پنڈت رتن ناتھ سرشار کا کلاسیکی شاہکار

فسانۂ آزاد

(ملخص)

حصۂ اوّل و دُوم

(مکمّل)

ایڈیٹر

رئیس احمد جعفری

شیخ غلام علی اینڈ سنز - پبلشرز

لاہور - پشاور - حیدر آباد - کراچی

فہرستِ مضامین

حرفِ آغاز

ہندوستان کی سرزمین پر، جب مسلمان فاتحوں کا کوکبۂ جلال آ کر رُکا، تو اس کی زبان فارسی تھی۔ یہی زبان فوراً دفتری زبان بن گئی۔ ہندوؤں نے وقت کی پکار پر لبیک کہی، اور بہت جلد انھوں نے فارسی زبان پر غیر معمولی دستگاہ حاصل کر لی کہ بغیر اس کے وہ عروج و کامرانی کے مراحل آسانی کے ساتھ طے نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے فارسی شاعروں، انشا پردازوں اور لُغت نویسوں کی صف میں ہمیں ہندو اہلِ قلم بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اس زبان کو اسی مہارت کے ساتھ حاصل کیا جس مہارت کے ساتھ بعد میں انگریزی راج کے دوران میں انگریزی زبان خوبی اور خوش سلیقگی کے ساتھ حاصل کی۔

لیکن مسلمان یہاں اس لیے نہیں آئے تھے کہ اس ملک کو لوٹیں اور اپنے ملک کو زر و جواہر سے بھر لیں، نہ اس طرح حکومت کرنا چاہتے تھے کہ اپنا ہیڈ کوارٹر افغانستان یا ایران رکھیں، اور صرف عسکری قوت کے بل پر حکمرانی کرتے رہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان فتح کیا، اور پھر وہ یہیں کے باشندے بن گئے۔ وہ اپنے ساتھ فارسی زبان لائے تھے، لیکن بہت جلد انھوں نے محسوس کر لیا کہ جس طرح مسلمان فاتحوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی زبان ترک کر کے ہندی زبان کو اپنا لیں۔ اسی طرح ہندوؤں کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی مادری زبان بھول جائیں، اور فارسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں۔

مسلمانوں نے، اس سلسلہ میں جبر اور جور سے کام نہیں لیا۔ وہ پوری مطلق العنانی کے ساتھ —— (وہ زمانہ مطلق العنانی ہی کا تھا، جمہوریت کا نہ تھا) —— فارسی کو ہندوستان کی ملکی زبان بنا سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ ایک زبان کی طرح ڈالی، جو غیر ملکی نہیں، بلکہ ملی تھی۔ یعنی اُردو!

اُردو زبان کی تعمیر و تاسیس میں انھوں نے خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا کہ یہ ملکی و ملّی تصوّرات کی آئینہ دار ہو، لیکن مذہبی جانبداری اور عصبیت کی روح کارفرما نہ ہونے پائے۔ وہ یہاں "السلام علیکم" کہتے ہوئے آئے تھے، اسے چھوڑ کر "آداب عرض"، "بندگی"، "تسلیمات" اور "کورنش" کو اپنا شعار بنا لیا۔ مسلمانوں کی اس قربانی نے رفتہ رفتہ ہندوؤں کو بھی متاثر کیا اور وہ اس نئی زبان کی تعمیر و تاسیس میں شریک ہو گئے۔ ان کی یہ شرکت وقتی مصلحت یا حکمتِ عملی پر مبنی نہیں تھی، بلکہ تمام تر اخلاص اور صداقت پر مبنی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اُردو، ہندوستانیوں کی مشترک زبان بن گئی۔ زبان کی وحدت کا نتیجہ یہ ہوا، کہ دونوں قوموں کے باہمی ارتباط اور تعاون، خلوص اور دوستی، یک رنگی اور ہم آہنگی، تہذیب اور تمدن، خیالات اور میلانات، انداز فکر اور طرزِ تخیل میں بھی بڑی حد تک یکسانیت پیدا ہو گئی اور اس یکسانیت نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا۔

قدیم اُردو لٹریچر کی تاریخ اس وقت تک نامکمل رہے گی، جب تک دیا شنکر نسیمؔ، درگا سہائے سرورؔ، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ ان بزرگوں کے تخلیقی کارنامے نہ مٹ سکتے ہیں، نہ فراموش ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح دورِ آخر میں منشی پریم چند، پنڈت برج نرائن چکبستؔ وغیرہ اور اب موہن لال رواںؔ، رگھوپتی سہائے فراقؔ، آنند نرائن ملاؔ، کرشن چندر، اور کنہیا لال کپور اور دوسرے ہندو اہلِ قلم اپنی زبان کے اوج، فصاحت و بلاغت، سلاست اور روانی، صحت اور استناد کے لحاظ سے، کسی بڑے سے بڑے انشا پرداز اور ساحر سے پیچھے نہیں ہیں۔

اُردو پہلے ہندی اور ہندوی کے نام سے منسوب رہی۔ رجب علی بیگ سرورؔ کے فسانۂ عجائب، اور فورٹ ولیم کالج

کلکتہ کی دوسری کتابوں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ یہ ہندی یا ہندوی زبان، ریختہ کے نام سے بھی یاد کی جاتی تھی۔ چنانچہ مرزا غالب فرماتے ہیں :-

جو یہ کہے کہ ریختہ، کیوں کر ہو رشکِ فارسی؟
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یُوں!

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

یہی ہندی، یا ہندوی، یا ریختہ زبان بعد میں اُردو کہلائی۔

اُردو کے ہندو شاعروں میں جس طرح پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام لازوال عظمت کا حامل ہے، اسی طرح اُردو کے ہندو انشا پردازوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا نام بھی زندہ جاوید حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

سرشار کے قلم میں جو بانکپن، جو آن، جو شان، جو روانی اور شگفتگی ہے، اس کی مثال کسی دوسرے ہندو یا مسلم انشا پرداز کے ہاں ملنا مشکل ہے۔ سرشار کا قلم مصوّر کا کیمرہ ہے جو ہر منظر، اور واقعہ کی ایسی دلکش تصویر کھینچتا ہے، کہ بے اختیار جی چاہتا ہے؛

اے مصوّر تیرے ہاتھوں کی بلائیں لے لُوں!

سرشار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تحریر کے ماحول میں جذب ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے، اس طرح لکھتا ہے، اور اس ادا سے لکھتا ہے کہ بس

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی!

الفاظ کا جتنا شان دار ذخیرہ اس کے پاس ہے، اور اس ذخیرہ کو خوبی اور سلیقہ کے ساتھ استعمال کا جتنا اچھا گُر وہ جانتا ہے، اس میں کوئی اس کا حریف نہیں۔

لکھنؤ کی رنگینیاں اور رعنائیاں ——— شاہانِ لکھنؤ کی طرب خیزیاں اور شادکامیاں، رؤسائے لکھنؤ کی یار باشیاں اور مجلس آرائیاں، مہوشانِ لکھنؤ کی جلوہ ریزیاں اور کرشمہ سازیاں، باشندگانِ لکھنؤ کی بٹیر بازیاں، پتنگ بازیاں اور ہر طرح کی بازیاں ——— اہلِ قلم کا یہ نہایت دلچسپ موضوع رہا ہے۔ انگریزوں نے، ہندوؤں نے، مسلمانوں نے، سب ہی نے اس موضوع پر خامہ فرسائیاں کی ہیں۔ سب ہی نے اس بُتِ پُرفن کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کی زلفِ پیچاں اور حُسنِ خنداں کا نقشہ پیش کیا ہے، مگر وہ بات کسی میں نہیں جو سرشار کے فسانۂ آزاد میں ہے۔ فسانۂ آزاد درحقیقت لکھنؤ کی تاریخ ہے۔ وہاں کے رسم و رواج، وہاں کی معاشرت، وہاں کی تہذیب و تمدّن، وہاں کے امراء و رؤساء وہاں کے عوام اور خواص، وہاں کے پیشہ ور اور صنعت کار، وہاں کے بانکے، وہاں کے شہدے، وہاں کی طوائفیں، وہاں کے افیمی، سب سرشار کے اس نگارخانہ میں چلتے پھرتے نظر آ جاتے ہیں اور کیا مجال جو کسی کے رنگ ڈھنگ، خو بو، اسلوب و انداز و اطوار میں ذرا بھی فرق ہو۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے آج سے نوّے برس پہلے کے لکھنؤ میں ہم کھڑے ہیں، اور اپنی آنکھوں سے وہاں کا جلوۂ بے محابا دیکھ رہے ہیں، اور اس جلوہ میں کچھ اس بلا کی کشش اور جاذبیت ہے کہ جی نہیں بھرتا، طبیعت نہیں اُکتاتی۔ بس یہی جی چاہتا ہے، کہ دیکھتے جائیں۔

دیکھتے رہیں ——— ایک بار دیکھا ہے، دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے!"

فسانۂ آزاد کو، اگر افسانہ یا ناول کے اعتبار سے دیکھیے تو اس میں "تکنیک" کی بہت سی خامیاں نظر آئیں گی، بلکہ سرے سے تکنیک ملے گی ہی نہیں، لیکن اگر اس اعتبار سے دیکھیے کہ وہ سو برس پہلے کے رہن سہن، اور تہذیب کا چربہ ہے تو ایک ایک حرف پڑھنے کو، اور بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔ دل سے بس ایک ہی صدا اٹھے گی۔

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!

آپ بار بار دیکھیں گے، پھر بھی جی نہیں بھرے گا، آپ ایسی دلکشی پائیں گے، جو کسی ناول، کسی افسانہ، کسی کہانی اور کسی داستان میں نہیں مل سکتی ——— بالکل نئی، سب سے الگ، سب سے جدا، سب سے عجیب!

بہت سے ایسے ٹکڑے بھی فسانۂ آزاد میں ملیں گے، جن پر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ ناول کا جزو نہیں، کسی مقالہ کا ایک حصہ ہیں، لیکن ان سب کی دلکشی اور تاثیر وہی ہے، جو ناول کے کسی دلچسپ باب میں ہوتی ہے، اس لیے کہ ایسے ٹکڑوں میں جو بظاہر مضمون معلوم ہوتے ہیں، سرشار نے لکھنؤ کی طلسمی زندگی کی کوئی نہ کوئی ایسی تصویر کھینچ دی ہے، جن کے رنگ و روغن کی آب و تاب اب تک قائم ہے اور شاید کبھی نہیں مٹے گی۔

سرشار کی اس کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان پر انھیں استادانہ قدرت تھی۔ عربی سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھے۔ علوم و فنون اسلامیہ پر بھی ان کی گہری اور وسیع نظر تھی۔ فارسی کے محاورے اور ضرب الامثال فارسی کے جملے اور اشعار ان گنت موقعوں پر انھوں نے استعمال کیے ہیں، اور کہیں ٹھوکر نہیں کھائی۔ قرآنی آیات، احادیث کے ٹکڑے عربی امثال کا جہاں انھوں نے مولویوں اور عربی دانوں کی زبان سے استعمال کرایا ہے۔ صحت کا یہ عالم ہے کہ کہیں ذرا بھی نہیں چوکے ہیں۔ فقہ، منطق اور فلسفہ کی اصطلاحیں، جس خوبی کے ساتھ انھوں نے برتی ہیں، یہ کسی اناڑی کا کام نہیں ہوسکتا۔ اپنے گروہ میں سرشار پہلے شخص تھے، جنھوں نے انگریزی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ انگریزی لٹریچر کا گہرا مطالعہ کیا تھا، انگریزی کے ناول، اخبارات، صحائف، سب اُن کی نظر میں تھے اور اس ہمہ دانی کی جھلک ان کی تحریر میں اکثر نظر آتی ہے۔ وہ ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے، اور صحافت کے ایچ پیچ سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے افسانہ میں یہ چیز بھی ملے گی، وہ وکیل یا قانون دان نہیں تھے، لیکن انھوں نے جہاں وکیلانہ جرح کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عدالتوں کے کاروبار سے بھی وہ ناواقف نہیں تھے۔ غرض ان کی تحریر میں لٹریچر کی کوئی کوتاہی یا خامی کہیں نظر نہیں آئے گی وہ جب اپنے کیریکٹر کی زبان سے وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں، جو اس کے طبقہ کے لیے مخصوص ہیں اور ان الفاظ کے استعمال میں کہیں بھی بُوئے کچہری نہیں آتی۔ ان کے اس کمال پر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔ یہ راستہ اتنا کٹھن ہے کہ ایک اوسط درجہ کا عربی دان مسلمان بھی آسانی سے اس پر رہبری نہیں کرسکتا۔ چہ جائیکہ ایک ہندو!

سرشار صاحب اپنے دور کے "ترقی پسند" انشاء پرداز تھے۔ وہ اپنی کتاب میں،

مطرب بنے، ندیم بنے، قصہ خواں بنے!

پر ہی اکتفا نہیں کرتے، واعظ اور ناصح کا بہروپ بھی اختیار کر لیتے ہیں اور خوب جلی کٹی سناتے ہیں۔ لیکن میں عرض کرچکا ہوں، فسانۂ آزاد کو ناول کی حیثیت سے پڑھنا سرشار اور اردو لٹریچر دونوں پر ظلم ہے۔ یہ کتاب صرف لٹریری حیثیت رکھتی ہے اور اس کی یہ حیثیت اتنی بھاری ہے کہ دوسری تمام کوتاہیوں اور خامیوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

سرشار کشمیری پنڈت تھے ، اُردو مادری زبان تھی انگریزی اسکول میں پڑھی ، فارسی عربی کی تعلیم کچھ گھر پر حاصل کی ، کچھ اہل علم کے فیض صحبت سے دسترس پیدا کی ۔ بلا کے ذہین اور شگفتہ طبع انسان تھے ۔ مسلمانوں کی معاشرت اور تمدن سے بہت متاثر تھے ، آخر وقت تک ترکی ٹوپی پہنتے رہے ۔ ترکوں سے محبت بھی بہت کرتے تھے ۔ مسلمانوں کے رسم و رواج ، اور تہذیبی معاشرت کے اتنے ہی رمز شناس تھے ، جتنا کوئی مسلمان ہو سکتا ہے ۔

عملی زندگی کا آغاز ، نول کشور پریس سے ہوا (غالباً ۱۸۷۸ء سے) منشی نول کشور ان کی خداداد صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے ۔ انھوں نے ، اُس زمانہ کے لحاظ سے معقول تنخواہ پر ملازم رکھ لیا اور روزنامہ اودھ اخبار کی ادارت سپرد کر دی ۔ یہ یو پی کا سب سے قدیم اُردو روزنامہ تھا ، جو تقسیم ہند کے وقت تک جاری رہا ۔ بعد میں جب یو پی سے اُردو کو دیس نکالا ملا ، تو اس اخبار کو بند ہو جانا پڑا ۔

سرشار کی زندگی کا آخری حصّہ حیدر آباد دکن میں بسر ہوا یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد صدر اعظم مملکت آصفیہ حیدر آباد نے ، اپنے متوسلین میں انھیں شامل کر لیا تھا ۔ مہاراجہ آنجہانی اُردو کے پہلے شاعر تھے ، وہ سخن سنجوں اور ادیبوں کی بہت قدر کرتے تھے وقت کے متعدد ادیب اور شاعر ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے سرشار بھی شریک ہو گئے ۔

شراب کے بہت رسیا تھے ، سچ ہے ،

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی !

شراب کی کثرت نے صحت بگاڑ دی ۔ زندگی سے انھیں کچھ ایسی زیادہ محبت بھی نہ تھی ——— کم از کم شراب سے زیادہ نہیں ——— صحت بگڑتی رہی ، شراب کے غم کے خم لنڈھاتے رہے ، اور آخر ایک رات (۱۹۰۳ء میں) اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے ۔ وہ مر گئے ، لیکن ان کا نام زندہ ہے ، اور تا ابد زندہ رہے گا ۔

فسانۂ آزاد کے متعلق ایک بات اور یاد رکھنی چاہیئے ۔ اس کا اور "طلسم ہوشربا" کا پلاٹ بالکل ایک سا ہے ، جس طرح طلسم ہوشربا میں خواجہ عمرو عیار ہیں ، اسی طرح فسانۂ آزاد میں خواجہ بدیع الزماں ہیں جس طرح ہوشربا کے مسلمان پہلوان ، اکثر نئی نئی عورتوں کا عشق قبول فرمایا کرتے تھے ، اور انھیں "مشرف بہ اسلام" کر کے ، سالئ عقد میں تعداد سے بے نیاز ہو کر ، لے آتے تھے ۔ اسی طرح فسانۂ آزاد کا ہیرو ، "آزاد" ، متعدد عورتوں کا محبوب بن جاتا ہے ، ان سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے ، پھر ان کے عشق میں آپ سا گریباں پھاڑتا اور چیختا چلاتا ہے ، اور جب آگے بڑھتا ہے ، تو سب کچھ بھول بھلا کر ، نئے رومان میں مصروف ہو جاتا ہے ، اور پیچھے پھر کر بھی نہیں دیکھتا ، اور جب خوبئ قسمت سے پھر آمنا سامنا ہو جاتا ہے تو از سر نو ، پیمان محبت بندھنے لگتے ہیں اور عشق کی ریہرسل شروع ہو جاتی ہے ، یہ نیا حال ، پرانے ماضی کو پس منظر میں لے جاتا ہے ، لیکن اس قسم کی نیرنگیاں سرشار کے دور میں عام نہیں ۔ اُس زمانہ کی واقعی زندگی بھی یہی تھی ، اور اُس دور کے لکھنے والوں نے ، اس زندگی کو اپنی کتابوں میں بار بار پیش کیا ہے ۔ جس طرح طلسم ہوشربا کا افسانہ امیر حمزہؓ کے ارد گرد گھومتا ہے ، اسی طرح فسانۂ آزاد کی کہانی ، جنگ روم (ترکیہ) و روس کے ارد گرد گھومتی ہے ۔ طلسم ہوشربا میں امیر حمزہؓ کی شخصیت کو سب سے بالا دکھایا ہے ۔ فسانۂ آزاد میں سرشار نے یہ زیادتی کی ہے ، آزاد کو اتنا ابھارا ہے کہ شیر پلونا ، غازی عثمان پاشا کا ذکر تک نہیں کیا ہے ، حالانکہ عثمان پاشا کے ساتھ آزاد کو دکھا کر وہ زیادہ دلکشی پیدا کر سکتے تھے ۔

یہ جنگ روس اور روم (ترکی) کے مابین ۱۸۷۷ء میں واقع ہوئی تھی روس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا ، پہلے نادروں کا

بھاری لشکرِ گراں لے کر میدان میں اُترا، جب وہ کامیاب نہ ہو سکا تو زار خود سپہ سالارِ اعلیٰ بن کر میدان میں آیا۔ عثمان پاشا کو ترکی حکومت کے مرکز سے کوئی کمک نہ پہنچ سکی کیونکہ اس زمانہ کا ترکی باہمی سازشوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ لیکن عثمان پاشا لڑتے رہے۔ اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کے بل پر اس وقت تک دشمن کے توپخانوں اور ٹڈی دل فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ سارے ترک سپاہی کام آگئے مگر زخموں سے چُور چُور اور نڈھال عثمان پاشا کا ہاتھ ابھی تلوار کے قبضہ پر تھا، زخموں سے خون رس رہا تھا، غشی طاری ہو رہی تھی، آنکھیں بند ہوتی جاتی تھیں، لیکن اب بھی اگر ایک لمحہ کے لیے کھلتی تھیں تو دشمن کو تلاش کرنے لگتی تھیں، کہ وہ نظر آئے، تو —————— !

آخر عثمان پاشا گرفتار ہو گئے۔ زارِ روس ان کی دلیری اور شجاعت سے اتنا متاثر ہوا کہ گرویدہ بن گیا۔ اس نے عثمان کو اپنا ذاتی مہمان بنا کر رکھا اور دربار میں جب عثمان پاشا اس کے سامنے پیش کیے گئے، تو اس نے اپنے ہاتھ سے وہ تمام ہتھیار، عثمان کے زیبِ جسم کیے، جو روسی سپاہیوں نے غشی اور قید کے عالم میں اتار لیے تھے۔

زار کے اس حسنِ سلوک کے باوجود، عثمان پاشا کے حُبِ وطن، قومی خودداری، اور ذاتی آن کا یہ عالم تھا کہ، اسی دربار میں شاہِ رومانیہ بھی موجود تھا۔ رومانیہ ترکی کا باج گزار تھا، لیکن اس جنگ میں، روس کی شہ پاکر اس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا، اپنے ملک سے روس کو گزر جانے کی اجازت دے دی تھی، اور روسی فوجوں کے پہلو بہ پہلو رومانی فوجیں بھی اپنے ترک آقاؤں سے لڑ رہی تھیں۔ جنگ کے اختتام کے بعد روس نے رومانیہ کی آزادی اور خود مختاری تسلیم کر لی تھی۔ وہاں کا بادشاہ اب تک پرنس کہلاتا تھا، اب روس نے اس کی بادشاہت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔ زارِ روس نے دربار میں عثمان پاشا کو، اپنے وزیروں اور افسروں سے ملانے کے بعد شاہِ رومانیہ کے سامنے پیش کیا۔

"یہ ہیں ہمارے اتحادی شاہِ رومانیہ!"

شاہِ رومانیہ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن عثمان پاشا نے کہا:-

"مَیں ایک باغی سے ہاتھ ملانا اپنی توہین سمجھتا ہوں!"

سارے دربار میں ایک سناٹا چھا گیا لیکن زار، عثمان کا قدر شناس تھا، دل پر جو کچھ بھی گذری ہو، بظاہر مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

غازی عثمان پاشا اپنے قیامِ روس کے دوران میں، جب سڑکوں پر نکل جاتے تھے، تو لوگوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ جمع ہو جاتا، لوگ اشتیاق، استعجاب اور دہشت کے ساتھ اس ترک سپاہی کا دیدار کرتے تھے، جس نے مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ، روس کے ٹڈی دل کا مقابلہ کیا تھا، جو آخر وقت تک لڑتا رہا تھا اور جس نے گرتے گرتے بھی ہار نہ مانی۔

کچھ عرصہ کے بعد زار نے، عثمان پاشا کو عزّت و تکریم کے ساتھ رہا کر دیا اور وہ اپنے وطن واپس آگئے، جہاں خلیفۃ المسلمین نے انھیں "غازی" کا خطاب عنایت فرمایا اور اپنا سب سے بڑا مشیر و تدبیر بنا لیا، اور پھر زندگی کی آخری سانس تک وہ امیر المومنین خلیفۃ المسلمین ہی کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے۔

"محاربات پلونا" پر ایک انگریز سپاہی لفٹنٹ ولیم ہربرٹ نے دو طویل حصوں میں ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے۔ یہ مصنف خود اس جنگ میں شریک تھا، لہٰذا اس نے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ انگریز بھی روسیوں سے کم ترکوں کے دشمن نہیں ہیں، لیکن اس انگریز نے صفائی اور بے باکی کے ساتھ ترکوں کی بہادری اور شجاعت کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے، اور عثمان کے کمالاتِ عسکری کو سراہا ہے۔

روم (ترکی) اور روس کی یہ جنگ جس مقام پر ہوئی تھی اس کا نام "پلونا" تھا۔ اسی مناسبت سے "غازی عثمان پاشا"

شیر پلونا" کے عوامی خطاب سے مشہور ہو گئے۔
سرشار نے اس جنگ کو اپنے افسانہ کا پس منظر بنایا ہے!

فسانۂ آزاد چار ضخیم حصوں پر مشتمل ہے، جن کی مجموعی ضخامت ہزاروں صفحات سے متجاوز ہے۔ یہ افسانہ روزنامہ ودھ اخبار میں، دو سال تک مسلسل چھپتا رہا۔ پھر کتابی صورت میں شائع ہوا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرشار روزانہ چند سلپیں کاتب کے حوالے کر دیتے تھے۔ پیش نظر یہ تھا، کہ افسانہ ہر منہ چھپتا ہے، اس لیے بات میں بات پیدا کرتے گئے، تاکہ زیادہ سے زیادہ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہ سکے۔ زیادہ سے یادہ دنوں تک اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ عوام اسے دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ لہذا منشی نولکشور، مالک نول کشور پریس و ودھ اخبار کا تقاضا تھا، کہ

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اس طویل داستان سرائی کا انجام یہ ہوا کہ دلچسپی کے باوجود، بہت کچھ رطب و یابس بھی اس میں آ گیا، غیر متعلق اور غیر ضروری ٹکڑے ی شامل ہو گئے۔

میں نے وہی مضمون جو طلسم ہوشربا کی تلخیص میں روا رکھا تھا، یہاں بھی پیش نظر رکھا، یعنی اپنی طرف سے نہ ایک لفظ کی کمی، نہ اضافہ یا۔ صرف قطع برید سے کام لیا۔ لیکن اس طرح کہ عبارت کے تسلسل اور روانی میں کوئی فرق نہ آ سکے۔ نہ افسانہ کی دلچسپی اور دلآویزی میں سے مجروح ہونے پائے۔ غیر ضروری اور غیر متعلق عبارتیں کاٹ دیں۔ طویل اور لامتناہی اشعار کے سلسلے حذف کر دیئے۔ نسانہ کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اس طرح ایک مرکز پر جمع کر دیا کہ بظاہر محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اصل افسانہ اتنا نہیں تھا۔ اس سے ی گنا زیادہ طویل و ضخیم تھا

بس، آتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

رئیس احمد جعفری
مرینا ہوٹل ـــــ کوہ مری

۱۵ مارچ ۱۹۵۱ء

سحر کاذب کے وقت مرغ بے ہنگام نے گربۂ مسکین کی آہٹ جو پائی تو گھبرا کر گلڑوں کوں کی بانگ لگائی، اور ہمارے
حبیب لبیب جو سر شام سے لمبی تانے میٹھی نیند سو رہے تھے یہ آواز خوش آیند سنتے ہی کلبلا کر اٹھ بیٹھے دیکھتے کیا ہیں کہ ہوا بہ
نسیم مشکبار نے تمام شہر کو نمونۂ گلزار بنا دیا ہے۔ یہ شاعر آدمی۔ تاب کہاں کہ مکان کے قفس میں قید رہیں، اپنے گل کی طرح نکل
کھڑے ہوئے۔ روشنی طبع کے صدقے ایک ایک قدم پہ ایک ایک مصرع ریختہ موزوں ہوتا جاتا تھا۔ وہاں واد کون دے، خود ہی گردن
ہلاتے جاتے تھے اور احسنت و مرحبا وغیرہ کلمات زبان پہ لاتے تھے اور خود ہی جھک جھک کر سلام کرتے تھے کہ دو مختلف الوضع
حضرات نظر سے گذرے۔ ایک صاحب وضع کو نیا سے نرالے پتلون خاکی، کوٹ پیلا، واسکوٹ ڈھیلا ڈھول چال چلے جاتے ہیں۔
دوسرے غمگسار زیبا انداز نازک خرام گلفام دھانی رنگا ہوا کرتہ اس پہ سپید گز والی مین فرنچ کا چست انگرکھا، گلبدن کا چوڑیدار
گھٹنا پہنے ہاتھوں میں مہندی پور پور رچے، آنکھوں میں سرمے کی تحریر، ایک عجیب لوچ سے کمر لچکاتے پھونک پھونک کر قدم
دھرتے چلے آتے تھے۔ انھوں نے ان کو اور انھوں نے ان کو خوب غور سے گھورا، اور ہمارے حبیب لبیب نے دونوں پر ایک ایک
نظر غلط انداز میں ڈالی، اتنے میں حضرت نازکبدن نے مسکراتے ہوئے آواز دی۔

نازکبدن: میاں جانے والے! او میاں جانے والے! اے فدوی ادھر تو دیکھو، یا الٰہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں، میرا
کلیجہ بلیوں اچھلتا ہے بھری برسات کے دن اے ہے! کہیں پھسل نہ پڑیں، ان بیچارے کی کھوپڑی پھٹ جائے حضرت فدوی سنبھلے
ہوئے گریئے گا تو مجھ سے ضرور پوچھ لیجئے گا۔

جانیوالا۔ بہت خوب ضرور پوچھوں گا، بلکہ آپ کو ساتھ لے کر گروں گا تو نیچے آپ ہوں اوپر بندہ۔ انشاء اللہ!

آزاد (جانے والا)۔ اب یہ فرمایئے کہ اس وقت آپ کہاں کے ارادے سے نکلے ہیں؟

چھمی جان (یعنی نازکبدن)، کل شب کو تین بجے تک ایک رنگیلے دوست کے یہاں محفل رقص و سرود میں شریک تھا واللہ وہ
پیاری پیاری صورتیں دیکھنے میں آئیں کہ واہ جی واہ، اگر وہ چاند سا مکھڑا نظر پڑ جائے گا، ہائے مرتے دم تک نہ بھولے گا، زاہد صد سالہ
بھی دیکھے تو اس بت بے پیر کی پرستش کرے۔ اب اس وقت جھٹ پٹ پھر جاتے ہیں، ذرا آنکھیں سینک آئیں پھیر دیں گذر رہی ہوگی۔

آزاد۔ کل فرصت ہو تو ہم سے ملئے گا!

چھمی جان - کل تو ملنا معلوم - کل تک تو نیند کا خمار رہے گا۔
آزاد - اچھا جانے دیجیے پرسوں ہی۔
چھمی جان - پرسوں اے پرسوں تو فغفور چین بھی یاد فرمائیں تو بندہ نہ جائے گا، پرسوں نواب صاحب کے ہاں بٹیروں کی پالی ہے مہینوں سے بٹیر تیار کیے ہیں۔
آزاد - خیر صاحب پرسوں نہ سہی دوشنبہ کے دن ملیئے۔
چھمی جان - دوشنبہ اور سہ شنبہ کو تڑکے سے بانے کی کنکیاں لڑیں گی، ابھی بنارس سے بانا منگایا ہے۔
آزاد - الٰہی خیر چہارشنبہ کو فرصت ہے؟
چھمی جان - واہ۔ واہ چہارشنبہ کو تو بڑے تڑکے سے بھٹیاریوں کی لڑائی ہوگی دیکھیے تو کیسی کیسی پر یزاد بھٹیاریاں کس بانکی ادا سے ہاتھ چمکا کر انگلیاں مٹکا کر لڑتی ہیں اور کیسی بے نقط سناتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔
آزاد - پنجشنبہ کو تو ضرور ملنا ہوگا تم کو واسطہ خدا کا۔
چھمی جان - حضرت اب کی نوچندی جمعرات ہے خدا جانے کس کس کے وعدے وفا ہوں گے برسوں سے منتیں مانی ہیں آپ کو تو دنیا و مافیہا کی خبر تو ہے ہی نہیں۔
آزاد - بس قبلہ ملنا طوفا معلوم، فرصت عنقا ملاقات معدوم۔
چھمی جان - اے تو خداوند آپ روٹھے کیوں جاتے ہیں؟
حبیب لبیب - یا حضرت مجرا عرض ہے - کیوں قبلہ و کعبہ خدام حضور کو ہمارے غدار شہر لکھنؤ میں ڈوم ڈھاریوں ہی کی صحبت پسند آئی یا کسی اور کی بھی وضع بھائی، لکھنؤ میں تو ہر فن کا باکمال موجود ہے وہ کونسا ہنر ہے جو یہاں مفقود ہے۔
چھمی جان - ہم تو ہمیشہ ایسی ہی نگری میں رہے - روز شب یہی چہچہے یہی چہچہے یہی قہقہے، گھر پھونک تماشا دیکھا - لنگوٹی میں پھاگ کھیلا خوب گلچھرے اڑائے، فرنگی محل کی طرف سے بھی نکلے تو کمروں ہی کو تکتے ہوئے۔
آزاد - اس فرنگی محل کا نام آفتاب جہانتاب کی طرح ساری خدائی میں روشن ہے اور علمائے فرنگی محل کی مصنفات المشہور کالشمس فی النہار ہیں کربلائے معلیٰ مدینہ منورہ، مشہد مقدس، بیت اللہ تک کے قدردان اور نکتہ دان ان بزرگان خورشید ضمیر بیضا تحریر کے کلام معجز نظام پر احسنت کہتے ہیں - مہینوں کی راہ طے کر کے شائقین علم و ہنر کسب کمال و تحصیل علوم کے لیے یہاں آتے اور چار دانگ ہند کے علما فیض پاتے ہیں۔

این سخن باید بآب زر نوشت

الغرض اب بھی ایک ایک طفل مکتب عجبلی خان ہے بلکہ رشک لقمان ہے یہاں کے صناعان چابکدست کے بھی جھنڈے گڑے ہیں، کمہار تو ایسے کہ دنیا کے پردے پر نہ ہوں گے - مٹی کی مورتیں ایسی بنائیں کہ مصوروں کی کرکری ہو گئی [1] بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ مورت گویا بولا ہی چاہتی ہے، جس عجائب گھر میں جائیے گا لکھنؤ کے کمہاروں کی کاریگری ضرور پائیے گا - خوشنویسوں نے کاتب قسمت کا نوشتہ مٹا دیا - بانکے [2] شیر کا پنجہ توڑ ڈالیں - ہاتھی کو ڈپٹیں تو چنگھاڑ کر منزلوں بھاگے - ہیرا ج رستم سیستانی تھا تو شیدی

---

[1] پھل کھلنا، توہین، ذلت۔ [2] لکھنؤ کے وہ منچلے بانکے کہلاتے تھے جو اپنی آن پر جان قربان کر دینا ایک کھیل سمجھتے تھے، ان بانکوں کو ہم یورپ کے ان تاریخی بہادروں سے تشبیہ دے سکتے ہیں جنھیں KNIGHT کہتے ہیں۔

اسفندیار رُوئیں تن، استاد محمد علی خاں پھکیت چھریرا بدن، لیکن گتکا ہاتھ میں آنے کی دیر تھی، پرے کے پرے دم میں صاف کر دیتے، کڑک کڑ طمانچہ کا تُلا ہاتھ لگا یا تو حریف کا منہ پھر گیا، کہا اڑے میں گتکا لے کر کھڑے ہوئے تو معلوم ہُوا بجلی چمک گئی۔ ایک دفعہ للکار دیا کہ روک ہنمدکتی دیکھ سنبھل خبردار ہوشیار نیہ آئی وہ آئی وتڑ، وہ پڑ گئی، بارک اللہ کی آواز فلک ہفتم پر پہنچنے لگی۔ کامدانی وہ ایجاد کی کہ اڑیسہ اور کوچین تک سے فرمائشیں آنے لگیں۔

حبیب (آزاد سے) واہ قبلہ، کیوں نہ ہو چشم بد دُور کس لطافت سے آپ نے لکھنؤ کے علمائے اجل فضلائے اکمل، صناعان کامل فن اور پہلوانان روئیں تن کے کمال کا حال بیان کیا حق تو یوں ہے کہ لکھنؤ کا علم و فضل لکھنؤ کے محاورات رنگین فقرات دل نشین خوش بیانی طرز غزل خوانی الشہور فی المشارق والمغارب ہے لیکن چھمی جان کو علوم سے مرد کار نہ فنون سے مطلب، یہ تو تال سم کے پھیر میں پڑے ہیں۔ افسوس۔

چھمی جان حضرات اس وقت بھیرویں سننے جاتا تھا لیکن آپ نے پادریوں کی طرح وعظ کہہ کر کایا پلٹ کر دی۔ اب جو ہمیں راہ پر لاتے ہو تو اتنا مان جاؤ کہ ذرا قدم بڑھاتے ہوئے پاٹے نالے تک چلے چلو دیکھوں تو پرستان سے کیونکر بھاگ آتے ہو، انھیں بتوں کا سجدہ نہ کرو تو کچھ جرمانہ دوں اور صاف تو یوں ہے کہ بلا امتحان۔ ع

قائل نہیں ہے بندہ کسی شیخ و شاب کا

اُس اندر کے اکھاڑے سے کورے نکل آؤ تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔

آزاد۔ (حبیب حبیب سے) یا حضرت آئیے، دل کڑا کر کے چلئے تو۔

حبیب لبیب۔ بسم اللہ چلیے!

الغرض حبیب لبیب اور میاں آزاد دونوں چھمی جان کے ساتھ ساتھ پاٹے نالے پر کسی حافظ جی کے بیت اللطف میں کھٹ سے جا پہنچے۔ کوئی چالیس پچاس قدم کے فاصلے سے لہرا لہرا کر گانے کی آواز آنے لگی۔ چھمی جان جھوم جھوم کر عجب نازو انداز سے قدم اُٹھاتے تھے۔ بارے یہ سب حافظ جی کے مکان عالیشان میں داخل ہوئے۔

لہ لکھنؤ کا ایک محلہ پاٹا نالہ۔

حافظ جی کا مکان عینو سواد اور شکر لباں حور نژاد

این چہ بزم است کہ لب برلبِ جام است اینجا
بادہ خورشید و قدح ماہِ تمام است اینجا

حافظ جی کا مکان خوش سواد و دلکش بہشت شداد تھا۔ اِدھر سفید پوشوں کی قطار اُدھر سبزان سبز بخت کے جوبن کی بہار، اِدھر نظارہ بازی اُدھر شوخی و طنازی، اِدھر رندانِ عالم سوز اُدھر نورِ عالم افروز، اِدھر شوقِ وصال اُدھر غرورِ حسن و جمال اِدھر آنکھیں اشکبار اُدھر بناوٹ، سجاوٹ، نکھار۔ اِدھر عشقِ جنوں خیز اُدھر زلفِ عنبر بیز، اِدھر صدائے بریز بریز اُدھر خندۂ شکر آمیز۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ راگ اور راگنی ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔ پازیب کی چھما چھم دل کو پامال کرتی ہے کوئی انا البرق کہتی ہوئی چمک جاتی ہے کوئی اونچے سُروں میں تان لگاتی ہے۔ دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ چھمی جان نے ایک ناظورۂ طرز ہے سے فرمائش کی کہ میدانِ خوش بیانی کے یکہ تاز لسان الغیب حافظ شیرازی کی اس غزل کو گاؤ،

برزمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود   سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

سوہنی کی دُھن میں اس غزل نے وہ لطف دکھایا اور ایسا رنگ جمایا کہ جماسے جیب بعیب تک ہو ہو کہہ اُٹھتے تھے۔ اول تو غزل حقانی دوسرے اس رنگین ادا کا طرزِ غزل خوانی، تیسرے اس کی اٹھتی جوانی، کوئی سر دھنتا ہے، کوئی آہ سرد کھینچتا ہے، کسی کے دل میں تیرِ عشق کی خلش، کسی کو بیٹھے بٹھائے مفت کی دوا دوش، دو چار بیباک مدعیانِ تہذیب نے ان طوائفوں کو بلا کر بڑے شوق سے قریب بٹھایا۔ نوک جھونک، ہنسی مذاق، چہل دل لگی۔ دھول دھپا ہونے لگا۔ حافظ جی بھی داد و غم ارباب نشاط بنے ہوئے مزے سے چہکھی اڑا رہے تھے۔ نوجوان بھی تعلیم نظری سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ اب مہ جبینوں، بڈھوں اور نوجوانوں کا مکالمہ سنیئے:۔

پیرِ فرتوت۔ آج کل کے لڑکوں کو بھی ہوا لگی ہے۔

نوعمر۔ اجی قبلہ اب تو ہوا ہی ایسی چلی ہے کہ جوان تو جوان بڈھوں تک کو ٹھبس لگا ہے، سو برس کا سن تابوت پر لدنے کے دن مگر جوانی ہی کا دم بھرتے ہیں۔

پیرِ فرتوت۔ میاں صاحبزادے ہم تو دنیا بھوکے نیارے ہیں ہمیں کوئی چنگ پر کیا چڑھائے گی اور رنگ پر کیا لائے گی مگر تم ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ایسا نہ ہو ان کے پھیر میں آجاؤ۔

نوجوان۔ واہ قبلہ آپ کے فیضانِ صحبت سے ہم بھی پختہ مغز ہو گئے ہیں ایسے کچے نہیں کہ ہم پر کسی کا داؤ پیچ چلے۔

مہ جبین۔ ان بڑے میاں سے کوئی اتنا پوچھو کہ بال تک کے برف سا سفید ہو گیا مگر اب تک سیاہ کاری نہ چھوڑی یہ کہاں تے کس منہ سے ہیں۔ ان کی سنتا کون ہے۔ خدا شیخ جی بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنایا کیجیے۔ شاہ جھڑے[1] والی گلی کے روز بیس بیس چکر ہوتے ہیں، اسے تم سمجھتے بھی نہیں۔

---

[1] لکھنؤ کا ایک بدنام محلہ۔

حافظ جی۔ شیخ جی جہاں بیٹھتے ہیں جھگڑا ضرور خریدتے ہیں۔

اِدھر تو یہ گفتگو ہوتی تھی اُدھر دوسری ٹکڑی میں فحش اور پھکڑ کا چرچا چلتا تھا تیسرے غول بیابانی میں ڈھول دھپا ہوتا ننھے کم سن اطفال اور جوانان مطلق العنان اور رنگین خیال و پیران نود سالہ مہمل کی تعلیم پاتے تھے۔ اتنے میں دوپہر کی توپ دغی دھنانا۔ جلسہ برخاست، ناچ رنگ بند۔

جلسے کا قل چراغ رقص و سرود کا گل ہونا تھا کہ ایک نیا گُل کھلا، میاں آزاد نے جامۂ شیخوخیت تہ کر رکھا اور عشق خانہ خراب کے ہاتھ بک گئے۔ اب ہر دم آہ و زاری ہے۔ بیتابی و بیقراری ہے۔ دیدۂ مطرود سینۂ مجروح۔ آہ سرد دلِ پُر درد عقل دنگ سینہ پر سنگ پائے خرد لنگ عشق مہوشاں شوخ و شنگ جنوں کی امنگ۔

چھمی جان تجربہ کار اور مزاجدان عشاق زار تھے چتونوں سے تاڑ گئے کہ کسی ترک زریں کمر کے تیر نگاہ نے گھائل کر دیا۔ پھر کیا تھا بولے:۔

"نیا رنگ لائی گلہری"

آزاد۔ ہائے وہ خال عنبریں وہ گیسوئے مشکیں۔ وہ لعل نگاریں وہ چشم شرمگیں۔ وہ سنگار وہ نکھار ہے ہے ہیں تو جیتے جی مرمٹا یار دکوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ وصال نصیب ہو، باغ ہو جام ہو میں ہوں اور وہ حبیب ہو۔

اب شہر بھر میں دھوم مچ گئی کہ ایک نئے بگڑے، جہاں جاؤ یہی چرچا میاں آزاد کے لنگوٹیے یاروں نے لاکھ فکر کی کہ ان کو راہِ راست پر لائیں مگر عشقِ صادق سے ایک کی پیش نہ گئی۔ قصر مراد تک کمندِ تدبیر نہ پہنچی۔ میاں آزاد کی حالت اس درجہ ردی ہو گئی کہ دن کو آہ و زاری شب کو اختر شماری۔ کھانا پینا چھوڑا عیش و آرام سے منہ موڑا، رنج و محن سے ناتا جوڑا۔

آخرکار احباب کی یہ صلاح ہوئی کہ کسی باغِ نزہت افزا اور چمنستانِ پُرفضا میں میاں آزاد رہیں شاید وحشت دل دور اور مرضِ جنوں کافور ہو جائے۔ میاں آزاد کی وحشتِ دل اور شیشۂ جنوں کے چکنا چور کرنے کے لیے لب جو ایک نزہت افزا اور پُرفضا باغ آراستہ ہوا۔ احباب صافی مزاج و بذلہ سنج مرنجان مرنج نے بھی ان کی دلجوئی کے لیے وہاں ہی بستر جمایا۔

بلیغ۔ حضرت اپنا تو یہ مقولہ ہے کہ "معشوق کیجیے تو پریزاد کیجیے"۔ ہم ظاہری حسن و جمال کے شیفتہ، نہ خد و خال کے فریفتہ۔ رُوئے خوش کے ساتھ خوئے خوش بھی ہو تو ہم ہزار جان سے اُس گُل کے بلبل ہو جائیں۔

نقل ہے کہ ایک شیخ ملکوتی صفات اشرف المخلوقات کی طبیعت لہرائی کہ سیر دریا کریں۔ خراماں خراماں چلے جاتے تھے، راہ میں ایک نوعروس پری پیکر برہنہ سر لبِ بام کھڑی تھی۔ شیخ نے کہا کہ اے سرمایۂ ناز سر کو ڈھک لے، اس جادو جمال نے جواب دیا کہ آنکھیں بند کر لے۔ شیخ نے کہا میں عاشق ہوں، کہیں عاشق زار آنکھیں بند کرتے ہیں۔ اس غیرتِ ماہ نے عین مستی میں کہا میں مستانہ ہوں / مجھے سر ڈھکنے سے کیا کام اور معاً یہ شعر بہ لحن باربدی پڑھا ؎

این موئے نیست بر سرِ من بلکہ خارِ عشق — در پائے من خلیدہ و از سر بر آمدہ

شیخ مبارک نہاد سنتے ہی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ عاشقی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ عشقبازی سربازی ہے مگر کوئی معشوق تو ہو مرد دانا کا معشوق مسلک نیک ہے۔

شمیم۔ واللہ لبِ جوئبار یہ گلزار پُربہار ایسا لطف دکھاتا ہے کہ غنچۂ دل نسیم طرب کے اہتزاز سے کھلا جاتا ہے۔ ایام شاہی میں ایک مرتبہ بڑی کیفیت ہوئی تھی۔ اعیان دولت میں سے ایک ایک رکن رکین سلطنت کی دختر فرخندہ اختر کی شادی اس دھوم دھام

سے ہوئی کہ پیرِ فلک نے باوصف پیرانہ سالی اس دھوم کی شادی دیکھی نہ سنی، عین گومتی کے کنارے جشن جمشیدی بڑے کر و فر سے منعقد ہوا، وہ دھوم وہ ہجوم کہ ملل وجل۔

انور۔ اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا سناؤں تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ جائیں۔ لوٹن کبوتر کی طرح لوٹنے لگو۔

نقل ہے کہ ایک صاحب نے اپنے غلام کو کہ صاحبِ طبع لطیف و بذلہ سنج تھا حکم دیا جا کر بازار میں تاک لگا کے شاگرد انگور ہاتھ آئے تو فوراً خرید لائے۔ غلام نے ایک دلبر میوہ فروش ستمگار دستم کوش کی دکان سے کئی خوشے خریدے اور مراجعت کرتے ہوئے خراماں خراماں آقا کے پاس لے گیا وہ نہایت ہی بد دماغ ہوئے فرمایا کہ ذرا سا کام اور یہ تاخیر، اتنی دیر میں تو میں لندن ہو آتا، ایسا کاہل دیکھا نہ سنا، خبردار آج سے اگر ایک کام کو بھیجوں تو ہاتھوں ہاتھ چار کام انجام دے لانا۔ غلام نے دست بستہ عرض کیا کہ پیرو مرشد اس مرتبہ معاف فرمائیں انشاء اللہ آیندہ ارشاد واجب الانقیاد کی لفظ بہ لفظ تعمیل ہوگی۔

دوسرے دن خواجہ کسی زبان دراز اور گستاخ کنیزک عشوہ پردار پر ایسے گرمائے کہ تپ چڑھ آئی غلام کو حکم دیا کہ کسی طبیب لبیب کو بلاؤ۔ وہ فوراً گیا اور طبیب کے علاوہ اور چند آدمیوں کو بھی ساتھ لایا۔ خواجہ نے پوچھا کہ یہ جماعت کیسی ہے ہم نے حکم دیا تھا کہ طبیب کو بلاؤ، تم اتنے آدمیوں کو کیوں ساتھ لے آئے؟

غلام نے بصد آداب عرض کی کہ خداوندا حضور تو بھول بھول جاتے ہیں ابھی تو کل ہی تاکید اکید کی تھی کہ اگر ایک کام کا ارشاد کروں تو کئی کام بعجلت تمام سرانجام دے لانا۔ الامر فوق الادب، لیجیے آج دم کے دم میں میں نے اتنے کام کیے قدر دانی شرط ہے، حکیم جی کو حسب الحکم حضور بلا لایا کہ تشخیص مرض کر کے معالجہ کریں اور ادھر ہی سے لپکا ہوا گیا مطرب خوش الحان کو ساتھ لایا کہ اگر خداوند عروسِ صحت سے ہم آغوش ہوں تو قوال کی خوش آوازی اور ناخن بازی سے بزم طرب آراستہ ہو، غسال کو بھی لیتا آیا کہ زندگی کا کیا بھروسہ اگر پیک اجل حضور کو خلد علیین کی سیر دکھائے تو غسال جھٹ پٹ غسل دیدے۔ ادھر سے ایک شاعر جادو بیان اور طلیق اللسان کو ہمراہ لیا کہ مرثیہ موزوں کرے۔ اب باقی کون رہا۔ گورکن۔ وہ بھی بات کی بات میں آن موجود ہوگا مطمئن رہیے۔ اب انصاف میرے آقائے نامدار کے ہاتھ ہے، غلام نے انعام ہی کا کام کیا ہے۔ آیندہ اختیار بدستِ مختار۔

بحرِ عشق کی طغیانی اور قلزمِ جنوں کی روانی

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

اس گلزارِ لالہ زار سراپا بہار نے میاں آزاد کی آتشِ عشق کو اور بھی بھڑکا دیا کبھی چشمِ مست کی یاد میں نرگسِ شہلا سے آنکھ لڑائی، سرو کو دیکھا، بوٹا سا قد آنکھوں میں پھر گیا شمشاد نظروں سے گر گیا۔ گلِ رعنا کی دید سے گلِ رخسار کا خیال بندھا۔ الغرض اضطراب و بے قراری نالہ و شیون آہ و زاری دن دونی رات چوگنی ترقی پاتی تھی ؎

بے گلعذار جا کے گلستاں میں کیا کیا
ہاں یہ کیا کہ داغِ کہن کو نیا کیا

عین حالت انتشار و ہجوم و افکار میں یہ سوجھی کہ اب بیابان کی راہ لو۔ دل مثلِ برق بیقرار تھا۔ آخر کار باغ کی دیوار پھاند کر یہ جادہ جا۔ راہ میں سوچتے جاتے ہیں کہ اگر وہ گل اندام ملے تو پھولے نہ سماؤں باغ باغ ہو جاؤں، جو ملتا ہے اس سے کوئے یار کا پتہ پوچھتے ہیں وہ ہوا بتاتا ہے قہقہہ اڑاتا ہے اور بھانپ جاتا ہے کہ جنوں کی امنگ اور عشق کی ترنگ ہے کبھی خنداں کبھی گریاں آنکھیں اشکبار و لب پر عاشقانہ اشعار ؎

کوچۂ یار میں چلئے تو غزل خواں چلئے
بلبلِ مست کی صورت سے گلستاں چلیے

یہ اپنی دھن میں ناک کی سیدھ پر چلے جاتے تھے آنکھ جھپکنے کی دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک نئے محلے میں پہنچے۔ چو طرفہ سناٹا، ہو کا عالم، جانور نہ آدم گتے تک دبکے پڑے ہیں، کوئی منکتا ہی نہیں۔ دروازے افیونیوں کی آنکھ کی طرح بند۔ حیرت تھی کہ یا للعجب اچھے شہر خموشاں میں گذر ہوا جہاں ہر کوئی دیوار ہے، اتنے میں ایک دروازہ کھلا اور پانچ سات سفید پوش بھر بھرا کر نکل پڑے تو وہ شور۔ وہ غل کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں اپنی اپنی سب گاتے ہیں۔ کوئی پورب گیا کوئی پچھم۔ ایک صاحب نے میاں آزاد کو دیکھا، تو تعجب ہوا کہ یہ اجنبی اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے۔

بزرگوار۔ کون۔ آپ کون صاحب ہیں؟

آزاد۔ ہم کوئی ہیں آپ اپنی کہیئے!

بزرگوار۔ اجی حضرت آپ تیکھے کیوں ہوئے جاتے ہیں، میں سیدھی بات کرتا ہوں آپ ٹیڑھے ہوتے ہیں ابھی برقنداز[1] دیکھ لے تو کوتوالی کا چبوترہ ہی دکھائے۔

آزاد۔ برقنداز کی ایک ہی کہی۔ برقندازوں سے تم ایسے قمار بازوں کو خوف ہے یا ہم کو۔ یہاں تھانہ دار کا خوف نہ حوالدار کا ڈر۔

بزرگوار (دل ہی دل میں) اچھے بیڈھب آدمی سے مڈبھیڑ ہوئی ہاری مانتا ہے نہ جیتی، اپنی ہی سی کہے جاتا ہے (آزاد سے) یا حضرت اک ذرا سی بات کو آپ نے کتنا طول دیا قسم لیجیئے جو میں نے آپ کو چور بنایا ہو صرف اتنا پوچھا کہ حضور کہاں تشریف لیے جاتے ہیں بس اتنی سی بات پر آپ بگڑ اٹھے لگے بے نقط سنانے۔

آزاد۔ خیر اگر بندے ہی کا قصور ہے تو معاف فرمائیے مگر خدا کے لیے اتنا ضرور بتائیے کہ اس گھر میں کون کون ذات شریف جمع تھے۔

بزرگوار۔ ذات شریف! سبحان اللہ! خوب پہچانا آپ نے قبلہ یہ سب شریف زادے تھے۔ اہل علم، عالی خاندان معالی دودمان، لائق فائق، بذلہ سنج، خوش فکر، تربیت یافتہ، دن بھر اپنے اپنے کام میں رہتے ہیں۔ شام سے آدھی رات تک یہاں جمتے ہیں۔ چوسر شطرنج، گنجفہ، چہل، مذاق، اپاڑگی یہی عیش زندگی ہے۔

آزاد۔ کیوں حضرت بھلا کوئی اور شغل بھی رہتا ہے؟ بزرگوار۔ اور کیا چانڈو پیتں سبزی اڑائیں۔ افیون گھولیں تاڑی منگائیں۔ دس پانچ سن بیٹھے خوش گپی ہونے لگی۔ یاروں جوری نہ پہل وفا بازی۔ آزاد۔ خدا کی مار ایسے اشتغال بیہودہ پر ——!

---

[1] یعنی جنبش بھی نہیں کرتا۔ [2] سپاہی

رنگے سیار

میاں آزاد زلفِ پریشاں کی یاد میں رات بھر خواب پریشاں دیکھا کیے۔ تڑکے خوابِ خرگوش سے بیدار ہوئے تو پھر سنیچر پاؤں پر سوار ہو گیا۔ دوپہر تک بے آب و دانہ ہر دم خیال وصل جانانہ۔ دوپہر ڈھلے ایک قصبہ میں پہنچے پیپل کے پیڑ کے سایہ میں بستر جمایا۔ سبزۂ بیگانہ کو اپنا مسکن بنایا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے ذرا دِل کو ڈھارس ہوئی، پاؤں پھیلا کر لمبی تانی تو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔ جب خوب نیند بھر کر سو چکے تو ایک مرد آدمی نے جگا دیا، اِلا اللہ کہہ کر اُٹھ بیٹھے۔ وحشت کسی قدر دور ہو گئی تھی مگر پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ سامنے اندارے[1] پر ایک گلبدن سیم تن عورت عجب نزاکت سے پانی بھر رہی تھی، حضرت بھی پہنچے۔

آزاد۔ کیوں نیک بخت ہمیں اک ذرا سا پانی نہیں پلاتیں؟

سیم تن (جواب ندارد) تیکھی چتون سے بھرپور نظر ڈالی۔ مگر قہر کی بھری ہوئی۔

آزاد۔ سخی سے شوم بھلا جو ترنت[2] دیوے جواب۔ بیوی پانی پلاؤ یا ٹکا سا جواب دو۔ یہ قصبہ تو اپنے حق میں دشتِ کربلا ہو گیا، ایک بوند پانی کو ترس ترس گئے۔ اب تو آب خنجر کی چاہ ہے، ایک دفعہ دزدیدہ نگاہ سے پھر دیکھ لو تو پانی بھی نہ مانگوں۔

سیم تن۔ (لب تک نہ ہلے۔ سکوت مگر ایک ناز معشوقانہ سے ظرف سیمیں بھر کر پانی لے چلی)

میاں آزاد کو حیرت تھی کہ یہ کمسن نازنین یہاں ویرانے میں اس کا کیا کام۔ سائے کی طرح ساتھ ہو لیے، وہ کنکھیوں سے دیکھتی جاتی تھی مگر مُنہ نہیں لگاتی تھی۔ بارے سڑک سے دائیں ہاتھ پر ایک خوشنما پھاٹک کے قریب وہ گلفام سیم اندام ٹھہر گئی۔ ظرفِ سیمیں کو دوسرے ہاتھ میں لیا اور پیڑ کے سائے میں بیٹھ کر سستانے لگی۔

آزاد۔ ہم بھی ہمراہ رکاب ہیں۔ ہم تاڑ گئے کہ نزاکت کے مارے یہ ہلکا پھلکا برتن ہی پہاڑ ہو گیا۔ اشارے کی دیر ہے ذرا لب ہلاؤ تو ہاتھ بٹا لوں۔

اُس ناطورۂ طاؤس زیب و عابد فریب نے پھر اس برتن کو بڑی کوشش سے اُٹھایا اور پھاٹک کے اندر ہو رہی میاں آزاد چپکے چپکے خود بھی پھاٹک میں دبے پاؤں اس گلعذار کے پیچھے پیچھے گئے۔ وہ رعنا شمائل ایک کھلے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں جا بیٹھی۔ میاں آزاد ایک روش میں دبک رہے گو شیطان ورغلاتا تھا کہ چل کر زلفِ چلیپا کی بلائیں لیں مگر تہذیب مانع تھی، جی بھر بھر آتا تھا مگر قدم آگے نہیں بڑھتا تھا۔

اب اُس فرح بخش و دلکشا مقام کا ذکر سنیے۔ چوطرفہ کھائی کھدی ہوئی آٹھ آٹھ گز گہری۔ بڑا عالیشان محرابدار پھاٹک لگا ہوا ہے۔ روشوں پر سرخی کٹی تھی، اشجار پُر بہار گویا آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ کہیں انار کی قطار کہیں لکھوٹ[3] کی بہار ادھر انبہ لذیذ و شیریں اُدھر امرود و حلوائے بے دود چکوتروں اور مہتابیوں سے ٹہنیاں پھٹی پڑتی تھیں۔ نارنگی اور میٹھے شاخوں پہ لدے تھے۔ پھولوں کی بو باس کہیں گل مہندی، کہیں گل عباس۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ اُودی اُودی گھٹا۔

---

[1] اندارا۔ بڑا کنواں ۔ [2] ترنت۔ فوراً۔ [3] ایک قسم کا پھل۔

کلیوں کی چٹک، جوہی کی بھینی بھینی مہک۔ وسط باغ میں ایک تین فٹ کا اونچا پکا مربع چبوترہ بنا ہے اور ایک کونے میں چھوٹا سا خوشنما بنگلہ ہے۔ اغل بغل دو ایک صاف ستھری کوٹھریاں۔ یہ تو سب کچھ ہے مگر مکین کا پتہ نہیں۔ اس سیم تن کی چال ڈھال اور طرز نشست سے اجنبیت برستی تھی۔ حیرت تھی کہ اس باغ لطافت باس کے مکین سلیقہ شعار کہاں چھپ رہے۔

انھوں نے دیکھا کہ وہ بُتِ طناز سرمایۂ ناز ظرف سیمین زمین پر پٹک کر ایک نواڑ کی نازک پلنگڑی[1] پہ سو رہی۔ اب تو اُن کو خوب ہی موقع ملا، اُٹھے اور میوۂ تر جس قدر جی چاہا خوب چھک کر کھائے اور اس ظرف سیمین کو منہ سے لگایا تو ایک ایک قطرہ پی گئے۔ اتنے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میاں آزاد جھٹ انگور کی ٹٹی میں چھپ رہے مگر تاک لگائے بیٹھے ہیں کہ دیکھیں ہے کون۔ دیکھا تو پھاٹک کی جانب سے کوئی آہستہ آہستہ آ رہا ہے۔ قریب آیا تو اُنھوں نے بغور نظر ڈالی۔ ایک کشیدہ قامت لیم و شحیم ڈنڈ پیل لنگوٹ باندھے اکڑتا اینڈتا اس بنگلہ کی طرف جاتا ہے سمجھے کہ کوئی پہلوان کشتی کھیل کے اپنے اکھاڑے سے واپس آتا ہے۔ قریب آیا تو یہ گمان دور ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی شاہ جی ہیں، وہ چٹ لنگوٹ جس سے پہلوان کا دھوکا ہوتا تھا۔ تہ بند نکلا۔

شاہ صاحب سیدھے بنگلے میں داخل ہوئے۔ سیم تن کو پلنگڑی پر سوتا پایا، ایک دفعہ ہی پلنگڑی پہ ہاتھ مار کر چلا اٹھے۔ وہ زن رعنا شمائل گھبرا کر اُٹھ بیٹھی، اٹھتے ہی قدم لیے، شاہ جی نے فرط شفقت سے اس کی جبین نورانی اور چین پیشانی پہ بوسہ دیا اور ایک تپائی پہ بیٹھ کر یوں تقریر کرنے لگے۔

شاہ جی۔ بیٹی! آج تم کو ہمارے سبب سے بہت راہ دیکھنی پڑی۔ ایک گاؤں میں یہاں سے دس کوس پہ ایک راجہ رہتا ہے مگر اسّی برس کا ہو گیا۔ اللہ نے اسے لڑکا دیا نہ لڑکی۔ ایک دن مجھے بلوایا، میں کہیں جاتا آتا تو ہوں نہیں۔ وہ رانی کو لے کر آپ آیا، قدموں پہ گر پڑا۔ میں نے رانی کے سر پہ ایک گلاب کا پھول بن سونگھا دے مارا، پانچویں ہی مہینے اللہ نے لڑکا دیا۔ راجہ میرے پاس دوڑا آتا تھا کہ میں راہ میں ملا۔ دیکھتے ہی مجھے رتھ پہ بٹھا لیا۔ کہتا ہے روپیہ لو جاگیر لو، گاؤں لو، ہاتھی گھوڑے لو۔ مگر میں کب مانتا ہوں۔ اس وقت پیچھا چھوٹا۔ تم پانی لائی ہو گی تو میں پھونک دوں گا جس میں تم نامحروم نہ رہو۔

سیم تن۔ میں آپ کی لونڈی ہوں یہی کیا کم ہے کہ آپ کی زیارت نصیب ہوئی، پانی وہ رکھا ہے آپ پھونک ڈال دیں تو میں رخصت ہوں۔ یہ کہہ کر سیم تن اُٹھی دیکھا تو ظرف موجود مگر پانی ندارد۔ ایں یہ پانی کیا ہوا۔ زمین کھا گئی آسمان کھا گیا

ابھی پانی دیکھتے ہی دیکھتے اُڑ گیا۔ ہے ہے شاہ صاحب آپ کے پاس میں جھوٹی نہیں۔ میری بڑی کرکری ہوئی۔ زمین پھٹ جائے تو میں دھنس جاؤں۔ اے لو غضب خدا کا ایک بوند تک نہیں۔ اللہ جانتا ہے لبالب بھرا ہوا تھا۔

شاہ جی۔ بتا ہی دوں۔ اچھا اب بےچین نہ ہو۔ مجھے اشراق سے معلوم ہو گیا کہ تم آتی ہو جب تم سو رہیں تو میں نے آنکھ بند کی اور یہاں پہنچ گیا، پانی پیا پھر آنکھ بند کی اور راجہ کے پاس ہو رہا۔ پھونک ڈالنے کی ساعت اسی وقت تھی۔ ٹل جاتی تو پھر ایک مہینے پہ بات جاتی۔ اب تم یہ الائچی لو اور کل آدھی رات کو کسی مرگھٹ میں دفنا دو بس مطلب حاصل ہو جائے گا۔

سیم تن نے الائچی لی اور اسی دم واپس گئی۔ میاں آزاد چپکے چپکے سب سن رہے تھے اب انھیں خوب ہی معلوم ہو گیا کہ شاہ جی رنگے سیار ہیں۔ سوچے کہ شاہ جی کی قرار واقعی مرمت کر دینی چاہیئے۔ اتنے میں شاہ صاحب لے ایک صاف شفاف چبوترے پہ لنگی بچھائی اور اس پہ دوزانو ہو کر مناجات پڑھنے لگے۔ شاہ جی بڑے سوز و گداز سے لہرا لہرا کر حضرت نظامی گنجوی علیہ الرحمتہ والغفران کے کلام معجز نظام کا خون اپنی گردن پر لے رہے تھے کہ میاں آزاد سے نہ رہا گیا ایک ہی دفعہ بول اٹھے کہ دیا دہشت تیرا ہی

---

[1] چھوٹا سا پلنگ۔

آسرا ہے) اب تو شاہ جی چکر میں آئے ۔ یہ آواز کس نے کہا ۔ اِدھر اُدھر دیدے پھاڑ کر دیکھا۔ مگر آدم نہ آدم زاد۔ ڈرے کہ کوئی بلائے ناگہانی یا آفتِ آسمانی ہے رونگٹے کھڑے ہو گئے، بدن تھرتھرانے لگا، ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کشف و کمال سب بھول گئے۔ بلا کی آیتیں پڑھنا شروع کیں۔ آخر میں بآواز بلند چلّا اُٹھے کہ (یا مظہر العجائب) اِدھر یہ بول اُٹھے ولنگی مع شاہ جی غائب، اب شاہ جی کی گھبراہٹ کا حال نہ پوچھئے۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ دم بخود میاں آزاد نے بھانپ لیا کہ شاہ صاحب پر رعب چھا گیا۔ جھٹ نکل کر تپوں کو خوب پاؤں سے کھڑکھڑایا۔ شاہ جی کانپ اُٹھے۔ آزاد نے بہ لحن داؤدی خاص اہل عجم کے لہجے میں ایک غزل پڑھی۔ اور اپنی شریلی آواز سے اس حقانی غزل کو گایا کہ کندۂ ناتراش تک کو وجد آیا۔ شاہ جی مست ہو گئے سمجھے کہ کوئی درویش باکمال آنکلے۔ اب تو جان میں جان آئی۔ میاں آزاد کے قدم لیئے اُنھوں نے پیٹھ ٹھونکی۔ شاہ جی اس وقت دو آتشہ شراب اُڑائے ہوئے تھے۔ نشہ کی ترنگ میں خیال بندھ گیا کہ کوئی آسمان سے اُترا ہے۔

آزاد۔ کیستی واز کجائی وبا منت چہ کار ست۔ سکوت تاکے ما اسمک انت ایچ ادستید؟

شاہ جی کے رہے سہے حواس اور بھی غائب ہو گئے۔ زبان سمجھ میں نہ آئی سمجھے کہ بیشک فرشتۂ آسمان ہے ہماری روح کو قبض کرنے کو نازل ہوا۔ دبے دانتوں فرماتے کیا ہیں کہ میں علم سے نامحرم ہوں گا۔ سمجھتا نہیں ہوں گا کہ آپ اس وقت کیا حکم دیتے ہیں۔ ہم نے بہت گناہ کیے اب ماف (معاف) فرماؤ۔

آزاد۔ یہ پیرانہ سالی اور یہ بد اعمالی۔ یہ سن و سال اور یہ چال ڈھال۔ یاد رکھ کہ قعرِ جہنم میں پڑے گا اور نارِ دوزخ میں جلایا جائے گا، سُن! فرشتۂ آسمانی و ملک روحانی ہیں حکیم بلنیاس کی روح پاک عالم ہوں حکیم ہوں خدا ترس ہوں رحیم ہوں ملکوتی صفات ہوں صاحب طلسمات و نیرنجات ہوں۔ تیری ناواقفیت کے سبب سے تجھے میں نے چھوڑ دیا لیکن اب آپ نے یہ نیا ہتھکنڈا سیکھا کہ اس زن جادو جمال زہرہ تمثال کو پھانسا اور اس سے کچھ اینٹھنا چاہتے تھے وہ اس زمانہ میں میری منکوحہ اور مطیعہ بیوی تھی۔ سے اب یہ ہتھکنڈے چھوڑو مکر و ریا سے منہ موڑو، ورنہ تم ہو اور ہم۔ ابھی ابھی ٹھیک بناؤں گا اور ناچ نچاؤں گا!

رندانِ مے آشام اور مہوشانِ نازک اندام

گھٹا کالی کالی دھنک لال لال — کنھیا کے ابرو پہ جیسے گلال
سیہ ابر مغرب سے ایسا اٹھا — میں سمجھا کہ کعبہ کا پردہ اٹھا

آزاد خانہ برباد مستانہ وار جھومتے چلے جاتے تھے کہ ایک کمرے سے آواز آئی۔ اتنی ارج موری مان (اتنی عرض میری مان)، بوہو بوہو تھوڑی تھوڑی پھوہار سبزۂ نو دمیدہ کی بہار۔ ننھی ننھی بوندیں۔ ابر طرب خیز نسیم سحری مشک بیز۔ تڑکے کا وقت اس صدائے خوش آہنگ کے سنتے ہی میاں آزاد نے اسی جگہ ایک کیاری میں بستر جمایا۔ اتنے میں اس کمرے سے قہقہے کی آواز آئی اور دس پانچ آدمیوں نے گردن نکال کر میاں آزاد کو دیکھا۔

ایک۔ حضرت یہ خانہ بے تکلف ہے بسم اللہ تشریف لائیے! میاں آزاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دوڑ کر کمرے میں داخل۔ ایک سجے سجائے کمرے میں بزم طرب آراستہ اور محفل سرور پیراستہ ہے۔ چاندنی وہ صاف بچھی ہے کہ چاندنی بھی شرمائے اور دھرے کی گلابیاں چنی ہیں۔ سحر کاذب کے وقت جب پپیہا بولنے لگا اور نسیم سحری مشک و عنبر سے بسی ہوئی بہشت کی لپٹیں لانے لگی تو کہروے کی فرمائش ہوئی۔ زلفیں پریشان، مست و خوش الحان سب حاضرینِ جلسہ شاداں و فرحاں مگر حضرت آزاد آزردہ و گریاں۔ اتفاق سے اُس تخلیئے کی صحبت میں ایک خواجہ صاحب کا بھی گزر تھا اور وہ بیچارے نئے پنچھی تھے۔ میاں آزاد کے بشرے سے تاڑ گئے کہ اس صحبت سے حضرت بہت کبیدہ خاطر ہیں۔

خواجہ۔ قبلہ یہ دیکھئے واللہ ہے کہ میں بھی گھبرا اُٹھا۔ جو ہے مست۔ جو ہے رند خرابات۔ جو ہے پھکڑ۔ یہ دیکھئے واللہ ہے کہ آپ کے چہرے کی رنگت سے بھانپ لیا کہ اتنی محفل میں ایک یہ ہیں۔ یہ دیکھئے واللہ ہے کہ یار لوگوں نے تڑاکا کر دیا۔ مگر آنکھ تک نہ جھپکی دیدے پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔

آزاد۔ جی ہاں اور ابھی کوئی نیک کام کرتے ہوتے تو چراغ جلے ہی سے پڑ رہتے۔ ایک جو منکتا مگر اس تھرکنے اور چمک دمک کے قربان کہ چار پہر بیٹھے ہی بیٹھے کاٹ دیئے۔

خواجہ۔ یہ دیکھئے واللہ ہے کہ یہ جتنے حضرات نظر آتے ہیں سب شرفا کے صاحبزادے ہیں۔ نصف تو امرا کے لڑکے ہیں، دال روٹی سے خوش، باقی ماندہ مفلس۔ ٹکا کفن کو پاس نہیں مگر بانکپن پر جان دیتے ہیں۔ گھر میں فاقہ ہے لیکن اکڑتے نکلتے ہیں۔ پڑھنا لکھنا نلاش معاش کی دُھن میں پرستا لنگوٹی میں پھاگ کبھی رنگ کبھی راگ۔

آزاد۔ حضرت مجھے تو ان کی صورت سے نفرت ہو گئی۔ بس چلے تو کھڑے کھڑے شہر بدر کرا دوں۔

صبح کی نوبت بجنے لگی، مرغ نے بانگ لگائی، شوالے کا گھنٹا ٹھناٹھن بجنے لگا، موذن نے مسجد میں اللہ اکبر کہنا شروع کیا۔

منشی سحر ہاتھ میں لے کے قلم زر — لکھنے لگا منصوبی و معزولی لشکر
لے فردِ سیہ شب کو کیا خارج دفتر — معتوب ہوا عاملِ روز اپنی جگہ پر
محتاب پہ جاری تھا قلم امر و نہی کا — پروانہ چراغوں کو ملا برطرفی کا

شمع گل، گجردم غائب، میاں آزاد اس صحبت رنداں مے آشام سے ایسے ناراض ہوئے کہ بلا رخصت بھاگ گئے، اجی حضرت! اجی حضرت سنیئے تو سہی، لیجئے تو سہی۔ واسطے خدا کے پیچھے پھر کے نہ دیکھئے تو جنت سے نکالا جائے۔ وہ سنتے کس کی ہیں۔ یہ جا وہ جا!

لکھنؤ کا محرّم الحرام

سینوں میں جگر بہ تیرِ غم چلتے ہیں　　رخساروں پہ اشک شمع ساں ڈھلتے ہیں
کیوں تعزیہ خانوں میں نہ رونق ہو زیادہ　　دل بھی تو چراغوں کی طرح جلتے ہیں

میاں آزاد سیلانی آدمی سیر سپاٹے پر اُدھار کھائے ہوئے صحرا گشتی کی دھن جو سمائی تو ریل کے انجن کی طرح چل کھڑے ہوئے اور سوچے کہ چل کے محرم لکھنؤ کا دیکھ لیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گھر گھر شیون و شین، گھر گھر بکا و بین مگر یہ وزاری اشکباری جم غفیر مجمع کثیر۔ ایک جلسے تن بول اُٹھے اور کیوں نہ ہو مجالس عزا کی دھوم دھام ہے۔ لکھنؤ کا محرم الحرام ہے۔ لکھنؤ کی سوز خوانی، لکھنؤ کی خوش بیانی۔ لکھنؤ کی عزاداری۔ لکھنؤ کی سوگواری از شام تا دم مشہور رہر مرز و بوم ہے۔ تعزیہ خانوں میں دھوم، امام باڑوں میں ہجوم ہے، اور ان سب میں حسین آباد مبارک کالبدر فی النجوم ہے۔ آزاد کے ساتھ ان کے ایک دوست بھی ہو لیے تھے ان کی بیقراری کا حال کچھ نہ پوچھیئے، وہ لکھنؤ سے واقف نہ تھے لوٹے جاتے ہیں کہ شہید کربلا کا واسطہ، آلِ مصطفیٰ کا صدقہ ہمیں لکھنؤ کا محرم دکھا دو۔ مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔

ایک شخص نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا کہ میاں اب وہ لکھنؤ کہاں، وہ لوگ کہاں وہ دل کہاں لکھنؤ کا محرم رنگینیے پیا جان عالم کے وقت میں دیکھتا تو رانی گوئے اوج طور پر بھی غش کر جاتا، بانکوں کی شمشیر دو پیکر جب دیکھو میان سے دو انگل باہر کسی نے ذرا تیکھی چتون کی اور انھوں نے کھٹ سے سر دہی کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا، بھنڈار کھل گیا۔ ایک ایک گھنٹوں میں بیس بیس خانہ جنگیوں کی خبر آتی تھی۔ دکاندار جوتیاں چھوڑ چھوڑ کر سٹک جاتے تھے۔ وہ دھکم دھکا وہ بھیڑ بھڑکا ہوتا تھا کہ واہ جی واہ، انتظام کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔ ادنیٰ ادنیٰ آدمی ہزاروں لٹاتا تھا۔ اب کوئی بھی نذر حسین نہیں نکالتا۔

اب انیس ہیں نہ دبیر، مونس ہیں نہ شبیر، ضمیر ہیں نہ دلگیر ؎

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے　　اس باغ سے کیا کیا گلِ رعنا نہ گئے
تھا کونسا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں　　وہ کون سے گُل کھلے جو مرجھا نہ گئے

دبیر مبرور کی تربت کو خدا عنبریں کرے واللہ خدائے سخن تھا ؎

مدّاح امیرا ابن امیر آتا ہے　　دربار میں شاہوں کے فقیر آتا ہے
مشتاق سخن، خلق چلی آتی ہے　　لو مرثیہ پڑھنے کو دبیر آتا ہے

اور انیس مغفور کو خدا بخشے باللہ العظیم کلام کیا جواہرات کے ٹکڑے قند و نبات کے ریزے لوہ کے مرثیہ میں ع

جو ہر شناس ہے تو انہیں موتیوں میں تول

فصحائے خطۂ پاک ایران تک کہتے ہیں کہ کجا انیس کجا فردوسی کجا کمر بند مرصع کجا شال طوسی۔ بزم میں وہ ڈھنگ رزم میں وہ رنگ کہ :-

مضمون انیس کا نہ چربا اُترا　　اُترا بھی تو کچھ بگڑ کر نقشا اُترا

نقاش نے سو طرح کی خفت کھینچی   تصویر نہ کھنچ سکی تو چہرا اُترا

لیکن ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تک، اب بھی اس شہر کی ایسی عزاداری ہفت اقلیم میں نہیں ہوتی۔ نجف اشرف، کربلا، کاظمین، میر باقر کے امام باڑے۔ چوٹیاں جہاں چلو داخل حسنات ہو۔ رنگ رلیاں مناتے پو قدمے چلے جاتے تھے۔ راہ میں وہ بھیڑ وہ ریل پیل کہ عیاذاً باللہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ غریب و امیر برناؤ پیر اُمڈے چلے آتے ہیں۔ جدھر دیکھو نرالی سج دھج۔ مومن پاک مثل کعبہ سیاہ پوش۔ کوئی ماتم حسین میں برہنہ سر چلا جاتا ہے۔ حسینان عنبرین مو اور مہ جبیناں قوس ابرو کی مستانہ چال، ماتمی پوشاک، بکھرے ہوئے بال۔ واہ وا وہ ناز دہ نگاہ غلط انداز وہ چھپ چھپ کر کترا جانا۔ کبھی لجانا کبھی مسکرانا۔ بے فکروں کی سو سو چک پھیریاں۔ تماشائیوں کی زور آزمائیاں، عاشق تنوں کی گھاتیں، رمز و کنایہ کی باتیں۔

پیچھے آغا باقر کے امام باڑہ میں کھٹ سے داخل۔ ادہو ہو ہو خدا کی قدرت مجسم نظر آتی ہے۔ واہ میاں باقر کیوں نہ ہو نام کر گئے، چکاچوند کا عالم ہے لیکن گلی تنگ۔ تماشائیوں کی عقل دنگ، مگر خلقت گھس پیٹھ کر دیکھ ہی آتی ہے۔ ناک ٹوٹے یا سر پھوٹے آغا باقر کا امام باڑہ ضرور دیکھیں گے۔ وہاں سے جو طرارہ بھرا تو کچے پل پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پیر فرتوت دقیانوس کے ہمعصر بیٹھے اگلے وقتوں کے لوگوں کو رو رہے ہیں، واللہ لکھنؤ کے کمہار بڑے نادرہ کار ہیں۔ ایسا بڈھا بنایا کہ معلوم ہوتا ہے پوپلے مُنہ سے اب بولا اور اب بولا، وہی سن کے سے بال۔ وہی سفید بھویں، وہی چتون، وہی پیشانی کی شکن، وہی ہاتھوں کی جھریاں، وہی کمر خم، وہی سینہ جھکا ہوا۔ واہ رے کاریگر۔ تو بھی اپنے فن میں یکتا ہے۔ وہاں سے جو چلے تو داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم کے امام باڑہ میں آئے۔ یہاں سورج مکھی پر وہ جوبن تھا کہ آفتاب اگر ایک نظر چھپ چھپا کر وہ نور دیکھ پاتا تو مارے غیرت کے بحر ظلمات میں غوطے کھاتا۔ بے تکلف کرسیوں پر جا ڈٹے اہلکارانِ سلیقہ شعار نے الائچی چکنی ڈلی پیشکش کی۔ وہاں سے حسین آباد مبارک میں پہنچے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ یہ امام باڑہ ہے یا روضۂ رضوان۔ الٰہی یہ مکان ہے یا باغ جناں۔ ہر در و دیوار سے محمد علی شاہ فردوس آرامگاہ کا نام روشن ہے۔ امام باڑہ سجا سجایا دلہن کا ایسا جوبن ہے بُرجوں پر ضیائے مو فور منار نورٌ علیٰ نور حیرت تھی کہ یہ کوہ ہے یا شعلۂ طور۔

اب ان کے دوست کو شوق چرایا کہ ارباب نشاط کے امام باڑوں کی زیارت کریں، پہلے تو میاں آزاد جھجکے۔ اے حضرت خدا خدا کیجیے بندہ ایسی جگہ نہ جانے کا۔

دوست۔ بھئی واللہ کتنے روکھے پھیکے آدمی ہو۔ ارے میاں حیدر کی نازک آوازی مشتری کی جادو طرازی۔ گوہر کی چمک دمک آبادی کی رخ انور کی جھلک سے کانوں کو سرور آنکھوں کو نور نہ حاصل ہوا تو لکھنؤ کا محرم کیا خاک دیکھا اور پیر و مرشد خدا اور خدا کا رسولؐ آگاہ ہے کہ انھیں دس دن تو مزے سے جہاں چاہیے رنگین کمروں پر دو گال ہنس بول آئیے۔ بچے اور بوڑھے سب پہنچتے ہیں۔ مضمون واحد ہے۔

آزاد۔ یہ کہیے تو خیر۔ چلیے بندہ بھی ٹو مل کر شہیدوں میں داخل ہو جائے۔ پہلے گوہر کے یہاں پہنچے۔ اللہ اللہ دماغ عرش بریں پر ہے۔ اچھے اچھے رئیس زادے رفیقِ یہ معاشرت کر رہے ہیں۔ ایک مالدار جوہری صاحب مشکتے ہوئے آئے دس روپیہ کی کارچوبی ٹوپی زیب سر۔ فالسی اطلس کا فوق البھڑک دگلہ زیب بر سنہری لیس ٹکی ہوئی۔ خاصے مرغِ زریں بنے ہوئے۔ خدمتگار کے کاندھے پر زرنگاری دوشالہ۔ یہ وضع قطع، مگر بیٹھتے ہی ٹوکے گئے۔ بیٹھے تو ضریح کی طرف پشت کرکے۔ صاحب خانہ نے

۱، ۲، ۳، ۴ لکھنؤ کے مقامات عزا۔ ۵ لکھنؤ کا ایک محلہ ۶ طوائف۔ ۷ ایک پل کا نام۔ ۸ فرمانروائے اودھ۔ ۹ یہ رنڈیاں محرم کے زمانہ میں پیشہ سے تائب رہتی ہیں۔ عزاداری کی بڑی پابند ہیں اور ہر شخص آ جا سکتا ہے۔ ۱۰ کوٹ (اندر روئی بھری ہوئی) ۱۱ تعزیہ۔

ایک عجیب ادائے دلربا سے جھڑک دیا۔ اے واہ بڑے خوش تمیز ہو ضریح مبارک کی طرف پشت، سیدھے بیٹھئے آدمیت کے ساتھ۔

جوہری۔ ماجلا (معاذاللہ) بیوی مجھے بیٹھنا نہیں آتا۔

میاں آزاد نے چپکے سے دوست کے کان میں کہا۔ لاحول ارے میاں یہ با اینہمہ ٹیم ٹام[1] گھڑکے گئے اور ذرا چیں بجبیں نہ ہوئے، پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔

دوست۔ بھائی جان۔ گوہر جانِ لکھنؤ، شانِ لکھنؤ، آن بانِ لکھنؤ، روحِ روانِ لکھنؤ ہے، رگ رگ میں شوخی ؎

قدو قامت آفت کا ٹکڑا تمام — قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

ایسا خوش قسمت کوئی ہو تو لے کہ اس بت عربدہ جو کی گھڑکی[2] سہے حاضرین ادب سے گردن جھکائے بیٹھے ہیں جسے دیکھو دزدیدہ نگاہ سے محو نظارہ بازی ہے لیکن رعب حسن سے بات کرتے کلیجہ لرزتا ہے۔

یہاں سے درد کی طرح اُٹھے تو فرنگی محل[3] میں حیدر جان کے یہاں پہنچے ؎

نکلے خیمہ سے جو ہتھیار لگائے عباس — چڑھ کے رہوار پہ میدان میں آئے عباس

اس سوز کو ایسی نازک آوازی سے سارنگ کی مانجھ میں ادا کیا کہ سامعین لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے۔ راگ اور راگنی تو اس کی لونڈیوں کا نام ہے، ادھو ہو ہو کی صدا ہر در و دیوار سے بلند تھی۔ واللہ کیا پیارا گلا پایا ہے۔ میاں آزاد کی باچھیں کھلی جاتی تھیں اور گردن تو گھڑی کا کھٹکا ہو گئی تھی۔

اب پھدک کر بی منجھو مشتری کے کمرے پر پہنچے۔ ان کی لفاظی، اُن کی جادو طرازی، اُن کی خوش بیانی، ان کے طرز سوز خوانی کی دھوم ہے۔ ارباب صافی مذاق کا ہجوم ہے کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے ع

خنجر جو بوسہ گاہِ پیمبر پہ چل گیا

اس کو جھنجھوٹی کی دُھن میں اس لطف سے پڑھا کہ سامعین سر دھننے لگے۔

دوست۔ کیوں یار کیا لکھنؤ میں زیور پہننے کی قسم ہے؟

آزاد۔ لاحول ولاقوۃ تم بالکل ہی گنوار ہو۔ ماتم میں زیور کا ذکر۔ لیکن یہ سادگی بھی عجیب لطف دکھاتی ہے چلئے ذرا مجالس عزا کا رنگ ڈھنگ بھی تو دیکھیں۔ نواب باقر خاں بہادر اور داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم اور جناب سید العلما مہر سپہر شرع دینداری سید ابراہیم صاحب اور جناب آغا علی خاں صاحب سابق ناظم کی مجلسوں میں گئے۔ ماتم داران جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا اور زائرین مصائب خامس آل عبا کی اشکباری اور گریہ و زاری سے یقین کامل ہو گیا کہ ماتم داری لکھنؤ پر ختم ہے۔

عاشورہ کی رات تو نچوڑ کا دن تھا۔ آزاد نے لکھنؤ کے محرم کا خوب لطف اُٹھایا۔

عاشورہ کے دن پو پھٹنے کے وقت تعزیہ نکلے۔ رانگے کا تعزیہ۔ جو کا تعزیہ۔ موم کا تعزیہ، کھیلوں[4] کا تعزیہ، روئی کا تعزیہ، پیپل کے پتوں کا تعزیہ۔ انڈوں کا تعزیہ، نوگزہ تعزیہ۔ لاکھوں تعزیے تالکٹورے کی کربلا میں دفنائے جاتے ہیں۔ ارباب نشاط برہنہ سر، برہنہ پا، سیاہ ماتمی پوشاک نے ان کے جوبن کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا لیکن ؎

رومال نہ اشکوں سے بھگونے پائے — منہ آب گہر سے بھی نہ دھونے پائے
کیا جلد ہوا ماہِ محرم آخر — جی بھر کے حسینؑ کو نہ رونے پائے

---

۱ ظاہری شان و شوکت۔ ۲ ڈانٹ۔ ۳ فرنگی محل سے مراد یہاں محلہ ہے، مرکز دینی نہیں۔ ۴ لائی

امیرزادوں کو فکرِ معاش اور نوکری کی تلاش

میاں آزاد صبح منہ اندھیرے تاروں کی چھاؤں میں بسترِ استراحت سے اُٹھے۔ ٹھاں دل میں ٹھان لی، چلو بھئی! ادھر اُدھر کے تو خوب سیر سپاٹے کیے اب ذری عدالت اور کچہری کی بھی دو گھڑی سیر کر آئیں۔ پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک لق و دق باغ ہے اور سہانی چھاؤں میں میلہ سا جمع ہے۔ کوئی حلوائی سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے کہیں خوانچے والا بیٹھا ہے دگلابی حلوا سوہن) مدارپٹے حُقّے ایک سمت تازے کیے جاتے ہیں وہ تڑاقا کہ واہ واہ میں آ تو آ، بہ آ وہ آ۔ آدمیوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ بیسیوں منشی متصدی چٹائیوں پر بیٹھے عرضیاں لکھ رہے ہیں۔ مسنغیث ہیں کہ ایک ایک کے پاس دس دس جھرمٹ کیے بیٹھے قانون چھانٹ رہے ہیں۔ ارے منشی جی یوکا انٹ سنٹ[1] جنگھٹیاں[2] سی کھچا[3] دیہو) ہم تو آپن مجمون تبادت ہیں آؤ[4] تم اپنے اڑھائی چاول الگے[5] چورا وت ہو۔ لے مور[6] منشی جی تنک[7] اس[8] سوچ بچار کر لکھو تاکہ پھر یک ثانی کیا[9] مقدمہ ڈسمسا[10] ئے جائے۔ یہ زبان[11] سنتے ہی میاں آزاد ہنس پڑے گواہ گھر کی طرف جو رُخ کیا تو سبحان اللہ سبز مندیلیں اور فوق البھڑک چغے ہی چغے نظر آتے ہیں۔ دکلاء اِدھر اُدھر بیٹھے مقدمے چکار رہے ہیں۔ پیچھے پھر کر دیکھا کہ ایک دوست کھڑے گلوریاں نبوا رہے تھے۔ جان میں جان آئی، مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ فرطِ ابتہاج سے بول اُٹھے۔ آخاہ آپ ہیں! آیئے کہاں بھول پڑے؟ جی یوں ہی چلا آیا۔ دوست نے کہا آیئے کچہری کے اندر چلیے۔ دو قدم بڑھے تھے کہ چپراسی نے کڑک کر آواز لگائی (سیتا بیگ حاضر ہے) ایک ابھی کے پاؤں لڑکھڑائے۔ سیڑھیوں[12] سے لڑھکتے ہوئے دھم سے نیچے۔ یا علی ایک ٹھٹول[13] نے کہا واہ قبلہ دیکھیے یہ شرط نہ تھی گرے تو مگر بندہ درگاہ سے پوچھ نہ لیا اُٹھے تو یار لوگوں نے گرد جھاڑی۔ اتنے میں ایک اپرینٹس (امیدوار) اور آیا اور کرسی پر ڈٹ گیا۔

امیدوار۔ کہاں سے آنا ہوا؟

دوست۔ جی اسی شہر میں رہتا ہوں۔

امیدوار۔ کچہری میں کھڑے رہنے کا حکم نہیں ہے۔ ہمارے کمرے میں سے آپ جایئے ورنہ چپراسی کو آواز دیتا ہوں۔

دوست۔ بگڑیئے نہیں، بس صرف یہ تو بتا دیجیے کہ آپ کا عہدہ کیا ہے؟

امیدوار۔ ہم امیدواری کرتے ہیں۔ تین مہینے سے روز یہاں کام سیکھتے ہیں اب فرّاٹے اڑاتا ہوں۔ آٹھوں گانٹھ کمیت ڈاکٹ تڑ سے لکھ لوں۔ نقشہ چٹکیوں میں بناؤں۔ کسی کام میں بند نہیں۔ پندرہ روپیہ کی آسامی ہمیں صبح و شام ملا ہی چاہتی ہے مگر پہلے تو واللہ گھانس چھیلنا مشکل معلوم ہوتا تھا اب بقراط بن گیا۔

آزاد۔ کیوں میاں صاحبزادے تمہارے والد کہاں نوکر ہیں؟

امیدوار۔ نوکر! توبہ توبہ کیجیے وہ دس گانوؤں کے زمیندار ہیں۔

آزاد۔ کیا تم کو گھر سے نکال دیا یا عاق کر دیا۔ یا کچھ کھٹ پٹ ہے۔

---

[1] بے تکی۔ بے معنی [2] لکیریں [3] دیتے ہو [4] اور [5] الگ [6] میرے [7] ذرا [8] ایسا۔ اس طرح [9] کا [10] ڈسمس ہو جائے [11] یہ دیہاتی زبان کا نمونہ ہے۔ [12] سیڑھی [13] مسخرہ۔

امیدوار۔ ہم ہونہار لڑکے ہیں اس سن میں نوکری کی فکر ہوئی۔
آزاد۔ حضرت جسے کھانے کو روٹیاں نہ ہوں وہ ستو باندھ کر نوکری کے پیچھے پڑے تو مضائقہ ندارد۔ تم خدا کے فضل سے خوش خرم، مرفہ حال فارغ البال۔ زمیندار روپیہ والے ہو، تم کو کیا سوجھی کہ دس پانچ کی نوکری کے لیے ایڑیاں رگڑتے ہو، اسی سے تو ہندوستان خراب ہے۔ ہائے اسی سے ہندوستان خراب ہے۔ واہ رے ادبار۔ جسے دیکھو نوکری پر ہزار جان سے عاشق۔ میاں صاحبزادے کہا مانو، گھر جاؤ اپنا کام دیکھو، اس پھیر میں نہ پڑو۔ عمامہ باندھا اور کچہری میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں محرری پر لوٹ، امانت پر اُدھار کھانے بیٹھے ہیں اور گھر میں سونے کی اینٹیں بھری ہیں، لاحول ولا قوۃ۔

دوسرے امیدوار کی نسبت معلوم ہوا کہ ایک مہاجن لکھ پتی کا لڑکا امیدواری کرتا ہے۔ باپ کی کوٹھی چلتی ہے لاکھوں کا وارا نیارا۔ بیٹا بارہ روپیہ کی نوکری کے لیے سو سو چکر لگاتا ہے۔ چوتھے درجہ سے مدرسہ چھوڑا اور اپرینٹس ہوئے کام خاک نہیں جانتے ہیں ڈاکٹ میں لکھتے آنرڈ سر۔ باہر جاتے ہیں تو منصرم صاحب سے پوچھ کر مولوی صاحب اگر اجازت باشد آب خوردہ بیایم۔ اس وقت جب سب دفتر والے اپنے اپنے گھر جانے لگے تو حضرت پوچھتے کیا ہیں۔ کیوں جی یہ سب چلے جاتے ہیں اور ابھی چھٹی کی گھنٹی تو بجی ہی نہیں (اسکول کی گھنٹی یاد آ گئی)

میاں آزاد دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ کمسن لڑکے، مسیں بھیگتی ہوئی۔ نوجوان، امیروں کے لڑکے ابھی گبھرو نام خدا پندرہ پندرہ سولہ سولہ برس کا سن، پڑھنے لکھنے کے دن۔ مدرسہ چھوڑا کالج سے منہ موڑا۔ امیدواروں کے زمرے میں شامل، اہل قلموں کی ٹکڑی میں داخل ہائے ستم وائے ستم۔ محنت کرنا وبال، درس و تدریس میں جی لگانا دشوار۔ دو چار برس جم کر پڑھنا محال لاحول ولا۔ یہ سب ہندوستان کے ادبار پر دال ہے۔ یورپ میں دیکھئے کہ ایک ایک پیر زال تک تربیت یافتہ و بدیع الخیال ہے۔ افسوس اپنی تو یہ کیفیت کہ جہاں کسی کمسن مرفہ حال کو قبل تکمیل مدرسہ چھوڑتے دیکھا سینہ پاش پاش ہو گیا۔ دل کراہنے لگا۔ اکثر لوگوں سے پوچھا کہ بھئی صاحبزادے مدرسہ کیوں چھوڑ بیٹھے تو یہی جواب پایا کہ اقلیدس کی شکل سے نفرت ہے، جبر و مقابلہ سیکھنا طبیعت پر جبر کرنا تھا۔ تاریخ یاد کیسے رہے یہاں تو خدا جھوٹ نہ بلائے گھر کے بچوں کا نام یاد نہیں آتا۔ لہذا پڑھنے کی دُم میں نمدا باندھا ہم بھی سوچے کہ کہاں کی جھنجھٹ۔ بھئی الگ بھی کرو چلتا دھندا کرو۔ اور لطیفہ سنئیے مدرسہ چھوڑا اور نوکری کی فکر ہوئی۔ عمامہ اونٹ پٹانگ باندھا اور کچہری میں غڑاپ موجود۔ اس لپیٹی دستار کے قربان اور اس وحشت کے صدقے۔ زمیندار کے لڑکے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کھیتی کو یک قلم الغلط کرے اور کچہری میں گھس بیٹھ کر داخل ہو دے۔ تاجر کے صاحبزادے کو جی سے لگی ہے، کہ کالج سے چمپت ہوں اور کچہری کی کرسی پر جا ڈٹوں۔ متصدی، محرر، منشی، اہل قلم کے صاحبزادوں کی تو گھٹی ہی میں نوکری ہے۔ علما، فضلاء عقلاء کملاء معزز حکام اور افسران ذی الاحترام کہتے کہتے تھک گئے کہ پڑھ لکھ کر اپنا پیشہ کرو اور اسی کو چمکاؤ۔ مگر بابو بننے کا شوق اور اہل دفتر کہلانے کا عشق ایسا چرانا ہے کہ عقل بالائے طاق، وحشت گلے کا ہار ہوتی ہے۔

نیچریہ شاعری

میاں آزاد ایک مرتبہ سیر کرتے ہوئے ایک شہر میں داخل اور ہوٹل میں فروکش ہوئے۔ جھٹپٹے کا وقت ہوا کھانے چلے تو دیکھا کہ سرا کی ایک کوٹھری کے برآمدے میں چار پانچ سفید پوش فرش مکلّف پر بیٹھے عظیم اللہ خانی حُقّے کا مشکبو دھواں دھار اڑا رہے ہیں اور گلوری چبا رہے ہیں، مگر سب موزوں طبع۔ شعرائے نازک خیال و شیریں مقال۔ حامی۔ علّامی۔ فہّامی و وقّاد اور جوّاد۔ ایک شاعر اور آ جائے تو چھ گڈّم کی خوب ٹھہرے۔ اتنے میں میاں آزاد تڑسے پہنچ گئے۔ پوچھا آپ تخلص کیا کرتے ہیں؟ فرمایا آزاد۔ تب تو ان سب کی باچھیں کھل گئیں کہ اچھا قافیہ ملا۔ لو صاحب اب جوّاد وقّاد اور آزاد یہ تین شعرا بھی ہم قافیہ تخلص والے جمع ہو گئے۔ بھئی خوب آئے، واللہ آپ ہی کی کسر تھی۔

اب شعر خوانی ہونے لگی۔ ایک شعر پڑھتا ہے باقی داد دیتے ہیں۔ اے سبحان اللہ، واہ میر صاحب یہ حضور ہی کا حصّہ تھا۔ حاصل زمین۔ بارک اللہ کیا خدا داد طبیعت پائی ہے۔ واللہ کیا ذہن کی رسائی ہے۔ پھر فرمائیے گا حضرت خدا کی قسم قلم توڑ دیئے کیا روزمرہ ہے۔ ہائے اس بول کے صدقے۔

آزاد۔ میاں سنو۔ ایں جانب اس شاعری کے قائل نہیں ہیں۔ ہمیں نیچریہ کلام پسند ہے یہاں اس شاعری کے معنی ہی سمجھ میں نہیں آتے۔ آپ لوگ تو زبان پر مرتے ہیں اور ہم خیالات پر جان دیتے ہیں۔ ہائے شاعری تو انگریزی پر ختم ہے۔

فہّامی۔ آہاہ۔ آپ نیچریئے ہیں انیسیے اور دبیریئے تو سنتے تھے، اب نیچریئے پیدا ہوئے۔

آزاد۔ بندہ صاف گو صاف باطن آدمی ہے لگی لپٹی نہیں رکھتا یہ شاعری نہیں خبط ہے بے تکا پن ہے۔

فہّامی۔ واہ قبلہ واہ۔ آپ کی نیچریت کے صدقے اچھی گٹ پٹ ہے۔

آزاد۔ اندھے کے آگے رونا اپنی آنکھیں کھونا۔

میاں آزاد نے اپنی نیچریہ شاعری کی تعریف کے وہ پُل باندھے کہ بحرِ ظلمات پٹ جائے جس کا اور نہ چھور ممکن کیا کہ کوئی تھاہ پائے۔ اُدھر وہ پانچوں اُردو کی شاعری پر غش آتش و میر کے روزمرہ پر عش عش کرتے تھے، ناسخ کی بلاغت۔ انیس کی فصاحت۔ ذوق کی تشبیہہ۔ غالب کے کلام ادق و خیالات نفیس۔ مومن کی زبان سلیس۔ امیر کے استادانہ کلام کی بڑھ بڑھ کر تعریف کرتے تھے۔ اب فرمائیے فیصلہ کون کرے۔ بھٹیارن جھگڑا چکانے سے رہی۔ آخر کار فریقین کی رائے یہ قرار پائی کہ شہر چلیے جو پڑھا لکھا آدمی پہلے ملے وہی حکم جو پہلے کہدے آمنّا و صدقنا منظور۔ سب نے ہاتھ پر ہاتھ مارا، چلنے ہی کو تھے کہ بھٹیارن[1] نے ان کو للکارا، اور جھپک کر میاں جوّاد کا دامن لیا۔ میاں یہ ہتّھے کسی اور کو بتانا۔ ہم بھی اس شہر میں اتنے بڑے ہوئے ہیں، ہوں تو ابھی آپ کی لڑکی کے برابر مُلّ[2] سیکڑوں ہی کنوؤں کا پانی پی ڈالا۔ پہلے کوڑی کوڑی بائیں ہاتھ سے رکھ جایئے پھر اسباب اُٹھایئے۔

علّامی۔ نیک بخت یہ شریف بھلے مانس ہیں۔ دو پیسے کے واسطے کہیں شرفا ایمان بیچا کرتے ہیں۔ چلو دامن چھوڑ دو۔ ابھی دم کے دم میں آئے۔

---

[1] داؤ فریب ۔ [2] لیکن ۔

بھٹیارن۔ اس دَم میں بندی نہ آئے گی۔ ایسے بڑے ساہوکار کھرے اسامی ہو تو ایک گنڈا[1] چکے سے نکال دو نہ۔

میاں جوّاد آدمی تھے صلح کُل، جب انھوں نے دیکھا کہ مفت میں دھرے گئے تو کہا بھئی تم پانچوں جاؤ ہم یہاں بی مہترانی کی تشفی کے لیے بیٹھے ہیں تم لوگ پنٹ آؤ۔

وہ سب تو اُدھر چلے اور جوّاد سرا میں زیرِ حراست بی بھٹیاری رہے دو چار منٹ بعد پکارتے ہیں کہ بی مہترانی۔ بی مہترانی! میں لٹا ہوں کہیں ایسا نہ ہو پیٹ میں چوہے دوڑیں کہ رفو چکر ہوئے۔ پھر تین منٹ کے بعد گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاّنے لگے۔ بھٹیارن! بھٹیارن! ہم بھاگنے والے اسامی نہیں۔ تم بے فکری سے دال بگھارو۔ جب بار بار اُنھوں نے چھیڑنا شروع کیا تو وہ آگ بھبھوکا ہو گئی۔

بھٹیارن۔ میاں میں ایسے دو پیسے سے درگذری۔ تم نے تو غل مچا مچا کر میرا کلیجہ پکا دیا، ناکوں دم آگیا۔ آپ جائیں بلکہ کھٹیا[2] سمیت دفان ہوں۔ مَیں خوش میرا اللہ خوش۔ یہ بات وہ بات نکالا میرے ہانڈا[3] اے واہ۔

ادھر تو میاں جوّاد سادہ دلی سے بی بھٹیارن سے چُہل کر رہے تھے۔ اُدھر سُنیے وہ پانچوں سرائے سے چلے تو راہ میں سناٹا۔ آدمی، نہ آدم زاد چلتے چلتے ایک مردِ مقدّس باریش مخضب سے دوچار ہوئے۔

حامی۔ السلام علیکم!

مقدس۔ وعلیکم السلام ورحمتہ وبرکاتہ۔

حامی۔ یا حضرت مولانا ایک مسئلہ حل کیجیئے تو احسان ہوگا!

مقدّس۔ خاکسار ذرہ بے مقدار اضعف العباد، ہیچمیرز ہیچمدان دبستانِ نادانی کا ابجد خواں، خاکپائے سخنوراں اضعف العباد ناہنجار ننگ انام مولانا ہونا ایک امر ہے ازبس دشوار۔ فاعتبرو یا اولی الابصار۔

حامی۔ آج خدا ہی ہمارا حافظ و ناصر ہے۔ حکم بھی ملے تو ایسے واہ ری قسمت کی خوبی۔ قبلہ اگر اسی طرح دو چار بار انکسار کی باتیں کیجیے گا تو بھور ہو جائے گا۔ اور اُدھر جوّاد بیچارے کو بھٹیارن نخاس دکھائے تو عجب نہیں۔ ایک امر متنازعہ فیہ کا فیصلہ کر دیجیئے اور دولت خانہ کا راستہ لیجیئے اور ہم سب کے جدامجد کے جدامجد اور ان کے نانا جان کے جدامجد پر احسان کیجیئے وہ یہ کہ یہ حضرت (آزاد) نیچریہ شاعری کا جلیہ کرتے ہیں اور ہم چاروں اُردو شاعری پر جان دیتے ہیں۔

مقدّس۔ یہ تو کوئی غور طلب مسئلہ ادق نہیں کہ غور و تعمق کا محتاج ہو۔ آپ چاروں کا فعل عبث ہے آپ سیدھے دارالشفا جائیے اور فصد کھلوائیے۔ شاعری پر جان دینا کار عقلائے دہر نہیں فعل حمقائے روزگار ہے۔ باقی رہی دوسری نوع کی شاعری۔ اس کے نام سے اس نابکار اور روسیاہ کے کان آشنا نہیں۔ یہ نیچریہ شاعری کس عالم اجل و محقق کی تحقیق انیق ہے۔ یہ قسم جدید ہے یا عتیق ہے؟ بینوا و توجروا۔

اس بینوا و توجروا پر پانچوں ہنس پڑے اور اس زور سے قہقہہ لگایا کہ مولانا صاحب کفش کو سٹر پٹر کرتے جبہ و دستار کو سنبھالتے چلتے ہوئے۔ اب سراپا د آئی اپنا سا منہ لے کر ناک کی سیدھ پر نوک دُم بھاگے۔ راہ میں آزاد نے کہا کہ بھئی سنو غزل مسلسل بندۂ درگاہ کو البتہ پسند ہے یہ نہیں کہ پہلے مصرع میں شہید ہو گئے۔ دوسرے میں بوسۂ لعل شکر خا کے خواستگار ہیں۔ مطلع میں معشوق کے خط آنے کا دُکھڑا رو دیا۔ مقطع میں مرحوم آب رواں کی تعریف کی اب غزل مسلسل سنیئے:۔

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا ۔۔۔ بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

---

[1] آنہ [2] چارپائی [3] دفع۔

مبارک وہ شب قدر سے بھی وہ شب تھی سحر تک مہ و مشتری کا قِراں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا
نکالے تھے وہ چاند اس نے مقابل وہ شب صبح جنت کا جس پر گماں تھا
عروسی کی شب کی علامت تھی حاصل فرحناک تھی روح دل شادماں تھا
مشاہد جمالِ پری کی تھی آنکھیں مکانِ وصل کا اک طلسمی مکاں تھا
حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا
کیا تھا اُسے بوسہ بازی نے پیدا کمر کی طرح سے جو غائب وہاں تھا
حقیقت دکھاتا تھا عشقِ مجازی نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا
بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

اوہو ہو ہو، واللہ کیا غزل ہے! پھڑکا دیا۔ روح شاد ہو گئی۔ القصہ وہ سب سرا گئے اور آزاد ہوٹل پہنچے۔

یا مظہر العجائب ہاتھی مع ہودا غائب

میاں آزاد ایک رئیس باتوقیر کی عالیشان کوٹھی کی طرف گذرے تو حُسنِ اتفاق سے اس وقت رئیس موصوف عالمگیر کا یہ فقرہ پڑھ رہے تھے، "آدم خوب بدست نمی آید"۔ میاں آزاد تڑ سے بول اُٹھے۔ آدمی تو کھانچیوں ملیں مگر قدر دان کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے۔ رئیس نے اشارے سے بلایا۔

آزاد۔ آتا ہوں پہنچے کو چڑھائے کل پر۔

رئیس۔ ماشاء اللہ آپ شاعر بھی ہیں؟

آزاد۔ جی، اور چشم بدُور اینجانب ساحر بھی ہیں۔

رئیس۔ ہم سحر کے کبھی قائل ہی نہیں ہوئے۔

آزاد۔ بس معلوم ہو گیا کہ آپ کسی قوس ابرو کی تیغ نگاہ کے گھائل ہی نہیں ہوئے۔

رئیس۔ بھئی واللہ کتنے حاضر جواب ہو۔

آزاد۔ تم بھی بے تکے پن میں انتخاب ہو۔

رئیس۔ تم تو گالیاں دینے لگے تو نوکری کر چکے، بس ہوا کھائیے۔

آزاد۔ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنائیے۔ یہاں اسی بات کے لاکھوں پاتے ہیں کہ ہر بات میں تُک ملاتے ہیں۔

رئیس۔ اچھا آج سے آپ ہمارے مصاحب ہوئے مگر سوتے جاگتے ہمیشہ قافیہ ہی میں جواب لیں گے۔

آزاد۔ دیں گے اور بیچ کھیت دیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد رئیس نے بُلایا۔ آزاد!

آزاد۔ خانہ احسان آباد!

رئیس۔ آخاہ آپ ہیں؟

آزاد۔ جی اور نہیں تو کیا آپ کے باپ ہیں!

رئیس۔ مت بک فضول!

آزاد۔ چونچ سنبھال نامعقول۔

اب سنیئے کہ رئیس بڑے دھوم دھڑکے سے ہاتھی پر سوار ہوئے اور سیر دریا کو چلے۔ میاں آزاد خواصی میں بیٹھے ہیں۔ جیسے ہی دریا میں ہاتھی ڈالا اور اس نے سونڈ سے پانی اچھالا، ہودا ڈانواں ڈول ہونے لگا، اب گرے اور اب گرے۔

رئیس۔ خدا بچائیو۔

آزاد۔ یا خدا ڈبو ڈبائیو۔

رئیس - امام ضامن کی دوہائی -
آزاد - آج پوری شامت آئی -
رئیس - یا علی مشکل کشا مشکلکشائی کیجئے !
آزاد - خواجہ خضر ذرا ہاتھی کا پاؤں تو پھسلا دیجئے !
رئیس - یا مظہر العجائب !
آزاد - ہاتھی مع ہودا غائب !

اتنے میں فیلبان ہاتھی کو نکال لایا اور رئیس نے مارے غصے کے آزاد کو دھتا بتایا ، ڈھکیلا تو زمین پر آ رہے - اچھا تک ملایا تھا - وہ تو کہیے ریت نہ ہوتی تو قافیہ تنگ ہو جاتا ' ہاتھ کے ماتھے جاتی یا پاؤں لنگ ہو جاتا - رئیس بھی سوچے کہ اچھے فقرہ باز ملے ، وقت بے وقت تک ہی ملانے سے مطلب ہے - ہم کہتے ہیں یا مظہر العجائب وہ فرماتے ہیں ہاتھی مع ہودا غائب -

---

کھوسٹ شوہر کے نام نوخیز بیوی کا خط

ایک روز میاں آزاد فرخ نہاد سیر کر رہے تھے کہ ایک پیر مرد لٹھیا ٹیکتے کھانستے کھونستے آن کھڑے ہوئے اور میاں آزاد سے کہا کہ میاں! ذری یہ خط تو پڑھ دیجیئے اور اس کا جواب لکھ دیجیئے۔ میاں آزاد نے خط کھولا اور پڑھ کر سُنانے لگے۔

خط: میرے کھوسٹ شوہر خدا تم سے سمجھے۔ سکندر ظلمات سے پیاسا آیا مگر تم نے آبِ حیات کے دو چار قطرے ضرور پی لیے ہیں جب ہی مرنے کا نام نہیں لیتے۔ کچھ اوپر سو برس کے تو ہوئے اب آخر کیا عاقبت کے بوریئے بٹورو گے؟ ذرا دل میں شرماؤ تو ہزاروں نوجوان نوخیز کفن پوش ہوتے جاتے ہیں اور تم ٹیّاں سے موجود ڈنکو نبور بھی آیا مگر تم مونچھوں پر تاؤ ہی دیتے رہے ہیضہ نے لکھو کھا آدمی چٹ کیے مگر حضور بے حیائی کی بلا دور ہیضہ کے باپ کو چٹ کر جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ بخار میں ہزاروں حیادار چل بسے مگر تم اور بھی موٹے ہو گئے، تم پر فالج تک نہیں گرتا۔ لقوہ بھی نہیں مارتا۔ لو کے جھونکے بھی تمہیں نہیں جھلساتے۔ دریا میں بھی تم پھسل نہیں جاتے اور سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ اگر حیادار ہوتے تو ایک چلّو کافی تھا، مگر تم وہ چکنے گھڑے ہو کہ عرق انفعال کے تم پر ہزاروں ہی گھڑے پڑیں لیکن ایک قطرہ نہ تھم سکے۔ واہ پچھے کیوں نہ ہو۔ بس نرے پچھے ہی ہو۔ ہے ہے کس ساعت میں تمھارے پالے پڑی۔ کس بُری گھڑی تمھارے ساتھ بیاہ ہُوا۔ ماں باپ کو کیا کہوں۔ مگر میری گردن تو کُند چُھری سے ریت ڈالی۔ اس سے تو کسی کنوئیں ہی میں ڈھکیل دیتے، قصائی ہی کے حوالے کر دیتے تو یہ روز روز کا کڑھنا تو نہ ہوتا۔ تم خود ہی انصاف کرو کہ تمھارے بڑھاپے سے مجھ پر کیا گاج پڑی۔ ہاتھوں میں تو آپ کے رعشہ پاؤں میں سکت نہیں۔ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ کمر کمان کی طرح خم۔ بینائی کی یہ کیفیت کہ دن کو اونٹ نہیں سوجھتا۔ جریب ٹیک کر دس قدم چلے بھی تو سانس پھول گئی دم ٹوٹ گیا۔ ستانے بیٹھے تو نقش قدم بن گئے۔ صبح کو ننھی ننھی دو چپاتیاں کھا لیں تو شام تک کھٹی ڈکاریں آ رہی ہیں۔ کرکری ہو گئی۔ تولہ بھر سکنجبین کا ستیاناس کیا مگر سوء ہضم کی شکایت بدستور۔ حافظے کا یہ حال کہ اپنے باپ کا نام بھی یاد نہیں۔ پھر آخر سوچو تو کہ بیاہ کرنے کا شوق کیوں چرایا۔ ایک پاؤں تو قبر میں لٹکایا ہے اور خیال یہ گدگدایا ہے کہ دولھا بنیں دُلھن لائیں۔ نوشہ کہلائیں۔ اللہ سوں جس وقت تمھارا پوپلا منہ اور سفید بھوں اور گالوں کی جھُرّیاں اور دوہری کمر اور گنجی چاند اور منحوس صورت یاد آتی ہے۔ کھانا حرام ہو جاتا ہے واہ بڑے میاں واہ! خدا جھوٹ نہ بُلائے تو ہمارے ابّا جان سے پچاس ساٹھ برس بڑے ہوں گے اور امّاں جان کو تم نے گود کھلایا ہو تو تعجب نہیں، خدا گواہ ہے تم میرے دادا کے باپ سے بھی بڑے ہو، مگر واہ ری قسمت کہ آپ اور میرے شوہر! زمین شق ہو تو میں دھنس جاؤں۔

آزاد۔ قبلہ و کعبہ! اس کا جواب کسی منشی بے بدل سے لکھوائیے۔

پیر مرد۔ اچھا اس کا جواب کل سوچ کر دیں گے۔

میاں آزاد دوسرے روز اُٹھے اور سویرے ہی چل کھڑے ہوئے چہار طرف سناٹا پڑا ہوا مگر ہر سمت لطف اتم ہے گورکا

لہ قسم

عالم ہے۔ اس سہانے وقت کا سماں دیکھ کر آزاد مسرور ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد کانوں میں بھنک پڑی کہ ان کو کوئی پکارتا ہے۔

ادھر دیکھنا ادھر جانے والے

ایں! یہ غیب کی آواز کیسی! پیچھے پھر کر دیکھتے ہیں تو وہی پیر فرتوت جس کو اس کی بیوی نے کھوسٹ شوہر کے القاب سے یاد کیا تھا۔

آزاد۔ اخاہ۔ مزاج شریف! کہئے اور کوئی خط تو نہیں آیا؟

پیر مرد۔ اُس نے میرا ناک میں دم کر دیا، اور سچ پوچھو تو جس دن سے اُس کو بیاہ لائے ناک ہی کٹ گئی۔ ایسی تنک مزاج دیکھی نہ سُنی، مجال کیا کہ ناک پر مکھی تو بیٹھ جائے۔

میاں آزاد نے وہ چکنی چپڑی باتیں کیں کہ بڈھا نان پاؤ کی طرح پھول گیا، سوا سو برس کا تجربہ چٹکیوں میں بھول گیا۔ گاؤں کا نام، مکان کا پتہ صاف صاف بتایا اور ایسا دم میں آیا کہ بیوی کا کچا چٹھا کہہ سنایا۔ میاں آزاد نے چپکے سے سب سُن لیا۔ جھٹ دوات قلم کاغذ لے کر کھوسٹ شوہر کی طرف سے اس کی بیوی کے نام جواب خط لکھا۔ ذرا سُنیئے گا:۔

جواب خط: میری البیلی چھیل چھبیلی تنک مزاج نازک بدن مغلوب الغیظ غنچہ دہن آگ بھبھوکا سیم تن نوعمر نوجوان کمسن نادان متوالی بیوی کو اُس کے سن رسیدہ گرگ باراں دیدہ کمر خمیدہ سنجیدہ فہمیدہ شوہر کی اُٹھتی جوانی دیکھنا نصیب ہوا ہے وہ جُگ جُگ جیئے اور تم پوتوں پھلو دودھوں نہاؤ۔ اٹھارہ لڑکے ہوں اور اٹھارہ دونی چھتیس چھوکریاں۔ جب میں دہلیز میں قدم رکھوں تو سب بچے ابّا آئے ابّا آئے کھلونا لائے بتاشے لائے۔ کہہ کہہ کر دوڑ پڑیں مگر ڈر یہ ہے کہ تم بھی ابھی کمسن ہو، ان کی دیکھا دیکھی کہیں مجھے ابّا نہ کہہ اُٹھنا کہ پاس پڑوس کی عورتیں مجھے انگلیوں پر نچائیں اور اُلّو بنائیں۔ مجھے تم سے اتنی محبت ہے جتنی کسی اپنے جگر گوشہ کی ہوتی ہے۔ نانی کو میں ایسا پیارا نہ تھا جتنی تم مجھے پیاری ہو اور کیوں نہ ہو تمہاری پر دلوی کو میں نے گودیوں میں کھلایا ہے اور میری بہن نے اسے دودھ پلایا ہے۔ مجھے تمہاری دادی کی خالہ کا گڑیاں کھیلنا اسی طرح یاد ہے جیسے کسی کو صبح کا کھانا یاد ہو مگر تمہارے خط نے میرے دل کے ساتھ وہ کیا جو خزاں چمن اور برق خرمن کے ساتھ کرتی ہے۔ لیکن مجھ میں ایک بڑا وصف یہ ہے کہ پرلے سرے کا بے حیا ہوں اور کیوں نہ ہو شرم دلہن کے لیے زیبا ہے بندہ تو چکنا گھڑا ہے مانا کہ آنکھوں میں نور نہیں مگر چشم نگراں ست۔ قوت سامعہ سے بے بہرہ ہی سہی لیکن گوش بر آواز زن جواں۔ پیر ہوں مگر بے پیر نہیں۔ ہاتھ میں رعشہ سہی مگر حاجت دستگیر نہیں، تم عصائے پیری ہو مگر خاص الخاص میری ہو، گو ضعف کے مارے مرتا ہوں مگر تمہاری محبت کا دم بھرتا ہوں۔

تمہارا پیارا پیارا مکھڑا، رسیلے نیناں نشیلی انکھڑیاں، گوری گوری بھتیاں[1] جس وقت یاد آتی ہیں کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ وہ خندۂ شکر آمیز وہ زلف عنبر بیز۔ وہ خال مشکیں وہ لعل نگاریں۔ وہ ابر کی ایسی مستانہ چال وہ خط و خال چندے آفتاب چندے ماہتاب، وہ چاندنی رات میں نکھر کر نکلنا۔ کبھی مسکرانا کبھی کھلکھلانا۔ کسکا شرمانا کیسا لجانا اور تو اور تمہاری پھرتی سے دل لوٹ پوٹ ہے کلیجے پر چوٹ ہے۔ صحن سے جو طرارہ بھرا تو تڑ سے بام پر۔ یہ چلبلا پن اور وہاں سے ایک ذقن میں مہتابی پر ہو رہیں اور وہاں سے چھلانگ ماری تو دن سے پھر صحن میں، ابر کی طرح اٹکھیلیاں کر رہی ہیں، چھپر کی کے فسل چوطرفہ

---

[1] باتھہ۔ بازو [2] چرخی۔

گھومنا طاؤس وار جھومنا کبھی کھیلتے کھیلتے میری چپت گاہ پر ٹیپ جمائی۔ کبھی شوخی سے وہ ڈانٹ بتائی کہ کلیجہ لرز گیا۔ کبھی آپ ہی آپ رونا، کبھی دن دن بھر سونا۔ الھڑپن کے دن، بارہ برس کا سن۔ تیرے بیساختہ پن کے قربان۔ لے کہا مانو، ہمیں غنیمت جانو۔ ہیں چراغ سحری ہوں۔ ہوا چلے یا نہ چلے اب گل ہوا اب گل ہوا۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں شیریں بیان ہوں۔ ستر برس بھٹے کہ دانت چوہے کی نذر کیے، تب سے حلوے پر بسر ہے، پھر جو روز حلوا کھائے گا اُس کی زبان قند شکر کیوں نہ بن جائے؟ وہ میٹھی میٹھی باتیں کروں کہ لب بند ہو جائیں مگر تم بھی بے قصور ہو، تمھارے گود میں کھیلنے کے دن ہمارا کچھ اوپر سو برس کا سن، تم طنّاز یہاں کمر خم۔ تم سرو بلند اقبال یہاں ریختہ دم۔ تم گلعذار باغ و بہار ہم ضعف و خستہ زار۔ مگر ہمارا عشق بھی بلا کا عشق ہے۔ تم لاکھ روٹھو پھر ہماری ہو۔ بیوی ہو لخت جگر ہو پیاری ہو۔ وہ شبھ گھڑی یاد کرو جب ہم دولھا بنے، پُرانے سر پر نئی دستار جمائے سہرا لٹکائے مہندی لگائے اُلّو کی دُم فاختہ حواس باختہ ٹینی مرغی کے برابر گھوڑیا پر سوار میٹھی پوئی جاتے تھے اور تم دُلہن بنی سولہ سنگار کیے قفس زرنگار میں سے جھانک رہی تھیں۔ ہمارے گالوں کی جھُرّیاں، ہمارا پوپلا مُنہ، ہماری ٹیڑھی کمر دیکھ کر خوش تو نہ ہوئی ہو گی۔ وہ آئی لب پر ہنسی دیکھو، مسکراتی ہو۔ اب ایک نصیحت بزرگانہ یاد رکھو۔ ایک تو میلے ٹھیلے میں نہ جانا، دوسرے آس پاس کی چھوکریوں کو گوئیاں نہ بنانا۔ خدا کرے جب تک زمین و آسمان قائم ہے تم جوان رہو اور نادان رہو۔ الھڑپن دن دونی ترقی پائے اور جوبن روز بروز بڑھتا جائے۔ ہمارے سفید بال تمھیں بھائیں، حاسد خار کھائیں۔

تمھارا پیر نابالغ شوہر

لکھنؤ کا چہلم

میاں آزاد نور کے تڑکے جو اُٹھتے ہیں تو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا، ہر سمت تیرہ و تار ظلمات کی سی کیفیت نمودار کوئی شے نظر ہی نہیں آتی، نور کا نور سرا کے باہر آئے تو چو طرفہ دل بادل قبلہ کی طرف سے جھومتی ہوئی گھٹا اُٹھی۔ کالی متوالی گھٹا۔ شاخیں مستوں کی طرح جھوم رہی ہیں۔ ہوا اس زناٹے سے چل رہی ہے کہ کلیجہ لرزا جاتا ہے۔ مرغانِ خوش نوا گھونسلوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ مگر ہوا نے پھر وہ زور باندھا کہ بادل اوپر ہی اوپر اُڑنچھو ہو گئے۔ کچھ یونہی سی بدلی تھی تو کیا دیکھتے ہیں کہ دھانی دوپٹا پھڑکاتی ایک حسین مہ جبین چمکتی چلی آتی ہے وہ اودی اودی گھٹا اور وہ ہلکا ہلکا دھانی دوپٹا۔ فصل کی ہر چیز ہر دلعزیز۔ پوچھا کہاں سواری چلی؟ مسکرا کر بصد ناز و ادا جواب دیا لکھنؤ کا چہلم دیکھنے۔ میاں آزاد تو لکھنؤ کے محرم الحرام اور مجالس عزا کی دھوم دھام پر لٹو ہو گئے تھے ٹھان لی کہ چہلم کی چہل پہل بھی دیکھیں گے اور ضرور دیکھیں گے۔ ریل پر سوار ہو کر لکھنؤ داخل ہو گئے اور وہاں سے تال کٹورے کی کربلا پہنچے۔ اللہ اللہ جہاں تک پیک نظر کی رسائی ہے بگھیوں، اور اِکوں اور گھوڑوں اور ہاتھیوں اور رتھ اور بہل اور ڈولیوں اور فنسوں کا تانتا لگا ہے جدھر جاؤ دھوم جدھر دیکھو ہجوم۔ بانکے ترچھے تیکھے ٹورے۔ گنڈے[1] تھے۔ تعندرے[2]۔ دو اُنگل کی نکے[3] دار ٹوپیاں اپیبن سے مستک گاہ پر جمائے۔ انکھڑیوں میں سُرمہ لگائے۔ آنکھیں سینکتے برتتے اینڈتے تنتے۔ اینٹھتے اونچی چولی کے انگرکھے پھڑکاتے پرے جمائے جا رہے ہیں۔ جو ہے اونچی بنا ڈنڈ پیل چوبل کرتا ہے۔

صوفیانِ صافی طینت میں ہُو حق کی صدا بلند ہے مگر افشائے راز میں زبان بند ہے خوش باش بھی پو قدمے جاتے ہیں اِدھر اُدھر دل بہلاتے ہیں چانڈو باز بڑھ بڑھ کر دَم لگاتے ہیں جب گرماتے ہیں تو دھوئیں کے بقعے اڑاتے ہیں۔ میاں آزاد گھبرائے کہ ایں جا بھی چانڈو خانہ۔ بھلا چانڈو اور بانبو کا میاں کیا کام ہے واللہ کتنا اژدہام ہے۔ امراء رؤساء عمائد شہر چھولداریوں شامیانوں خس کے بنگلوں اور خیموں میں تین دن سے مقیم تھے۔ امراء کی شان ہی اور تھی رؤساء کی آن بان ہی اور تھی۔ کشمیر جنت نظیر کے شالبافوں کا بار منت سب کی گردن پر تھا دوشالہ دوسالہ زیب دوش کوئی چاندی کی گڑگڑی گڑگڑاتا ہے کوئی دھواں دھار پیچوان پیتا ہے۔ زیر انداز پر جوبن ہے حقہ کیا دُلہن ہے۔

حقہ نہیں عصا ہے یہ موسیٰ کے ہاتھ میں   بیجان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

آگے بڑھتے ہیں تو اربابِ نشاط کے جمگھٹے معشوقوں کے جھمکڑے وہ چھب وہ ادا وہ ناز وہ غمزہ کہ زہّادِ صد سالہ بھی تسبیح و تہلیل بھول جائیں اور صوفی کے بھی ہاتھ پاؤں پھول جائیں۔ میاں آزاد گو رنگین طبع سودائی مزاج آدمی تھے مگر دیکھتے ہی بگڑ گئے اور ایسا گرمائے جیسے چونے پر پانی چھڑک دیا لاحول ولا۔ انھوں نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اس متبرک مقام سے منہ نہ موڑا۔

اتنے میں باجے کی آواز کان میں آئی۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ جناب نواب ممتاز الدولہ کا تعزیہ آتا ہے۔ بڑے دھوم دھڑکے سے اٹھا ہے۔ میاں آزاد بھی ایک اونچے ٹیکرے پر کھڑے ہو گئے کہ کل کیفیت دیکھیں۔ اللہ اللہ کوسوں جلوس ہے ۴۵ ہاتھی دنتیلے[5] ایک دنتے[6] مست دُم کٹے کوئی زنجیر کو سونڈ سے اُچھالتا ہے کوئی جھومتا ہوا آتا ہے۔ کوئی سر پر خاک ڈالتا ہے۔ اونٹ بلبلاتے ہیں شتر غمزے کرتے جاتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ، کیا کاواک جانور ہے ماشاء اللہ کیا

---

[1] غنڈے [2] لچے [3] آوارہ [4] نوکدار۔ [5] دانت والے [6] ایک دانت والا۔

قطع ہے یہ گردن ہے یا شیطان کی آنت۔ باجے والے وردیاں ڈانٹے گھوڑوں پر اکڑے بیٹھے ہیں دماغ عرش بریں پر ہے۔ نیچے زمین آسمان بالائے سر ہے۔ خاکی پلٹن کے چار سو تلنگے رپ رپ کرتے جا رہے ہیں۔ برچھی برداروں کی لال لال وردی سے گل لالہ کھلا تھا۔ سر خا سُرخ بیر بہوٹی بنے ہوئے بان بردار بان چمکاتے پھر ہرے اڑاتے بڑے ٹھاٹ سے ساتھ ہیں۔ بادبہاری شہید کربلا کی سواری طنبورے چھڑ رہے ہیں۔ باجے نے رنگ جمایا کہ راگ اور راگنی نے مرحبا کا طنطنہ بلند فرمایا نشان کی وہ آن بان کہ عجب تیری قدرت عجب تیری شان کشتیوں کی قطار اور ان پر گلاب پاش عنبر بار رنگا جمنی پر بہار انگیٹھیوں میں مشک اذفر نافہ و عنبر۔ چپراسی لال لال پگیاں[1] جمائے ہُد ہُد کی صورت بنائے ہاتھ میں خوشنما لکڑیاں اور ان میں پیتل کی پھلیاں پھکیت گتکہ لیے اکڑ رہے ہیں گھائی اور چھوٹ لڑ رہے ہیں۔ طمانچہ دکھایا اور ہاتھ گھمایا باہرہ دیا اور بنکٹی کا ہاتھ لگایا۔ گتکہ سو قدم پر اچھل گیا۔ ہاتھوں ہاتھ سیر بھر سوہن حلوا لیا یہ چمکایا وہ کڑک کر بالٹ کا بھرپور ہاتھ لگایا، واہ استاد اس صفائی کے قربان کیوں نہ ہو واہ پہلوان پھر ایک دفعہ۔

اب ماتم داروں کا نام لیا تو کروبیوں نے عرش بریں کو تھام لیا۔ زمین کا گہوارہ ڈانواں ڈول تھا ہزاروں کا غول تھا اور حسنؑ و حسینؑ کی صدا آسمان تک بلند تھی گریہ وزاری بکا و اشکباری اور برسوں سے دوچند تھی۔ ہزارہا عزادار شریک ماتم سینہ مجروح آنکھیں پُرنم مرثیہ خوان خوش الحان گریہ کناں چہاں چہاں جا رہے ہیں۔

بندیؑ بنا کے پہلے دیکھو یہ بدخصال	اور یوں بیان کرتے تھے سجاد خستہ حال
سب اونٹ پر سوار تھے میں ساربان تھا	سر ننگے بال کھولے مرا کاروان تھا

اتنے میں ریلا آیا تو ٹیپ کا شعر سننا محال ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی ۳۵ تعزیئے آئے۔ ایک سے ایک خوشنما ہر ایک ضریح قابل دید تھی بلکہ دیدنی نہ شنیدنی تھی چو طرفہ علم اور سونے کے پنجے اور سہرے اور ان میں گوہر شاہوار لٹکتے اور دُرِّ یتیم و آب دار جھلکتے۔ پھولوں کی بوباس سے دماغ طبلۂ عطار بن گیا۔ دُلدُل سبحان اللہ سبحان اللہ اشہب آہو شکار تند خوار اہوار۔ سمند دغا پسند کُرنگ نقرہ خنگ جو یائے جنگ کمیت اور سرنگ۔ سونے کی دُمچی[2]۔ اس کے برابر شمشیر خارا شگاف و خوش غلاف لٹکی ہوئی چادر میں خون کے ایسے دھبے جس نے عزاداروں کو خون رُلایا۔ ہر مومن پاک آنسو بھر لایا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ دُلدُل سوار نے ابھی زخم کھایا ہے اور فرس[3] سلیقہ شعار اس سانحہ ہوش رُبا کی خبر لایا ہے اور میدان کارزار سے سیدھا چلا آیا ہے۔ باگ ایک طرف کٹی ہوئی ہے ہائے یہ واقعہ بھی کیسا جگر خراش ہے۔ ہے ہے سینہ پاش پاش ہے اِدھر تیر اُدھر کمان اِدھر دستانہ اُدھر عمامہ۔

لوگ پٹے پڑتے تھے چپے چپے پر لڑتے تھے۔ ساقنوں کی دُکان دھواں دھار۔ میاں آزاد یہاں سے بھاگے تو افتاں و خیزاں کربلا میں دم لیا۔ کیوں میاں یہ قبر کس کی ہے؟ ایک جوان طنّار با سینۂ بریاں و دیدۂ گریاں بول اُٹھا کہ یہ مقام عشّار ہے تیر غم جگر کے پار ہے۔ ارے نادان یہ حسو جان کا مزار ہے۔ ہے ہے دلفگار ہے چشم اشکبار ہے۔ دل ہے کہ اُمڈا آتا ہے اچھے اچھے وضعدار ارد گرد کھڑے آٹھ آٹھ آنسو رو لیے ہیں۔

ایک جلسۂ یاران سر پل کی طرف سے گذر ہوا تو عجب گفتگو سننے میں آئی۔ ایک صاحب نے بیتی واردات یوں سنائی بھئی قسم ہے خدا کی جیسے ہی جنگل میں پہنچا ہوں عجب تماشا دیکھا۔ واللہ باللہ ثم باللہ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شیر ببر دُم پھیلاتا درخت کے سائے میں کھڑا ڈکار رہا ہے اور ابا جان کی قسم یہ دیکھیے واللہ کہ مجھ سے اور اس سے کوئی چار ہی پانچ قدم کا فاصلہ

---

[1] پگڑیاں۔ [2] قیدی [3] مصنوعی دُم [4] گھوڑا جو لڑنے پڑتے تھے۔

ہوگا - حضرت میری اُٹھتی جوانی اور گینڈا بنا ہوا - اور بھئی اللہ گواہ ہے کہ میں اپنی طاقت آزمائی بھی کر چکا تھا! ایک دفعہ کمتا ہاتھی کو بڑھ کر طمانچہ مارا، تو دُم دبا کر یہ بھاگا وہ بھاگا - پھر میرا زعم بے جا تو نہیں - میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بس شیر کو ایک دفعہ ہی ڈپٹ دیا بھالا لے آگے قدم بڑھایا اور میں نے بھرپور ہاتھ جمایا - تب تو شیر اور بھی غرّایا بس اس پر مجھے بھی غصّہ آگیا پھر تو حضرت قسم ہے جنابِ باری کی بندۂ درگاہ بھی جم گئے - اور زناٹے سے بدن تول کر ولایتی کا ہاتھ جو چھوڑ تو شیر نے تیور ماکر منہ موڑا - میں نے کہا او گیدی نامعقول تو شیر ہے یا بھیڑ ہے یہ کہہ کر میں جھپٹ پڑا اور جھپٹتے ہی میاں کی دُم جو دبائی تو ہاتھ میں تھی پھر بھاگا میں نے غل مچایا کہ ابے او لنڈورے (سوچنے لگے) واللہ ہے بڑھ کر ایک ہاتھ ولایتی کا دیا کا سہ سر کاٹتی ہوئی پیر تک پہنچ گئی - اتنے میں مجھے خیال آیا کہ اِس بار خدایا میں مسلح وہ نہتا - یہ تمنائے شجاعت نہیں معاً خدا گواہ ہے تلوار پھینک کر جھپٹ گیا (پھر سوچنے لگے) ہاتھوں ہاتھ دستی کھینچی اور کولے پر لاد کر دھم سے زمین پر دے ٹپکا چاروں شانے چت وہ پچھاڑا تین دفعہ تال ٹھونک یا علی کہہ کر اُٹھا مگر اپنی جان کی قسم اُس وقت داد دینے والا کوئی نہیں تھا اِدھر اُدھر سناٹا، اتنے میں جنگل کے بھورے ریچھ نے آکر ڈنڈ مل دیئے -

میاں آزاد چپکے چپکے بیٹھے سُن رہے تھے - جب داستان ختم ہوئی تو ان کی گپ پہ دل ہی دل میں ہنستے ہوئے چلے کہ اتنا جھوٹ - یہ ریچھ کا ڈنڈ ملنا کیا معنی؟ ریچھ بھی ان کا چچا تھا اور ماشاء اللہ ایسے کراے ہیں کہ شیر ببر سے مقابلہ کیا - اس پر بات بات میں قسم کھانا اور جنابِ باری کو درمیان میں لانا لاحول ولا قوۃ -

ضرورت ہے ایک جورو کی

آزاد کے لنگوٹیے میاں انور مع اپنے رفیق میاں آزاد کے ایک دن اپنے باغیچہ نزہت افزا میں بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھا رہے تھے اور گرما گرم چائے اڑا رہے تھے کہ ایک دفعہ ہی ڈاک کا ہرکارہ ہری وردی پھڑکائے لال لال پگیا جمائے خاصہ ٹیاں بنا ہوا سامنے سے آن موجود ہوا۔ جھک کر سلام کیا اور اخبار دے کر لمبا ہوا۔ اتنے میں انور کے ایک اور لنگوٹیے یار المتخلص بہ بہار تشریف لائے۔ علیک سلیک اور مصافحہ و معانقہ کے بعد ایک کرسی پر وہ بھی ڈٹ گئے۔ انور نے جھٹ پٹ اخبار کھولا، عینک لگائی اور بڑے غور سے پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے صفحہ آخر پر نظر پڑی تو باچھیں کھل گئیں۔ چہرہ گلنار، مزاج زعفران زار۔

بہار۔ اللہ اللہ اس وقت حضور کھلے ہی جاتے ہیں، جامے میں پھولے ہی نہیں سماتے۔ کیا پڑا پایا؟

آزاد۔ ہم بتائیں اور پتے پتے کی بات بتائیں کہ حضرت بھی وجد میں آئیں۔ کسی معشوق پری وش کی آمد آمد اس وقت ہے۔ سچ کہیئے گا چتونوں سے تاڑ گیا۔

انور۔ حضرت آپ تو عاشق تن آدمی ٹھہرے۔ جب دیکھو عشق کے پھیر میں۔ بندہ اس کوچے سے منزلوں بھاگتا ہے۔ بتان زہرہ تمثال حسن و جمال اور عاشقی معشوقی کا خیال آپ ہی کو مبارک رہے بندے کو یہ مرض ہی نہیں اس وقت ایک اشتہار پڑھ کر باغ باغ ہو گیا۔ خدا نے چاہا تو اسی اٹھوارے میں پانچوں گھی میں ہوں۔ اشتہار سنیئے تو آپ خود ہی سمجھ جائیے گا۔ نوٹس۔

Wanted

An Arabic Professor for the
Nasirpur College. Pay Rs 200. For
particulars apply to the Principal.

ترجمہ: ضرورت ہے ایک عربی پروفیسر کی نصیر پور کالج کے لیے۔ تنخواہ دو سو روپیہ ماہواری۔ اس کی نسبت جو کچھ دریافت کرنا ہو پرنسپل سے دریافت کیا جائے۔

بہار۔ ہم کچھ سمجھے و سمجھے خاک بھی نہیں۔ آخر اس سے مطلب کیا؟

آزاد۔ ارے صاحب ایک عربی پروفیسر نصیر پور کالج کے لیے چاہیئے ہے۔ دو سو روپیہ تنخواہ ملے گی۔ میاں انور درخواست دینے والے ہیں۔

بہار۔ خدا کامیاب کرے۔ لیکن سنیئے تو سہی، یہ تو اخبار ہے۔ اس میں عہدے اور تنخواہ اور درخواست کا کیسا جھگڑا؟

آزاد۔ تو قبلہ آپ نے اخبار پڑھا ہی نہیں۔ پیر و مرشد اخبار تو عطر کا مجموعہ ہے۔ لڑکوں کا اتالیق۔ جوانوں کا ناصح شفیق۔ بڈھوں کے تجربہ کی کسوٹی۔ رکن رکین سلطنت۔ تجار کا دوست۔ صناعوں کا یار غار۔ رعایا کا وکیل۔ جمہور نام کا سفیر۔ مدبّروں کا مشیر۔ کسی کالم میں ملکی چھیڑ چھاڑ۔ کہیں سوشل امور میں تکرار۔ کہیں اشعار آبدار۔ کہیں نوٹس اور اشتہار۔ انگریزی اخباروں میں طرح طرح کی باتیں

درج ہوتی ہیں اور دیسی اخبار بھی اُن کا تتبع کرتے ہیں۔ شطرنج کے حل مطلب نقشے۔ قرضہ قومی کا نرخ۔ گھوڑدوڑ کا تذکرہ سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ اور جب کبھی کوئی عہدہ خالی ہوا اور اچھا اہلکار نہ ملا تو حکام غلوئے عہدہ کا حال مشتہر کرتے ہیں۔ لوگوں نے پڑھا اور درخواست داغ دی۔

بہار۔ حضرت اور تو باتیں ہیں لیکن ہمیں اس وقت اپنی ضرورت یاد آگئی۔ بھائی از برائے خدا چھپوا نہیں دیتے ضرورت ہے ایک جورو کی چالاک اور چست خط و خال۔ نک سک سے درست۔ شوخ و زبان دراز ہو۔ جوان ہو طنّاز ہو ہزاروں میں انتخاب لاکھوں میں لاجواب۔ اُٹھتی جوانی عنفوان شباب ہو مگر بلا کی چنچل ہو کبھی روٹھ جائے کبھی گدگدائے۔ بخیل ہو ورنہ ہم سے میزان نہ پٹے گی۔ شنجرفی چہرہ ہو۔ برف کے ایسے ہاتھ پاؤں۔ ہرن کی ایسی آنکھ۔ لیکن قد تاڑ کے برابر نہ ہو کہ ہم کو پاڑ باندھنے کے لیے مزدور بلوانے پڑیں۔ بندہ پست قد آدمی ہے اور شرط یہ ہے کہ کھانا پکانے میں استاد۔ سینے پرونے میں گُل بوٹے بنانے میں برق ہو لیکن سوءِ ہضم کی شکایت نہ رہے اور ضعف معدہ کا عارضہ ضرور ہو۔ ہلکی پھلکی دو چپاتیاں کھائے تو تین دن میں ہضم ہوں سادہ مزاج ایسی ہو کہ زیور گہنے پانے سے مطلب ہی نہ رکھے۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ مذہب کے ہاتھ نہ بک گئی ہو۔ خدا کو واجبی ہی واجبی مانتی ہو۔ مگر برانڈی کی تاک میں ہردم رہے۔ غٹاغٹ جام شراب پیئے اور ہم میلے ٹھیلے بھی نہ جانے دیں گے اور محلے کی کسی عورت کو بھی نہ آنے دیں گے اور یہ بھی یاد رہے کہ چھریرا بدن ہو نزاکت سے آنچل کا بوجھ نہ اُٹھ سکے کمر لچک جائے کروڑوں بل کھائے ہنس مکھ بھی ضرور ہو مردوں کو ہنسائے مگر یہ نہیں کہ پھٹی جوتی کی طرح موقع بے موقع محل بے محل دانت کھول دے۔ ہاں اور بلڑی نہ ہو ورنہ اجیرن ہو جائے گی۔ طرار ہو۔ مکار ہو۔ عیار ہو۔ ستمگار ہو طرحدار ہو۔ باغ و بہار ہو۔ وہ ترچھی چتون وہ بانکی ادا کہ بیساختہ زبان سے نکل جایا کرے تیری بانکی ادا نے مجھے مارا۔ گانے بجانے کو عیب نہ سمجھتی ہو بلکہ وقت بے وقت تھرکنے میں عار نہ ہو۔ لیکن چال بھونڈی نہ ہو بھدّے پاؤں نہ پڑیں۔ جب چلے اٹھلا اٹھلا کر۔ درخواستیں کھٹا کھٹ بندۂ درگاہ کے پاس آئیں۔ مگر ٹکٹ چسپاں نہ ہوں گی تو بیرنگ واپس۔ مکرر یہ کہ بی صاحب کے رُخ انور پر ریش مبارک نہ ہو۔

آزاد۔ اور تو خیر۔ مگر یہ ڈاڑھی کی بڑی کڑی شرط ہے۔ یہ انوکھی بات بتائی، اچھی قید لگائی۔

بہار۔ واہ معقول۔ آپ کیا جانیں۔ اجی قبلہ یہ نکاح کی شرطیں ہیں احتیاط شرط ہے۔ جب شرطیں ہی کرنے پر آئے تو کوئی بات اٹھا کیوں رکھیں کہ پیچھے ہماری مونچھ ان کے ہاتھ اور ان کی ڈاڑھی ہمارے ہاتھ میں ہو۔

آزاد۔ اجی بندہ نواز عورت کی ڈاڑھی چہ معنی دارد؟

بہار۔ معنی سے کیا مطلب یہاں تو صورت کا ذکر ہے۔ بھئی چاہے جو ہو یہ پخ ہم ضرور لگائیں گے احتیاط شرط ہے۔ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست۔

انور۔ قبلہ سنیئے جورو کی تو پیچھے فکر کیجیئے گا پہلے دماغ کی فکر کیجیے۔ سڑی سودائی کو جورو سے کیا کام۔

بہار۔ جی تو دماغ کی آپ جیسے زیادہ فکر کریں۔ بندے کا دماغ خوب چاق ہے دیکھئے آج کے آٹھویں ہی دن کسی شوخ و شنگ سے بیاہ نہ رچے تو سہی مگر یار شرطیں ۔ ۔ ۔ کا کرتے ہیں۔

آزاد۔ اور خصوصاً یہ ڈاڑھی والی!

لے جھجڑ والے

ضلع جگت

ایک اتوارے میں انور عربی پروفیسر ہو گئے۔ سمجھے تھے کہ ٹکا سا جواب آئے گا مگر گھٹ سے درخواست منظور اور نادری حکم کہ بقچہ سنبھال کر تڑسے دھمکو۔ ذری دیر ہوئی اور عہدہ غتربود۔ انور تو نوکری پر ادھار کھائے بیٹھے ہی تھے جھپ پر کمر لیس ہو لیا بدھنا اٹھا روٹیاں اور گوشت دسترخوان میں باندھ لڑکے کو چوم بیوی سے مل چل پڑے۔

شکرم گھڑگھڑ کرتی ہوئی چلی۔ انور نے کہا۔ الوداع! ۔آزاد بولے۔ فی امان اللہ۔ جب تک شکرم نظر آئی حیرت کے ساتھ میاں آزاد دیکھا کیے۔ جب نظر سے اوجھل ہوئی تو یہ بھی کھسکے چلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اثنائے راہ میں پانچ چھ نوجوان سفید پوش شریف و نجیب سڑک پر جا رہے ہیں۔ مگر سب خوش رو۔ خوش خو۔ میاں آزاد نے پوچھا یا حضرت کہاں کی تیاریاں ہیں؟ کہیں مشاعرہ ہے یا ناچ رنگ کا جلسہ۔ جی نہیں جلسہ نہ مشاعرہ مگر جہاں چار آدمی بیٹھ گئے وہیں جلسہ ہے۔ اس وقت چاندنی خوب نکھر رہی ہے جی چاہتا ہے کہ لپک کر چاند کا مکھڑا چوم لوں۔ ہم یاران بذلہ سنج مرنجان مرنج نے ٹھان لی کہ گلگشت چمن اور تماشائے نسرین و نسترن کریں لو عروسان چمن کا جوبن لوٹیں۔ نرگس شہلا سے آنکھیں لڑائیں شادیانے بجائیں دھماچوکڑی مچائیں خوب مزے اڑائیں شب ماہ کے لطف اٹھائیں۔ آئیے آپ بھی تشریف لائیے باغ میں قدم رنجہ فرمائیے عزت بخشیے رتبہ بڑھائیے۔

میاں آزاد تو ایک ہی بے فکرے نمبر اوّل کے کوچہ گرد جھٹ سے راضی ہو گئے۔ باغ میں پہنچے تو ایک چبوترے پر جا ڈٹے۔ پہلے کچھ عرصہ تک شعر خوانی رہی پھر بعد ازاں ضلع جگت کی ٹھہری جو ہے ضلع میں طاق جگت بازی میں مشاق پہلے حقے کا ضلع شروع ہوا۔ میاں تم کندن کیے دیتے ہو۔ ایک تش ہم بھی تو لیں اسے مسل و جل قش کے کیا معنی؟ حضرت جی یہ قشید ن سے ہے بہت دم نہ دیجیے۔ واللہ کیا گرما گرم آدمی ہو۔ بندے کا مکان مثل دروازے میں ہے اور ہمارا مسکن تو چرخ چنبریں ہے۔ یہ آدمی ہے یا الٹا تو انمبا کو کا پنڈا یہ حقہ بازی ہم خوب سمجھتے ہیں اجی ایسے مدار یئے ہم نے بہت چلتے کیے اس کو کوئی لے کر کرے کیا لے بہت چٹخیے نا۔ آپ تو میری باتوں سے سوخت ہوئے جاتے ہیں۔ بندہ تازہ دم ہے۔ وہی ڈھاک کے تین پات۔ واللہ آپ کا سر تو چھلا چھلایا ناریل ہے۔ یار تو تو پریت کی طرح چمٹا۔ تمہارا ضامن کون ہے۔ میاں کل تک تو کوڑی گنا بیچتے پھرتے تھے آج باتیں بناتے ہو۔ لے اب برف کی قفلی کھائیے۔ بہت ٹرائیے نہ ورنہ بیچ لم لگائیں گے۔ بھئی کیا نے کی اڑائی۔ واہ چلم کا تلازمہ تو رہا ہی جاتا تھا اب اس کو چھوڑیئے اب بے تکی ہونے لگی چل سٹک۔ آئیے پان کا تلازمہ ہو بھئی واللہ کیا خوب بنگلہ ہے۔ دساور سے مال آیا ہے۔ میرے جوتے کا پان خوب چمکتا ہے۔ بہت چبا چبا کر باتیں نہ کیجیے آج تو میں سرخرو رہا۔ آپ سبز بخت ہیں۔ ذری کپوری سنگھ کو تو بلانا۔ برگ سبز است تحفۂ درویش۔ آپ کے پانوں کا نیاں کیا ہے۔ چکنی چپڑی باتیں ہیں ہیں تیرا یار کتھا۔ ایں! یہ کیا حضرت یہ کتھے کا تلازمہ ہے۔ لاحول ولا۔ بس لگے بے تکی اڑانے آئیے گانے بجانے کا تلازمہ ہو۔ واہ بندہ نواز کیسے آج تار برقی کیا ہے۔ طبیعت ناساز ہے۔ آپ مستان شاہ ہیں دنیا کے پردے پر ایسا گھمنی نہ ہو گا۔ کیا بے وقت کی شہنائی بجائی ہے۔ بے تال کیسی بڑھیے۔ بھئی تمھیں قسم ہے آپ کے گلے میں توڑا ڈال دو، دیکھیے دبل نہ جائیے گا۔ جنگل کی دھن ہے یہ سر ہے یا تونبی۔ اب میں کہیں کان نہ اینٹھوں۔ اچھا راگ لائے۔ بھئی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ بس بس

تانت باجی اور راگ بوجھا۔ بے وقت کی شہنائی ہے۔ واہ یہ ہو چکی ہے۔ چلو خوشی کے شادیانے بجاؤ۔ کہیں لونڈے تالیاں نہ بجائیں۔ وہ ناچ نچاؤں کہ عمر بھر یاد کرو۔ بے بھاؤ کی پڑنے لگیں گی۔ آدمی ہے یا گھنچکر۔ اپنا تو کلیان ہوگیا۔ آئیے اب کھانے کا ضلع ہو۔ بھئی نوجوانان مے آشام سے خدا بچائے۔ آپ کی دال نہ گلنے کی۔ جی چپڑی اور دو دو۔ ظرافت تو آپ کے خمیر میں ہے نمک تو ماش کا آٹا ہوئے جاتے ہو۔ یہ ناحق اپنے ڈھائی چاول گلاتے ہیں۔ آپ کے منہ میں گھی شکر۔ اچھی کھچڑی پک رہی ہے۔ کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ جاؤ ہنڈیا چڑھاؤ۔ آج تو پانچوں گھی میں ہیں اور سر کڑھائی میں۔ اس میں پوری نہ پڑے گی۔ اب مٹر گشت کیجیے۔ ابکی ہولی میں شبرال کھائیں گے۔ پاؤں تو تمھاری بوٹیاں ہی چبا جاؤں۔

میاں آزاد نے جو دیکھا کہ اب کی یہ سب کے سب جھک مارنے لگے تو وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔

میاں آزاد ایک روز مٹر گشت کرتے ہوئے ایک محلے میں جا نکلے تو سنتے کیا ہیں کہ ایک شخص کراہتا اور غل مچا مچا کر چلاتا ہے، ہائے مرا، ارے مرا، ہائے جان گئی۔ باپ رے باپ، یا خدا بچائیو۔ اُف اُف۔ ہائے ہائے۔ ارے کوئی دوڑو۔ خداوندا موت دے۔ یاالٰہی میری سن لے۔ اُف اُف۔ ادھر ان کے کان میں جو بھنک پڑی تو آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھے پر چل ہی کھڑے ہوئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک ضعیف آدمی دقیانوس کا ہمعصر چھپر کھٹ پر لیٹا ہوا سسک رہا ہے۔ مگر چہرے سے موت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہے۔ انھوں نے نبض پر ہاتھ ڈالا تو پتا ہی نہیں۔ سینے پر ہاتھ لے گئے تو کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ پوچھا مزاج کیسا ہے؟ صدائے برنخواست۔ اشارے سے دریافت کیا کہ کیسے ہو؟ آنکھ بند کر لی۔ دو گھنٹے تک سسکتا رہا۔ بعد ازاں گھرا[1] لگا اور اوپر کی سانس بھرنے لگے۔ اور آناً فاناً میں مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔ میاں آزاد کا دل بھر آیا اور رقیق القلب تو تھے ہی، آٹھ آٹھ آنسو روئے۔ ایک مرد آدمی سے جو قریب بیٹھے تھے پوچھا کہ یا حضرت! بھلا یہ پیر مرد کس عارضے میں مبتلا تھے؟ اس نے آہ سرد کھینچ کر کہا کہ یہ نہ پوچھیے حمق کا عارضہ تھا۔ کیا حمق! یہ کون عارضہ ہے صاحب قانونچے میں اس کا کہیں پتا نہیں۔ طب اکبر میں اس کا ذکر بھی نہیں۔ یہ نیا عارضہ ہے۔ جی ام العوارض ہے۔ ذرا اس کے علامات تو بتائیے! جی حضرت کیا بتاؤں عقل کی مار اس کا خاص باعث ہے۔ عرض کروں کہ یہ پیر مرد اسّی برس کے تھے مگر عقل کے پورے نمبر چھو نہیں گئی۔ خدا جانے دھوپ میں بال سفید کیے تھے یا نزلہ سے یہ عارضہ ہو گیا تھا۔

اب سنئے کہ شامتِ اعمال سے حضرت کی پیٹھ پر ایک پھوڑا نکلا، دس دن تک علاج ندارد۔ دسویں دن کسی گنوار نے کہہ دیا کہ گل عباس کے پتے اور سرکہ باندھو۔ چپ چاپ راضی ہو گئے۔ سرکہ بازار سے خریدا۔ گل عباس کے پتے باغ سے توڑ لائے اور سرکہ میں پتوں کو خوب تر کرکے پیٹھ پر باندھا۔ دوسرے روز پھوڑا آدھ انگل بڑھ گیا۔ کسی اور نے کہہ دیا کہ بھٹکٹیا اور نمک باندھو۔ بسم اللہ کرکے آپ نے وہ بھی کیا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ بڈھے کچھ گھاس تو نہیں کھا گیا ہے، ارے پھوڑے کو بھٹکٹیا سے کیا واسطہ؟ فرمایا کہ واہ آپ کیا جانیں یہ کیا علاج تھوڑا ہی ہے یہ تو ٹوٹکا ہے۔ خیر صاحب ٹوٹکا سہی۔ خدا کرے اس چھومنتر کی کالی بوٹی سے آپ چنگے ہو جائیں۔

---

[1] مرتے وقت جب سانس رک رک کر اور اٹک اٹک کر چلتی ہے اسے گھرا کہتے ہیں۔

مگر بے بخیر۔ درد اور زیادہ شروع ہو گیا۔ کسی نے بتایا املی کی پتی اور دھتورہ اور گوبر باندھو۔ وہاں گیا تھا۔ فوراً منظور اب تڑپنے لگے، اُف اُف، اُف اُف لگے تلملانے اب ہوش وحواس باختہ آگ لگ گئی۔ محلے کی ایک عورت نے کہا میں بتاؤں مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ سہل ترکیب ہے۔ مولی کا آچار دفنا دو مگر تین تلے ہوں اور دفنا کر نکال لو اور نکال کر کنویں میں ڈال دو اور اپنے ہاتھ سے پانی بھرو۔ اُسی دم چنگے نہ ہو جاؤ تو ناک کٹا لوں۔ سوچے کہ بھئی شرط اس نے بڑی کڑی کی ہے کچھ تو ہے کہ ناک بدلی۔ جھپ مولی کے تلے لے دفن کیے اور پھر نکالے۔ کنویں میں تینوں تلے غڑاپ داخل۔ لگے پانی بھرنے۔ ڈول تھا وزنی اور اس پر طرّہ یہ کہ مارے درد کے تڑپ رہے تھے۔ رسّی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور حضرت دھم سے گرے۔ پھوڑا تو آپ جانئے شیشے کی مثال ٹھیس لگی اور بھی درد بڑھا، لگے تلملانے۔ آخر کار دم توڑا۔

آزاد۔ افسوس صد افسوس! ان مدعیانِ عقل سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ ہر کس و ناکس کی رائے پر علاج کیوں کر بیٹھتے ہو۔ جس نے جو بتایا آمنا و صدقنا منظور۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو عارضہ بڑھ جاتا ہے یا جان سن سے نکل جاتی ہے۔

نشہ بُری چیز ہے

ایک دن میاں آزاد حسبِ معمول کوٹ پتلون پہنے ترکی ٹوپی زیبِ سر کیے پُھرتی کے ساتھ کسی طرف جاتے تھے اور سامنے سے ایک صاحب آتے تھے۔ جب دونوں قریب پہنچے تو اس نے پوچھا حضرت آپ افیون تو نہیں کھاتے؟ خدا کی مار افیون پر شیطان کی پھٹکار۔ کسی ملعون نے آج تک ہاتھ سے بھی چھوئی ہو۔ افیونی کی صورت دیکھوں تو لاحول پڑھوں۔ اور جو کہیں افیون پر ہاتھ پڑ جائے تو آبِ گوہر سے ہاتھ دھوؤں۔ اس وقت اس کالی بلا کا نام زبان پر آیا بس جی چاہتا ہے کہ پونے دو سو گھڑوں سے زبان پاک کروں۔ یہ کہہ کر میاں آزاد ندی کے کنارے جا بیٹھے، وہاں سے پلٹ کر جو آئے ہیں تو کچھ اور ہی گل کھلا دیکھتے کیا ہیں کہ وہ ذات شریف پڑے آنکھیں مانگ رہے ہیں اور کراہتے ہیں۔ صورت پر مُردنی چھائی ہے۔ لب خشک۔ آنکھیں تر۔ سر کی فکر نہ پاؤں کی خبر۔ تب تو میاں آزاد چکرائے کہ یا الٰہی کیا اسرار ہے؟ پوچھا کیوں بھائی خیر تو ہے ابھی تو خاصے بھلے چنگے تھے۔ یہ اتنی جلد کایا پلٹ کیسی ہو گئی؟ کچھ منہ سے بولو سر سے کھیلو ع دریا ہے کہ درد لا دوا ہے۔ اس نے کانکھ کانکھ کر آہستہ سے کہا کہ یارو میں تو مرمٹا، بھائی کہیں سے پانچ چھ ٹکے کی افیون لے آؤ۔ پیوں تو آنکھیں کھل جائیں۔ جان میں جان آئے۔ بندہ چھٹپنے سے افیون کا عادی ہے۔ وقت پر نہ ملے تو نزع کی حالت پہنچے۔ ایں! یہ کیفیت ہے۔ حضرت آپ کا کہیں ٹھکانا ہی نہیں، کچھ انتہا بھی ہے چھ ٹکے کی افیون ایک ہی دفعہ نوش جان۔ آدمی ہے یا بلانوش بچہ۔ ایک دن ٹیں سے مر جائیں گے۔ جی بجا ہے اور آپ تو شاید آبِ حیات پی کر آئے ہیں۔ عاقبت کے بوریئے آپ ہی بٹوریئے گا واہ میاں واہ ہو نیکھے آدمی۔ چتون کہے دیتی ہے کہ بڑے دم خم کے آدمی ہو۔ رسی جل گئی مگر رسی کا بل نہ گیا۔ واہ آکا کیوں نہ ہو سسک رہے ہو مگر جواب ترکی بہ ترکی نہ دو تو دوزخ ہی نصیب ہو۔ حضرت افیون لانی ہو لا دیجیے ورنہ یہاں بک بک کا دماغ نہیں ۔

دوزخ مجھے قبول ہے یا منکر و نکیر   لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

جی تو اس بھر وسے بھی نہ رہیے گا کہ ہم اور افیون لائیں۔ ہم تو اس فکر میں بیٹھے ہیں کہ آپ مریں تو نوحہ موزوں کریں ع مرگیا کشتۂ تیغِ افیوں ۔ یہ پہلا مصرع ہوگا۔ ایک بات مانو تو ابھی لپک جاؤں اور افیون لاؤں۔ ذرا لکڑی کے سہارے سے اس ہرے بھرے پیڑ کے تلے چلو، وہاں ہری ہری گھانس پر لوٹ مارو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔ واہ اچھی صلاح ہے، لے میاں یہاں جان دو بھر ہے۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا کیسا؟ بھائی کہا مانو، میرے سہارے چلو۔

الغرض میاں آزاد نے اُس افیونی کو پیٹھ پر لادا اور لے چلے۔ ان کی یہ قطع کہ آنکھیں بند منہ کھلا ہُوا، معلوم ہی نہیں کہ جاتے کہاں ہیں ایک دفعہ میاں آزاد نے ان کو ندی میں لے کر غوطہ دیا۔ بس قیامت بپا ہو گئی۔ افیونی آدمی پانی کی صورت سے نفرت۔ لگے چلانے۔ بڑا غپا دے گیا۔ مارا پڑا کر دیا۔ عمر بھر میں آج ہی ندی میں قدم رکھا۔ خدا سمجھے تجھ سے۔ سن سے جان نکل گئی۔ ہو ہو ہو ہو ٹھٹھر گیا۔ او خدا ناترس اب تو رحم کر۔ اتنے میں میاں آزاد نے ایک اور غوطہ دیا۔ تیسرا غوطہ دیا۔ چوتھا غوطہ دیا۔ تابڑ توڑ کئی غوطے دیئے اب ان کی کیفیت نہ پوچھیئے۔ بس نگفتہ بہ کروڑوں گالیاں دیں۔ لاکھوں صلواتیں سنائیں۔ میاں آزاد نے ان کو ریتی میں چھوڑ دیا اور لیٹے ہوئے۔ اور پیو افیون۔ سنیئے صاحب ہم نے جو ایک دوستانہ صلاح

دی تو کہنے لگے تم عاقبت کے بوریئے بٹورو گے لوچڈ اگلجبرد اور بڑھ بڑھ کر باتیں بناؤ۔ بات تیرے کی۔

میاں آزاد وہاں سے چلے تو راہ میں ایک اور حضرت ملے۔ آداب عرض ہے تسلیم آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمائیے! بندہ چانڈو باز ہے۔ اس وقت شہر بھر میں چانڈو کی دکان ہی نہیں۔ سب چانڈو والے میلے گئے ہیں، وہاں جائیں تو شام ہو جائے اور پھر جا یا کس سے جائے گا۔ ہم تو نیم جان ہیں، آپ کچھ سبیل کر دیں تو بڑا ہی احسان ہو۔ میاں آزاد نے کہا میں بتاؤں سامنے ناک کی سیدھ چلے جائیے وہ ہرا بھرا پیڑ نظر آتا ہے۔ ندی کے کنارے وہاں ایک صاحب لیٹے چانڈو اڑا رہے ہیں۔ آپ بھی شریک ہو جائیں۔ آہا ہا ہا! اوہو ہو ہو کہہ کر اُچکنے ہوتے چلے کہ بھئی دو چار چھینٹے تو اڑائیں اور ذرا گرمائیں۔

میاں آزاد نے ایک پچاس قدم گئے ہوں گے کہ ایک اور ذات شریف سے دوچار ہوئے۔ کیوں بھئی گھبرو کبھی جام بھی دیکھا ہے؟ کیا جام! جام کیسا؟ جام جہاں نما کانوں سُنا ہے دیکھا نہیں۔ ارے میاں ہم تو اس جام کو پوچھتے ہیں جو کونین نما ہے کونین! کیا بخار کا عارضہ ہے۔ واہ بھئی اُلٹی کے سمجھنے والے۔ کونین دوا نہیں۔ میاں اب صاف صاف کہہ دیں۔ کبھی شراب بھی پی ہے؟ استغفراللہ! استغفراللہ!!

اجی تم تو گھامڑ ہی نکلے میاں ع نام خدا ہو جوان کچھ تو کیا چاہیئے۔ کیا کہیں بوتل میں اس وقت ایک بوند تک نہیں ورنہ آپ کو ضرور مزہ چکھاتے اس وقت طبیعت بے لطف ہے۔ بندہ ہر روز دو وقتہ شراب پینے کا عادی ہے۔ آج جان عذاب میں ہے۔

میاں آزاد نے کہا ہم بتائیں۔ وہ دیکھو سامنے املی کا پیڑ ہے چلے جاؤ وہاں دو چار آدمی بیٹھے چُسکی لگاتے ہیں۔ جاؤ غٹاغٹ شراب اڑاؤ۔ میاں شرابی تو کھل گئے۔ اے خانہ احسان آباد، واہ اُستاد کیا بات بتائی۔ اس وقت جان بچائی۔ چلو تم بھی ایک چُلّو میں اُلّو ہو۔ میاں آزاد نے کہا معاذاللہ، میں اور شراب یہ کہنے ہی تھے کہ ہنسیا کلوارن اُودی اُودی پھریا پھڑکائے اُدھر سے گذری۔ صورت دیکھتے ہی میاں آزاد سیدھے نوک دم بھاگے، پیچھے پھر کے دیکھنا قسم تھا۔ مگر دل ہی دل میں سوچتے جاتے ہیں کہ نشہ بھی کیا بری چیز ہے کہ ذرا وقت پر نہ ملا اور دم ٹوٹنے لگا۔

اپنے حلوے مانڈے سے کام

میاں آزاد کے تو پانوں میں آندھی روگ تھا۔ ادھر اُدھر چکر لگائے، راستہ ناپا اور پڑ کر سو رہے۔ ایک دن حسب معمول تنو ے کھلائے تو چلے سرا کی طرف۔ وہ تو کہئے خیر گذری کہ جوش جنوں نے جنگل نہ دکھایا۔ دونوں وقت ملتے سرا میں پہنچے۔ بڑی چہل پہل ہے۔ ایک طرف روٹیاں پک رہی ہیں۔ دوسری طرف دال بگھاری جا رہی ہے۔ بھٹیاریاں مسافروں کو گھیر گھار کر لا رہی ہیں۔ صاف ستھری کوٹھڑیاں دکھا رہی ہیں۔ حضرت ادھر اُدھر خوب گھومے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک کوٹھری کے پاس ایک صاحب لحیم و شحیم فربہ و جسیم۔ جیسے ہی چارپائی پر بیٹھنے لگے پٹی ٹوٹ گئی اور حضرت غڑاپ سے جھولنگے میں ہو رہے۔ ہائے موٹاپا بھی کیا بُری چیز ہے اُٹھا نہیں جاتا۔ آخر کار دایاں ہاتھ بھٹیاروں نے لیا۔ بائیں طرف میاں آزاد نے ہاتھ دیا اور بعد خرابی بسیار حضرت کو نکالا۔ جھلنگے سے باہر آئے تو نہایت ہی خفیف۔ پہلے تو بی بھٹیاری سے خوب گلخپ ہوئی۔ واہ اچھی چارپائی دی اگر جو میرا ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتا سر پھوٹ جاتا تو کیسی ہوتی۔ اے واہ میاں! اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ایک تو چھپر کھٹ کو چکنا چُور کر ڈالا۔ پٹی کے بہتر ٹکڑے ہو گئے۔ دیں گے ٹکا اور چھ گنڈے پر پانی پھیر دیا۔ دوسرے ہمیں کو للکارتے ہیں۔ الغرض لوگوں نے سمجھا بجھا کر جھگڑا پاک کیا۔

میاں آزاد نے پوچھا یا حضرت کہاں سے تشریف لانے کا اتفاق ہُوا؟ فرمایا یہیں تک آیا ہوں۔ معقول سوال دیگر جواب دیگر۔ قبلہ آپ آئے کہاں سے ہیں؟ جی وطن سے آتا ہوں۔ الٰہی خیر، وطن کا کچھ نام بھی ہے یا گمنام ہے؟ جی گوپامؤ[1] میں مکان ہے۔ لاحول آپ ہیں، آپئے۔ واللہ خوب ملے۔ تو یہ کہئے حضور کا دولت خانہ گوپامؤ میں ہے۔ خوش آمدی۔ خوش آمدی۔ یہاں کس غرض سے آنا ہوا۔ حضور جی بندہ حکیم ہے۔ یہ کہیے کہ آپ طبیب ہیں کیا! طبیب طبیب آپ خود ہوں گے۔ ہم حکیم ہیں۔ طبیب کہیں اور رہتے ہوں گے۔ خیر صاحب وہ طبیب نہیں۔ آپ حکیم بلکہ سلطان الحکماء سہی خفا کیوں ہوتے ہو صاحب۔ کیا یہاں مطب کرنے کا قصد ہے۔ اور نہیں تو کیا بھاڑ جھونکنے آیا ہوں۔ سنیچر پاؤں پر سوار تھا بھلا یہ فرمائیے کیسا مقام ہے، لوگ کس قیش کے ہیں، آب و ہوا کیسی ہے؟ حضرت یہ نہ پوچھئے۔ باشندے شورہ پشت چاق و چوبند آٹھوں گانٹھ کمیت اور آب و ہوا کا تو خیال ہی نہ کیجیے۔ برسوں رہیئے۔ اگر کسی دن سوءِ ہضم کی شکایت ہو تو جرمانہ دوں۔ پاؤ بھر کی غذا ہو تو تین پاؤ کھائیے۔ ڈکار تک لیجیئے تو مجھے سزا دیجیے۔

یہ سن کر حکیم صاحب نے مُنہ بنایا اور گو لاکھ ضبط کیا مگر بے اختیار بول اٹھے لاحول ولا قوۃ۔ بڑے بُرے پھنسے! ایں بُرے پھنسے! یہ کیوں؟ اجی آب و ہوا مرغوب ہے۔ بیماری کا نام نہیں، یہ تو اچھا مقام ہے لاحول چہ معنی دارد! حضرت آپ نرے کوڑھ مغز ہیں۔ ایک تو آپ نے یہ گولا مارا کہ آب و ہوا اچھی ہے تو ہم سے کیا واسطہ۔ ہمیں کون پوچھے گا۔ بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھے مکھیاں مارا کریں گے۔ ہم تو ایسے شہر جانا چاہتے ہیں جہاں ہیضے کا گھر ہو۔ بخار پیچھا نہ چھوڑتا ہو۔ ڈنگو روز ٹیٹوا دبوچے۔ قبض و پیچش کی سب کو شکایت ہو۔ آب و ہوا میں سم کی خاصیت ہو۔ چیچک کا وہ زور ہو کہ الامان حیب البتہ ہماری ہنڈیا چڑھے۔

---

[1] ایک قصبہ کا نام ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں کے لوگ احمق ہوتے ہیں۔

آپ نے واللہ آتے ہی گولا مار اچھے ہی پر ٹوک دیا اور انشاء اللہ کس ہمدردی سے آپ فرماتے ہیں کہ سوءِ ہضم کی شکایت نہ ہو گی۔ واہ سوءِ ہضم کی شکایت اُن کو ہوتی ہو گی جو ضعفِ معدہ کے عارضہ میں مبتلا ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ پاؤ بھر کے عوض میں تین پاؤ غذا کھانے لگوں۔ واہ وا واہ، بیڑا ہی کر دیا۔ آمدنی ٹکا نہیں اور کھائیں چوگنا تو فرمائیے مرے با جیئے۔ نا صاحب بندہ سویرے ہی اپنا بدھنا اُٹھا کر چمپت ہو گا۔ ایسے منحوس شہر میں میری بلا رہے جہاں سب ہٹے کٹے ہی نظر آتے ہیں۔ جسے دیکھو ڈنڈ پیل سنڈا بنا ہوا۔

بھلا کوئی خاص عارضہ بھی یہاں ہے یا عارضہ کا اس طرف گذر ہی نہیں ہوا۔ حضرت یہاں کے پانی میں یہ تاثیر ہے کہ برسوں کا مریض آئے اور ایک قطرہ پی لیا چاہئے بس خاصہ ہٹا کٹا۔ لاحول! پانی کیا ہے آبحیات ہے تو سہی جو پانی میں زہر نہ ملا دیا ہو اے قبلہ ہزاروں کنوئیں سیکڑوں اندارے پچاسوں باؤلیں کس کس میں زہر ملتے پھریئے گا۔ خیر بھئی سمجھا جائے گا۔ مگر بُرے پھنسے واللہ بہت بُرے پھنسے۔ اس وقت ہوش ٹھکانے نہیں ہے۔ مہترانی! بی مہترانی! مہترانی ذری ہم کو پنساری کی دکان سے تولہ بھر سکنجبین تو لا دینا۔ اس وقت جی قابو میں نہیں ہے۔ اے میاں پنساری یہاں کہاں۔ کسی فقیر کی دعا ایسی ہے کہ یہاں حکیم اور پنساری جمنے ہی نہیں پاتا۔ کئی حکیم آئے مگر گور رہیں ہیں۔ کئی پنساریوں نے دکان جمائی مگر چتا پر پھونک دیئے گئے۔ یہاں تو بیماری نے آنے کی قسم کھائی ہے۔ ارے توبہ! ارے توبہ! بھئی واللہ کیا نکما شہر ہے خدا وندا بچائیو۔ اس طرف رُخ جو آج سے کرے اُس پر لعنت۔ لے یارو خدا کے لیے ہمیں ٹٹو کرایہ کر دو تو رفو چکر ہو جائیں۔ بیچ پی ہزار نعمت کھائی۔ ایسے شہر کی ایسی تیسی غضب خدا کا یہاں پنساری کبریتِ احمر کا حکم رکھتا ہے۔

میاں آزاد نے ان کو چھوڑا تو سرا کے دوسرے گوشہ میں ہو رہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگوار گوش محل میں بستر جمائے، فوق البھڑک کپڑے پہنے کھڑے ہیں۔ یہ بے تکلف آدمی السلام علیکم کہہ کر گوش محل میں داخل ہو گئے۔ وہ بھی بڑے تپاک سے پیش آئے۔ ہاتھ ملایا۔ بغلگیر ہوئے تعظیم کی۔ لطف و اخلاق سے بٹھایا۔ مزاجِ اقدس الحمد للہ۔ جناب کا مزاج عالی۔ شکر ہے۔ میں تو ایک مسافر غریب الوطن ہوں۔ آپ نے بڑی بندہ نوازی فرمائی اور ممنونِ احسان کیا۔

میاں آزاد سمجھ گئے کہ یہ کوئی بڑے لشان آدمی ہیں۔ پوچھا آپ یہاں کس تقریب سے تشریف لائے ہیں۔ فرمایا عرض کروں پیر و مرشد میں وکیل ہوں۔ قصد ہے کہ یہاں وکالت کروں۔ کہیے یہاں عدالت کی کیا کیفیت ہے؟ میاں آزاد نے فرمایا یہ نہ پوچھئے یہاں کے باشندے بھیگی بلّی ہیں۔ لڑنا بھڑنا جانتے ہی نہیں۔ سال بھر میں دو چار مقدمے شاید ہوتے ہیں۔ چوری چکاری یہاں کبھی سننے ہی میں نہیں آتی۔ زمین اراضی لگان پٹی داری حقیت کے مقدمے کبھی سُنے ہی نہیں۔ قرض کوئی لے نہ دے۔ وکیل صاحب کا رنگ زرد ہو گیا۔ مگر حکیم جی کی طرح مضبوط تو تھے ہی نہیں کہ بلبلا اُٹھتے نہایت متانت سے فرمایا کہ سبحان اللہ بڑے مسکین آدمی یہاں بستے ہیں، مگر دل میں افسوس ہوا اس ٹیم ٹام دھوم دھام سے آئے اور یہاں وہی ڈھاک کے تین پات ان کو بھی چھوڑا اور یہاں سے اور طرف چلے۔

دیکھا کہ چارپائی بچھائے شہتوت کے پیڑ کے تلے ایک صاحب بیٹھے حقہ اُڑا رہے ہیں۔ پوچھا آپ کا اسم شریف؟ فرمایا گمنام۔ پوچھا مسکن؟ فرمایا۔ ع

درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست

پوچھا پیشہ؟ فرمایا خونِ جگر کھانا۔ آ ہاہ۔ آپ شاعر ہیں یہ کہہ کر میاں آزاد چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئے۔ لے حضرت حقہ تو بندے کے حوالے کیجیے اور آپ اپنا کلام سنائیے۔ بسم اللہ شاعر موصوف نے بہت کچھ چنیں و چناں کے بعد

پڑا یا کلام اپنا کہہ کر سنایا۔ سبحان اللہ حضرت آپ تو شاعرِ غرّا ہیں۔ عرض کروں حضرت شاعرِ غرّا ہونا تو محال ہے مگر آپ قدردان آدمی ہیں۔ ورنہ شاعرِ غرّا تو عرب میں متنبیؔ اور امراءالقیس۔ فارسی میں سعدی و خاقانی و فردوسی و انوری۔ ہندی میں کالیداس اور کبراج اور اُردو میں انیسؔ و دبیرؔ و آتشؔ و میرؔ گذرے ہیں باقی خیر صلاح۔ اچھا حضرت کچھ اُردو کلام تو سنائیے۔ بہت خوب ؎

داغ دے جاتے ہیں جب آتے ہیں — یہ شگوفہ وہ نیا لاتے ہیں

سبحان اللہ داغ کے لیے شگوفہ کیا خوب (تسلیم)

بار تک بار کہاں پاتے ہیں — راستہ ناپ کے رہ جاتے ہیں

کیا بول چال ہے کیا روزمرّہ ہے (آداب)

پھر جنوں دشت نہ دکھلائے کہیں — آج تلوے مرے کھجلاتے ہیں

اوہوہو۔ کیا زبان ہے۔ سبحان اللہ حضرت (کورنش)

ٹال جاتے ہیں جو بوسہ مانگا — بات مطلب کی چبا جاتے ہیں

بارک اللہ زبان چوم لے۔ بوسے کے لیے چبانا بھی کیا خوب ہے۔

پھول کا جام پلا او ساقی — کانٹے تالو میں پڑے جاتے ہیں

اہاہا۔ پھول کے لیے کانٹے

کنگھی کے نام سے ہوتے ہیں خفا — بات سلجھی ہوئی اُلجھاتے ہیں

اس کے بعد شاعر نے پوچھا کیوں حضرت یہاں کے رؤسا میں کوئی قدردان شعر و سخن بھی ہے؟ یہ نہ پوچھئے یہاں مارواڑی البتہ رہتے ہیں۔ کتاب یا کتب فروش، شاعر یا منشی کی صورت سے نفرت ہے۔ یہاں کے رؤسا سے کچھ بھروسا نہ رکھیئے وہ شعر و شاعری کے قریب نہیں پھٹکتے۔ لاحول ولا قوۃ۔ تو یہ آنا ہی بیکار رہا۔

مصاحبت

میاں آزاد کڑی کمان کے تیر کی طرح چل کھڑے ہوئے اور سیدھے ریل کے اسٹیشن پر پہنچے۔ لگے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرنے۔ پل مارنے کی دیر ہوئی تھی کہ سامنے سے نور کا بقعہ نظر آیا۔ چکا چوند کا عالم تھا۔ ان کے کان کھڑے ہوئے کہ ایں گُل دیگر شگفت۔

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ اغل بغل مشعل دستی روشن، اِدھر اُدھر مصاحبین رفقا خوشامد خورے لیمو نچوڑ بیچ میں ایک امیر کبیر رئیس ابن رئیس بڑے ٹھسّے سے آرہے ہیں۔ ہٹو بچو دور باش وادب کی آواز بلند ہے۔ سب کے پہلے اُس جھنڈ کی نظر میاں آزاد پر پڑی۔ جو ہے انھیں کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ یہ اس وقت وحشت میں جو آئے تو اور بھی ڈبل چال چلنے لگے۔ رئیس کے مصاحبین سب حاضر جواب، تیز طبیعت، زبان دراز، فقرہ باز، ٹھٹول، ضلع جگت میں طاق، پھبتی کہنے میں مشاق، آوازہ کسنے میں شہرۂ آفاق تھے۔ پھبتی نہ کہیں تو ذہن کند ہو جائے۔ ایک نے کہا حضور دیکھیے گا یہ فرنگی بھی اللہ عقل کے پتلے ہیں۔ آسمان میں انھوں ہی نے تھگلی لگائی ذری دیکھیے تو بے پٹری کے چھوٹا موٹا انجن چبوترے پر چلا دیا۔ دوسرا بولا خدا کی قسم کیا لاگ ہے۔ تیسرے صاحب نے فرمایا خداوند یہ چلتا پرزہ ہے۔ چوتھے ماشاءاللہ ذری اس وحشت کو ملاحظہ فرمائیے گا۔ یہ اقتباس یہ گرمی اور آپ سیاہ بانات کا دگلا ڈانٹے گھوم رہے ہیں پانچواں بادہ انانیت کے نشے میں جھوم رہے ہیں چھٹا یہ مرہٹہ یا ڈھیلے والا کدو ہے توند ہے یا ہانگر مٹو کا تربوز۔ ساتواں ماشاءاللہ کیا چہرہ نورانی ہے۔

میاں آزاد نے دیکھا کہ پھبتیوں کا گراب[1] ہی پڑنے لگا جسے دیکھو نئی سناتا ہے۔ جو ہے وہ بناتا ہے تو پر پرزے جھاڑ کر یہ بھی جواب ترکی بہ ترکی دینے پر آمادہ ہوگئے۔ جیسے ہی ایک مصاحب نے کہا کہ ماشاءاللہ کیا چہرۂ نورانی ہے۔ میاں آزاد تڑ سے بول اُٹھے۔ واللہ اچھا غول بیابانی ہے۔

ایک اور صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ اسم مبارک؟ میاں آزاد نے کہا۔ آپ کا مزاج پلید؟ دوسرے نے قہقہہ لگا کر کہا کس کھیت کے ہو؟ یہ بولے بھیڑیئے کے بھٹ سے کب نکلے بھئی۔ رئیس کو میاں آزاد کی باتیں ایسی بھائیں کہ پاس بلوا لیا۔ حضرت آپ اس وقت چوکھو لڑ رہے تھے۔ یہ آپ ہی کا کام ہے میاں آزاد جھک کر ایک فرشی سلام بجا لائے۔ رئیس با توقیر تو امیر کبیر تھے ہی جس سے خوش ہوئے دم کے دم میں نہال کر دیا۔ فرمایا کہ آج سے ہمارے ساتھ رہا کیجیے۔ خانہ احسان آباد بہت خوب ہمراہ رکاب ہوں۔ جہاں حضور کا پسینہ گرے میں خون گراؤں۔ کوئی تیکھی چتون سے دیکھے تو آنکھیں پھوڑ ڈالوں۔ مصاحبوں کو میاں آزاد کا ذکر ہونا کانٹے کی طرح کھٹکا۔

ایک۔ (دبے دانتوں) پیر و مرشد استخارہ تو دیکھ لیں واجب آئے تو کیا مضائقہ!

دوسرے۔ (جل بھن کر) خداوند بے سمجھے بوجھے کیونکر یہ رکھ لیے گئے۔ خدا جانے چور ہیں اچکے ہیں۔ خونی ہیں یہ ہیں کون بلا۔ اور یوں صورت سے تو مرد آدمی سب ہی معلوم ہوتے ہیں مگر کسی کے دل کا حال کیا معلوم؟

تیسرے۔ بیشک، کیا چوٹٹوں کے سر پر دو سینگ ہوتے ہیں۔

---

[1] بندوق کی نالی سے بہت سے چھروں کا ایک ساتھ نکلنا۔

چوتھے - حضور والا یہ ایک دفعہ جعلی دستاویز بنانے کی علت میں ماخوذ ہو چکے ہیں۔
پانچویں۔ ابھی یہ تو برف بیچا کرتے تھے۔ مگر واللہ اچھا نقشہ جمایا۔
چھٹے - خداوندان کی چشم ازرق پر نظر فرمائیں یہ عین دلیل طوطے چشمی کی ہے۔
ساتویں۔ نا صاحب ان کا یہاں کہاں ٹھکانا۔

میاں آزاد سب کی بانگ سن کر بولے، پیرومرشد یہ سب چوٹے اٹھائی گیرے ہیں۔ جانبازوں میں بندہ درگاہ ہی ہے۔ اچھا ایک کام کیجئے اسٹیشن پر کوئی کام بتا دیجئے۔ دیکھئے کون حسن لیاقت سے انجام دیتا ہے۔

مصاحب۔ آپ تو ریل کے خلاصیوں میں کام کر چکے ہیں۔ آپ سے اس میں کون بڑھے۔

آزاد۔ اچھا حضور عروض میں کچھ سوال و جواب ہوں۔ دیکھئے ان سب کا قافیہ تنگ کر دیتا ہوں یا نہیں۔

اتنے میں ایک صاحب نے جھلا کر کہا۔ ابے واہی تو لبے ٹیں ٹیں لگاتی ہے۔ کہیں ہیں ایک گدا نہ دوں حضور کو بھولا بھالا سادہ مزاج دیکھ کر بہت چل نکلا ہے۔ چل الگ ہٹ۔

میاں آزاد یہ گیدڑ بھبکیاں! اسے کیوں نہ ہو۔ شان خدا آپ اور ہمیں گدا[1] دیں۔ سن او گاؤدی ہم گدا لگانے والے نہیں۔ کیا کہوں ایک رئیس کے مصاحبوں میں نہ ہوتا تو اسی دم میں گردن ناپتا۔ مگر کل تم کو ٹھیک بناؤں گا۔ اس میں ایک اور رفیق نے ڈپٹ کر کہا۔ آپ ہیں کس بھکوئے رئیس کے مصاحب! میاں آزاد نے کہا دیکھئے خداوند نعمت ایسے مصاحب ہیں حضور کے ایک تو حضور کے سامنے گدا دینے پر آمادہ ہیں دوسرے پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے۔ تیسرے نے آپ کے دشمنوں کو بھکوا بنایا۔ چوتھے صاحب نے فرمایا کہ ہمارے آقا بھولے سادے آدمی ہیں۔ سب کون نہیں جانتا کہ بھولا اور سادہ اس زمانے میں گاؤدی احمق گھامڑ سے مراد ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

رئیس کو یہ کلمے ایسے بڑے معلوم ہوئے کہ فوراً مصاحبوں کو نکالا۔ جس نے بھکوا کہا تھا وہ تو کھڑے کھڑے موقوف ہوا۔ کیوں بے نمک حرام یہ کیا بات جیت تھی جس کا نمک کھائے اس کو بھکوا بتائے۔ ابھی موقوف ان کو نکال دو۔ میاں آزاد نے (بہت خوب پیرومرشد) کہہ کر ان کو تو اسٹیشن کے باہر نکالا۔ اب ان کی شامت آئی جو سادہ مزاج بتاتے تھے۔ کیوں بے مرنگ ہم احمق ہیں بھولے ہیں گدھے ہیں۔ ابھی دور ہو سامنے سے۔ اگر ڈیوڑھی پر آیا تو رئیس نے تو کہا ہی تھا کہ میاں آزاد نے نقرا پورا کر دیا (تو وہ بے بھاؤ کی پڑیں گی کہ سر پر ایک بال نہ رہے گا) رئیس نے پوچھا کوئی ہے؟ حاضر پیرومرشد کہہ کر آزاد نے ان کی گردن ناپی اور اسٹیشن سے بدر کیا۔ خبردار جو ڈیوڑھی پر کیا تو جانے گا۔ اب ان حضرت کی باری آئی جو گدا دیتے تھے۔ ہاں جی کیا تم نے کہا تھا ذرا پھر تو کہنا۔ گدا دو گے۔ میری طرف دیکھو۔ گدا دو گے اللہ اللہ اب اتنے ہو گئے کہ جس کو ہم نوکر رکھیں اس کو آپ گدا دیں ہٹ سامنے سے۔

میاں آزاد نے دیکھا کہ سب کے سب کا موقوف ہونا اچھا نہیں بتو کس مزے سے کہتے ہیں اے خداوند ان سے مجھ سے مذاق ہوتا ہے جانے دیجئے۔ دیکھو جی تم کو رئیسوں کی ابھی صحبت نہیں رہی ہے کوئی اپنے آقا کے نام کے سامنے ایسا کلمہ منہ سے نکالتا ہے۔ سے اب خطا معاف کدورت صاف کراؤ ہاتھ جوڑ و قدموں پہ ٹوپی رکھو۔ بیچارے نے چار ہاتھ جوڑے اور کانپتے ہوئے کہا۔ خداوند قصور ہوا۔ از خوردان خطا از بزرگان عطا۔

---

[1] گھونسہ ۔

اب سنیئے کہ میاں آزاد نے کہا چلیئے حضور ہوٹل گھر دکھا دوں۔ رئیس گردوں مدار مع مشغل دستی و رفقا چلے تو آزاد نے کہا۔ حضور اگر میرا کہنا مانیں تو اس غث کے غث کو ساتھ نہ لے چلیں۔ ان کو حکم دیجیئے کہ باہر جہاں گاگڑ والا بیٹھا ہے وہاں ٹھہریں اور دستی گل کر دی جائے حضور شریف لے چلیں۔ کمترین ہمراہ رکاب ہو اور ایک خادم باادب۔ بس اُدھر رئیس مع آزاد مصاحب خاص اور خادم باادب کے ہوٹل کی طرف چلے اِدھر مصاحبین میں ہنڈیاں پکنے لگیں۔ واہ بھئی واللہ ہم سمجھے تھے کہ ہم ہی زمانے بھر کے فقرہ باز ہیں مگر یہ ہمارے بھی چچا نکلے۔ آدمی کیا بلا ہے بے دھاں ہے۔ یہ وہ کالی ناگن ہے جس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ ابھی سونگھ جائے تو انسان ٹیں کر کے رہ جائے۔ ارے یار ہم جانتے تو اس بدبخت پر آوازے ہی کستے۔ کیا کہیں شدنی بشدنی۔ دیکھو واللہ چٹکیوں میں رنگ جما یا۔ آتے ہی دو کو کھڑے کھڑے نکلوا دیا اور تیسرے کی خطا معاف کرائی۔ ایسے دخیل ہو گئے اور سنیئے کس فقرے سے ہم سب کو اس وقت ٹہلا یا۔ اور گاگڑ والے سے مصاحبت گرانے کا حکم دلوایا! بات تیری دُم میں موٹا سا رستا باندھوں مصاحب خاص بننے ہیں چڑا۔ یار وبے ڈھب ہوئی اب اس مردود کا نکلنا مشکل ہے۔ اس پر فقرہ چلنا سخت دشوار ہے پرلے درجے کا مکار طرار عیار ہے۔ واللہ ہنسی آتی ہے۔ جی آپ کو تو ہنسی آتی ہوگی ہماری روح تو رو رہی ہے۔ بھلا ہنسی کا یہ کون موقع ہے جس طرح دودھ سے مکھی نکالی جاتی ہے۔ اس طرح ہم آپ برسوں کے رفیق نکال دیئے گئے۔ کٹ جانے کا مقام ہے خود مصاحب خاص الخاص بن بیٹھے۔ اب کوئی ایسی فکر کرنا چاہیئے کہ اب یہ جمنے نہ پائیں۔ ہم بتائیں مشہور کر دو کہ یہ بوچڑ ہیں۔ نیچ قوم۔ ہمارے حضور کو اس کا بڑا خیال ہے۔ بھئی جو ابھی موقوف نہ کر دیں تو ہاتھ کٹا تا ہوں ناک ناک بدتا ہوں۔ واللہ بوچڑ کی خوب سوجھی مگر کہے کون۔ کسی دیرے غیر بے باک کلیان کو لگا دو۔

اُدھر رئیس خورشید کلاہ کو آزاد شیخو خیبت پناہ نے ہوٹل دکھایا لمونیڈ کا ایک جام پلایا اور خراماں خراماں اسٹیشن کے باہر سیر کرا لے لائے۔ مصاحبوں نے دیکھا کہ مصاحب خاص سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے آتے ہیں۔ ایک شخص کو پہلے ہی سے سکھا پڑھا رکھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر آوازہ کسا کہ واہ رے زمانے کے اُلٹ پھیر

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

شریف بے چارے تو نکالے جائیں اور قوم کے بوچڑ رئیسوں کی مصاحبت پائیں۔ اتنا سننا تھا کہ رئیس کے کان کھڑے ہوئے۔ ان کو نیچ قوم خصوصاً بوچڑوں سے بہت نفرت تھی۔ فوراً میاں آزاد سے بیساختہ پوچھ بیٹھے کہ کیا آپ بوچڑ ہیں؟ اتنے میں ایک مصاحب چلا اُٹھے۔ نہیں تو اور ہیں کون۔ دوسرے نے موقع پا کر کہا ابھی کل تک تو کلیجی بیچتے تھے۔ آج حضور کے مصاحب خاص ہوئے۔ ایاز قدر خود بشناس۔ کیا مزے سے گرما رہے ہیں۔ گوشت بیچتے بیچتے عمر گذر گئی اب باتیں بناتے ہو اور رئیس زادوں کو بہکاتے ہو۔ اب میاں آزاد حیران ہیں کہ یہ سر دست اچھی خوب پچھاڑا۔ کیا دل گردہ ہے کہ کلہ بکلہ بوچڑ بنا رہے ہیں! الغرض میاں آزاد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ مصاحبین کا داؤ چل گیا۔ میاں آزاد بیچارے بوچڑ بنا کر نکالے گئے اور مصاحبین نے کہنا شروع کیا کہ حضور تو اس بوچڑ والے کے دم میں اچھے آگئے۔ ہم برسوں کے جاں نثار ریشت ہا پشت کے نمک خوار گاگڑ والے کے سپرد کیے گئے اور وہ حضور کے ساتھ ساتھ اسٹیشن کی سیر کر رہا تھا صاحب لوگوں نے دیکھا ہوگا تو کیا کہا ہوگا کہ یہ امیر آدمی اور بوچڑ کے ساتھ ہُوا کھا رہے ہیں۔ الٰہی توبہ۔ الٰہی توبہ!

چلّو میں اُلّو

میاں آزاد ایک روز چلے جاتے تھے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک چوراہے کے نکڑ پر بھنگ والے کی دکان ہے اور اُس پر اُن کے ایک لنگوٹیے یار بیٹھے ڈینگ کی لے رہے ہیں کہ ہم نے جو خرچ کر ڈالا وہ کسی کو پیدا کرنا بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ لاکھوں کمائے، کروڑوں لٹائے۔ اتنے میں میاں آزاد نے جھک کر کان میں کہا۔ واہ بھئی استاد کیوں نہ ہو۔ لفاظی کے صدقے۔ بابا! تو آپ کے عمر بھر فالودہ بیچا کیے۔ آپ نے کمایا کیا اور لٹایا کیا؟

اس نے کہا آپ بھی نرے گاؤدی ہیں۔ ارے میاں اب گپ اڑانے سے بھی گئے گزرے اور پھر اتنا تو سمجھو کہ یہاں جانتا کون ہے۔ میاں آزاد تو ایک سیلانی آدمی تھے۔ خود بھی تپائی پر ڈٹ گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک درخت کے تلے چھپر پڑا ہے صاف ستھرا ایک تخت بچھا ہے۔ دو تین لٹیاں دو ایک گھڑے ٹوٹل رستی لوٹے کونڈی بھنگ بھری دستورہ شکر کالی مرچ یہ سب سامان موجود ہے۔ بھنگ والا سل پر رگڑے لگا رہا ہے۔

دو چار بگڑے دل دنیا و مافیہا سے بے خبر نہایت بیتابی سے غل مچا رہے ہیں کہ داتا تیری دکان پر مُن برسے۔ آج تو دستورا بھی چاہیئے ذرا سا گڑ ڈالے۔ بھنگ والے نے دو تین کو خوب گاڑھی بوٹی پلائی وہ رفوچکر ہوئے تو دو چار اور آگئے۔ اتنے میں میاں آزاد کے دوست نے جن کو لوگ موٹاپے کے سبب سے بھد بھد کہا کرتے تھے یوں ہانک لگائی۔ استاد آج تو دودھیا پلواؤ، گر خوب چکی ہو۔ پیتے ہی بے اٹھے چلو میں الو ہو جائیں۔ استاد تو لن ایسوں کی قبر تک سے واقف ہے دودھیا میٹھی کیوڑے سے بسی ہوئی پلائی۔ پہلے تو میاں آزاد نے کہا کہ کیا بھنگ نشے کی چیز! نا صاحب توبہ توبہ عطائے تو بلقائے تو بخشیدم۔ بندہ درگذرا نشے کا تو میں جانی دشمن ہوں۔ زر دادن و درد سر خریدن۔ کونسی دانائی ہے۔

بھد بھد۔ تو یہ کہئے چنیں و چناں کے پھندے میں پھنس گئے اور پڑھو، رفتہ رفتہ پاگل ہو جاؤ گے لے اب پہلے تو آپ ضد کھوائیں پھر دماغ کا علاج کریں۔ ایک کلھڑ پیو۔ نہ پیئے تو ہمارا ہی خون پئے۔

بھد بھد نے اپنے ایک دوست ہر بجے کو پلا دی اور سب مل کر چلے۔

بھد بھد۔ یہ چھوہارے کا پیڑ ہے؟

آزاد۔ ہاں ہم خرما و ہم ثواب۔

راستے میں ہر بجے نے پوچھا۔ کیوں یار یہ کون محلہ ہے؟ جی چینی بازار ہے سولہ کہیں پو نہ۔ یہ چینیا بازار ہے ماشاءاللہ یہ نیا نام سنایا۔ چینیا بازار کیسا چینی بازار ہے آپ تو کہنا نہیں مانتے ہم گلی گلی کوچے کوچے چپے چپے سے واقف ہیں۔ آپ ہمیں راستہ بتاتے ہیں۔ اے تیری قدرت اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ اسی میں عمر بھر رہے۔ اسی میں اتنے بڑے ہوئے۔ آپ فرماتے ہیں چینیا بازار نہیں تو کیا آپ کی طرح چینی بازار کہیں۔ قبلہ بندۂ درگاہ کی زبان سے غلط لفظ نہ نکلے گا۔ جی ایسے تو آپ بڑے محقق ہیں۔ لے خبردار اب چینیا بازار نہ کہیے گا۔ میرے سامنے گنوار سا ہے۔ ابے چینیا بازار کے کیا معنی مرد کسے ائیں

لہ لکڑی کی تپائی۔ لہ ملا دے لہ مٹی کا پیالہ۔

کیا بکا۔ مردک! یہ مردک کیسے کہا؟ میری شان میں اور یہ کلمہ؟ شہید مردوں سے بھی دل لگی؟ اچھا کسی ثالث سے پوچھو۔ آزاد نے دونوں کو سمجھایا کہ کیوں لڑتے مرتے ہو مگر سنتا کون تھا۔ اُس وقت سامنے سے ایک آدمی چلا آتا تھا۔ آزاد نے بڑھ کر پوچھا کہ او میاں جانے والے ہوت! بھلا یہ کون محلہ ہے؟ اس نے کہا چینا بازار۔ اب بھد بھد ابا ہو۔ بیچ دونوں نے اُس کو دق کرنا شروع کیا۔ چینی بازار کہ چینا بازار۔ بتاؤ جھٹ پٹ۔ چینا بازار کہ چینی بازار، چینی بازار یا چینا بازار۔ سو سو دفعہ پوچھ رہے ہیں کہ چینی بازار یا چینا بازار، اور آدھ کوس تک اُس کے ساتھ گئے کہ اس بیچارے کو ان لنگڑے سلطانوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ بار بار ڈپٹ رہے ہیں کہ چینی بازار یا چینا بازار۔ اس نے صد ہا مرتبہ کہہ دیا کہ صاحب چینا بازار اور چینی بازار دونوں صحیح ہیں۔ مگر ان کو تو کچے گھڑے کی چڑھی تھی۔ انھوں نے سوائے اس کے اور کچھ بات ہی نہ کی کہ چینی بازار یا چینا بازار۔ جب آدھ کوس تک اس بیچارے رہرو کو رگیدے گئے، اور چینی بازار اور چینا بازار سنتے سنتے اس کے کان پک گئے تو وہ جھلایا اور ڈانٹ کر بولا کہ چپ رہو بدمعاش! چینی بازار اور چینا بازار دونوں کی ایسی تیسی اور تمھاری ساتھ کے۔ اب بولے تو ہم کھوپڑی پر ایک ڈنڈا جمائیں گے نامعقول۔ ہم کو بناتا ہے۔ ہم کوئی گنوار نہیں۔ تم اپنے دل میں سمجھتے کیا ہو ابھی آواز دوں تو تین سو تلوریئے تلواریں سوت سوت کر آن موجود ہوں۔ ایک گھنٹے سے جان عذاب میں کر دی کہ چینا بازار یا چینی بازار۔

ہر نبج۔ ہمت ترے بھد بھد کی ایسی تیسی۔ کہتے تھے مردک سے کہ ہم کو نہ چلایا نہ مانا۔ دیکھ بھنگ سے کیسی مت بھنگ ہوئی۔

اکڑفوں

میاں آزاد زمین کے گز بنے ادھر ادھر گھوم رہے تھے کہ اتنے میں ایک بڈھے کھوسٹ نے ایک بانکے سے کہا کہ میاں بیٹھے ہوئے ہو یا زندگی دوبھر ہے؟ یہ اکڑنا اور بربڑانا کیا معنی یہاں گردن جھکا کر چلا کیجئے ورنہ کوئی پہلوان گردن ناپے گا تو یہ مشیخت ساری خاک میں مل جائے گی۔ مفت میں کرکری ہوگی، یہ شہر کشتی پٹے بانک لکڑی کی ٹکسال ہے۔ بہت سے لڑنتیے آئے مگر منہ کی کھا گئے۔ ہاتھ ملاتے ہی یہاں کے پہلوان پکڑ لائے اور مارا چاروں شانے چت۔ تنگڑی پڑنے میں طاق۔ سواری کسنے میں مشاق۔ کوڑے پر لادنے میں پڑاق۔

یہ سنتے ہی وہ میاں بانکے آگ بھبوکا ہو گئے۔ جی۔ تو کہیں اس بھروسے بھی نہ رہیئے گا۔ بندہ منہ کی کھانے والا آدمی نہیں ہے۔ بیچ کھیت پچھاڑوں تو سہی قربان اپنے اُستاد کے جنہوں نے ہمیں لکڑی سکھائی۔ ٹالوں کی لکڑی پھینکنا تو سب ہی جانتے ہیں۔ مگر میدان کارزار میں ٹھہرنا البتہ کارے دارد۔ اور زبانی داغلہ تو اور ہی بات ہے۔ ہمارے استاد تیس تیس آدمیوں سے گھاد لڑتے تھے اور کون لوگ؟ ایسے ایسے گنوار گھامڑ نہیں۔ پڑھے ہوئے پٹھے جن پر ان کو ناز تھا۔ پھر یہ خیال کیجئے کہ تیس گنکے برابر پڑتے تھے مگر تیسوں کے خالی جاتے تھے۔ کبھی آڑے ہو گئے، کبھی گنکے سے چوٹ کاٹ دی کبھی بدن سمیٹ لیا کبھی پینترا بدل دیا۔ شاگردوں کو للکارتے جاتے تھے کہ لگا بڑھ کے ہاتھ آگھس کے۔ اور وہ جھلا جھلا کے چوٹیں لگاتے تھے مگر منہ کی کھاتے تھے اور اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے تھے۔ جب سب کا دم ٹوٹ گیا اور لگے ہانپنے تو گنکے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ پڑے مگر واہ رے استاد۔ ان کے وہی دم خم وہی چتون۔ وہی تاؤ بھاؤ۔ پہروں لکڑی پھینکیں لیکن دم نہ پھولے اور جو کہیں بھڑ پڑے تو بات کی بات میں پرے صاف تھے۔ کسی پر پالٹ کا ہاتھ جمایا۔ کسی کو چاکی کا ہاتھ لگایا۔ جنیو کا ہاتھ تو آج تک کوئی چار دانگ عالم میں روک ہی نہ سکا۔ وہ تلا ہوا پڑتا تھا کہ ادھر اشارہ کیا ادھر تڑ سے پڑ گیا۔ گنکا ہاتھ میں آیا اور معلوم ہوا کہ بجلی لوکنے لگی۔ ممکن نہیں کہ انسان کی آنکھ نہ جھپکنے پائے اور آدمی تیورا نہ جائے۔ للکار دیا کہ روک چاکی۔ پھر لاکھ جتن کیجئے بھلا روک تو لیجئے۔ نشانہ تو کبھی خالی ہی جانے نہیں پاتا۔ تاکا اور بھرپور ہاتھ لگایا۔ پھر عمر بھر نہ چھوٹی۔ ایک انگ ہی لڑا کیے ان کے ٹھاٹھ ہی نرالے ہیں۔ چھریرا بدن سادہ مزاج۔ آدمی صورت دیکھے تو یقین نہ آئے کہ یہ استاد بے بدل ہیں۔ مگر ایک ذراسی بانس کی کھپاچ دیجیئے پھر دل لگی دیکھئے کہ کیسے جوہر دکھاتے ہیں۔ میاں ہم ایسے استادوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔ پٹے بانے بنوٹ کشتی لکڑی کسی میں بند نہیں جی چاہے کسی سے بھڑوا کر دیکھ لیجئے۔

اتنے میں ایک گنوار کا لڑکا چلا جاتا تھا۔ انھوں نے پکارا کہ ارے ذرا ادھر آنا۔ ادھر اُدھر کی بات سُنتے جاؤ۔ لڑکا قریب آیا تو پوچھا کہ ان سے دو چوٹیں ہوتی ہیں۔ اس نے نظر بھر کر دیکھا اور کہا ہاں ہم کسی سے دب کے نکلنے والے نہیں جس کا جی چاہے ارمان نکالے۔

بانکا۔ ابے جا، ایسے دیہاتی چھوکرے ہم نے بہت چرائے ہیں۔

گنوار۔ دیہاتی چھوکرے سے شیطان نے پناہ مانگی ہے۔ آپ ہیں کس شمار و قطار میں، ہم نے بھی شہر ہی میں تعلیم پائی ہے۔

---

[1] بیوقوف [2] لڑنے والے [3] لکڑی کی دکان [4] لڑائی۔ [5] جھگڑا۔

ان گیدڑ بھبکیوں میں اور آتے ہوں گے۔

گنوار تو یہ فقرے سُنا کر چل دیا میاں آزاد اور بانکا پھر شہر میں چکر لگانے لگے چوک میں پہنچے تو جس پر نظر پڑتی ہے بانکا ترچھا تیکھا چنت دار انگرکھے پہنے نکے دار کٹی ہوئی ٹوپیاں سر پر جمائے چُست گھٹنے[1] ڈانٹے ڈھاٹے باندھے ہوئے تنے چلے جاتے ہیں۔ تینچے کی جوڑی کمر سے لگی ہوئی دو دو ولا تیاں[2] پڑی ہوئیں بارمیتیں چڑھی ہوئیں۔ قرابینچہ۔ پیش قبض۔ کٹار۔ سروہی۔ شیر بچہ سب سے لیس۔ خاصے اوچھے بنے ہوئے۔

ایک بانکے کو دیکھ کر ایک دکاندار شامت اعمال سے کہیں ہنس پڑا۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دَن سے تپنچہ داغ دیا مگر حُسنِ اتفاق سے خالی گیا۔ لوگوں نے پوچھا کیوں آ کا کیوں بگڑ گئے؟ تیکھے ہو کر فرمایا کہ ہم کو دیکھ کر بچہ جی مسکرائے تھے۔ ہم نے گولی لگائی کہ دانت پر پڑے اور اس جواب دنداں شکن سے ان کے بھی دانت کھٹے ہو جائیں۔ مگر زندگی تھی کہ گولی سے بچ نکلا۔

میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ یہ بانکے تو بالکل نا خدا ترس ہیں ان کو زیر نہ کیا تو کچھ بات نہیں۔ ایک تنبولی سے پوچھا کیوں بھئی اس شہر میں بانکے بہت ہیں؟ اُس نے کہا میاں بانکا ہونا دل لگی نہیں۔ ہاں یوں کہیئے کہ پھکڑے بہت ہیں۔ اور ان سب کے گرو گھنٹال وہ ذات شریف ہیں جن کو لوگ یک رنگ کہتے ہیں۔ وہ صندلی رنگا ہوا جوڑا پہن کر نکلتے ہیں مگر مجال کیا کہ شہر بھر میں کوئی صندلی جوڑا پہن تو لے۔ یک رنگ (صندلی جوڑا کوئی پہن نہیں سکتا کوئی پہنے تو گولی بھی سر کر دیں اس کے ساتھ یہ بھی ہے)۔

میاں آزاد سوچے کہ اس یک رنگ کا ٹیٹوا نہ لیا تو کھانا حرام۔ دوسرے دن حضرت بھی صندلی بوٹ صندلی گھٹنا صندلی انگرکھا صندلی ٹوپی دے کر نکلے۔

اب جس گلی کوچے بازار سے گذر ہوتا ہے لوگ تعجب کرتے ہیں کہ یہ آج اس ڈھب سے کون نکلے ہیں؟ بس چو طرفہ انگلیاں اُٹھنے لگیں۔ شدہ شدہ حضرت یک رنگ کے چیلی چاپڑ نے ان کے کان میں بھی بھنک ڈال دی سنتے ہی منہ لال چقندر ہو گیا۔ کپڑے پہن ہتھیار لگا چل کھڑے ہوئے۔ میاں آزاد تنبولی کی دکان پر جا کر ٹھک گئے۔ ان کی دھج دیکھتے ہی اُس کے ہوش اڑ گئے۔ لگا ہاتھ جوڑنے اور منت کرنے کہ از برائے خدا میری ٹوپی دے لیجیئے یا جوتا بدل ڈالیئے۔ ورنہ وہ آتا ہی ہو گا مفت کی ٹھائیں ٹھائیں سے کیا واسطہ ان کو تو کچے گھڑے کی چڑھی تھی یہ مانتے کب تھے۔ گلوری لی اور اکڑ کھڑے ہو گئے۔ ارد گرد تماشائیوں کا ہجوم ہے اور شہر بھر میں دھوم ہے کہ آج تو یک رنگ سے تلوار چلے گی۔ اتنے میں حضرت یک رنگ بھی نمودار ہوئے۔ تنبولی نے میاں آزاد سے کہا کہ سنبھلئے وہ ع۔ آتے ہیں تپنچے کو چڑھائے ہوئے کل پر۔ ان کے آتے ہی بھیڑ چھٹ گئی۔ کوئی ادھر کترا گیا کوئی اُدھر دبک رہا۔ کوئی گلی میں گھسا۔ کوئی کمرے پر چڑھ گیا۔

یک رنگ نے جوان کو دیکھا کہ از سرتا پا صندلی پوشاک پہنے ہیں تو جل ہی مرا نظر تہر آلود ڈال کر کہا۔ ابے او لا خبط[3]، اتار ٹوپی بدل جوتا گستاخ! ہمارے ہوتے ساتے تو صندلی جوڑا پہن کر نکلے۔ اُتار اُتار۔ نہیں تو میں بڑھ کے کام تمام کر دوں گا۔

میاں آزاد پینترا بدل کر تیر کی طرح جھپٹ پڑے اور نہایت پھرتی سے یک رنگ کی توند پر تپنچہ رکھ دیا۔ او غریب شخص جنبش کی اور دُھواں اُس پار ہوا اور دہائیں کی آواز آئی۔ بولا اور لاش پھڑکنے لگی۔ مردک بڑا بانکا بنا ہے۔ صد ہا شرفا کو بے عزت کیا۔ تم جیسے بدمعاش اور بانکپن کا دم بھرو ساتنے چابک ماروں گا کہ یاد کرو گے بچہ۔ ابھی اُتار ٹوپی۔ اُتار اُتار نہیں دھواں اُس پار۔

---

[1] پاجامے [2] تلواریں۔ [3] دھار۔ [3] بے وقوف

اتفاق سے کہیں ایک درزی کا اُدھر سے گذر ہوا۔ میاں خلیفہ کی پگڑی اُتار بیگرنگ کی چپت گاہ[۱] پر رکھی اور بیگرنگ کی صندلی
ٹوپی اپنی جیب میں رکھ لی۔ بات تری ایسی تیسی۔ بڑے بانکے بنے تھے شہر بھر میں کوئی بیگرنگ جوڑا نہ پہنے۔ نادری حکم لگا دیا۔
زیر دستوں، غریبوں، شریفوں کو بہت ستاتے تھے۔ ہم سے ایک نہ چلی۔ حوصلہ ہو تو آؤ دو دو ہاتھ بھی ہو جائیں۔ خبردار جو آج سے
صندلی جوڑا پہنا تو تم جانو گے۔

شہر بھر میں یہ دھوم ہوگئی کہ میاں آزاد نے بیگرنگ کے چھکے چھڑا دیے۔ گھگھی بندھ گئی۔ چپ چاپ درزی سے ٹوپی بدلی۔
سچ ہے دبلے پرتی چوہے سے کان کٹاتی ہے۔ اب تو میاں آزاد پر بانکوں کی بھی نظر پڑنے لگی۔ جس ٹکڑی میں جاتے تھے لوگ تعظیم
پیش آتے تھے۔ ایک دن اُنھوں نے منادی کر دی آج میاں آزاد چھ بجے صبح سے آٹھ بجے تک اپنے فن کے کرتب دکھائیں
گے۔ جن اصحاب کو شوق ہو آئیں اور حظ اٹھائیں۔

روز معینہ کو ایک فراخ و وسیع میدان میں ٹھٹ کے ٹھٹ[۲] جمع ہوئے اور میاں آزاد نے طرح طرح کے جوہر دکھائے۔ لیموں پر نشان
لگایا اور تلوار سے اُڑایا تو نشان کے پاس کھٹ سے دو ٹکڑے۔ کسیرو اُچھالا اور پانچ چھ مرتبہ میں چھیل ڈالا۔ تلوار کی باڑ سے دس بارہ
کی آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ چراغ جلایا اور رکھا ڈنڈا پھینکتے پھینکتے گل کاٹ ڈالا۔ لو الگ بتی الگ۔ ایک پیالے میں دس کوڑیاں رکھیں
اور دو پر نشان بنا دیا۔ دونوں کو تلوار سے پیالے ہی میں کاٹا اور باقی کوڑیاں بلا وجہ بچ نکلیں۔ لکڑی ٹیکی اور چھت پر ہو رہے۔ گھٹکے
کا ذرا اشارہ کیا اور بیس ہاتھ اُڑ گئے۔ چالیس چالیس آدمیوں نے گھیرا اور یہ صاف نکل بھاگے۔ پلنگ کے نیچے ایک جنگلی کبوتر چھوڑ
دیا۔ انھوں نے اس کو نکلنے نہ دیا۔ وہ لاکھ کوشش کرتا رہا مگر پھڑپھڑا پھڑپھڑا کر رہ جاتا تھا۔ اتنے میں ایک پھکیت بولے اجی یہ
شعبدہ بازی ہے۔ میدان کارزار میں سامنا ہو تو جانیں۔

آزاد۔ ہاں بے دعوی۔ اچھا فہمیدہ خواہد شد۔ تمھارے بیگرنگ رنگے سیار کا رنگ تو پھیکا ہو گیا۔ اب تم منہ آتے ہو۔ کسی دن گردن
ناپوں گا۔

پھکیت۔ جو پیچ سنبھالو نہیں تو ہم تمھاری خبر لے لیں گے۔

آزاد۔ یہی دلی خواہش ہے کہ تم جتنے گرگے بانکے ہو سب کو نیچا دکھاؤں اور تمھارا اُبل نکالوں۔ دیکھو صبح و شام تمھاری بھی قلعی کھلی
جاتی ہے۔ تم لوگ بانکے نہیں۔ مردم آزار خونخوار ناخدا ترس ہو۔ جس طرف سے نکل جاؤ اُدھر آدمی کانپ اٹھیں کہ بھیڑیا آیا بلکہ ہنسا
اور تم نے بندوق چھتیائی۔ کسی نے بات کی اور تم نے چوٹ لگائی۔ بھئی واہ اچھا بانکپن ہے تو وجہ کیا جہاں دس ڈنڈ پیلے اور
اُبل پڑے۔ دس بارہ دن لکڑی بھیکی اور محلہ والوں پر شیر ہو گئے ورنہ با کمال کو ہمیشہ بردبار ہی دیکھا۔
جب سے رذیلوں میں پھکیتی بنکیتی بانا شروع ہو گیا۔ تب سے شرفا اس کو معیوب سمجھنے لگے اور یوں اونچی بن کر اور خوب
تن کر نکلنا تو سب ہی جانتے ہیں مگر فن کا جاننا اور ہی شے ہے۔

اتنے میں میاں آزاد کے قریب سے ایک پہلوان اینڈتے ہوئے نکلے، چٹ لنگوٹ باندھے، ململ کی چادر اوڑھے، دو تین
پٹھے ساتھ۔ ایک کسیرو والے کی چپت گاہ پر پہلوان نے خدا واسطے کی دھپ لگا دی۔ وہ پیچھے پھر کر دیکھتا ہے تو دھٹو[۳] کا دھوہ
آدمی۔ قہر درویش بر جان درویش۔ کان دبا کر دھپ کھا کر دل ہی دل میں کوستا ہوا چلا گیا۔ ایک تھوڑی دیر میں میاں پہلوان
نے ایک خوانچہ والے کا خوانچہ اُلٹ دیا۔ تین چار روپے کی مٹھائی خاک میں مل گئی جب اس نے خوب ہی غل غپاڑہ مچایا

---

۱ سر۔ ۲ ٹھٹ کے ٹھٹ۔ ۳ پہاڑ کا پہاڑ۔

توشاگردوں نے سر سہلایا۔ دو تین گدّے گھونسے ٹکّے لگا رہے، دو چار لپّڑ جما دیے وہ بیچارا روتا چلّاتا دہائی دیتا چلا گیا۔ دہائی ہے میرا خوانچہ لوٹ لیا۔

میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ یہ تو کوئی بڑا ہی شورہ پشت معلوم ہوتا ہے کہیں پر لپّڑ کسی پر دھپّڑ۔ واہ کیا پہلوانی ہے! اس کی خبر نہ لی تو کچھ بھی نہ کیا۔ اس نے تو شہر بھر میں تہلکہ مچا دیا ہے یہ سوچتے ہی مثل شیر جھپٹ پڑا اور پہلوان کے پاس جاکر گھٹنے سے ایسا دھکا دیا کہ میاں پہلوان نے باایں ہمہ تن و توش بیس لڑھکیاں کھائیں اور سنبھلتے ہی ان کی طرف ڈپٹ پڑے۔ یہ بھی شیر نر کی طرح ڈکارتے ہوئے چلے۔ تماشائی تو سمجھے کہ پہلوان قوی ہیکل کس بل کا آدمی ہے چُرمُر کر ڈالے گا۔ لیکن آزاد نے پہلے ہی سے وہ داؤ پیچ کیے کہ پہلوان کے چھکّے چھوٹ گئے ایسا دبایا کہ چھٹی کا دودھ حضرت کو یاد آیا۔ پہلوان نے جیسے ہی میاں آزاد کا بایاں ہاتھ گھسیٹا اُنھوں نے داہنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ باندھا اور اپنا چھڑا لیا اور ٹھینگیوں میں کولے پر لادگھٹنا ٹیک کر مارا، چاروں شانے چت۔ یاعلی۔ پہلوان اب تک کورا تھا۔ کسی دنگل میں آسمان دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ میاں آزاد نے جو سربازار ایک پٹخنی بتائی اور اس نے ہزاروں آدمیوں میں پچھاڑ کھائی تو بڑی کرکری ہوئی اور تمام عمر کے لیے داغ لگا۔

میاں آزاد نے شاداں و فرحاں اور اس پہلوان نے نالاں و گریاں وہاں سے اپنی اپنی راہ لی۔ اب تو میاں آزاد حکیت استاد ہو گئے۔ بکرنگ کا رنگ پھیکا پڑگیا۔ پہلوان نے پٹخنی کھائی اور وہ وہ جوہر دکھائے کہ لوگ دم بھرنے لگے۔ بنکیتی پھکیتی کشتی شورہ پشتی کی شہر بھر میں دھوم تھی۔ جدھر جاتے تھے لوگ تعظیم بجالاتے تھے۔ جس سے چار آنکھیں ہوئیں اس نے فرشتی سلام کیا۔ اچھے اچھے بانکوں کی کور دبنے لگی جہاں کسی زبردست نے زیردست کو دبایا اور اس نے غل مچایا دُہائی میاں آزاد کی۔ دہائی اُستاد کی اور یہ آن موجود ہوئے۔ کمزور کو کسی مردم آزار نے ذرا ایذا پہنچائی اور اس نے ڈانٹ بتائی۔ ہائیں نہیں مانتے بلاؤں میاں آزاد کو۔ شہدے لچّے میاں آزاد سے ایسے تھرّاتے تھے جیسے چوہے بلی سے۔ یا مرشد کا نام سنا اور نعلین جھاڑنے لگے۔ صورت دیکھی اور گلی کوچوں میں دبک رہے۔

الغرض شہر بھر میں ان کا ڈنکا بج گیا۔ جو طرّہ سکّہ بٹھا دیا۔ ایک دن میاں آزاد سرد ہی لیے اینڈتے جارہے تھے اور لوگ اُنگلیاں اُٹھا رہے تھے کہ ایک درزی کی دکان کے قریب سے ان کا گذر ہوا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ تیرہ صدی کے ایک بانکے ترچھے جوان چھوٹے پنجے کا چڑھواں مخملی جوتا پہنے زلفیں لٹکائے چھری کمر سے لگائے درزی سے تکرار کر رہے ہیں۔

بانکے۔ واہ میاں خلیفہ تم نے تو ہمیں اُلٹے اُسترے سے مونڈا۔ واللہ عجیب قطع کے آدمی ہو بھئی۔ میں تو زمین کا گز بن گیا جب کہیں بکسوئی ہاتھ آئی اور جو شے سلوانی ہوئی تم سے سلوائی۔ مگر تم جانے کس کنز ہونٹ میں رہتے ہو۔ سینا پرونا بخیرہ ہاں زبان البتہ کترنی کی طرح چلا کرتی ہے تم سے کپڑے سلوانا اپنے کو انگشت نما کرنا ہے۔ تمھارے رشتہ دار سب استاد ہیں۔ مگر تم بڑے گھامڑ نکلے۔ ہاں دم دھاگا دینا خوب جانتے ہو۔ ٹوپی ایسی بھونڈی بنائی کہ یاران سرپل نے پھبتی پر پھبتی سنائی واللہ ہمارے ایک شفیق کا درزی ٹوپی سیتا ہے کہ سر پر قالب[1] کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

خلیفہ۔ اے تو حضور میں اس کو کیا کروں؟ میرا بھلا اس میں کیا قصور؟ آپ کا سر ہی کا واک ہے۔ میں ٹوپی بناتا ہوں۔ سر تھوڑا ہی بنا جانتا ہوں۔

بانکے۔ ارے گیدی چونچ سنبھال۔ بہت بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بنا۔ بانکوں کے منہ آتا ہے اور سنیے ہمارا سر کا واک ہے۔ تیرا سر سانچے کا ڈھلا ہے منہ بند کر نہیں دوں گا اُلٹا ہاتھ تو منہ ٹیڑھا ہو جائے گا اور تماشا دیکھیے ہمارا سر گویا کدو ہو گیا۔

---

[1] جس پر ٹوپیاں کسی جاتی ہیں۔

درزی۔ حضور مالک ہیں، لِلّٰہ میری کہتا نہیں جیسا سر ویسی ٹوپی۔ ایسا سر تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ یہ نئی گڑھت کا سر ہے صاحب پچاس ہزار نعمت کھائی۔ آپ پھیر پس بس میں سی چکا بھر پایا۔ جب دام دینے کا وقت آیا تو یہ فقرہ سنایا۔

یہ سنتے ہی بانکے نے درزی کو چپڑ غوڑ کیا اور اس درجہ پیٹا کہ وہ بیچارہ بیدم ہو گیا۔ آخر کار کفن پھاڑ کر چیخا کہ دہائی میاں آزاد کی۔ دہائی میرے استاد کی۔ میاں آزاد دور سے کھڑے سیر دیکھ ہی رہے تھے جھٹ عین موقع واردات پر پہنچ گئے۔

آزاد۔ اس ڈنڈ بل کے قربان۔ واہ بھئی پہلوان، تم تو رستم داستان ہو۔ خلیفہ بیچارے پر ساری چوٹیں صاف کر دیں۔ کبھی کسی کڑے خاں سے بھی پالا پڑا ہے۔ کہیں گنوار بھی لڑا ہے یا غریبوں ہی پر شیر ہو۔ بڑے دلیر ہو تو آؤ ہم سے بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ تم ڈھیر ہو جاؤ یا ہم چرکا کھائیں۔ آئیے پھر پینترا بدلیے۔ اے ہے تو اب تامل کیا ہے۔ لیجئے "دم اور لگا بڑھ کر ہاتھ ادھر یا ادھر۔"

بانکے۔ ہائیں ہائیں استاد ہمیں پر ہاتھ صاف کرنے کا داعیہ ہے۔ ہماری تلوار تم پر چلے اور تمھاری سروہی ہم پہ چلے۔ کیا مجال ہم ابھی نو سیکھے تم گرد گھنٹال۔ اس کمینے درزی کی طرف سے آپ بولتے ہیں اور شریفوں پر تلوار تولتے ہیں۔ سبحان اللہ! آئیے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ مصیبت تکلیف سب کچھ سہنا ہے۔ اگر تم کمک کرو تو بیڑا پار ہے ورنہ ہم ہیں اور منجدھار ہے۔

آزاد۔ اچھا تو یہ کرو کہ اب کسی غریب زیردست کو نہ دھمکائیں گے۔

بانکے۔ اجی حضرت دھمکانا کیسا ہم خود بلا میں پھنس گئے۔ خدا ہی بچائے تو بچیں۔ صاف صاف یوں ہے کہ یہاں ہمارا ایک پٹیت ہے۔ کمیدان۔ بلا کا پھکیت۔ ستم کا بنکیت۔ قیامت کا ہاتھ ہے۔ اس سے ہم سے لاگ ڈانٹ ہو گئی۔ کل نوچندی جمعرات کو ہمیں درگاہ میں گھیرے گا کوئی دو سو بانکوں کی جماعت سے ہم پر حربہ کرنے کا قصد ہے ع۔ اس طرف ساری خدائی ہے ادھر کچھ بھی نہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ درگاہ نہ جائیں تو بانکپن پر حرف آتا ہے۔ جائیں تو کس برتے پہ۔ یار تم ساتھ چلو تو مزے ہیں ورنہ بے موت مرے۔

آزاد۔ بس اتنے ہی کے واسطے لو تمھارا ساتھ دیتے ہیں۔ بیڑا اٹھا لیا کہ تم کو کل لے چلیں گے اور سب سے بھڑ پڑیں گے۔ دو سو ہوں خواہ ہزار مگر یہ بتاؤ کہ تمھارا قصور تو نہیں ہے؟

بانکے۔ نہیں استاد شہید کربلا کی قسم۔ جو میری جانب سے پہل ہو تو ناک کاٹ لیجئے اور جو چاہے سزا دیجئے۔ مجھ سے انھوں نے ایک دن اکڑ کر کہا کہ تو تلوار نہ باندھا کر۔ میں بھی آپ جل بھنے انسان ہوں بشر ہوں فرشتہ نہیں ملک نہیں۔ مجھے بھی غصہ آ گیا میں نے کہا۔ تو اور ہم سے ہتھیار رکھوا لے۔ اے تیری قدرت اتنے میں لگا بے نقط سنانے۔ اس نے بآواز بلند کہا۔ اب کی نوچندی میں یا ہمیں نہ ہوں گے یا تم ہی نہ ہوگے۔

آزاد۔ اچھا تم لیس رہنا۔ میں دو گھڑی دن رہے آؤں گا۔ گھبراؤ نہیں تمھارا بال بیکا ہو تو مونچھ منڈوا ڈالوں۔ یہ دو سو آدمی دیکھنے ہی میں بھرکے ہوں گے جانبازی میں وہ ہی چار ہوں گے جو آزاد کی تیغ کی چمک اور آب خنجر کی جھلک کا سامنا کریں۔ ورنہ ایک سو چھیانوے تو کدم بھاگیں تو سہی۔

میاں آزاد دوسرے دن ہتھیار سج کر اور بھی بنے ہوئے چلے، راستے میں وہی بانکے ملے۔ علیک سلیک کے بعد دونوں ساتھ ساتھ چلے۔ جھٹپٹے وقت ٹہلتے ہوئے درگاہ پہنچے۔

نوچندی جمعرات میں کے آگے بنارس کا بوڑھوا منگل مات چو طرفہ چہل پہل کہیں مہوشان غنچہ دہن کہیں پری رویان سیم تن

---

۱ مگر۔ ۲ تیار۔

تماشائیوں کا ہجوم، ہٹو بچو کی دھوم۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ آدمی پہ آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ کوسوں تانتا لگا ہوا ہے۔ میوہ فروش صدا لگا رہے ہیں۔ تنبولی بیڑے بنا رہے ہیں۔ گنڈیریاں ہیں کیوڑے کی۔ کلیجے ہیں کباب۔ میاں آزاد خراماں خراماں سیر کرتے گھومتے گھامتے پھاٹک پر داخل ہوئے۔ دیکھا کہ سامنے بیس پچاس آدمیوں کا غول ہے۔ بانکے نے کان میں کہا یہی حضرات ہیں۔ دیکھیے دنگے پر آمادہ ہیں یا نہیں اور لطف یہ کہ کوئی نہتا نہیں۔

آزاد۔ بھلا یہاں تمہارا بھی کوئی جان پہچان ہے۔ ہو تو دس پانچ کو تم بھی بلا لو۔ بھیڑ بھڑکا تو ہو جائے۔ لڑنے والے ہم کیا کم ہیں مگر ذرا دو چار رونق ہو جائے۔

بانکے۔ ابھی لایا۔ دس بیس اچھے جیوٹ آدمی کٹ مرنے والے۔ آپ ٹھہریں میں دم کے دم میں آیا مگر باہر ٹہلیے تو اچھا ہے یہاں جوکھم ہے۔

میاں آزاد پھاٹک کے باہر ٹہلنے لگے اور ان کے یار چپے جیوٹ آدمیوں کی تلاش میں۔ کمیدان نے جو دیکھا کہ دونوں کھسکے تو اہم منڈیاں پکنے لگیں۔ وہ کھسکا یا تو ہٹا یا بھگا ہے تو کدم بات تیری دم میں فدا۔ ایک شخص نے کہا حضور وہ بھاگا نہیں ہے۔ واللہ فکر میں گیا ہے ذرا کسی آدمی کو دوڑا دیجیے تو خبر لائے۔ ایک نگڑے دل باہر گئے تو دیکھا بانکے پچھم کی طرف شتر بے مہار کی طرح گردن اٹھائے بھاگے چلے جاتے ہیں اور میاں آزاد پھاٹک سے دس قدم چہل قدمی کر رہے ہیں۔ الٹے پاؤں آکر خبر دی کہ واللہ یہی موقع ہے چلیے چلیے مار لیا اناڑی کو۔ بائیں ہاتھ چلا جاتا ہے اور اکیلا ہے یہ یک بینی و دو گوش۔ وہ سب دوسرے پھاٹک سے پکڑ پکڑا کر پینترے بدلتے۔ ٹھہرے ٹھہرے۔ دعا ادھر بس لپک جا، آگے قدم بڑھایا اور تلوار کا زخم کھایا جنبش کی تو دیا تلا ہوا ہاتھ بچہ آج تو چند ہی جمعرات ہے۔ پندرہ بیس آدمیوں نے چو طرف سے گھیر لیا اور لگا کابیوں کا چھرا چلنے۔ کمیدان کی آنکھیں لال انگارہ خون ٹپک رہا تھا۔ بدن مارے غصے کے تھر تھرا رہا تھا۔ بانکے کو اکیلا پا کر نتھا بھی شیر ہیں۔ کوئی اکڑتا ہے کوئی بڑھتا ہے اتنے میں دس پانچ نے مشیخت میں آکر تلوار کھینچ ہی تو لی بائیں بائیں بائیں اور لوگوں نے دیکھا کہ ہم ہی پھسڈی رہے جاتے ہیں سڑ سے سڑ ہی میان سے باہر تھی۔ بانکے کا رنگ فق کہ غضب ہی ہو گیا اب کیسے کی موت مرے کس کس سے لڑوں گا۔ ایک کی دوا دو تہ کو سو تیسر پھر چپ باداباد پیچھے میاں آزاد کو کوئی خبر کر دیتا تو وہ جھپٹ ہی پڑتے۔ مگر اب موقع کہاں جب تک کوئی جائے جائے ہمارا کام تمام ہو جائے گا۔ ایک یار نے بڑھ کر بانکے بیچارے مصیبت کے مارے پر ایک ہاتھ لگا دیا تو بائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ غل غپاڑے کی آواز میاں آزاد نے بھی سنی۔ انہیں کیا معلوم کہ ان کے یار پر کیسا وقت گذر رہا ہے۔ ٹہلتے ہوئے چلے اور بھیڑ کاٹ کر دندناتے ہوئے پہنچے۔ ہوں ہوں۔ یہ بانکے یہاں پھنسے ہوئے ہیں لاحول ولا قوۃ ہم ٹہلتے ہی رہ گئے اور حریف چھا ان سے ہی گیا تلوار کو ذرا ٹیکا اور زن سے اس پار آن پہنچے۔ بھئی کھلاڑی خبردار اناڑی۔ ہاتھ اٹھا اور میں نے چپڑ غٹو کیا اور پٹوا لیا۔ بانکے کے دل میں ڈھارس ہوئی کہ شکر ہے خداوندا جان بچائی از سر نو زندگی پائی۔ اتنے میں میاں آزاد نے کہا رو کو سا وہ ہے

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغ شرر فشاں — شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں
آواز دی زمیں نے کہ یا حافظ جہاں — دہشت سے تھرتھرا گیا مریخ آسماں

تلوار کا چمکنا تھا کہ سب ساتھی رفیق نام کے بانکے ہٹ ہو گئے۔ میدان خالی فقط میاں آزاد تلوار اور ان کے ایک طرف کمیدان اور دو شریف زادے دوسری طرف باقی رفو چکر۔ ایک نے آزاد پر پینترا چلایا۔ دائیں۔ مگر خالی گیا پھر کس پر چڑھایا اور دوا آکر مگر نجگ چاٹ گئی۔ آزاد نے جھپٹ کر ان کو ایسا چرکا دیا کہ تلملا کر گر پڑے۔ دوسرے حضرت دس قدم پیچھے ہٹ گئے بانکے شش گئے اب میاں آزاد اور کمیدان وہ کڑک پر جھکے اور انھوں نے نہایت خوبصورتی سے چوک کر سر پر ہاتھ لگانا چاہا۔ جس نے روکا اور جالی کا ہاتھ دیا۔ الغرض آدھ گھنٹے تک ان کے دو کتے تلوار چلائی آخر کار انھوں نے بڑھ کر جنبو کا وہ کاری ہاتھ لگایا کہ بھنڈارا تک کس گیا۔ مگر کمیدان بھی گرتے گرتے پار ہو رہے ہی گیا طرفین سے خون کے فوارے بہنے لگے ادھر یہ ادھر وہ دھم سے گرے۔ انھوں نے کہا یا علی وہ بولے یا اللہ۔ لے بھاگو چلو۔

بھولے بھالے نواب

کمال بھی کیا چیز ہے واللہ میاں آزاد کے ٹھاٹھ دیکھیے کہ کیا آن بان ہے جدھر گذر ہوتا ہے انگلیاں اٹھتی ہیں۔ قدہ شدہ نوابوں رئیسوں میں بھی ان کا ذکر خیر پہنچا۔ رئیسوں کو مرض ہے کہ پہلوان پھکیت بنوٹیے کو ساتھ رکھیں۔ کبھی بیرے کرہوا کھانے نکلیں۔ ایک نواب صاحب نے ان کو بھی بلوایا۔ یہ اودی بنے ہوئے دو دو دلائیاں کرسے لگائے تنے ہوئے جا پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک نواب صاحب اپنی ماں کے لاڈلے، اندھیرے گھر کے اجالے بھولے بھالے مسند پر بیٹھے ہیں چاروں گرد گرد ہا ہے ہیں۔ تمام عمر زنان خانے ہی میں حضرت نے پرورش پائی تھی۔ کبھی گھر کے باہر جانے تک کی نوبت نہ آئی تھی گویا باہر قدم رکھنے کی قسم کھائی تھی۔ دن بھر کمرے میں بیٹھنا، یار دوستوں سے گپیں اڑانا کبھی جومر کا رنگ جمایا۔ کبھی بازی لڑی۔ کبھی پر پر گوٹ اڑی۔ پھر شطرنج کبھی شاطر اپنے اپنے منصوبے کرنے لگے۔ مہرے کھٹ کھٹ پٹتے تھے۔ وہ گھوڑا پست لیا۔ وہ پیادہ ٹھیک لیا۔ رخ پھیر دیئے فکر کے میدان میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ جب دل گھبرایا تو مدک کا دم لگا۔ چانڈو کے چھینٹے اڑائے۔ افیون کی چسکی لی۔

اس دن حضرت اپنے صاف ستھرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں میر آغا بٹیر کو موٹھ کرتے ہوئے تشریف لائے اور آداب بجا لا کر دوزانو بیٹھ گئے۔ میر آغا ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ پیچھے مرزا پونڈا چھیلتے ہوئے آ ہی گئے اور ایک کونے میں جا ڈٹے۔ میاں چھمن دانگرکھے کے بند کھولے گدی پر ٹوپی رکھے کھٹ سے موجود۔ پھر کیا تھا تو آ ہی آ، دس پندرہ حضرات جمع ہو گئے۔ مگر سب جھنڈے تلے کے شہدے۔ چپٹے ہوئے گرگے۔ کوئی چینی کی پیالی میں افیون گھول رہا ہے کوئی چانڈو کا قوام بنا رہا ہے۔ کسی نے گنڈیریاں بنائیں۔ کسی نے امیر حمزہ کی داستان چھیڑی۔ سب اپنے اپنے دھندے میں مصروف ہوئے۔ اتنے میں نواب صاحب نے میر آغا سے پوچھا کہ میر صاحب آپ نے مشکے[1] کا درخت بھی ملاحظہ فرمایا ہے؟ میر آغا۔ حضور قسم ہے امیر علیہ السلام کی ستر اور دو بہتر برس کی عمر ہونے کو آئی غلام نے آج تک آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ لیکن حضور ہوگا درخت بڑا تو جہ کیا۔ ایک عالم کی اس سے پرورش ہوتی ہے جسے دیکھو مشکے پر جتھے لگاتا ہے۔ میر آ خریہ آتا کہاں سے ہے؟

اچھے مرزا۔ قربان جاؤں درخت کے بڑے ہونے میں کیا شک ہے۔ کشمیر سے لے کر قربان جاؤں بڑے گاؤں تک اور لندن سے تا بولایت سب اس کے خوشہ چین ہیں مگر حضور بنگال میں مشکے کے پیڑ بڑے بڑے کوئی بلینڈی کے برابر ہوتے ہوں گے، وہاں تو اسی پر دارو مدار ہے۔

نواب صاحب۔ میرا قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ درخت ہوگا عظیم الشان لیکن ہاں دریافت طلب یہ بات ہے کہ آخر کس درخت سے زیادہ مناسبت ہے۔ اگر یہ دریافت ہو جائے تو پھر جانیئے کہ ایک نئی بات پیدا ہوئی اور بھئی سچ پوچھو تو تحقیقات کے بھی یہی معنی ہیں کہ جب تک ایک ایک بات کی خوب چھان بین نہ ہو تب تک لطف نہیں

چھمن۔ ہم نے کیلے کا پیڑ، امرود کا پیڑ، گیندے کا پیڑ، خربوزے کا پیڑ یہ سب انھیں آنکھوں دیکھ ڈالے۔

---

[1] چاول۔

آزاد۔ بھلا یہاں کسی صاحب نے واہ واہ کی پھلیوں کا پیڑ بھی دیکھا ہے؟
کپتی۔ جی ہاں حضرت - ایک دفعہ نیپال کی ترائی میں دیکھا تھا۔ مگر شیر جو ڈکارا تو میں کیندے کے درخت پر جھپ سے چڑھ گیا۔ کچھ یاد نہیں کہ پتی کیسی ہوتی ہے۔
منے میاں۔ بھئی خشکے کے درخت کا کچھ تو حال دریافت کرنا چاہیئے - یہ بھی فیشن ہوگیا ہے کہ لاکھ جتن کیجئے بھید ہی نہیں کھلتا اور لیں تکے بازیوں سے کام نہیں چلتا پیپل سے بڑا درخت تو آج تک سنا ہی نہیں۔
اچھے مرزا۔ قربان جاؤں ان لوگوں کی باتوں کا اعتبار کیا سب سنی سنائی کہتے ہیں ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ - قربان جاؤں غلام نے وہ بات سوچی کہ سنتے ہی پھڑک جائیے - قربان جاؤں کہتے ہوئے لب بندھے جاتے ہیں۔
نواب صاحب۔ ہاں واللہ میر صاحب - آپ کو قسم ہے پنجتن پاک کی جلد کہیئے - حضرت اب اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔ لے واللہ ہے مجھے یقین ہوگیا کہ آپ نے اس کی لم دریافت کرلی ہوگی۔ انشاءاللہ دور کی کوڑی لائے ہو۔
اچھے مرزا۔ قربان جاؤں کنارے کو ٹیک کر اور نیم خیز ہو کر اگر خشکے کا درخت ہوگا تو اس کنارے کے برابر ہوگا تو پھر [illegible]۔
نواب صاحب۔ واللہ واہ میر صاحب کیا بات نکالی ہے۔
مصاحبین۔ سبحان اللہ واہ اچھے مرزا واہ میر صاحب قربان جاؤں اس سوجھ بوجھ کے۔ کیا شیریں بیانی ہے۔ واللہ اس کنارے کے صدقے۔

آزاد۔ آپ تو اپنے وقت کے لال بجھکڑ نکلے کیا بات پیدا کی ہے بھئی معلوم ہوتا ہے سفر بہت کیا ہے۔
اچھے مرزا۔ کون؟ میں نے - سفر وفر سے تو بہ قسم لے جو گھر سے باہر گیا ہوں مگر میاں میں لڑکپن ہی سے ذکی تھا۔ والدہ مرحومہ تو بالکل بیوقوف تھیں مگر اماں جان بلا کی عورت تھیں۔ اُف اوہ - وہ بات ہی بات پیدا کرتی تھیں کہ اچھے اچھے مردوں کی عقل دنگ ہو جائے - ستر برس کی عمر تک۔ انھوں نے ہمیں پالا پڑھایا پھر بھلا ہم برق کیوں نہ ہوں۔

اتنے میں محل میں غل غپاڑے کی آواز آئی - ہائیں! خیر تو ہے - بھئی آخر ماجرا کیا ہے - اندر سے مبارک قدم لونڈی پاؤں ننگے سر پیٹتی ہوئی آئی - حضور حضور میں صدقے واسطے خدا جلدی چلئے - یہ ہنگامہ کہاں ہو رہا ہے؟ پڑوس میں موئے منڈے خون کیے ڈالتے ہیں۔ بڑی بیگم صاحبہ کھڑی رو رہی ہیں کہ میرے بچے پر آنچ نہ آ جائے نواب صاحب جوتیاں چھوڑ کر اندر بھاگے - دروازے سب بند اب کسی کو حکم نہیں کہ دروازے سے بڑھے۔

اتنے میں ایک مصاحب نے ڈیوڑھی پر سے پکارا کہ پیر و مرشد میاں آزاد پھر آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ گنڈیری ہی چھیلنے کے کام کے نہیں تو ہم بنانا نہیں جانتے۔ بٹیر مٹھیانے میں جانگلو۔ ان کو بھیج کر دریافت نہ کرائیں کہ یہ دنگا کہاں ہو رہا ہے۔
مبارک قدم۔ ہاں ہاں بھیج دیجئے۔ کہیئے کتے چال جائیں اور بلی کی چال آئیں۔

میاں آزاد نے ایک خدمتگار کے ہاتھ میں تیغ اصفہانی دی اور خود کٹارے کو اینڈتے ہوئے چلے۔ راہ میں لوگوں سے پوچھتے جاتے ہیں کہ کیوں بھئی یہ فساد کیا ہے یہ دنگا کہاں ہو رہا ہے؟ ایک نے کہا جی چکنڈی میں دو قصابوں میں چھیچھڑے پر چھری چلی - آگے بڑھے تو دو چار آدمی باتیں کرتے جاتے تھے کہ میاں ہوا یہ کہ پنساری نے چڑیا ہی جما لگوٹہ

باندھ دیا۔ پس انھوں نے آتے ہی گردن ناپی کہ منفرِ کند اُکے عوض جھانگوٹا لا دیا۔ اور دس قدم چلے تو ایک شخص نے کہا وہ کیسے خیریت گذری کہ جاگ ہو گئی نہیں تو بھیڑیا گھر بھر کو اُٹھا لے جاتا۔ ہائیں بھیڑیا آ گیا۔ جی حضور ایک منہار کے گھر سے بھیڑ یا تین بکریاں دو مینڈھے ایک خرگوش اور ایک خالی پنجرا اُڑا لے گیا۔ اس کی عورت کو بھی پیٹھ پر لاد چکا تھا کہ منہار جاگ اُٹھا۔

اب میاں آزاد چکرائے کہ بھئی یہ عجیب بات ہے جو ہے نئی بات سنتا ہے انوکھی روایت بتاتا ہے۔ قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ پندرہ بیس آدمی مل کر چھپر اُٹھاتے ہیں اور غل مچا رہے ہیں لاحول ولا قوۃ۔ کوئی کہتا تھا کہ چھپر چھپڑوں پر چھپری چلی۔ کوئی پنساری اور جھانگوٹے کی کہانی سناتا تھا۔ ایک گرگ باراں دیدہ بھیڑیے کی روایت لائے۔ بس دس ہی قدم میں پچاسوں باتیں سننے میں آئیں اور قریب آئے تو نامعقول نامعقول جتنے منہ اتنی باتیں۔ جتنی زبان اتنے ہی بیان الامان والامان اور اللہ ہنسی تو یہ آتی ہے کہ نواب صاحب کیسے بدحواس ہو کر خواب سے گھر کے اندر ہو رہے اور گھر میں کہرام مچ گیا۔ رفقا اور مصاحبین نے دروازے بند کر لیے۔ آخر کار ہم اس میدان میں ٹھوکر کھا گئے۔ اللہ ری دہشت۔ واہ میاں آزاد بس ختم ہے۔

(دوسرے روز نواب صاحب کا دربار گرم ہے)

مڈگشت۔ خداوند آج تو بڑی تشویش کی بات سنی میں نے تو حواس نفرد ہو گئے۔ شہر بھر میں کھلبلی مچی ہے۔ اللہ بچائے اب کی گرمی کی فصل خیر سے گذرتی نہیں سوجھتی آتا رہے ہیں۔

نواب۔ کیوں کیوں خیر باشد کیا قیامت آنے والی ہے یا آفتاب سوا نیزے پر ہو رہا ہے یا دوسرے طوفان نوح کا خیمہ نصب ہو گیا ہے یہ کھلبلی کیسی مچی آخر ماجرا کیا ہے کچھ بتاؤ تو سہی۔ یہ تو بڑی بُری سنائی۔ اللّٰھم احفظنا من کل البلیات۔

میر زا۔ اے حضور یہ جب آتے ہیں ایک نیا شگوفہ چھوڑتے ہیں۔ خدا جانے کون فرشتہ ان کے کان میں پھونک جاتا ہے۔ اس وقت ایسی سنائی کہ واللہ نشہ ہرن ہو گیا۔ جمائیاں آنے لگیں۔ ابھی افیم گھولی تھی۔ ابھی ابھی ڈبیا کھولی تھی حضور کے سامنے ہی چسکی لی۔ مگر ان کے کہتے ہی نشہ ہرن ہو گیا۔ ان کی عادت ہے کہ جب آئیں گے کچھ نہ کچھ اوٹ پٹانگ ضرور سنائیں گے مفت میں نشہ اُتر گیا۔

مڈگشت۔ اجی آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔ ہم سے تو بڑے بڑوں کے نشے ہرن ہو گئے ہیں۔ جب پہلی تاریخ آئے گی تو آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ لیجئے صاحب ہم ڈھونڈ ڈھونڈ ڈھانڈھ کر خبریں لائیں آپ دن بھر پینک میں اونگھا اور میٹھائی ٹھونگا کریں اور ہمیں کو اُلّو بنائیں۔

نواب۔ کیا کیا پہلی تاریخ کیسی؟ اے میاں تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو۔ کچھ حال تو کہو۔ آخر پہلی کو کیا ہونے والا ہے؟

مڈگشت۔ اے حضور یہ نہ پوچھئے۔ بس کچھ عرض نہیں کیا جاتا۔ یہ ایک حلوائن ابھی جوان جہان ہے۔ گوری کے ایسے بھولے بھالے گال۔ آنکھیں جیسے نیا س پھلیں۔ کہیں اتفاق سے اونٹا ہوا دودھ جو مارے ہونٹوں کے پی گئی تو پیٹ پھولنے کے کیا ہو گیا۔ کسی نے کچھ بتایا کسی نے کچھ نسخہ پلایا۔ مگر وہ اتنا غفیل ہو گئی۔ اب سنئے کہ اس کا میاں اس کو بہت چاہتا تھا۔ جب چتا پر جانے لگی تو ایک دفعہ ہی کلبلا اٹھی۔ حلوائیوں اور گنواروں نے وہ بم مچائی کہ توبہ ہی بھلی۔ آخر کار دو چار حلوائیوں نے جو کڑا کر کے

۱؎ چوڑیاں بنانے والا۔ ۲؎ لالچ۔

لاش کو پیچھے سے گھسیٹ لیا۔ تو بیاں سے اٹھ بیٹھی۔ حضور قسم ہے خدا کی اس نے دو وہ باتیں بیان کیں کہ سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔
کہنے لگی کہ جب مری تو فرشتوں نے مجھے عرش گل پر چلایا اور میری پیاری پیاری صورت پر عاشق ہو گئے۔ دو تین میں خوب گدے
بازی ہوئی۔ دونے تو دھکنی کمائی۔ ایک نے مجھے اٹھا کر خدا کے پاس پہنچا دیا۔ خدا ان بیٹھی بیلت رہیں (نقل کفر کفر نباشد)
ہم کو دیکھ کر خدا اڈپٹا کہ اس کو لے جاؤ۔ اتنے میں تم نے چارپائی پر رکھ دیا۔ حضور مجھے اس کی بولی تو یاد نہیں مگر مطلب یہی تھا۔
پھر اس نے کہا کہ پہلی کو بڑا اندھیرا گھپ چھا جائے گا اور طوفان آئے گا۔ جتنے گنہگار بندے ہیں سب سے اس دن منکر نکیر
سوال کریں گے۔ اور افیمی جس گھر میں ہونگے اس کو فرشتے جلا کر خاک سیاہ کر دیں گے۔

نواب۔ میرزا صاحب، لے یو ریا بندھنا اٹھائیے۔ آپ کا بیان ٹھکانا نہیں۔ ناحق کہیں فرشتے میری کوٹھی پھونک دیں تو کہیں
شنوائی بھی نہ ہو سکے۔ قبلہ اب میرا پیچھا چھوڑیے۔ بس بقچہ سنبھالیے کہیں اور بستر جمائیے۔

میرزا۔ پیرومرشد یہ بڑا اڑی اور بے ایمان آدمی ہے۔ حضور تو بھولے بھالے رئیس ہیں جس نے جو کہا فوراً باور کر لیا۔ جو اس کی
کچھ بھی اصلیت ہو۔ بھلا کہیں فرشتے گھر پھونکا کرتے ہیں۔ ذرا تو سوچیے اس مردود کے بھرے میں آن کر مجھ بڈھے کو نہ نکالیے۔ غلام
پشت ہا پشت سے اسی دربار میں پرورش پایا کیا۔ اب کس کا دامن پکڑوں۔ حضور کا سایہ دامن کافی ہے۔ اس مردک کی افترا پردازی
پر نہ جائیے یہ تو میرا جانی دشمن ہے۔ ہائے تو کچا ہی کھا جائے۔ ارے واہ رے فقرہ باز ابھی تو۔ حلوائن کی چھوکری مری بھی اور
جی بھی اٹھی۔ جھوٹے کی ایسی تیسی۔ بھلا کسی نے بھی یہ باتیں سنی تھیں۔ اور سنیئے کہنے لگے آنکھیں جیسے تباس پھینی۔ واہ بیٹی واہ کیا
مثال دی ہے۔

ظریف۔ حضرت یہ افیون کا تلازمہ تھا۔

میرزا۔ جی ہاں آپ بیٹھے رہیں کونے میں، یہ دل لگی کا موقع نہیں۔ آپ کو تو سوائے مسخرے پن کے دوسری بات ہی نہیں آتی۔

نواب۔ خیر صاحب یہ جھگڑا تو ہوا ہی کرے گا۔ آپ اپنا بھیتا کریں۔ میرے باپ دادا کی ملکیت مفت میں فرشتے پھونک دیں تو
میں کہیں کا بھی نہ رہوں۔ آپ ہیں کس مرض کی دوا۔ چارپائیاں توڑا کرتے ہو۔

میرزا۔ واہ ری قسمت! برسوں ریاض کیا۔ جان توڑ دی۔ بکری کی جان گئی کھانے والے کو مزا نہ آیا۔ اس ملعون سے خدا سمجھے جس
نے میرے حق میں یہ کانٹے بوئے۔ خدا کرے اس کا آج کے ساتویں ہی دن جنازہ نکلے۔ جیسے ہی یہ آکر بیٹھا اور میری بائیں آنکھ
پھڑکنے لگی۔ سمجھا کہ کچھ دال میں کالا کالا ہے تو یہ گل کھلا۔ اچھا بچہ تباہ ہی نہ کر چھوڑوں تو سہی۔

نواب صاحب مصاحبوں کو ہدایت دے کر زنان خانے میں گھس گئے کہ میرزا صاحب کو نکلوا دو۔ وہ تو داخل دفتر
ہوئے یہاں میرزا صاحب کی لے دے شروع ہو گئی۔

ہمارے بھولے بھالے نواب صاحب کا زنان خانہ میں داخل ہونا تھا کہ ماں نے چٹ پٹ بلائیں لیں۔ ماما اصیلوں نے دعائیں
دیں۔ چھوٹی بیگم صاحبہ نے آٹھ آٹھ آنسو رونا شروع کیا۔ سب نے منتیں مانیں۔ اب کی تو جمعرات خیر سے گذرے تو مسجد میں گھی کے
چراغ جلائیں۔ کمال شاہ کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائیں۔ یہ ہے پہلی تاریخ کیا آتی ہے جیسے کال آتا ہے۔ اے خدا کے لیے
اس نگوڑے افیمی کو نکلوا دو[1]۔ موئے نے افیم گھول گھول کر اتنے دن سیہ کاری کی۔ جب دیکھو سوگ نشینوں کی طرح ماتم میں
رہتا ہے۔

---

[1] بھگا دو۔

اِدھر باہر رفقا اور مصاحبین نے میرزا بیچارے کا ٹیٹوا دبوچا اور نکدم کر دیا۔

مٹرگشت ۔ میرزا جی انہوں کا ڈنڈا بغل میں دبایئے اور چلتے پھرتے نظر آیئے۔ سرکار کا حکم ہے اور چھوٹی بیگم صاحبہ جھنا منھ مچا رہی ہیں کہ اس بڈھے خبیث کو کھڑے کھڑے شہر بدر کر دو۔ سو اب کھسکیئے ورنہ بُری ہو گی۔

مسیتا بیگ ۔ واجبی بات ہے۔ سرکار چلتے چلتے حکم دے گئے تھے ہم لوگ مجبور ہیں۔ اب آپ اپنا سبھیتا کیجیے۔ ابھی سویرا ہے نہیں ہم پر پتّس پڑے گی اور بھئی جب فرشتوں کے آنے کا ڈر ہے تو کوئی تم کو کیوں کر اپنے گھر رہنے دے۔ یہ جو کم ہے نہ۔ اور جو فرشتوں نے ایک ننھی سی چنگاری رکھ دی تو کیسے مکان جل بھن کر خاک سیاہ ہو جائے گا یا نہیں۔ پھر کیسی ہو گی۔

میرزا ۔ ابے تو نا معقول فرشتے کہیں گاؤں جلایا کرتے ہیں۔ وہی اوٹ پٹانگ باتیں بکتا ہے جن کا سر نہ پیر۔ لو صاحب ہمارے رہنے میں جو کم ہے۔ جو آٹھوں پہر ڈیوڑھی پر بنے رہتے ہیں۔ تم سے اٹھائی گیرے اور ہمیں نکلوائیں۔ خدا کی شان تم سب کی ملی بھگت ہے۔ ارے میں تو تمھاری قبر تک سے واقف ہوں اچھا اڑنگا دیا۔

جمن ۔ اڑنگا وڑنگا میں نہیں جانتا۔ بہت دن بیٹھے ٹکڑے اُڑائے چغلخور رئیس کا مزاج بگاڑ دیا۔ ذرا سی خطا کسی سے سرزد ہوئی اور آپ نے جڑ دی۔ بھُس میں چنگی ڈال جمالو الگ کھڑی ہوئی۔ صدہا تو خدمتگاروں نے موقوف کرائے اور پچاسوں بھلے مانسوں کی روٹی لی۔ غفور! میاں غفور! مرزا نے تمھاری بھی تو بیخ کنی کی فکر کی تھی۔

غفور (خدمتگار) کون مرزا جی۔ یہ تو اپنے باپ کی جڑ کو کھودنے والے آدمی ہیں۔ اندر سے باہر تک کوئی ماما کوئی اصیل کوئی آدمی ان سے خوش نہیں۔ ایسے چرچے تو دیکھے نہ سُنے۔ آج ہی تو ہتھے چڑھے ہیں ان کے سر پر تڑ تڑ پڑیں۔ پھر سیر دیکھیئے جیسے مینڈک کی کھوپڑی پر نمک چھڑک دیا۔

مسیتا بیگ ۔ مرزا اگر غیرت ہے تو اس مصاحبت پر پامردی سے لات مارو جس اللہ نے منہ چیرا ہے وہ رزق بھی پہنچا دے گا۔

مبارک قدم (لونڈی) غفور۔ غفور! چھوٹی بیگم صاحبہ کا حکم ہے کہ اس موئے افیمچی کو شہر بدر کر دو۔ فرماتی ہیں کہ جب تک یہ دفان نہ ہو گا داہنے ہاتھ کا کھانا حرام ہے۔

میرزا ۔ شہر بدر؟ تمام شہر پر بیگم صاحبہ کا کیا اجارہ ہے وہ کل آئیں یہاں اس گھر میں عمر تیر ہو گئی۔ اب وہ ہمیں گدھے پر سوار کرا کر شہر بدر کرواتی ہیں۔ جیسے نواب ویسے مصاحب ویسی ہی بیگم صاحبہ۔

اتنے میں چوبداروں نے فہ پانی تو چو طرفہ سے للکار اُٹھے۔ ابے او نمک حرام چھوٹا منہ بڑی بات بیگم صاحبہ کے کہنے کو رُلکتا ہے۔ اتنی پڑیں گی بے بھاؤ کی کہ یاد کرو گے بچہ بہت لن ترانیاں اچھی نہیں ہوتیں۔

میرزا ۔ اب جو یہاں پانی پیئے تو اس کی منقاد پشت پر لعنت۔ چو طرفہ سے ہمیں پر بوچھاڑ ہونے لگی۔ اٹھائی گیروں کا یہاں جلسہ ہوتا ہے۔

نواب کی جاہ دیکھیئے گا — مرزا کا نباہ دیکھیئے گا
پھتوں سے کھڑے سکوڑے بھر لوں — انشاء اللہ دیکھیئے گا
جوتی خورے ہمیں بنائیں — انشاء اللہ دیکھیئے گا
افیموں کی لم میں یہاں سے نکلے — تقصیر و گناہ دیکھیئے گا

۱؎ تخت۔

مرزا کی اپچ افیم کا رنگ   سبحان اللہ دیکھئے گا

مصاحبین- واہ کیا زٹل قافیہ ہے۔ بڑے شاعر کی دُم بنے ہیں ہات تیرے کی چلئے نہیں گردن ناپی جائے گی اب بڑھو نہیں دوں گا، دھکا ہیں لڑھکیاں کھاؤ گے۔

میرزا تھے تو پیر توت مگر تیکھے جھٹ بھرا ہوا تینچہ لے کر کھڑے ہو گئے پاجیو یہ لام کاف چہ معنی دارد؟ میں بھی ہمایوں کی نسل سے ہوں۔ کوئی ایسا ولیسا نہیں تم ٹکڑ گدوں کی یہ مجال کہ ہم کو مارنے اٹھو۔

اس پر سب کے سب کھلکھلا کے ہنس پڑے کہ واہ رے بڈھے بڑا تیکھا ہے۔ رسّی جل گئی رسی کے بل نہ گئے۔ القصہ میرزا نے افیم کی ڈبیا اٹھائی اور چلے۔ خدمتگاروں نے ان کے جلانے کے لیے فقرہ چست کیا کہ مرزا صاحب کبھی کبھی آ جایا کیجیے۔ ایک بولا۔ لایئے ڈبیا میں پہنچا دوں۔ دوسرے نے کہا کہیئے تو گھوڑا کسوا دوں۔

ادھر پہلی تاریخ آئی تو سرگشت چکرائے کہ اب میں جھوٹا بنا اور ساکھ گئی۔ لوگوں نے نواب کو چنگ پر چڑھایا کہ حضور جو ہم کہیں وہ کیجیے تو آج کی بلا ٹل جائے۔ نواب صاحب نے مصاحبوں کو سیاہ و سفید کا اختیار دیدیا۔ اب سرِ شام سے کیفیت قابل دید تھی۔ ایک طرف تو برہمن بیٹھے استت پڑھ رہے ہیں اور کھٹا کھٹ جاپ کر رہے ہیں۔ سواہا سواہا کی آواز آ رہی ہے۔ دوسری طرف قرآن خوانی ہو رہی ہے۔ اور علماء قرأت کے ساتھ عمل پڑھ رہے ہیں۔ امن یجیب المضطر اذا دعاہ و یکشف السوء۔ گھر بھر میں چراغاں کی بہار اور چراغوں کی قطار۔ ہزاروں لمپ جھاڑ کنول روشن ہیں اور محفل رقص و سرود آراستہ ہے۔ قدسی تماشا دیکھیں تو لاہوت کو بھول جائیں۔ ؎

جب تک کہ نہ دل کی بے کلی جائے
او دائرہ والے گت چلی جائے

نواب- توبہ کی کہ اب کسی افیونی کو آنے تک نہ دونگا۔ اس کالی بلا سے اللہ بچائے۔ چانڈو تک خیریت ہے۔ افیم کا بندہ دشمن ہو گیا۔ خبردار آج سے افیونی دہلیز کے پار نہ ہونے پائے۔ ہے ہے جو کہیں مرزا ہوتے تو فرشتوں نے وہ ڈنڈ مچائی ہوتی کہ توبہ ہی بھلی، دل مسوس کر رہ جانا۔ پہلی تاریخ کے انتظار میں آنکھیں پتھرا گئیں بارے صد شکر کہ بخیر گذشت۔

مسیتا- حضور میاں شوری کا ٹپا سنیئے گا یا کوئی غزل چھیڑ دی جائے۔ اچھا غزل ہی سنیئے۔ ذرا اشارے کی دیر تھی دو تین طوائفوں نے مل کر یہ غزل گائی:-

مرا گھر کہاں اُن کے آنے کے قابل / بلاؤں اگر بھی ں بلانے کے قابل
کبھی بوسہ مانگا دہن کا تو بولے / چلو تم نہیں منہ لگانے کے قابل
ہنسا میں تو ہنس کر کہا اس نے مجھ سے / ہوئے آپ بھی مسکرانے کے قابل
کہا کچھ جو میں نے تو بولے وہ مقدر / ہوئے تم بھی باتیں بنانے کے قابل

بھئی واہ واللہ کیا دور کی سوجھی کہ محفل رقص و طرب آراستہ ہو۔ فرشتوں کے پھسلانے کا نیا طریقہ ایجاد ہوا۔ ماشاءاللہ۔ میاں آزاد کئی دن سے ساری کیفیت چپ چاپ بیٹھے دیکھ رہے تھے سوچے کہ ایسے رئیسوں کی سرکار میں نوکری کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ چغلخوری کا بازار ہر دم گرم، ایک کا ایک دشمن۔

ایک دن مرزا جی منڈی میں پونڈے چکار رہے تھے اور سامنے سے میاں آزاد جھومتے جھامتے گھومتے گھامتے آ رہے تھے۔

لے عرق۔

جب دو چار ہوئے تو باہم یوں گرم گفتار ہوئے:

آزاد - تسلیم کا چھرا پھینکتا ہوں۔

میرزا - تو میں بھی آداب داغتا ہوں۔

آزاد - اللہ اللہ ابھی تک چشمۂ لغاطی جاری ہے۔

میرزا - بار چغل خوروں سے غفل عاری ہے۔

آزاد - کہئے اب کیا شغل کیا رنگ ڈھنگ ہیں؟

میرزا جی - تیغے کل برچھے ہیں آمادۂ جنگ ہیں، حضرت میں نے دھوپ میں تو بال سفید نہیں کیے ہیں۔ ایک در بند سو در کھلے۔ ایک اور رئیس کے یہاں گیا اور جاتے ہی چینی کی رنگ برنگ پیاری پیاری پیالیوں میں اس حکمت کے ساتھ افیم گھولی کہ رئیس پیتے ہی پینک میں آگئے۔ جس نے چسکی لگائی آنکھیں بند ان ہاتھوں کے قربان اجی مجھ میں تو وہ جوہر ہے کہ جہاں جاؤں قدر ہو۔ افیم کا بول بالا اور پینک کا منہ کالا۔ جب رئیس اور اُن کے رفیقوں کو ذری ذری ہوش آیا تو حُقّے کی پکار ہوئی کوئی ہے۔ دس پانچ آدمی بول اُٹھے۔ حاضر، حکم پیر و مرشد۔ ذرا پیچوان تازہ کر کے بھر لانا۔ بھائی ہماری سٹک بھی لاؤ۔ میاں ایک اچھی سی چلم پلاؤ۔ بس تڑ سے حقہ بھر لایا۔ مشکبو تمباکو دھواں دھار رئیس کو پلایا۔ پینا دینا بخیر۔ نہنال منہ سے لگائے اونگھ رہے تھے جب پھر ہوش آیا تو دو چار کش پیئے، آنکھیں کھل گئیں۔ باچھیں کھل گئیں۔ یہ حقہ کس خدمتگار نے بھرا ہے؟ اس کو ہماری دلائی انعام دے دو۔ تب تو بندۂ درگاہ ہاتھ جوڑ کر سامنے آن کھڑے ہوئے۔ خداوند یہ غلام کی کارگذاری ہے۔ خدمتگار کو اشارہ کیا تو دلائی ایں جانب کے کاندھوں پر۔ جھک کر سات مرتبہ فراشی سلام بجا لایا۔ حق تعالیٰ ایسے رئیسوں کو سلامت رکھے۔ دم غنیمت ہے۔

رئیس - یہ افیم بھی تو آپ نے گھولی تھی؛ واللہ مزہ آگیا۔

بندہ - قربان جاؤں حضور ایسی افیون پلاؤں کہ قیامت تک پینک رہے دخل کیا کہ بے کیف ہو جائیے۔ ہاتھ تلے ہوئے ہیں۔ سانچے کے ڈھلے ہوئے ہیں پیر و مرشد کمال یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں سرخا سُرخ ہو جائیں۔ لال لال ڈورے رنگ جائیں اب شام کو حکم ہو تو غلام پھر پلائے۔

رئیس - ضرور، شام کیا معنی اب میں آپ کو جانے نہ دونگا۔ آپ تو واللہ ڈبیا ہی میں بند رکھنے کے قابل ہیں۔ افیون تو کروڑوں روپیہ کی پی ڈالی مگر ایسی کبھی آج تک نصیب ہی نہ ہوئی۔ واللہ کیا ہاتھ ہیں، جی چاہتا ہے چوم لوں۔ میں نے پھر جھک کر فراشی سلام کیا۔ حضور کا سایۂ دامن مجھے کافی ہے۔ مگر بھائی اس وقت جتنے خوشامد خورے بیٹھے تھے سب کا رنگ فق اور کلیجہ شق ہو گیا۔ پیٹ میں ..... چوہے چھوٹے کہ اس نے اچھا رنگ جمایا۔ ایسا نہ ہو ہم نظروں سے گر جائیں۔ واللہ معاً وہ تدبیر کی کہ ہمارا جما جمایا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ ایک شخص نے کہا حضور کی آواز اس وقت کچھ بھاری ہے۔ دوسرے نے فقرہ چُست کیا کہ آواز سے کچھ ضعف بھی پایا جاتا ہے۔ تیسرے صاحب بولے نصیب اعدا کیا طبیعت بے لطف ہو گئی۔ چوتھے نبض پر ہاتھ رکھ گئے اخاہ تپ چڑھی ہے۔ پانچویں نیم حکیم پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ اف ماتھا کیسا جلتا ہے۔ چھٹے صاحب نے فرمایا کہ حضور کی آنکھوں ہی سے نصیب دشمناں علالت پائی جاتی ہے۔ اب چو طرفہ سے یہی ہانک سنائی کہ رئیس علیل ہیں۔ جب سب نے مل کر کہنا شروع کیا تو وہ بھی گھبرائے۔ فرماتے کیا ہیں۔ ہاں آج تو کچھ بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ آنکھیں بھی جلتی ہیں اور نبض

میں بھی سرایت ہے۔ اتنے میں ایک صاحب نے کہا خداوند کیا عرض کروں، کلیجہ بیٹھا جاتا ہے خدا جانے کیا ہو گیا۔ دوسرے نے سر پکڑ کر کہا اُف سر پھٹا جاتا ہے۔ تیسرے نے آنکھیں مل کر کہا بھئی آنکھیں نکلی پڑتی ہیں۔ الغرض سب نے ایک نئی بیماری بتائی کسی کو بخار آیا۔ کسی کو جوڑی کسی کا بدن گنگنا ہو گیا کسی کا جی متلایا۔ ایک کا مکھنے لگا۔ دوسرا ہائے ہائے کرنے لگا۔ ہم چکرائے کہ بار خدایا یہ کیا بات ہے سب کے سب ایک دم سے بیمار کیونکر پڑ گئے ارے! پھر تو میں سوچا کہ یہ یاران سرپل کی کارستانی ہے اکھاڑا مل کر۔

رئیس۔ آخر کچھ سوچئے تو یہ بیٹھے بٹھائے کیا گل کھلا بھائی تو ہم سب بھلے چنگے بیٹھے تھے آناً فاناً یہ کیسی ہوا چلی کہ درد سر، درد کمر، تپ لرزہ نے آن دبوچا۔ اس میں کچھ فیہ ضرور ہے۔

مصاحب۔ حضور۔ تو جہاں کسی نے دو چار چکنی چپڑی باتیں سنائیں بس دم میں آ گئے خدا جانے ان ذات شریف نے افیم میں کیا ملا یا تھا کہ سب کے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔

رفیق۔ کیا پتے کی بات کہی ہے۔ واللہ میری زبان سے لے گئے۔ جب سے افیم پی جی متلانے لگا اور ایک ہم پر کیا فرض ہے۔ سب کا یہی حال ہے۔

لیمو نچوڑ۔ میں کہنے ہی کو تھا کہ یہ البتہ تازہ وارد حضرت کے کانٹے بوئے ہوئے ہیں اور حضور سچ کہوں مجھے تو یہ کوئی اٹھائی گیرے سے معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے آنکھوں ہی سے چھوٹا پن برستا ہے۔ ضرور افیم میں کچھ ملا دیا ان کو تھانے پر لے چلیئے۔

خدمتگار۔ میرے سامنے انھوں نے کچھ جیب سے نکالا اور افیم کے ساتھ گھولا پھر حقہ بھرا تو تمبا کو میں بھی کچھ ملا دیا۔ اب مجھے ان کی نیت کا حال کیا معلوم تھا شکل صورت سے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کے پیٹ میں تو بیٹھا ہی نہیں ہے۔

رئیس۔ واہ صاحب آپ کے جوہر تو اب کھلے۔ بھلے کو جلد آپ کی ذات پہچان لی آپ تو ایک آدھ کی جان لیتے اور سنکھیا دے دیتے۔ اب خیر اسی میں ہے کہ آپ چپکے سے کھسک جائیں ورنہ بری ٹھہرے گی۔

مصاحب۔ ہم تو ان کو بغیر ٹھیک بنائے نہ جانے دیں گے وہ تو کہئے حضور کی نیک نیتی اس گاڑھے وقت آڑے آئی، ورنہ اس نے تو قسمہ تک نہیں باقی رکھا تھا۔ ان کو کوٹھری میں بند کر کے خوب ٹھونکے اور پھر راہ خدا پہ چھوڑ دے مگر ذری خیال رہے کہ خون نہ نکلنے پائے۔

حضرت تب تو میرے ہوش اڑ گئے کہ خدا ہی خیر کرے بُرے پھنسے۔ دُلائی کیا پائی کہ شامت آئی۔ اب کروں تو کیا کروں بھاگوں تو چور بنوں بیٹھوں تو پٹا جاؤں۔ مگر اتنی تشفی تھی کہ کوتوالی کی تو نہ دکھائے گا۔ ان میں اتنی جرأت کہاں۔ ایک دفعہ ہی میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ بھی غنیمت سمجھے کہ از یں چہ بہتر۔ ایک نے دلائی پر ہاتھ مارا دوسرے نے جوتی چھین لی تیسرے نے کہا بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی لیجئے کہاں تو دُلائی انعام میں پائی تھی کہاں شجاع الدولہ کے گونٹوں کی جوتی بھی ہاتھ سے دی۔ قہر درویش بر جان درویش بھاگا تو یہاں آ کر دم لیا۔ رخصت، فی امان اللہ۔

میاں آزاد دل میں سوچے کہ بھئی رئیسوں کے دربار میں جعلخوروں کی بڑی گرم بازاری ہے ان ملعونوں کی دم میں رسا نہ باندھا تو آزاد نہیں۔ اس وقت سے بیڑا اٹھایا کہ ان کو ٹھیک بناؤں گا۔ مگر چہ کوشش ٹھکانے لگنا معلوم۔ دیل گھر پر تو ایک دفعہ بوچھے بن چکے۔ اب منہیار یا چمار نہ بنائے بائیں کہ سر کری شخت نکل جائے بھئی کم کھائے غم نہ کھائے۔

ہمارے گول مول نواب صاحب ایک دن دونوں وقت ملتے اپنی خوش سواد کوٹھی کے ایک رنگین کمرے میں بیٹھے مصاحبوں

رفیقوں سے چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ اتنے میں میاں آزاد نے دروازہ میں سے گردن نکالی مجرا عرض کرتا ہوں پیر و مرشد۔ آیئے میاں آزاد کہاں سے سواری آتی ہے؟ اس وقت تو کچھ چہرہ تمتمایا ہوا ہے کیا کسی سے جھوڑ ہوئی ہے؟ اے حضور آپ کی جوتیوں کے صدقے میں اس جوار میں تو کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا۔ دھاک ہے محلہ محلہ ہوا بندھی ہے۔ اچھے اچھے پہلوانوں نے پچھاڑیں کھائیں۔ ہم نے وہ ٹھنیاں بتائیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ کیوں بھئی معقولات میں بھی کچھ دخل ہے یا لنگوٹا باندھ کر کشتی اور ڈھینگا مشتی ہی جانتے ہو؟ کون! میں! معقولات! ہونہہ۔ عمر بھر کیا کیا کیئے۔ اس فن کی وہ کون سی کتاب ہے جس پر اینجانب نے نکتہ چینی نہیں کی۔ فقہ امامیہ اور فقہ حنفیہ اور کتب تفسیر و تصوف۔ جس میں چاہیئے بحث کیجئے۔

مصاحب۔ حضور اس شہر میں ایک عالم آیا ہے کہتا ہے دنیا بھر کی کتابیں چاٹ گیا ہوں۔ خصوصاً علم مناظرہ میں تو ید طولیٰ رکھتا ہے۔ منطق کے زور سے جھوٹ کو سچ کر دکھائے مگر خدا کو نہیں مانتا ہے۔ پکّا ملحد اور منکر ہے۔

آزاد۔ واہ منطق کی اچھی قدر کی۔ حضرت ان کے تو ہم بھی مشتاق ہیں۔ واللہ خدا کا وہ کامل ثبوت دوں کہ وہ خود پھڑک جائیں۔ ذری یہاں تک لایئے تو سہی۔ بھاگے راہ نہ ملے جو پھر اس شہر میں منہ دکھائیں تو آدمی نہ کہنا۔

نواب۔ ہاں ہاں میر صاحب ذری ان کو پھانس پھونس کر لایئے تو میاں آزاد کے جوہر کھلیں۔ مگر میاں ان منکروں سے بھڑنا دل لگی نہیں۔ کسی کے قائل ہی نہیں۔ بس ایک مادے کے قائل ہیں۔

اس پر میر صاحب نے دو چار قدم لگائے اور لڑکھتے ہوئے گئے اور جھپ سے اُس دہریئے کو لائے۔ یہاں ہجوم عام تھا۔ وہ اژدہام تھا کہ تھالی اُچھالیئے تو سر ہی سر جائے۔ مُلحد نے آتے ہی پوچھا کہ کون بزرگوار بحث کریں گے؟

میاں آزاد بولے۔ ہم۔ اب سب منتظر ہیں کہ دیکھیں کیا سوال جواب ہوتے ہیں چوطرفہ کھچڑی پک رہی ہے کہ یہ مُلحد تو کسی سے آج تک قائل ہی نہیں ہوئے انھیں کوئی بند کیا کرے گا؟

میاں آزاد۔

توحید میں مقام نہیں قال و قیل کا
ہے کس کو ناطقہ ترے ذکرِ جمیل کا

یا ایہا السامعین! اس دہریئے کے دل گردے کو دیکھیئے کہ اللہ میاں ہی کے قائل نہیں۔ یہ شکل اور یہ صورت اور یہ خیال اے لعنت!

مُلحد۔ پانی پی پی کر کوسنا اور بات ہے اور بحث کرنا اور بات ہے ہمیں کوئی معقول کردے تو البتہ جانیں۔ یہ بات کیا کہ لگے گالیاں دینے۔

آزاد۔ نامعقول کو معقول کون کرے۔ کوئی سوال کیجیئے تو ہم جواب دیں۔ شک ہو رفع کردیں۔

مُلحد۔ اچھا پہلے تو ان تین سوالوں کا جواب دیجیئے پھر اور بحث چھیڑیں گے۔

سوال اوّل۔ خدا ہے تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟

سوال دوم۔ شیطان ناری ہے اور وہ دوزخ میں جلایا جائے گا۔ واہ وا واہ۔ بھلا ناری کو آگ کا کیا ڈر ہے۔ اس سزا سے وہ ضرور نڈر رہے۔

سوال سوم۔ جو کرتا ہے خدا کرتا ہے پھر انسان کا قصور کیا؟

چوطرفہ سناٹا پڑ گیا۔ کہ واللہ کیا عالم ہے! اوہو ہو ہو۔ کیا کڑے سوال کیے ہیں! سب کے اوسان خطا۔ ہوش اُڑے ہوئے۔ بگڑے دل رگ دانت پیس رہے ہیں کہ باہر نکلے تو گردن ناپیں۔ کوئی دل ہی دل میں کوس رہا ہے کہ خدا کرے یہ مرذک

ابھی ابھی مرجائے۔ کوئی قہر کی نگاہ سے گھور رہا ہے کہ اتنے میں میاں آزاد نے کہا۔ یار عزیز ایسی باتیں نہ کرو۔ جہنم میں جلائے جاؤگے جہنم میں۔ اس نے مسکرا کر کہا کہ ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اس پر میاں آزاد نے ایک ڈھیلا کھینچ مارا۔ کھٹ سے اُس منکر کی کھوپری پر پڑا، ہائے کرکے بیٹھ گیا۔ اُف لاحول ولا قوۃ اچھے وحشی سے پالا پڑا۔ میں بحث کرنے آیا یا نپا تُلی۔ جب تقریر میں ہارے تو کلوخ اندازی کرنے لگے اور جو میں بھی ایک پتھر کھینچ ماروں تو پھر کیسی ہو بھی جی۔ جاہلوں کا قاعدہ ہے کہ ہاتھا پائی پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ دہائی ہے نواب صاحب کی۔

نواب۔ بھئی آزاد! ہمیں یہ تمہاری حرکت پسند نہیں آئی۔ یہ ڈھیلے بازی کے کیا معنی مانا کہ یہ ذات شریف کشتنی سوختنی گردن زدنی ہیں مگر بحث کرکے معقول کیجیئے یہ نہیں کہ جوتا کھینچ مارا یا تان کے ایک ڈھیلا لگایا۔

آزاد۔ پیرومرشد میں نے تینوں سوالوں کا وہ جواب دیا کہ اگر کوئی قدردان ہوتا تو اس وقت گلے سے لگا لیتا اور کروڑوں روپیہ انعام کا دیتا۔ سنیئے:۔

پہلا سوال۔ خدا ہے تو ہمیں کیوں نظر نہیں آتا۔

جواب۔ اگر اس ڈھیلے سے ان کو چوٹ لگی تو چوٹ نظر کیوں نہیں آتی۔

سبحان اللہ کا ڈونگڑا برس گیا۔ واہ استاد واہ۔ واللہ کیا جواب ترکی بترکی دیا ہے۔

دوسرا سوال۔ شیطان کو نار جہنم میں جلانا بیکار ہے وہ تو خود ناری ہے۔

جواب۔ ان سے پوچھیئے کہ یہ مٹی کے پتلے ہیں یا نہیں؛ ان کی کھوپری مٹی ہی کی بنی ہے یا سوبڑ کی؟ پھر مٹی کا ڈھیلا لگا تو سر کیوں بھنا گیا؟ ہائے ترے کی۔ واہ میاں آزاد کیا جواب دنداں شکن دیا کہ دانت کھٹے ہوگئے۔

تیسرا سوال۔ جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔

جواب۔ پھر ڈھیلا لگانے کا جرم ہم پر کیسا؟

تو میاں چوطرفہ اچھلنے لگیں۔ کہ واہ میرے شیر کیا کہنا۔ اوہو ہو ہو۔ لیجیے صاحب اب تک تو میاں آزاد پہلوان اور پھکیت ہی تھے اب صوفی صافی اور مولوی بھی مشہور ہوگئے۔ نواب نے میاں آزاد کی پیٹھ ٹھونکی۔ واہ کیوں نہ ہو۔ پہلے تو میں جھلایا کہ یہ ڈھیلا بازی چہ معنی دارد۔ مگر پھر تو پھڑک گیا کہ واہ کیا نازک خیال آدمی ہے۔

ایک دن ہمارے باغ و بہار جوان لڑنتیے پہلوان میاں آزاد اپنے آقائے نامدار نواب گردوں مدار کی کوٹھی میں دوزانو بیٹھے مصاحبین سے گپ اڑا رہے تھے کبھی کو لکڑی کی چوٹیں کسی کو کشتی کے داؤ بتا رہے تھے کہ اتنے میں نواب صاحب نے کہا کیوں آزاد کبھی بٹیریں بھی لڑائی ہیں۔ نبت شب بخیر! اکیس ربیع الاول ہیں وہ گھمسان کی لڑائیاں دکھائیں کہ واہ جی واہ۔

مصاحب۔ میاں آزاد تم تو اپنے کو بڑا جہانیاں جہاں گشت سمجھتے ہو مگر واللہ یہ لڑائی نہ دیکھی ہوگی۔ اس طرح گتھ جاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ بٹیر کی لڑائی کے آگے تو توپ و تفنگ بھی گرد ہے۔ اور پھر ہمارے نواب صاحب کے یہاں کی پالیاں۔ اُف فوہ آج ہماری سرکار میں جتنے بٹیر ہیں اتنے تو مٹیا برج کے چڑیا خانے میں بھی نہ ہوں گے۔ ایک ایک بٹیر ہزار ہزار کی خرید کا۔ توکدم کے بنانے میں توڑے کے توڑے صرف ہوگئے۔ سیروں موتی مروارید تو میں نے اپنے ہاتھوں ہی کھلا دیئے ہیں۔ کچھ دنوں روز کھرل چلتا تھا۔ مگر واللہ آپ بھی کہیں گے کہ ہم آدمی ہیں۔ اس ڈیوڑھی پر اتنے دن سے ہو اب تک بٹیر خانہ بھی نہ دیکھا۔ لے آؤ چلو تم کو سیر

کرائیں۔ یہ کہہ کر بٹیر خانہ لے گئے۔ میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ چوطرفہ کابکیں ہی کابکیں نظر آتی ہیں اور کابکیں بھی وہ بیش بہا کہ ادھو ہو۔ ہاتھی دانت کی تیلیاں ان پر گنگا جمنی گمندیاں اور کار چوبی چھتیں اور منقش کی جھالر اس پر کامدار مخملی غلافیں۔ رنگ برنگ سونے چاندی کی ننھی ننھی کٹوریاں جن میں بٹیر اپنی پیاری پیاری ننکیلی چونچوں سے پانی پئیں۔ پانچ پانچ چھ چھ سو کی لاگت کی کابکیں ہر سمت ٹنگی ہیں۔ کھونٹیاں بھی رنگ برنگی۔ مصاحب ایک ایک کابک اتار کر بٹیر دکھا کر تعریف کرنے لگے تو پل باندھ دیئے۔ ایک بٹیر کو دکھا کر کہا کہ اللہ رکھے کیا منجھولا جنور ہے۔ صف شکن جو آپ نے سنا ہو یہی حضرت ہیں لندن تک خبر کے کاغذ میں اس کا حال چھپ گیا۔ میری جان کی قسم ذری اس کی آن بان تو دیکھئے گا (بوسہ دے کر) ہائے کیا بانکا بٹیر ہے۔ یہ نواب صاحب کے دادا جان کے وقت کا ہے۔ ایسے رئیس پیدا کہاں ہوتے ہیں؟ دم کے دم میں لاکھوں پھونک دیتے۔ روپیہ تو ٹھیکریاں سمجھا کیے۔ تینگ بازی کا شوق ہوا تو شہر بھر کے پتنگ بازوں کو نہال کر دیا۔ کنکوے والے بن گئے۔ اجی اور تو اور لونڈے جو گلی کوچوں میں لنگڑ اور رنگے لے کر دور لوٹا کرتے ہیں روز ڈور بیچ بیچ کر حکوتیاں کرتے تھے۔ عیاشی میں بھی وہ نام روشن کیا کہ کوئی دم ڈھاری غریب نظر نہ آیا۔ چانڈو کا شوق ہوا تو دتیا نوس کے وقت کی نگالیاں ہزاروں روپیہ کو خریدیں۔ اور فی سبیل اللہ دو دو ڈھائی ڈھائی سو آدمیوں کو ایک ایک دن میں چانڈو پلا دیا۔ افیم اتنی خریدی کہ ٹکے سیر سے سولہ روپیہ سیر بکنے لگی۔ اللہ کی عنایت سے جو شوق کیا ایسا ہی کیا۔ پھر بٹیر بازی میں ان کے سامنے کون ٹھہرتا۔ لاکھوں روپیہ صرف کر ڈالا اب یہ ایک صف شکن ان کے وقت کا باقی رہ گیا ہے۔ یہ بزرگوں کی نشانی ہے۔ بٹیر کیا ہفت اقلیم میں لاثانی ہے۔ ان کی وفات کو کوئی بیس تیس برس گذرے ہوں گے۔ بس یہ سمجھئے کہ محمد علی شاہ کے وقت میں خریدا گیا تھا۔ اب کوئی سو برس کا ہوگا دو کم یا دو اوپر۔ مگر اس بڑھوتی وقت بھی وہ بڈے موتھڑے کہ مرغ پر لپک کر لات دے تو وہ بھی چیں بول جاوے۔ جیسے باز اور تیدرے کی لڑائی۔ پارسال کی دل لگی سنئے۔ نواب صاحب کے ماموں تشریف لائیے۔ ان میں بھی ریاست کی بو ہے۔ بٹیر بازی کا بھی پہلے سرے کا شوق ہے۔ آپ کا ظفر پیکر تو بلا کا بٹیر ہے۔ بٹیر کیا شہدی لندھور ہے۔ ڈھوہ کا ڈھوہ۔ جیسے خاصہ چھوٹا تیتر۔ خبر آتے ہی نواب کو لے کر بٹیر دیکھنے گئے۔ میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا کہ حضور کو تو بٹیروں کا مدت سے شوق ہے کروروں ہی بٹیر دیکھ ڈالے ہوں گے مگر صف شکن سا بٹیر تو حضور نے بھی دیکھا نہ ہوگا۔

ماموں ( ) ہونہہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ ظفر پیکر کو دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں۔ عقل کے ناخن لیجیے بڑھ کر ایک لات دے تو صف شکن کیا معنی آپ کو تو کدم پالی باہر کر دے۔ حوصلہ ہو تو منگواؤں؟

نواب۔ اچھا ماموں جان پھر کل شد ہو جائے۔ دو دو چونچیں تو ہوں۔

ماموں۔ کیا مضائقہ۔ مگر اپنا بٹیر آپ مفت میں کٹوائیں گے۔ آپس کی لڑائی سے فائدہ؟ یا اچھا کل ہی ہو جائے۔ ادھر یا ادھر۔

الغرض دوسرے دن پالی ہوئی۔ ہزاروں آدمی جوق جوق آن موجود۔ شہر بھر میں دھوم تھی کہ آج بڑے معرکے کی جنگ ہے۔ بھئی قسم ہے رزق کی دو چیزیں میں نے نہیں دیکھیں اس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔ ایک تو یہ پالی۔ دوسرے پیرول کی سوگھی۔ ادھر ظفر پیکر اس ٹھاٹھ سے آیا کہ زمین ہل گئی اور میرا تو کلیجہ دہلنے لگا۔ مگر صف شکن نے اس دن آبرو رکھ لی۔ جب ہی تو نواب صاحب اس کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ پہلے اس کو دانہ کھلوا لیتے ہیں پھر کہیں آپ کھاتے ہیں۔ ایک دن خدا جانے بلی دیکھی یا کیا ہوا کہ اپنے آپ پھڑکنے لگا۔ نواب سمجھے کہ بوندا ہو گیا۔ پھر تو ایسے دھاریں دھار روئے کہ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ میں نے نواب صاحب کو کبھی روتے دیکھا نہیں۔ مجالس عزا میں ایک آنسو نہیں نکلتا۔ جب بڑے نواب صاحب نے انتقال کیا تو اشک کا ایک قطرہ بھی نہ گرا۔ بھئی یہ بٹیر ہی ایسا انمول ہے اور سچ تو یوں ہے کہ اس نے اس دن نواب کی سات پیڑھیوں پر احسان کیا۔ واللہ

جو کہیں گھٹ جاتا تو بندہ تو جنگل کی راہ لیتا۔ میاں جنگ میں آبرو ہی آبرو تو ہے اور ہے کیا۔ خیر صاحب جیسے ہی دونوں پکھی کھا چکے، ظفر پیکر بجلی کی طرح صف شکن کی طرف چلا۔ یہ ڈوری دہ گھا کر آتے ہی دلبر ج بیٹھا اور چوٹی کو چونچ سے پکڑ کر ایسی ایسی مرمٹیاں دیں کہ دہ سرا ہوتا تو ایک رگڑے میں پھُر سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ نواب کا اُس دم رنگ فق ہو گیا اور کلیجہ شق۔ منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں نصیب اعدا زہر کھانے کا وقت پہنچا کہ اتنے میں صف شکن قلفی کر کے لوٹ ہی تو پڑا۔ واہ میرے شیر خوب بھرا۔ پالی بھر میں آواز گونجنے لگی۔ کم اوہو ہو وہ مارا ہے۔ ہاں بیٹے دے بڑھ کر لات۔ ایک لات ایسی جمائی کہ ظفر پیکر نے منہ پھیر دیا۔ منہ کا پھیرنا تھا کہ صف شکن نے اُچک کر ایک جھنجھوڑی بتائی کہ واہ واہ وا۔ اسی مقام پر ایک لات اور کس کر اہو ہو ہو شاباش! واہ پٹھے۔ اوہو ہو ہو۔ اسی جگہ ایک اور اہو ہو ہو۔ لگا ایک اور مردڑی۔ اہو ہو ہو۔ اتنے میں میاں ظفر پیکر نیچ کر کے نو کدم پالی باہر۔ پھُر سے اُڑ گیا۔ پالی بھر نے کہا وہ بھگا یا۔ وہ مارا۔ چو طرفہ ٹوپیاں اچھلنے لگیں۔ اور زفیلے بجنے لگیں۔ واہ رے صف شکن۔ ظفر پیکر گھٹ گیا تو صف شکن کا دل لو بھی بڑھا۔ آج یہ بٹیر اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

میاں آزاد نے دیکھا کہ نواب کا ہزار روپیہ بٹیروں کے پھیر میں ناحق گھوما جاتا ہے۔ ذہن کے پکے تو تھے ہی سوچے کہ آؤ آج ان سب کو اُڑا ئیں تو اچھی دل لگی ہو۔ یہ سوچتے ہی مصاحب سے کہا کہ یار دآج اچھی سی افیون گھول کر پلاؤ تو میں بھی بسم اللہ کر دوں۔ مصاحب کی باچھیں کھل گئیں کہ اچھے کو چیلا کیا۔ بڑے مُڈھ کو مونڈا دوڑتے ہوئے گئے کہ افیون گھول کر لائیں۔ ادھر میاں آزاد نے میدان خالی پا کر کابکوں کی کھڑکیاں کھول دیں۔ بٹیر سب پھُر سے بھاگ گئے۔ صف شکن کو انھوں نے چھپا لیا۔ باقی سب ہوا میں موجیں لے رہے ہیں۔ بات تیرے کی گھر بھر میں کتاب کا نام نہیں۔ کاغذ قلم دوات سے کام نہیں۔ کہیں اور کابک اور جھبیر کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لو بچہ اور پالو بٹیر۔

نواب صاحب کا دربار
خوجی کی گُل افشانیٔ گفتار

ہمارے رئیس نامدار یعنی نواب عرش وقار جھٹپٹے وقت اپنے باغیچۂ پر بہار میں فرش مکلّف پر بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ مصاحب اور رفقا خوشامد کی باتیں بنا رہے تھے اور میاں آزاد صحبت گرما رہے تھے اتنے میں دریا اخضر فلک پر کشتی ہلال نظر آئی۔ یعنی مہ نو نے اپنی پیاری پیاری صورت دکھائی۔ چاندنی کا چھٹکنا تھا کہ مصاحب بلبل کی طرح چہکنے لگے۔ نوابوں کے درباروں میں مسخروں کا کال نہیں۔ ایک اینچی پاڑ کی چاٹ پر مسخرے بن گئے۔ چو طرفہ اُن پر بوچھاڑ ہونے لگی ایک شخص نے پوچھا کیوں یار واجد علی تمھارے کون ہیں بھائی ہیں نہ؟ تو فرماتے کیا ہیں۔ جی واجد علی میری خالہ جان کی بہن کے میاں کے لڑکے کے بیٹے ہیں۔ اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ فلک ہفتم تک آواز پہنچی۔ بھئی واللہ یہ نیا رشتہ ہے۔ ابھی اُلٹ پھیر ہے اور کیوں میاں تمھارے باپ تمھارے کون ہوئے؟ واہ وا اس میں کونسی مشکل بات ہے بھلا۔ ہوئے کون؟ باپ ہوئے اچھے رہے اب ہمیں الّو گھامڑ سمجھ لیا ہے۔ مجھے بھی کوئی گنوار مقرر کیا ہے۔

نواب صاحب نے کہا خوجی اس حوض میں نہاؤ تو ایک اشرفی دیتا ہوں۔ پیر و مرشد اشرفیاں تو حضور کی جوتیوں کے صدقے بہت سی مل جائیں گی، مگر جینا دوبھر ہو جائے گا۔ وہ نہ مرے سہی لیکن نکٹا جیا بُرے احوال۔ نا صاحب مجھے تو کوئی فی غوطہ ایک اشرفی دے تو بھی پانی میں نہ بیٹھوں۔ پانی کی صورت دیکھے بدن کانپ اٹھتا ہے اور روح لرزنے لگتی ہے۔ بھئی واہ کیسے مردوے ہو جی۔ ابھی سرکار کا حکم ہے پھر کوئی اپنی جان وید ے۔ حضور جو یہ اس وقت دم سے حوض میں نہ کود پڑیں تو افیم انھیں نہ ملے۔ آپ بہت چل نکلے ہیں۔ کھلائیں حضور کھائیں ہم۔ آپ کون بیچ میں بولنے والے۔ اڑسٹھ برس سے تو میں افیم کھاتا آیا ہوں۔ اب آپ کے کہنے سے چھوڑ دوں تو کیسے مرا یا جیا۔ نواب صاحب نے کہا اچھی بھئی جانے دو۔ دودھ کھاؤ گے۔ واہ خدا دیدنی اور پوچھ پوچھ۔ دودھ تو وہ شے ہے جس کو انسان ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی غٹ غٹ پیتا ہے لیکن ذری مٹھاس خوب ہو۔ شاہجہانپور کی سفید شکر یا روسری کوٹھی کا قند یا کالپی کی مصری گھولیے گا اور تھوڑا سا کیوڑہ بھی گیر دیجیے تو پیتے ہی آنکھیں کھل جائیں۔

نواب صاحب نے حکم دیا کہ بھئی ان کے واسطے دودھ لاؤ۔ کیوں جی تم حلوائی کا دودھ پیتے ہو یا گھوسن کا۔ حضور جو مل جائے آم کھانے سے کام ہے یا پیڑ گننے سے۔ غفور خدمتگار چاندی کے کٹورے میں دودھ لایا۔ خواجہ صاحب دودھ پیجیے چپ نامعقول اتنا بڑا الو مڑ ہوا ہے ابھی تک تمیز نہیں آئی۔ یہ دودھ پینا کہاں کا محاورہ ہے۔ گنوار دودھ کھانا نہیں کہتا۔ کٹوری یہاں رکھ دے۔ میں ابھی آیا ذری کتّے بلّی کو دیکھتے رہنا۔ کہاں کہاں۔ خوجی کہاں۔ اے دودھ تو کھا ئے جاؤ مرد آدمی۔ کہیں نہیں حضور ابھی آیا۔ خوجی جب نظر سے اوجھل ہوئے تو میاں آزاد چپکے سے آدھا دودھ کھا گئے اور کٹورا لبالب کرنے کے لیے حوض سے پانی لے کر بھر دیا۔ اتفاق سے ایک چھوٹی سی مچھلی پانی کے ساتھ کٹورے میں آ رہی۔ جب خوجی [illegible] تھوڑی دیر میں پھونک

پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے برآمد ہوئے اور کٹورے کو دودھ سے لبالب پایا تو باچھیں کھل گئیں جاتے ہی منہ ڈال دیا۔ اتنے میں مچھلی بھی منہ میں آ گئی۔ تب تو چکرائے کہ الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ حضور پر بہت جھلائے اور نواب صاحب سے بڑی شکایت کی کہ حضور اس کی کان گوشی واجب ہے ایسا غافل ہو گیا کہ حوض سے مچھلی اچک آئی اور انھیں کانوں کان خبر نہیں۔ او گیدی اتنی تو میاں بھونکی ہوں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ حاضرین نے خوب قہقہہ لگایا جیسے دیکھو لوٹ رہا ہے کہ واللہ اچھی دل لگی ہوتی۔ اس پر میاں آزاد نے کہا ارے کھا جا یہ شیر ماہی ہے۔ تب تو میاں خوجی نہایت ہی افسوس کرنے لگے کہ ہائے ہائے سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ شیر ماہی ہے ورنہ کچی ہی چبا جاتا۔ اس قسم کی مچھلی میں یہ خاصیت ہے کہ اسی برس کا بڈھا کھائے تو جوان ہو جائے۔ نئے سرے سے دانت نکل آئیں۔ اس پر گھنٹوں دل لگی رہی۔

اتنے میں ایک صاحب نے پوچھا کہ خواجہ صاحب لوگ آپ کے پدر بزرگوار کو باورچی بتاتے ہیں۔ واللہ ہم تو آپ کو شریف زادہ سمجھتے تھے مگر آپ باورچی ہی نکلے۔ باورچی آپ اور آپ کے باپ۔ کچھ پیسے تو نہیں ہو یہ باورچی کی کون سی بات جیت ہے۔ ہم نے تو عمر بھر کبھی چولھا نہیں پھونکا۔ باپ دادا کا حال نہیں معلوم کون تھے کون نہ تھے!

واہ میاں واہ تو کیئے آپ کو اپنے باپ دادا کا حال ہی نہیں معلوم۔ یہ لاعلمی تو بندہ نواز آپ کی عالی خاندانی کی قلعی کھل گئی بس بس اب آپ اس دربار کے لائق نہیں۔

نواب صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ارے میاں خوجی تم کو اپنی زبان سے بھی کتا نہیں یہ تم بک کیا گئے۔ کوئی اپنے باپ دادا کو بھی نہیں جانتا۔ واہ بے پاگل ساٹھ برس کا ہوا آدمیت نہ آئی سٹھیا گیا ہے۔

میاں آزاد نے پوچھا کیوں میاں صاحب آپ پٹھان ہیں یا شیخ؟ جی میں تو ہندوستانی ہوں۔ پھر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور حاضرین لوٹنے لگے۔

اب سنیئے کہ ایک اور مسخر الدولہ آئے۔ حضور کو مجرا۔ اخاہ میر مذاق ہیں۔ آئیے مشفق کہیئے کوئی تازہ خبر؟ تازہ خبر یہ ہے کہ آج سے اینجا نب تارک اللحم ہو گئے۔ گوشت اب نہ چھوئیں گے نباتات ہی پر دانت لگائیں گے۔ کیوں کیوں خیر باشد؟ یہ کیا بدپرہیزیاں ہیں؟ کیا باورچی نے گوشت نہیں دیا؟ غفور۔ حضور۔ محمد وکو بلاؤ۔ محمدو آیا۔ آداب بجا لایا۔ کیوں جی تم سے تو ہم نے کہہ دیا تھا کہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھا کرو۔ (اتفاق سے میاں محمدو واحد العین تھے) حضور غلام سب کو اسی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ جھوٹ کہتا ہو تو یہ کانی کو دکھا کر) آنکھ اپنی پھنگ گیا سے پھوڑ ڈالیے (بائیں ہاتھ کی چھنگلیا نواب صاحب کی تعداد دکھی) اس پر نواب صاحب ہنس پڑے سان کا ہنسنا تھا کہ مصاحبوں نے بھی کھلکھلانا شروع کیا۔ مسخر الدولہ بولے۔ خداوند اس کا قصور نہیں میں کچھ اور ہی عرض کرتا ہوں۔ وہ فرمائیے۔ حضور ایک بڑے عالم نے لکھا ہے کہ نباتات کھایا کرو گوشت کھانا برا۔ سو حضور کچھ دن آپ بھی اس کا تجربہ کریں۔ مصاحبوں نے جو یہ سنا تو پیٹ میں چوہے چھوٹ گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نواب سیدھے سادے تو ہیں ہی گوشت وو شت کا کھانا چھوڑ دیں تو پھر ہم منہ ہی تاکا کریں۔ یہ سیخ اور شامی کباب اور قورما اور کوفتے اور دوپیازا اور کوکو پلاؤ کھانے ہی میں نہ آئے۔ واہ بے بھانجی خوب اچھا آیا۔

(۱) اے حضور ان کو تو سودا ہو گیا ہے گرمی کے دن آئے اور ان کے سر پر شیخ سدو سوار ہوئے۔ کہنے لگے گوشت دکھائیے پھر کھائیں کیا برے کا سر۔ آپ تو گھانس کھا گئے ہیں۔

(۲) پیرو مرشد یہ ایسی ہی بے ٹھکانے بات بک دیا کرتے ہیں جس کا سر نہ پیر۔ ایک عالم گوشت چکھتا ہے ان کے یہاں ممانعت ہے۔ وہ صاحب گوشت نہ کھائیں تو پھر کیا بھوسا کھائیں۔

(۳) اجی ان کی ف[illegible] لکھوائیے۔ قبلہ کی سلامت [illegible] جاتی ہے حضور گوشت نہ چھوڑیئے گا یہ بڑی نعمت ہے۔

(۴) میاں کیسی باتیں کرتے ہو۔ حضور چھوڑیں بھی تو کہیں چھوٹ سکتا ہے۔ رئیسوں سے گوشت بغیر ایک لقمہ تو کھایا نہ جائے۔ نہ کہ ترک کرنا اور ان کی نہ کہیے یہ تو دیوانے مشہور ہی ہیں۔ پائیں تو بکرے کا بکرا ہی چکھ جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ مگر نصیحت کرنے میں آندھی ہیں۔ آپ کو قسم ہے جو آج سے گوشت کھائیے۔ گوشت کھاؤ تو مردار۔ حرام۔ سؤر۔

مسخر الدولہ۔ میاں سو برس کے بعد گھورے کے بھی دن بھورتے ہیں۔ سو کئی صدی بعد گھانس پھونس کی بھی ستی چمکی لے دیکھ لینا جو دس برس میں ایک گوشت خور بھی نظر آئے۔ سب گھانس خور ہو جائیں تو سہی۔

صف شکن بٹیر

میاں آزاد نواب کی ڈیوڑھی پر آئے اور آداب بجا لائے۔ اتنے میں ایک چوبدار برہنہ سر پریشان و مضطر لپکتا ہوا آیا۔
خداوند بڑا غضب ہو گیا۔ کیا کہوں کیا کہوں۔ کہو ایں خیر ہے۔ بولو تو۔
سب کا رنگ فق کہ خدا ہی خیر کرے۔ نواب کا کلیجہ دہل گیا۔ میاں کچھ منہ سے بولو سر سے کھیلو۔ آخر کیا آفت آئی؟ کچھ معلوم تو ہو؟

چوبدار۔ (ہاتھ جوڑ کر) جان بخشی ہو تو عرض کروں۔ بٹیر سب اڑ گئے!

نواب (ہاتھ ملتے ہوئے) سب؟ ارے سب اُڑ گئے۔ ہائے میرے صف شکن کو جو ڈھونڈھ لائے ہزار نقد گنوائے۔ اس وقت میں جیتے جی مر مٹا۔ اُف بھئی ابھی سانڈنی سواروں کو حکم دو کہ پنج کوسی دورہ کریں۔ جہاں صف شکن ملے سمجھا بجھا کر لے ہی آئیں۔

مصاحب۔ خداوند سمجھانا کیسا۔ وہ بھی کوئی آدمی ہے کہ سمجھ جائے گا۔ جنور لاکھ پڑھے پھر جنور ہے۔

نواب۔ کوئی ہے؟

رفقا۔ حاضر پیر و مرشد خداوند جی حضور!

نواب۔ ان پہ جوتے پڑیں۔ تو صاحب ہم تو اس وقت گھبرائے ہوئے ہیں۔ یہ بات کاٹتا ہے۔ صف شکن کو تم ایسے گدھوں سے زیادہ تمیز ہے۔

رفقا۔ حق ہے اے حضور، وہ تو عربی سمجھ لیتا ہے۔

دوسرے بولے خداوند اس کو قرآن کے کئی پارے یاد ہیں۔
تیسرے نے کہا۔ قسم ہے پنجتن پاک کی میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔
چوتھے ایک دن ہنس رہا تھا۔
پانچویں۔ اجی ہم نے ڈنڈ پیلتے دیکھا ہے۔

نواب صاحب کو ان کل باتوں کا یقین آگیا۔ اس مصاحب بیچارے کی گدی پہ دو چار گدے پڑ گئے۔
بٹیر کیا اڑ گئے کہ نواب صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے آنکھوں سے اشک جاری ٹپ ٹپ آنسو کر رہے ہیں۔ کلیجہ بلیوں اچھل رہا ہے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ہائے میرا صف شکن۔ پیارا صف شکن۔ ؎

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را
نمیکردم بدل روشن چراغِ آشنائی را

مجھے تو اس سے عشق ہو گیا تھا جی۔ میں تو اس کی ہر ادا پر جان دیتا تھا۔ یار وہ نوکیلی چونچ۔ وہ بیتابی سے کنگنی چگنا چپکی کاٹی اور لوٹ گیا۔ سیکڑوں معرکوں میں لڑایا مگر کورا آیا۔ دو دو چونچیں ہوئیں اور بٹیر دم دبا کر بھاگا۔ پھر سامنا ہوا اور منہ پھیر دیا۔ کس بانکپن سے جھپٹ کر لات دیتا تھا کہ پالی بھر تھرا اٹھتی تھی اور اس کی بساط ہی کیا تھی۔ بھولا جنور۔ لیکن بلا کا کس بل۔ اور قسم ہے صف شکن ہی کی۔

اس کی خوبیاں تو مجھ پر آج کھلیں۔ یہ تو میں پہلے سے جانتا تھا کہ وہ حقانی جانور ہے۔ صورت بٹیر کی سیرت فقرا کی۔ اور ایک پنڈت نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ کیا جانے کیسی کھنڈت ہو گئی نہیں تو اس کا بڑا درجہ تھا۔ اب سُنا کہ نماز بھی پڑھتا تھا۔

مصاحب۔ حضور کو یاد ہو گا کہ رمضان شریف کے مہینے میں اس نے دن کے وقت دانہ تک نہ چھوا۔ حضور سمجھے تھے بوندا ہو گیا۔ گر میں تاڑ گیا کہ پابندِ صوم و صلوٰۃ ہے۔

خوجی۔ جل جلالہ۔ جل جلالہ۔ کیا شان کبریائی ہے۔ خداوندا بس حضور سے کہتا ہوں کہ دس پانچ دفعہ میں نے افیم بھی پلا دی۔ مگر واللہ باللہ ثم باللہ جو ذرا بھی نشہ ہوا ہو۔ ہاں آنکھڑیوں میں لال لال ڈورے تو پڑ گئے تھے۔

میر صاحب۔ پیر و مرشد یقین جانیئے پچھلے پہر سحر کا ذب تک حق حق کی آواز کا بک سے آیا کرتی تھی۔ غفور نمک کو بھی ہم نے کئی بار جگا کر سُنایا تھا کہ صف شکن یادِ خدا میں مصروف ہیں۔

غفور۔ ہاں میاں پچھلے سے حق حق سے کیا کرتے تھے اور اکثر دیکھا تھا کہ سجدہ کر رہے ہیں۔

خوجی۔ جل جلالہ۔ جل جلالہ۔ واہ میاں صف شکن علی شاہ!

نواب۔ بھئی ہم نے اُسے پہچانا ہی نہیں۔ اُف اف بھئی کوئی پنکھا جھلنا۔

مصاحبین۔ (غل مچا کر) پنکھا لاؤ جلدی۔ سامنے کھڑے ہو کر جھلو۔

نواب ؎
پیتم جو میں جانتی کہ پیت کیے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈھورا پیٹتی کہ پیت کرے نہ کوئے

خوجی۔ (پینک سے چونک کر) ہاں ذری اونچے سُروں میں۔ واہ استاد چھیڑے جا۔ اس وقت تو میاں شوری کی رُوح پھڑک گئی ہو گی۔

نواب۔ چپ نامعقول۔ کوئی ہے ان کو یہاں سے ٹہلاؤ۔ یہ رئیسوں کی صحبت کے قابل نہیں۔ مجھ کو بھی کوئی گویا مقرر کیا ہے۔ یہاں تو جی جلتا ہے اور اندر ہی اندر پھک رہا ہوں ان کے نزدیک قوالی ہو رہی ہے۔ کہنے لگے اونچے سُروں میں۔ میاں شوری یاد آتے ہیں۔ تم ایسے مُفت خوروں کو کسی کے دُکھ درد سے کیا سروکار تم کو تو چکھوتیوں سے مطلب ہے اور بس۔ فیرنی ہو کھیر پکے۔ مزعفر پر ہاتھ پڑے ٹکڑے کھائے دل بہلائے کپڑے پھٹے گھر کو آئے۔

خوجی۔ خداوند غلام تو اس دم اپنے آپے میں نہیں۔ ہائے صف شکن کی کابک خالی ہو اور میں اپنے ہوش و حواس سے چوکس رہوں۔ میرا معشوق نظر سے غائب ہو تو طبیعت کیونکر حاضر رہے۔ حضور نے اس وقت مجھ پر جبر کیا۔ افسوس ہائے افسوس۔ ارے یارو صف شکن کو کہیں سے ڈھونڈھ لاؤ۔ کوئی تو پتہ لگاؤ۔ چور گیدی سے خدا سمجھے۔

نواب۔ شاباش! خوجی شاباش!! اس وقت طبیعت بہت ہی خوش ہو گئی۔ بیشک تم نمک حلال۔ تمہارے باپ دادا نمک حلال۔ ارے بھئی سانڈنی سوار دوڑائے گئے یا نہیں؟

مصاحب۔ شجاعت علی سے کہو ابھی سانڈنی تیار ہو اور پانچ کوسی چکر لگائے جہاں صف شکن ملیں اُن کو سمجھا بجھا کر لے ہی آئے۔

شجاعت۔ جاتا تو ہوں مگر وہ تو منطق پڑھے ہیں میری کیا سنیں گے کوئی مولوی بھی تو ساتھ بھیجیئے اُن سے بحثے گا کون۔ غلام تو کچھ اونٹ ہی چلانا خوب جانتا ہے اُن سے دلیل کون کرے بھلا۔

خوجی۔ خداوند قربان جاؤں۔ افیم، چانڈو، مدک، چرس کی بحث ہو تو بندۂ درگاہ کو بھڑا دیجئے مگر وہاں تو حقانی باتیں ہوں گی۔

اس میں اس جانب کو راجح ہی داجبی دخل ہے۔ پھر دخل در معقولات دیگر اُو ہتوں مفت ہیں۔

میاں آزاد۔ پیرو مرشد۔ بانک بنوٹ لکڑی پٹے کا چرچا ہوتا تو بندہ بھی تلوار سوت کر عین موقع واردات پہ جا ڈٹتا اور چرکے پر چرکا نشتر پر نشتر لگاتا۔ مگر منطق کی بحث کچھ غلامی کا گھر تو ہے نہیں۔ کسی جغادری مولانا کو بلوائیے۔

مصاحبوں نے ایک مولانا صاحب کو تجویزا۔ مولانا بیچارے پھٹے حالوں تھے سمجھے کہ جو ملے غنیمت ہے۔ مگر یاران سرپل نے اُن سے کل داستان نہیں بیان کی چوبدار مکان پر گیا اور کہا کہ نواب صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے چلئے کسی بڑے عالم سے بحث ہوگی

مولانا۔ السلام علیکم۔ حضور نے آج یاد فرمایا۔ زہے نصیب۔

نواب۔ وعلیک السلام۔ آپ کو اس وجہ سے تکلیف دی کہ میرا قرۃ العین، لخت جگر، نورِ بصر ناراض ہو کر چلا گیا۔ مگر بہت منطقی ہے اسرار خدائی سے واقف، علم مناظرہ میں طاق۔ پابند روزہ و نماز۔ آپ بحث کیجئے اور منقول کر کے لے آیئے!

مولانا۔ انشاءاللہ۔ والدین کا بڑا حق ہوتا ہے وہ کیسے نادان آدمی ہیں کہ والدین سے خفا ہو گئے۔ مقام استعجاب ہے۔

خوجی۔ مولانا صاحب وہ بٹیر ہے مگر خوش تمیز۔ عارف، زاہد۔ عفت کوش، متقی، متشرع، منطقی۔ ہئیات داں۔ عربی خواں۔

میر صاحب۔ کیا صف شکن کا نام مولانا صاحب نے نہ سنا ہوگا؟ وہ تو روم تک مشہور تھے۔ قبلہ حقیقت حال یوں ہے کہ سرکار کا بٹیر صف شکن کل کابک سے اُڑ گیا۔ اب تجویز یہ ہوئی کہ ایک سانڈنی سوار جائے اور سمجھا بجھا کر لے آئے مگر شتربان پھر شتربان ہے لاکھ صحبت یافتہ ہو تو کیا، لہٰذا آپ بلائے گئے کہ سانڈنی پر سوار ہو جیئے اور ان کو بلطائف الحیل بلا لائیے۔

مولانا۔ درست، آپ سب کے سب نشے میں تو نہیں ہیں۔ ہوش کی باتیں کیجئے خود مسخرے بنتے ہو یا مجھے مسخرہ بناتے ہو۔ بٹیر منطقی کیا لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے مجھے بھی کوئی نقل محفل بنایا ہے۔ اور سنیئے بٹیر اڑ گیا اس کو سمجھا کر لاؤ۔ وہ بھی کوئی مولوی ہے یا آدمی ہے صف شکن، ۹ دن لڑائی مرکی تھی۔ استغفراللہ استغفراللہ۔ اچھے گاؤدیوں کا مجمع ہے۔ بندہ رخصت ہوتا ہے۔

نواب۔ یہ کس کوڑھ مغز کو لائے تھے۔ خاصا جانگلو ہے۔

آزاد۔ اچھا حضور بھی کیا یاد کریں گے کہ اتنے بڑے دربار میں ایک بھی منطقی نہ نکلا سے اب غلام نے بیڑا اٹھا لیا کہ جاؤں گا اور لاؤں گا ایک تو سانڈنی دیجئے باد رفتار اور دو دن کی خوراک دیجئے اور ایک خط اپنے دستخط مبارک سے لکھ دیجیے۔ تیسرے دن غلام مع صف شکن خان بہادر کے ڈیوڑھی پر موجود نہ ہو تو مونچھیں منڈوا ڈالیے۔

نواب۔ اچھا آپ جائیے اور لیس ہو کر آئیے۔ میں یہاں بندوبست کیے دیتا ہوں۔ مگر ابھی آئیے دیر نہ ہونے پائے۔ اتنا خیال رہے۔

میاں آزاد گھر گئے تو اور مصاحبوں میں کھچڑی پکنے لگی۔ یار وہ یہ تو بازی جیت لے گیا۔ پالا اسی کے ہاتھ رہا۔ اور جو کہیں صف شکن کو لے آیا تو پھر ہم سب پر شیر ہو جائے گا آزاد ہی آزاد چو طرفہ نظر آئیں گے۔ ہم کو آپ کو کوئی نہ پوچھے گا۔ اس کی فکر کیجیے۔

خوجی۔ حضور جان بخشی ہو تو عرض کروں۔

نواب۔ کہیئے شاید جان بخشی کا کون موقع ہے۔ کوئی عمدہ صلاح دیجیے۔ کوئی معقول تدبیر نکالیے۔

خوجی۔ حضور میاں آزاد بھی دو دن سے اس دربار میں آئے ہیں ان کا اعتبار کیا۔ خدا جانے اچکے ہیں۔ اٹھائی گیرے ہیں چور ہیں۔ گرہ کٹ ہیں۔ کوئی کیا جانے؟ اور جو سانڈنی لے کر رفوچکر ہوں تو پھر کوئی کہاں ان کا پتہ لگاتا پھرے۔ انصاف سے کہیئے گا کہ ایک خانہ برباد خانہ بدوش آدمی کا ٹھکانا کیا اور وہ کچھ بیدھا ہے کہ پھر واپس آئے گا؟

مصاحب - ہاں خداوند کہتے تو سچ ہیں۔

رفیق - پیر و مرشد مٹری ہے تو کیا ہُوا مگر کتا پتے کی ہے۔

میر صاحب - یہ خوبی صورت ہی سے ایسے معلوم ہوتے تھے لیکن بات کی ٹھکنے کی۔ لے ہاں ایسے آزاد کا ٹھکانا کیا۔ سانڈنی کے کوڑے کرلے اور اپنی راہ لے۔

مستابیگ - ہم تو حضور کو صلاح نہ دیں گے کہ میاں آزاد کو سانڈنی دیجیئے۔

نواب - چلو بس بہت نہ بکو۔ تم انھائی گیرے مفت خورے ہو نہ سب کو اپنا ہی ایسا سمجھتے ہو۔ آزاد کی چتون کہے دیتی ہے کہ وہ وزارت کے قابل ہے۔ تم میں سے کوئی اس کی جوتی کی ہیٹ پھٹ کو نہیں پہنچتا۔ اور فرض کرو کہ سانڈنی جاتی ہی رہے تو کیا میں بھی کوئی ٹکڑا گدا ہوں کہ سانڈنی کے کھونے سے مجھے بھیک مانگنے کی نوبت آئے اور ہزار بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ صف شکن پر سے لاکھوں صدقے ہیں۔ سانڈنی کس شمار میں ہے؟

ہمارے سیلانی جوان۔ رنگیلے پہلوان۔ ظریفوں کی جان۔ زندہ دلوں کی روحِ رواں میاں آزاد نے سانڈنی پر کاٹھی کسی اور بھولے بھالے دیوانے متوالے نواب سے رخصت ہوئے۔

خوجی - فی امان اللہ میاں آزاد جس طرح بیڑا اُٹھا کر جاتے ہیں۔ خدا کرے اُسی طرح سُرخ رو آئیں۔

میر صاحب - ذرا سانڈنی سے چوکس رہیئے!

آزاد - خداوند رخصت۔ مجرا عرض ہے۔ غلام کے حق میں دعائے خیر دیجیئے۔

نواب - خدا حافظ و ناصر ہے اور میرا تو رونگٹا رونگٹا دُعا دے رہا ہے۔ لے بسم اللہ کیجیے۔

میاں آزاد نے پشت پھیری تھی کہ اتنے میں پٹ سے چھینک پڑی۔ ہات ترے کی ناک کاٹوں تجھے پڑو کا کمبخت نے۔ لے میاں ذرا جوتا بدل ڈالو اور یہ گلوری کھا لو۔ میاں آزاد پھر سب سے رخصت ہوئے۔ فی امان اللہ۔ خدا حافظ۔ اللہ کو سونپا۔ مگر سانڈنی کی خیر نہیں نظر آتی۔ بی مبارک قدم لونڈی اور ماما اصیلوں نے چٹ چٹ بلائیں لیں اور دُعائیں دیں۔

الغرض میاں آزاد سانڈنی پر سوار ہو کر ہُوا ہوئے۔ یہ جا وہ جا۔ تھوڑی دیر میں نظر سے اوجھل۔ بانکا رسندلی عمامہ برسر اور جامئہ پہلوانی در بر۔ شتر بے مہار زیر ران۔ گھونگھرو چھن چھن بولتے جاتے ہیں۔ کاٹھی پر قرمزی زرّیں پوش اور کا کریزی گوٹ سے اونٹنی کا جوبن دوبالا ہو گیا۔ چلتے چلتے ایک پھاٹک پر بڑا لمبا چوڑا اشتہار دیکھ کر ٹھٹک رہے۔ پڑھا تو باچھیں کھل گئیں۔

بڑے بڑے کھیل اور بڑے بڑے تماشے

دآؤ کھلاڑی آؤ، پریوں کے پول دیکھ جاؤ۔ بمبئی کے پارسی چھتر منزل میں اندرسبھا کا وہ تماشہ دکھاتے ہیں کہ اس فن کے مبصر تک وجد میں آتے ہیں۔

آزاد تو سیر سپاٹے پر اُدھار کھائے ہی ہوئے تھے جھٹ سانڈنی کو لکھنؤ کے رُخ سبک پویہ کیا جہاں تماشا ہونے کو تھا۔ سانڈنی بلا کی باد رفتار آہو شکار۔ گردن اُٹھائے دُم دبائے بلبلاتی اور شتر غمزے دکھاتی شترگام جانے لگی۔ اور دن سے لکھنؤ کے پکے پُل پر داخل۔ میاں آزاد کا دماغ فلک الافلاک پر کہ میری اونٹنی کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ بے پر کی پریوں کو مات کرتی ہے۔ وہاں سے ایک طرارہ بھرا تو چھتر منزل میں کھٹ سے آن موجود۔

اُوہو ہو ہو کیا مقام مینو سواد ہے۔ الٰہی یہ زمین ہے یا بہشت شداد ہے۔ یہ رنگین دروازے ہیں یا باب گلستاں یا ابواب الجناں۔

اتنے میں گھنٹی بجی اور محفل دلہن کی طرح سجی۔ سامنے پردۂ زرنگار اور اس پر کہسار اور دامن کوہ میں سبزہ زار ادھر ادھر اشجار پر بہار۔ عقل دنگ ہے کہ الٰہی یہ پردہ ہے یا نگار خانۂ ارژنگ ہے۔ وہ گل بوٹے کہ واہ جی واہ۔ وہ نقش و نگار کہ سبحان اللہ تماشائی پڑنے رسیا تاڑ گئے کہ ع کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔ اتنے میں پردہ اُٹھا تو آنکھ جھپک گئی۔ وہ چکا چوند کا عالم کہ نظر کا پاؤں پھسلا جاتا تھا۔ راجہ اندر تخت جواہر نگار پر بڑی شان اور بان سے متمکن ہیں۔ پھر تو ہر در و دیوار سے چھن چھن چھم چھم کی آواز آنے لگی اور محفل پھر کھلکھلانے لگی۔ ایک غلمان نظیر نے عجب ادائے دلپذیر سے چمک چمک کر گانا شروع کیا اور دائرہ والے نے گت کا بجانا شروع کیا ؎

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے ۔۔۔ پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

اب اُدھر نواب کے یہاں کا حال سنئے کہ وہاں کیا ہوتا تھا۔ جب کئی دن گذر گئے تو خوشامد خوروں نے چنگ پر چڑھایا کہ پیر و مرشد دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ میاں آزاد خانہ برباد کا ٹھکانا کیا۔ حضور نے نہ مانا۔ آخر ش سانڈنی کی سانڈنی گئی اور رنج کا رنج ہوا۔

خوجی۔ اور بیوقوف کے بیوقوف بنے۔

میر صاحب۔ اور انعام و زاد راہ جو دیا گیا گھاٹے میں۔ اس کی گنتی ہی نہیں۔

غفور۔ ہجور اب وہ پھر نے بخیریں آنے۔ وہ تین سو کی سانڈنی پر پانی پھر گیا۔

خوجی۔ ہونھ۔ یہ دو ہی تین سو لیے پھرتے ہیں۔ ارے میاں وہ سانڈنی بلا کی دھاوا کرنے والی ہے۔ ریل کی دُم میں باندھ دو دیکھو چندوسی تک برابر چھم چھم کرتی چلی جاتی ہے یا نہیں۔ ہندوستان سے ملک میں ویسی تو ایک نظر آتی نہیں۔ کیا و ختم ہے۔ بھئی میں تو ایک دفعہ سوار ہوا۔ واللہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہوا پر جا رہا ہوں وہ ٹھمک ٹھمک چال کہ ادھو ہو ہے۔ سواری اور اونٹ بگھی گھوڑا پالکی ہاتھی سب اس کے مقابلے میں گرد ہیں اور بھئی سچ پوچھو تو میاں صف شکن سے اس کے کھونے کا زیادہ رنج ہوا۔

میر صاحب۔ واہ خواجہ صاحب آپ بھی واللہ کیا بے تکی باتیں کرتے ہیں۔ کجا بے زبان جانور کجا ہمارے صف شکن سلمہ اللہ تعالیٰ۔ پاجی اور بھلے مانس کا مقابلہ کیا؟ ارے وہ اشرف المخلوقات۔ ایسی ایسی ہزار سانڈنیاں اس کی ایک لات پر نثار۔ کہنے لگے سانڈنی کے کھونے کا زیادہ رنج ہوا۔

نواب۔ اتنے بڑے لونبڑ ہوئے مگر کو کھے ہی رہے جو بات کریں گے بے ٹھکانے سانڈنی ٹکے کا جانور۔ گئی گئی۔ اب اس کا رونا کیا۔ ہائے سچ تو یہ ہے کہ میاں صف شکن اب ہاتھ نہ آنے کے میرا ہی دل جانتا ہے کہ کلیجے پر کیسی چوٹ لگی ہے۔ اس سے تو مجھے ہی موت آ جاتی تو سمجھتا بڑا خوش نصیب ہوں۔ افسوس۔

مصاحب۔ حضور صبر کیجیے۔ بڑے نواب صاحب مر گئے تو حضور نے کیا کر لیا چچا حضور کو چھوڑ کر چل بسے تو حضور نے کیا کر لیا۔ دادا جان ساری ثروت سے منہ موڑ کر داغ جدائی دے گئے تو حضور نے کیا کر لیا۔ اب صبر کیجیے۔ صبر کیجیے۔

نواب۔ میاں بات یہ ہے کہ باپ دادا تو سب ہی کے مرا کرتے ہیں مگر صف شکن سے وفادار جانور کا ایک دم بھی جدا ہونا کھلتا ہے ذکر کا یک سے اڑ جانا۔ خیر خدلان کو بخشے اس وقت دل ہے کہ بے اختیار امڈا چلا آتا ہے۔

خوجی۔ اس وقت تو دل سے دُعا نکلتی ہے کہ میاں آزاد مع صف شکن علی شاہ کے کھٹ سے آ جائیں اور حضور والا اللہ دلگا ہی دیتا ہے کہ آیا ہی چاہتے ہیں بس صبح و شام آئے داخل۔

نواب۔ تمہارے منہ میں گھی شکر!

مسیتا۔ حضور مٹھائی کا اقرار کریں۔
خوجی۔ اور سنیئے یہ بندۂ شکم گرسنہ چشم خوب بولا۔ اب مٹھائی کیسی وہ جلسے اڑیں وہ جشن ہوں کہ واہ جی واہ۔ مہینوں طبلے پر تھاپ پڑے اور دُور دُور سے طائفے آئیں صف شکن کا آنا کوئی ایسی ویسی بات ہے۔ گیدی کہیں کا۔
نواب۔ انشاء اللہ پھر میں اپنے دل کا ارمان نکالوں۔ وہ دھما چوکڑی مچے کہ واہ جی واہ
مسیتا بیگ (میر صاحب کے کان میں چپکے سے) نقل عیش بہ از عیش۔ آنا جانا منا ملانا معلوم۔ مگر واللہ آزاد بھی بلا کا جوان ہے وہ جھانسا دیا کہ نواب بھی ساری عمر نہ بھولیں گے۔ ساںڈنی تو بھئی اس نے بیچ لی۔ اونے پونے دام سیدھے کیے۔ صف شکن کی دُم میں نمدا۔
میر صاحب۔ (آہستہ سے) کیوں جی یہ ہمارے رئیس بھی کتنے بھولے ہیں۔ بٹیر سے صف شکن ہوئے اور صف شکن سے اب صف شکن علی شاہ بنے (ہاہاہا) لاحول ولا قوۃ۔ واللہ نرا گاؤدی ہی رہا۔
مسیتا بیگ۔ اجی خدا کرے ایسا ہی بنا رہے۔
نواب۔ اب زنان خانہ میں جاتے ہیں ہم۔ رخصت!

نواب صاحب زنان خانہ میں بیٹھے بیگم صاحب سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔

بیگم۔ اے ہاں آزاد کس کھوہ میں دھنس گیا۔ میں تو جانوں کوئی دو مہینے سے کم نہ ہوئے ہوں گے۔ جس دن سدا بہار کی لڑکی کا منّی کی ہنسلی بڑھائی گئی تھی اسی دن لدپھند کر گیا تھا۔ میں کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔
سدا بہار۔ اے وہ چمپت ہُوا مُوا چور۔
بیگم۔ بس انھیں باتوں پر میں جھلّا اٹھتی ہوں۔ پھر کہتی ہے۔ پھر کہتی ہے چھوٹی بیگم مجھ سے تیکھی رہتی ہے۔ تیری باتوں سے میرا جی جلتا ہے۔
نواب۔ تو کوئی کیوں مرتی ہو بھلا۔ چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میرا آزاد میاں صف شکن علی شاہ کو لا ہی چھوڑے گا۔ ہم جانتے ہیں علمی بحث ہو رہی ہے اور پھر تم جانو علم تو وہ سمندر ہے جس کا اور نہ چھور۔
بیگم (قہقہہ لگا کر) علمی بحث ہو رہی ہو گی۔ کیوں صاحب، میاں صف شکن علی شاہ علم بھی جانتے ہیں (پھر قہقہہ) میں کہتی ہوں آخر اللہ نے تم کو کچھ رتی ماشہ تولہ عقل بھی دی ہے۔ موا بٹیر، ذری سا جنور کا کن کے تین دانوں میں پیٹ بھر جائے اس کو آپ بڑھے حافظ سے بھی زیادہ علم والا سمجھتے ہیں (پھر قہقہہ) میرے میکے کے پڑوس میں ایک سڑی سودائی دن رات واہی تباہی بکا کرتا ہے اس کی اور تمھاری باتیں ایک سی ہیں۔
سدا بہار۔ نابیوی روانت کے تلے انگلی دبا کر) اُوئی کوئی ایسا کہتا ہے۔ اُس سودائی نگوڑے کو ان پر سے صدقے کر دوں۔ واہ وا۔
نواب۔ تم سمجھی نہیں سدا بہار۔ ابھی الھڑ پنے ہی کے دن ہیں نہ ران کے۔ خدا کی قسم ان کی یہی باتیں تو بھاتی ہیں۔ یہ کم سنی کا سبھاؤ ہے اور دو تین برس۔ پھر یہ شوخی اور چلبلا پن کہاں؟ یہ جب جھڑکتی یا گھڑکتی ہیں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔
سدا بہار۔ ہاں ہاں پھر جوانی تو باؤلی ہوتی ہی ہے۔
بیگم۔ اچھا سدا بہار سے کہو کہ اس کو اپنے بڑھاپے کی قسم جو جھوٹ بولے۔ بھلا کیوں سدا بہار۔ بٹیر پڑھے لکھے بھی ہوا کرتے

ہیں منہ دیکھی نہ کہنا اللہ لگتی کہنا۔
سدا بہار۔ بڑھاپا! بہو نچہ۔ بڑھاپا کیسا۔ بیوی بس یہی باتیں تو اچھی نہیں لگتی ہمیں۔ میں بوڑھی کاہے سے ہو گئی۔ بُرا نہ مانو تو کہوں آپ سے ابھی ٹانٹھی ہوں۔

اتنے میں غفور خدمت گار نے پکارا۔ فرخندہ! فرخندہ! اے بوا فرخندہ بہَر رے کہہ دو کہ پیچوان بھر رکھا ہے، یہاں بھیجدوں یا نیچے میں رکھوں۔ حضور باہر نہ آئیں گے کیا؟
نواب۔ وہ چاندی والی چھوٹی گڑگڑی بیگم صاحب کے واسطے بھرلاؤ۔ کل بواں سے تمباکو آیا ہے۔ وہی بھرنا اور پیچوان باہر لگا دو ہم ابھی آتے۔

یہ کہہ کر نواب نامدار بیگم صاحب کے ہنسی ہنسی میں آہستہ سے ایک چٹکی لے کر مسکراتے ہوئے باہر تشریف لے گئے اور حالی موالی مصاحب رفقا ان کے جاتے ہی سر و قد تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آداب بجا لاتا ہوں۔ حضور کو رُمش ہے۔ پیر و مرشد تسلیمات عرض کرتا ہوں۔ خداوند مجرا عرض ہے۔ حضور رُالا۔ چوطرفہ سے آداب و تسلیمات کے چھرے چلنے لگے۔
خوجی۔ اُف اس وقت ملک الموت سے سامنا ہوا۔ ایسا دھچکا لگا کہ کلیجہ بیٹھا جاتا ہے اور بے اختیار رونا آتا ہے۔ ہات تیرے گیدی چور کی۔
نواب۔ کیوں خیر باشد؟
خوجی۔ پیر و مرشد اس وقت بٹیر خانے کی طرف گیا تھا وہاں۔
نواب۔ اُف (دھم سے گر پڑے)
مصاحبین۔ یا علیؑ۔
نواب۔ بھئی دل بیقرار ہے رطبیعت بے لطف ہو گئی۔ خوجی میاں تم کو ہماری تشفی کرنا چاہیئے تھی نہ کہ اُلٹے ایسی باتیں کرتے ہو جس میں ہمارے ہاتھ پاؤں اور بھی پھول جائیں۔ اب شاہ جی سے ہاتھ دھونا چاہیئے کہ ان کا وصال ہو گیا۔ اِنا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون۔
رفقا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
خوجی۔ (پینک سے چونک کر) اسی بات پر کچھ مٹھائی نہیں کھلواتے۔ منگواؤ تو کولی کی دکان کی مٹھائی۔
نواب۔ کوئی ہے۔ اس مردک کی گردن تو ناپنا۔ ہم تو اپنی قسمتوں کو رو رہے ہیں یہ مٹھائی مانگتا ہے، بے ٹکا نمک حرام۔
خوجی۔ دیکھئے دیکھئے پھر میری گردن کُند چھری سے ریتی جاتی ہے۔ میں مٹھائی کچھ کھانے کے واسطے تھوڑا ہی منگواتا ہوں میں تو اس لیے منگواتا ہوں کہ فاتحہ پڑھوں۔
نواب۔ شاباش! جی خوش ہو گیا۔ خوجی مجھے معاف کرنا۔ بے اختیار نمک حرام کا لفظ نکل گیا تم بڑے۔
مصاحب۔ حلال خور۔ حلال خور ہو۔

اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ نواب صاحب لوٹنے لگے اور بیگم صاحب نے گھر سے لونڈی کو بھیجا کہ دیکھنا تو یہ کیا ہنسی ہو رہی ہے۔

نواب۔ بھئی کیا آدمی ہو، واللہ رتّے کو پہنسانا اسی کا نام ہے۔ خوجی بیچارے کو حلال خور ہی بنا دیا۔

خوجی۔ حضور اب میں یہاں نہ رہوں گا۔ کیا بے وقت کی شہنائی سب کے سب بجانے لگے کہ نوبہ ہی بھلی۔ افسوس صف شکن علی کا کسی کو بھی خیال نہیں۔

اتنے میں نواب صاحب پلنگ پر دراز ہوئے اور رفقا میں سے کوئی چانڈو خانہ پہنچا، کوئی افیم گھولنے لگا۔

رند ساغر نوش۔ فتنہ ہمدوش۔ ستم ایجاد۔ میاں آزاد سرائیں کھٹیا کی پاٹی پہ مزے سے بیٹھے سرور کے ساتھ بلبل شاخسار معجز طرازی حضرت لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی جعل الجنۃ مثواہ کی یہ غزل بہ لحن داؤدی لہرا لہرا کر پڑھ رہے تھے اور اس سرمست صہبائے عرفان کے کلام سحر نظام پر احسنت و مرحبا کہہ رہے تھے ؎

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیزست — ببانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیزست

درآستین مرقع پیالہ پنہاں کن — کہ ہمچو چشم صراحی پیالہ خوں ریزست

عراق و فارس گرفتی بشعر خوش حافظ

بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریزست

مقطع پر میاں آزاد لوٹ گئے اور عین حالت وجدان میں غلغلہ جزاک اللہ بلند کرنے لگے اور چارپائی سے دس دس ہاتھ اچھل پڑے۔ بار بار یہی شعر شیریں اور کلام رنگیں زبان پر لائے کہ ؎

عراق و فارس گرفتی بشعر خوش حافظ

بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریزست

اتنے میں ایک بھڈری[1] آنکلا۔ ساعت بچاریں ساعت۔ شگن بچاریں شگن!

بھڈری (پوتھی سنبھال کر) تمھاری نواب صاحب کے یہاں کے بڑی تلاش تھی جی۔ تم گاٹب کہاں ہو گئے تھے اونٹ لے کے۔ اب ہیں جا کے کہوں گا کہ میں نے پوتھی دیکھا تو نکلا کہ آجاد (آزاد) پانچ کوس کے اندر ہی اندر ہیں۔ جب تم ٹپ دینی پہنچ جاؤ گے تو پھر ہماری چڑھتی کلاں ہو گی۔ تم کو بھی آدھوں آدھ بٹا دیں گے مگر بھانڈا نہ پھوڑنا چڑھ باجی ہے جو تم راضی ہو جاؤ تو چاندی ہے۔

آزاد۔ واللہ کیا سوجھی ہے۔ منظور ہے بس اب تم جاؤ ہم بھی دم کے دم میں پہنچتے ہیں۔

بھڈری نے پستک بغل میں داب کر راہ لی اور نواب کے یہاں دھر دھمکے۔

خوجی۔ اجی جاؤ بھی تمھاری ایک بات بھی ٹھیک نہ نکلی اب کچھ حکم لگاتے ہو۔

نواب۔ برسوں ہمارا نمک تم نے کھایا ہے برسوں۔ ایک دو دن نہیں برسوں برسوں۔ اب اس وقت کچھ پوتھی ورتھی بھی دیکھو گے یا باتیں ہی بناؤ گے چکنی چپڑی۔

بھڈری۔ وہ حکم لگاؤں کہ بیٹ ہی نہ پڑے۔

خوجی۔ اجی جاؤ بھی دیکھ لی۔ [illegible] زبانی [illegible]۔ ڈینگئیے ہو خاصے۔ کہیں کسی روز میں قرولی نہ بھونک دوں۔ سوائے بے پر کی اڑانے کے اور بات سیکھی ہی نہیں مرد آدمی سال بھر میں ایک دفعہ تو سچ بولا کرو۔

مصاحب۔ واہ سچ بولتے تو قصائی کے کتے کی طرح پھول نہ جاتے۔

---

[1] نجومی۔

نواب۔ یہ کیا واہیات گفتگو ہے؟
بھڈری۔ ناہیں ہم سے ان سے بنسی ہوتی ہے۔ یہ ہمیں کہتے ہیں ہم انہیں۔ اب آپ کوئی پھول من ہیں ہیں۔
نواب۔ یہ ڈھکوسلے ہمیں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ ہمیں صاف صاف بتا دو کہ میاں آزاد کب تک آویں گے۔
بھڈری۔ (کچھ بڑبڑا کر) پانی کے پاس ہیں۔
مصاحب۔ وہ آسوں برکھا گھم گھم برسے۔ واہ استاد پانی کے پاس کی ایک ہی کہی لڑکی نہ لڑکا۔ دونوں طرح اپنی ہی جیت۔
بھڈری۔ یہاں سے کوئی تین کوس کے اندر ہی اندر ہیں۔ جو نہ ہوں تو ناک کٹا ڈالوں۔
خوجی۔ آدُ آدُ ناک، ناک بدتے ہیں وہ منزلوں کی راہ ہیں۔ سانڈنی کے کوڑے کیے ہوں گے۔ گل چھرے اڑا رہے ہوں گے۔ آپ تین کوس لیے پھرتے ہیں۔
رفقا۔ حضور یہ بھڈری بڑا فیلیا ہے آپ تو پوچھتے ہیں کہ میاں آزاد کب آئیں گے وہ کہتا ہے کہ تین کوس کے اندر ہی اندر ہیں۔ واہ رے جھپ جھا لیئے سوائے جھوٹ سوائے جھوٹ۔
بھڈری۔ تو بتاتے بتاتے بتا ہی دیں گے یا ایک دم سے بتا دیں۔ سوچیں بچار ہیں بھی تو۔ لے ناک ناک کون بدتا ہے۔ کاٹ ہی لوں گا ناکے کے پاس گوندنی والی بغیہ میں میاں آجا د بیٹھے ہوں گے جاؤ دیکھ لو۔ پوتھی جلا دوں ناک کٹا ڈالوں جو جھوٹ نکلے۔
نواب۔ چابک سوار کو بلواؤ اور حکم دو کہ ابھی سُرنگ گھوڑی پر سرپٹ جائے اور دیکھے میاں آزاد ہیں یا نہیں۔ ہوں تو اس بھڈری کا آج گھر بھر دوں۔ بس آج سے اس کا معتقد ہو جاؤں۔

چابک سوار نے بانکا منڈا سا باندھا اور سرنگ گھوڑی پر کاٹھی کس، یہ جا وہ جا۔ پچاس ہی قدم گئے ہوں گے کہ گھوڑی بھڑکی اور عین تیزی میں دوسرے ناکے کی راہ لی۔ چابکسوار بہت اکڑے بیٹھے تھے مگر روک نہ سکے۔ دھم سے منہ کے بل سڑک پر گھوڑی چمپت۔
خوجی۔ حضور گھوڑی نے نادر علی خاں کو دے ٹپکا اور کیا جانے کس طرف نکل گئی۔
نواب۔ چلو خیر سمجھا جائے گا۔ تم شرغہ ٹانگن کسواؤ اور دوڑ جاؤ۔
خوجی۔ پیر و مرشد میں تو بوڑھا ہو گیا اور رہی سہی سکت افیم نے لے لی۔ ٹانگن ہے بلا کا شریر کہیں پھینک پھانک دے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں تو دین و دنیا دونوں سے جاؤں۔ آزاد خود بھی گئے اور ہم سب کو بھی بلا میں مبتلا کر گئے۔ حضور مجھے معاف کیجیے۔ شرغہ ٹرا ہوتا ہے اور یہ ٹانگن برسوں سے بندھا ہے اور کاٹ کھاتا ہے لپٹ تک اچھالتا ہے دولتیاں جھاڑتا ہے۔ خدائی بھر کے عیب تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ میرا تو بھرکس ہی نکل جائے گا۔

میاں آزاد ذرا ادھر ادھر ٹہلنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے تھوڑی دور پر ایک پختہ مکان بنا ہے۔ مختصر موزوں خوشنما اور دلکشا۔ اردگرد گلبن بھی ہیں۔ دوب بھی چوطرفہ جمی ہوئی ہے۔ سڑک پر سرخی بھی کٹی ہے۔ شوق چرایا کر دیکھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتے لکڑی ہلاتے پہنچے تو دیکھا کہ کسی کا مقبرہ سا ہے۔ اخاہ یہ کسی بڑے شخص کا مقبرہ ہے۔ کتبہ پڑھا تو یہ لکھا تھا ؎

شورے شد واز خواب عدم چشم کشودیم   دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

مزار پُر انوار مقبول بارگاہ لم یزلی ولی حق آگاہ عارف باللہ حضرت صف شکن علی شاہ برد اللہ مضجعہ دانا اللہ

برہانہ ؎

پختہ مکاں کی طرح سے ہے فکر گور بھی ‏ ‏ ‏ انسان جان دیتا ہے آرام کے لیے
رہتا ہے آدمی کا نشاں اس جہان میں ‏ ‏ ‏ بنتی ہے قبر بعد فنا نام کے لیے
اے خاک تیرہ خاطر مہماں نگاہدار ‏ ‏ ‏ کیں نور چشم ماست کہ در بر گرفتۂ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

میاں آزاد نے جو یہ پڑھا، کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ یہ کہیئے یار لوگوں نے قبر بھی بنوا دی۔ واللہ کیا کیا فقرے باز ہیں۔ اِدھر چابک سوار نے شبدیز آہو شکار سے پٹخنی کھائی اُدھر ایک لونڈے نے تالی بجائی۔ مگر واہ رے شہسوار کچومر نکل گیا لیکن وہی خم دُم تیچھے جھاڑی پہلے نواب کے اصطبل میں گئے اور ایک خوش خرام و تیزگام کمیت پر کاٹھی کس سوار ہوتے ہی کڑکڑا دیا۔ ہَوا سے باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ چلتے چلتے گوندنی والی بغیہ میں دھم سے جا کودے۔ دیکھا تو سانڈنی پر کا کر بڑی جھول جھلک رہی ہے اور اونٹنی گردن جھکائے چوطرفہ منک رہی ہے۔ پکارا، میاں آزاد! میاں آزاد! ہوت۔ اخاہ آپ ہیں۔ آیئے ذرا بغلگیر تو ہو جیئے۔ مصافحہ معانقہ دونوں میں سے ایک تو ہو۔ بسم اللہ کہیئے مزاج معلّٰی۔ اجی ہمارے مزاج کی نہ پوچھو۔ گھڑی میں ماشہ، گھڑی میں تولہ۔ ابھی شیطان انگلی دکھائے تو دِتی ہو رہیں، وحشت ٹیٹوا لے تو دھاکے سے جبلپور پہنچیں۔ آپ کہیئے نواب کے یہاں تو خیریت ہے۔ جی ہاں خیر صلاح کے ڈھیر ہیں۔ مگر آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ ارے میاں کچھ اور بھی سُنا اس ٹیر کی قبر بنائی گئی ہے۔ سمجھے صاحب یہ سامنے وہی تو ہے۔ واللہ لا نا تو ہاتھ۔ یار تمھاری ہی کسر تھی۔ کہو ہم نے سُنا خوب گلچھرے اڑائے۔ چلو پھر اب نواب نے یاد کیا ہے۔ ایں! انھیں ہمارے آنے کی کہاں سے خبر ہو گئی بھئی۔ اجی اب یہ ساری داستان راہ میں سنائیں گے۔ اچھا تو پہلے آپ ہمارا خط نواب کے پاس لے جائیں۔ لائیے ایک نہیں دس۔
میاں آزاد نے تڑ سے خط کھینچ ڈالا۔

آج قلم کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ دماغ فلک الافلاک پر ہے، سینہ تختۂ گل بن گیا اور کیوں نہ ہو۔ میاں صف شکن علی شاہ حق آگاہ قدس سرہٗ الشریف کی سواری آتی ہے۔

حضور کے نمک کی قسم ادھر تحت الثریٰ اُدھر بُرجِ کرسی آسمان تک ہو آیا تب کہیں جا کے کھوج پایا۔ شاہ جی صاحب ہر روز ڈاڑھیں مار مار کر روتے ہیں اور الحق مرؒ الحق مرؒ کیا کرتے ہیں۔

سُنیئے حضور پُر نور۔ بندۂ جاں نثار نے وہ کام کیا ہے کہ خلعت دیجیے انعام و اکرام دیجیئے۔ زر و جواہر دیجیئے۔ زر و جواہر میرے اوپر سے صدقہ کیجیئے۔ اللہ اللہ یہ کارنمایاں کیا صف شکن علی شاہ عازی کو سمجھا بجھا منا منو کر لے آیا۔ بڑی بڑی دلیلیں چھانٹتے تھے پہلے فرمایا کہ ؏ دریں بزم رہ نیست بیگانہ را۔ میں نے چھوٹتے ہی جواب دیا کہ شاہ جی ؏ کہ پروانگی داد پروانہ را۔ کھل کھلا کر ہنس پڑے اور اشارہ سے بلایا۔ روبرو گیا تو خدمت گار سے کہا۔ ؏ رمضانی مگساں می آیند۔ میں نے بڑھ کر عرض کیا کہ پیر و مرشد ؏ ناکساں پیش کساں می آیند۔ پیٹھ ٹھونکی اور فرمایا کہ شاباش برخوردار نواب صاحب کی صحبت میں آپ بہت برق ہو گئے ہیں الغرض کامل دو ہفتے تک مجھ سے بحث رہی۔ آخر کار فرمایا کہ تمھاری سر مغزن سے یاد الٰہی میں فتور پڑتا ہے۔ میں نے قدم لیے اور دست بستہ عرض کیا کہ آپ چلیئے ورنہ میں زہر کھا کر مرجاؤں گا۔ مجھے سمجھایا اور کہا دیکھو یہ زندگی عطیۂ یزداں ہے۔ اس کو مفت میں رائگاں کرنا خلافِ عقل و سعادت ہے مگر خیر تمھاری خاطر سے چلتا ہوں۔ لیکن وہ خوجی جو نواب صاحب کے مزاج

میں وغیل ہیں ان سے میری طبیعت نفور ہے میں ایک شرط سے چپتا ہوں کہ جس وقت میں وہاں پہنچوں تو نواب صاحب کے سامنے خوجی پر بیس مشکیں پڑیں عرض کیا بیس نہیں بائیس۔ فرمایا کہ قول دو۔ عرض کیا قول جان کے ساتھ ہے۔ تب کہیں آئے۔ اب آپ لوگوں کو ٹھاٹھ سے بھیجیئے تو دھوم دھام سے میاں آزاد کو ساتھ لائیں اور اہل شہر ان کی زیارت سے استفادہ اُٹھائیں۔ میں بالکل چُرمُر ہو گیا ہوں لیکن حضور کا سایۂ دامن مجھے کافی ہے۔ سے اب جلوس جلد بھیجیئے تو شاہ جی صاحب تشریف لائیں۔

یہ خط لے کر چابکسوار روانہ ہُوا۔

نواب کا کامل فن شہسوار شبدیز بادرفتار کو ران کے تلے دبائے باگ اُٹھائے آسن جمائے مہمیز کا اشارہ کرتا اکڑتا پیرتا کھٹا کھٹ جا رہا تھا اور پٹاپٹ کوڑے جما رہا تھا۔ اصیل گھوڑا اور اس پر کوڑا، تاب کہاں بلا کی طرح جھپٹا بگولا بن گیا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ دریا لہریں مارتا ہے۔ ہوا بھی آئے، تو پچھاڑیں کھا کے اس کی گرد تک کو نہ پائے۔ کیوں نہیں۔ نواب کے اصطبل کے گھوڑے خاصے کے گھوڑے پریزاد گھوڑے دیونژاد گھوڑے ہیں کہ باتیں۔

الغرض میاں آزاد کا خط لے کر چابکسوار نواب کی خدمت میں حاضر ہوا۔

چابکسوار۔ مجرا عرض ہے۔

نواب۔ سلام۔ کہو بیٹا کہ بیٹی۔ جلدی سے بولو۔ یہاں پیٹ میں چوہے چھوٹے ہوئے ہیں۔

چابکسوار۔ حضور غلام نے راہ میں دم لیا ہو تو حرمیانہ دوں۔ بس گھوڑے کی پیٹھ پر آیا اور کڑ کڑا دیا۔

خوجی۔ کتنے بے تکے ہو میاں۔ سوال دیگر جواب دیگر کہیں کھیت کی سُنیں کھلیان کی۔ بھلا اپنی کارگذاری جتانے کا یہ کون موقع ہے؟ جی آزاد کا پتہ بتاؤ۔ مارے مشیخت کے دُبلے ہی ہوئے جاتے ہیں۔

چابکسوار۔ حضور گومتی والی لبنیہ کے پاس زین پوش بچھائے بیٹھے ہیں اور حضور کو یہ عرضی دی ہے۔

نواب۔ لاؤ لاؤ لاؤ لاؤ بھئی لاؤ کہیں لاؤ تو۔ کوئی ہے۔ منشی صاحب کو آواز دینا۔

منشی۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں پیر و مرشد۔

منشی صاحب نے خط پڑھنا شروع کیا تو حاضرین جلسہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ع کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔

خوجی۔ خداوند جان بخشی ہو تو غلام کچھ عرض کرے۔

نواب۔ جان بخشی کیسی؟ آج تو وہ خوشی ہے کہ بادشاہ قیدیوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور یہاں تو اس وقت شادی مرگ کی نوبت ہو گئی ہے۔ قدسیوں نے لاہوت پردہ نہ دیکھا ہوگا جو ہم نے ان آنکھوں سے اس دار الغرور میں دیکھ ڈالا۔ ایسی خوشی کے وقت جان بخشی بھی کیسی بے تکی بات ہے کہو تا۔

خوجی۔ پیر و مرشد۔ اور تو میاں آزاد نے جو کچھ لکھا اس میں رتی بھر فرق نہیں مگر غلام کا جو حال لکھا ہے وہ سب ڈھکوسلا ہے جو ذری بھی اصلیت ہو تو ہاتھ کٹا دوں۔

بھڈری۔ بس بیٹھے رہیئے تم پہلے بھی تو ناک کٹاتے تھے اب کاٹ لوں جڑ سے ناک۔ ہجور غلام کا پرشن کیسا ٹھیک نکلا۔ جو ہے سو ما نو نشانے پر تیر۔ کھٹ دینی بیٹھ گیا۔

لہ سے،

نواب۔ ہاتھی گھوڑا جاگیر انعام اکرام خلعت جو کہو دیں گے مگر ذرا میاں آزاد کو آنے تو دو۔ اور کیوں بھئی رمال نے تو بیان کیا تھا کہ صف شکن علی شاہ کے دشمن خدانخواستہ داخل خلد ہوئے یہ میاں آزاد کو کہاں سے مل گئے حیرت ہے کیوں میر صاحب! واللہ عالم یہ کیا اسرار ہے۔

میر صاحب۔ خداوند اس کی کُنہ حقیقت تک پہنچنا امر محال ہے۔ جناب باری کے قصر رموز کا کنگرہ رفیع اس درجہ بلند ہے کہ اس کے لب بام تک کمند اوہام کا پہنچنا دشوار ہے۔ ازبس دشوار ہے۔ ما عرفناک حق معرفتک۔ ما عبدناک حق عبادتک۔

ہے تجھ کو جنوں کی قسم اے جذب محبت
اس نور تجلی کی جھلک مجھ کو دکھا دے

نواب قمر رکاب نے کل رفقا اور مصاحبین اور حوالی موالی کو بلا کر حکم دیا کہ اصطبل کے سب ترکی عربی تازی گھوڑے اور فیل خانے کے دیو نژاد مستیوں کی دھت ہاتھی اور فلٹن اور بگھیاں اور خواص بردار اور جھنڈی بردار سپاہی جتنے ہماری سرکار میں ہیں سب سے کہو لیس ہو رہیں اور شہر بھر کے امیروں اور رئیسوں سے جلوس طلب کر لو اور سجا کر جاؤ۔ صف شکن علی شاہ کو ساتھ ہی لے آؤ مگر انتظام ہو کہ لوگ دور دور تک تعریف کریں۔ سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے۔ انگریزی باجا ضرور رہے۔

خوجی۔ اے پیر و مرشد انگریزی باجا تو آج کل دھوبیوں بھنگیوں تک کی برات کے ساتھ ہوتا ہے اس میں کیا منت ہے، رہا جو دھوم دھام چاہتے ہوں حضور تو غلام کو مقرر کیجیے اور میر صاحب کو میری نیابت میں دیجیے۔ پھر مزہ دیکھیے انتظام کا۔

میر صاحب۔ جی بجا ہے۔ یہاں بادشاہوں کی مصاحبتیں کیا کیے ہیں اور آپ کے نائب ہوں۔

نواب۔ اچھا تم دونوں مل جل کر انتظام کر لو۔

پھر کیا تھا، اتنا اشارہ پانا تھا کہ لگے ہاتھوں سب بندوبست ہو گیا۔ کیل کانٹے سے درست۔ چھوٹی بیگم کوٹھے پر کھڑے کھڑے جلوس دیکھ رہی ہیں اور دل ہی دل میں ہنس رہی ہیں کہ نواب کے دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے۔ اس وقت کوئی خوجی کو دیکھتا ہے، دماغ ہی نہیں ملتے تھے۔ اس کو ڈانٹ اس کو ڈپٹ کسی کو دھول جمائی کسی کو چانٹا رسید کیا۔ اس کو پکڑ لاؤ۔ اس کو گرفتار کرو۔ کبھی مشعلچی کو گالیاں دیں کبھی بنشاخے والے کو بے نقط سنائیں۔

الغرض جد و جہد اور اہتمام بلیغ کے بعد جلوس اس ترتیب سے چلا۔ سب کے آگے نشان کا ہاتھی اس کے بعد ہندوستانی باجا۔ اس کے بعد آرائش پھولوں کے تخت چنبیلی۔ اس کے بعد انگریزی باجا تال سم سر سے درست۔ اس کے بعد گھوڑے۔ کمیت کاٹھیاواڑ۔ کچھ سُرنگ۔ کرنگ۔ نقرہ۔ خنگ۔ کمیت سبزہ دیلا۔ چھم چھم کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ دو دو آدمی تعینات گھوڑے دُلہن بنے ہوئے۔ اس کے بعد پھر ارگن باجا۔ اس کے بعد پریوں کے تخت نازنینان عربدہ جو اور پری پیکران عنبر مو تختوں پر تھرک رہی ہیں۔ صد ہا تماشائی اُن کے شمع رخسار کے پروانہ ہیں۔ اس کے بعد روشن چوکی والے ستم ڈھا رہے۔ اس کے بعد ہاتھیوں کی قطار جھومتے جھامتے سونڈ سے کھیلتے جاتے ہیں۔ روشنی کا انتظام بھی چوکس تھا۔ پنشاخے اور لالٹینیں جھک جھک کر رہی تھیں۔ سوئی گرے تو اُٹھا لیجیے۔ رائی کا دانہ صاف نظر آئے اس ٹھسے سے برات چلی۔ اسے توبہ۔ برات کیسی جلوس چلا کہ میاں صف شکن علی شاہ کو لائیں۔

اب سنیئے کہ میاں آزاد اپنی سانڈنی پر سوار صف شکن علی شاہ کو کابک میں بٹھائے سڑک پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ہیں! صف شکن علی شاہ کہاں سے آ گئے ابھی کسی اٹیر بٹیر کو ادھر اُدھر سے خرید لیا ہوگا۔ نا صاحب وہی صف شکن۔ ناظرین

کو یاد ہوگا کہ میاں آزاد نے سب بٹیروں کو تو اُڑا دیا تھا مگر صف شکن علی شاہ کو چھپا رکھا تھا۔ اب موقع پر اس کو نکالا۔ خیر خوجی آتے ہی ان سے بغلگیر ہوئے اور میر صاحب گلے ملے اور غفور خدمت گار نے سلام کیا اور رفقا و مصاحبین سے مصافحہ ہوا۔

خوجی ۔ مثل مشہور ہے کہ سو برس بعد گھورے کے بھی دن بہورتے ہیں۔ سو ہمارے تو آج دن بہورے کہ آپ آئے اور شاہ جی کو لائے۔ نواب کے یہاں سناٹا پڑا ہوا تھا۔ وہ چہل پہل ہی نہیں، وہ دل لگی ہی نہیں۔ صف شکن کے سوگ میں سب پر مُردنی چھائی تھی۔ نواب چونک چونک پڑتے تھے۔ کھٹ ہُوا اور پوچھا آزاد آئے۔ دھم ہُوا اور کہنا ئے مگر آپ نہ آئے نہ آئے حاسدوں نے تو جڑ دی تھی کہ حضور وہ سانڈنی وانڈنی لے کر لمبے ہوئے کیسے آزاد اور کہاں کے صف شکن؟ وہ پہنچے یہاں سے سو منزل پر۔ مگر یار ہم تمہارا جنبہ کرتے تھے

میر صاحب ۔ جی ہاں اور ہم بھی آپ ہی کی طرف سے لڑتے تھے۔ ہم اور خواجہ صاحب دونوں۔

آزاد ۔ بھائی کچھ پوچھو نہیں۔ واللہ آسمان میں تھگلی لگائی تب کہیں ان کی زیارت نصیب ہوئی۔ خدا جانے کن کن جنگلوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اور وہاں کیا کیا افتادیں پڑیں۔

خوجی ۔ جی اس میں کیا شک ہے حضرت۔ یہاں لوگوں نے وہ گپیں اڑائی تھیں کہ توبہ ہی بھلی۔ کسی نے کہا بھانڈوں کے یہاں نوکری کر لی۔ کوئی طوفان باندھتا تھا کہ بھٹیاری کے گھر پڑ گئے۔ مگر سب بہتان۔ لوگ تہمتیں تراشتے تھے۔ لیکن اب سب نے منہ کی کھائی، ہات تیرے گیدی کی۔

خلاصہ یہ کہ خوجی اور میر صاحب اور رفقا اور مصاحبین سب کے سب مل کر میاں آزاد کو چیتے یار بناتے تھے۔ مگر ہمارے آزاد ایک ہی استاد۔ ان مردکوں کی قبر تک سے واقف تھے خوب سمجھے کہ اب نواب کے یہاں جو ہمارا طوطی بولے گا اس سے یہ سب ہمارے یار بچے بن رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک خوب گھُل گھُل کر باتیں ہوئیں تو میاں آزاد نے کہا حضرت اب رات جاتی ہے یا آتی ہے چلیے نا بس اب انتظار کس کا ہے۔ اچھا بسم اللہ کیجیے۔ پنشاخے چڑھاؤ لالٹینیں جلاؤ گھوڑے چلاؤ۔ ہاتھی کے پر سجاؤ۔ باجا بجاؤ۔ نامدان بڑھاؤ۔ سب قرینے سے لگاؤ۔ جب جلوس آراستہ ہوا تو میاں آزاد ایک فیل فلک شکوہ پر جا ڈٹے اور صف شکن علی شاہ کی کابک کو آگے رکھ لیا۔ خوجی اور میر صاحب کو حکم دیا کہ خواصی میں بیٹھیں۔ ہائیں! واہ ہم بھی کوئی چوڑے چار چر کٹے ہیں جو خواصی میں بیٹھیں گے۔ آپ بھی خوب کہتے ہیں۔ لوگوں نے سمجھایا کہ اجی کچھ واہی سے معلوم ہوتے ہو بیٹھ نہیں بیٹھتے خواصی میں۔ کیا شیخت میں بٹا لگے گا یا شان کرکری ہوگی۔ خیر، قہر درویش برجان درویش، دونوں کے دونوں پیچھے بیٹھ لیے اور جلوس چلا۔

شہر میں تو پہلے ہی سے ہُلڑ تھا کہ نواب والا بٹیر بڑے ٹھٹے سے آ رہا ہے۔ لاکھوں آدمی چوک میں تماشا دیکھنے کو ڈٹے ہوئے تھے چھتیں پھٹی پڑتی تھیں، وہ بھیڑ بھڑکا کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا۔ باجے کی آواز جو کانوں میں پڑی تو تماشائی چشم بدراہ انتظار ہوئے۔ نشان کا ہاتھی جھنڈے کا پھریرا اُڑاتا اٹکھیلیاں کرتا سامنے آیا۔ پھولوں کے تخت آگے تھے۔ انگریزی باجے نے کانوں کو مسرور، نازنینانِ پریوش کے رخ انور نے آنکھوں کو نور بخشا۔

لالہ و گل

ایں سبزۂ و ایں چشمۂ و ایں لالہ و ایں گل
آں شرح ندارد کہ بگفتار در آید

ہمارے شفیق نیک نہاد کوچہ گرد خانہ برباد اسم بامسمیٰ وارستہ و آزاد رنگیلے جوان بنے ہوئے بڑی آن بان سے تنے ہوئے شکرم پر سے اُترے تو نئے شہر کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ ہر محلہ آباد کوچہ و برزن خوش سواد۔ ہر سمت لطفِ خداداد۔ الٰہی یہ شہر ہے یا بہشتِ شداد۔ سڑکیں صاف، چپہ چپہ شفاف، کوڑے کرکٹ سے کام نہیں، گندگی و عفونت کا نام نہیں۔ ہر سمت سبزہ زار چوطرفہ گلزار اور گلہائے بے خار۔ دماغ طبلۂ عطار، نسیم عنبر بار اور روکش صد ہزار نافۂ تاتار۔

ایک رنگین کوٹھی جو نظر آئی تو آنکھوں نے چشم بددور وہ طراوت پائی کہ واہ جی واہ اس کی بناوٹ اور سجاوٹ ایسی بھائی کہ سبحان اللہ۔ بس دل میں کھُب ہی تو گئی۔ روشیں دنیا سے نرالی، بیلیں ساری خدائی سے انوکھی۔ پودوں پر وہ جوبن کہ انسان برسوں گھورا کرے، درختوں پر وہ پھبن کہ دیکھنے سے سیری ہی نہ ہو۔

میاں آزاد نے ایک ہرے بھرے درخت کے سایہ میں زرّیں پوش بچھایا۔ سبزۂ بیگانہ کو اپنا مسکن خاص بنایا۔ ٹہنیاں ہوا کے جھوکوں سے مستوں کی طرح جھومتی تھیں اور زمین کو بار بار چومتی تھیں۔ ایک رہرو سے میاں آزاد نے پوچھا۔

آزاد۔ اس کوٹھی اور بارہ دری میں کون رئیس رہتا ہے؟

رہرو۔ رئیس نہیں ایک رئیسہ رہتی ہیں۔ بڑی مالدار ہیں۔ اب تو کوئی ساٹھ برس کی ہوں گی۔ رات کو روز بجرے پر دریا کی سیر کو نکلتی ہیں۔ ان کی دونوں صاحبزادیاں بھی ہوتی ہیں۔

آزاد۔ بھلا کیوں صاحبزادیوں کی عمر کیا ہو گی؟ بیاہی ہیں کہ بن بیاہی؟

رہرو۔ اب سن و سال کا حال بندہ کو کیا معلوم مگر سیانی ہیں کوئی تیرہ تیرہ، چودہ چودہ برس کی ہوں گی۔ بس اور کیا۔ شریف زادیاں، رئیس زادیاں ہیں۔ بڑی تمیزدار، بڑی سلیقہ شعار، بڑی خوش فکر اور بڑھیا تو بقراط ہے اپنے وقت کی۔ ایسی منتظمہ تو دیکھی نہ سنی۔ بڑی پاک باز۔ بڑی راست باز۔ مخیر۔ جواد۔ غیور۔ خوش خلق اور تربیت یافتہ۔ لڑکیاں بھی اپنی ماں کے قدم بقدم ہیں۔ آنکھوں میں شرم، عفت کوش۔ حیا پرور۔ پاک نظر۔ نازو نعم پروردہ مگر خواندہ۔ یہ نہیں کہ الف کے نام بے نہ جانتی ہوں۔ رات کو بڑی سیر ہوتی ہے۔ جس وقت بجرہ فراٹے سے بہاؤ پر آتا ہے۔ اوہو ہو۔ وہ لطف آتا ہے۔ واہ۔

آزاد۔ شادی ابھی نہیں ہوئی بھلا کہیں پیغام و لیغام ہے؟

رہرو۔ ابھی شادی نہیں ہوئی نہ کہیں بات چیت ہے۔ دونوں بہنوں کو مطالعہ کتب کا ازبس شوق ہے۔ پڑھنے لکھنے اور سیر دریا یا گل گشتِ چمن کے سوا اور کوئی کام نہیں۔

آزاد۔ بندہ نواز ہم تو اس وقت ریشہ خطمی ہو گئے۔ پوچھئے وجہ! سنئے جہاں ہم نے اپنے وطن کی تعلیم یافتہ پڑھی لکھی لڑکی کا حال سنا اور بس باچھیں کھل گئیں۔ خدا کرے تعلیم نسواں اس ملک میں روز بروز ترقی پائے اور ہر ایک لڑکی فارسی

یا انگریزی پڑھ جائے۔آمین! لیکن واللہ اب دلی خواہش یہ ہے کہ کسی ترکیب سے بجرے کو دیکھیں۔

رہرو۔ الحمدللہ! الحمد للہ! لو منہ مانگی مراد پائی۔ وہ سامنے سے پالکی آئی۔

آزاد۔ آہاہا! وہ دیکھی۔ایں وہ تو درخت کے سایہ میں رُک رہی۔جی۔لیجیئے گیا۔

رہرو۔ گھبرایئے نہیں۔آپ کے تو ہوش ہی پیترا ہوئے جاتے ہیں۔اب کوئی اور ذکر چھیڑیئے۔جس میں معلوم ہو کہ دو مسافر تھک کر کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔

آزاد۔ سوجھی تو اچھی۔اب میں کوئی اور ذکر چھیڑتا ہوں۔کیوں صاحب ایکی آم کی فصل خوب ہوئی، جدھر دیکھو پٹے پڑے ہیں۔ شیرہ شکر ریز ہے آم پر چھری تیز ہے۔منڈی جایئے کھانچیوں کی کھانچیاں تربوز کی دیکھ آیئے، کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا اور آم کے سامنے تربوز کو کون ہاتھ لگائے؟

رہرو۔ بھئی امسال تو ہم نے خوب ہی آم کھائے۔کچھ دیکھا۔وہ دیکھو ہاتھی آ رہا ہے۔ ہاتھی کیا کوہ کا کوہ ہے نیل فلک شکوہ ہے۔

اب سب آ گئے، وہ دیکھو بجرا تیار ہو رہا ہے۔اس فیل مست پر دونوں بہنیں بصد ناز و دلربائی و انداز زیبائی متمکن ہیں اور پالکی میں بڑی بیگم صاحب جلوہ فگن ہیں اب بجرے پر سوار ہوا ہی چاہتی ہیں۔

یہ میٹھی میٹھی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک دفعہ ہی قبلہ کے رُخ سے کالی گھٹا متوالی گھٹا جھومتی ہوئی اُٹھی اور بجلی نے لونکنا[1] شروع کیا۔رعد کی گرج سے کان پڑی آواز کا سننا محال تھا اور رم جھم لگا مینہ برسنے۔ادھر قطرہ افشانی ہوئی، اُدھر فیلبان نے ہاتھی کا رُخ پھیر دیا۔کہاروں نے پالکی کو لیا اور چلے گھر کی طرف۔

اس شہر نشاط آباد و خوش سواد میں میاں آزاد خانہ بر باد نے بستر استراحت پر آرام فرمایا تو رات بھر کروٹ تک نہ لی۔ تڑکے تڑکے نسیم طرب انگیز نے جگایا۔اُٹھے تو اشعار آبدار در زبان غنچۂ دل گل خنداں۔

رہرو۔ الٰہی خیر۔صبح صبح پیغمبر سے کام نہ خدا کا نام بس ایک ذکر جام دوسرے خیال دلآرام۔

محبّت مے و معشوق ترک کر آتش
سفید بال ہوئے موسم خضاب آیا

آزاد۔ میاں یہ سب بڑھوتی[2] وقت کے خیال ہیں۔یہاں تو حضرت دل خرام ناز کے پامال ہیں۔

رہرو۔ لیجیئے منہ دھویئے۔حمام خانے جایئے۔ماحضر تناول فرمایئے۔اول طعام بعدہٗ کلام۔راحت الروح فی قلۃ المنام۔ ہاں لے اب اللہ اکبر کہہ کر اُٹھ تو بیٹھیئے۔بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سنا کر آٹا مینگی کرا لیں۔ادھر آفتاب نے رُخ انور کی جھلک دکھائی۔ادھر میاں آزاد کو سیر دریا کی دھن سمائی۔رہرو کو ساتھ لیا۔ہاتھ میں ہاتھ دیا اور اشعار سناتے رہرو کو وجد میں لاتے گاتے لہراتے پھونک پھونک کر قدم جماتے باد بہاری اور قدرت کی گلکاری کے مزے اُڑاتے چلے۔ لب جُو دونوں دوستانِ صادق اور یارانِ موافق نے جا کر دم لیا اور حدیث حسن و عشق کو سر کیا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک دفعہ کچھ آواز سی کان میں آئی۔معلوم ہوا کہ بڑی دُور سے کوئی سوار رہوار آہو شکار و برق رفتار

---

[1] چمکنا [2] بڑھاپا۔

کڑکڑاتے اور چمکاتے ہوئے آرہے ہیں۔ میدان بھر گونج گیا ہیں! اس وقت ہماری طرح کس کو تاب ہی آئی کہ سیر صحرا کی دُھن سمائی، تڑتڑ تڑ تڑ کرتے ہوئے بادرفتار گھوڑے چار تپلیوں سے اُڑتے چلے آتے ہیں۔ یہ کھائی پھاندی دن سے وہ نالی پرسے اُچک آئے زن سے ایک دفعہ ہی بجلی جو چمکی تو گھوڑے ان کے سر پر تھے۔ دیکھا کہ چار پانچ سوار چُست و چالاک سبزہ زار، پُربہار ہیں اشجار تناور کے سایہ میں کھڑے ہیں، گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ چمک رہے ہیں، یہ کڑکڑاتے وہ پہنچے، وہ چمکے، یہ آرہے جو شبدیز ہے سبک خیز ہے۔

آزاد۔ کیوں قبلہ۔ یہ جوان رعنا بلند دبالا گلعذار طرحدار کون ہیں کہاں سے آئے کدھر کے عزم ہیں ذرا دریافت تو کیجئے۔ مگر واللہ کیا کیا رنگیلے جوان ہیں اور گھوڑے تو سبحان اللہ زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ گھوڑے ہیں یا پری۔ اللہ اللہ یہ شان دلبری۔ جیسے دیکھو برق دم پری چھم۔

رہرو۔ حضرت یہ فوجی آدمی ہیں۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے ذرا روح کانپتی ہے یہ لوگ بات پیچھے کرتے ہیں چانٹا پہلے دیتے ہیں۔

آزاد۔ ہونھ۔ چانٹا اس کا تو ذکر ہی نہ کیجیے یہاں مرد میدان ہیں، دیکھئے ہم پر وبال ملاتے ہیں۔ ابھی باتوں میں لگاتے ہیں یہ کہہ کر میاں آزاد نے

پوچھا تم لوگ خیل کے خیل　　　جاتے ہو کدھر کو صورت سیل؟

شہسوار۔

اے صنم یہ ستم خدا سے ڈر　　　عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
قافلے والو اک ذرا ٹھہرو　　　پھر کے دیکھو شکستہ پا ہیں ہم
تم کو چاہا بڑا گناہ کیا　　　ہاں سزاوار ہر سزا ہیں ہم
عاشقانہ مزاج رکھتے ہیں　　　حال میں اپنے مبتلا ہیں ہم

آزاد۔ آہاہاہا۔ آئیے مصافحہ تو کریں۔ آپ بھی عاشق مزاج، باغ و بہار جوان طرحدار نکلے۔

رہرو۔ معقول! یہ اچھی ہوئی واللہ۔ دونوں سودائی مل گئے۔ اب دیکھئے کوئی دیر میں جوتی بٹا ہی چاہتی ہے۔ خُوب ہی گھنپ ہوگی۔

پانچوں سوار گھوڑے پر سے اُتر پڑے اور سب نے میاں آزاد سے مصافحہ کیا۔ رہرو کے ہوش پرّاں کہ واہ رے آزاد کیا دم کے دم میں بال و پر ملالیے گویا برسوں کی ملاقات دانت کاٹی روٹی ہے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ظریف آدمی اپنے لڑکے کو گودی میں لیے ہوئے تھپکی دے دے کر سُلا رہا ہے اور بہلا رہا ہے۔ میاں آزاد کی باچھیں کھل گئیں کہ خیر سے ایک ظرّاف تو ملا فوراً ہاتھ ملایا گلے لگایا۔ پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا واللہ خوش مذاق آدمی ہو کیوں نہ ہو استاد لے اب چلو ذرا اپنے شہر کی ہمیں سیر تو کرالاؤ ہم غریب الوطن مسافر ہیں۔

ظریف۔ ہم تاڑ گئے ہم بھانپ گئے شہر کے باہر دیکھیئے گا لطف یا اندر۔

آزاد۔ جہاں جائیے۔

ظرّاف۔ اچھا پھر آپ بھی کیا یاد کیجیے گا۔ آئیے چلئے۔

الغرض میاں آزاد اور ظرّاف (خوب گھوم پھر کر) گھر پہنچے۔ روشن (ملازم) نے کہا حضور بیگم صاحب آپ کو کوئی

بیس بئیر پوچھ چکی ہیں۔ اتنے میں لونڈی اندر سے آئی رمیاں گھر میں بلاتی ہیں) میاں ظرّاف نے دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ ان کی بیوی نے آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ دن دن بھر آپ غائب کہاں رہنے لگے۔ اب تو خیر سے بڑے سیلانی ہوگئے صبح کے نکلے نکلے شام کو خبر ملی۔ چلو میاں سامنے سے جاؤ مجھے ان باتوں سے نفرت ہے پس کھانا وانا خیر صلاح ہے یہاں ٹکّا دکا نہیں۔ حلوائی کی دکان پر دادا جی کی فاتحہ پڑھو۔ تنوری روٹیاں اڑاؤ میاں کسی کو کتے نے نہیں کاٹا ہے کہ وخت بےوخت چولھے کا مُنہ کالا کیا جائے — بھلے مانس آدمی دو ایک گھڑی کے لیے کہیں ذری گئے تو گئے، یہ نہیں کہ دن دن بھر پتا ہی نہیں۔ اچھے ہتھکنڈے سیکھے ہیں۔

ظرّاف نے چپکے سے کہا کہ نیکبخت ذرا آہستہ آہستہ باتیں کر باہر ایک بھلا مانس ٹکا ہوا ہے۔ اتنی بھی کیا بے حیائی ہے؟ اس پر وہ چمک کر بولی کہ بس زبان نہ کھلواؤ تمھیں جو دوست ملتا ہے خدائی خوار نہ گھر نہ بار۔ جانے کہاں کے الفتے ان کو مل جاتے ہیں کبھی کسی شریف زادے سے دوستی کرتے دیکھا نہیں۔ چلیے اب دور ہو جیئے نہیں تو ہم بے طور پیش آئیں گے۔ میاں ظرّاف کی جان عذاب میں کہ گھر میں بیوی بے نقط سنا رہی ہیں اور باہر میاں آزاد لاکھوں ہی گالیاں دیں گے کہ آپ کی بیوی نے آپ کو تو خیر جو کچھ کہا تھا وہ کہا ہی تھا مجھے کیوں لے ڈالا ہم نے کیا اُن کا بگاڑا تھا۔ اپنا سا منہ لے کر باہر نکل آئے اور آزاد سے کہا کہ یار آج روزے کی نیت کرلو۔ بیوی فوجداری پر آمادہ ہیں بھئی ایسی ترش مزاج سرکہ جبیں تو دیکھی ہی نہیں بات ہوئی اور تنک گئیں۔ مہینوں روٹھی رہتی ہیں۔ مگر کیا کروں امیر کی لڑکی ہے۔ ورنہ میں ایک جھلاّ[2] مجھے بدمزاجی پسند کہاں۔

باہمیں مردماں بباید ساخت   چہ تواں کرد مردماں ایں اند

سو بھئی آج فاقہ ہے فاقہ ہی سہی۔ قہر درویش برجان درویش۔

آزاد بولے کہ فاقہ آپ کے دشمنوں کو چلیئے نانبائی حلوائی کسی کی دکان پر مزے سے چل کر کھانا چکھ آئیں اور دندنائیں۔ انھوں نے آہ سرد کھینچ کر کہا۔ اتنے ہی ہوتے تو پھر بیوی کی کیوں سنتے۔ میاں پیسہ ٹکا پاس نہیں حلوائی کیا ہمارا ماموں ہے۔ آزاد ایک ہی خرانٹ گرگ باراں بولے کہ واہ اس فکر کسے ہے آپ ہمارے ساتھ چلیے اور مزے سے مٹھائیاں چکھیئے۔ مگر جو تدبیر بتاویں اس میں سر مو فرق نہ آنے پائے۔

الغرض میاں آزاد حضرت ظراف کو لے کر بازار پہنچے اور حلوائی کی دکان کے قریب سے یہ آگے بڑھ گئے آزاد ذرا پیچھے رہ گئے۔ ظرّاف سکھائے پڑھائے سمجھائے بجھائے تو تھے ہی جاتے ہی حلوائی سے کہا کہ میاں آٹھ آنے کے پیسے دو اور آٹھ آنے کی پنج میل مٹھائی۔ حلوائی نے پنج میل مٹھائی خاصی تازی تازی تو دی اور آٹھ آنے ڈبل گن دیئے۔ پیسے تو میاں ظرّاف نے دوپٹے میں باندھے اور مٹھائی اسی دکان پر چکھنے لگے۔ اتنے میں میاں آزاد نمودار ہوئے۔ بھئی لالہ ذرا عمدہ تازہ لڈو تو ایک روپیہ کے تول دینا مگر نخود ہی کے ہوں۔ اس نے ایک روپیہ کے لڈو تول کر چنگیل ان کے ہاتھ دھری۔ اتنے میں حضرت ظرّاف نے پیسے اور مٹھائی جو حلوائی سے پہلے تھی سنبھال کر چلنے کا قصد کیا اور بسم اللہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب تو حلوائی نے لکارا کہ میاں چلے کہاں؟ ذری پہلے بائیں ہاتھ سے پیسے تو رکھے جاؤ۔ واہ۔ پیسے کیسا ہوں۔ روپیہ۔ خوب اچھا مزا ہے ایں! بے روپیہ کیا تو نے پایا نہیں پہلے روپیہ دیا پھر سودا لیا۔ کیا چور اُچکوں سے سابقہ رہا ہے۔ اور سنیئے صاحب اچھے ملے دو دو مرتبہ[1] روپیہ دیں۔ کہیں میں رپٹ نہ لکھائی۔ مجھے بھی کوئی گنوار سمجھے ہو، ارے نامعقول چہرہ شاہی تو ابھی ابھی دے چکا ہوں۔ اب کیا کسی کا گھر لے گا۔ اس پر حلوائی اور ظرّاف میں تکرار ہونے لگی اور اس درجہ بڑھی کہ تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا ان کی دو گھڑی کی دل لگی ہوئی۔ ارد گرد سب حالی موالی بازاری

---

[1] مرتبہ۔ [2] غصہ ور

تماشائی ڈٹ گئے۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے ہیں کوئی کہتا ہے لالہ گھانس کھا گئے۔ کوئی کہتا ہے میاں ایک روپیہ کے لیے نیت ڈانواں ڈول نہ کرو۔

اتنے میں میاں آزاد نے کہا میاں حلوائی اب کہیں اسی طرح میرا روپیہ بھی نہ بھول جائیے گا۔ کیا آپ کا روپیہ؟ آپ نے روپیہ دیا کس کو؟ چلیئے ایک نشد دوشد۔ اب جو سنتا ہے وہ اس حلوائی ہی کو اُلّو بناتا ہے۔ چوطرفہ سے اس پر لے دے ہونے لگی۔ اور لوگوں نے بہت کچھ لعنت ملامت کی کہ شریف آدمیوں کو بے عزت کرتے ہو۔ روپیہ لے کر خوب مکر جاتے ہو۔ لالہ ساکھ جاتی رہے گی۔ اتنے میں اس حلوائی کا بڈھا باپ جو آیا دیکھتا کیا ہے کہ دکان کے اردگرد اژدحام عام اور جم غفیر ہے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ کیا دکان لُٹ گئی ہے؟ ایک بگڑے دل نے کہا۔ اجی لُٹ تو نہیں گئی مگر اب تمھاری دکان کی ساکھ جاتی رہی۔ ابھی ایک بھلے مانس نے کھن سے روپیہ پھینکا اب کہتا ہے ہم نے روپیہ پایا ہی نہیں۔ اس کو چھوڑا تو دوسرے بیچارے شریف کا دامن پکڑ لیا کہ تم نے بھی روپیہ نہیں دیا۔ حالانکہ وہ بیچارے سیکڑوں قسم کھاتے ہیں کہ میں دے چکا ہوں۔ حلوائی بڑا تیکھا بڈھا تھا۔ سنتے ہی آگ ہوگیا اور جھلّا کر اپنے لڑکے کی کھوپڑی پر تان کے ایک ٹیپ لگا بیٹھا۔ بات تیرے کی کہتا ہوں کہ بھانگ نہ کھایا کر مانتا ہی نہیں۔ کیوں پھر کھائے گا بھانگ۔ جا بیٹھ دکان پر۔

ظراف اور میاں آزاد نے مزے سے ڈیڑھ روپیہ کی مٹھائی باندھ لی اور آٹھ آنے کے پیسے مزید براں۔ راستے میں قہقہے لگاتے چلے۔ جب گھر پہنچے تو خوب لڈو اور برفی اور پیڑے چکھے، بچے بچائے اندر بھیجے۔ اب آزاد سے میاں ظریف نے کہا یار اسی طرح روپیہ کی فکر نہیں کرتے۔ کہیں سے روپیہ دلواؤ تو جانیں۔ انھوں نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے؟ استاد ہمارا ذمّہ۔ ابھی ابھی چلو۔ مگر کسی سے مانگ مونگ کر کچھ اشرفیاں یا روپیہ لے چلو۔ اشرفی ہو تو نورٌ علیٰ نور۔ ظرّاف نے دوسو اشرفیاں کلدار نکالیں اور کہا لیجیئے معہ ہمیانی کے موجود ہیں۔ اس کے بعد ہمیانی اُٹھائی اور آزاد میاں روشن علی کو ساتھ لیا۔ بازار چلے۔ پہلے ایک مہاجن کو اشرفیاں دکھائیں اور پرکھائیں بیچتے ہیں کھری کھوٹی دیکھ لیجیئے۔ مہاجن نے ان کو خوب کسوٹی پر کسا اور کامل عیار پایا اور کہا انیس[19] کے حساب سے لیں گے۔ ظراف دوسری دکان پر پہنچے اور وہاں اشرفیاں گنوائیں اور پرکھائیں۔ اور چلتے ہوئے۔ اور اب اثنائے راہ میں میاں آزاد سے کہا یہاں ایک کوٹھی بھی ہے۔

الغرض ایک مہاجن کی کوٹھی پر پہنچے مگر اشرفیاں راستے میں آزاد کو دیدیں اور کہا تم سیدھے گھر کی راہ لو۔ کوٹھی پر پہنچ کر کہا کہ ہم کو دوسو اشرفیاں خریدنی ہیں۔ مہاجن نے دیکھا کہ آدمی متین ہے اور ریاست چہرے سے برستی ہے کپڑے بھی نفیس اور قیمتی زیب تن کیے ہوئے ہیں، فوراً دوسو اشرفیاں اُن کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ ظرّاف نے پوچھا کہ دَر[ل] کیا ہے؟ بولے خریدتے ساڑھے اُنیس[19] کے حساب سے اور بیچتے بیس[20] روپیہ کے در سے ہیں۔ اخاہ اتنا فرق! اچھا دوسو اشرفیوں کا حساب ساڑھے انیس کے در سے کسی کاغذ پر لکھ تو دو۔ مہاجن کے منیب جی نے ایک پرچہ پر حساب لکھ دیا۔ حضرت نے وہ کاغذ تو جیب میں رکھا اور اشرفیاں باندھ کر کھڑے ہوئے اور طرارہ بھر کے کوٹھی کے باہر تھے۔ ہائیں ہائیں۔ ہائیں۔ ہاں لینا لینا۔ کہاں کہاں۔ ظرّاف پینترا بدل سامنے کھڑے ہو گئے۔ بس دور ہی سے بات چیت ہو سامنے آئے اور میں نے "تلا ہاتھ دیا۔ اے صاحب روپیہ تو دیجیے۔ کیسے روپے؟ آخر روپے کیسے؟ ہم نہیں بیچتے۔ کیا کہا؟ نہیں بیچتے۔ کیا اشرفیاں آپ کی ہیں؟ جی اور نہیں تو کیا آپ کے باپ کی ہیں۔ ہم نہیں بیچتے آپ کا اجارہ ہے کچھ۔ آپ ہیں کون زبردستی کرنے والے۔

ل نرخ۔

اتنے میں آزاد بھی آن پہنچے۔ ظراف بولے ساڑھے انیس[۱۹] کے حساب سے ہم کیوں بیچنے لگے بھلا۔ مہاجن اور ان کے منیب جی اور چیلے چاپڑ غل مچا رہے ہیں کہ تم اشرفیاں لائے کب تھے وہ ایک نہیں سنتے۔ اتنے میں کوئی دو سو آدمی جمع ہو گئے اور اہل پولیس بھی آن موجود۔

جمعدار۔ کیا فساد ہے لالہ چنا مل، وہ نہیں بیچتے تو زبردستی کیوں کرتے ہو۔ اپنے مال پر سب کو اختیار رہے۔ وہ بیس چھوڑ بائیس کے حساب سے دیں پھر آپ کون؟

مہاجن۔ آپ اچھے میر فیصل بنے یہاں چار ہزار روپیہ پر پانی پھرا جاتا ہے آپ کہتے ہیں جانے بھی دو یہ تو ہماری اشرفیاں ہیں۔

تماشائی۔ واہ بھلا کوئی بات بھی ہے۔ یہ اکیلے آپ دس۔ جو ایسا ہوتا تو یہ کوٹھی کے باہر بھی آنے پاتے۔ آپ سب مل کر ان کا اچار نہ نکال ڈالتے۔ اب تک ان کا کچومر نکل گیا ہوتا۔ اتنے بڑے مہاجن اور دو سو اشرفیوں کے لیے ایمان چھوڑے دیتے ہو۔

جمعدار۔ بری بات ہے۔

ظراف۔ دیکھئے آپ بازار بھر میں دریافت کر لیں کہ ہم نے کتنی دکانوں میں یہ اشرفیاں دکھلائیں اور پرکھوائیں۔ بازار بھر گواہ ہے۔ اس کو بھی جانے دیجیے یہ پرچہ پڑھیئے اس میں ساڑھے انیس کے حساب سے در لگایا ہے یا کچھ اور؟ اور اگر بیچتے ہوتے تو بیس کے در سے حساب لگاتے یا ساڑھے انیس سے۔ بطلان کریجیے۔ یہ انھیں کے ہاتھ کا پرچہ ہے یا اس سے بھی ان کو انکار ہے۔ مفت میں ایک شریف کے پیچھے پڑے ہیں۔ لینا ایک نہ دینا دو۔

جمعدار۔ یہ تو خوب ثبوت دیا۔ لالہ جی افسوس ہے آخر یہ آپ کے منیب کے دستخط ہیں یا کسی اور کے؟ پھر جھگڑا بھلا کاہے کا۔ سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ بازار میں چلیئے، دیکھیئے ان کے پاس اشرفیاں تھیں یا نہ تھیں؟ اچھا اس وقت وہاں اور بھی کوئی تھا؟

روشن۔ جی ہاں میں تھا۔

جمعدار۔ تم نے کیا دیکھا؟

روشن۔ یہ میاں آئے اور جھرد جھرد (زرد) اشرپھی (اشرفی) انڈیل دی۔ لالہ سے بھاؤ تاؤ نہ ہوا بس باندھ کے لے گئے تو لالہ نے غل مچایا کہ لوٹ لیا۔ لوٹ لیا بس اور کچھ نہیں دیکھا۔ ایمان نہیں چھوڑنا ہے۔

الغرض میاں ظراف اور ساہوکار اُن کے منیب اور جمعدار اور تماشائی سب مل کر بازار چلے وہاں تحقیقات کی تو دلالوں، مہاجنوں نے گواہی دی کہ بیشک ان کے پاس اشرفیاں تھیں اور انھوں نے پرکھوائی بھی تھیں۔ ابھی ابھی یہاں سے گئے تھے۔

جمعدار۔ لالہ صاحب اب خیر اسی میں ہے کہ چپکے ہو رہیئے ورنہ بیڈھب ٹھہرے گی۔ ثبوت کافی موجود ہے۔ آپ کی لاکھ کی ساکھ جائے گی۔ اور منیب کی تو شامت ہی آئے گی۔ آیندہ آپ کو اختیار رہے۔

مہاجن۔ کیا اندھیر ہے چار ہزار روپیہ پر پانی پھر گیا۔ بٹے کھاتے[۱] میں اتنا روپیہ کبھی عمر بھر میں نے جمع ہی نہیں کیا تھا آج تک۔ اور جو ہے ہمیں کو اُلو بناتا ہے۔ خیر ہاتھ دھویا۔

میاں آزاد تو کھسکے اور روشن بشاش بشاش ان کے ساتھ چلے۔ میاں ظراف کے گھر پہنچے تو چہرہ گلنار۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ جاتے ہی دو سو اشرفیاں کھن کھن کرکے ڈال دیں۔ دیکھا یوں لاتے ہیں۔ لو اب یہ اشرفیاں ہماری بھابی جان

---

[۱] بٹہ کھاتہ۔ مفت۔ بیکار۔

کے پاس رکھو۔

ظراف۔ (گھر میں جاکر) کہاں ہو کیا سو رہیں!

بیوی۔ کیا کمائی کر کے لائے جو ڈپٹ رہے ہو۔ سو نہ رہیں تو کیا تمھاری طرح رات بھر چوکی پہرا دیں؟

ظراف۔ (اشرفیاں کھنکا کر) لو ادھر آؤ۔ لو صلواتیں نہ سناؤ۔ یہ لو دس ہزار کی اشرفیاں۔

بیوی۔ واہ یہ بُتّے[1] کسی اَیلی[2] کو دیجئیے گا۔ یہ تو وہی اشرفیاں ہیں جو چچا جان امانت رکھوا گئے ہیں۔ اُڑتے ہیں آپ۔ شان خدا!!

ظراف۔ وہ یہ ہیں!

بیوی۔ دیکھوں (کھلکھلا کر) واہ وا واہ، کیا کسی کے یہاں پھاندے تھے آخرش یہ لائے کس کے گھر سے، بس چپکے سے صندوقچے میں ہمارے رکھ دو۔

ظراف۔ جی بجا ہے۔ آپ کا صندوقچہ ایسا ہی تو بڑا ہے۔

بیوی۔ (ہنس کر) واہ اسے واہ الائچی رکھنے والا نہیں وہ بڑا صندوق جس میں ہمارا زیور رہتا ہے۔

ظراف۔ یہ اشرفیاں وہی لائے ہیں جنکو تم الفتے اور لُقّے[3] بناتی تھیں۔ اور ہم نے مدد دی۔

بیوی (ہاتھ جوڑ کر) میاں قصور معاف کر دو۔ ہماری خاطر سے کہا سُنا بھول جاؤ۔ انسان کی طبیعت ہمیشہ ایک سی تھوڑا ہی رہتی ہے، میں تو تمھاری لونڈی ہوں۔

آزاد۔ (باہر سے) ہم بھی سُن رہے ہیں بھابی صاحب، ابھی تو آپ نے ہمارے بھائی بیچارے کو ڈپٹ لیا تھا اور خدا جانے کیا کیا صلواتیں سنائیں۔ گھر سے باہر کر دیا۔ کھانا نہ دیا۔ کھڑے کھڑے نکال دیا۔ اور ہم کو جو بے نقط سنائیں دگھاتے ہیں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ اب جو زر دا زرد اشرفیاں دیکھیں تو پیاری بیوی بن گئیں خیر چلو بھائی تو بچ گئے اب نہ للکاریئے گا۔ اب ان کا بھی پوٹا تر ہے اور جو کہیں ہم برس چھ مہینے ٹک گئے تو سونے کی اینٹوں سے مکان بنوا لیجئیے گا۔ مگر ان کے ذری کان نہ گرمایا کیجئیے، یہ بیچارے بے باپ کے ہیں۔

بیوی (قہقہہ لگا کر) اب آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ کو کیا کہوں آپ تو ہنسی ہنسی میں دو چار فقرے چُست کر گئے مگر آپ کی ہنسی ہمارے سر آنکھوں پر۔

چہرہ پرداز ہیولائے رہ نوردی جرعہ نوش جام کوچ کردی۔ میاں آزاد سحر کاذب کے وقت خواب کیا دیکھتے ہیں کہ مہر جہان تاب نے جلباب[4] خفا سے رُخ انور نکالا ہے اور ظلمت شب دور چو طرفہ اُجالا ہے۔ ادھر میاں آزاد بن ٹھن کر تیار ہوئے اور ادھر میاں ظرّاف کمر کس کر دن سے آن موجود، دونوں چلے ؎

علی الصباح کہ مردم بکار و بار روند
بلا کشان محبت بکوئے یار روند

آپس میں میٹھی میٹھی باتیں ہوتی جاتی ہیں کہ ملّاح ملیح کیا میرزا اُمش بزرگ ہے، دیکھیں کیسی گذرتی ہے، خدا نے چاہا تو گھری چھنے

---

[1] بتہ۔ فریب۔ دھوکا [2] بھولی۔ بیوقوف۔ سادہ لوح [3] لچا۔ بدمعاش۔ آوارہ۔ [4] چادر۔ پردہ

آج پو بارہ ہیں۔

اب ادھر کا ذکر سنیئے کہ وہ دونوں بہنیں نام خدا سیانی تھیں اور مست بادہ جوانی تھیں لیکن ابتدا ہی سے انتہا کی حیا پرور اور پاک نظر اور اس پر طرّہ یہ ہُوا کہ تعلیم اعلیٰ درجہ کی پائی۔ کتب اخلاق و پند و موعظت کی خوب ہی سیر فرمائی لیکن اُن کی بوڑھی اماں پرانے فیشن کی رئیس زادی ضعیف الاعتقادی تو ان کا خاص حصّہ تھا، انھیں پرانی باتوں پر لٹّو تھیں۔ بلّی اگر گھر میں کسی روز آوے تو ستم ہو جاوے۔ اُلّو بولا اور ان کی روح فنا ہوئی۔ اب صبح تک تالیاں ہی بجا کریں گی۔ جوتے پر جوتا دیکھا اور آگ ہو گئیں۔ کسی نے سیٹی بجائی اور اُنھوں نے کوسنا شروع کیا۔ پاؤں پر پاؤں رکھ کر کوئی سویا اور آپ نے للکارا۔ ہجر یا غم و الم کا شعر کسی نے زبان سے نکالا اور انھوں نے فوراً روک دیا۔ کتّا گلی میں رویا اور ان کا دم نکل گیا۔ کُتّیا لے کان پھٹ پھٹائے اور انھوں نے تھو تھو کرنا شروع کیا۔ راستے میں کانا ملا اور انھوں نے فنس پھیر دی۔ تیلی کی شکل دیکھی اور دو پلی خون خشک ہو گیا۔ کسی نے لکیر بنائی اور اس کی شامت آئی۔ جو کہیں جاتی ہوں اور کوئی ٹوک دے تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔

ہندوؤں کی طرح ساون کے مہینے میں چارپائی بنوانے کی قسم کھائی تھی۔ دن رات بوڑھا چونڈا ہلانا اور باتیں بنانا مگر تھیں بڑی مالدار۔ الغرض اس بڑھاپے میں بھی آنکھوں سے خُون ٹپکتا تھا اور منہ سے انگارے برستے تھے۔ جب دیکھا کہ لڑکیاں سیانی ہو گئیں تو سوچیں کہ کنوارپنے کے دن کب تک کاٹیں گی۔ بڑی لڑکی کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اونچے اونچے گھرانوں سے پیغام آنے لگے اور کیوں نہ آتے ایک تو نوجوان دوسرے آن بان تیسرے مالدار۔ چوتھے شوخ و طرار۔ پانچویں فہمیدہ و سنجیدہ۔ چھٹے گلفام نازک اندام۔ ایک زمانے کا دل اُن پر آیا تھا۔ مکھڑا چاند بلکہ بن،[۱] ماچاند بھی ان کے مقابل ماند۔ قامت زیبا سرو آزاد بلکہ رشک شمشاد۔ زلفِ چلیپا بلائے بے درماں۔ غارت گرِ دین و ایماں۔ ابرو شمشیر برّاں یا تیغ اصفہاں۔

بڑی بیگم نے ایک رئیس باتوقیر کے صاحبزادۂ اکبر کے ساتھ اپنی بڑی صاحبزادی کا عقد کرنا چاہا اور ان کے پیغام کو قبول کر لیا۔ بڑی لڑکی حسن آرا بیچاری ششدر او رحیران و مضطرب کہ یا الٰہی اب میں کیا کروں۔ میاں جو ہونے والے ہیں۔ ان کی صورت کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی۔ ہمجولیاں مبارک سلامت کہتی ہیں یہاں پلپیوں خون خشک ہوا جاتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ خدا جانے بد قطع ہے بد وضع ہے۔ پڑھا لکھا ہے یا جاہل ناخواندہ۔ واللہ اعلم خیالات کیسے ہیں۔ یا الٰہی کیا کروں، کہاں جاؤں۔ رازِ دل کس کو سناؤں۔ بولوں تو اڑوس پڑوس کی عورتیں طعنے دیں کہ واہ لڑکی کیا بلائے بے درماں ہے یہ تو سوار کو کھڑے کھڑے گھوڑے پر سے اتار لے۔ اے ہے ایسی لڑکی نوج کسی کی ہو۔ یہ دیدہ دلیری! دل ہی دل میں بیچاری کڑھنے لگی۔ اپنی پیاری چھوٹی بہن سے درد دُکھ کہتی تھی اور کس سے کہتی۔ وہ بیچاری سن کر اداس ہو گئی وہ اٹھکھیلیاں سب بھول گئی۔

ایک دن بڑی بیگم جو صبح کو پلنگ سے اٹھیں تو پٹ سے چھینک پڑی۔ چھینک کا پڑنا تھا کہ ان کے پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی، کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ ضعیف الاعتقاد تو تھی ہیں سمجھیں کہ فال بد ہے۔ اب سنیئے کہ خواہ مخواہ یہ بھی سمجھ بیٹھیں کہ میری بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ اب کوّا بھی بولتا ہے تو ماتھا ٹھنکتا ہے کہ فال بد ہے۔ تیوری آنے لگے۔

بڑی بیگم کی تو یہ کیفیت تھی۔ اب حُسن آرا کا ذکر سنیئے کہ وہ اور اس کی چھوٹی پیاری بہن سپہر آرا شہ نشین میں فرش مکلّف پر

---

[۱] جگر۔

بصد شان دلبری بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہیں جس میں ایک شریر کا حال ہے کہ پرسوں شب کو ایک مہاجن کے یہاں کو دے اور کوٹھری کے قفل کو توڑ کر اندر گھسنے لگے۔ اتنے میں اُس مہاجن کی چار دہ سالہ لڑکی نے جو آہٹ پائی تو کلبلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور ڈرتے ڈرتے اپنی ماں کو جگایا۔ امّاں! امّاں!! امّاں!!! ذری جاگو تو بلّی نے تیل کا گھڑا گرا دیا۔ بھشت بھشت۔ بل بل اس کی ماں جو گڑبڑا کر اُٹھی تو حضرت کوٹھری کے باہر ایک چارپائی کے نیچے دبک رہے۔ اس نے اپنے لڑکے کو جگایا۔ وہ ڈنڈ پیل جوان خم ٹھونک کے ایک مرتبہ دھم سے چارپائی پر سے کودا۔ آخر کار مہاجن کے لڑکے نے ان کو اُٹھا کر دے مارا۔ اتنے میں اس کمبخت لڑکے نے کمر سے چھُری نکالی اور بھونک دی۔ بیچارے کی آنتیں نکل پڑیں۔ اس کی ماں نے سر پیٹنا اور چلّانا شروع کیا۔ پڑوسی اور خدمت گار، باری اور کہار، پاسی اور برقنداز فوراً دوڑ پڑے۔ اور صاحبزادے صاحب کو ہاتھوں ہاتھ گرفتار کر لیا۔ خاکسار ایڈیٹر کو یہ بات لکھتے ہی بے اختیار رونا آتا ہے کہ مہاجن کا لڑکا دو دن کے بعد جاں بحق تسلیم ہوا اور وہ رئیس زادہ جو چوری کرنے گیا تھا اب حوالات میں ہے اور ضرور پھانسی پائے گا۔ افسوس صد افسوس کہ اس رئیس زادے کی شادی ایک تربیت یافتہ اور حسین رئیس زادی کے ساتھ قرار پائی تھی جس کا نام حسن آرا ہے۔

یہ پڑھ کر حسن آرا آٹھ آٹھ آنسو رونے لگی۔ اس کی پیاری چھوٹی بہن گلے سے چمٹ گئی اور اس کی بہت کچھ تشفی کر کے اخبار اپنی بوڑھی ماں کے پاس لے گئی اور روتے روتے بصد حسرت و ارمان کہا کہ امّاں جان دیکھیے کیا غضب ہو گیا تھا۔ آپ نے بے دیکھے بھالے بے سمجھے بوجھے شادی منظور کر لی تھی۔ اس کے بعد اخبار کا کُل مضمون از سرتا پا پڑھ کر سنایا۔ ان کی ماں روتے روتے بولیں کہ بیٹیا آج تڑکے جب میں پلنگ سے اٹھی تو پٹ سے کسی نے چھینکا اور میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی، ہے ہے اُسی دم پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ میں تو سمجھی ہی تھی بابا کہ آج کچھ سنائی سنیں گے۔ چلو اللہ نے بڑی خیر کی۔ حُسن آرا کو میری طرف سے چھاتی سے لگاؤ اور کہہ دو کہ جو شریف زادہ تم کو پسند ہو اس کے ساتھ نکاح کر دوں گی۔ مگر پڑھا لکھا ہو عالی خاندان ہو دس آدمی اچھا کہیں۔ گو اس بات پر اکثر آدمی ہم کو ہنسیں گے مگر تم سوائے حُسن آرا کے اور کسی سے ذکر نہ کرنا۔

خاتون مہ لقا حسن آرا کی پیاری بہن سپہر آرا اپنی بوڑھی ماں کے پاس سے آئی تو باچھیں کھلی ہوئیں۔ ہنسی ضبط نہیں ہو سکتی۔ آنکھوں سے خوشی برستی ہے۔ کلیجہ گز بھر کا، گویا قارون کا خزانہ مل گیا۔ آتے ہی بڑی بہن سے چمٹ گئی اور کہا لو بہن مبارک پیاری بہن مبارک ہو۔ لو اب تو منہ مانگی مراد پائی۔ دلی تمنا بر آئی۔ اب اداس کیوں بیٹھی ہو، اچھی بہن ذری مسکرا دو میری خاطر سے (گلے سے چمٹ کر) میں صدقے نہ ہنسے تو ہم کو رونے آخرش اب رنج کا ہے کا۔ اللہ سونھ[1] وہ خوش خبری سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔

حُسن آرا۔ اے ہے تو کچھ کہو گی بھی۔ یہاں کیا جانے اس وقت کس غم میں بیٹھے ہیں۔ انھیں دل لگیاں سوجھتی ہیں۔ یہ خوشی کا کون موقع ہے بہن۔ تم نے تو اور کلیجہ ہیپ کر دیا۔

سپہر آرا۔ اے واہ یوں ہم بتا چکے بلا مٹھائی لیے نہ بتائیں گے۔ بات یہ ہے کہ میں نے امّاں جان کو جا کر سب مضمون سارے کا سارا اُنا دیا۔ وہ بھی اُداس ہو گئیں۔ یہ سن کر بولیں کہ اب میں نے حسن آرا کو اُن کے فعل کا مختار کر دیا۔ جس کے ساتھ جی چاہے شادی کر لیں اُن کی پسند پر ہے، میں اب دخل نہ دوں گی مگر شریف زادہ ہو اور عالی خاندان۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور

---

[1] قسم۔

کہا کہ اماں جان اپنے قول پر رہیئے گا۔ اُنھوں نے چھوٹتے ہی میری اور تمھاری دونوں کی قسم کھائی کہ اپنے اپنے نکاح کا تم دونوں کو اختیار ہے لیکن شریف زادہ ضرور ہو۔ خاندان کا نام ہی نہ ڈبونا۔ پسند تمھاری منظوری ہماری۔ جس کو تم پسند کرو بشرطیکہ ہم بھی منظور کرلیں اُسی کے ساتھ نکاح ہو۔ مگر باجی خبردار کسی سے ذکر نہ کرنا۔ کوئی مرد حسین تمھارے واسطے تجویز کریں گے۔

حُسن آرا۔ (مسکرا کر) یہ کیوں، حسن تو عورتوں کے لیے زیبا ہے مردوں کو اس سے کیا کام۔ ہاں سخن سنج ہو۔ سخنداں ہو۔ سخنور ہو۔ خاندان کا اچھا ہو۔ بدقطع، چیچک رُو، کالا کلوٹا نہ ہو۔ بس۔

سپہر آرا۔ بس وس میں نہیں جانتی۔ آپ اتنا یاد رکھیئے گا کہ جو دولھا بھائی کالے بھجنگا ہوئے تو ہم سے نہ بنے گی۔ اللہ نے حسن کو بڑا رتبہ بخشا ہے۔ آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ اور پھر تمھارا یہ چاند سا مکھڑا۔ کیا چاند میں گہن لگاؤ گی۔ لوگ نہ کہیں گے کہ بی بی کا یہ حسن گلوسوز (سالی کا یہ نور عالم افروز) اور میاں کالے بھجنگا ہفتے کا روز۔

حسن آرا۔ (ہنس کر) اے تو سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔ خاطر جمع رکھو مجھے اس کا خود خیال ہے مگر بات وہ کرنی چاہیئے کہ پاس پڑوس کی عورتیں ہمجولیاں طعنے نہ دیں۔

اتنے میں پیر بخش بڈھے نے آواز دی بٹیا کہاں ہو میں بھی آؤں؟

سپہر آرا۔ آؤ آؤ تمھاری ہی تو کسر تھی۔ یوں آؤ۔ آج سویرے سویرے کہاں تھے۔ شام کو ہم بجرے میں ضرور ہوا کھائیں گے مگر شرط یہ ہے کہ جو مطلع صاف رہا تو اور جو آج کچھ گھٹا چھائی تو بندی نہ جائے گی (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) حاشا میں نہ جانے کی۔ کل تو بجرا ایسا ڈانواں ڈول ہوتا تھا کہ میں سمجھی اب ڈوبی اور اب ڈوبی۔ یہی معلوم ہوتا تھا جیسے تنکا بہا چلا جاتا ہے۔ اُف کلیجہ دھک دھک کرتا تھا اور پانی بلّیوں اُچھلتا تھا۔

حسن آرا۔ اُس وقت تو میری جان پر بن آئی تھی۔ بارے بخیر گذشت۔

پیر بخش۔ تم سے کچھ کہنا ہے بٹیا۔ دیکھو تم ہماری پوتیوں سے بھی چھوٹی ہو تم دونوں کو میں نے گودیوں کھلایا ہے اور تمھاری اماں ہمارے سامنے بیاہ آئی تھیں۔ تمھارے ابّا کو خدا بخشے اُن تک کو تو میں نے پالا تھا۔ مگر رہے نام اللہ کا۔ میں تو تمھارے دادا کے یہاں داروغہ تھا۔ ملّاحی تو شوقیہ سیکھی کچھ میرا پیشہ تو ہے نہیں۔ جو میں کہوں اُسے کان دھر کے سُننا، تمھارے بھلے کو کہتا ہوں۔ سنو تم اب سیانی ہوئیں، اب تمھاری شادی کی ہمیں فکر ہے۔ پہلے تم سے مشورہ کرلوں پھر بیگم صاحب سے عرض کروں۔ آج کل یہاں ایک جوان نوخیز وارد ہوئے ہیں۔ صورت شہزادوں کی سی۔ سیرت فرشتوں کی سی۔ وضع بھلے مانسوں کی سی مگر بانکپن لیے ہوئے۔ حسن کا یہ عالم کہ انسان گھنٹوں گھورا کرے۔ بدن چھریرا مگر کسیلا۔ مسیں بھیگتی ہیں۔ ڈاڑھی مونچھ کا نام نہیں۔ ابھی اُٹھتی جوانی ہے اور طبیعت وہ نور کی پائی ہے کہ اہو ہو ہو۔ شعر گوئی میں برق۔ بول چال روزمرّہ اُن کا حصّہ ہے۔ علم و فضل میں یکتا۔ خوشنویسی میں دوسرے یاقوت رقم خاں۔ تصویر ایسی کھینچیں کہ نقل کو اصل کر دکھائیں۔ بانکے پٹے کشتی بنوٹ میں نظیر نہیں رکھتے۔ خدا ایسا کرتا کہ حسن آرا کے ساتھ ان کا نکاح ہوتا تو خوب بات تھی۔ تم دیکھ لو جو تم کو پسند ہو تو تمھاری ماں سے ذکر کروں نہیں تو بات کہہ کر بات گنوانے سے فائدہ! ہاں خوب یاد آیا یہ وہی جوان ہے جو بجرے کے ساتھ تم کو دیکھتا ہوا باغ میں جا رہا تھا۔ یاد آیا۔

حسن آرا۔ (آنکھیں نیچی کر کے) وہاں تو بہت سے آدمی تھے۔ کیا جانے کس کو کہتے ہو۔ چلو خیر۔ بے دیکھے کوئی کیا کہے۔

سپہر آرا۔ مطلب یہ کہ دکھا دو۔ بھلا دیکھیں تو ہیں کیسے ۔آپ نے تو تعریف کے پُل ہی باندھ دیئے۔

حسن آرا۔ ہم بتائیں ، جب ہم بجروں پر ہَوا کھانے چلیں تو وہ بھی کسی ترکیب سے وہاں ہوں ۔ بجرے پر تو ہم آنے نہ دیں گے مگر وہ کنارے پر کھڑے رہیں ۔ ہم اُن کو بخوبی دیکھ لیں گے تو اماں سے کہیں اور پھر ان کو مکان پر بلوائیں اور باتوں باتوں میں ان کا امتحان لیں۔ دیکھیں تو پڑھے کتنا ہیں جو اچھی تعلیم نہ پائی ہوگی تو ہماری نظروں سے گر جائیں گے ۔

حسن آرا یہ گفتگو کر ہی چکی تھیں کہ پیر مرد نے کہا تم ٹھہرو میں ابھی ابھی آتا ہوں اور خدا نے چاہا آج ہی سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا ۔ اب دیر اچھی نہیں ۔کسی تدبیر سے میں تم کو دکھا دیتا ہوں ۔ ان سے رخصت ہو کر پیر مرد باہر آ گئے اور انتظار میں کھڑے ٹہل رہے تھے کہ میاں آزاد اب آئیں اور اب آئیں ۔

اور ان کی کیفیت سنیئے کہ ظرّاف کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے چہاں چہاں چلے آتے ہیں ۔ چو طرفہ اودی گھٹائیں اور ٹھنڈی ہوائیں ۔ ہر سمت بہار اور لالہ زار۔

ظرّاف۔ اب گھبراہٹ کیا ہے ؟ میاں اب تو کوئے دلدار سامنے ہے ۔

آزاد۔ ایک ایک قدم اس وقت ایک ایک منزل ہے ۔چلنا دوبھر ہو گیا ۔بس یہی شوق ہے کہ پر لگا لینا اور اُڑ بھاگتا اور پھُدک کر اُس دیوان کیوان نشان پر ہو رہنا ۔

ظرّاف ۔ یار تمھاری وحشت سے ہم بہت ہی گھبراتے ہیں مگر واسطے خدا کے ۔ لیے وہاں وحشت کی نہ لینا ۔

غرض دلدادۂ جمال جانانہ میاں آزاد موزوں ترانہ اپنے شفیق رفیق میاں ظرّاف کے ساتھ اس دیوان سعادت تو امان کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ملاح ملیح یعنی وہی پیر مرد وجیہہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا سامنے سے آ رہا ہے ۔

آزاد۔ السلام علیکم !

پیر مرد۔ وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ۔

ظرّاف ۔ مزاج اقدس حضور کا ۔

آزاد۔ مزاج معلیٰ ؛

پیر مرد۔ آپ اپنے مزاج کی کیفیت فرمایئے ! میرا مزاج تو آج اوج پر ہے ۔

آزاد۔ کہیئے پھر کچھ کہیئے تو مژدہ سنانے میں اتنی دیر۔

پیر مرد۔ آیئے غریب خانہ تک قدم رنجہ فرمایئے ۔ وہ سامنے کلبۂ احزان ہے چل کر بآرام تمام تشریف رکھیے اور داستان سنیے فتح ہے فتح ۔

آزاد۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی + خانہ احسان آباد۔

پیر مرد۔ اے حضرت یوں تشریف رکھیے ۔ میاں ظرّاف صاحب میری خاطر سے آپ ہی یوں آیئے ۔ یار مجھ بوڑھے کا اتنا تو کہنا مانو خیر صاحب [illegible] کہ نشیند صدر ست + سنیئے بندہ آج صبح کو ان دونوں کے پاس گیا اور آپ کی اس درجہ تعریفیں کی کہ پُل باندھ دیئے ۔ اور پھر آپ جانیئے بندہ گو عالم نہیں فاضل نہیں ، لیکن آخر علما اور فضلا کی آنکھیں تو دیکھی ہیں اس لسانی اور لفاظی سے تقریر کی اب آپ کے جمال با کمال دیکھنے کو کئی بار کہہ چکیں ۔ لو حضرت معاملہ تو سب لیس ہے ذرا کسر نہیں ۔لیکن ایک بڑی پیچ ہے ۔ وہ آپ کا امتحان لیں گی ۔سوالات کے جوابات آپ کو دینے ہوں گے ۔

ہاں یہ بڑی سخت شرط ہے۔ دونوں کی دونوں یکالۂ آتش ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ پوچھ بیٹھیں اور آپ بغلیں جھانکنے لگیں۔ خدا کی قسم انھوں نے قسم کھائی ہے کہ جاہل مورکھ اَن پڑھ کے ساتھ نکاح نہ کریں گے، ہرگز نہ کریں گے۔ آپ سوچ سمجھ لیجیے۔

آزاد۔ واللہ منہ مانگی مراد پائی۔ جو تمنّا تھی دل کی بر آئی۔ ایک نہیں ہزار با امتحان لیں تو کیا پروا ہے۔

ظراف۔ بھائی امتحان کا نام بُرا۔ شاید رہ گئے تو پھر؛

آزاد۔ پھر آپ کا سر۔ رہ جانے کی ایک ہی کہی۔

پیر مرد۔ میں جا کر کہہ دوں کہ وہ آئے ہیں۔ بسم اللہ امتحان لیجیے، انھیں بسر و چشم منظور ہے۔

الغرض پیر مرد رخصت ہو کر اور اجازت لے کر محل میں گئے۔

حسن آرا۔ کہیے آپ کیا خبر لائے۔ کچھ خوش خوش آرہے ہو۔

پیر مرد۔ وہ آئے ہیں امتحان کا نام سنتے ہی باچھیں کھل گئیں۔ کہیئے تو بلا لاؤں بیٹی دیکھتے ہی جی خوش نہ ہو جائے تو سہی۔

سپہر آرا۔ نا محرم کا کھٹ سے گھر میں چلا آنا کیسا۔ پہلے اُن سے کہیے کہ چلیے باغ کی سیر کریں۔ روشوں میں ان کو ٹہلیے ہم جھروکوں سے دیکھیں تو سہی۔ یہ نہیں کہ ایرا غیرا پچکلیان جو آیا داخل۔ واہ۔

حسن آرا۔ ہاں کہتی تو سچ ہے ابھو بے موقع ہے۔

پیر مرد باہر گئے اور کہا کہ ابھی آرام میں ہیں آئیے تب تک ہم آپ مل کر گلگشتِ چمن کریں۔ دیکھیے تو باغ میں کیا فضا ہے! در روشوں میں سرخی پر قیامت کا جوبن ہے۔ بھئی چلو باغ میں ٹہلیں۔ ادھر میاں آزاد اور میاں ظراف اور پیر مرد باغ کی روشوں میں ٹہلنے لگے اور ادھر جھروکوں سے اُن دونوں زہرہ جبین نازنین رشکِ قمر پری پیکر خاتونوں نے دُزدیدہ نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ میاں آزاد مہر طلعت مہ لقا سبزہ آغاز شوخ و طناز حسین و مہ جبین او پچی بنے ہوئے باغ میں ٹہل رہے تھے۔ دیکھتے ہی پھڑک گئیں۔ بڑی بہن نے تو ضبط کیا مگر چھٹکی سے نہ رہا گیا۔

سپہر آرا۔ اہو ہو ہو۔ کیا رنگیلا چھیل چھبیلا جوان ہے۔ کیا نورانی صورت ہے بہن، یہ تو تمھارے ہی لائق ہیں۔ اللہ نے یہ جوڑی اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔ میری اچھی باجی جان، ہماری خاطر سے ان کے ساتھ بیاہ کر لو۔ میں صدقے گئی، مان لو۔

حسن آرا۔ اے واہ کیسی نادان ہو۔ بھلا شادی بیاہ بھی کہیں کسی کی خاطر سے ہوا کرتے ہیں۔ یہ دل کا سودا ہے۔ ہم بے سمجھے بوجھے دل سی پیاری چیز کسی کو نہ دیں گے (جھلا کر) اور پھر ایسی ہی تم گردیدہ ہو تو تم ہی سہی۔

سپہر آرا۔ (گردن جھکا کر) بڑی بہن ہو کیا کہوں۔

اُدھر وہ سب سبزہ و لالہ و گل و سنبل کے جوبن لوٹتے تھے اور وہ دونوں گلبدن سیم تن دزدیدہ نگاہ میاں آزاد پر ڈالتی تھیں کہ ایک دفعہ ہی دو سوار سبک خیز اور بلا کے تیز گھوڑوں پر سوار عجب بانکی ادا سے آن موجود ہوئے۔ انھوں نے میاں آزاد کو اور میاں آزاد نے ان کو تیکھی چتونوں سے دیکھا۔

آزاد۔ (پیر مرد سے) یہ تو اچھے رقیب پیدا ہو گئے بغلی گھونسا ان کو کسی ترکیب سے ٹال دیجیے۔

پیر مرد۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ان دونوں کے منہ سے تو انگارے برستے ہیں۔ فوجی آدمی ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ مگر ہیں رئیس زادے۔ ایک کام کیجیے آپ کا اور ان کا امتحان لیا جائے جو اوّل رہے اُسی کے نام فتح ہے۔ سچ کہیے گا کیا فیصلہ کیا ہے۔

آزاد۔ منظور۔

پیر مرد۔ اُترو بھیّا گھوڑوں کو سائیس کے سپرد کردو آؤ بیٹھو۔

اِلا اللہ کہہ کر دونوں دھم سے اُتر پڑے تو پیر مرد نے کہا سُنو۔ بھائی ان دونوں مہ وشان وجلال پر اگر آپ کا دل آیا ہے تو ہم ایک سہل سی تدبیر بتادیں۔ یہ بے سمجھے بوجھے بیاہ نہ کریں گی۔ اتنا سننا تھا کہ ایک کڑک کر بولا کیا کہا؟ دوسرے نے کہا داغ دے دھواں اُس پار رہو۔ پیر مرد کے ہوش پرّاں کہ بُرے پھنسے آہستہ سے کہا کہ وہ امتحان لینے کو کہتی ہیں۔ امتحان چہ معنی دارد۔ سٹھیا گیا ہے بڈھے کیا؟ ارے صاحب۔ ارے ترے کہاں کی نکالی نامعقول۔ اجی حضور وہ علم وفضل میں امتحان لیں گی کیا؟ علم وفضل ہم کیا کچھ مکتب خانے کے لونڈے ہیں۔ ہمارا علم ہماری تلوار (سڑاپ سے میان سے باہر نکال کر) یہ چمکتی دمکتی تلوار۔ دوسرے بولے یہ تلوار (تڑسے میان سے باہر تھی) اب پیر مرد ہکا بکا کہ بات کرتے ہی تلوار اُگل پڑے ہیں۔ خدا ہی خیر کرے بھئی۔ اچھے دجھلوں سے سابقہ پڑا ہے۔ بولیئے کہ آپ امتحان دینگے یا نہ دیں گے۔ ایک نے کہا دیں گے دوسرے نے کہا پہلے تیرا سر کاٹ لیں گے۔ تب تو پیر مرد بھی کسی قدر تیز ہوئے۔ بس میاں بس بہت بانکپن کی نہ لو۔ میرے پوتے کے برابر ہو اور مجھی کو للکارتے ہو اور تلوار دکھاتے ہو۔ بڈھوں کے منہ لگتے ہو (دانتوں کے تلے اُنگلی دبا کر) توبہ توبہ۔ بانکپن کے یہ معنی نہیں کہ بڈھوں پر تیز ہوبیاں منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ ہم تو اب حلوا کھانے کے کام کے ہیں۔ لڑنے بھڑنے کا زمانہ اب کہاں رہا۔ ایک جوان نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ معاف کیجیئے گا۔ دوسرے نے قدموں پر ٹوپی رکھی کہ قصور ہوا۔

خیر اب اصل حال اور کل داستان کا لب لباب سنیئے کہ حسن آراء، سپہر آرا سولہ سنگار کرکے ایک پُرتکلف کمرے میں جلوہ گر ہوئیں اور میاں آزاد کو وہاں بلوایا۔ یہ مژدۂ روح افزا سنتے ہی میاں آزاد کے رخسار تاباں پر فرط طرب سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے، قدم بڑھاتے ہوئے کمرے میں پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ کمرہ دُلہن کی طرح سجا ہوا ہے، مشک وعنبر کی چوطرفہ خوشبو آتی ہے، جو شے ہے بے بہا۔ جو چیز ہے دلربا۔ فرش مکلّف کرسیاں رنگین، دَر و دیوار غیرت آگین۔

سامنے جو نظر کرتے ہیں تو ایک زرنگار اور پُر بہار پردہ پڑا ہے اور وہ دونوں خواتین ملائک نظر فریب۔ مہ لقا اور جادو نگاہ ورنگیں ادا متمکن ہیں، مگر پردہ حائل۔

حسن آرا۔ مزاج شریف!

آزاد۔ ؎ حُسنِ تو ہمیشہ در فزوں باد
رویت ہمہ سال لالہ گوں باد

حسن آرا۔ یا الٰہی دیوان کے دیوان نوک زبان میں ہیں۔ میں مزاج شریف پوچھتی تھی۔

آزاد۔ ؎ خجالت آفتابِ ہر نظر باد
زخوبی روئے خویت خوبتر باد

سپہر۔ کوئی فی البدیہہ شعر سنائیے!

آزاد۔ ؎ کے شعر تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد
یک نقطہ دریں معنی گفتیم ذہیں باشد

حضرت اب تاب گفتگو نہیں، روح پر صدمہ ہے، واسطے خدا کے ہمارا اور رقیب روسیہ کا امتحان لیجئے!

الغرض پیرمردان دونوں جوانانِ طنّاز و سراپا انداز کو بھی لے آئے اور امتحان شروع ہوا۔

حسن آرا۔ اس مصرع کا دوسرا مصرع فرمائیے۔ مگر مطلع ہو۔ ع

شب چو آمد ماہِ ما بر بام ما

جوان۔ ؎ شب چو آمد ماہِ ما بر بام ما

پُر شدہ از جوہر دل جام ما

آزاد۔ الغلط شراب کو فصحائے نکتہ پرور اور شعرائے ذی ہنر نے جوہر روح باندھا ہے۔ جوہر دل نیا محاورہ ہے۔ لسان الغیب حافظ شیرازی کا شعر ہے ؎

بدہ ساقی آں جوہر روح را دوائے دل ریش مجروح را

دیکھو مصرع یوں لگاتے ہیں ؎

شب چو آمد ماہ ما بر بام ما خندہ زد بر صبح روشن شام ما

حسن آرا۔ بارک اللہ۔ ایک بڑھا اپنی نئی شادی کرنے کی ٹھانے مگر لڑکی چھوٹی ہو۔ ۱۲۹۶ ہجری میں بیاہ قرار پایا۔ مادۂ تاریخ تو اس وقت موزوں کیجئے۔

آزاد۔ پیرِ نابالغ۔ ۱۲۹۶ھ

حسن آرا۔ واہ۔ واہ وا۔ سبحان اللہ، کیا موزوں طبیعت پائی ہے۔ چشم بد دور، کیا ذہن کی رسائی ہے کیا برجستہ تاریخ فرمائی ہے۔ وہ دونوں جوان سخت شرمائے اور گو بڑے کرارے اور طاقت اور فنون سپہ گری میں طاق تھے مگر آزاد پر نظر ڈالی تو اُن کے حُسن اور کس بل اور قد و قامت اور رعنائی کے مقابل میں جھینپ کے چل دیئے۔

ادھر آزاد شیفتہ و دیوانہ شمع رخسار آتشیں پر پروانہ، ادھر پری خانہ اور جانِ جانانہ۔ ایک دفعہ ہی بادِ بہاری نے اس پردۂ زرنگاری کو جو اُٹھایا نور کا بکّا نظر آیا۔ حسن آرا بے حجاب۔ سپہر آرا برافگندہ نقاب۔ دونوں نکھری ہوئیں۔ زلفیں بکھری ہوئیں۔ پردہ کا گرنا اور نامحرم پر نظر کا پڑنا ہی تھا کہ وہ انا البرق کہتی طرارہ بھر کے بدن کو چھپاتی ہوئی وہ ہوئی وہ ہو رہیں۔ اس وقت اُن دونوں کا بنتیا بانہ بھرتی کے ساتھ اُچکنا اور بجلی کی طرح چمکنا میاں آزاد کی آنکھوں میں کھب گیا۔ سپہر آرا کی نور رگ رگ میں شوخی بھری تھی۔ وہ تو دم کے دم میں چمک دمک کر ایک ہی زقند میں نظر سے اوجھل ہو گئی۔ مگر حسن آرا کسی قدر مستعلیق تھیں عمداً ذرا لڑکھڑانے لگیں۔ اُس بُتِ طنّاز کو میاں آزاد خانہ برانداز نے نظر بھر کر دیکھ لیا۔

سپہر آرا۔ اس ہوا کو آگ لگے۔ اس پر بجلی پڑ جائے۔

آزاد۔ اب تو آپ ہوا سے بھی لڑنے لگیں، خدا ہی خبر کرے۔

حسن آرا۔ آپ تو کہئے ہی گا اُس کی ہوا خواہی کا دم آپ نہ بھریں گے تو کون بھرے گا۔ پردہ اٹھا دیا نہ؟

آزاد۔ ہوا نے در پردہ فہمائش کی کہ بھلے مانسوں سے بھلے مانسوں کو پردہ کیسا۔ ؎

کس کا حجاب کیسی حیا اور کہاں کی شرم

پردہ سے ہاتھ ہاتھ سے پردہ اُٹھائیے

حسن آرا۔ ماشاء اللہ ابھی شاید کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پڑی، بے نقاب تو دیکھ لیا اور اب کیا چاہتے ہو، بندہ پرور کچھ تو قناعت چاہیئے۔

آزاد ؎

قانع بہ تجلّی نشود شایق دیدار
پروانہ بہ مہتاب تسلّی نہ تواں کرد

حسن آرا۔ صاحب سنیئے یہ دل کا سودا ہے دل لگی نہیں۔

ملّاح۔ آج تو آپ جائیں کل تشریف لائیں۔ معاملہ سب ٹھیک ہے لیکن ذرا ان کی بوڑھی ماں کو بھی اطلاع دے دیں۔ کل ان کے سامنے ذرا خوب مولویانہ تقریر کیجیئے گا اور ایک بات اور دیکھیئے تیمور لنگ ہی سے اپنا شجرہ ملائیے گا۔

آزاد۔ واہ یہ بھرّے کسی اینلے کو دیجیئے۔ بندہ لنگڑے لولوں کا پوتا نہ بنے گا۔ مگر پدرم سلطان بود ضرور کہوں گا۔ اب بندہ رخصت ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی قسم عمر بھر شکایت رہے گی کہ منہ دکھاتے ہی نظر پھیر لی۔ رخصت!

سپہر آرا۔ امام ضامن کو سونپا۔

حسن آرا۔ فی امان اللہ!

بڑی بیگم

سپہر آرا مچل گئی کہ بہن تم دس دن کے اندر ہی اندر میاں آزاد کے ساتھ بیاہ کرلو۔ میں ایک نہ مانوں گی۔ مہنا منتھ مچاؤنگی، آسمان سر پر اُٹھاؤں گی۔ اب پیر مرد اور حسن آرا دونوں سمجھاتے ہیں کہ سُنو سُنو ٹھہرو ٹھہرو۔ کس کا سننا میں ایک نہ مانوں گی، میں روؤں گی جب تک بہن میری بات نہ مانیں گی۔ ہم کسی کی تو سننے کے نہیں۔ پیر مرد نے سمجھا کر بسہولت کہا۔ کہ تم اس وقت ہَوا کے گھوڑوں پر سوار ہو، تم سے بحثے کون۔ آخر اُس انشی برس والی بوڑھی دادی سے بھی پوچھو گی یا نہیں، ان کی بڑی بن بیٹھیں، الڑھ پنے کی باتیں کرتی ہو۔ چلو پہلے بڑی بیگم صاحب سے کہیں ان کی رائے لیں ان کو سمجھائیں، صلاح مشورہ ہو بیاہ نہ ہوا ہنسی ٹھٹھا ہوگیا۔

سپہر آرا اور پیر مرد بڑی بیگم کے پاس گئے اور آداب بجا لا کر پیر مرد نے کہا کہ حسن آرا آپ کے سلام کو حاضر ہوئی ہیں اور کچھ عرض کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے گردن ہلا کر کہا آؤ بابا آؤ۔ کہو۔ اب تو میں نے شادی تمھاری ہی رائے پر چھوڑی مگر شریف زادہ ہو۔ آج کیا جانے کیا خوش خبری سننے میں آئے گی کہ فجر سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ پیر مرد ایک جہاندیدہ خرانٹ، سوچا کہ بس یہی موقع ہے۔ بولا حضور اس سے بڑھ کر اور مژدہ کیا ہوگا کہ حسن آرا اپنے نکاح کا کچھ حال کہنے حاضر ہوئی ہیں۔ مگر شرماتی ہیں لجاتی ہیں کہہ نہیں سکتیں یہاں ایک شریف زادہ آج کل آیا ہوا ہے۔ بس بلا تشبیہہ یوسف ہے، انتہا کا حسین و مہ جبین اور علم کا یہ حال کہ عجیب نورانی طبیعت پائی ہے۔ شاعری میں اُن کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ نثر لکھنا اُن کا حصہ ہے اور شریف مسلمان نجیب الطرفین۔ تیمور کے گھرانے سے ہیں۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی۔ حساب کتاب سیاق سباق سب میں برق۔ اور تقریر سے تو جادو ہی ٹپکتا ہے اور ابھی نام خدا مسیں بھیگتی ہیں۔ بس اللہ نے یہ جوڑی سچ مچ اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔ کیا خوبصورت رئیس زادہ ہے کہ واہ۔

سپہر آرا بولی کہ میں نے تو آج تک ایسا خوب صورت آدمی دیکھا ہی نہیں اور لطف یہ کہ شریف ہنس مکھ اور پڑھے لکھے۔ اماں جان آپ بھی ایک دن دیکھ لیں۔

اتنے میں حسن آرا کو بڑی بیگم نے بلوایا۔ بیچاری لجائی جاتی تھی اور فرط حیا سے ہاں یا نہیں کچھ زبان پر نہ لا سکتی تھی۔ نیچی نظروں سے چپکے چپکے پیرزال کے چہرے کو دیکھتی جاتی تھی کہ بشاش ہیں یا ملول۔ اتنے میں بڑی بیگم نے حسن آرا کو چھاتی سے لگایا اور ہنس کر کہا۔ کہ لڑکی مجھ سے اُڑتی ہے سکھائی پڑھائی آئی ہے۔ اچھا کل ہم بھی انھیں دیکھ لیں تو پھر مشورہ کریں۔

دوسرے دن میاں آزاد یکہ و تنہا وہاں پہنچے۔ ظراف کی دُم میں بھی رسّا باندھا، پہلے تو پیر مرد کے یہاں گئے۔ ان سے کچھ دیر گلخپ رہی اور انھوں نے یہ مژدہ فرح بخش سنایا کہ بڑی بیگم نے بھی نکاح منظور کرلیا۔ مگر ایک دفعہ آپ کو دیکھیں گی ضرور، آج یا کل چلیئے ہمارے ساتھ۔ انشاءاللہ وہ بھی خوش ہوں تو سہی۔

میاں آزاد ملاح ملح کو کے کر حسن آرا کے پاس گئے مگر وہی پردے کی ملاقات۔

آزاد۔ بندہ حاضر ہے۔

حسن آرا۔ مزاج معلیٰ!
آزاد۔ الحمدللہ۔
سپہر آرا۔ بندہ پرور آج پردہ خوب مضبوط بندھا ہے۔ آج تو ہوا کیا معنی آندھی بھی آئے تو ذرا نہ ہٹے۔ مگر پڑنا کیا معنی۔
آزاد۔ ؎ نہیں روزن جو قصر یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوار آہن میں
حسن آرا۔ کل تو آپ کے فیضان صحبت سے ہم نے بہت سی باتیں سیکھیں۔ ہاں صاحب خوب یاد آیا۔ تقدم کی دو چار قسمیں بیان کیجئے۔
آزاد۔ تقدم بالزمان۔ تقدم بالشرف۔ تقدم بالعلت۔ تقدم بالمکان۔
حسن آرا۔ علم منطق کی تعریف کیجئے!
آزاد۔ آلتہٌ قانونیتہٌ تعصم مراعاتہا الذہن عن الخطاء فی الفکر۔
حسن آرا۔ جذب شعری کس قوت کا نام ہے؟
آزاد۔ تجاذیب انابیت شعری اس قوتِ کشش سے عبارت ہے جس کے ذریعہ سے پانی اور اسی قسم کی اشیاء رقیق چھوٹے چھوٹے سوراخوں کے وسیلے سے اپنی سطح سے کسی قدر اوپر چڑھ جاتی ہیں اور وہاں قائم رہتی ہیں۔ شعر بفتح عربی میں بال کو کہتے ہیں، وجہ تسمیہ یہ کہ جس قدر نے کا چھوٹا سوراخ ہوگا اُسی قدر اشیاء رقیق زیادہ بلند ہوں گی۔ اگر بال کے برابر باریک ہوں تو اشیاء بہت زیادہ اونچی ہو جائیں۔
حسن آرا۔ یہ اتنے پہاڑ اللہ میاں نے دُنیا میں کیوں پیدا کر دیئے آخر فائدہ؟
آزاد۔ جو بے شمار اور غیر محدود فوائد پہاڑوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ وہ خدا کے فضل و کرم پر دال ہیں۔
پہاڑوں کی چوٹیاں بادلوں کے پانی کو جذب کر لیتی ہیں جس سے انسان فائدہ کثیر اٹھاتے اور پودے نشو و نما پاتے ہیں۔ پہاڑ نہ ہوتے تو مینہ کا پانی زمین میں جذب ہو جاتا اور چو طرفہ دلدل ہی ہوتی۔ جو ابخرے کشش آفتاب سے صعود کر کے ہوائے جو میں منتشر ہوتے ہیں اُن کے سدّ راہ ہو کر ان کو ایک جگہ مجتمع کرتے ہیں۔ اور یہ بخارات اعتدال اور ہوائے محیط ارضی کے مطابق اولے یا برف یا بارش ہو کر زمین پر برستے ہیں جو رطوبات اس طرح حاصل ہوتی ہیں وہ پہاڑوں کی درزوں اور مسامات میں منجمد ہو کر زمین کے ابتدائی طبقوں میں جمع ہوتی ہیں اور انجام کار چشموں اور ندیوں اور نہروں وغیرہ کی مبداء ہو جاتی ہیں۔
حسن آرا۔ آپ کی ذکاوت اور طباعی پر صاد ہے، آپ بڑے ذی لیاقت آدمی ہیں۔
پیر مرد۔ (آزاد سے) حضور تشریف لائی ہیں۔ آداب بجا لایئے جھک کر۔ حُسن آرا کی اماں جان ہیں۔ یہی میاں آزاد ہیں حضور!
آزاد۔ (زمین دوز ہو کر) آداب بجا لاتا ہوں۔
بیگم۔ جیتے رہو بیٹا۔ آؤ ادھر آ کے بیٹھو۔ مزاج اچھے؟
آزاد۔ دُعا کرتا ہوں ایک عرصۂ دراز سے حضور کی قدمبوسی کا تہ دل سے اشتیاق تھا۔ بحمد اللہ کہ یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی۔
بیگم۔ سپہر آرا تمھاری بڑی تعریف کرتی تھی اور بیشک تم اسی لائق ہو کہ تعریف کی جائے چشم بد دُور۔ لئیق اور خوبصورت اور

ابھی بچے ہو اس وقت تم کو دیکھا بہت ہی طبیعت خوش ہوئی۔ اچھا پھر اب پرسوں ہم سے ملنا۔

آزاد۔ (اٹھ کر) آداب بجالاتا ہوں اور اس وقت رخصت ہوتا ہوں۔ پرسوں بشرطِ زیست ضرور حاضر ہونگا۔

بیگم۔ امام ضامن کو سونپا۔

میاں آزاد اور پیر مرد دونوں باہر گئے۔ پیر مرد نے کہا کہ لو میاں مبارک! فال نیک ہے۔ اب پرسوں آنا۔ کل نہ آنا۔ لے خدا حافظ!

اب آپ نے پالا جیتا ہو قسمت کے دھنی سے

بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جاوے ۔۔۔ یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

ادھر مہر عالم افروز بصد کرّ و فر نور افشاں ہوا۔ اُدھر سرتاج عشاق زار جواب مصرعۂ زلف مہوشاں فرخار یعنی میاں آزاد کوئے یار کی طرف سر کے بل رواں ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ برہمن چندن لگائے، دھوتی بغل میں دبائے دریا سے نہا کر آرہے ہیں اور پجاری شیوالوں میں سنکھ بجا رہے ہیں۔ مُلا سرگرم گفتگو۔ زاہد بہ تہیۂ وضو نوبتی نوبت بجا رہے ہیں۔ بادہ گسار جھومتے ہوئے مےخانے جاتے ہیں۔ برقنداز جا بجا ڈٹے کھڑے ہیں۔ بدمست خواب خرگوش میں پڑے ہیں۔ حلوائی بھٹی پر سوتا ہے۔ کتا بزوں کی قسمت کو رو رہا ہے۔ افیونی عیش۔ چانڈو باز طیش۔ نئی روشنی والے ہوا کھاتے ہیں۔ مسافر لدے پھندے جاتے ہیں۔ کوئی بھجن گاتا ہے۔ یہ مرحلہ طے کر کے میاں آزاد کف دست سنسان بیابان میں آئے تو پھولوں کا مہکنا اور کلیوں کا چٹکنا ستم بپا کر رہا ہے۔ شاہد بہار کے خوب جوبن لوٹے اور چلتے چلتے دن سے داخل منزلِ مقصود۔ پیر مرد سے چار آنکھیں ہوئیں تو دونوں مسکرا کر باتیں کرنے لگے۔

آزاد۔ کورنش عرض ہے قبلہ!

پیر مرد۔ زندہ باش! آج بڑا کڑا امتحان ہے بڑی بیگم صاحب امتحان لیں گی۔ اگر پورے اُترے تو ہاتھوں ہاتھ انعام دیں گی۔

آزاد۔ (بڑی بیگم سے) آداب بجالاتا ہوں۔

بیگم۔ جیتے رہو بیٹا! اے فرخندہ ذرا پنکھا جھلو آپ کے، آپ کا سن شریف کیا ہوگا؟

آزاد۔ یہی کوئی انیس برس کا۔

بیگم۔ کیوں بیٹا ہاتھی کو خواب میں دیکھے تو کیسا۔ اس کی تعبیر کیا ہو گی؟

آزاد۔ بُرا۔ ہاتھی کی تعبیر بلا ئے جان۔ مگر ہاں ایک بات ہے کہ اگر ہاتھی کسی پر اپنی سونڈ پھیر رہا ہو تو سمجھنا چاہیئے آئی ہوئی بلا ٹل گئی۔

پیر زال۔ شاباش! تم بڑے لئیق آدمی ہو چشم بد دور۔ تھوڑا سا کالا دانا ان پر سے جلا دو۔

الغرض بیگم نے میاں آزاد کو دن بھر بٹھایا اور ساتھ ہی کھانا کھلایا۔ جا نچا پرتالا۔ میاں آزاد گربہ مسکین بنے ہوئے ہاں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں اور دل ہی دل میں کھلکھلاتے جاتے ہیں۔ جب دن قریب اختتام ہوا، اور وقت شام ہوا تو پیر زال خجستہ خصال نے کہا۔ کہ بھائی اب دو گھڑی حسن آرا اور سپہر آرا کے پاس بھی جاؤ۔ دو گھڑی وہاں بھی خوش گپیاں اڑاؤ۔ پیر مرد کو کنکھیوں سے اشارہ کیا کہ سایہ کی طرح قدم قدم پر ساتھ رہو۔ میاں آزاد اور پیر مرد اُٹھے اور بڑی بیگم سے رخصت ہو کر حسن آرا کے کمرے میں گئے۔ آزاد نے پیر مرد سے کہا کہ حضرت ہمیں حیرت ہے کہ با اینہمہ ضعیف الاعتقادی اس قدر بے تکلفی کیسی اور پُرانے فیشن کے خاندان میں بے تکلفی کب جائز رکھی جائے گی۔ پیر مرد نے کہا یہ سچ ہے مگر مجھے

نصیحت ہو رہی ہے کہ خبردار ساتھ نہ چھوڑنا۔

آزاد۔ بندہ حاضر ہے۔

سپہر آرا۔ بسم اللہ آیئے۔ بسر و چشم۔ کہیئے اماں جان سے کیا بات ہوئی؟

آزاد۔ آپ کی اماں تو بالکل سفید آدمی ہیں مگر بلا کی ضعیف الاعتقاد آج تمام دن بھوت پریت چڑیل بن مانس چھلاوے جادو ٹونے ہی کی باتیں کرتی رہیں۔ میں بھی ہاں میں ہاں ملاتا گیا۔ آخر اور کیا کرتا مصلحت وقت کا تقاضا ہی یہ تھا۔

حسن آرا۔ اے تو بوڑھی عورت اور پڑھی لکھی نہیں۔ پھر ان باتوں کو کیسے نہ مانیں۔

آزاد۔ اب تو اس گھونگھٹ کے طلسم کو توڑیئے۔ مانا کہ آپ مہ پارہ ہیں مگر ہم بھی طالب نظارہ ہیں۔ اتنا بھی بخل کیا۔ روز مصاحبت فرماتے ہیں مگر صورت دیکھنے کو ترس ترس جاتے ہیں۔

سپہر آرا۔ چلیے آج ساتھ ساتھ سیر دریا کریں۔

شب کو گھڑی بھر رات گئے حسن آرا اور سپہر آرا اس شان سے نکلیں کہ بس معلوم ہوتا تھا کہ پرستان سے پریاں اُتر آئی ہیں مگر دونوں کے چہرے پر نقاب ہر امر میں حیا و حجاب۔ اِدھر بجرا دریا میں رواں ہوا اُدھر میاں آزاد کو گلستاں کا باب پنجم وردِ زباں ہوا۔ موربلوں کی جھنکار پپیہوں کا پکار۔ ٹھوڑی ٹھوڑی پھوہار۔ حسن آرا کی ہنس[illegible] پیشانی۔ سپہر آرا کا جوش جوانی۔

آزاد۔ ؎ منم موسٰی نقاب از چہرہ بردار　　نم آید خوشم ایں لن ترانی!

الٰہی یہ عارض تاباں پر نقاب ہے یا مہر عالم افروز تہ سحاب ہے!

سپہر آرا۔ ؎ حیا کنم نہ چرا از رخ نقاب ہنوز　　مرا حجاب ندیدست بے حجاب ہنوز

حسن آرا۔ حضرت وہ لگاوٹ باز انکھڑیاں کہیں اور ڈھونڈھیے۔ یہاں چشم حیا پردہ ادب آموز نگاہ ہے۔ حیا بھی سامنے آئے تو آنکھیں بند کر کے بوئے گل تک گریباں کو چاک نہ دیکھے۔

اتنے میں وسط دریا میں ایک رنگین وعشرت آئین وخوشنما اور باتزئین کوٹھی نظر آئی اور سپہر آرا اس کو مشاہدہ کر کے خوب ہی کھلکھلائی

حسن آرا بول اُٹھی کہ لو وہ کوٹھی آئی وہ کوٹھی آئی۔ پیر مرد نے کہا چلو اب بن آئی۔

سپہر آرا۔ کوٹھی ہے یا روضۂ رضوان یہ مکان ہے یا چوتھا آسمان یہ دریا ہے یا سلسبیل یہ باغ ہے یا گلزار خلیل، سبزہ چوطرف لہلہایا گلستان عالم پر ابرِ مسرت چھایا۔ کہیں کوئل کی کوک کہیں موروں کی ہوک۔ ادھر اُدھر دریا رواں بیچ میں ایوان سپہر تو اماں چلیے یہاں لطف صحبت اٹھائیں سب سے الگ تھلگ بستر جمائیں۔

آزاد۔ واہ کیا پری خانہ ہے کہ پرستان بھی اس کے آگے مات ہے یہ رات ہے یا شب برات ہے اور کیوں نہ ہو سعد اکبر کی کرامات ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ سب طلسمات ہے۔ ساری کلفت دُور ہو گئی دل کی بیتابی کافور ہو گئی۔

میاں آزاد اور پیر فرخ [illegible] اور دو [illegible] ں پیاری بہنیں لطف بہار اٹھاتی سیر کرتی چلی جاتی تھیں۔ بجرے بہاؤ پر فراٹے سے رواں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کالی کالی گھٹائیں۔ سپہر کی پیاری پیاری باتیں حسن آرا کی رمز و کنایہ کی گھاتیں۔ بوندوں کا گرنا اور آب جوئبار کا جنبش کرنا عجب بہار دکھاتا تھا دریا کا پانی لہریں مارتا ہوا جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہی ہوا نے وہ زور باندھا کہ مینڈھا اچھلنے لگا اب بجرے کی یہ کیفیت ہے کہ ڈانواں ڈول تہ و بالا ہو رہا ہے یہ گرا وہ گرا۔ یہ ڈوبا وہ ڈوبا۔ یہ لہر آئی وہ ہو رہا۔ وہ تھپیڑا کھایا یہ آیا۔ پیر مرد بیچارہ گو جہاندیدہ اور خرانٹ تھا لیکن اُس کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سیر دریا کی کہانیاں سب

بھول گئے۔ چہرے پر عرق ہاتھ کانپ رہے ہیں بدن بھر میں رعشہ۔ حسن آرا کا چہرہ زرد۔ سپہر آرا کا دل سرد۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ سپہر آرا کی آنکھوں سے جوئے اشک جاری۔ حسن آرا مصروف گریہ وزاری۔ میاں آزاد خستہ و خراب با دل اضطراب حیران و پریشان کہ یا الٰہی کیا بُرے پھنسے۔ کنارِ دریا کو جو دیکھتے ہیں تو کالے کوسوں ہیچوں بیچ میں بجرا جا رہا ہے۔ ایک مرتبہ بجلی اس زور سے تڑپی کہ حسن آرا ڈر کر میاں آزاد سے چمٹ گئیں۔ میاں آزاد اس وقت بے اختیار رو دیئے کہ معشوق گلے بھی ملا تو اس نازک حالت میں۔ یہ پہلا ہی مرتبہ تھا کہ میاں آزاد کو کسی نے روتا دیکھا ہو۔

اتنے میں ایک دفعہ پھر بجلی کوندی اور اس زور سے گرجا کہ سپہر آرا ڈر کر دوڑی اور افسوس صد افسوس کہ مارے گھبراہٹ کے ندی میں گر پڑی۔ ڈوبتے ہی پہلے غوطہ کھایا اور لگی ہاتھ پاؤں چھٹ پھٹانے۔ اور بھی نیچے ہو رہی۔ اتنے میں اُبھری اور پھر غوطہ کھایا حسن آرا سکتے کے عالم میں۔ میاں آزاد نے جو یہ کیفیت دیکھی تو جھٹ پٹ کپڑے اتار دھم سے کود ہی تو پڑے۔ اب حسن آرا بیچاری سمجھی کہ سپہر آرا اور میاں آزاد دونوں کے دونوں ڈوبے۔ لگی دھتڑ پیٹنے۔

میاں آزاد نے غوطہ کھایا تو سپہر آرا کی زلف پریشان ہاتھ آئی۔ انھوں نے جھپ سے زلف کو پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ ابھری۔ یہ وہی سپہر آرا ہے جو پردۂ زنگار میں رہ کے اٹھتے ہی جیب ادب سے لٹ ساہے بھاگی تھی۔ یہ وہی حسن آرا تھی۔ انجام کے مقابل دیکھ کر بدن کو چھپاتی تھی اور تھرتی سے بھاگی جاتی تھی۔ کل یہ پردہ تھا۔ آج کالیش الغرض میاں آزاد سپہر آرا کو ساتھ لیے غوطے پر غوطہ لگاتے ہوئے چلے کہ بجرے کی طرف لے چلیں۔ لیکن بجرا ہے کہ ہوا سے باتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک دفعہ میاں آزاد نے باآواز بلند پکارا پیر مرد۔ پیر مرد۔ ملاح ملاح بجرا روکو خدا کے واسطے خدا کے واسطے پیر مرد کے اس وقت ہوش و حواس اُڑے ہوئے تھے اور حسن آرا غش میں پڑی تھیں۔ بجرا خدا کی راہ پر جدھر چاہتا تھا جاتا تھا۔ ہوا ملاح اور خدا ناخدا۔ میاں آزاد کو پیراکی بہت اچھے تھے لیکن برسوں سے مشق چھوٹی ہوئی تھی۔ دم پھولنے لگا۔ اتفاق سے ایک بھنور میں پڑ گئے اس کے بیچ سے ایسا چکر کھایا کہ بے ہوش ہو گئے۔ لاکھ طاقت کی مگر ایک نہ چل سکی اور ستم پر ستم یہ ہوا کہ سپہر آرا چھٹ گئی اور چھٹتے ہی تہ پر تھی۔ میاں آزاد کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور یہ دوسرا مرتبہ تھا کہ میاں آزاد عمر بھر میں کبھی روئے۔ اب کی بار بڑی پھرتی سے جھپٹے اور فوراً تہ کو اُبھارا اور پھر لاد کر چلے مگر بجرے کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ وہاں حسن آرا سکتے پر غش میں پڑی ہوئی تھی اور ملّاح نے بجرے کو راہِ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔ انھوں نے پھر پکارا کہ ملّاح او ملّاح بجرے کو روک لو۔ دل میں سوچے کہ معلوم ہوتا ہے بجرا غرقاب ہو گیا اور حسن آرا اور ملّاح دونوں کے دونوں لقمۂ نہنگِ اجل ہوئے۔ اب میں سپہر آرا کو لادے لادے کہاں تک جاؤں اور کیا کروں۔ لیکن آزاد نے دل میں ٹھان لی کہ چاہے بچوں چاہے ڈوبوں جب تک جان میں جان ہے سپہر آرا کو نہ چھوڑوں گا، نہ چھوڑوں گا۔

اتنے میں پھر پکارا کہ یارو کوئی مدد کو آؤ۔

ملّاح نے ڈنڈ وار کو پھینک کر سر پیٹنا شروع کیا۔ ہائے ستم وائے ستم۔ واحسرتا۔ آزاد۔ آزاد۔ ہائے چل بسے تم بھی چل بسے۔ سپہر آرا بیچاری کا ساتھ دیا۔ یار و داغ جدائی دے گئے آزاد۔ ارے میرے آزاد۔ سپہر آرا پیاری سپہر آرا ہائے ہائے تجھے کس ناز و نعم سے پالا تھا۔ تیرے دم سے گھر کا اجالا تھا۔ پیارے آزاد۔ جوانمرد آزاد۔ اُف۔ اُف۔ اُف یہ آواز میاں آزاد کے کان میں بھی پڑی۔ لیکن بُعد کے سبب سے کچھ نہ سمجھ سکے کہ کون ہے۔ سمجھے کہ وہی پیر مقدس جو ٹیلے پر سے کودا تھا غل مچا رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں اُن کو بجرا نظر آیا تو باچھیں کھل گئیں۔ اب یہ بالکل خستہ اور شل ہو چکے تھے لیکن نہایت ہی استقلال اور جوانمردی سے انھوں نے کھڑی لگانی شروع کی۔ ملاح نے دُور سے دیکھا کہ کوئی شخص آ رہا ہے۔ آزاد کو تو یہ سمجھ گئے کہ ڈوب ہی چکے تھے اور سپہر آرا کے دیکھنے کی اُن کو ذری بھی امید نہ تھی۔ اب ان کو حیرت تھی کہ یا الٰہی یہ ہماری طرح اور کس بیچارے پر مصیبت پڑی کہ اس وقت پیرتا چلا آتا ہے۔

آزاد نے پکار کر جیتے بچے۔ شکر ہے اُف ری تباہی اللہ نے عزت بچائی۔ کہو حسن آرا کہاں ہیں۔ پیرمرد نے بغور دیکھا۔ ایں! یہ حُسن آرا کا نام کس نے لیا۔ پوچھا کہ آپ کون ہیں آیئے بجرا حاضر ہے ایک سے دو بھلے۔ ہائے واویلا۔ آزاد نے کہا آپ اس وقت مستقل مزاج ہیں، میں آزاد ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ پیرمرد کی باچھیں کھل گئیں۔ سوچے کہ یا الٰہی یہ خواب دیکھ رہا ہوں یا سچ مچ آزاد ہی ہے۔

جب میاں آزاد فرخ نہاد بجرے کے قریب آئے تو پیرمرد یعنی ملاح ملیح نے پہچانا اور فرط طرب سے تالیاں بجانے لگے۔ آزاد نے سپہر آرا کو بجرے میں لٹا دیا اور پیرمرد سے کہا آیئے آپ اور ہم ان کو کسی طرح سے ٹانگیں اور ان کے منہ سے پانی نکالیں۔ یہ اتنی دیر میں کیا جانیں کس قدر پانی پی گئی ہیں پیرمرد اور میاں آزاد نے سپہر آرا کو خوب مضبوط پکڑا اور ٹانگا تو بہت سا پانی منہ سے نکلا۔ اس کے بعد بجرے میں لٹا دیا اور بیگ کھول کر کسی دوا کا ایک جام اس کو فوراً پلا دیا۔ اب حسن آرا کی فکر ہوئی۔ وہ بیچاری غش میں پڑی تھی آزاد نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے تو ذرا ہوش آیا مگر آنکھیں بند۔ ہوش آتے ہی پوچھا کہ پیاری سپہر آرا کہاں ہے آزاد جیتے بچے۔ پیرمرد نے پکار کر کہا۔ کہ آزاد تمہارے سرہانے بیٹھے ہیں اور تمہارا سر انھیں کے زانو پر ہے۔ اور سپہر آرا صحیح و سلامت تمہارے پاس لیٹی ہیں۔ اتنا سُننا تھا کہ حُسن آرا نے میاں آزاد کے زانو پر بوسہ دیا اور یہ پہلا ہی مرتبہ تھا کہ حسن آرا نے اپنے سچے عشق کا حال کسی طرح منہ یا زبان یا لب سے ظاہر کیا ہو۔ جب حسن آرا نے آنکھ کھولی اور آزاد کو دیکھا تو کہا۔

حسن آرا۔ آزاد میری روح اگر تم پر سے فدا ہو جائے تو اس وقت مجھے اس سے زیادہ خوشی ہو جس قدر سپہر آرا کے بچ جانے سے ہوئی۔ سنو آزاد میں صدق دل سے کہتی ہوں کہ مجھے تم سے سچا عشق ہے۔ یہ کہ کر حسن آرا نے آزاد کا ہاتھ چوم لیا اور یہ پہلا ہی مرتبہ تھا کہ میاں آزاد کے ہاتھ پر کسی مہوش کے بوسہ کا نشان پڑا ہو۔

اتنے میں دوا کا اثر جو پہنچا تو سپہر آرا بھی آہستہ سے اٹھ بیٹھی۔ اور اُٹھتے ہی حُسن آرا کو جھپٹ کر فرط شادی و مسرت سے رونے لگی۔ حسن آرا بھی خوب دل کھول کر گلے ملی اور اشارہ کیا کہ میاں آزاد نے جان بچائی۔ سپہر آرا نے میاں آزاد کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اور رو رو کر کہا کہ میاں آزاد میں تم پر سے صدقے میں تم پر سے واری ہو جاؤں۔ تم نے آج وہ کیا جو ساری خدائی میں ایک اجنبی کے ساتھ نہ کرتا۔

پیرمرد نے سپہر آرا کی پیشانی پر بوسہ دیا اور میاں آزاد کو صد ہا دعائیں دیں۔ اس مصیبت ناک کارروائی میں عرصہ گذرا اور وہ ایوان کیوان نشان جو دریا کے بیچوں بیچ واقع تھا نظر سے اوجھل ہو گیا۔ ہوا اب بندھ گئی تھی اور دریا میں منڈھا بھی نہیں اچھلتا تھا۔ بجرا آہستہ آہستہ کنارے پر آلگا اور سب کے سب اُس پر سے اُتر پڑے۔

آزاد۔ (گھاس پر بیٹ کر) اُف مر مٹے۔ ارے توبہ! کیا ناشکری کا کلمہ منہ سے نکل گیا (گال پر تھپیڑ لگا کر) یوں کہنا چاہیئے کہ جی اُٹھے۔

حسن آرا۔ بے شک بے شبہ۔ سپہر آرا کی جان بچائی۔ میری جان بچائی۔ اماں جان کی جان بچائی۔ اس بیچارے بوڑھے کی جان بچائی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا تم تو ہمارے لیے مسیحا ہو گئے۔ خدا اس کا تمہیں اجر دے۔

آزاد۔ (ہنس کر) شکر ہے۔

اس گفتگو کے بعد پیرمرد نے کہا کہ اس فرح بخش ایوان عالی شان میں کیونکر جا بیٹھے گا۔ بجرے پر تو اس وقت سوا ہونا

حماقت ہے۔ میاں آزاد نے قہقہہ لگایا اور فرمایا کہ واہ ایسا بھی کیا خوف ہے۔ اب کیا ہر دم طوفان ہی آیا کرتا ہے۔ کچھ حسن آرا اور سپہر آرا نے کہا قسم ہے خدائے پاک کی کہ اس وقت تو ہم بجرے پر نہ چڑھیں گے چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔

آزاد۔ جو اس وقت جھجک گئیں تو عمر بھر خوف ہی دامنگیر رہے گا۔

حسن آرا۔ آپ کی بلا سے۔

سپہر آرا۔ چلیئے رہنے دیجئے۔ اب تو مارے تھکاوٹ کے آپ کے بدن میں اتنی سکت بھی نہ رہی ہوگی کہ کسی کی لاش کو دو قدم بھی لے چلیے۔ نا صاحب بندی نہ جانے کی۔ بے ہے بجرے کی صورت دیکھنے سے بدن کانپتا ہے تم بڑے دلیر ہو، ہم تمھیں بھی نہ جانے دینگے۔

آزاد۔ واہ!

سپہر آرا۔ دیکھ لیجیے گا۔ آپ اُدھر بجرے پر بیٹھے اور ادھر ہم دریا میں پھاند پڑے۔

آزاد۔ اچھا پھر بجرا پیر مرد لائیں۔ آپ اور ہم کنارے کنارے خشکی خشکی آئیں۔

ملاح۔ جی میں ہی تو فالتو ہوں اچھا تجویزا۔

القصّہ پیر مرد تو بجرے پر گئے اور یہ تینوں خشکی کے راستے چلے۔

پیر مرد وجیہ تو ادھر چشمہ سار میں بجرا چلا رہے تھے ادھر میاں آزاد دونوں شاہدانِ طنّاز اور سراپا ناز کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ دریا کی روانی دیکھ کر سپہر آرا کانپ کانپ اُٹھتی تھیں۔ اور حسن آرا صرف آزاد کے چھیڑنے کو نقاب سے منہ ڈھانپ رہی تھیں۔

آزاد۔ بس یہی تو قہر ہے۔ اب ہم سے پردہ کیسا؟

حسن آرا۔ ہم نامحرم سے بات کرنا وضع کے خلاف سمجھتے ہیں۔

آزاد۔ ہاں ذرا ادھر چار آنکھیں تو کیجیئے۔ پھر تو فرمائیے نامحرم۔ ہم نامحرم ہیں کیوں سپہر آرا بیگم۔ ان کی باتیں سنو ہمیں نامحرم بتاتی ہیں۔

سپہر آرا۔ آپ اور نامحرم: اس وقت تو دریا کو دیکھ کر میں سہمی جاتی ہوں۔ اُف۔ رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اللہ بچائے۔

حسن آرا۔ (گھاس پر بیٹھ کر) اُف بھئی ہم سے تو اب ایک قدم نہ چلا جائیگا۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ آپ جائیں ہم نہ جائیں گے۔

آزاد۔ چلیئے اب تھوڑی دُور تو ہے ہماری خاطر سے چلی چلو۔

حسن آرا۔ اللہ جانتا ہے جو اُٹھا بھی جاتا ہو۔ آپ کچھ فکر کیجیے۔ ہم سے تو ہلا تک نہیں جاتا۔ آخر چلنے کا کچھ ٹھکانا بھی ہو۔

آزاد۔ آپ بجرے پر سوار ہوں میں ساتھ ہوں۔

سپہر آرا (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) معاذ اللہ۔ خدا کی قسم ہم نہ جانے کے۔ بجرے پر سوار ہوتے تو روح فنا ہوتی ہے۔ بجرا دھرا رہنے دیجئے۔

حسن آرا۔ نہیں بہن بجرے پر میں خود ہی نہ سوار ہوں گی۔

یہ گفتگو ہوتی ہی تھی کہ میاں آزاد نے پیر مرد کو کنارے کی طرف پکارا اور کہا کہ بجرا روک کر اُتر آؤ۔ جب پیر مرد نے بجرے

کو چھوڑا اور کنارے پر آیا تو آزاد نے کہا کہ گھر جا کر گھوڑے یا فنس لے آؤ حسن آرا تھک گئی ہیں۔ مگر واسطے خدا کے سپہر آرا کے ڈوبنے اور ملّاح بننے کا حال وہاں کچھ نہ کہنا۔

حسن آرا۔ تم اتنا کہہ دینا کہ کل تک ہم سب آئیں گے اور سب خیریت سے ہیں۔

الغرض بیر مرد تو سواری لینے گئے اور میاں آزاد اور سپہر آرا اور حسن آرا بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ شطرنج کا ذکر حسن آرا نے چھیڑ دیا اور کہا کہ آپ تو علم صحبت کے بادشاہ ہیں، کبھی کبھی شطرنج کا بھی شوق رہا ہے؟ ایک نقشہ حل کیجیے تو جانیں۔ خدا کی قسم چھکے چھوٹ جائیں زچ ہو جائیے تو سہی۔ بڑا پیچیدہ نقشہ ہے۔ اور چار چال کا کچھ کچھ بدل لیجیے تو کیا مضائقہ ہے۔

آزاد۔ بسم اللہ کچھ فرمائیے۔ اسی بالو پر نقشہ بنا دیجیے ابھی حل کرتا ہوں۔

حسن آرا۔ دیکھیے یہ نقشہ ہے:۔

سبز بازی

		وزیر سُرخ					
				پیادہ سبز		فیل سُرخ	
			شاہ سبز				
						پیادہ سُرخ	
						شاہ سُرخ	

سُرخ بازی چار چال میں مات کرے

آزاد۔ چار چال میں مات ہے۔ اچھا پہلے کون چلے: سبز یا سُرخ؟
حسن آرا۔ واہ واہ تو آپ نقشہ حل کر چکے جو مات کرتا ہے وُہی پہلے چلتا ہے، نقشے کا یہ قاعدہ ہے۔ بس آپ حل کر چکے
قابلیت حضور معلوم کردم۔
آزاد۔ اچھا چلیے کشت۔
حسن آرا (قہقہہ لگا کر) واہ کشت کی اچھی کہی، نقشے میں پہلے ہاتھ کشت تو دی نہیں جاتی۔
آزاد۔ تو ہم حل کر چکے مگر ذرا غور کرنے دیجیے۔ چار چال کی شرط بُری بلا ہے اچھا سوچیں تو۔ وہ حل کر لیا۔ نہ کہو گی۔ اوّل
چال شاہ سُرخ بخانہ دوم فیل کھیلے۔ دوم پیادہ سُرخ ایک گھر چلے۔ سوم فیل سُرخ بخانہ چار وزیر کھیلے۔ چہارم وزیر
کی شہ مات ہو گی۔
حسن آرا۔ اس کی تشریح کیجیے!
آزاد۔ اوّل چال شُرخ بخانۂ دوم فیل کی ہر طرح رہے گی۔ اب اگر حریف شاہ سبز کو بخانۂ چہارم بادشاہ سُرخ کھیلے تو
مات کرنے والا پیادہ سُرخ چلے۔ اگر شاہ سبز بخانۂ وزیر یعنی جس گھر پر تھا جاتا ہے تو شاہ سُرخ کو بخانۂ سوم وزیر چلے
شاہ سبز کو کسی پیادہ چلنا پڑے گا اور فیل کی شہ مات ہو گی۔
حسن آرا۔ سبحان اللہ۔ آپ واقعی بڑے ذکی الطبع آدمی ہیں کیا چٹکیوں میں نقشہ حل کیا ہے۔ ہم نے تین دن میں بڑے
غور کے بعد کہیں حل کیا تھا، آپ نے دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ نکال لیا۔

چین ہی چین لکھتا ہے

آزاد خانہ برباد اور حسن آرا دورکا[1] گھوڑوں سوار لطف بہار دیکھتے شبدیز سبک خیز چمکاتے کبھی دوڑاتے کبھی جم
چلے جاتے تھے۔ میاں آزاد نے جو حسن آرا کو بے نقاب و بے حجاب پایا تو مدعا ضروری بالاظہار زبان پر آیا۔ مگر رمز و کنایہ
حسن آرا چتونوں سے تاڑ گئی جلد باز آدمی ہیں۔ مطلب کی بات چبا گئی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا۔ کبھی لجائی۔ کبھی مسکرا
شرمائی۔ کبھی بات بنائی، مگر نکاح کا لفظ زبان پر نہ لائی نہ لائی۔ اتنے میں سب کے سب اس ایوان سپہر توامان میں پہنچے جو
چشمہ سار میں واقع تھا۔

فرش و فروش بے بہا۔ شیشہ آلات خوشنما۔ یہ قالین ہے یا نگار خانہ ارژنگ یہ سوزنی ہے یا تختۂ تصویر فرنگ۔ رنگین
سائبان چھت گیری زرافشاں۔ پردے خوش نقش و نگار۔ در و دیوار مسرت نگار۔ پاندان مکلل درنگین نشاں۔

میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ چار مہوشان گل رخاں حسن آرا اور سپہر آرا کے ہمکنار رہوی ہوئیں چھما چھم کرتی چلی آتی ہیں۔ چاروں
طرحدار باغ و بہار چاروں کمسن الھڑ پن کے دن۔ جسے دیکھو جوش شباب سے اکڑتی ہے جوانی پھٹی پڑتی ہے۔ جو ہے پری زاد
ستم ایجاد۔ سرو قامت رشک شمشاد۔ ایک کی پتلی پتلی کمر لچکتی ہے۔ دوسری انا البرق کہتی ہوئی بجلی کی طرح چمکتی ہے۔

حسن آرا اپنی ہمجولیوں کو ساتھ لائی تھیں اور وہ بڑے شوق سے آئی تھیں کہ میاں آزاد کے جمال پر نظر ڈالیں۔ دیکھتے ہی غش غش
کر گئیں کہ واہ کیا جوان رعنا بلند و بالا ہے، آدمی کیا آفت کا پتلہ آتش کا پرکالہ ہے۔ گیتی آرا جو حسن آرا کی خالہ زاد بہن تھیں،
کہنے لگیں۔

گیتی آرا۔ حسن آرا بہن تمہاری پسند پر صاد ہے، یہ انسان یا پریزاد ہے؟

سپہر آرا (حسن آرا سے) باجی سلام۔ ہم نہ کہتے تھے کہ میاں آزاد سا طرحدار جوان کوئی کم نظر آئے گا۔ سے جناب مشکل کشا علی
کی قسم مشعل لے کر بھی ڈھونڈیئے تو نہ پایئے۔ گیتی آرا بہن بھی دیکھتے ہی لوٹ ہو گئیں اور میری تو بے دست و پائی کی حالت میں انہوں
نے دستگیری کی ہے۔ کفران نعمت اپنا شعار نہیں۔ جب تک جیئوں گی ان کا دم بھروں گی۔

گیتی آرا۔ کیوں بہن میاں آزاد کچھ شعر بھی کہتے ہیں۔ صورت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر آدمی ہیں۔

حسن آرا۔ کیا خوب ماشاء اللہ قیافہ شناس بھی آپ ہیں۔ پھر آپ انہیں سے نہ پوچھیے۔ یہ گھونگھٹ کیا؟

گیتی آرا۔ کبھی کی جان پہچان ہوتی تو خیر مضائقہ نہ تھا۔ بے جانے بوجھے نامحرم سے باتیں کرتے شرم آتی ہے۔

آزاد۔ فقیر بے نوا سے جان پہچان کیسی درویش گوشہ نشین سے جھجک یعنی چہ؟

گیتی آرا۔ یہ فقیر بینوا آپ کب سے ہوئے؟

آزاد۔ جب سے سلطان خوبان کی صحبت میں باریاب ہوا۔

گیتی آرا۔ (مسکرا کر) چہ خوش اچھی الٹی گنگا بہائی۔ بادشاہوں کی صحبت میں تو گدا تک مستغنی ہو جاتا ہے۔ آپ کے سلطان خوباں

---

[1] دور رکاب والا۔

اچھے خسرو ہیں کہ آزاد کو گدائے بے نوا کر دیں۔

آزاد۔ (جھیپ کر) اپنی اپنی قسمت۔

گیتی آرا۔ واہ ایک نشد دو شد۔ قسمت کو تو نہ الٹا دیجئے۔ قسمت نے تو سلطان خوباں کے در دولت تک پہنچا دیا۔

آزاد۔ (پھر منہ کی کھائی) اس وقت بلبل شیدا کی طرح دلفگار ہوں، دماغ صحیح نہیں۔

حسن آرا۔ (قہقہہ لگا کر) کیا خدا نہ کرے خشکی زیادہ ہے۔ روغن گل ملیئے۔

آزاد۔ سبحان اللہ اس گویائی کے صدقے بلبل کے لیے روغن گل اور دماغ کے لیے خشکی بھی اچھی رعایت ہے۔ یہ عروس فصیح البیان طوطیٔ ہندوستان۔ یہ مجسمۂ نازک آواز ہے یا بلبل شیراز۔ میرا تو ناطقہ بند کر دیا۔

گیتی آرا۔ (مسکرا کر) آدمی ہیں منصف۔

حسن آرا۔ (گردن پھیر کر) چشم بد دور۔

گیتی آرا۔ اگر طبیعت حاضر ہو اور دماغ چاق ہو تو اس مصرعے پر ایک غزل موزوں فرمائیے ع

"مرض عشق لا دوا دیکھا"

آزاد۔ طبیعت کی نہ پوچھیے، ہر وقت حاضر رہتی ہے غائب ہونا تو جانتی ہی نہیں۔ باقی رہا دماغ۔ اس میں شمیم زلف عنبریں سمائی ہے۔ اس وقت اور شعر و سخن؟ مگر الامر فوق الادب۔ بسم اللہ سنیئے ؎

شیخ کعبے میں تم نے کیا دیکھا ہم بتوں سے ملے خدا دیکھا

آہ نے میری کچھ نہ کام کیا ہم نے یہ تیر بھی لگا دیکھا

آئینہ کب مقابلِ دل ہو گرچہ دونوں کو با صفا دیکھا ق

وہ دکھاتا ہے عکس کم یہ کیف اس میں رو اس میں مدعا دیکھا

ہر مرض کی دوا مقرر ہے مرض عشق لا دوا دیکھا

شکل ناخن ہے گرچہ ابروِ یار پر نہ اس کو گرہ کشا دیکھا

گیتی آرا۔ بارک اللہ آپ تو شاعر غرا نکلے۔ کیوں حسن آرا اب ہماری قیافہ شناسی کی آپ قائل ہوئیں یا اب بھی شک ہے۔

حسن آرا۔ قائل! اے بہن ہم معتقد ہیں قائل کیا معنی۔

گیتی آرا۔ کیا طبیعت حاضر ہے۔ واہ وا واہ خصوصاً مطلع تو مطلع آفتاب سے روشن تر ہے ؎

شیخ کعبے میں تم نے کیا دیکھا ہم بتوں سے ملے خدا دیکھا

اور وہ آئینہ والا قطعہ کتنا دلکش ہے کہ واہ جی واہ

آزاد۔ اب انصاف تو اسی کا مقتضی ہے کہ میں نے آپ کو خوش کر دیا، آپ مجھے مسرور کیجیے۔

گیتی آرا۔ دل و جان سے منظور۔ آپ کچھ فرمائیں میں سعی کروں گی۔ شاید میری ہی کوشش ٹھکانے لگے۔

آزاد۔ صورت سوال ہے۔ حسن آرا کے حسن گلو سوز نے خرمن صبر و طاقت جلا دیا۔ نکاح کا سوال ہے۔

گیتی آرا۔ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے صاحب۔ دل کا سودا دل لگی نہیں ہے۔ آخر حسن آرا میں کیا بات ہے جو آپ لٹو ہو رہے یا

ل طعن دینا، کوسنا۔

یا نام پر ہی عاشق ہو گئے (حسن آرا سے) بہن مان لو۔
حسن آرا۔ اے واہ کیا سفارش ہے۔ کیوں مان لیں؟
خیر حسن آرا اور سپہر آرا اور ان کی خالہ زاد بہن گیتی آرا اور جہاں آرا اور میاں آزاد اور پیر مرد سب کے سب نے مل کر اس ایوان کیوان نشان میں بڑے لطف و سرور اور مسرت و بہجت سے دو روز کاٹے اور حسن آرا نے میاں آزاد کی چال ڈھال وضع قطع بات چیت کو میزان خرد میں خوب تولا خوب جانچا پرتالا۔
دو دن اس ایوان سپہر توامان میں اسی غرض سے رہی تھیں کہ میاں آزاد کے چال چلن کو بخوبی جانچیں پرتالیں۔ جب دو دن تک خوب دیکھ بھال چکیں تو گیتی آرا نے کہا کہ حسن آرا اب چلو گھر چلیں اور میاں آزاد سے کہو کسی اور محلہ میں مکان لیں مگر آیا جایا کریں۔ بہن آزاد۔ ہم کو دل و جان سے محبت ہے۔ اللہ وہ دن دکھائے کہ آزاد کا اور تمھارا عقد ہو جائے۔ آزاد ہم کو اپنی بڑی سالی کہیں اور ہم ان کو اپنا بہنوئی۔ کیا آنکھیں ہیں آہو ہو بہو۔ کیا رخسارے ہیں واہ وا واہ۔ کیا قد و قامت ہے کیا شکل و صورت ہے کہ سبحان اللہ۔ یہ ایک طرف علم و فضل کو دیکھو۔ شاعر کیسے غرا۔ سخندان کیسے بے ہمتا۔ منشی کیسے بے بدل۔ نثار کیسے بے مثل۔ مورخ کیسے زبردست۔
حسن آرا نے گیتی آرا سے کہا۔ بہن سنو۔ ہم تو ان کے بڑے ممنون ہیں۔ انھوں نے سپہر آرا کی جان بچائی ہیں تو ان کی لونڈی ہو جاؤں خدا کی قسم مگر بیاہ میں بے جانچے پرتالے نہ کروں گی۔ اب تم ان سے یہ کہو کہ کسی اور محلے میں فوراً نہایت عمدہ مکان کرایہ پر لیں اور اس میں رہا کریں اور بہن ان سے کوئی ایسی بری بات کہو جو شریف زادوں کی وضع کے بالکل خلاف ہے۔ دیکھو یہ مانتے ہیں یا نہیں ان سے تم کہو کہ فلاں بات کر لاؤ جو بالکل وضع کے خلاف ہو اور ان کو ترغیب دو کہ اگر تم یہ بات کرو تو ہم حسن آرا کو بیاہ کرنے پر مجبور کر دیں گے دیکھو مانتے ہیں یا نہیں۔ گیتی آرا نے کہا خوب سوچیں تم اب یہاں سے چلو تب کوئی بات ہو تم نے یہاں خیمے ہی نصب کر دیئے۔ حسن آرا نے کہا پھر چلیئے۔
گیتی آرا۔ (میاں آزاد سے) اب تو گھر چلنا چاہیئے۔ دو دن ہو گئے۔
آزاد۔ ہاں اب بوریا بدھنا اٹھایئے۔ بقچہ سنبھالیے۔ بڑی بیگم صاحب اپنے دل میں کہتی ہوں گی کہ دو دن غائب غلہ رہنا چہ معنی دارد۔
گیتی آرا۔ اس کا تو آپ خیال ہی نہ کیجیے۔ حسن آرا کی والدہ ماجدہ کو ان پر کافی اعتماد ہے۔
الغرض سب کے سب بجروں پر سوار ہو کر چلے۔ راہ میں میاں آزاد نے کئی بار گیتی آرا سے کہا کہ اگر یہ نہ مانیں تو میں زہر کھا لوں گا۔ میری تو جان جاتی ہے میں کیا کروں۔ ہائے ستم مجھے خدا نے ایسی پاکیزہ صورت کیوں دکھائی۔
ہوا سے مینڈھے اچھل رہے تھے۔ دریا نوجوانوں کے مزاج کی طرح بلیوں پر تھا۔ موجیں لہراتی ہوئی آتی تھیں۔ پانی ساحل کو چوم کر اٹھکیلیاں کرتا ہوا جاتا اور آتا تھا۔ اشجار پہ بہار کا عکس جوبن دے رہا تھا بعض بعض شاخیں پانی کو چوم رہی تھیں۔ ان پر طیور ذی شعور اور مرغان خوش الحان کا مزے سے بیٹھنا اور ہوا کے جھوکوں کا اس قدرتی جھولے کو پینگ دینا اور مرغان خوش نوا کا فرط طرب سے جھوم جھوم کر چہکنا عجب لطف بہار دکھاتا ہے۔ مچھلی یہ اچکی وہ ہو رہی کسی نے کہا رہو ہو ہے۔ کوئی بولا بام ہے۔ وہ دریائی جانور نے سر نکالا اور غڑاپ غوطہ کھایا۔ کچھوا یہ تیرتا جا رہا ہے وہ گردن فٹ سے پیٹ کے اندر رکھی۔ کنارے پر گھاس خوب جمی ہوئی ہے اور ایک کونے پر غوطہ خور بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے۔ لہریں لہراتی ہوئی آتی ہیں اور اس کے پاؤں کو چوم جاتی ہیں۔ ہوا ایسی سرد چل رہی ہے کہ جگر تک کرۂ زمہریر بن گیا۔ روح ٹھٹھری جاتی ہے۔
میاں آزاد نے حسن آرا سے پوچھا کہ کیوں صاحب ہمارے بجرے پر کیوں نہ سوار ہوئیں بھلے مانسوں کا اس زمانے میں

اعتبار نہیں رہا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا۔ اس پر سپہر آرا بولی۔ باجی تمہارا تو اچھا سٹھا دہے اے واہ کوئی بھلے مانس بات کرے تو جواب تک نہ دو۔ حُسن آرا نے ایک عجیب دلرُبا ادا سے کسی قدر تنک کر کہا کہ بھلے مانسوں کو دیکھ لیا۔

اتنے میں بجرے داخل ساحل ہوئے۔ میاں آزاد نے اپنی راہ لی۔ دُور تک فنسوں کا جمگھٹا اور مہریوں کا جھگڑا دیکھتے رہے جب فنسیں نظر سے اوجھل ہوئیں تو حضرت اپنے شفیق بالتحقیق میاں ظرّاف کے یہاں چلے آنکھیں اشک فشاں اور اشعار عشقیہ ورد زباں۔

اب سنیئے ادھر میاں آزاد تو اس سوچ میں تھے۔ ادھر ملّاح یلیح یعنی پیر بخش کو خط گھٹوانے کا شوق جو چرّایا تو حجام کو بلوایا۔ حجاموں کا قاعدہ ہے کہ منہ بناتے بناتے چہ میگوئیاں بھی کرتے جاتے ہیں۔ میاں خلیفہ ملّاح یلیح کا خط بناتے جاتے ہیں اور ساری خدائی کی گرما گرم خبریں سناتے جاتے ہیں۔ میاں میں لکھنؤ ایک دفعہ گیا تھا تو وہاں سرائیں بھی ٹکے تھے۔ اجی یہی جوان ہیں نہیں گھبرو سے جوتن آپ کے پاس بیٹھے تھے (اس روج (روز) ارے کون جوان گبھرو۔ کچھ بتا دے۔ اجی ہجور وہی گورے گورے ہیں نہیں۔ وہ جون بجرے پر بھی گئے تھے۔ ہاں ہاں وہی میاں آزاد۔ جی بس بس وہی میاں آجاد (ہاں۔ پھر کچھ کہے گا۔ وہ صاحب تمہارے ایک بھٹیاری سے شادی کرنے کو تھے تُل پھر نکل گئے۔ اس نے ان پر نالش جڑدی تھی کہ یہ مجھے کچھ روٹی کپڑا دیتے ویتے نہیں۔ اس بھٹیاری کو یہ اونٹ پر سوار کرکے رات کو لیے پھرتے تھے اور کل پرسوں انھوں نے ایک چڑی مار کو مارا۔ اس سے کہن کہ تو جال اور لاسا اور کپا پھینک پھانک کے چل دے وہ کب مانتا۔ آپ نے اس پر دو تین چپتیں جما دیں آدمی کچھ ٹھیک نہیں ہیں اور شراب بہت پیتے ہیں۔ مدا بڑے علم کے آدمی ہیں اور کبول (قبول) صورت بھی ہیں۔ دیدار رو جوان۔ ملّاح کا رنگ یہ داستان سنتے ہی فق ہو گیا۔ خبردار اور نہ کسی سے کہنا ہم سے کہا تو کہا اور کسی سے کہا تو بیڈھب ٹھہرے گی۔ پس اب زبان سے نہ نکالنا۔ اچھا میں نے تو ہجور سے کہا اور سے کہا گرج (غرض) ادھر میاں ظرّاف کے مکان پر حضرت آزاد پہنچے۔

آزاد۔ بھائی صاحب گھر میں ہو۔

لونڈی۔ میاں تو ابھی ابھی کہیں گئے ہیں۔ آپ کہاں سے تشریف لائے!

آزاد۔ اجی واہ ہم کہیں سے آئے تم کوئی قاضی ہو۔ تم بھابی صاحب سے ہماری بندگی کہہ دو اور کہو مزاج پوچھتے ہیں پہنچانا یا بھول گئیں غریبوں کو؟

لونڈی۔ (دروازے کے پاس آن کر) بیگم صاحب سلام عرض کرتی ہیں، اور فرماتی ہیں کہ کہئیے کہاں رہے اتنے دن؟

آزاد۔ ادھر ہی اُدھر۔

لونڈی۔ وہ کہتی ہیں جی بس۔ ہم سے نہ بہت اڑئیے۔ کہئیے آپ کی حسن آرا تو اچھی ہیں؟

آزاد۔ (مسکرا کر) کیا خوب آخر آپ سے یہ کس نے کہا۔ کچا چٹھا ہی سنا گیا یہ کن بزرگوار کی عنایت تھی۔

لونڈی۔ فرماتی ہیں کہ آپ کے بھائی ایک ہی جہانیاں جہاں گشت ہیں۔ شہر بھر کا حال اُن سے پوچھ لیجیے۔ اب ہمیں اتنا بتا دیجیے کہ برات کس دن چڑھے گی۔

اتنے میں کسی نے پیچھے سے میاں آزاد کی آنکھیں بند کر دیں۔ آزاد چلّا اٹھے کہ بھائی ظرّاف۔ دونوں گلے لپٹ گئے۔

۱ے وضع چلن ۲ے خط گھٹوانا۔ حجامت بنوانا۔ ۳ے جون = جو۔

ظراف (پیٹھ ٹھونک کر) شاباش۔ ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند کیوں نہ ہو واللہ مان گیا۔

ادھر آفتاب لب بام ہوا اور وقت شام ہوا ادھر میاں آزاد خانہ برباد اور ظراف فرخ نہاد نے کوئے جاناں کی راہ لی۔ ایوان عالیشان کے قریب پہنچے تو چوکیدار نے للکارا (کون؟) دربان بولا (بس وہیں سے بات چیت) ظراف تو جھجکے مگر میاں آزاد نے بڑھ کر کہا (ہم) اور (پھر) (ہم) ہم؟ ہم کون ہم کا نام بھی ہے یا ہم ہی ہم۔ اجی ہم اور کون۔ ہاں ہاں ہم ہی ہم۔ نہیں تو کیا تم۔ اے صاحب ہم کا نام تو فرمائیے یا ٹھنڈی ہوا کھائیے۔ ہم میاں آزاد! آزاد آزاد! کون اجی تم دل بہار کو اطلاع کر دو۔ چوکیدار نے دربان سے کہا۔ دربان نے آواز دی۔ اے بوا دل بہار ذری ادھر آؤ کوئی صاحب تشریف لائے ہیں۔ اندر سے آواز آئی پوچھو کون ہے۔ اس نے کہا آزاد نام بتاتے ہیں۔ میاں آزاد کی مطلوبہ دمہ لقا حسن آرا تو اس وقت خواب ناز میں تھیں لیکن ان کی پیاری بہن سپہر آرا دیوان صفدر پڑھ رہی تھیں اور وجد کر رہی تھیں۔ جب دل بہار نے میاں آزاد کے آنے کی خبر سنائی تو سپہر آرا پھولے نہ سمائی۔ کہاں کہاں کدھر بلاؤ بلاؤ اتنے میں میاں آزاد غڑاپ مکان کے اندر داخل ہوئے۔

آزاد۔ آپ کی باجی کہاں ہیں؟

سپہر آرا۔ آج نصیب اعدا کچھ طبیعت ناساز ہے۔ دل بہار جگا دو۔ کہو میاں آزاد آئے ہیں!

جب اُس دوح رعنائی اختر بُرج خود نمائی کو خواب سے جگایا اور میاں آزاد کے آنے کا مژدۂ طرب انگیز سنایا تو باچھیں کھل گئیں۔ انگڑائی لیتی ہوئی بڑے ناز و ادا سے اُٹھیں اور اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چلیں۔ اصیلوں نے دعائیں دیں اور چٹ پٹ بلائیں لیں۔ عجب ٹھسّے سے وہ نوعروس سرایۂ ناز میاں آزاد کے قریب آن کر بیٹھی تو لباس گراں بہا سے بہشت کی لپٹیں آنے لگیں۔

آزاد۔ مزاج اقدس!

حسن آرا۔ درد سر ہے۔

حسن آرا نے اپنے دست نازک سے ایک گلوری بنائی اور اپنے ہی ہاتھ سے میاں آزاد کو کھلائی۔ اوہو ہو ہو۔ سپہر آرا بولی۔ لو میاں آزاد نقشہ جم گیا۔ اس پر میاں آزاد نے پاندان چھین کر ایک گلوری خود بنائی اور ہزاروں قسمیں دے دے کر اپنی مطلوبۂ مطبوع[1] کو اپنے ہاتھ سے کھلائی۔ سپہر آرا نے کہیں دیکھ لیا تو کہتی کیا ہے۔ اب ہمارے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔ کوئی لاکھ چوری سے پان کھائے لبوں کی شوخی کب چھپ سکتی ہے۔ حسن آرا کی پیشانی پر عرق آ گیا، مگر جب ایک دفعہ چھوٹی بہن کی طرف دیکھا اور مسکرا کر گردن پھیر لی۔ میاں آزاد اس وقت رشک خلجی ہوئے جاتے تھے۔ جامے میں نہیں سماتے تھے۔ چہرۂ گلنار کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں اور حسن آرا عرق عرق نیچی نظروں سے تاک جھانک ہونے لگی۔

آزاد۔ اس وقت ہمارے دل کی کلی کھل گئی۔

سپہر آرا۔ کیوں نہیں پھر مُنہ مانگی مراد بھی تو مل گئی۔ اب مٹھائی کھلائیے۔ منہ میٹھا کیجیے۔ نہیں میں بھانجی ٹھوری[2] پر کر باندھوں گی۔

حسن آرا۔ اللہ یہ ان دونوں میں کیا رمز و کنایہ کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ شیرینی کیسی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

آزاد۔ ہم سمجھا دیں کیوں حضور۔

---

[1] دل پسند۔ [2] ادا اندازی۔

حسن آرا۔ جی نہیں بس معاف کیجئے۔
آزاد۔ آخر ہم کب تک ترسا کریں۔ امتحان دیا، پورے اترے۔ اب انعام تو ملے۔
حسن آرا۔ ہمارا تو اس وقت بُرا حال ہے۔ نیند اُمڈی چلی آتی ہے۔ آنکھیں جھکی پڑتی ہیں۔ اُف جمائی پر جمائی آرہی ہے۔ بند بند ٹوٹا جاتا ہے۔ (نیم خیز ہو کر) اب ہمیں سو ہی جانے دیجئے۔
آزاد۔ (دوپٹا پاؤں سے دبا کر) بسم اللہ آرام کیجئے جائیے اب جائیے۔ اسے صاحب تشریف لے جائیے۔
حسن آرا۔ (تنک کر) چھیڑ خانی سے آپ باز نہیں آتے۔ دامن تو دبائے ہیں اور کہتے ہیں جائیے جائیے۔ اب جائیں تو کیوں کر جائیں۔
آزاد۔ دوپٹے کو پھینک جائیے۔
حسن آرا۔ بجا۔ یہ کسی اور کو سکھائیے (بیٹھ کر) اب صاف کہہ دوں۔
آزاد۔ ضرور۔ مگر آپ کے تیور اس وقت بے ڈھب ہیں۔ خدا ہی خیر کرے۔ کہہ ڈالیے جو کچھ کہنا ہو۔ خدا کرے میرے مطلب کی بات منہ سے نکلے۔
سپہر آرا۔ آمین!
حسن آرا۔ آپ لائق فائق۔ علم و ہنر کے شائق۔ خوش تقریر۔ خوش بیان۔ عالی خاندان معالی دودمان۔ فہمیدہ و سنجیدہ حسین مہ جبین سب کچھ ہیں۔ فصاحت و بلاغت میں آپ کو سحبان الساؤ جی پایا تو حسن و جمال میں یوسف مصری۔ مگر آپ پردیسی آدمی۔ آپ کا ٹھوہ[1] نہ ٹھکانا۔ گھر نہ بار خانہ بدوش خانہ برباد خانماں خراب میں کسی سے آپ کا ذکر کروں تو کہوں کیا؟ کس کے لڑکے ہیں کس کے پوتے ہیں۔ کس کے نواسے۔ کس خاندان کے ہیں۔ مکان کہاں ہے۔ میں بتاؤں گی کیا؟ شہر بھر میں یہی خبر مشہور ہو جائے گی کہ حسن آرا نے ایک پردیسی کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا جس کے حسب نسب کا پتہ ہی معلوم نہیں۔ مجھے تو اس کی پروا نہیں۔ میں تو خوب جانتی ہوں۔ ع

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

لیکن مجھے ڈر یہ ہے کہ مبادا اس نکاح سے اور تعلیم یافتہ شریف زادیوں کو عوام حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور مجھ کو لوگ بد وضع سمجھیں جو مجھ کو مر جانے کے برابر ہوگا۔ بات وہ کرنی چاہیئے کہ دھبا نہ لگے اور ہم اور تم لطف سے زندگی بسر کریں۔ اب ساری بات یہ ہے کہ اپنے مشہور کرنے کی فکر کیجئے۔ مشہور کرنے کے یہ معنی نہیں کہ آپ کسی کے گھر جا ڈالیے اور ڈکیتی میں نام پیدا کیجئے۔ مطلب یہ کہ نیکی کے ساتھ لوگ آپ کو یاد کریں۔
آزاد۔ (خوش ہو کر) چشم ما روشن دل ما شاد۔ کہیے تو آگ میں پھاند پڑوں۔
حسن آرا۔ ماشاءاللہ کہی بھی تو وہی وحشت کی بات۔ تم آگ میں پھاند پڑو اور مجھے جلاؤ۔ کوئی معقول بات سوچو جس میں نام ہو۔
سپہر آرا۔ کوئی کتاب تصنیف کیجیے۔

---

[1] جگہ۔

حسن آرا۔ نہیں کوئی حمیت اور بہادری کی بات ہو کہ جو سُنے عش عش کرنے لگے اور پھر اچھی اچھی رئیس زادیاں چاہیں کہ اُن کے ساتھ میاں آزاد کا بیاہ ہو جائے۔ لیکن پھر اس وقت ہمیں آپ کاہے کو پوچھنے لگے۔ بچہ دماغ ہی نہ ملیں گے۔

آزاد۔ اگر میرے خیالات ایسے ہوں تو خدا مجھے غارت کرے۔

حسن آرا۔ تو سنیئے۔ اب روم[1] و روس میں جنگ چھڑنے والی ہے۔ روم کی مدد آپ پر فرض ہے۔ آپ روم کی طرف سے لڑیئے اور تیغِ بسالت کے خوب جوہر دکھائیے۔ تمغے لٹکاتے ہوئے آئیے تو وہ نام ہو کہ ہندوستان بھر میں گھر گھر آپ ہی کے چرچے ہوں اور ہم فخر سے کہیں کہ میاں آزاد غازی ہمارے شوہر ہیں۔

آزاد۔ (ٹوپی اچھال کر) منظور۔ منظور۔ جاؤں اور بیچ کھیت کے جاؤں۔ مرے تو خیر اسلام کے نام پر جان دی اور زندہ رہے تو تم کو پایا۔

سپہر آرا اس تقریر کو سن کر آنسو بھر لائی کہ واسطے خدا کے یہ خیال دل سے دور کر دو۔ کجا روم کجا ہندوستان۔ وہاں تک خیال بھی منزل بمنزل دم لیتا ہوا جاتا ہے اور میدان کارزار کے نام سے میرے ہوش پران ہوتے ہیں۔ میاں آزاد نے کہا آپ ابھی بالکل کمسن لڑکی ہیں۔

میاں آزاد وہاں سے رخصت ہوئے کہ کل ملیں گے اور پرسوں کوچ۔

---

[1] ترکستان (مرحوم سلطنت عثمانیہ)

سپہر آرا کا اصرار

سپہر آرا - باجی ہم کیا کریں! دل بیقرار ہے - میرے تو کلیجے میں جیسے کسی نے برچھیاں چبھو دیں - رات کاٹے نہیں کٹتی - ہائے تم کیسی بے رحم ہوئی جاتی ہو - آزاد کو بیکار جنگ پر بھیجتی ہو - تمھیں خاتونِ جنت کی قسم (گلے لپٹ کر) میری باجی میں صدقے - اب اس خیال سے درگذرو - آزاد جائیں گے تو پھر ان کی صورت دیکھنے کو ترس جاؤ گی - دن رات آنسو بہاؤ گی - زندگی تلخ ہو جائے گی - قیامت بپا ہوگی - اچھا، ہمیں کیا تم ہی پچھتاؤ گی - وہ بڑا دلیر آدمی ہے - مورچے سے آزاد کا پھرنا ایسا ہی ہے جیسا ملک الموت کا واپس جانا - کیوں مفت میں کسی کی جان کی دشمن ہوئی ہو؟

حسن آرا - ہائیں ہائیں بہن - اے واہ - یہ مفت کا رونا دھونا اچھا سوانگ ہے - وہ مبارک دن میری نظروں کے سامنے پھر رہا ہے جبکہ آزاد تمغے لٹکائے ہوئے روم کی لڑائی سر کرکے ہمارے دروازے پر کھڑے ہوں گے -

اتنے میں میاں آزاد بھی دَر سے داخل ہو گئے - میاں آزاد پر اور ہی عالم تھا - سپہر آرا تو اُن کو دیکھتے ہی آٹھ آٹھ آنسو رونے لگی لیکن حُسن آرا نے ضبط کیا اور بار بار کنکھیوں سے اُن کے گُلِ رُخسار پر نظر ڈالنے لگی اور ہنسی دل لگی کی باتوں میں رنجِ فرقت ٹالنے لگی - اس وقت آزاد کا چاند سا مکھڑا حُسن آرا کو ایسا بھایا کہ بے اختیار اسی وقت نکاح کرنے کو جی چاہا مگر اللہ رے استقلال و ضبط - ذرا اُف تک نہ کی -

سپہر آرا : جی اگر ایسی ہی محبت ہوتی تو توپ کے مہرے ان کو نہ بھیجتیں -

حسن آرا : ہائیں ہائیں اور توپ کے مہرے ان کو بھیجتا ہی کون ہے - کیا میں زبردستی تھوڑا ہی کرتی ہوں - وہ تو آپ جاتے ہیں - ہاں میں ان کو روکوں گی نہیں، وہ اسلام کے نام پر سر کٹانے جاتے ہیں - منع کروں تو کیونکر - سلطان المعظم روم ہمارے ظہیر المذہب[ؒ] ہیں - ہم پر اُن کی مدد لیے نازک وقت میں فرض ہے -

آزاد - ہاں اُنھوں نے مجھ سے اصرار کب کیا کہ تو ضرور ہی جا - میں تو خود ہی جاتا ہوں - یہ منع کر دیکھ لیں - دیکھیں میں کہنا مانتا ہوں کبھی نہیں، جاؤں اور پھر جاؤں -

سپہر آرا - بھلا خشکی خشکی جائیے گا -

آزاد - سمندر سمندر -

سپہر آرا - ہے ہے (ہاتھ مل کر) اُف اُف - سمندر ؟ بڑی بُری سنائی - خدا بچائے - اللہ بچائے، علیؑ مشکل کشا مشکل کشائی کرے - ہے اُف، کلیجہ مُنہ کو آگیا آج -

آزاد - اب رات زیادہ آئی - آپ آرام فرمائیں، ہم کل شب کو یہاں سے کوچ کریں گے -

سپہر آرا : ہے ہے کوچ ! اُف پھر دل دُکھانے ہمارے پاس آئے ہی کیوں تھے؟ (دامن زور سے دبا کر) جائیے تو دیکھوں کیونکر جاتے ہیں آپ!

حسن آرا (ٹپ ٹپ آنسو بہا کر) ؎

داغِ الفت لگا دیا کس نے | نقشِ ہستی مٹا دیا کس نے

ؒ پشت پناہ -

گل سے شبنم بنا دیا کس نے   ہنس رہے تھے رُلا دیا کس نے

سپہر آرا۔ اللہ میں کس کو سمجھاؤں جو مچلا جاتا ہے۔ آزاد کو سمجھاؤں جو داغ فرقت دیئے جاتا ہے۔ یا حسن آرا کو سمجھاؤں کہ اس جوان کے قتل کا بیڑا اُٹھایا ہے؟

حسن آرا۔ ہائے کس غضب میں جان پڑی۔ اس وقت عجب حالت ہے۔ بنڈا پھیکا پڑ گیا۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹے جاتے ہیں۔ آنکھیں جل رہی ہیں آزاد، جو میں جھوٹ کہتی ہوں تو یہ دونوں آنکھیں پٹم[1] ہو جائیں کہ اگر دنیا میں کسی کی چاہ ہے تو آزاد کی لیکن دل سے لگی ہے کہ تم روسیوں کو نیچا دکھاؤ۔ روم کی کمک کو جاؤ۔ مرنا جینا مقدر کے ہاتھ ہے۔ کون رہا ہے اور کون رہے گا ؎

غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے	ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم	ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں	کھا گئے اُن کو آسمان و زمیں
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر	ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے	یہی دُنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتا	نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا
بوئے الفت تمام پھیلی ہے	باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان	پڑھتے ہیں کل من علیہا فان[2]

میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم سرخرو ہو کر آؤ گے۔

آزاد۔ یہاں کیا راضی برضا۔ جو مرضی ہو۔ ہم تو کفن کو ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ مورچے سے ہٹ جائیں کیا مجال۔ زندہ رہے تو خیر ورنہ رخصت۔

حسن آرا۔ سپہر آرا۔ اچھا اب ان کو جانے دو کل آئیں گے۔

سپہر آرا۔ اچھا جائیے۔

آزاد۔ رخصت کل ملیں گے۔

میاں آزاد جب گھر سے نکلے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے۔ کبھی درویش شیخوخیت پناہ ولی اللہ عارف باللہ حق آگاہ مشیخت دستگاہ، کبھی جرعہ نوش بغیۂ بادہ فروش۔ رندِ آشام۔ صبح کو شراب شام کو جام۔ کبھی پہلوان یا پھکیت بن گئے، کسی لڑنتیے یا بنوٹیے کو دیکھا اور تن گئے۔ اس کو داؤ جا۔ اس کا منہ نوچا۔ اس کو دے پٹکا۔ اس کو لِدا دیا۔ کبھی پری رخوں کا جمال دیکھ کر مفتون ہو گئے کسی لیلیٰ وش پر نظر پڑی اور مجنوں ہو گئے مگر ان سے بڑے بڑے کارنمایاں بھی سرزد ہوئے۔ مکتبوں کی بھی اُنھوں نے اصلاح کی۔ مدرسوں اور کٹھ ملاؤں کی انھوں نے خبر لی۔ پاٹھ شالوں کا انھوں نے خاکہ اڑایا۔ ان پڑھ گرگوں کو اُنھوں نے رستہ بتایا۔ مگر دو ایک حرکتیں فضول بھی سرزد ہو گئی تھیں جن کا اب خمیازہ اٹھائیں گے۔

میاں آزاد نواب صاحب کے حکم سے جب صف شکن علی شاہ کو سمجھانے چلے اور ایک سرا میں بی اللہ رکھی بھٹیارن سے آنکھ لڑ گئی تھی مگر زبانی واخلہ اللہ رکھی خود بھی ان پر ریجھی تھیں۔ اس بارے میں تو میاں آزاد بڑے ہی خوش قسمت ہیں۔ کیسی ہی گلعذار پری رخسار کیوں نہ ہو ان کو نظر بھر کر دیکھا اور عاشق زار ہو گئی۔ اللہ رکھی نے ان پر نالش جڑی اور حضرت کو بھاگتے ہی بن پڑی۔ اب سنیے کہ اللہ رکھی

---

[1] اندھی۔ [2] یہ اشعار مثنوی زہرِ عشق کے ہیں۔

نے اڑتی سی خبر پائی کہ میاں آزاد فلاں شہر میں ایک خاتون مہ لقا کی زُلفِ چلیپا اور رُخِ زیبا پہ ہزار جان سے عاشق ہوگئے ہیں، اور وہ زہرہ تمثال بھی اُن کو چاہتی ہے۔ دونوں عاشق اور دونوں معشوق ہیں۔ سوچی کہ بدلہ لینے کا اچھا موقع ہے۔ میری زندگی میں تو میاں آزاد شادی نہیں کرنے پاتے تو سہی جو وہیں نہ پہنچوں اور سب معاملہ بھر بھنڈ نہ کر دوں۔ کیا دل لگی ہے۔ ہمیں بتے بتائیں اور اوروں کو بیاہ لائیں۔ اللہ رکھی نے دل میں ٹھان لی کہ جاؤں اور پھر جاؤں۔ یہ سوچ کر اپنے رفیق میاں چانڈو باز کو ساتھ لے کر چلیں اور دھم سے داخل ایک سرا میں بڑے ٹھسے سے رہنے لگیں۔ میاں چانڈو باز چوطرفہ ٹوہ لینے لگے کہ میاں آزاد کہاں ہیں؟ ایک دن چانڈو کی پینک میں جھومتے ہوئے چلے جاتے تھے اور سامنے سے میاں آزاد آتے تھے۔

چانڈو باز۔ (ہنس کر السلام علیکم (گلے مل کر) مزاج اچھے اللہ اللہ بعد مدت کے زیارت ہوئی۔ آنکھیں آپ کو ڈھونڈھتی تھیں واللہ ترس ترس گئے۔ آپ کی کس کس عنایت کا ذکر کروں بارے مے خوب۔ بی اللہ رکھی تو مر گئیں بیچاری ہائے غضب ہوگیا۔ مرتے وقت خدا کی قسم اللہ اللہ کہا کیں اور دم توڑنے کے پہلے تین دفعہ آزاد۔ آزاد۔ آزاد کہا اور چل بسیں۔ بس ہے نام اللہ کا۔

آزاد نے جس وقت چانڈو باز کی صورت منحوس پہلے دیکھی تھی تو چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا تھا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دم کا جاتا اور چھکے لکا تا بھول گئے۔ سوچے کہ دال میں کالا کالا ہے۔ اب عزت خاک میں ملی اور ساری کیفیت نکل گئی۔ چانڈو باز نے جب ان سے مصافحہ و معانقہ کیا تو اُن کا جی چاہا کہ قرولی بھونک کر للکاریں لیکن چانڈو باز نے بیان کیا کہ اللہ رکھی راہگرائے عالم جاودانی ہوئیں تو کسی قدر خوش اور کسی قدر ملول ہوئے۔ خوش اس وجہ سے چلو کہ بلا گئی۔ خس کم جہاں پاک اور ملول اس وجہ سے کہ عین عنفوانِ شباب میں اس نے وفات پائی لیکن جب میاں آزاد نے سُنا کہ نزع کے وقت ان کا نام ورد زبان تھا تو بڑا ہی افسوس ہوا۔ پرانی محبت نے جوش کیا اور آنسو آنکھوں سے جاری ہوگئے۔ چانڈو باز دل میں سوچا کہ مار لیا پھتروں میں آگئے۔ پھانسا کھا گئے، وہ چکمہ دیا کہ یاد ہی تو کریں گے۔

آزاد۔ کیوں حضرت ہم سے بڑی محبت تھی۔ اُف اس وقت بُرا حال ہے۔ ہائے مرتے وقت دو دو باتیں بھی نہ کرنے پائے۔

چانڈو باز۔ جی کیا عرض کروں۔ واللہ ہے اس پیار اور اس حسرت سے تمھیں یاد کیا کہ بس میں کیا کہوں۔ میرا تو اس وقت عجب نقشہ تھا روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ دم واپسین تک آپ ہی کی یاد کرتی رہیں۔ کھٹ ہوا اور آزاد آئے؟ دھم ہوا اور آزاد آئے؟ آپ اپنا ایک رومال وہاں بھول آئے ہیں اور اس کو ہر روز دیکھ لیتی تھیں۔ کئی تولہ عطر اس میں ملا اور مرتے وقت کہا کہ ہماری تُربت پہ یہ رومال رکھ دینا۔

آزاد۔ (رو رو کر) اف کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کس مردود کو معلوم ہو کہ اللہ رکھی کو ہم سے اس درجہ اُلفت تھی۔ ہائے ہم اس کی پیار کی باتوں اور رمز و کنایہ کی گھاتوں کو ذرا نہ سمجھے۔

چانڈو باز۔ ایک گلدستہ اپنے ہاتھ سے بنا کر دے گئی ہیں۔ اگر میاں آزاد حسنِ اتفاق سے آجائیں تو اُن کو دے دینا اور کہنا کہ اب حشر میں آپ کی صورت دیکھیں گے بس۔

آزاد۔ بھائی اسی وقت دو۔ ابھی ابھی دو۔ واسطے خدا کے ابھی لاؤ۔ یار میں تو مرا بے موت۔ لاؤ تو گلدستہ، ذرا میں چوم لوں۔ سر پر رکھوں آنکھوں سے لگاؤں گلے سے لگاؤں۔

چانڈو باز: (آنسو بہا کر) چھپنے میں سرا میں فرو کش ہوں۔ گلدستہ ساتھ ہے۔ اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ ہائے کیا گلدستہ ہے۔

آزاد اور میاں چانڈو باز مل کر چلے راہ میں اللہ رکھی کے حسن و جمال اور خط و خال اور بھولی بھالی باتوں اور عشق کی گھاتوں کا

ذکر مذکور رہا۔ چلتے چلتے دونوں سرا میں داخل ہوئے ۔ میاں آزاد جیسے ہی آگے بڑھے اور چانڈو باز کی کوٹھڑی میں گھسے ایسے ہی دیکھتے کیا ہیں کہ بی اللہ رکھی بگلے کے پر کا سا سفید لباس پہنے کھڑی ہیں۔ دیکھتے ہی میاں آزاد کا رنگ فق ہو گیا۔ اے ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ چپ اب ہلتے ہیں نہ بولتے ہیں۔ پیکرِ تصویر کی طرح بے حس و حرکت۔ پیشانی عرق عرق۔ آنکھیں جھپک گئیں اور ایک ہی دفعہ آوازِ بلند کہا (اُف مر گیا) یہ کہہ کر میاں آزاد دھم سے گر پڑے اور پھر کہا (اُف)۔

اللہ رکھی۔ (زور سے تالیاں بجا کر) مجرا عرض کرتی ہوں۔ اے بندہ پرور ذری ادھر نظر کیجئے۔ یہ مہینوں کی راہ طے کر کے ہم صرف آپ ہی کی زیارت کے لیے آئے ہیں اور آپ کو ہم سے ایسی نفرت ہے کہ آنکھ تک نہیں ملاتے۔ واہ ری خوبیٔ قسمت! اب ذرا سر تو اٹھائیے۔ ہائے ستم ہے۔ جن پر ہم جان دیتے ہیں وُہ ہماری صورت سے بیزار ہیں۔ کہیے آپ کی حسن آرا تو اچھی ہیں؟ ذرا ہم کو تو اُن کا جوبن دکھا دو۔ ہم نے سُنا بادِ بہاری کی طرح چمن میں ناز کرتی پھرتی ہیں۔ کبھی ہمجولیوں کو لے کر جشن اڑاتی ہیں اور نامِ خدا ابھی سولہ ہی سترہ برس کا بن ہے۔ اور ان دنوں تو بناوٹ سجاوٹ پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں ؎

مصاحب ان روزوں آئینہ ہے سنگار کا ان کو مشغلہ ہے   کبھی ہے سرمہ کبھی ہے مسّی کبھی ہے غازہ کبھی حنا ہے

کیوں بندہ پرور ہم بک رہے ہیں یا بھونک رہے ہیں (رخساروں پر ہاتھ پھیر کر) ہمارا ہی لہو پیئے جو ادھر نہ دیکھے۔ ایک نظر ادھر بھی۔

آزاد۔ جنابِ باری کی قسم صرف تمھیں دیکھنے آیا ہوں۔

چانڈو باز۔ اس وقت بھائی آزاد کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ ان کو بھی تم سے دِلی اُنس ہے۔ خدا کی قسم میں نے جو یہ فقرہ چست کیا کہ اللہ رکھی نے نزع کے وقت آزاد آزاد کہہ کر دم توڑا تو اُن کے چہرے پر بھی موت کے سے آثار پائے گئے۔

اللہ رکھی۔ خیر اتنی تو ڈھارس ہوئی کہ مرنے کے بعد ہمارا قاتل آنسو بہائے گا لیکن کیا ؎

آئے تربت پہ بہت روئے کیا یاد مجھے   خاک اُڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

آزاد۔ اللہ رکھی اب ہماری عزت و آبرو تمھارے ہاتھ ہے۔ تم چاہو تو جلاؤ چاہو تو نہ جلاؤ۔ اگر ہم تمھارے معشوق ہیں تو ہمیں دق نہ کرو ورنہ اب ہم سنکھیا کھا لیں گے اور اسی دم جان دیں گے۔ اگر ہماری موت منظور ہو تو خدا کی قسم ہم کمر کس کر مرنے پر آمادہ ہو جائیں اور اگر ہماری زیست چاہو تو ہمیں آزاد کر دو۔

اللہ رکھی۔ سنو آزاد ہم بھی شریف زادی ہیں۔ کوئی ایسی ویسی نہ سمجھنا۔ مگر اللہ کو یہی منظور تھا کہ ہم پاجیوں کی طرح سرا میں بھٹیاری بن کر رہیں۔ میں ایک شریف کی لڑکی ہوں۔ ہائے ہماری اماں نے ہمیں کس موئے بوڑھے کے ساتھ بیاہا تھا۔ دن رات ہم کڑھا کرتے تھے اور ہماری جوانی مفت میں ضائع جاتی تھی۔ آخر کار وہ تو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہی تھے چل بسے۔ جس دن اُن کے مرنے کی خبر آئی، ہم نے مسجد میں گھی کے چراغ جلائے لیکن ہماری اماں نے پھر ہماری شادی نہ کی اور ہم کو یہ سوجھی کہ گھر سے نکل بھاگیں۔ اللہ جانتا ہے، جو ننگ و ناموس میں فرق آیا ہو۔ تم سے بیاہ کرنے کا بہت شوق تھا مگر تم یہ سمجھ کر کہ بھٹیاری کو کیا بیاہیں، نکاح پر راضی نہ ہوئے۔ اب ہم نے سُنا ہے کہ حُسن آرا کے ساتھ تمھارا نکاح ہونے والا ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ خوشی سے بیاہ کیجئے لیکن ہمیں نہ بھول جانا۔ لونڈی بن کر رہوں گی مگر تم کو نہ چھوڑوں گی نہ چھوڑوں گی۔

میاں جی

میاں آزاد خانہ برباد بصد حسرت و یاس سراسیمہ و بد حواس جا رہے تھے کہ دفعتاً دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پُر بہار کنج میں جھولے پڑے ہیں اور بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس کی چھوکریاں ٹیپیاں جمائے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے مانگ نکالے گلے میں ہار ڈالے ہوئے پینگ لگا رہی ہیں اور دھانی دھانی دوپٹوں اور لال لال چُنری کا جوبن دکھا رہی ہیں اور سب پیاری اور سریلی آواز سے لہرا لہرا کر گا رہی ہیں۔

اتنے میں میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مجسم شامت پستہ قامت کوتاہ گردن۔ تنگ پیشانی، شرارت و خباثت کی نشانی کھڑا دُور ہی سے چھوکروں پر نگاہِ بد ڈال رہا ہے۔ جب اُنھوں نے کئی بار یہ کیفیت دیکھی تو اُن سے رہا نہ گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک چپت زناٹے سے جما ہی تو دی۔ ٹیپ کھاتے ہی وہ جھلّا اُٹھا اور گالیاں دے کر کہنے لگا کہ نہ ہوئی ولائتی[1] اس وقت پاس ورنہ بھٹّا سا سر اُڑا دیتا اور جو کہیں جوان ہوتا تو اس وقت کھود کر دفن کر دیتا اور جو کہیں بھوکا ہوتا تو کچا ہی کھا جاتا اور جو کہیں نشہ کی جھانج[2] ہوتی تو گھول کر پی ہی جاتا۔

میاں آزاد نے نشہ کا نام جو سُنا تو چونکے۔ غور کر کے دیکھا تو سن سے جان نکل گئی۔

یہ میاں خوجی تھے۔ کون خوجی؟ نواب صاحب کے مصاحب۔ کون نواب؟ وہی بٹیر باز۔ کون بٹیر؟ وہی صف شکن علی شاہ۔ کون صف شکن علی شاہ؟ وہی جن کی تلاش کو میاں آزاد نکلے تھے۔ چار آنکھیں ہوتے ہی انھوں نے اُن پر اور انھوں نے اُن پر نظر ڈالی۔

آزاد۔ ایں! بھائی خوجی ہیں۔ اللہ اکبر برسوں کے بعد ملاقات ہوئی، مزاج تو اچھا ہے؟

خوجی۔ جی ہاں مزاج تو اچھا ہے لیکن کھوپڑی بھنّا رہی ہے۔ واہ اُستاد بات کرتے ہی گال کاٹ لیا۔ اور تو در کنار علیک سلیک بالائے طاق۔ آتے ہی زناٹے کی وہ ٹیپ جمائی کہ توبہ ہی بھلی۔ بھلا آخر ہم نے تمھارا بگاڑا کیا تھا؟ اُف کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ نہ ہوئی قرولی[3]

آزاد۔ (دست بستہ) بھائی معاف کرنا قصور ہوا۔

خوجی۔ جی ہاں جوتیاں لگائیے اور کہئے معاف کرنا اور دل لگی یہ کہ بیس بیس دفعہ معافی مانگتے ہیں۔ اچھی مزاج پرسی کی کہ آتے ہی تڑ سے ایک دھول جمائی۔ وہ تو کہیے مجھے جلدی سے معلوم ہو گیا ورنہ اس وقت میں آپ کو جان سے مار ڈالتا۔ لانا میری قرولی۔

آزاد۔ اس میں کیا شک ہے۔ کہیے آخر آپ آئے کہاں۔

خوجی۔ آپ ہی کی تلاش میں آئے تھے۔ آپ نے ملتے ہی کھوپڑی سہلا دی۔

آزاد۔ نواب تو اچھے ہیں:

خوجی۔ اجی وہ گئے چولھے میں۔ یہاں سر بھنّا رہا ہے۔ اُف لے اب چلو تمھارے ساتھ چلیں۔ کچھ تو کھلواؤ یار۔ اس وقت مارے بھوک کے بیدم ہوئے جاتے ہیں۔

آزاد۔ چلیئے آئیے بسم اللہ۔ مگر واسطے خدا کے سچ کہنا ہماری گرفتاری کے لیے تو نہیں آئے ہو؟ بھائی ہم ہرگز نہ جانے کے، اب یہاں اور ہی دُھن ہے۔

آزاد اور خوجی دونوں مل کر چلے تو کالی کالی گھٹا نے وہ لُطف دکھایا کہ اُہو ہو ہو۔ میاں آزاد اپنے دوست خوجی کو ایک

---

[1] تلوار [2] زور۔ جوش۔ [3] خنجر۔

یورپین کوٹھی میں لے گئے اور وہاں سے جاکر اتنی شراب پلا دی کہ خوجی غین ہوگئے۔ تب میاں آزاد نے دم دے دے کر اُن سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کہ کہاں آئے ہو۔ وہ تو اس وقت اپنے آپے ہی میں نہ تھے۔ سب حال صاف صاف مو بمو کہہ دیا کہ نواب نے بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میاں آزاد جہاں ہو وہاں سے لے آؤ۔ آپ سے بہت ہی ناراض ہیں۔ تین آدمی اور میرے ساتھ ہیں۔ اب ہم آپ کو گرفتار کر لے جائیں گے۔

یہ سنتے ہی میاں آزاد کے کان کھڑے ہوئے اور وہاں سے بھاگے تو سیدھے میاں ظرآف کے گھر مو رہے۔

میاں آزاد خانہ برباد صبح کو ظراف کے مکان سے چلے تو بحر حیرت میں غوطہ زن کہ الٰہی جاؤں تو کہاں جاؤں۔ ملوں تو کس سے ملوں؟ ایک معشوق ہو تو اس پر جان دوں۔ ایک بُت ہو تو اس کا سجدہ کروں۔ حُسن آرا کے پاس جاؤں یا اللہ رکھی کی خبر لوں یا خوجی بے چارے کو کوٹھی سے لاؤں؟ وقت تھوڑا فرصت کم مہلت عنقا مگر خواہشیں شیطان کی آنت سے بھی زیادہ طویل و عریض۔ ایک ایک خواہش سے اندازا اٹ جائے بلکہ سمندر پٹ جائے۔ کبھی سوچے کہ حسن آرا سے ملیں۔ کبھی شوق چرّایا کہ اللہ رکھی ہماری تلاش میں کالے کوسوں سے آئی ہے آؤ پہلے اسی کی خبر لیں۔ پھر جی چاہا کہ سب سے پہلے چل کر خوجی کو تو کوٹھی سے لائیں۔ طرح طرح کے خیالات جو دل میں جاگزین ہوئے تو جان عذاب میں ہوگئی۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ میاں چانڈو باز جھومتے جھامتے گھومتے گھامتے ایک پھٹی سی ٹوپی لیے ہوئے سامنے سے آرہے ہیں اور دوسری طرف ملاح ملیح ایک جریب ٹیکتے ہوئے لوقدمے جارہے ہیں۔ اتفاق سے تینوں کی مڈبھیڑ ہوئی تو عجب سیر ہوئی۔ چانڈو باز اس وقت پینک میں تو تھے ہی، آؤ دیکھا نہ تاؤ جھلا کر باآواز بلند آواز کہا کہ عجیب طرح کے آدمی ہو میاں۔ اقرار کر آئے کہ ابھی آتا ہوں، دو گھنٹے میں آیا۔ پل مارنے کی دیر نہ ہوگی اور میں دن سے داخل ہو جاؤں گا ہونہہ۔ اور تب کے گئے ہوئے اب تک صورت نہ دکھائی، واہ اللہ رکھی بیچاری ڈاڑھیں مار مار کر رو رہی ہے۔ خوب ملے۔ چلئے اُن کے آنسو تو پوچھئے۔ دامن سب تربتر ہوگیا، سر ٹپک ٹپک کر جان دے رہی ہیں۔ ملاح نے جو یہ تقریر سُنی تو اُس کے کان کھڑے ہوئے۔ حجام کی زبانی یہ تو سُن ہی چکے تھے کہ میاں آزاد کسی سرا میں اللہ رکھی پر فریفتہ ہو گئے تھے مگر انھوں نے حُسن آرا سے پوشیدہ ہی رکھا لیکن جب دو دن تک برابر آزاد کا پتہ ہی نہ ملا، تیسرے دن حُسن آرا نے ملاح سے کہا کہ ذرا شہر جاؤ دو چار چکر لگاؤ، دیکھو تو آزاد کو کیا ہوا۔ ملاح ملیح نے دیکھا تو اور ہی رنگ اور ہی ڈھنگ۔ اللہ رکھی کا ذکر مذکور ہے۔ آزاد کا رنگ فق ہوگیا اور ملاح کا کلیجہ شق ہوگیا۔

اب سُنیے۔ چانڈو باز خاموش ہوئے تو ملاح نے اپنی داستان چھیڑی۔ بھائی آزاد کہاں رہے بھئیا ایسا کوئی کرتا ہے۔ بھلا حُسن آرا کی خوننابہ فشانی اور سپہر آرا کی اشک افشانی کا حال ناگفتہ بہ۔ رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ ہر دم آہ و زاری۔ ہر دم بیقراری۔ حسن آرا تو خیر کسی قدر ضبط بھی کرتی ہیں مگر سپہر آرا بیچاری پھوٹ پھوٹ کر روتی ہیں۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتی ہیں۔ کلیجہ تھام تھام کر اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ بیٹھ جاتی ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو چار دفعہ تو غش آیا ہوگا۔

چانڈو باز نے جو یہ رنگ دیکھا تو بگڑے کہ واہ جی تم کون ہو۔ میاں ہوش کی دوا کرو۔ بھلا مجال ہے کہ اللہ رکھی کو چھوڑ کر یہ یہاں سے جائیں۔ کیا خوب اچھی دل لگی نکالی ہے۔ چلو اپنی راہ لو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ معقول! ہم تو منزلوں خاک پھانکتے سیکڑوں کنوئیں جھانکتے یہاں آئے۔ آپ بیچ میں بولنے والے کون؟

آزاد نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سمجھے کہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ حسن آرا الگ بدظن ہو جائیں گی اور اللہ رکھی الگ منہ پھلائیں گی اور سپہر آرا ناک بھوں چڑھائیں گی، تو گیتی آرا گرما گرم فقرے سنائیں گی۔ ملاح کا چہرہ اس وقت چانڈو باز کی الکمٹر تقریر سے لال انگارا

ہوگیا۔ آزاد نے معاً فقرہ چست کیا اور چانڈو باز سے کہا کہ یار تم گھبراتے کیوں ہو۔ یہ پیر فرتوت افیمی آدمی ہے۔ بازار سے جاکر دو آنے کی بالائی تو لپک کر لے آؤ۔ ان کو افیم پلا کر غین کر دیں اور ہم اور آپ مزے سے سیر کر چلیں۔ کیوں استاد ہے نا معلّے کی بات۔ لانا ہاتھ۔ چانڈو باز تو پھر آپ جانئے نشہ باز آدمی۔ بالائی کا نام سنتے ہی گلقند آفتابی ہو گئے۔ واہ خوب کہی جھپ سے دو آنے لیے۔ لڑھکتے پڑھکتے چلے بالائی لانے۔ ادھر میاں آزاد نے اس موقع کو غنیمت جان کر ملاح ملیح سے کہا کہ چلئے قبلہ، ہم اور آپ چلیں۔ راستہ میں باتیں ہوتی جائیں گی۔ دونوں ساتھ چلے۔

اتنے میں وہ کوٹھی سامنے نظر آئی اور دیکھتے ہی میاں آزاد کے دل کی کلی کھل کھلائی اور غل مچایا وہ کوٹھی آئی۔ وہ کوٹھی آئی۔ وہ آئی۔ وہ آئی۔ ملاح نے کہا آپ ذرا اس شہتوت کے درخت کے سایہ میں دم لیں۔ دم کے دم میں آیا۔ یہ کہہ کر ملاح ملیح کوٹھی میں گئے اور حسن آرا سے خوش خوش کہا کہ لو میاں آزاد آگئے۔ سپہر آرا پلنگ پر سے چونک کر اُٹھی۔ آئیے آئیے بلاؤ بلاؤ۔ جھٹ دریچے میں سے جھانکنے لگی۔ میاں آزاد اندر داخل ہوئے تو سپہر آرا نے اٹھ کر استقبال کیا اور دیکھ کر بشاش ہوگئی۔ مگر حسن آرا اپنی جگہ سے نہ اُٹھی نہ اُٹھی۔ جہاں بیٹھی تھی وہیں پیکر تصویر کی طرح خاموش رہی گویا دہن میں زبان ہی نہ تھی۔ میاں آزاد باادب بیٹھے رہے۔

حسن آرا۔ بہن ان سے پوچھو ان کے آنے کا مدعا کیا ہے؟

آزاد۔ اصالتاً پوچھیے کیا لب نہیں ہے یا دہن نہیں ہے۔ اور ہمارا مدعا کیا پوچھتی ہو:۔

متردد ہے دل کہوں نہ کہوں　　پوچھتے ہیں وہ مدعا میرا
ہر نگہ میں ہیں سینکڑوں ارماں　　کوئی دیکھے تو دیکھنا میرا
پاس تم کو اگر نہیں تو نہ ہو　　اے بُتو کیا نہیں خدا میرا
لیے جاتے ہو تم کہاں دل کو؟　　ہے یہ مدت سے آشنا میرا

سپہر آرا باجی کی آنکھیں روتے روتے خونِ کبوتر کی سی سُرخ ہوگئیں۔ کھانا پینا حرام تھا۔ کلیجہ ہر دم دھک دھک کرتا تھا۔ طرح طرح کے خیالات آتے تھے۔ لوگوں نے یہاں آن کر کیا جانے کیا کیا کہا؟

آزاد۔ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کو ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

لگائی بجھائی باتوں کا خیال کرنا وضعداری کی وضع کے خلاف ہے۔

حسن آرا۔ (تنک کر) پوچھو کہ اب آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟

آزاد۔ پوچھے کون؟ اے صاحب آپ خود کیوں نہیں پوچھتیں آخر۔ اللہ رے عتاب۔ اف رے تیری تیکھی چتون اور اللہ رے تیری لگاوٹ باز انکھڑیاں۔ ہم سے دریافت ہوتا ہے کہ اب آپ چاہتے کیا ہیں؟ شانِ خدا ہم سے اور یہ سوال

کہوں کیا میں تجھ سے کیا چاہتا ہوں　　جفا ہو چکی اب وفا چاہتا ہوں
بہت آشنا ہیں زمانے میں لیکن　　کوئی دوست درد آشنا چاہتا ہوں

حسن آرا۔ اے ان سے کہہ دو نا کہ اس شعر خوانی کو چھپّر پر رکھیں۔ یہاں کسی کو واہی تباہی شعر کہنے کا شوق نہیں ہے۔

معلوم ہے کہ بڑے شاعر کی دُم ہیں ۔ الکذب حسنہ پر عمل ہے ۔ بڑے شاعر ہی ہیں بس ۔

سپہر آرا ۔ بہن تم لاکھ بنو ۔ ہزار بگاڑ کی باتیں کرو لبوں پر مسکراہٹ آ ہی جاتی ہے ۔ دل کی لگن کہیں چھپانے سے چھپتی ہے ؟ اے توبہ ۔

حسن آرا ۔ چلو بس چپ بھی رہو ۔ بہت کلیجہ نہ پکاؤ ۔ اس وقت دل پر جو دُکھ ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں ۔ لو تم تو بڑی الڑھ ہو ۔ ہرجائیوں سے ملاقات کیا ایسوں سے تپاک کیا ؟ چلو اب ہم تم کمرہ خالی کر دیں ۔ جس کا جی چاہے بیٹھے ۔ جس کا دل چاہے جائے ۔ حیادار کے لیے ایک چلو کافی ہے ۔

یہ کہہ کر حسن آرا اُٹھی اور سپہر آرا بھی ساتھ ہی ایک ناز دلربایانہ سے کھڑی ہوئیں کہ اتنے میں میاں آزاد نے سپہر آرا کا پہونچا پکڑ لیا ۔ اب دل لگی دیکھیے کہ اُدھر تو میاں آزاد اُس نازک بدن کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ، اور ادھر حسن آرا اُس گلفام کو اپنی طرف گھسیٹ رہی ہیں ۔ حسن آرا بگڑ رہی ہیں کہ ہماری بہن کا ہاتھ کوئی پکڑے تو ہاتھ ہی توڑیں ۔ جب ہم نے ٹکا سا جواب دیا تو پھر کوئی یہاں آنے والا کون ؟ واہ ایسے حیادار بھی نہیں دیکھے ۔ آزاد نے کہا ۔ صاحب آپ اتنا خفا کیوں ہوتی ہیں ۔ واسطے خدا کے ذرا بیٹھ تو جائیے ۔ ایسا غصہ بھی کیا ۔ مانا کہ ہم معتوب ہیں مگر ہم سے جواب تو سنیے ۔ خدا گواہ ہے کہ ہم بے تصور ہیں ۔ حسن آرا نے کہا ۔ بس بس زبان نہ کھلوائیے اور جو خدا نہ کرے کسی کی جان نکل جاتی تو کیسی ٹھہرتی ؟ یہاں نعل در آتش ماہیٔ بے آب کی طرح بیقرار ۔ طرح طرح کا انتشار سیکڑوں اندیشے ۔ اور آپ کا پتہ ہی نہیں ۔

روم کے سفر کی تیاری

ظرافؔ۔ کہیئے اب تو رخصت ہے بھئی۔

بہ سفر رفتنت مبارک باد   بہ سلامت روی و باز آئی

کھانا تیار ہے کہیئے تو نکلوایا جائے۔ برف بھی منگوا رکھی ہے۔

آزادؔ۔ کھانا تو اس وقت ہم نہ کھائیں گے۔ اشتہا نہیں، مطلق بھوک نہیں۔

ظرافؔ۔ ایں! کیا خوب۔ پھر اتنا پکوایا کیوں؟ اجی دو نوالے تو کھا لو۔

آزادؔ۔ پکوایا کس نے۔ مجھے تو صبح سے کھٹی ڈکاریں آرہی ہیں۔ یہ آپ سے کہا کس نے تھا کہ آپ کھانا پکوائیں۔

ظرافؔ۔ اور سنیے گا۔ کہا کس نے کی ایک ہی کہی۔ کہا آپ کے خوجی نے اور کس نے۔ بولو میاں خوجی۔ دس سیر فرنی اور دس سیر کھیر اور اٹھارہ سیر میٹھے ٹکڑے اور خدا جانے کیا الم غلّم بتا گئے۔ گھر میں بڑے اہتمام بلیغ سے سب سامان لیس کیا۔ اب تو دو چار نوالے تو آپ کو اُن کی خاطر سے ضرور کھانے چاہئیں۔

آزادؔ۔ لاحول ولا قوت۔ خوجی بھی بس گرسنہ چشم ہی رہے۔

خوجیؔ۔ لاحول کاہے کی۔ آخر اس لاحول کے کیا معنی؟ آپ نہ کھائیے بندہ تو ڈٹ کے چکھ چکا۔

آزادؔ۔ کیا یہ کھانا کھا چکے؟

خوجیؔ۔ جی نہیں تو کیا آپ کی طرح بے وقوف ہوں۔ اور سب میٹھی میٹھی چیزیں پکوائیں۔ آج افیم بھی معمول سے زیادہ پی، خوب چسکی لگائی۔

آزادؔ۔ بس اب پھر بوریا بندھنا اُٹھائیے چلئے بسم اللہ کرکے لدئیے پھندیئے۔

خوجیؔ۔ قبلہ اب تو اس وقت یہ حال ہے کہ جیسے چوہے کو کوئی پارہ پلا دے چلنا چلانا معلوم، اب بندہ لوٹ مارے گا اور سواری کیا ہے ظراف: یکا رے غضب خدا کا بندہ جا چکا۔ کیئے پیدا آج تک کبھی سواری نہ ہوئے۔ اینجانب اور پھر کھانا کھا کر آرے تو بہ مری جاؤں گا ذرا سا پانی پلانا۔ یار فہمی تو بہت دیکھے مگر سچ کہنا ایسا بھی کوئی دیکھا جو پینک کا نام بھی نہ جانتا ہو۔

الغرض میاں آزاد نے جھٹ پٹ کھانا کھایا اور اسباب وسباب کس کرا آمادۂ سفر ہوئے۔ خوجی کو بھی ایک لات جمائی کہ اُٹھ نامعقول! بس اب سونا ودنا ہو چکا۔ قہر درویش بر جان درویش، کہہ کر اٹھے۔

اب سنیے کہ میاں خوجی نے اپنے مریل ٹٹو کو جو دیکھا تو لگے دوہتڑ پیٹنے۔ یارو واسطہ خدا کا ہمیں بچا لو۔ بھئی ہم ایسے جانے سے درگذرے۔ بلی بخشے چوہا لنڈورا ہی ہو کر جیئے گا۔ بیچ پی ہزار نعمت پائی۔ آخر کار لوگوں نے للکارا کہ بیوقوف ہوا ہے۔ مرا کیوں جاتا ہے۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ سوار ہو جائیں لیکن یار لوگ ڈرلتے کہ دیکھ دیکھ وہ پشتک اچھالی۔ وہ دولتی جھاڑی۔ وہ کاٹنے دوڑا۔ وہ منہ کھول کر لپکا۔ وہ دبوچا۔ وہ ٹیٹوا لیا۔ وہ ٹٹو کھڑا ہے۔ کان تک نہیں ہلاتا۔ ایک دفعہ ہی آنکھ بند کرکے حضرت نے چاہا کہ لدلیں مگر یاران سرپل نے تالیاں جو بجائیں تو ٹٹو بھاگا اور میاں خوجی بھد سے زمین پر۔ اُف دیکھا کہتے تھے نہ کہ ہم اس ٹٹو پر نہ سوار ہوں گے، مگر حضرت ذات شریف نے دو گھڑی دل لگی دیکھنے کے لیے ہم کو الو بنایا۔ کچھ مرہی

نکل گیا۔ بڑی پسلی بچ گئی ورنہ چومری ہو جاتے۔ خیر۔ دو آدمیوں نے اُن کو اٹھایا اور لاد کر گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ دیا لگام اُن کے ہاتھ میں دی اور کہا چلئے شیخ جی۔ کہ کر ایک بگڑے دل نے چابک جمایا اور ٹٹو دُم دبا کر بھاگا اور میاں خوجی نے غل مچایا، مرا مرا۔ گرا گرا۔ یا علی مشکل کشا مشکل کشائی کیجئے۔ یا خدا مدد دے۔ الٰہی خیر کیجیو۔ ارارا دوں دھم۔ وہ میاں خوجی پھسک گئے۔ تب تو میاں آزاد نے گھوڑی بڑھائی اور ظرافت سے رخصت ہو کر خوجی کی مدد کو چلے۔ اُن کو جو حوالی موالی بازاری تماشائیوں نے دیکھا تو کھسکے اور خوجی ٹٹو پر لدے ہوئے آہستہ آہستہ چلے۔

خوجی۔ اب کیا روم تک برابر اس ٹٹو پر جانا ہوگا؟

آزاد۔ جی اور نہیں تو کیا۔ اور کیا آپ کے واسطے اڑن کھٹولا آئے گا؟

خوجی۔ بندہ رخصت ہوتا ہے۔

آزاد۔ بندہ گدا دیتا ہے۔

خوجی۔ بھلا اس ٹٹو پر کون جائے گا؟

آزاد۔ ارے بے وقوف لکھنؤ تک یونہی چلنا ہو گا وہاں سے پھر ریل ہے۔ بمبئی تک ریل پر جائیں گے اور وہاں سے جہاز۔

خوجی۔ (غل مچا کر) کیا! جہاز! اُف میرے مولا پانی کا سفر ہم کس سے ہو سکے گا اور وہاں افیون کہاں ملے گی ہم سب بھر پائے بھائی ہمیں آزاد کرو۔

آزاد۔ بس چپکے چلو۔

میاں آزاد اور اُن کے لنگوٹیے یار میاں خوجی گھوڑوں کی باگ اُٹھائے چلے جاتے تھے۔ میاں خوجی کی ٹٹوی کبھی گرمائی تو آزاد کی سمند گھوڑی سے دس پانچ ہی قدم پیچھے رہنے لگی۔ چلتے چلتے شام کے وقت ایک گاؤں نظر آیا۔ میاں آزاد نے کہا کہ یہیں بستر جماؤ۔ آج یہاں پر پڑاؤ ہو۔ کل دن سے لکھنؤ داخل ہو جائیں گے۔ رات بھر وہاں رہے۔ صبح تڑکے گجردم پھر چلے تو کوئی تین ہی چار کوس گئے ہوں گے کہ میاں خوجی ارہر کے کھیت میں گئے اور ٹٹوی کو راہ خدا پر چھوڑ دیا کہ جہاں جی چاہے آزادی سے چرے۔ ٹٹوی دیکھنے میں تو دُبلی پتلی تھی۔ صورت حرام۔ مگر انتہا کی شریر۔ یہ تو ارہر کے کھیت میں ہو رہے وہ سیدھی چل کے بوٹ کے کھیت میں پہنچی اور لگی چرنے۔ اتنے میں کسان نے جو دیکھا تو لٹھ لے کر دوڑا، اور لگا بُرا بھلا کہنے۔ اس کی جورو بھی چمک کر لپکی اور کوسنا شروع کیا۔ میاں خوجی نے للکارا۔ او گیدی ابے او گیدی۔ خبردار اس حرکتِ ناشائستہ سے باز آ ورنہ فرق دان پر ایک بال بھی باقی نہ رہے گا اور ضربتِ پاپوش سے بوکھلا جائے گا۔ وہ گنوار بلکہ اور گنوار کا لٹھ۔ عربی ترکی پڑھا نہ تھا اس پر جھلا کر جھپٹ پڑا، اور اتنے لٹھ رسید کیے کہ ٹٹوے کے ہنجر پنجر بگڑ گئے۔ میاں خوجی میں ایک وصف تھا کہ بے سوچے سمجھے بے دیکھے بھالے لڑ پڑتے تھے، چاہے اپنے سے دوگنا چوگنا ہو، یہ جھٹ ہی جائیں گے۔ غصہ کی یہ خاصیت ہے کہ جب آتا ہے کمزور پر۔ مگر میاں خوجی کا غصہ بھی نرالا تھا۔ ان کو جب غصہ آتا تھا تو شہ زور پر جوان کو اٹھا کر پھینکے تو اشارہ لڑھکنیاں کھائیں۔ چاہے کچومر نکل جائے، مگر یہ لڑنا نہیں چھوڑتے۔

دوسرا وصف یہ تھا کہ پٹ پٹا کر جھاڑ پونچھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے مگر ممکن کیا کہ ذرا اُف کریں۔ وہی خم و دم۔ کسان نے اتنی بڑی گستاخی ان کے حضور میں کی کہ ان کی ٹٹوی کو ان کے سامنے اتنا مارا کہ اس کا بھر کس ہی نکل گیا، پھر بھلا اُن کو تاب کہاں۔ آفتابہ پھینکا اور تڑ سے دوڑ کر کسان سے گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ گنوار آدمی اور انتہا کا گرارا۔ یہ منحنی دبلے پتلے مبین آدمی۔

ہَوا کے جھونکے میں اُڑ جائیں - اس نے ان کی گردن دبوچی اور گدّ سے زمین پر پھینکا - پھر جھپٹنے کی کوشش کی تو کسان کی جورو
ان سے چمٹ گئی اور لگی ہاتھا پائی ہونے - اس نے ایک گھونسا جمایا اور اُن کے پیچھے پکر پھینکا تو چاروں شانے چت
دو تھپڑ رسید کیے - ایک اِدھر ایک اُدھر اور کسان کھڑا ہنس رہا ہے کہ مہاراج سے جیت پاوت ناہیں یو منڈوئن
سے کاٹ دیبے لے بھلا - کسان کی جورو تو ٹھونک ٹھانک اور پیٹ پاٹ کر چل دی اور آپ نے پکارنا شروع کردیا قسم
بابا جان کی جو کہیں چھرا پاس ہوتا تو ان دونوں کی لاش اس وقت پھڑکتی ہوتی وہ تو کہیے خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ میں اپنے زخم
میں آپ کہہا ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ عمر بھر یاد کرتے - بات تڑے کی نابکار لعین - کمڑا تو رہ او گیدی دوزخی - اس پر گاؤں والوں
نے خوب قہقہہ اڑایا اور اتنا بنایا کہ میاں خوجی جھلا کر سب کو گالیاں دینے لگے - تم سب پہ میں بھاری ہوں - پرے کے پرے صاف
کر دوں - وہ تو کہیے چھری نہ ہوئی اس سے خیریت ہے - ایک نے پوچھا کہ کیوں میاں صاحب چھری ہوتی تو کیا بھونک کر مر
جاتے یا اپنے پیٹ میں لگاتے - آخر نتیجہ کیا ہوتا - اس پر میاں خوجی اور بھی آگ ببھوکا ہو گئے

میاں آزاد کوئی دو گولی کے ٹپے پر نکل گئے تھے - جب خوجی کو ساتھ نہ دیکھا تو حیرت ہوئی کہ ایں! یہ کہاں رہ
گئے بھئی - ایک مسافر سے پوچھا کہ کیوں جی پیچھے کوئی شخص ٹٹو پر سوار آتا دیکھا؟ اس نے کہا جی ہاں ایک کسان سے
لڑائی ہو رہی تھی - اور اس کی جورو نے ان کو خوب مارا - وہ کھیت میں پڑے قرولی ڈھونڈ رہے ہیں - اور کہتے ہیں کہ
قرولی ہوتی تو مار ہی ڈالتا -

میاں آزاد گھوڑی پھیری اور دم کے دم میں ہوا ہو گئے تو کھٹ سے اس کھیت میں داخل -

آزاد - اے میاں خوجی خیریت تو ہے؟ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ کھیت میں پڑے رہنے کا سبب کیا؟ چلو اُٹھو گرد جھاڑو
آخر کب تک پڑے رہوگے بھلا؟

خوجی - قرولی نہ ہوئی پاس ورنہ اس وقت دو لاشیں یہاں پھڑکتے ہوئی دیکھتے -

آزاد - اجی وہ تو جب دیکھتے تب دیکھتے - بالفعل تو تمھاری لوتھ دیکھ رہے ہیں -

پھر تو ٹھبو کر کے اٹھایا اور گھوڑی پر سوار کرایا - چلے تو تھوڑی دور تک میاں آزاد کا ساتھ رہا - بعد ازاں کوئی ایک
کھیت کا فاصلہ ہو گیا - خوجی سے ایک پٹھان نے پوچھا کیوں شیخ جی! آپ کہاں رہتے ہیں - حضرت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ،
جھٹ سے ایک کوڑا چکھایا اور کہا کہ اِبے ہم شیخ نہیں خواجہ ہیں - وہ شخص غصے سے آگ ببھوکا ہو گیا اور ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا تو
خوجی کھٹ سے زمین پر - چاہا کہ اُن کا گلا گھونٹ کے مار ڈالے مگر رحم آیا اور چھوڑ دیا کہ مفت کا خون کون اپنی گردن پر لے - اب
ان کی سنیے کہ ٹٹوی پر سے گر کر چاروں شانے چت پڑے ہیں - آزاد نے جو پیچھے پھر کر دیکھا تو ٹٹوی پوقدمی چلی آتی ہے مگر
خوجی ندارد - سمجھے کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے - پلٹے کہ دیکھیں اب کیا واقعہ ہوا - خوجی ٹٹوی پر سے گر کر حسبِ معمول غل
مچانے لگے کہ نہ ہوئی قرولی ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ یاد ہی کرتا عمر بھر - آزاد گھوڑی کڑکڑاتے ان کے کلے پر جا ڈٹے تو
دیکھا پھر اسی طرح زمین پر پڑے ہوئے قرولی کی جستجو میں ہیں -

آزاد - اے پشتار شرم نہیں آتی - کمزور مار کھانے کی نشانی بدن میں سکت نہیں تو پھر کٹے کیوں مرتے ہو - مفت میں جوتیاں
کھانا کون جوانمردی ہے -

---

[1] عورت - [2] تنومند -

خوجی۔ واللہ آزاد جو قرولی کہیں پاس ہو تو بدن ہی چھلنی کر ڈالوں۔ دم تو لینے نہ دوں۔ مگر چلیے بخیر گذشت ورنہ اس وقت اس گیدی کی تجہیز و تکفین کی فکر پڑتی۔

آزاد۔ چلو اب اٹھو۔ اٹھو گے بھی یا پرسوں تک یہاں ہی پڑے رہو گے۔ یار تم نے تو اچھا ناک میں دم کر دیا۔

خوجی۔ اجی ہم نہ اٹھیں گے تاوقتیکہ قرولی نہ لا دو۔ بس اب بنا قرولی کے نہ بنے گی۔

آزاد۔ (دھپ لگا کر) بس اب بیہودہ نہ بکو۔ اٹھو ورنہ ایک لات بھی جماؤں گا۔

الغرض میاں آزاد اور میاں خوجی پھر راہ چلے۔

میاں آزاد آج کچھ تھکے بہت ہیں۔ واللہ اعلم کیا سبب ہوا۔ طبیعت ہی تو ہے۔ میاں خوجی چانڈو پینے، گپ اڑانے، خوشامد کرنے کے عادی۔ ان کو یہ تاب کہاں کہ منزلوں ٹٹو پر جائیں۔ سفر کی صعوبت کون سہے؛ دو دن جو منزلوں چلنا پڑا تو بول گئے اور بچے اتنا کہ بھر کس نکل گیا۔ بند بند درد کرتا ہے۔ عضو عضو ٹوٹ رہا ہے۔ میاں آزاد اور خوجی دونوں باتیں کرتے ہوئے پوقدمے جا رہے ہیں۔

خوجی سرا میں جا کر کوٹھڑیاں دیکھنے لگے۔ سرا بھر میں چکر لگا آئے لیکن کوئی کوٹھڑی پسند نہیں آئی۔ بھٹیاریاں پکار رہی ہیں کہ میاں ادھر آؤ ادھر۔ دیکھو خاصی صاف ستھری کوٹھڑی ہے۔ ٹٹو باندھنے کی جگہ الگ۔ اتنا کہنا تھا کہ میاں خوجی آگ ہو گئے۔ ٹٹو پھیر کر کہا کہ کیا؟ پھر تو کہنا۔ ٹٹو ی! ہشت یہ بیگو کا ٹانگھن ہے۔ ایک بھٹیاری نے چمک کر کہا کہ اے میاں ادھر آؤ۔ بیگو کے ٹانگھن کو ادھر باندھو۔ دوسری مسکرا کر بولی۔ اے بیگو کا ٹانگھن ہو یا خراسان کا گدھا۔ ادھر آؤ تو۔ یہ جھلانے لگے اور جب ان سب نے مل کر خوب بنایا تو چھری اور قرولی کی حضرت کو تلاش ہوئی۔ اس پر سرا بھر کی بھٹیاریاں تالیاں بجا بجا کر بنانے لگیں۔ تب تو میاں خوجی چکرائے کہ تو بہ ہی بھلی۔ اتنے دق ہوئے کہ ٹٹو ی کو انھوں نے وہاں سے تیز[1] کیا۔ اور سرائے کے باہر نکل آئے۔ باہر جو آئے تو آزاد نے پوچھا کہ کہو کیسی ہوئی۔ تو آپ فرماتے کیا ہیں کہ نہ بھئی چولھے گئے گئے گاؤں میں رہیں گے۔ یہاں سب کے سب شریر ہیں۔

آزاد۔ اے کمبخت وہ شریر ہوں یا نیک اس سے کیا واسطہ۔ یہاں جان پر بن آئی ہے آپ کو دل لگی ہاتھ آئی ہے۔ واسطے خدا کے کوئی کوٹھڑی تجویز نہ ہو۔ یا تم پڑے اپنی ایسی تیسی ہیں۔ میں خود جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر میاں آزاد نے گھوڑی کو تیز کیا اور بات کہتے سرا میں داخل ہوئے۔ ادھر ادھر گھوم گھام کر ایک کوٹھڑی تجویز کی اور اتر پڑے۔ میاں خوجی نے بھی ٹٹو ی پر سے زین پوش اتارا اور بستر جمایا۔

اب سنیے کہ سائیس پیچھے رہ گئے تھے میاں خوجی کو اپنے ہی ہاتھ سے سب کچھ کرنا پڑا۔ لید بھی اٹھائی اور گھوڑیاں بھی باندھیں اور گھانس بھی خرید لائے اور کھریرا بھی کیا۔ سرا والے سمجھے کہ یہ سائیس ہے۔

بھٹیارا۔ او سائیس بھیا ذرا گھوڑی کو ادھر باندھو

خوجی۔ (گردن پھیر کر) کس سے کہتا ہے بے۔ ابے سائیس کون ہے؛

بھٹیارا۔ پھر اور ہو کون؟

بھٹیارن۔ اے تو تیکھے کیوں ہو میاں۔ سائیس نہیں چرکٹے سہی۔

آزاد۔ یہ کیا بیہودہ تقصیر ہے۔ یہ ہمارے دوست ہیں یا سائیس؟

---

[1] تیز کیا۔

بھٹیاری نے چارپائی بچھا دی اور میاں آزاد لیٹے تو بخار کی وہ شدت کہ الامان۔ آنکھیں جل رہی ہیں اور بے چینی اور بے قراری بڑھتی جاتی ہے۔

خوجی۔ اب طبیعت کیسی ہے؟

آزاد۔ مر رہا ہوں۔

خوجی۔ الحمد للہ۔

آزاد۔ خدا کی مار تجھ پہ۔ دل لگی کا بھی کیا بھونڈا وقت اللہ آیا ہے۔ جی چاہتا ہے اس وقت زہر کھا لوں۔

خوجی۔ نوش جان اور اس میں تھوڑی سنکھیا بھی ملا لیجئے گا۔

آزاد۔ مر کمبخت

خوجی۔ اب بوڑھا ہو مردوں کس پہ۔ مرنے کے دن تو لد گئے۔

بھٹیاری۔ میاں کیسے ہو؟

آزاد۔ کیا بتائیں بی کیسے ہیں۔ مر رہے ہیں۔

بھٹیاری۔ کس پہ؟

آزاد۔ تم پر۔

بھٹیاری۔ علیؑ کی سنوار۔

آزاد۔ کس پر؟

بھٹیاری۔ (خوجی کی طرف اشارہ کر کے) ان پہ۔

خوجی۔ افسوس نہ ہوئی قرولی اس وقت۔

آزاد۔ ہوتی تو کیا کرتے؟

خوجی۔ بھونک لیتا اپنے پیٹ میں۔

بھٹیاری۔ ایسے حیادار ہوتے تو ننھے بڈھے نہ ہونے پاتے۔

آزاد۔ آپ خنجر کی جن کو ضرورت ہوتی ہے وہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے ہیں۔ اف بھئی کچھ تو علاج کرو۔

لکھنؤ

لکھنؤ میں میاں آزاد اور حضرت خوجی نے دو دن پڑاؤ کیا اور شہر کے دو مختلف مقاموں پہ ایک ایک شب بسیرا لیا۔ پہلی شب آغا میر کی سرا میں بسر کی۔ چوک سیر کو گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو رویہ بازار آراستہ۔ دکانیں قرینے سے سجی سجائی۔ اشیا سلیقے سے چُنی چنائی۔ حلوائی کی دکان شہد و شکر کی کان۔ تھالوں میں مٹھائی اور اُس پہ ورق نقرہ۔ گاہک پر گاہک آ رہے ہیں۔ افیمی پر افیمی لوٹے پڑتے ہیں۔ گوٹے والوں کی دُکان پر بھیڑ بھڑکا ہے۔ کوئی لالہ سے مول تول کرتا ہے کوئی منیب جی سے چکاتا ہے۔ صرافے میں کھنا کھن اور چھنا چھن کی آوازیں آتی ہیں۔ دور تک دُکان کی قطار ہے اور ہر دُکان میں اشرفیوں کا انبار ہے۔ دلالوں کی چاندی ہے۔ دو ایک گاہک مل گئے تو پو بارہ ہیں۔ بازار بھر میں کھڑے چکر لگا رہے ہیں۔ اُس سرے سے اِس سرے تک تاکتے جا رہے ہیں۔ جوہری کے دکانچہ جواہر نگار ہیں۔ جواہرات کے ڈھیر لگے ہیں۔ لالہ پنا مل کے دماغ ہی نہیں ملتے۔ جواہر رنگا رنگ اور گوہر شاہوار و لآلیِ آبدار دیکھ کر میاں آزاد کی آنکھیں کھل گئیں۔ لعل گراں مایہ کے نور و ضیا سے چکاچوند کا عالم ہے۔ کہیں یاقوت رمانی، کہیں زمرد سبز ریحانی۔ بزاز سراپا ناز کی دُکان پر وہ متاع دلفریب ہے کہ واہ جی واہ۔ انگریزی ہندوستانی، شہری جامدانی، جس قسم کا کپڑا چاہو لے لو۔ چھینٹ۔ ڈوریہ۔ اطلس۔ قاقم۔ سنجاب۔ بانات، ہر قسم کا کپڑا موجود مگر بادس روپیہ گز کہیں تو تین روپیہ گز بکیں۔ شالے سے شانہ چھلتا تھا۔ بادِ صبا کو بھی وقت سے بار ملتا تھا۔

کمروں کی طرف جو نظر کی تو بشاش ہو گئے مگر میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ بھئی یہ تو خلافِ تہذیب ہے۔ اس بازار سے آپ کو جلد نکال دینا چاہیئے۔ ان کے لیے تو ایک بازار خاص ہونا لازم ہے کہ لوگ وہاں جاتے ہوئے شرمائیں اور مارے خوف و لحاظ کے وہاں جانے سے باز آئیں۔ مسجدوں کو دیکھا کہ چھتیں پھٹی پڑتی ہیں۔ بھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہیں۔ نمازی تلاوتِ قرآن میں مصروف۔ خیر اس طرف کے لطف تو انھوں نے خوب اٹھائے۔ اب دوسری شب کو امین آباد کی سرائے میں آئے۔ اللہ اللہ۔ کیا شہر غدار ہے، کوسوں تک آباد۔ کروڑوں مکان، پدموں آدمی سنکھوں باشندے اللہ اللہ۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ شاہی میں اور بھی زیادہ آبادی تھی۔ اب تو گول دروازہ کے سامنے صاف شفاف میدان ہے اور اِدھر اُدھر اکثر محلے ویران اجڑے ہوئے مکانات گرے پڑے۔ مگر ہاں صدر کی طرف خوب گلزار ہے۔ صدر بازار اور امین آباد میں وہ رونق ہے کہ وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مکانات بھی عمدہ اور پختہ بنے ہیں۔ عمارات عالی شان، بنگلے صاف و شفاف اور باغ اس کثرت سے ہیں کہ اس سرے سے اس سرے تک باغ ہی باغ نظر آتے ہیں۔ سکندر باغ سبزہ زار ہی سبزہ زار ہے۔ بادشاہی باغ سراپا بہار ہے اور جس طرف نکل جائیے باغ کثرت سے پائیے۔

الغرض میاں آزاد اور خوجی نے یہاں خوب لطف اٹھایا۔ ہمارے رنگیلے جوان میاں آزاد اور ان کے سیلانی یار جانی میاں خوجی خانہ برباد نے لکھنؤ میں خوب سیر گشت کی۔ محمد و طبلچی کو طبلہ بجانے میں استاد پایا۔ بابا جی نے وہ ستار بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا۔ فرنگی محل ہے یا خطۂ یونان یا علما فضلا کی کان۔ اطبا میں ایک سے ایک برق۔ حکیم مرزا محمد جعفر کی طبابت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ بہ الشافی نسخے میں لکھنے بھی نہ پائے کہ مریض نے صحت کامل پائی اور شفا لے

عاجل حکیم سید محمد خاں صاحب کے مجربات ۔علوی خاں دہلوی کے مجربات سے کم نہیں ۔ معقولات میں استاد مسلم الثبوت خوش خلق، زندہ دل، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں ۔حکیم مرزا محمد حسین صاحب اور حکیم محمد ابراہیم صاحب کے گھرانے نے وہ دستگاہ کامل بہم پہنچائی کہ اودھ بھر میں شہرت پائی ۔ دور دور تک نام ہوا ۔ جو مریض ان سے رجوع لایا، فائز المرام ہوا۔ شعرا بھی باکمال ہیں ۔تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی اصناف سخن پر قادر، علم عروض کے ماہر ۔ اگلے شاعروں میں اب یہی تو باقی رہ گئے ہیں ۔خدا حضرت الیاس کی عمر عطا کرے ۔ گو بوڑھے ہو گئے مگر طبیعت جوان ہے ۔ ایک ایک شعر سے سچا لطفِ شاعری ٹپکتا ہے ۔ جو سنتا ہے احسنت و مرحبا کہتا ہے اور دادِ سخن دیتا ہے ۔ آفتاب الدولہ قلق اس زمانے میں غنیمت ہیں ۔ ناسخ میر درد مغفور کا نام انھوں نے خوب روشن کیا ۔مثنوی فصاحت مثنوی وہ تصنیف کی کہ قلم توڑ دیے ۔کیا صاف روزمرہ کا طرزِ بیان ہے ۔کیا بول چال کیا زبان ہے ۔ محمد جان شاد بھی بول چال اور روزمرہ کے استاد ہیں ۔

چوک میں جو سیر کرنے گئے تو بے اختیار بول اٹھے ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو، پھر غنیمت ہے نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

ایک دن پہلوانوں کی کشتی اور پھیتیوں کی دھینگا مشتی اور بکیتوں کی کثرت اور پھکیتوں کے کرتب اور بنوٹیوں کے کمال دیکھے تو گردن ہلائی کہ ہاں ابھی بانکوں سے لکھنؤ خالی نہیں ہے ۔ تراش خراش کا بھی لکھنؤ پر خاتمہ ہے ۔ یہاں کی مشاطگانِ چابک دست کی قسم کھانی چاہیے ۔ وہ گویا دہیں کہ واہ جی واہ ہندوستان کا فرانس لکھنؤ ہے ۔ وہاں مہینے میں ایک فیشن بدلتا ہے تو یہاں ہفتے میں پانچ ۔ میاں آزاد اور خوجی لطف تماشا دیکھتے ہوئے چلے جاتے تھے کہ اثنائے راہ میں ایک صاحب نئی وضع اور انوکھی قطع کے نظر سے گذرے ۔ حیرت ہوئی کہ الٰہی یہ کس فیشن کے آدمی ہیں؟ بالکل نئی گڑھت ہے ۔اب ان حضرت کی قطع ملاحظہ فرمائیے کہ از سرتا پا زرد ۔ زرد ۔ ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ زعفرانی کھپل بیٹ کا تین کمر توئی والا انگرکھا ۔ کیسری دو پلی مخے دار ٹوپی ۔ بسنتی کاندھوں پر بہت بڑا چھپکے کا رومال، عشاق زار کے چہرے کی رنگت اور ان سب میں لچکا ٹکا ہوا ۔ ماشاء اللہ سن شریف چہل و شش ۔ نازم بایں ریش فش ۔

آزاد ۔ کیوں بھئی خوجی بھلا تھانپو تو یہ کس ولایت کے ہیں ۔[1]

خوجی ۔ خراسانی سے معلوم ہوتے ہیں یا کابل کے ہوں ۔

آزاد ۔ کابلیوں کی یہ قطع کہاں؟

خوجی ۔ واہ خوب سمجھے ۔ارے میاں کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے؟

آزاد ۔ (قہقہہ لگا کر) ذرا حضرت کی چال تو دیکھئے گا ۔ کیسے کندھے جھاڑتے ہوئے پو قدمے چلے جاتے ہیں ۔ کبھی رومال پھڑکاتے ہیں کبھی انگرکھا چمکاتے ہیں ۔

خوجی ۔ آپ کو واللہ ذرا چھیڑیئے تو دل لگی ہی سہی ۔

آزاد ۔ یا حضرت آداب عرض ہے ۔ واللہ آپ کے لباسِ فاخرہ پر تو وہ عالم ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی ہے ۔ پائے نظر پھسلا جاتا ہے ۔

---

[1] تھانپنا = اندازہ لگانا ۔

زرد پوش (شرماکر) جی ایک خاص وجہ ہے۔

آزاد - وجہ خاص کیا؟ کیا کسی خاص سرکار سے وردی ملی ہے۔ یار سچ کہنا استاد کسی نائی سے تو نہیں چھین لائے ہو؟

زرد پوش (اپنے خدمتگار سے) رمضانی ذرا بتا تو دینا ہمیں اپنے منہ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رمضانی - حضور میاں کا نکاح ہونے والا ہے۔ مانجھے کے کپڑے پہنے ہیں۔ رسم ہے حضور۔

آزاد - لاحول ولا قوت۔ رسم کی ایک ہی کہی۔ کہاں کی رسم۔ کہنے لگے رسم ہے۔ واہ اچھی رسم ہے۔ یہ بدعت ہے یا رسم ہے؟ واسطے خدا کے ان کپڑوں کو اتارو۔ مردوں کی پوشاک پہنو۔ لاحول ولا قوت۔

زرد پوش - یہ تو سب ہی پہنتے ہیں۔

خوجی - ذری ہم سے تو چار آنکھیں کیجیۓ۔ ہاں صاحب کون سب پہنتے ہیں۔ آخر آپ نے کن سب کو دیکھا ہے؟ ہم کو سکھلاتے ہو۔

ایک رئیس کا دربار

میاں آزاد گھومتے گھامتے اور خوجی افیون کی پینک میں جھومتے جھامتے ایک نواب کے دولت خانے پر پہنچے۔ کوٹھی سجی سجائی، متعدد کمرے سب آراستہ و پیراستہ سجے ہوئے دُلھن بنے ہوئے ایک بڑے عالیشان کمرے میں فرش مکلف بچھا ہوا، دوسرے میں کرسیاں میز آرام چوکیاں مسہریاں کوچ قرینے سے آراستہ وہ سامان کہ نظر کو چکا چوند۔ جس نے دیکھا دنگ ہوگیا۔ خوجی اپنے نواب کے تزک و احتشام کو بھول گئے۔ جا کر باادب دونوں کے دونوں بیٹھے۔ خوجی تو نواب زادوں کی صحبت اُٹھائے ہوئے تھے، دیکھتے ہی کوٹھی کی اس درجہ تعریف کی کہ پُل باندھ دیے۔

خوجی۔ خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے کہ کیا سجی سجائی کوٹھی ہے، دُلھن ہے دُلھن۔ قسم ہے حسینؑ کی جو آج تک ایسی عمارت اور اس سج دھج کی تعمیر نظر سے گذری ہو۔ ہم نے تو اچھے اچھے رئیسوں کی مصاحبت کی ہے مگر واللہ ہے جو کبھی یہ ٹھاٹھ کہیں دیکھے ہوں خدا چشم زخم سے بچائے۔

مصاحب۔ ابھی ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے۔ یہاں دن عیدرات شب برات ہے۔

نواب۔ کیوں صاحب یہ فرامشن بھی جادوگر ہیں شاید۔ آخر جادو نہیں تو اور ہے کیا؟

رفیق۔ بجا ارشاد ہوا پیر و مرشد۔ جادو ہی ہے جادو برحق کرنے والا کافر۔ یہ سب ساحر ہیں۔

مصاحب۔ خداوند ایک فرامشن سے مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں آپ جانیے کتنا کائیاں[1]۔ حضور میں نے اُن سے خوب یارانہ پیدا کیا۔ بڑی گہری دوستی ہوئی۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ کیوں یار سچ کہنا یہ فرامشن کیا شے ہے۔ آخرش اس کا راز تو بتاؤ۔ انھوں نے کہا تو پھر فری مشن ہی کیوں نہیں ہو جاتے کہ کسی سے پوچھنے کی حاجت ہی نہ رہے۔ میرے بھی دل پہ آگئی۔ ایک دن اُن کے ساتھ فری مشن ہوئے۔ وہاں حضور کروڑوں لاشیں تھیں اور سب کی سب مجھ سے گلے ملیں اور ہنسیں۔ میں بہت ہی ڈرا۔ مگر ان لوگوں نے دلاسا دیا کہ کچھ پاگل ہے۔ ایسے خوف کیا کرتا ہے لیکن خبردار کسی سے کہنا نہیں ورنہ یہ لاشیں کچا ہی کھا جائیں گی۔ اتنے میں خداوند آگ برسنے لگی اور میں جل بھن کر خاک ہوگیا۔ اس کے بعد ایک شخص نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو بندۂ درگاہ ہٹے کٹے ٹیاں سے موجود۔ تب تو بندہ کفن پھاڑ کر چیخ اٹھا اور بھاگنے لگا مگر سب کے سب چمٹ گئے اور گھسیٹ لے گئے۔ لیکن حضور سچ تو یہ ہے کہ کوئی دوسرا ہو تو رو دیتا، میں مستقل رہا۔ لیکن یہ کہتا تھا کہ میں فرامشن نہ ہوں گا نہ ہوں گا۔ تب تو ایک لیم و شحیم آدمی نے مجھے ایک حوض میں ڈھکیل دیا اور وہاں میں دو دن دو رات رہا۔ بالکل مردہ و افسردہ۔ آخرش نکالا گیا اور سب کی صلاح ہوئی کہ یہ کھوٹا آدمی ہے۔ اس کو یہاں سے نکال دو۔ ہم نکالے گئے۔ خداوند گردن ناپی گئی۔ خدا خدا کر کے بچے ورنہ جان ہی پر بن آئی تھی اور عزت ہی گنوائی تھی۔

میاں آزاد نے جو یہ جھوٹی داستان سنی تو آگ بھبوکا ہوگئے۔ سوچے کہ اللہ اکبر۔ ان نوابوں کے مصاحب بھی کیا بے پر کی اڑاتے ہیں اور کیسے ذٹل قافیے ملاتے ہیں اور رئیسوں کے کیسے جلد دم میں لاتے ہیں اور وہ بھی کس سادگی سے ہر امر کو آمنّا و صدقنا تسلیم فرماتے ہیں کہ الاماں۔ اس گپ کو تو دیکھئے، دو دن دو رات آپ حوض ہی حوض میں مردہ و افسردہ پڑے رہے۔ سبحان اللہ کیا خوب تحقیقات فری مشن کی

---

[1] کائیاں۔ چالاک۔ چلتا پرزہ۔

کی ہے۔ کہنے لگے کہ کروڑوں لاشیں تھیں اور سب کی سب بول رہی تھیں۔ اس کذب پر شیطان کی پھٹکار۔ لاحول ولاقوۃ۔

رفیق۔ حضور اس سحر کو بھی خدا نے کیا زور بخشا ہے؟ سنا ہے کہ کامروپ میں عورتیں جہاں مرد سے ملتفت ہوئیں اور بس ماش پڑھ کر پھونکے اور بکرا بنا دیا۔ بیل بنا دیا۔ گدھا بنا دیا۔

خوشامدی۔ پیر و مرشد یہ موٹھ کیا شے ہے؟ کل شب کو حضور تو یہاں پڑے آرام فرماتے تھے۔ بس دو بجے کے قریب قرآن شریف پڑھ کر ٹہلنے لگا تو حضور کے سرہانے پر اوپر آسمان پر روشنی سی ہوئی۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔

رفیق۔ اور ہوش اڑ جانے کی تو بات ہی ہے۔

خوشامدی۔ جی اس میں کیا شک ہے۔ بس خداوند میں رات بھر جاگتا رہا اور حضور کے پلنگ کے اردگرد چوکی پہرا دیا کیا۔ ایک ہانڈی سی تھی۔ اور اس میں کوئی شے ایسی جلتی تھی جیسے گیس کی روشنی۔

نواب۔ (کانپتے ہوئے) تمھیں قرآن کی قسم۔

خوشامدی۔ پیر و مرشد حضور کے طفیل میرے بال بچے پرورش پاتے ہیں۔ بھلا آپ سے اور جھوٹ بولوں۔ نمک کی قسم، سچ عرض کرتا ہوں، رونگٹا رونگٹا بدن کا کھڑا ہو گیا۔ گھنٹوں سہما رہا۔ اگر میرا باپ بھی سوتا ہوتا تو پہرا نہ دیتا مگر حضور کا نمک جوش کرتا تھا۔

رفیق۔ حضور ان باتوں کو جانے دیجئے۔ اب یہ فرمائیے کہ سمند سیاہ زانو جوڑی بکاؤ ہے۔ حضور خریدیں تو دکھاؤں۔ کیا جوڑی ہے کہ اُہو ہو ہو۔ ڈیڑھ ہزار سے کم نہ دے گا۔ حضور ہی کی سواری کے قابل ہے۔

مصاحب۔ اسے تو آپ نے خرید کیوں نہ لی۔ اتنی تعریف کرتے ہو اور اور پھر ہاتھ سے دے دی۔ پیر و مرشد ان کو اجازت دیجئے کہ بس خرید ہی لائیں۔

نواب۔ کوئی ہے۔

مصاحب۔ ارے کوئی ہے۔ ارے کوئی ہے (کئی آدمی چلا اٹھے)؟

خدمت گار۔ حاضر خداوند، پیر و مرشد، حضور (دس پندرہ آوازیں)۔

نواب۔ دو ہزار روپیہ روشن علی کو ابھی دو اور دو سائیس ان کے ساتھ بھجواؤ اور ایک سپاہی ابھی جائے ابھی۔

نواب کے حکم کی دیر تھی کہ لالہ نے مہاجن کے گھر کی راہ لی۔

لالہ۔ لالہ جواہر مل۔ سرکار نے بھیجا ہے۔ اس وقت ایک دو ہزار کی ضرورت ہے، جلد لائیے۔ میرا بھائی دیر نہ لگانا ورنہ میں نکال دیا جاؤں گا۔

جواہر مل۔ تو جلدی کاہے کی ہے۔ ذرا دم لو۔ حقہ وقہ پیو۔ آخر یہ روپیہ کیا ہو گا کیا۔

لالہ۔ ایک جوڑی لی جاوے گی روشن علی کی معرفت۔

روشن علی۔ (لالہ کے کان میں) استاد [illegible] ہم کو بدنام نہ کر دیا ر بھئی چار سو کی جوڑی ہے۔ باقی رہے سولہ سو۔ اس میں سے آٹھ سو اور حوالی موالی کو جائیں گے کسی کو سو کسی کو پچاس۔ باقی رہے آٹھ سو۔ چھ سو ہمارے دو سو تمھارے۔ بھئی معاملے کی بات ہے۔

لالہ۔ تم تو لو چھ سو اور ہم لیں دو سو اچھا معاملہ ہے۔ میاں بھائی ہونا۔ ارے یار تین سو ہم کو دے۔ پانچ سو تو اُڑا۔ یہ البتہ معاملے کی بات ہے۔

روشن علی۔ اجی میاں بھائی کی نہ کہیے۔ میاں بھائی تو نواب صاحب بھی ہیں آخر۔ مگر اللہ میاں کی گائے اور یار تم اڑگ تو وہ لیس کی گانٹھ

ہو کہ تمھارے کاٹے کا تو منتر ہی نہیں۔ لاکھوں روپیہ کھا جاؤ مگر گزی کی لنگوٹی لگائے ہو۔

الغرض لالہ جواہر مل نے دو ہزار چہرہ شاہی تڑاتڑ گن دیے اور لالہ نے روشن علی کو تین سو کم دو ہزار یعنی سترہ سو روپیہ دیئے۔ میاں روشن علی نے سوا چار سو کی جوڑی خریدی اور اسی وقت لے جا کر نواب نامدار کو دکھائی اور کہا کہ کوڑیوں کے مول خریدی ہے۔

مصاحب۔ اُہو ہو ہو۔ گھوڑی کیا پرستان کی پری ہے۔ ایسی ہمرنگ جوڑی دیکھی نہ سنی۔

رفیق۔ کیا ذری سی تھوتھنی ہے۔ کیا چوڑی پیشانی ہے!

خوشامدی۔ واللہ کنوتیاں تو دیکھیے ہائے پیار کر لینے کو جی چاہتا ہے۔

زمانہ ساز۔ حضور ایسے جانور قیمتوں سے ملتے ہیں۔ واللہ جناب باری کی قسم شہر بھر میں اس کے ساتھ کی دوسری جوڑی نہیں نکلے گی۔

خود مطلب۔ اس میں کیا شک ہے مگر بھئی بڑے سستے داموں میں آئی۔ واللہ دو ہزار کی ایک ایک گھوڑی ہے۔ کیا خوب ہاتھ پاؤں ہیں۔ واللہ اور لطف یہ کہ کوئی عیب نہیں۔

نواب۔ بھئی اس کو حفاظت سے بندھواؤ۔ کل شام کو فٹن میں جوتنا۔ دیکھیں کیسی جاتی ہے۔

زمانہ ساز۔ اے خداوند سبحان اللہ آندھی کے موافق جائے، بگولا بن جائے کیا دل لگی ہے کچھ ؎

قدم باز ایسی گویا زیر پا امواج دریا ہے
سبک خیز اس قدر ہلنے نہ پائے پیٹ کا پانی

حُسن آرا کی بیقراری اور خیال میاں آزاد میں گریہ وزاری

درون سینہ من زخم بے نشاں زدۂ　　بحیرتم کہ عجب تیر بے گماں زدۂ
کجا روم بکہ گویم بکو چہ چارہ کنم　　کہ تیرِ عشق مرا اندرونِ جاں زدۂ

اس وقت حُسن آرا فرطِ طرب سے آپ ہی آپ مسکراتی تھی اور چلبلے پن کے مارے کھلکھلائی جاتی تھی کہ دفعتاً سارا لطف کرکرا ہوگیا، سامان تازہ مہیا ہوگیا، عین مستی میں بصد شوخی ہر طرف گھوم رہی تھی اور جوانی کے نشہ میں جھوم رہی تھی کہ دور سے کسی شخص نے خوش آوازی سے گانا شروع کیا کہ (جب سے گیو موری سدھ ہی نہ لینی۔ کیسے کٹھور کٹھور) یہ سنتے ہی طوفانِ غم تو رسینہ میں جوش زن ہوا۔ رنج و فراق میں سر دھننے لگی۔ کبھی چیخی اور چلّائی، کبھی پھول کی پنکھڑی کو سونگھ کر کہا کہ اس میں اُس گُل عذار کی بو ہے، کبھی سنبل کی طرف نظر ڈال کر کہا کہ ایسا ہی وہ عنبریں مُو ہے۔

پیرمرد جیسے یعنی وہی ملاح ملیح حسنِ اتفاق سے باغ کی طرف جو گذرا تو دیکھا کہ حسن آرا دیوانہ وار اِدھر اُدھر پھر رہی ہے، سمجھا کہ رنگ و رو باختہ حضرت عشق کی ساختہ پرداختہ ہے۔ تاڑ گیا کہ آزاد یاد آئے زلف کھلی اور آشفتہ بال بکھرے ہوئے مین بے خودی کے عالم میں ہے۔

پیر مرد۔ (قریب جا کر) حسن آرا۔ پیاری حسن آرا۔

حسن آرا۔ (پیچھے پھر کر) کیا کہا۔ پیاری! کس کی پیاری!! ہائے ہائے کس کی پیاری!!! آزاد کی پیاری۔ اپنے پیارے آزاد کی پیاری، اپنے آنکھوں کے تارے آزاد کی پیاری۔ آج سے ہمیں پیاری نہ کہنا سنا بڈھے۔ خبردار جو پیاری کہا تو جانے گا۔

پیر مرد (کانپتے ہوئے) حسن آرا تمھاری تقریر سے ہمیں خوف معلوم ہوتا ہے کہ اب تم بہکنے لگیں۔ میں تو تم کو اپنی بیٹیوں کے برابر سمجھتا ہوں۔ کیا اولاد والدین کی پیاری نہیں ہوتی؟

حسن آرا۔　　از سر بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب　　دردِ مندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

پیر مرد۔ اس آہ و زاری سے خدا بُرا مانتا ہے۔ یہ سوءِ ادب ہے۔

حسن آرا۔　　ہائے وہُوئے عاشقاں در پیش رب　　سوزشِ عشق ست نے ترکِ ادب

پیر مرد۔ اس وقت سبزہ زار کو دیکھو۔ باغ و بہار کو دیکھو۔ دو گھڑی جی خوش کرو۔ دل بہلاؤ۔

حسن آرا۔　　ہے گُل عذار جانے گلستاں میں کیا کیا　　ہاں یہ کیا کہ داغ کہن کو نیا کیا

اتنے میں پیرمرد کو سوجھ گئی کہ میاں آزاد کی تصویر لا کر حسن آرا کو دکھا دوں۔ دوڑ گئے اور جھپٹ کر لے آئے۔

پیر مرد۔ (تصویر دیکر) لو ہم نے میاں آزاد کو یہاں ہی بلا دیا نہ، کہو گی ہیں وہی یا اور کوئی؟

حسن آرا۔ واہ!

قانع بہ تجلی نہ شود شائقِ دیدار　　پروانہ بے مہتاب تسلّی نتواں کرد

اس تصویر میں گویائی کہاں۔ وہ شوخی تو مصور نے کھینچی ہی نہیں۔ اس چشمک زنی کا عکس تو اُتارا ہی نہیں۔ وہ رُخسارِ آتشیں کے

رنگ کا متغیر ہونا تو دکھایا ہی نہیں۔ وہ بات بات پہ بانکپن اس میں کہاں نظر آتا ہے۔ وہ خوش الحانی وہ طرزِ غزل خوانی تو دکھائی ہی نہیں دیتا۔ منہ سے پھول دمِ تقریر تو جھڑتے ہی نہیں۔ آنکھوں کے لال لال ڈورے تو سوجھتے ہی نہیں۔

اتنے میں حسن آرا کی چھوٹی بہن سپہر آرا دوڑی آئی۔

سپہر آرا۔ بہن بہن۔ اس وقت وہ خوش خبری سنائیں کہ تم بھی یاد کرو۔

حسن آرا۔ ہم تو اسی دن خوش ہوں گے جب میاں آزاد پھاٹک پر آن کھڑے ہوں گے۔

سپہر آرا۔ اللہ میرا جاتا ہے کہ اُچھل پڑو۔ یہ لو میاں آزاد کا خط آیا ہے۔ احسان تو نہ مانو گی۔

حسن آرا۔ چل جھوٹی۔ ایسا ہمیں کوئی دیوانہ بنایا ہے؛

سپہر آرا۔ خاتونِ جنت کی قسم۔ یہ لو پڑھ لونہ۔ اُدھر دیکھو۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

حسن آرا۔ یہ نامہ آزاد آیا۔ یا مسیح دمِ فریاد آیا؛

سپہر آرا۔ پڑھوں۔ سنیے:۔

تین چار دن میں بمبئی سے مثل نظر رواں ہوں گا اور میرا جہاز بہت جلد قسطنطنیہ کے قریب لنگر انداز ہوگا۔ شکست و فتح کا حال خدا جانے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تم راتوں کو مجھے یاد کرکے چونک پڑتی ہوگی۔ میری تصویر ہر دم تمھارے روبرو رہتی ہوگی۔ لطف صحبت آنکھوں میں پھرجاتا ہوگا اور بعض اوقات تم دیوانوں کی طرح سر پٹکتی ہوگی، مگر میرے استقلال کو دیکھو کہ محبوب مطلوب کے حکم کی تعمیل کے لیے میں نے کیا کیا گوارا کیا۔ اک اشارے کی دیر تھی کہ ٹرکی کا جانا فوراً منظور کر لیا۔ سربازوں اور سچے عاشقوں کا یہی کام ہے "نہ عشق خام ہے اور عاشق برائے نام۔

راہ میں بخار نے ناک میں دم کر دیا۔ اب خدا کے فضل سے صحیح و سالم ہوں۔ میاں خوجی راہ میں خوب تماشے دکھلاتے ہیں۔ ایسا مسخرہ کبھی کم دیکھا ہوگا۔ خیر، یار زندہ صحبت باقی، جیتے ہیں تو پھر ملیں گے۔ ورنہ جس دن لیلیٰ اور مجنوں۔ شیریں اور فرہاد کا نکاح ہوگا اسی دن ہم تم دولہا اور دلھن بنیں گے۔ خدا حافظ۔ بمبئی سے اپنی روانگی کا تار بھیجوں گا۔ (آزاد خستہ جان)

سرا میں خوجی پر بے بھاؤ کی پڑیں اور بوا زعفران پنجے جھاڑ کے لڑیں

ایک دن پچھلے پہر کھٹملوں نے میاں خوجی کا ناک میں دم کر دیا۔ بدن بھر کا خون جونک کی طرح پی لیا۔ حضرت بہت ہی جھلائے۔ انیمی آدمی چار پہر آنکھوں میں رات کٹی۔ پچھلے سے ذرا آنکھ لگنے کو تھی ہی کہ کھٹملوں کا خدا بھلا کرے، انھوں نے انگر کھا لہولہان کر دیا اور انھوں نے پلنگ سے چونکتے ہی غل مچایا کہ (لانا میری قرابینچہ) یہ ہانک جو انھوں نے لگائی تو آس پاس والوں کی نیند حرام ہو گئی۔ معاً چور کا گمان ہوا۔ لینا لینا جانے نہ پائے۔ چور چور ارے میاں کہاں کدھر۔ کس رخ لینا پکڑ لیا ہے۔ دیکھو گھانسے[1] رہنا۔ کھدیڑ[2] خوب کھدیرو۔ بھئی مسافر ہوشیار۔ اپنے اپنے مال کی حفاظت کرو۔

اب سرائے بھر میں ہلڑ مچا ہوا ہے۔ ہڑبونگ کا عالم ہے۔ کوئی آنکھیں ملتا ہوا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے۔ کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کے اپنی گٹھری کو دیکھ رہا ہے کوئی مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے ہوئے دبکا پڑا ہے۔ میاں خوجی نے جو لینا لینا جانے نہ پائے چور چور کی آواز سنی تو خود بھی غل مچانا شروع کیا کہ (ہائیں! ہائیں! خبردار جانے نہ پائے لانا میری قرولی اچور اوگیدی۔ ٹھہرا رہنا کہ میں بھی قرولی لے کر آن پہنچا) ۔ یہ خبر ہی نہیں میاں کو کہ یہ شگوفہ حضرت ہی نے چھوڑا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ٹھہرا رہنا میں بھی قرولی لے کر آن پہنچا۔ میاں خوجی جو گرمائے تو چھپر کھٹ سے اٹھ ہی کھڑے ہوئے اور لپک پڑے۔ اب آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہے ہیں کہ لینا لینا لینا۔ ایں معقول! لینے کے عوض کہیں دینے نہ پڑ جائیں۔ لپکے تو بھٹیاری کو ڈپٹ لیا اور فرمایا کہ تو ہی چور ہے۔ بھلا بے بھلا پکڑ لیا۔ حریف کو بھٹیاری نے کہا میاں کچھ خیر تو ہے ہوش کی باتیں کرو۔ اتنے میں آپ نے دوڑنا شروع کیا۔ پینک میں سوجھ گئی کہ چور آگے بھاگا جاتا ہے۔ دوڑتے دوڑتے ٹھوکر جو کھاتے ہیں تو اڑا اڑا دھوں۔ میاں خوجی اپنی شامت اعمال سے گرے بھی تو کہاں جہاں کمہار کے ہنڈے رکھے تھے۔ گرنا تھا کہ کئی ہنڈے چکنا چور ہو گئے۔ کمہار نے للکارا کہ چور چور یہ اٹھنے کو تھے کہ اس نے آن کر دبوچ لیا اور پکارنا شروع کیا کہ ارے دوڑو چور پکڑ لیا۔ مسافر اور بھٹیارے اور بھٹیاریاں اور حوالی موالی سب کے سب دوڑ پڑے۔ کوئی ڈنڈا لیے ہے کوئی لٹھ باندھے۔ کوئی بید گھماتا ہے کوئی لکڑی ہلاتا ہے مگر افسوس ہے کہ میاں خوجی کے پاس قرولی نہ قرابینچہ۔

اندھیری رات گھٹا ٹوپ اندھیرا چو طرفہ چھایا ہوا کسی کو کیا معلوم کہ یہ چور ہے یا میاں خوجی۔ بگڑے دل آدمیوں کو شکار ہاتھ آیا خوب بے بھاؤ کی حضرت پر پڑنے لگیں۔ یار لوگوں نے تاک تاک کر ناؤ کے ہاتھ لگائے۔ اب خوجی کی سٹی بھولی۔ نہ قرابینچہ یاد رہا نہ قرولی، جب خوب پٹ پٹا چکے تو ایک مسافر نے کہا کہ بھئی ذرا ٹھہرو تو یہ تو خوجی جو اس کوٹھری میں پانچ سات روز سے ٹکے ہوئے ہیں چراغ جلایا گیا تو معلوم ہوا کہ تیرہ صدی کے بالشتیے میاں خوجی ہی ہیں۔ کمہاروں کو لوگوں نے للکارا کہ چھوڑ دے۔ ہنڈوں کے دام ہم دے دیں گے۔

---

[1] گھانسنا = گھیرنا [2] دوڑانا

الغرض بعد خرابی بصرہ میاں خوجی کی جان بچائی مگر کب جب کچھ مر نکل گیا۔ انجر پنجر الگ ہو گئے۔ جب یاران سرپل نے چپت گاہ کو خوب سہلا دیا تو میاں خوجی چلے۔ میاں آزاد سے بھی کسی نے کہہ دیا تھا کہ تمہارے ساتھی خوجی چوری کی علت میں پھنسے ہیں۔ کسی مسافر کی ٹوپی چرائی تھی سو اس نے پکڑ لیا۔ دوسرے نے آن کر کہا کہ نہیں یہ نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک کمہار کی ہنڈیاں چرانے گئے مُنہ کی کھائی جاگ ہو گئی بھئی واہ۔ جتنے منہ اتنی ہی زبانیں اور اتنی ہی باتیں۔ اسی دم کی بات اور مختلف روایتیں مشہور ہو گئیں۔

میاں آزاد کو بڑا ہی برا معلوم ہوا کہ ہمارا ساتھی اور چوری کی علت میں ماخوذ ہو مگر یہ بات ان کو جچی نہیں۔ سوچے کہ خوجی ایسے آدمی ہیں نہیں۔ وہ چوری چکاری کیا جانیں، وہ تو بس فقرہ بازی ہی خوب جانتے ہیں اور بھلا چوری چکاری بھی کرتے تو ہنڈیوں کی۔ خیر انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ چلیں اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ خوجی صاحب جھومتے چلے آتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ بات تیرے گیدی کی۔ بڑا آزاد بنا ہے۔ ایسے آزاد بہت دیکھے ہیں۔ مردود چارپائی پر پڑا خرخر کیا اور ہماری خبر ہی نہیں۔ اب بڑبڑاتے ہوئے میاں آزاد کی گلی تک چلے آئے مگر آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ، اتنا بھی نہ سوجھا کہ آزاد کھڑے ہیں۔ جب قریب پہنچے تو میاں آزاد نے یوں کہا۔

آزاد ۔ خیر ہم کو تو پیچھے گالیاں دینا، اب یہ بتاؤ کہ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹے؟

خوجی ۔ ہاتھ پاؤں! یہ لوہے کی سلاخیں ہیں۔ آپ اس وقت ہوتے تو دیکھتے کہ بندۂ درگاہ نے کیا کیا جوہر دکھائے، پچاس آدمی گھیرے ہوئے پورے پچاس۔ ایک کم نہ ایک زیادہ۔

راوی ۔ درست۔ اُس وقت آپ کو اتنا ہی تو ہوش تھا کہ آدمی گننے بیٹھتے۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ پڑیں کتنی۔ آدمی بھی مکھی کے جوڑ ہوئے کہ خول میں جھپاک سے گن لیے۔ مارے چپتوں کے بولا تو گئے تھے مگر بے حیا کی بلا دور۔ جھاڑ پونچھ کر پھر موجود۔

خوجی ۔ بس یہ کیفیت تھی کہ دس آدمی اس شانے کو اور دس ہی اس شانے کو پکڑے ہوئے تھے اور میں جو پھیرا تو کسی کو اُنٹی دی دھم سے زمین پر گرا۔ کسی کو کولے پر لاد کر مارا کھٹ سے چھپر کھٹ کی پٹی پر۔ دو چار میرے رعب میں آ کر تھرا تھرا کر گر ہی تو پڑے۔ دس پانچ کی ہڈی پسلی چکنا چور کر دی۔ یہ ڈھیلکی کھائی وہ ہو رہا۔ اِدھر بگلا اُدھر ابھرا۔ گھس پیٹھ میں تو پھر آپ جانیے اینجانب یکتا دم ہی ہیں۔ جو سامنے آیا نیچا دکھایا، جو منہ چڑھا مُنہ کی کھائی۔

خیر، میاں آزاد اور خوجی دونوں اس وقت سو رہے اور دوسرے روز شام کو نواب صاحب کے ہاں پہنچے۔

آزاد ۔ پیرومرشد رخصت ہونے آیا ہوں۔ زندگی ہے تو پھر ملوں گا ورنہ یہ آخری الوداع ہے۔

نواب ۔ کیا کوچ کی تیاری کر ہی دی، بھئی جب واپس آ ئے تو ملاقات ضرور کرنا، بھول نہ جانا۔

آزاد ۔ بھلا یہ آپ کے فرمانے کی بات ہے۔

خوجی ۔ غلام بھی رخصت ہوتا ہے۔

نواب ۔ آپ تو واللہ بڑے ہنسوڑ آدمی ہیں۔ کہیئے اب بشرط خیریت کبھی ملئے گا بھی؟

خوجی ۔ خدا لائے گا تو آؤں گا حضور۔

داروغہ ۔ میاں خدا کرے سب کے پہلے انھیں پر گولی پڑے بلکہ گولہ اور وہ بھی بم کا گولہ۔ اب خدا اس منحوس کی صورت نہ دکھائے اور نہ اس مردک کو یہاں لائے۔

الغرض آزاد اور خوجی نواب صاحب سے رخصت ہوئے۔

۱؎ لیکن

نواب - فی امان اللہ خدا بخیریت پہنچائے اور واپس لائے۔

خوجی - داروغہ جی خدا حافظ۔

داروغہ نے کہا۔ میاں آزاد کو امام ضامن اور خوجی کو شیطان کو سونپا۔ آزاد اور خوجی رخصت ہوئے تو پھاٹک سے باہر نکل کر میاں خوجی نے کہا بھئی ذرا ٹھہرے رہنا میں ابھی ابھی آیا۔ آپ کو جو وحشت نے گھیرا تو پہنچے زنانی ڈیوڑھی پر۔

خوجی (دربان سے) یار پچے ذرا بوا زعفران کو نہیں بلا دیتے!

دربان تھا گنوار کا لٹھ گوکھا آدمی اس نے اُن کو تپائی دی کہ آپ بیٹھیے۔ یہ بیٹھے تو پینک میں سر یہ چلا وہ چلا اب کوئی دم کے دم میں زمین دوز ہوا ہی چاہتا ہے۔ اتنے میں دربان نے آواز دی کہ بوا زعفران! بوا زعفران!! اجی بوا زعفران!!! اے بوا زعفران۔ بوا زعفران بولیں۔ اے ہے تو، کچھ کہو گے بھی یا بوا زعفران ہی پکارتے جاؤ گے۔ دماغ کے کیڑے تک چاٹ گئے۔

دربان - اجی آپ کے لڑکے وہ۔ توبہ۔ تمھارے میاں آئے ہیں۔

دربان بے وقوف نے بیچے (لڑکے) کہہ کر میاں کا لفظ جو کہا تو گھر بھر کی عورتیں کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور بیگم صاحب ہنستے ہنستے بولیں کہ اچھے گنوار کو ڈیوڑھی پر بٹھایا ہے اس نے بھرغل مچایا کہ اجی بوا جی آگئے دیکھیے تو ان کا حال کیا ہے۔ ابھی تو خاصے بھلے چنگے تھے۔ ابھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ بوا زعفران سے اور اُن کے میاں سے لاگ ڈانٹ تھی وہ جو گھبرائی ہوئی اندر سے آئی تو ان کو دیکھا کہ تپائی پر بیٹھے پینک میں جھوم رہے ہیں۔

اب یہ لطیفہ بھی سننے کے قابل ہے کہ بوا زعفران کے میاں کی بعینہٖ یہی قطع مبارک تھی خوجی سے بالکل مشابہ ذرا فرق نہیں۔ وہی سوا بالشت کا قد۔ وہی دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں اور طرّہ یہ کہ افیون بھی پیتے تھے اور زعفران ان سے روز کہا کرتی تھی کہ تم افیون کھانا چھوڑ دو۔ وہ کب چھوڑنے والے تھے اور اسی سبب سے دونوں میں دم بھر نہیں بنتی تھی۔ آخر کار ایک روز اس کے میاں نے کہا کہ اچھا آج سے اگر ہم کو پینک میں دیکھو تو گن کر پانچ سوجوتے لگاؤ اور جو بھول جاؤ تو پھر سرے سے گنو۔ زعفران نے جو باہر آکر دیکھا تو حضرت موجیں لے رہے ہیں۔ جُل بھُن کر خاک ہی تو ہو گئی اور جاتے ہی میاں خوجی کے پٹے پکڑ کر ایک دو تین چار پانچ دھپیں تڑ تڑ لگا ہی تو دیں۔ وہ جشن دیوانی نواب کے یہاں رتیں کھا کھا کر ہتنی بنی پھرتی تھی۔ یہ بیچارے سوا بالشت کے آدمی۔ اس نے ان کو چُرمُر کر ڈالا مگر یہ قرولی ہی مانگا کیے ساتنے میں غل غپاڑے اور دھر پکڑ کی آواز جو بلند ہوئی تو اصیلیں مغلانیاں، ماما چھوچھو لونڈیاں سب باہر نکل آئیں اور بیگم صاحب اور عصمت النساء بیگم اور گیتی آرا بیگم سب کے سب پردے کے پاس دوڑیں کہ دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔

بیگم صاحب - بوا زعفران آخر یہ ہے کیا۔ روئی کی طرح اس بے چارے کو تو م کے دھر دیا۔ واہ

عصمت النساء بیگم - اوئی توبہ ایسی جورو کسی کی ہو ہاتھ ہی ٹوٹیں مردار کے۔ ادھ مرا ہی کر ڈالا۔

مغلانی - حضور زعفران کا قصور نہیں۔ یہ اس مردوے کا قصور ہے جو جوروا کے ہاتھ بک گیا ہے (خوجی کا کان پکڑ کر کہا) چھٹے سے منہ جُھوا کے ہاتھ سے جوتیاں کھاتے ہو اور ذرا چوں نہیں کرتے)۔

خوجی - جوروا! ہائے افسوس۔ اجی یہ جورو کس مرنے کی ہیں؟ خدا خدا کرو۔ بھلا میں اس بٹر دنگی دیو کی بچی کالی کلوٹی ڈائن کے ساتھ بیاہ کرتا۔ یہ اس کو اس وقت سوجھی کیا کہ مارکے بھُرکس نکال دیا اور دانت کٹکٹا کر بوٹیاں تک نوچ ڈالیں۔ یہ ہے کون بلا میرے تو حواس برجا نہیں۔

بوا زعفران نے جو یہ باتیں سنیں تو وہ آواز ہی نہیں، وہ لب ولہجہ ہی نہیں۔ غور کر کے دیکھتی ہے تو میاں وہاں کوئی نہیں یہ تو کوئی اور ہی ہے۔ ع کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ چہرہ زرد ہو گیا اور دانتوں تلے انگلی دبا کر خاموش ہو رہی۔

مغلانی۔ اے ہاں یہ ہے کون۔ پہچانا گیا تو نہیں ہیں۔

عباسی۔ (ہنس کر) اے واہ بوا زعفران اب تو راہ چلتوں کو بھی میاں بنانے لگیں۔ ذرا پہچانو تو یہ ہیں کون؟

فرخندہ ۔ اوئی یہ تو بے چارے نواب صاحب کے یہاں دن رات بنے رہتے تھے۔ یہ یہاں کیسے آئے۔ اے زعفران آخرش تم کو سوجھی کیا۔ قدری مثال (مشعل) جلا کر تو دیکھو تو چھپا کے آبا ہی ہیں۔

اتنے میں نواب صاحب سے کسی نے جا کر ساری داستان کہہ دی اور محفل بھر میں حاضرین پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگے کہ بھئی واللہ، یہ نئی روایت ہے۔ اس پر میاں ندرت بولے کہ بھئی ان کو یہاں تک تو لاؤ دیکھیں تو ہیں کون بزرگ، خدمت گار پہنچے تو میاں خوجی کو لے آئے۔

حاضرین۔ ایں! ارے میاں یہ تو خوجی ہیں لاحول ولا قوۃ۔

ہنسی کے سمندر پر ایک اور تازیانہ ہوا اور کل حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے۔ اب ادھر نواب صاحب اور ان کے مصاحب قہقہہ لگاتے ہیں۔ ادھر گھر سے قہ قہ کی صدائیں بلند ہیں اور خوجی اپنے دل میں خفیف کہ یکے نقصانِ مایہ دیگر شماتتِ ہمسایہ ایک تو خوب پٹے۔ دوسرے لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ نواب صاحب نے زعفران کو اندر سے بلوایا مگر خدمت گار نے کہا کہ حضور، وہ تو نہیں آتیں، پردہ کے پاس کھڑی رو رہی ہیں۔

خوجی۔ اس مکر کو دیکھیے گا حضور۔ رونا ہم کو چاہیے الٹا وہ رو رہی ہیں۔

ندرت۔ بھئی تم کو میاں بنایا۔ رونے سے بھی گئی گذری۔

نواب۔ زعفران کی سزا ہم نے یہ تجویز کی ہے کہ خوجی کو دے دی جائیں۔

خوجی۔ بس غلام کے حال پر رحم کیجیے۔ معاف فرمائیے بندہ درگذرا۔ غضب خدا کا اس دیکی بچی کے ساتھ اور میں شادی کروں! خدا بچائے۔ میاں کے دھوکے میں تو اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دیے اور جو کہیں سچ مچ میاں ہی ہوتے تو معاذ اللہ چٹنی ہی کر ڈالتی۔ کیا کیجیے کچھ بس نہیں چلتا ورنہ نوابی ہوتی تو اتنی قرولیا بھونکتا کہ عمر بھر یاد ہی تو کرتی۔ یہاں کوئی ایسے ویسے نہیں۔ گھانس نہیں کھودا کیے ہیں چکلہ داریاں۔ کمیدانیاں رسالداریاں کیا کیے ہیں۔

نواب۔ اور وہ آپ کے ساتھی میاں آزاد کہاں ہیں؟

خوجی۔ پھاٹک کے اس طرف پل پر بیٹھے تھے۔

ندرت۔ میاں دیکھو پھاٹک سے نکل کر پل پر میاں آزاد بیٹھے ہیں۔ ان کو ذرا لپک کر بلا لانا۔

میاں آزاد آئے تو روشن علی نے ساری داستان سنائی اور آزاد خوب کھکھلا کر ہنس پڑے۔

آزاد۔ کیسے قرولی اس وقت نہ یاد آئی؟

دربان۔ جی ہاں قرولی تو یاد آئی تھی اور بڑا غل غپاڑہ مچایا تھا اور سرا کا نام لیتے تھے کہ سرا والوں نے تو کھوپڑی پلپلی کر دی۔ جب آنکھ کھلی تو نشہ ہرن ہو گیا اور اس نے اس دھوکے میں کہ اس کے میاں ہیں بڑی بُری گت بنائی۔ پھر محفل بھر میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور مصاحب مارے ہنسی کے لوٹنے لگے۔

آزاد۔ آخر یہ وہاں کیا کرنے گئے تھے ؟

داروغہ۔ (دوڑتے ہوئے آئے) کیا ہوا بھئی کیا ہوا۔ خیر باشد کس پہ پڑیں تڑاتڑ ؟

نواب : آپ کے دوست میاں خوجی پر۔

داروغہ اور میاں خوجی میں تو لاگ ڈانٹ تھی ہی۔ اُنھوں نے جو یہ خبر سُنی تو بہت ہی خوش ہوئے اور بآواز بلند کہہ اُٹھے کہ یہ خوجا اسی لائق ہے۔ میں بھی بہت خوش ہوا۔

روشن علی۔ اجی سنیے تو لوٹنے لگے حضرت ڈیوڑھی پر پہنچے تو تپائی پر اونگھ گئے۔ دربان سمجھا کہ لوا زعفران کے میاں ہیں۔ اس نے آواز دی کہ لوا زعفران تمھارے میاں آئے ہیں۔ اس نے باہر آکر دیکھا تو پینک ہیں اور اس کو فہیم سے تھی نفرت۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے، پٹے پکڑ کر خوب تڑاتڑ لگائیں۔ آپ اس سے اتنا بھی نہ نہیں کہتے کہ میں تیرا میاں نہیں ہوں۔

داروغہ۔ (بہت خوش ہوکر) سزا۔ اس گیدی خر کی سزا (کان میں جھک کر) کیوں بچہ چپتیائے گئے نہ ـــــ الغرض بڑی دیر تک اندر باہر دونوں جگہ قہقہے پر قہقہے پڑے اور آخر کار میاں آزاد اور خوجی از سرِ نو نواب اور حاضرینِ جلسہ سے رخصت ہوئے اور چلے۔ اثنائے راہ میں میاں آزاد مارے ہنسی کے بیتاب ہو ہو گئے اور ایک بار خواجہ صاحب فرماتے کیا ہیں کہ ہم نے بھی وہ وہ چٹکیاں لیں کہ زعفران بھی یاد ہی کرتی ہوں گی۔

آزاد۔ میاں ڈوب مرو جاکر۔ ایک چُلو بھر پانی کافی ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ ایک عورت سے ہاتھا پائی میں جیت نہ پائے۔

خوجی۔ جی وہ عورت سو مرد کے برابر ہے جھپٹ پڑے تو آپ کے حواس بھی نفر د ہو جائیں۔

جہاز پر سوار ہونے کے شرائط سخت منجانب خواجہ صاحب بخت

میاں آزاد اور خوجی سرا پہنچ کر چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ گوشت اور روٹی اور باقرخانی اور کباب کی فکریں ہونے لگیں اور لدھیانہ کے اسٹیشن پر چلے۔

خوجی۔ یا خدا بچائیو۔

آزاد۔ ایں! خیر باشد کیا شیطان نے انگلی دکھائی یا لوازعفران یاد آئی۔

خوجی۔ اجی حضرت یہ تو فرمائیے کہ آپ چلتے کہاں ہیں۔ اُف میدانِ جنگ میں گولیوں اور چھروں کے منہ میں خدا ہی خیر کرے۔ بار ایک چنے کے برابر گولی میں تو کام تمام ہو جائے گا۔ بھائی کہا مانو۔ حسن آرا سے درگذرو۔

آزاد۔ بہت خوب۔ لے بس اب زیادہ بک بک نہ کیجئے۔

خوجی۔ حضرت سنیے، چلنے کو تو ہم چلتے ہیں مگر اتنی شرطیں قبول کیجئے تو بسم اللہ ورنہ ع۔ بندہ رخصت مے شود۔ اللہ نگہبانِ شماست کہئے تو کہہ چلوں۔ ایک ایک شرط ماننی ہوگی۔

شرطِ اول۔ قرولی ہم کو منزور لے دیجئے۔ اور ایک قرابینچہ بھی ہمارے پاس رہے۔ چلے ہیں تو مورچے پر آپ اور ایک پھول کی چھڑی تک پاس نہیں۔

دوم۔ برس بھر کے لیے افیم اِس جانب کو دیجئے ہمیں اپنے لادے لادے پھروں گا ورنہ جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی اور بے موت اتنا غفیل ہو جاؤں گا۔ آپ تو عورتوں کی طرح نشے کے عادی ہی نہیں مگر بندہ درگاہ بے افیم پیئے ایک قدم نہ چلیں گے۔

سوم۔ اتنا بتا دیجئے کہ وہاں لوازعفران کی سی ڈنڈیل پنجہ کش دلہنیاں تو نظر نہ آئیں گی۔ ہوں تو بندہ ابھی سے رخصت ہوتا ہے۔ خدا حافظ۔ اُف واللہ کیا کس کس کے لاتیں لگائی ہیں اور کیا تان تان کے ککے بازی کی ہے کہ پلیتھن ہی نکال ڈالا۔ روح پر صدمہ ہے واللہ روح پر۔

چہارم۔ سرا میں اب ہم تمام عمر نہ اتریں گے اور جو جہاز میں کمہار ہوئے تو ہم بس ڈوب ہی مریں گے۔ اجی اتفاق سے ہم ٹھہرے آدمی بھاری بھرکم، کہیں پاؤں پھسل گیا اور ایک آدھ ہنڈ ٹوٹ گیا تو کمہار اخبر پنجبر ہی الگ کر دے گا۔ لہذا کمہاروں کی صحبت آج سے الغط۔

پنجم۔ میٹھے پلاؤ روز پکیں۔

ششم۔ ہم کو میاں خوجی نہ کہنا۔ جناب خواجہ صاحب قبلہ کہا کیجئے، یہ خوجی کیا معنی؟

ہفتم۔ مورچے پر ہم نہ جائیں گے۔ بس باورچی خانہ کا انتظام ہمارے تعلق ہے اور لوٹ مار میں جو کچھ ہاتھ آئے وہ بھی ہماری تحویل میں رکھا جائے۔

ہشتم۔ حسن آرا کے نام ایک خط روز لکھنا اور ہر خط میں ہماری طرف سے بندگی بلکہ دعائے خیر۔

نہم۔ گولی کھانے کے تین گھنٹے قبل اور مرنے کے دو گھنٹے پیشتر ہمیں اطلاع کر دینا۔

دہم۔ جو ہم خدانخواستہ داخل خلد بریں ہوں تو لاش کو ہندوستان میں پہنچوانا اور جہاں والدِ مبرور کی لاش دفن ہے، وہاں ہی دفنانا لیکن ہم کو خود ہی معلوم نہیں کہ پدر بزرگوار مرے کب اور دفنائے کہاں گئے اور تھے کون۔ آپ ذرا پتہ لگا لیجئے اور تربت پہلو بہ پہلو بنوائیے گا۔ اگر ان کی

نہ ملے تو کسی قبرستان میں جاکر جو سب سے بہتر قبر بنی ہو بس اسی کے قریب ہم کو بھی دفنا نا اور لکھ دینا کہ یہ اُن کے والدِ ماجد کا مزار شریف ہے۔

یازدہم۔ پینک کے وقت ہم کو ہرگز نہ چھیڑنا۔ اس وقت یہاں استغراق کی کیفیت ہوتی ہے۔ اتنی شرطیں اگر بسروچشم قبول ہوں تو چشم ماروشن دلِ ماشاد۔ خانۂ احسان آباد! ورنہ خوجی نہ میاں آزاد۔

آزاد۔ مرنے کے دو گھڑی بیشتر کہہ دیں گے کہ اب چل چلاؤ لگ رہا ہے مگر گولی کھانے کے تین گھنٹے قبل بتا دینا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے اور بھائی سنو۔ خواجہ صاحب تو ہم سے نہ کہا جائے گا۔ ہم تو خوجی ہی خوجی کہا کریں گے۔ ایک قرولی۔ ایک قرابین آپ کو خرید دیں گے۔ آپ مزے سے کاندھے پر لادے یا ہاتھ میں لیے جہاں چاہے، جائیے۔ افیم بمبئی میں آپ کی پیٹھ پر لاد دیں گے۔ گھبرائیے نہیں۔ کہیے اب تو چلیئے گا یا اب بھی مچلیئے گا؟

خوجی۔ بسم اللہ کمر کسئے۔

میاں آزاد کا بمبئی میں داخل ہونا اور خوجی کا ایک گرانڈیل عورت کے عشق میں عقل کھونا

الغرض میاں آزاد اور خوجی بمبئی میں آئے۔ جب بمبئی میں داخل ہوئے تو شہرپناہ کے پاس دونوں میں دو دو چونچیں ہو گئیں۔

آزاد۔ چلو کسی اچھی سرا میں چل کر بسیرا لیں۔

خوجی۔ کہنے والے اور چھپنے والے دونوں کی ایسی تیسی۔ کیوں بچہ یہی وعدہ پورا کرتے ہو، وہ قرولی تو خریدتے ہی رہے اور افیم کے لیے بھی پورے سولہ گنڈے نہ دیئے۔ اب یہ وعدہ خلافی کرتے ہو۔ اسی سے تو ہم نے پہلے ہی قول لیا تھا کہ چاہے آسمان کی جگہ زمین اور زمین کے مقام پر آسمان آجائے مگر ایجناب سرا میں قدم نہ رکھیں گے۔ سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔ اس کمہار نے اتنی بے بھاؤ کی لگائیں کہ بس ہمارا ہی سر جانتا ہے۔

آزاد۔ اجی اب دنیا بھر کی سراؤں میں کمہار ہی کمہار تو ہیں۔ وہ باتیں کرتے ہو کہ گدھوں کو بھی ہنسی آئے۔

خوجی۔ اچھا تو اس شرط پر چلتے ہیں کہ رات کو کسی پیڑ پر بسیرا لینا۔

آزاد اور میاں خوجی دونوں چلے تو سرا میں کھٹ سے داخل۔ ایک کوٹھری میں جا میاں خوجی تو مزے سے چھپرکھٹ پر دراز ہوئے چاروں شانے چت۔ میاں آزاد خانہ برباد بھی دوسری کھٹیا[2] پر لیٹے ہو کر خراٹے لینے لگے۔ خوجی افیمی آدمی نیند کہاں۔ بس کوئی دم آنکھ جھپکنے ہی نہیں پاتی۔ آزاد نے تکیہ پر سر رکھا تو نیند ہاتھ باندھے آن موجود ہوئی۔ خوجی نے جوان کی یہ کیفیت دیکھی تو آپ ہی آپ کہنے لگے کہ ارے میاں آزاد گذر گئے۔ بیچارے خوب آدمی تھے۔ افسوس اچھی باتیں کرتے تھے، اچھی ندارد۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کشیدہ قامت، بلند و بالا شیطان کی خالہ سامنے سے چمکتی دمکتی ہوئی آتی ہے مگر قد کوئی سات فٹ کا نصف انچ کم نہ جو بھر زیادہ۔ آستینوں کی پھنسی ہوئی کرتی اور وہ چُستی اور پھرتی کہ الاماں۔ چادر سبز پہنے سبزانِ چمن کو شرماتی[1] ناز سے قدم بڑھاتی ہوئی میاں خوجی کی طرف آنکلی۔ خوجی نے اس کی طرف نظر ڈالی تو اس نے انجب تیکھی چتون سے ان کو دیکھا اور اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلی تو حضرت نے سیٹی بجائی اور سیٹی کی آواز سنتے ہی وہ ان کی طرف جھک پڑی اور چھماچھم کرتی ہوئی کوٹھڑی میں دراتی چلی آئی۔ اب میاں خوجی کے حواس پیترا ہوئے۔ سوچے کہ اگر آزاد کی آنکھ کھل گئی تو وہ لے ہی ڈالیں گے کہ اللہ اللہ اب آپ کو بڑے بڑے شوق چرائے اور جو کہیں وہ ریجھ گئے تو پھر ہم کو چرمرہی کر ڈالیں گے۔ اشارے سے کہا کہ ذری آہستہ بولو۔ اس نے کہا کیا؟

خوجی۔ (منہ پر انگلی رکھ کر) چُپ چُپ۔

عورت۔ لے واہ۔ اچھے ملے۔ کیا چُپ شاہ کا روزہ ہے؟

خوجی۔ (اشارے سے) میاں آزاد سوئے ہوئے ہیں۔

---

[1] آنہ د   [2] چارپائی

عورت ۔ ان کا لحاظ کرتے ہو کیا باپ ہیں تمھارے ؟

خوجی ۔ (ہاتھ جوڑ کر) واسطے خدا کے چپ بھی رہو۔

عورت ۔ چلو ہم تم دوسری کوٹھڑی میں چل کر کے بیٹھیں۔

خوجی اور وہ عورت جس پر میاں صاحب کا دل آیا تھا چلے اور ایک کوٹھری میں یوں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

خوجی ۔ آپ کا نام ؟

عورت ۔ کیسر۔

خوجی (کانپ کر) سچ کہنا کہیں زعفران کی ہمشیرہ جان تو نہیں ہو؟

عورت ۔ اللہ جانتا ہے کتنے وجیہہ جوان ہو۔ اور خدا پاک کی قسم کیا ہاتھ پاؤں پائے ہیں مگر داڑھی منڈوا لو۔

خوجی ۔ (دونوں بازؤں کو پھڑکا کر) اور جو میں ورزش کروں تو شیدی لندھور کو لڑاؤں۔

عورت ۔ ذرا کان تو چھٹپٹا ڈالو ۔ شاباش ہے ۔

خوجی ۔ ایک بات کہوں برا تو نہ مانو گی ؟

عورت ۔ جو برا مانوں گی تو کھوپڑی سہلا دوں گی ۔ چلو چھٹی ہوئی ۔

خوجی ۔ (ہاتھ جوڑ کر) جان بخشی کرو تو کہوں ۔

عورت ۔ کیا بھٹیارے یا بھٹیاری یا کسی اور کی جان لو گے آخر صاحب یہ جان بخشی کیسی؟ اچھا جو تمھیں کہنا ہو وہ کہو مگر داڑھی صفا چٹ ہو ۔

خوجی ۔ خون معاف ہو۔

عورت ۔ چپت لگا کر ۔ لبے بھکوے خون کیسا ؟

خوجی یہ دھول دھپا شریفوں میں بھلا کہاں جائز ہے ؟

عورت ۔ شریف تجھ سے کو کون نگوڑی سمجھتی ہے ٹوپی پھینک کر ایک اور چپت جمائی ۔ چٹاخ۔

راوی ہاں ۔ اب کی البتہ چٹاخ کی آواز گونجی۔

عورت ۔ آنکھیں کیا نیلی پیلی کرتا ہے ۔ پھوڑ دوں دونوں دیدے ۔

راوی ۔ واہ واللہ اچھی آنکھ پھوڑ سے آنکھ لڑائی ۔ خدا چشم زخم حوادث سے بچائے ۔ جسم بھر میں اس نے دیدہ دانستہ عین آنکھ ہی پر نشتر لگانا چاہا ۔ عورت کیا آنکھ پھوڑ پڑا ہے ۔

خوجی ۔ اب ہمارا مطلب تو اس جھنجھٹ میں خبط ہوا جاتا ہے ۔ اب لے بتاؤ کچھ مانگیں تو دوگی ؟

عورت ۔ ہاں کیوں نہیں ہز کان پکڑ کر ایک پٹرا ادھر ایک ادھر) کیا معنے بولتے ہیں آپ چیستانیں بجھواتے ہیں۔

خوجی ۔ (گھبرا کر) ہم مانگتے ہیں کہ قول دو ۔

عورت ۔ دیا

خوجی ۔ پھر مکرنے کی سند نہیں؟

عورت ۔ نہ

خوجی ۔ میں کہتا ہوں پھر

عورت۔ بسم اللہ

خوجی۔ کنایہ ہے کہ۔ گر کنتے ہوئے دل کانپتا ہے۔

عورت۔ اب میں تم کو ٹھیک نہ بتاؤں کہیں۔

خوجی۔ شادی کرلو میرے ساتھ۔

عورت۔ اے ابھی تم بچے ہو۔ دودھ کے دانت تک تو ٹوٹے نہیں، بیاہ کیا کروگے بھلا۔

خوجی۔ واہ وا۔ میرے دو بچے کھیلتے ہیں۔ ابھی تک ان کے نزدیک لونڈے ہی ہیں ہم۔

عورت۔ پھر اس کی نہ کہیے۔ میرا بھی تو ایک بچہ کھیلتا ہے۔

خوجی۔ لاحول تو بس معاف کیجئے۔

عورت۔ آ گئے نا جھانسے میں۔ اتنا نہ سمجھے کہ ابھی میں آپ بچہ ہوں لڑکوری[1] کیونکر ہو سکتی تھی بھلا۔

خوجی۔ سن شریف۔

عورت۔ بارہ اور پانچ کے ہوئے۔

خوجی۔ بارہ اور پانچ سترہ۔

عورت۔ پھر اس عمر میں کہیں لڑکا بھی ہوا ہے؟

خوجی۔ (دست بستہ) کہنا مانو نکاح پڑھوالو۔

عورت۔ کچھ کمائی دمائی تو نکال اور داڑھی منڈوا۔

خوجی۔ (دس روپیہ دیکر) لو یہ حاضر ہے۔

عورت۔ دیکھوں۔ اُونھ ہاتھی کے مُنہ میں جیرا۔ (زیرہ) اچھا خیر

خوجی۔ لو یہ پانچ اور لو۔ اس کے کپڑے بنوانا۔ مگر میری دھجیاں نہ اڑانا۔ میں زمین کا گز بن جاؤں گا اور تم کو بیگم بنا کر رکھوں گا۔

عورت۔ (کان پکڑ کر) ایک شرط سے شادی کروں گی۔

خوجی۔ منظور۔

عورت۔ صبح تڑکے سویرے منہ اندھیرے اٹھ کر مجھے جھک کر سات بار سلام کرنا اور میں سات چپتیں لگاؤں گی۔

خوجی۔ اجی بلکہ اور دس۔ (اچھل کر) چاند سی بیوی پائی۔

عورت۔ اچھا اسی بات پر ایک پنجہ اور دائیں ہاتھ سے نکالو۔

خوجی۔ لو یہ پانچ اور لو۔ تمھارے دم کے لیے سب کچھ موجود ہے۔

عورت نے جھپ سے میاں خوجی کو گود میں اٹھا لیا اور بغل میں دبا کر لے چلی تو خوجی بہت ہی چکرائے۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے۔ ہزار زور کئے مگر اس نے جو دبایا تو اس طرح لے چلی جیسے کوئی چڑیمار جانوروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے لے چلے۔ اب سارا زمانہ دیکھ رہا ہے کہ خوجی پھڑکتے ہوئے جاتے ہیں اور وہ کشیدہ قامت عورت چھم چھم کرتی ہوئی اور پھرتی کے ساتھ قدم دھرتی ہوئی بیرگئی وہ گئی۔ ایک مقام پر خوجی بھاگ نکلنے کو تھے مگر اس نے چیر چپڑ غٹو کیا۔

---

[1] لڑکوری = لڑکے والی۔

خوجی۔ اب چھوڑتی ہے یا نہیں۔
عورت۔ ایں! ہوش کی دوا کر مردوے۔ میں اب عمر بھر تو چھوڑنے کا نام لوں گی نہیں۔ ہم بھلے مانسوں کی بہو بیٹیاں چھوڑ دینا کیا جانیں بس ایک سر ہو رہیں۔ بھاگے کہاں جاتے ہو میاں۔
خوجی۔ میاں ابھی سے کیوں کر ہو گئے؟
عورت۔ بس اب زیادہ ٹراؤ گے تو میں اسی وقت سے چپت بازی شروع کر دوں گی، (گودی سے اتار کر) بھلا تم بھاگ تو جاؤ۔
خوجی۔ یارو کیا اندھیر ہے۔ میں کچھ قیدی ہوں؟
عورت۔ (چپت دے کر) اور نہیں کون ہے تو آخر، تو ہے کون۔ اب کیا میں کہیں جانے بھی دوں گی۔
خوجی پیچھے ہٹنے لگے تو اس نے پٹے پکڑ کر خوب بے بھاؤ کی لگائیں۔ اب یہ جھلائے اور غل مچایا کہ کوئی ہے؟ لانا قرولی تماشائی بازاری ارد گرد ٹھٹ کے ٹھٹ لگائے کھڑے ہنس رہے ہیں۔
ایک۔ کیا ہے میاں کیا ہے کیا۔ یہ دھڑ پکڑ کیسی؟
عورت۔ آپ کوئی قاضی ہیں۔ یہ ہمارے میاں ہیں۔ ہم چاہیں چپتیائیں چاہے دھپیائیں پھر کسی کو کیا؟
خوجی۔ واہ تو میاں بس دھپیانے ہی بھر کے ہیں۔
دوسرا۔ ان کو بغل میں داب کر کہاں لے چلیں۔
عورت۔ جدھر سینگ سمائے۔
خوجی۔ ہائے نہ ہوئی قرو۔۔۔
کانسٹبل۔ کیا! قرولی۔ پہلے لیسنس تو دکھاؤ۔ پھر قرولی نکالو۔ ہونہہ مہاراج گردن دالبے گو وماں اُٹھاتے لئے جات ہے وہ کرولی نکارت ہیں۔
تیسرا۔ ارے واہ رے بے غیرت جوروانے دبایا اور دھپیایا اور تو دم بخود کھڑا ہے۔
چوتھا۔ تو حضرت کرے کیا، وہ ٹھہری ہٹی کٹی مشٹنڈی ڈنڈیل۔ یہ بیچارے دُبلے پتلے مریل آدمی۔ پھر اس دیوی سے عہدہ برا کیونکر ہو سکیں؟
خوجی بھائیو میری جان بچاؤ۔
لوگ۔ بیاہ کیوں کیا تھا؟
عورت۔ میاں بیوی کے جھگڑے میں آپ لوگ نہ پڑیں۔
خوجی۔ میاں کون مردود ہے؟
عورت۔ تو مردود اور کون۔
خوجی۔ خدا کی مار جو اس کے ساتھ نکاح بھی ہوا ہو۔
عورت۔ بھلا پھر میں یونہی ان کو بغل میں دبوچ کرلے آتی!
لوگ۔ جیسے بلی اپنے بچوں کو منہ میں دبا کر گھر لے جاتی ہے۔
کانسٹبل۔ یا جیسے دائی بچوں کو گود میں لے کر تماشا دکھلاتی ہے۔
خوجی۔ یارو ذرا میاں آزاد کو سرا سے بلانا۔

عورت۔ ہاں یہ کہیے اب آپ کی کچھ اور نیت ہے۔

پھر گود میں اٹھا کر لے چلی۔ تماشائی اور بازاری اور حوالی موالی ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے اور خوجی ایسے جھلائے کہ بوٹیاں نوچے ڈالتے تھے مگر قرولی میان ہی میں ہے۔

لوگ۔ اجی بس جاؤ بھی۔ عورت ذات سے جیت نہیں پائے۔ بس عزت ڈبو دی بالکل۔ لاحول ولا۔

خوجی۔ اجی اس عورت پر علیؓ کی سنوار، یہ مردوں کے کان کاٹتی ہیں۔

عورت۔ (جھلاکر) ہاں! کوسنے بھی لگے اب۔ اچھا۔

اچھا کر کے جو اس نے دبایا تو میاں خوجی نے خوب غل مچایا۔

خوجی۔ ارے یارو کیا شہر شملہ ہے۔ ایک عورت ڈائن ایک بھلے مانس کو مارے ڈالتی ہے اور کوئی بیچ بچاؤ تک نہیں کرتا۔ یارو خدا کے لیے بچاؤ۔ للہ بچاؤ۔

اتنے میں میاں آزاد جو بیدار ہوئے تو خوجی غائب غلہ۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ کہیں پتہ ہی نہیں۔ خوجی خوجی۔ خواجہ صاحب۔ اجی جناب خواجہ صاحب۔ ایں! جواب ہی نہیں دیتے۔ ارے یہاں کہاں ہو؟ وہ ہوں تو بولیں۔ وہ تو بازار میں اضحوکہ روزگار بن گئے ہیں۔ بھٹیاری نے کہا کہ (میاں خوجی بازار کی طرف گئے تھے) میاں آزاد بازار گئے کہ دیکھیں کیا افتاد پڑی۔ دیکھا تو دنگ ہو گئے۔ للکار کر کہا کہ چھوڑ دے۔

اُس نے خوجی کو چھوڑ دیا اور سلام کر کے میاں خوجی سے کہا کہ حضور میرا انعام ہوا۔ میں بہروپیا ہوں۔ خوجی ع کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ پچیس تیس روپے گئے اور اُلو کے اُلو بنے۔

میاں آزاد کا ایک بُتِ تند خو پر دل آنا

میاں آزاد سے ایک شخص نے کہا یا حضرت آج میلہ دیکھنے نہ چلئے گا۔ وہ دُھوم دھڑکے کا میلہ ہوتا ہے کہ اُہو ہو ہو۔ ایک ایک مہ پارۂ جادو نگار رو کش مہر غیرت ماہ۔

نازسے پائنچے اٹھائے ہوئے　　شرم سے جسم کو چرائے ہوئے
نشۂ بادۂ شباب سے چُور　　چال مستانہ حسن پر مغرور
انکھڑیاں قہر کی لگاوٹ باز　　مست صہبائے غمزہ و انداز
سیکڑوں بل کمر کو دیتی ہوئی　　جان طاؤس و کبک لیتی ہوئی

میاں آزاد خوب نکھرے اور سج دھج کر اکڑتے ہوئے چلے۔ واللہ ایسا بے فکرا بھی نہیں دیکھا۔ میلا ٹھیلا تو کوئی ان سے سیکھے ہی نہیں پاتا تھا۔ کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر گئے ہوں گے کہ ایک جھروکے سے آواز آئی۔

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو　　طلب ہوتا ہے شانہ آئینہ کو یاد کرتے ہیں!

میاں آزاد نے جو اوپر نظر کی تو سبحان اللہ شان تیری۔ اب قدم نہیں اٹھتا۔ دفعتہً دروازہ خوجی کی آنکھ کی طرح بند ہو گیا وہ معاملہ اہل کے دل کی گرفتاری کے واسطے کمند ہو گیا۔ آزاد متحیر کہ الٰہی یہ چھلاوہ تھا، سحر تھا، ٹونا تھا آخر کیا تھا پل مارنے کی دیر ہوئی اور وہ چاند سا ٹکڑا گہن میں آگیا۔ ایک مرتبہ سہ منزلہ کی ایک کھڑکی سے وہ چہرۂ نورانی پھر نظر آیا۔ آزاد یوں اُٹھے کہ وہ اُس ماہ تاباں نے جلوہ دکھایا مگر پھر غائب ہائے ستم۔ آزاد جوش عشق اور بڑے زور سے بولے۔

دیدار می نمائی و پرہیز می کُنی　　بازار خویش و آتش ما تیز می کنی

آزاد کے ساتھی نے جو یہ رنگ دیکھا تو آہستہ سے کہا کہ حضرت بس کہہ دیا اس پھیر میں نہ پڑیے گا۔ کانٹے میں اُلجھنا ہو تو بسم اللہ ورنہ آگے قدم بڑھائیے الا اللہ۔

آزاد۔ حضرت آج تو بعد مدت کے چاند سی صورت نظر آئی ہے پس اب تو کوٹھے پر جانے کی دھن سمائی ہے۔ وہ معشوق ہیں عاشق۔ وہ عذرا ہیں وامق۔ وہ شیریں ہیں فرہاد۔ وہ پریزاد ہیں عقل سے آزاد۔

اتنے میں دیکھا کہ پھر وہ معشوق پراگندہ نقاب جھروکہ پر بصد ناز و انداز کھڑی ہوئی میاں آزاد کی آنکھ اُس آہو چشم کی فسوں پر واد اور لگاوٹ باز انکھڑیوں سے لڑی ہوئی۔ اس نے ایک عجیب ادائے دلبرانہ سے اپنی بانکی مہری سے جو نکھر کر اس کے سامنے کھڑی تھی کہا کہ فنس تیار کراؤ، ہم میلے جائیں گے۔

دم کے دم میں وہ صورت پھر غائب ہو گئی۔ اب میاں آزاد کی بیقراری اور گریہ و زاری کا بحر مواج لہریں مارنے لگا۔ اس سمندر کا اور چھور ہی نہیں۔ کھڑکیاں اور دریچے سب بند ہو گئے۔ اب آزاد چکرائے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ اتنے میں اوپر سے ایک دفتی[1] گری میاں آزاد وحی آسمانی سمجھ کر جھپٹے۔ اٹھا کر پڑھتے ہیں تو جلی قلم سے لکھا تھا۔ کلوخ انداز را پاداش سنگ است۔ آزاد نے اس تحریر

---

[1] کاغذ کا تختہ

کو چوم لیا۔

اتنے میں ایک اور وصلی اوپر سے گری اور میاں آزاد نے جھپٹ کر اٹھائی۔ پڑھا تو یہ مصرعہ لکھا تھا۔ دل لگی کرتی ہیں پریاں مرے دیوانے سے۔ آزاد پڑھتے ہی اچھل پڑے۔ مرے دیوانے۔ اب اپنے دیوانے کی فکر کیجئے (کھڑکی کی طرف نظر کرکے) حضور آپ اپنے دیوانے کا خیال رکھیے۔ سا پتا کہ کر اغیار سے نہ ہنسوانا۔

اتنے میں ایک مہری اندر سے آئی اور میاں آزاد کو دیکھ کر مسکرائی۔ اشارے سے کہا کہ آئیے۔ ہاتھ سے بتایا کہ جلدی جلدی قدم بڑھائیے۔ آزاد بادلِ شاد و خنداں فرحاں و شاداں پہنچے تو دماغ رشکِ چمن ہو گیا۔ سینہ چمن چمن ہو گیا۔ دیکھا کہ ایک عریدہ جو دلھن بنی ہوئی ایک نازک کرسی پر بصد شان برنائی و خود نمائی عجب ٹھسّے کے ساتھ بیٹھی ہے۔ میاں آزاد کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انھوں نے بیٹھتے ہی کہا کہ نقشِ مراد کرسی نشین ہوا۔ وہ بت پندار ایک دلربا شوخی کے ساتھ مسکرائی تو میاں آزاد کی زبان پر یہ بیت آئی۔ ؎

چو خوں بہا طلبند از تو کشتگان در حشر
تبسمے کن و بگذر۔ ہمیں ادا کافی ست

مہری نے جو سامنے کھڑی تھی آزاد کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آہستہ آہستہ گفتگو کیجئے۔ وہ بڑی نازک مزاج ہیں۔ طبع نازک پر یہ آواز گراں گزرے گی۔

نازک بدن۔ (یعنی وہی دلھن) فرمائیے کیا مطلب ہے۔ دور دور کی ملاقات یا وصال۔

آزاد۔ ملاقات نہ وصال فقط نظارۂ جمال۔ ع۔ اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری۔

اب سنیے کہ اس دلارام گلفام کی شکل و صورت بعینہٖ خاتون مہ لقا حسن آرا کی سی تھی۔ وہی شباہت وہی حسن و جمال وہی گلاب سا چہرہ وہی خال سرمو فرق نہیں۔ میاں آزاد کو اپنی پیاری حسن آرا یاد آئی اور بے ساختہ یہ مصرعہ زبان سے نکلا۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسی داری

نازک بدن۔ معلوم ہوتا ہے آپ چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ کسی کے جعدِ مشکیں[2] میں دل پھنسا ہے۔ ناگنی زلف نے ڈسا ہے۔

کھلتے ہیں کچھ اشتیاق کے طور
رُخ میری طرف نظر کہیں اور

آزاد۔ برسوں حسن و عشق کے پھیر میں رہے لیکن اب تو ایک حسین مہ جبین سے دل ملایا ہے۔ بس اسی کے بیاہنے کا شوق چرّایا ہے۔

نازک بدن۔ پھر ہم سے واسطہ؟ رحمت میں داغ لگانے سے رہے۔ شادی ہو تو بسم اللہ ورنہ تشریف لے جائیے۔

آزاد۔ (نیم خیز ہو کر) خدا حافظ۔

نازک بدن۔ (دامن پاؤں تلے دبا کر) اللہ ری تنک مزاجی۔ اف ری عالی دماغی۔ ہم غیب کا حال بھی بتا سکتے ہیں۔ کہیے آپ کا کچا چٹھا کہہ چنوں۔ مگر ہٹ دھرمی کی سند نہیں۔

آزاد۔ (بیٹھ کر) بسم اللہ۔

نازک بدن۔ میاں آزاد آپ کا نام ہے اور حسن آرا۔

آزاد۔ (متحیر ہو کر) ایں! یہ کیا اسرار ہے؟

نازک بدن۔ کیوں کیا پتے کی کہی ہے۔

آزاد۔ (دم بخود حیرت زدہ)

---

[1] چھت [2] زلف

نازکبدن۔ (ہاتھ میں ہاتھ دے کر) حسن آرا میری چھوٹی چچازاد بہن ہے۔ ڈیڑھ برس سے میں نے اسے نہیں دیکھا مگر دوسرے تیسرے خط ضرور آتا ہے۔ یہ حسن آرا کا خط ملاحظہ فرمائیے۔

آزاد خط لے کر چومنے لگے۔ سر آنکھوں سے لگایا۔ خط کو پڑھا تو یہ لکھا تھا۔ میری پیاری بہن۔ اللہ وہ دن دکھائے کہ تمھاری بہن تمھارے وصل کے شراب کے نشے میں جھومتی ہو۔ تم ان کو اور وہ تم کو مارے خوشی کے چومتی ہو۔ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھائیں ہنسیاں دل لگیاں ہوتی جائیں۔ اب دردِ دل سنو! یہاں ایک جوان ماہرو قوس ابرو پریزاد میاں آزاد آئے تھے جوان صالح و پاکباز ہیں۔ لعلمئے نامی سے دمساز ہیں۔ اصرار کیا کہ نکاح ہو۔ ساعت سعد کو بیاہ ہو۔ میری شامت زبان سے نکل گیا کہ روم جائیے۔ مسلمانوں کو کفار کے حملے سے بچائیے۔ نام کرکے آئیے اور تمغے لگائیے تو کیا مضائقہ۔ وہ تو ایک ہی ٹھن[1] کا آدمی ہے۔ معاً منظور کر لیا اور چل کھڑا ہوا۔ اب فراق مارے ڈالتا ہے۔ دل قابو میں نہیں۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں ابھی ناکردہ کار ہوں۔ ع عشق کے صدمے اٹھانے کو جگر بھی چاہیے۔ یہاں جگر پاش پاش ہو گیا اور ابھی بسم اللہ ہی ہے۔

وہ بمبئی کی راہ سے روم جائیں گے۔ تم سرا میں پتا لگا کر اُن کو بلانا اور میرا خط پڑھ کر سنانا۔ اتنا ضرور کہنا کہ کیا مروت اسی کی مقتضی ہے کہ مجھ شہید کشتۂ تیغ وفا کو تڑپاؤ۔ تصویر شناخت کے لیے بھیجتی ہوں۔ میرا حال میرا اللہ ہی جانتا ہے۔ سپہر آرا روز طعنے دیتی ہے کہ ایسی ہی محبت چپٹ پڑی تھی تو بھیجا کیوں؟ شہر بدر کیوں کیا؟ مگر دل گواہی دیتا ہے کہ آزاد پیارے آزاد سرخرو آئیں گے۔ آمین۔ آزاد خدا کی قسم تمھاری تصویر ہر دم روبرو رہتی ہے مگر ؎

یکے زبان و ہزاراں شکایت ستمرا   تو شاد زی کہ غم بے نہایت ستمرا

(حسن آرا)

آزاد۔ واہ رے اشتیاق۔ اور اُف رے دردِ فراق ہم بمبئی میں داخل نہ ہونے پائے اور نامہ شوق آگیا۔

نازکبدن۔ حسن آرا تڑپ رہی ہے آپ کی تحریر سحر تخمیر سے ذرا تسکی ہوگی سپہر آرا حیران ہے کہ اُس کے جنون کا علاج کیا کرے۔ مگر

بیماری عشق لادوا ہے	اس باغ کی اور ہی ہوا ہے
مجنوں ہو اگر تو فصد کیجئے	سلیہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے
کچھ روگ جو دردِ پہ خلش ہو	درماں کے لیے دوا دوش ہو
وہ سبزۂ خط جو یاد آئے	جھنجھلا کے کہیں نہ زہر کھائے
گر یاد کہیں چہِ ذقن کو	کودے نہ کنوئیں میں باولی ہو
دیوانے کی مطلق انسانی!	ہے باعثِ مرگِ ناگہانی

مرگ ناگہانی کا کلمہ سن کر میاں آزاد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور اشکوں کا تار بندھ گیا۔

نازکبدن۔ اب آپ ہمارے یہاں ٹھہریں۔ اکثر علما اور باحمیت اہلِ اسلام آپ کی زیارت کے مشتاق ہیں۔ ایک دن جلسۂ عام منعقد ہوگا اور آپ کی خدمت میں باحمیت مسلمان اسپیچ دیں گے۔ جہاز کا بندوبست کر دیا جائے گا مگر اب تک آپ نے یہ نہ پوچھا کہ ہم نے آپ کو پہچانا کیوں کر۔ ہم نے سرا میں آدمی بھیجا تھا اور اس نے آپ کو بغور دیکھا تھا۔ اس وقت اس نے مجھ سے آن کر کہا کہ وہی صاحب آئے ہیں۔ میں آپ کو کنانی بھی کر دیکھوں کہتے ہیں۔ بیاہ کا ذکر میں نے اسی سبب سے چھیڑا تھا۔ اگر آپ عشق ہی ظاہر کرتے جاتے تو میں

[1] آن۔ ضد۔ وضع۔

حسن آرا کو لکھ بھیجتی۔ لیکن آپ نے میری صورت دیکھتے ہی کہا کہ۔ اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری۔

آزاد۔ پھر میں یہاں ہی اُٹھ آؤں۔

نازکبدن۔ ضرور۔

آزاد۔ شاید آپ کے اعزہ میں سے کوئی بدظن ہو جائیں۔

نازکبدن۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ ہندوستان کی کوئی نیک شریف زادی اس طرح بے دھڑک کسی غیر اور نامحرم کو اپنے ہاں نہ بلوائے گی جس طرح میں نے آپ کو بلوا لیا، کیا مجھے ناموس و ننگ کا خیال نہیں ہے؟ کیا میں نہیں جانتی کہ میرے یہاں غیر مرد کو اس بے تکلفی کے ساتھ میرے قریب بیٹھے دیکھیں گے تو آنکھوں سے خون ٹپکنے لگے لگا مگر وہ خود اس وقت تمہاری تلاش میں نکلے ہیں۔ حسن آرا نے تو خطوں کی بھرمار کر دی اور ان کو قسمیں دے دے کر لکھا ہے کہ آزاد کو ضرور ڈھونڈ نکالو۔ آتے ہی ہوں گے دیر سے گئے ہوئے ہیں۔ اب آپ تو جائیں نہیں میرے آدمی کو بھیج دیجئے وہ اسباب لے آئے۔

آزاد۔ اچھا ذرا دوات کاغذ تو منگوائیے۔ میں اپنے ساتھی کے نام رقعہ لکھ کر بھیجوں۔

ایک عورت نے قلم دوات کاغذ سامنے رکھ دیا اور میاں آزاد نے یہ رقعہ لکھا۔

خواجہ صاحب بہادر! اسباب وساب لے کر اس آدمی کے ساتھ چلے آئیے۔ سرا میں رہنا تم کو ہم کو دونوں کو شاق گذرتا ہے۔ یہاں یہاں حُسنِ اتفاق سے حسن آرا کی بہن مل گئیں۔ یار ہیں قسمت کے دھنی ہم تم دونوں۔ بس اب آؤ اور یہاں ہی بستر جماؤ۔ اور ایک مژدۂ طرب انگیز بھی سناتا ہوں کہ افیم کی دُکان بھی یہاں سے قریب ہے۔ وہ ہنسی آئی باچھیں کھل گئیں ہا استاد۔

خوجی کی حماقت

خوجی نے مارے دہشت کے دل میں ٹھان لی کہ جو آئے گا خوب غور سے دیکھوں گا۔ بھلا اب کی چکما چل جائے تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ اس دفعہ کیا جانے کیا اتفاق ہوا کہ وہ بہروپیا چکما دے گیا۔ یہاں اڑتی چڑیا پکڑنے والے ہیں۔ ہم بھی اگر یہاں رہتے ہوتے تو اس مردود بہروپیے کو چچا ہی بنا چھوڑتے۔ وہ غپا دیتا کہ عمر بھر یاد ہی کرتا مگر خیر۔ ع۔ پھر سمجھیں گے اضطراب کیا ہے۔ سامنے ایک گھسیارا گھانس کا گٹھا سر پر لادے پسینہ میں عرق عرق آن کھڑا ہوا۔ میاں خوجی کی کوٹھڑی کے قریب ایک ٹٹو[1] سرا میں بندھا تھا۔ وہ سمجھا انہیں کا یابو ہے تو ان سے یہ گفتگو ہوئی۔

گھسیارا۔ حضور گھانس تو نہیں چاہیے؟

خوجی۔ (غور کر کے دیکھا) چل اپنا کام کر۔ ہمیں گھانس وانس کچھ نہیں چاہیے، گھانس کوئی اور کھاتے ہوں گے۔ ہم اپنے غم ہیں آپ کا ہیدہ ہیں۔

گھسیارا دور تھا۔ اس نے اچھی طرح سنا نہیں کہ میاں خوجی نے کیا جواب دیا تو پھر پوچھا کہ صاحب، کچھ گھانس لو گے؟ خوجی سمجھے کہ بہروپیا ہے (چل بے چل، ہم پہچان گئے۔ ہم سے بہت چکمہ بازی نہ کرنا۔ بچہ اب کی کوئی حرکت سرزد ہوئی تو پلیتھن ہی نکال ڈالوں گا۔ اب جاتا ہے یا آنکھیں دکھاتا ہے؟ تیرے بہروپیے کی دُم میں رسّا۔ ع ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے۔ شامتِ اعمال سے گھسیارا بہرہ تھا۔ وہ سمجھا کہ بلاتے ہیں ان کی طرف آنے لگا۔ بس تب تو میاں خوجی غصّہ ضبط نہ کر سکے اور چلّا اٹھے کہ او گیدی بس آگے نہ بڑھنا نہیں تو سر تن سے جدا ہوگا۔ یہ کہہ کر حضرت لپکے اور گٹھا پکڑ کر چاہا کہ اس کو چپت لگائیں اس نے جو زور کیا کہ چھڑا کر بھاگ نکلے تو میاں خوجی مُنہ کے بل دھم سے زمین پر آ رہے اور گٹھا جو گرا تو حضرت خواجہ صاحب تَنب[2] ہی گئے اور گٹھے کے بوجھ سے ایک لڑھکنی کھائی۔ بھٹیاریوں نے دوڑ کر گٹھے کو پاؤں سے دبانا شروع کیا اور خوجی نے اس کے اندر سے غنغنانا شروع کیا لے او گیدی آنتی قرولیاں بھونکوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ مردک نے ناکوں دم کر دیا۔ خیر بعد خرابی بسیار آپ گھانس کے نیچے سے برآمد ہوئے تو گرد میں لت پت بھٹیاریوں نے بڑی ہمدردی سے گرد جھاڑی۔ گرد کیا جھاڑی یہ کہیے کہ گرد جھاڑنے کے حیلے خوب مرمت کر دی۔ ایک نے ادھر سے گُدّ جمایا، دوسری نے اُدھر سے چپتایا اچھی گرد جھاڑی۔ خوجی بہت ہی جھلّائے مُنہ پھیلائے بیٹھے تھے کہ میاں آزاد نے جس آدمی کو سرا میں بھیجا تھا وہ رقعہ لیے ہوئے آیا اور لوگوں سے پوچھ کر ان سے کہا کہ چلیے، آپ کو آزاد نے بلوایا ہے۔

خوجی۔ کس سے کہتے ہو۔ ارے ابھی نامہ بر بن کر آیا تب ہی گھسیارا بنا تھا۔ پہلے عورت کا بھیس بدلا پھر سپاہی بنے۔ چل بھاگ مردود۔

نامہ بر۔ رقعہ تو پڑھ لیجیے۔

خوجی۔ میں جلتی بتی لکڑی سے داغ دوں گا۔ نامعقول! مجھے کوئی لونڈا مقرر کیا ہے کیا ایسے ایسے بہروپیے یہاں جیب میں پڑے رہتے ہیں۔

نامہ بر چل دیا۔

میاں آزاد خانہ برباد نے تو اپنے انیمی دوست میاں خوجی کے پاس آدمی کو بھیجا تھا کہ اُن کو مع بوریا بدھنے اور تنگ توبڑے کے لے

---

[1] ٹٹو = گھوڑا [2] کسی چیز کے نیچے آجانا۔ ڈھب جانا

آئے مگر وہ بیرنگ واپس گیا۔ خوجی نے اس کو ایسا للکارا اور وہ ڈانٹ بتائی کہ اس کے حواس پیترا ہوئے اور بگٹٹ بھاگا تو گھر پر آن کر دم لیا۔ ہانپتے ہانپتے ڈیوڑھی سے اس نے پکارا کہ بوا زین۔

زیبن۔ اسباب وسباب لے آئے ہوتا۔

آدمی۔ کہاں کا اسباب۔ وہ تو کاٹنے دوڑے۔ یہ دیکھو قرآن کی قسم جو ذری اور بولوں نا تو وہ چکت دے کہ کان ہی اڑا لے جائے اور میں لنکتا ہی رہ جاؤں۔ وہ تو کچھ اول جلول سا بکنے لگے۔ کچھ سنک سی ہے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نازکبدن کا شوہر آگیا۔ زین نے صحن میں سے پکارا کہ بیگم صاحب لیجئے مرزا صاحب آگئے۔

بیگم۔ (وہی نازکبدن) کہو میاں آزاد سے تو کہیں مڈبھیڑ نہیں ہوئی؟

میرزا صاحب۔ شہر بھر گھوم آیا۔ سیکڑوں چکر لگائے مگر نہ ملے نہ ملے۔ سرا میں گیا تو خبر ملی کہ آئے ہیں۔ ایک شخص بیٹھے ہوئے تھے، اُن سے پوچھا تو بڑی دل لگی ہوئی۔ جیسے ہی میں قریب گیا اور وہ کلبلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کون آپ کون ؟ میں نے کہا۔ یہاں میاں آزاد نامے کوئی صاحب تشریف لائے ہیں۔ بولے کہ پھر آپ سے واسطہ؟ میں نے کہا صاحب آپ تو کاٹے کھاتے ہیں۔ آخر میں نے کیا آپ کو گالی دی تھی ؛ تو نعوذ دیکھ کر کہتے کیا ہیں (ارے اس بہروپیے نے تو ہماری ناک میں دم کر دیا۔ ہاری مانتا ہے نہ جیتی۔ تو پھر آیا آج بھلے مانس کی صورت بنا کر آئے ہیں، کل گھسیارے بنے تھے پرسوں کیا جانے کیا بنے تھے، غرض کہ ایسی ایسی اول جلول واہی تباہی تقریر اُنھوں نے کی کہ توبہ ہی بھلی۔ میں جو کچھ سمجھا ہوں کہ یہ کیا بک رہا ہے۔ آخر کار ایک عورت نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک سڑی سودائی آدمی ہیں۔ ان کے منہ نہ لگیے۔ ان کو ایک بہروپیا کئی بار ستا چکا ہے۔

بیگم۔ ذرا اوپر تو آؤ۔ دیکھو ہم نے میاں آزاد کو یہیں بلوا لیا نہ کہوگے۔

میرزا صاحب کھٹ کھٹ کرتے ہوئے کوٹھے پر آئے۔

میرزا صاحب (بغلگیر ہو کر) بسم اللہ حضرت آنکھیں ترستی تھیں آپ کی زیارت کو۔ میں تو سرا میں گیا تھا مگر وہ آپ کے رفیق ڈانٹنے لگے۔ سمجھے کہ یہ بھی بہروپیا ہے۔

آزاد۔ وہ ایک سودائی آدمی ہیں۔

میرزا صاحب۔ اب آپ آرام سے بیٹھیں۔ اچھی طرح سے تشریف رکھئے۔

بیگم۔ (اپنے شوہر میرزا صاحب سے) میاں آزاد کو بڑا کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو تم آن کر ہم پر خفا ہو اور نامحرم کو یہاں دیکھ کر ہم سے بد دماغ ہو جاؤ۔ (مسکرا کر) یہ کبھی مرہٹوں کے ملک میں نہیں رہے۔

میرزا صاحب۔ (آزاد سے) حضرت ہم عرصۂ دراز تک دکھن میں رہے ہیں۔ پردے کا چنداں خیال نہیں اور پھر آپ سے جس کرا نے آپ کی سفارش کی ہے۔

آزاد۔ آپ کی نوازش۔

میرزا صاحب۔ خدا گواہ ہے اس وقت آپ کی ملاقات سے طبیعت اس درجہ مسرور ہوئی کہ ع۔ دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من۔ انشاء اللہ ایک جلسہ عام یہاں منعقد ہونے والا ہے جس میں علمائے بمبئی آپ کو ایڈریس اور اہلِ اسلام شریک جلسہ ہو کر دعائے خیر دیں گے۔ خدا آپ کو اس ارادے میں کامیاب کرے۔

ادھر میاں خوجی اپنے دل میں سوچے کہ عزت بھی ڈوب رہی گئی، مشیخت میں دھکا لگا۔ بڑی ہی کرکری ہوئی کھلی ملیا چکما

بہروپیے سے کہنا چاہیے کہ وہ بھی عمر بھر یاد کرے۔ کئی گھنٹے تک اسی میں غلطاں و پیچاں رہے حتیٰ کہ افیم کھانا تک بھول گئے کہ اتنے میں میرزا صاحب کا آدمی آیا اور میاں آزاد کا خط دکھایا۔ پہلے تو خوجی جھجکے کہ یہ بہروپیا ہے مگر بغور دیکھا تو لفافہ پر میاں آزاد کے دستخط پائے۔ لیا اور پڑھا۔ خواجہ صاحب میں نے سنا کہ اس بہروپیے نے جس کے ساتھ آپ نکاح کرنا چاہتے تھے، آپ کو خوب ہی جھانسے دیے۔ لاحول ولاقوۃ۔ خیر وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ اب اس آدمی کے ہمراہ تشریف لائیے ورنہ وہ پھر آپ کو دھوکا دے گا اور آپ کو کہتے دھرتے کچھ نہ بن پڑے گی۔ بھائی کہا مانو اور آؤ اور جلد آؤ اور ضرور آؤ۔ مگر خرابی تو یہ ہے کہ تم نے آدمی کو دور سے دیکھا اور للکارنا شروع کیا کہ بھلا بے بہروپیے ہم پہچان گئے۔ خدا خیر کرے میں جانتا ہوں کہ اب مجھی کو آنا پڑے گا۔ خیر ہر چہ بادا باد۔ (آزاد)

خوجی نے یہ خط پڑھ کر کل اسباب خدمت گار کے سپرد کر دیا اور کہا ان سے کہہ دینا کہ ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ آپ مطمئن رہیں مگر ہم کو پتا تو بتا دو۔ خدمت گار نے ٹھیک ٹھیک پتہ بتا دیا۔

خوجی ایک شخص سے بہروپیے کے مکان کا پتہ پوچھ چکے تھے۔ پوچھتے پوچھتے بہروپیے کے مکان پر داخل ہوئے۔ اس وقت حسنِ اتفاق سے بہروپیا گھر میں نہ تھا اور بہروپیے کی بیوی کو ضرورت تھی کہ اپنے جان پہچان کے پاس تیس روپیہ بھیجے۔ وہ پارسل بنا کر اور سی کر رکھ چکی تھی اور لونڈی کو سکھا دیا تھا کہ جو کوئی پڑھا لکھا ادھر سے نکلے تو پارسل کا لفافہ لکھوا لینا۔ لونڈی کھڑی راہ دیکھ رہی تھی۔ میاں خوجی تو اس تاک میں ——————————— کہ کسی ڈھب سے لونڈی ہم کلام ہو اور لونڈی اس فکر میں کہ کوئی منشی یا مولوی ملیں تو مزے سے لفافہ لکھواؤں۔ خوجی سے اور اس سے یوں گفتگو ہوئی۔

خوجی (لونڈی سے) کیوں جی ذری پانی نہیں پلاتی ہو۔

لونڈی یہ سنتے ہی پھول گئی تو منہ مانگی مراد پائی۔ جو دل میں آرزو تھی بر آئی اور خوش ہو کر بولی کہ میاں بیٹھو پانی پیو۔ گلوری کھاؤ۔ حقہ گڑگڑاؤ۔ میں ابھی لائی۔ دوڑتی دوڑتی گھر میں گئی اور ہنس کر بیوی سے کہا کہ لو اب کیا چاہتی ہو۔ میں پانی لیے جاتی ہوں۔ آپ جھپ سے ایک گلوری بنا رکھئے ایک منشی جی کو بڑی دُور سے پھانس پھونس کر دم دلاسا دے کر گانٹھ لائی ہوں۔ دو آنے پر راضی ہوئے ہیں لونڈی اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ جس آفتابے میں پان بھیگ رہے تھے وہی جلدی سے اُٹھا لے گئی۔ پانی کھاری اور کڑوا جیسے نیب پائینچے ایک ہاتھ سے اٹھائے دوسرے ہاتھ میں کٹورا لئے باہر پہنچی۔

لونڈی۔ لیجئے میاں پیجئے۔

خوجی۔ (ہنس کر) لاؤ تم بڑی نیک بخت ہو بوا۔

خوجی نے کٹورے سے پانی پیا تو غل مچایا کہ ارے غضب کیا زہر ملا لائی ہو۔ مار ہی ڈالا۔ لاحول ولا قوۃ۔ (اپنے دل میں) سچ ہے واللہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ بہروپیے کی لونڈی نے تو اس کے بھی کان کاٹے خیر لونڈی جھٹ پٹ اندر گئی اور صراحی سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی لائی۔ میاں خوجی نے پیا تو جان میں جان آئی۔ اتنے میں گلوری تو بیوی نے بنا ہی رکھی تھی لا کر میاں خوجی کو دی۔ چباتے ہی اُگل دی۔ منہ ہی کاٹ ڈالا۔ چونا ہی چونا لگا لائی ہو ارے توبہ (دل میں) یہ اس بہروپیے کی بیوی، تو لونڈی کی بھی خالہ ہے۔ بڑی بی تو بڑی بی چھوٹی بی سبحان اللہ۔ دونوں بس کی گانٹھ۔

اتنے میں لونڈی اندر سے پارسل لائی اور کہا کہ میاں اتنا ہم پر احسان کرو کہ اس پارسل کا لفافہ لکھ دو۔

خوجی۔ لفافہ اچھا۔ کہاں جائے گا کس کے نام ہے۔ کون بھیجتا ہے۔ کچھ معلوم بھی تو ہو۔

لونڈی۔ میں بیوی سے سب حال پوچھ لوں تو بتاؤں۔ آپ بیٹھے رہیئے گا۔ پارسل مجھے دے دیجئے۔ ابھی ابھی آئی دم پر دے کے

پاس سے ! میاں جانا نہیں میں صدقے ایک گلوری اور کھلاؤں گی۔

خوجی۔ اچھا اچھا جاؤ (دل میں سوچ کر) اُف اوہ کیا کائیاں لونڈی ہے۔ پارسل جھپاک سے لے ہی بھاگی نہیں تو اس وقت پارسل ہی اڑا دیتا۔ لونڈی اندر سے پارسل لے آئی اور بیوی یعنی بہروپیئے کی جورو نے پردے کے پاس سے پتہ بتا دیا۔ میاں خوجی نے بچے اور نشان کی دم میں رسّا باندھا اپنا نام اس پر جلی قلم سے لکھ دیا۔

بعز اسمہ در بلدہ بمبئی محلہ بھنڈی بازار بر دولت خانہ میرزا اسد بیگ صاحب درجۂ خاص میاں آزاد سیاح اور آزاد نزد جناب قبلہ وکعبہ میاں خواجہ بدیع صاحب مدظلہ مشرف باد۔

یہ لفافہ لکھ کر حضرت نے لونڈی کو دیا اور اپنی راہ لی۔ لونڈی نے فوراً ڈاک خانہ میں پارسل دی اور رجسٹری کرا کے چلتی ہوئی۔

میاں خوجی کو پتہ تو معلوم ہی تھا پہنچے تو وہاں بڑی دل لگی ہوئی۔

دوسرے دن کوئی دوپہر دن چڑھے ڈاک کا ہرکارہ لال لال پگیا پہ جمائے چونگلا دبائے میرزا صاحب کے مکان پر آیا۔

ہرکارہ۔ (میرزا سے) آپ کے یہاں کھوجی ٹکے ہیں۔

میرزا۔ کون کھوجی۔ اپنے یہاں کھوجی کا کیا کام؟

خوجی۔ ہاں ہاں جی ہمارے نام پارسل آیا ہوگا (اٹھ کر پارسل لیا دستخط کیے اور ہرکارہ روانہ باشد)۔

اب آزاد متحیر ہیں کہ اس مردک کے پاس پارسل کہاں سے آیا ہوگا۔ پڑھا تو سخت متحیر ہوئے کہ قبلہ وکعبہ لکھا ہے اور پتا ٹھیک ٹھیک۔ اُدھر بہروپیا جو گھر میں گھسا تو بیوی نے کہا لو تم لفافہ نہیں لکھتے تھے ہم نے لکھوا لیا اور جھپ سے پارسل بھجوا دی۔

لونڈی۔ ایک ٹھگنے ٹھگنے دُبلے پتلے آدمی تھے۔ افیم کی پینک میں اونگھتے جاتے تھے۔ انھوں نے لکھ دیا۔

بہروپیا۔ (ہاتھ مل کر) ارے! افسوس اُف مار ڈالا۔ دے گیا چکما۔ ہو نہ ہو وہی سڑا والا خوجی ہو بس غضب ہی ہوگیا۔

بیوی۔ خیر تو ہے؟

بہروپیا۔ کچھ نہ پوچھو۔

بیوی۔ یہ افسوس کیسا، جلد حال بتاؤ۔ کلیجہ اُلٹا جاتا ہے۔

بہروپیا۔ تم سے کیا بتاؤں۔

ادھر میرزا صاحب کے ہاں خوجی نے افیم کی چسکی لگائی اور پلنگ پہ دراز۔ مگر چشم نیم باز۔ زیبن لونڈی جو باہر آئی تو حضرت کو پینک میں دیکھ کر خوب ہی کھلکھلائی اور اندر جاکر بیوی سے یوں کہا۔

زیبن۔ اے بیگم صاحب ذری پردے کے پاس آئیے تو لوٹ لوٹ جائیے یہ موا خوجی سودائی بڑی افیم کھاتا ہے۔ ہے ہے مجھ سے مارے ہنسی کے رہا نہ گیا۔ ذری آئیے تو سہی۔ بیگم کمسن تو تھیں ہی۔ پردے کے پاس سے جو جھانکا تو اُن کو ایک دل لگی سوجھی۔ جھپ سے ایک بتی بنائی اور زیبن سے کہا کہ لے چپکے سے ان کی ناک میں بتی کر۔ زیبن ایک ہی شریر بس کی گانٹھ وہ جاکے بتی میں تتیا مرچ لگا لائی اور خوجی کی کھٹیا کے نیچے گھس کر سرہانے کی طرف گئی اور ہاتھ بڑھا کر میاں خوجی کی ناک میں آدھی بتی داخل ہی تو کر دی اور جھپ سے کھینچ لی۔ اف واللہ اس وقت مارے ہنسی کے لکھا نہیں جاتا۔ خوجی جو کلبلا کر اُٹھے تو آچھیں۔ چھیں۔ چھیں۔ آچھیں چھیں۔ اتفاق سے ٹپوس میں ایک پرانے فیشن کے بزرگوار نوکری کی تلاش میں ایک حاکم کے پاس جانے والے تھے وہ جیسے دہلیز

کے پاس آئے ویسے ہی خوجی نے چھینکا۔ اندر چلے گئے۔ بیوی نے ایک گلوری دی، چباتے ہوئے چلے ہی تھے کہ پھر چھینک پڑی، لاحول ولا۔ پھر اندر گئے اب کی چکنی ڈلی کھائی۔ روانہ ہونے ہی کو تھے کہ ادھر آ آچھیں کی آواز آئی اور ادھر بیوی نے لونڈی دوڑائی کہ اندر چلیے کہ بیوی بلاتی ہیں۔ اندر جا کر انھوں نے جوتے کا پاؤں بدلا، پانی بھی پیا اور رخصت ہوئے۔ جیسے ہی باہر آن کر رکاب پر پاؤں رکھنے کو تھے کہ خوجی نے ناک کی دونالی بندوق سے ایک اور فیر داغ دی۔ تب وہ بہت ہی جھلائے۔ ہات تیرے چھینکنے والے کی ناک کاٹوں مردود کی۔ مردک نے مرچوں کی ناس لی ہے کیا، ناک کیا تک چھکنی کی جھاڑی ہے۔ ہات تری ناک پر چکت دوں منحوس نے جانا دوبھر کر دیا۔ رکاب پر قدم رکھا اور چھیں۔ دہلیز تک آئے اور چھیں۔

خدا سمجھے۔ بیوی اندر سے بولیں کہ ناک ہی کٹے موئے کی جو بدشگونی کے لیے ایسی دل لگی بازی کرے۔ ذری زمین کو بلا کر پوچھ تو یہ کس نکھٹے مونڈی کاٹے کو بسایا ہے؟ اللہ کرے گدھے کی سواری نصیب ہو۔

ادھر یہ میاں بیوی پانی پی پی کر بیچارے کو کوس رہے تھے اُدھر خوجی کا چھینکتے چھینکتے سچ مچ ناک میں دم ہو گیا اور بیگم صاحب گھر کے اندر لوٹ رہی تھیں۔ ہنسی کا ضبط کرنا محال تھا۔ مگر واہ ری زمین وہ سٹواں کھینچی کہ سبحان اللہ چارپائی کے نیچے دبکی پڑی رہی تو سانس تک نہ لی۔ مگر مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ سمجھی کہ ہنسی اور قلعی کھلی۔ دم بخود خوجی ابھی تک چھینک ہی رہے ہیں جب چھینکنے نے ذرا فرصت دی تو انھوں نے غل مچایا او گیدی۔ بھلا بے بہروپیے نکالی نہ کسر تو نے، اچھا بچہ چچا ہی بنا کر چھوڑ دوں تو سہی۔

اتنے میں میاں خوجی نے دروازے سب بند کر دیے جب دروازے بند ہوئے تو زمین کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اور قریب تھا کہ چیخ کر نکل بھاگے مگر دیکھا کہ میاں خوجی چارپائی پر دراز ہوئے اور ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ زمین کی جان میں جان آئی اور چپکے سے کھسکتی ہوئی نکلی اور بھاگی دروازہ تک پہنچی ہی تھی کہ خوب کھلکھلا کر ہنسی اور ادھر بیگم صاحب قہقہے لگاتی تھیں۔ ادھر بی زمین لوٹی جاتی تھیں۔

بیگم۔ جاؤ۔ اب کی پھر چپکے چپکے ناک میں بتی کرنا۔

زمین۔ نا بیوی اب میں نہ جانے کی۔ سڑی سودائی آدمی اس کے مُنہ کون لگے؟

بیگم۔ ہاں نہ جاؤ گی۔ اچھا نہ جاؤ۔

زمین۔ لو بیوی یہ زبردستی کی بات ہی اور ہے۔ وہ کیا مثل ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔

اتنے میں زمین کا دیور دس برس کا چھوکرا مگر آفت کا پرکالہ انتہا کا شریر۔ شیطان کا بچا اور کانا۔ ایک تو کڑوا کریلا دوسرے نیب چڑھا! رگ رگ میں شرارت اتنا سا لونڈا مگر بلا کا بدذات۔ اس نے کہا میں جاتا ہوں اور دیکھے جائیے بیگم صاحب کیسا انگلیوں پر اُس افیمچی کو نچاتا ہوں گی انام (انعام) لوں گا۔ بیگم صاحب بولیں کہ اچھا ہمیں ہنسا دے تو انعام دیں گے۔ لونڈے نے جا کر جھانکا تو دیکھا حضرت کی خبر آگئی ہے۔ دوڑا دوڑا آیا اور کہا وہ تو اس وقت خدا جانے کہاں ہیں۔ بیچارے خوب آدمی تھے۔ کتا گھر میں بندھا تھا جھٹ اُس کو زنجیر سے کھول زنجیر میں رسی باندھی اور باہر لے جا کر چارپائی کے پائے میں کتے کو باندھا اور میاں خوجی کی ٹانگ میں بھی رسی باندھ دی اور چمپت۔ کتے نے جو بھونکنا شروع کیا تو خوجی چونک اُٹھے مگر ہاتھ ابھی ناک پر ہی ہے۔ دیکھتے ہیں تو ٹانگ میں رسی اور رسی میں کتا۔ اب ادھر خوجی چلاتے ہیں۔ ادھر شیر اچل اچل مچاتے ہیں۔ رسی اور لے خاموشی۔

سے دوڑا آیا۔ خیر تو ہے خیر تو ہے۔ کیا ہوا ارے! ذرا سنو کوئی کتے کو ان کی ٹانگ سے باندھ گیا ہے۔ اب زور نہ کیجئے ورنہ کتا مفت میں ٹانگ لے گا۔

خوجی۔ ہونہہ۔ پوچھتے ہیں کون باندھ گیا ہے۔ کون کیا۔ یہ اُسی بہروپیے مردک کا کام ہے اور کسی کو کیا پڑی تھی۔

زمین۔ اے کیا ہوا میاں کیوں غل غپاڑا مچایا ہے۔

لونڈا۔ اجی میاں کی ٹانگ میں کوئی بہروپیا کتا باندھ گیا ہے۔

زمین۔ دیکھو اوئی کیا کیا لوگ ہیں۔ لو ٹانگ میں کتا باندھ دیا۔

خوجی۔ ٹانگ میں کتا باندھ گیا! یوں نہیں کہتیں کہ دم میں نمدا باندھ گیا۔

زمین۔ (ہنس کر) ہاں میاں بھول گئی تھی۔ سچ مچ دم میں موا نمدا ہی باندھ گیا۔ مگر یہ آیا کدھر سے۔ کواڑے تو سب کے سب بند پڑے ہیں۔

خوجی۔ یہی تو مجھے بھی حیرت ہے مگر ابھی میں نے بھی ناک پر اس زور سے ہاتھ رکھا کہ بہروپیا بھی میرا لوہا مان گیا ہوگا۔ اب یہ تو سوچو کہ آیا کس طرف سے؟ اچھی دل لگی نکالی۔ بھلا کتے اور بلی کی دل لگی کون سی نکالی ہے؟ ابھی ہیں چھچھوندر ہی مردک کی ٹانگ سے باندھوں گا۔ ٹھہر تو جاؤ چچا جان۔

زمین۔ میاں کتے ڈر معلوم ہوتا ہے اس جگہ ایک خبیث رہتا ہے۔

خوجی۔ خبیث! اجی نہیں یہ اس بہروپیے ہی کا کام ہے۔

لونڈا۔ جب تک خبیث ان کی کھٹیا کو نہ الٹ دے گا تب تک مانیں گے تھوڑا ہی۔

خوجی۔ یہ بات تھی تو اب تک ہم سے کیوں نہ کہا۔ جان لوگی کسی کی دو دن کے لیے مہمان تمہارے ہاں آیا اور خبیث کو پیچھے لگا دیا۔ اب رات کو جو یہاں سوئے اس پر تین حرف۔

زمین۔ میں بھی کہوں کہ یہ بند دروازہ اور کتا باندھ جانا کیا اچنبھے کی بات ہے۔

خوجی۔ واہ کیا دانائی اپنی بیان کر رہی ہو؟ آزاد آئیں تو ان کو آڑے ہاتھوں لوں۔ وہ خبیث پریت چڑیل بھوت جن ایک کے قائل نہیں۔ سوئیں تو معلوم ہو کہ کبھی بلی میاؤں میاؤں کر رہی ہے کبھی کتا بھونک رہا ہے۔ ایک پائنتی دوسرا سرہانے۔

خوجی تو یہاں خبیث کے پھیر میں تھے اور اُدھر میاں آزاد علما و فضلا سے مصافحہ و معانقہ کرتے پھرتے تھے۔ جدھر نکل گئے انگلیاں اٹھنے لگیں۔ مسلمان اُن کی زیارت کو جوق جوق اُمڈے چلے آتے تھے۔ اور جو ملتا تھا وہ تعریف کے پُل باندھ دیتا تھا کہ واہ آزاد سبحان اللہ۔ ع۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ آزاد دل ہی دل میں حسن آرا کا شکریہ ادا کرتے تھے کہ نہ اُس بت پندار سے آنکھ لڑتی نہ تمام ہندوستان میں ہمارا نام مشہور ہوتا۔ حسن آرا کو سیکڑوں دعائیں دیتے تھے۔ جہاز کا بھی پیر صاحب نے خوب بندوبست کر دیا۔

مانجھی سے سوال وجواب

خوجی نے ایک دن کہا۔ ارے یار کیا اندھیر ہے۔ تم روم چلتے چلتے بہے بہے کہاں پھرتے ہو کہیں پریوں کے جوبن لوٹے کہیں قاضی القضات حضرت مولانا محمد عبدالقدوس صاحب سے غامت علمت فہو علمت کیا۔ اتنے دن تک نواب ہی کے ہاں پڑے رہے اور پھر ایک ہو تو کہوں دو ہوں تو چپ رہوں تین ہوں تو گنوں چار ہوں تو شمار کروں۔ جب ہر مقام پر ایک نئی چھیل چھبیلی پر ریجھے تو کہاں تک گنوں۔ بھئی میں تو بکتے بکتے دیوانہ ہوگیا یاالٰہی مگر افسوس ہے کہ تم کو اپنی بات کا ذرا پاس نہیں کسی سے وعدہ کیا ہے پورا کرنا چاہیئے یا نہیں۔ اب آخر روم کب جاؤ گے عاقبت میں یا حشر کے دن۔ اجی بس۔

آزاد۔ میرزا صاحب اتنے دنوں میں خوجی نے ایک یہی تو بات پکی کہی۔ اب جہاز کا جلد انتظام کیجئے۔

میرزا۔ اجی حضرت تیاری کیجئے۔

خوجی۔ قبلہ پہلے بتائیے کہ کتنے دن کا سفر ہے؟

آزاد۔ اس سے کیا واسطہ؟

خوجی۔ اور سنیے۔ اس سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔

آزاد۔ بھئی ہم کبھی جہاز پر سوار ہوئے ہوں تو بتائیں۔

خوجی۔ جہاز! ہائے غضب۔ کیا تری تری جانا ہوگا؟

آزاد۔ اجی اور نہیں تو کیا خشکی خشکی۔ آپ ابھی تک اسی بھروسے تھے بہت جلد چونکے۔

خوجی۔ میری تو روح لرزنے لگی۔ بھیا میں نہ جانے کا۔ بابا من نمی رفتم دہ لاحول۔ من نخواہم رفت۔

آزاد۔ اجی وہ برندش کا معاملہ ہو تو سہی۔ چلو وہاں ترکی عورت کے ساتھ تمھارا بیاہ کرا دیں گے۔

خوجی۔ خشکی خشکی چلو تو بھائی میں چلوں گا۔ سمندر میں جاتے پاؤں ڈگمگاتا ہے۔

میرزا۔ جناب خواجہ صاحب آپ کو شرم نہیں آتی اتنی دور تک ساتھ آئے اور اب ساتھ چھوڑے دیتے ہو۔ ڈوب مرنے کی بات ہے۔

خوجی۔ کیا خوب یوں بھی ڈوبوں اور دوں بھی ڈوبوں۔ تو یہ اس قدر ضد کیوں کرتے ہیں خشکی ہی خشکی کیوں نہیں چلتے:

میرزا۔ آپ بھی واللہ نرے جونگ ہی رہے۔ عجب آدمی ہو بھئی۔ خشکی کی راہ سے کتنے دن میں پہنچے گا بھلا۔ کچھ ٹھکانا ہے، کجا بمبئی کجا قسطنطنیہ۔ آپ بھی طرفہ معجون ہیں۔ پرسوں جہاز پر سوار ہو دُن سے روم داخل۔ خشکی کی ایک ہی کہی۔

خوجی۔ اب آپ سے حجت کون کرے آپ تو ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ جہاز کا کون اعتبار اور جو ڈوب گیا۔ ذرا کسی سوراخ کی راہ سے پانی آیا اور پہنچے جہنم سیدھے۔ ع چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔ ذرا ہوا تیز چلی اور پچھم کے عوض پورب پہنچے۔

آزاد۔ تو نہیں چلو گے نہ۔ صاف صاف بتا دو ابھی سویرا ہے۔

خوجی۔ چلیں تو پیچ کھیت۔ ڈنکے کی چوٹ مگر پانی کا نام سنتا اور روح تحلیل ہوگئی۔ بھلا کیوں صاحب یہ تو بتائیے کہ

سمندر کا پاٹ گنگا کے پاٹ سے کوئی دونا ہوتا ہوگا - یا کچھ کم و بیش -

میرزا - جی بس اور کیا چلیے آپ کو سمندر دکھلائیں نہ تھوڑے ہی فاصلہ پر ہے -

خوجی - بس کیوں صاحب شہید مردوں سے بھی دل لگی - ہم کو لے چلیے اور چھپ سے چپر غٹو کرکے جہاز پر بٹھا دیجیے - ایک شرط سے چلتے ہیں - بیگم صاحب ضمانت کریں - ہمارے سر کی قسم کھائیں کہ زبردستی نہ کریں گے کہ خواہ مخواہ ہی جہاز پر جاؤ -

آزاد - کیا خوب آپ کیا اور آپ کا سر کیا چلیے ہم بیگم صاحب سے کہلوائے دیتے ہیں آپ اور آپ کے باپ دونوں کے سر کی قسم کھالیں تو سہی -

میرزا - اچھا چلیے وہ ضمانت کر دیں گی - آئیے اُٹھیے -

میرزا صاحب اور میاں آزاد دونوں مل کر گئے اور اُن سے کہا کہ واسطے خدا کے اس سڑی افیمی خبطی خوجی سے اتنا کہہ دیں کہ تو جہاز دیکھنے جا یہ لوگ زبردستی سوار نہ کر دیں گے - بیگم صاحب نے جو ساری روایت سنی تو خوب کھلکھلائیں اور تنک کر بولیں ہم نہ کہیں گے - اچھا خیر پردے کے پاس بلا لو -

خوجی - (پردے کے پاس سے) آداب بجا لاتا ہوں حضور -

جواب کون دے - بیگم صاحب تو مارے ہنسی کے لوٹی جاتی ہیں اور میاں آزاد کے خیال سے اپنی بے تکلفی اور چلبلاہٹ پر کسی قدر شرماتی ہیں مگر لجاتی بھی ہیں، اور کھلکھلاتی بھی ہیں اور شرم اور ہنسی دونوں نے مل کر رخساروں کو اور بھی سرخ کر دیا - اس وقت تغیر رنگ نے عجب جوبن دے دیا - اتنے میں خوجی نے پھر ہانک لگائی کہ آداب بجا لاتا ہوں - حضور غلام کو کیوں یاد فرمایا ہے؟

میرزا - وہ کہتی ہیں کہ ہم ضمانت کیے لیتے ہیں -

خوجی - آپ رہنے دیجیے انھیں کو کہنے دیجیے -

بیگم - خواجہ صاحب بندگی آپ کیا پوچھتے ہیں -

خوجی - اے حضور مجھ کو جہاز دکھانے کے لیے جاتے ہیں - جاؤں یا نہ جاؤں - جو حکم ہو بجا لاؤں

بیگم - کبھی بھولے سے نہ جانا - نہیں پھر کے نہ آوگے اور جو کہیں وہ مؤا بہروپیا مل گیا تو بس بن گئی بات -

خوجی - آپ ان کی ضمانت کرتی ہیں -

بیگم - میں کسی کی ضامن وامن نہیں ہوتی - زرد دیجیے ضامن نہ ہوجیے - یہ ڈلو ہی دب گے - موئی قزدلی رکھی ہی رہے گی -

خوجی - چلیے بس حد ہو گئی - اب ہم نہ جانے کے -

آزاد - بھائی تم ذرا ساتھ چل کر سیر تو دیکھ آؤ -

خوجی - واہ - اچھی سیر ہے - کسی کی جان جائے آپ کے نزدیک سیر ہے - اس جانے والے پر تین حرف -

خیر تو تھمبو کرکے میرزا صاحب اور میاں آزاد خوجی کو لے چلے - چلتے چلتے جب ساحل بحر پر پہنچے تو خوجی نے نظر بھر کر سمندر کو دیکھا دیکھتے ہی دو چار قدم پیچھے ہٹے اور چیخ پڑے پھر دس پانچ قدم پیچھے کھسکے اور رونے لگے -

خوجی - اف خداوندا بچائیو - یا خدا بچا - یہ ملک الموت ہے یا سمندر - لہریں دیکھتے ہی کلیجے کو کسی نے مسوس لیا -

میرزا - کیا لطف ہے - خدا کی قسم جی چاہتا ہے پھاند ہی پڑوں اُہو ہو ہو -

خوجی۔ (میرزا کا ہاتھ پکڑ کر) کہیں بھولے سے پھاندنے واندنے کا قصد بھی نہ کرنا۔ حیادار کے لیے ایک چلّو کافی ہے۔
آزاد۔عجب مسخرہ ہے بھئی۔ ایک آنکھ سے روتا ہے ایک سے ہنستا ہے۔

اتنے میں دوچار ملاح سامنے سے آئے۔خوجی نے جوان کو غور سے دیکھا تو ہنسے مچھٹی۔میرزا صاحب سے پوچھا کہ یہ کون ہیں بھئی ان کی تو کچھ وضع ہی نرالی ہے۔انھوں نے کہا یہ ملاح ہیں۔ دن رات سمندر ہی میں۔ جب دیکھئے جہاز پر

خوجی۔ بھلا یہ ہماری بولی سمجھ لے گا؟ اردو جانتا ہے کہ نہیں،

میرزا صاحب۔ ہاں ہاں جانتا کیوں نہیں ہے۔ ہزاروں ہندوستانیوں کو لے گیا ہے اردو خوب سمجھتا ہے۔

خوجی۔ (ایک بوڑھے ملاح سے) کیوں میاں مانجھی تمھارے باپ کہاں مرے تھے؟

مانجھی۔ساگر (سمندر) میں جہاز پر۔

خوجی۔ ہوں! اور دادا؟

مانجھی۔ وہ بھی جہاز پر۔

خوجی۔ ہوں۔ اور چچا وچا؟

مانجھی۔ وہ بھی سمندر میں۔

خوجی۔ افسوس۔بھلا تم کہاں مرو گے؟

مانجھی۔ اب یہ کون جانے کسی کو اپنے مرنے کا حال کیا معلوم؟ مگر مریں گے اسی سمندر میں ہم بھی۔

خوجی۔ پھر بھلا تمھارے کنبے کے اتنے مرے اور تم خود بھی وہیں مرنے والے ہو تو اس سے پرہیز کیوں نہیں کرتے اور کوئی پیشہ کرو۔

مانجھی۔ آپ کے باپ کہاں مرے تھے میاں؟

خوجی۔ ہمارے شہر میں اور کہاں مرتے!

مانجھی۔ اور دادا تمہارا کہاں مرا تھا؟

خوجی۔ وہ بھی شہر میں مرے تھے۔قبرستان میں ان کی بھی لاش ہے۔

مانجھی۔ اور چچا وچا سب کہاں مرے؟

خوجی۔ سب وہیں مرے۔کئی قبریں اب تک موجود ہیں۔

مانجھی۔(گردن ہلا کر) پھر آپ اس شہر کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے جہاں آپ کے باپ دادا اور چچا وچا اور عزیز سب مرے تھے؟

خوجی۔ واہ۔واہ۔شہر کے چھوڑنے سے کیا مرنے سے بچ جائیں گے۔ ہم چاہے جہاں رہیں۔ مریں گے ضرور۔ مرنا حق ہے چاہے یہاں سے لندن جائیں چاہے روم و شام جدھر جائیں ملک الموت سے بھلا کوئی بچ سکا ہے۔ ع۔علاج موت نہ کردند روسیاہ شدند۔

مانجھی پھر میں اپنا پیشہ کیوں چھوڑنے لگا۔ بھلا جب موت سے بچ ہی نہیں سکتا کوئی تو میں پیشہ کیوں چھوڑ دوں۔

خوجی۔آپ منطق بھی پڑھے ہیں معلوم ہوتا ہے۔اچھی دلیل پیش کی۔

مانجھی۔کیا؟ میں سمجھا نہیں۔

خوجی - اجی تم خوب سمجھتے ہو۔ مگر شکل و صورت سے تو ہم سمجھے تھے کہ جانگلو ہے لیکن تم خوب اردو بولتے ہو۔
مانجھی - میں جبل پور کا رہنے والا ہوں۔ باپ دادا سب نے یہی پیشہ کیا۔
آزاد - کیسے خواجہ صاحب جھینپے تو نہ ہوں گے آپ - سچ کتنا کیا جواب دیا۔ واہ رے مانجھی۔ کہیئے اب تو تشفی ہوئی چلئے گا جہاز پر۔
خوجی - ہاں ضرور۔ سوکام چھوڑ کر۔ نہ چلنا کیا (مانجھی سے) کیوں بھئی ہم کو پاؤں پاؤں تو نہ چلنا ہوگا کسی مقام پر۔
مانجھی - ہونھ - کیا دھرتی پر چلنا ہے؟
خوجی - بھلا افیم کھانے کی تو جہاز پر ممانعت نہیں ہے ؟
مانجھی - نہیں بہت سے آدمی افیم گھول کر پیا کرتے ہیں - جس کا جو جی چاہے کھائے ۔
خوجی - اے میں تیری زبان کے قربان - واہ میری جان - بس چنیا بیگم پاس ہوں تو مزے ہیں۔ بھلا کیوں میاں جہاز پر کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں سے سمندر نظر ہی نہ آئے اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں؟ سچ بتانا استاد - اجی ہم پانی سے بہت ڈرتے ہیں بھائی ۔
مانجھی - ہم آپ کو ایسی جگہ بٹھا دیں گے جہاں پانی آسمان کچھ سوجھ ہی نہ پڑے ۔
خوجی - صدقے۔ قربان۔ بڑے دوست ہو ہمارے - ایک بات اور بتا دو گنے ملتے جائیں گے راہ میں یا ان کا کال ہے ؟
مانجھی - اجی جو چاہو ساتھ رکھ لو۔
خوجی - اور جو منہ ہاتھ دھونے کو پانی کی ضرورت ہو تو کہاں سے آئے ؟
آزاد - پاگل ہے کون مسخرہ اتنا نہیں سمجھتا کہ سمندر میں جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ پانی کہاں سے آئے گا - سب پانی پیئں گے، تم پیاسے مرو گے دشت کربلا ہے نا احمق۔
خوجی - تو آپ کیوں الجھ پڑے - آپ سے پوچھتا کون گیدی ہے (ملاح سے) کیوں جی بھلا ہم گنے یہاں سے باندھ لے چلیں اور گنڈیریاں بنائیں اور جہاز پر چوسیں مگر چھلکے پھینکیں گے کہاں - آخر ہم صبح و شام دو چار پونڈے کھایا چاہیں۔
آزاد - یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے - ہم بتا دیں گے آپ بدحواس نہ ہوں ۔
خوجی - اس کی ممانعت نہیں ہے کہ کوئی پینک میں نہ ہو۔
مانجھی - (ہنس کر) نہ ۔
خوجی - اور جو قرولی باندھے ہو تو ہرج تو نہیں ہے کچھ یا مثلاً قرابینچہ؟
مانجھی - چاہے جو ہو توپ نہ ہو اور تارپیڈو نہ ہو - تلوار ہو کٹار ہو چاہے جو ہو مگر لائسنس ضرور ہونا چاہیے ۔
خوجی - ہوں۔ دیکھیے ایک بات معلوم ہوئی نہ۔ اچھا یہ سب تو ہوا - اب دو دو باتیں اور ہو جائیں - ایک تو یہ بات پوچھنی ہے کہ بہروپیے تو جہاز پر نہیں چڑھنے پاتے ۔
مانجھی - چاہے جو سوار ہو - دام دے سوار ہو لے کسی کا دہ نہیں مُل۔
خوجی - اجی مُل کو ڈالو بھاڑ میں - ہمارے سوال کا جواب دو۔ کمہار تو نہیں ہوتے ؟
مانجھی - آج تلک کوئی کمہار گیا نہیں - یاد نہیں پڑتا ۔
خوجی - اے میں تیری زبان کے پھر قربان - بڑی ڈھارس ہوئی خیر کمہار سے تو بچے - باقی رہا بہروپیا - اس گیدی کو سمجھ لوں گا - اتنی قرولیاں بھونکوں کہ یاد ہی تو کرے - آخر حوض میں گرا ہی تو دیا۔

مانجھی ۔ اتنی باتیں توکسی نے بھی نہ پوچھی تھیں ۔ اب کچھ اور پوچھو گے؟
خوجی ۔ ہاں بس ایک بات اور وہ بھی دو پٹی ۔ یہ قید تو نہیں ہے کہ صبح و شام ہر شخص ضرور ہی نہائے : اگر یہ قید ہوئی تو جانے والے پر تین حرف ۔ ہم کوئی جیل خانہ میں تو ہوں گے نہیں ۔
مانجھی ۔ آپ چاہے عمر بھر نہ نہائیں ۔
خوجی ۔ اے میں تیری زبان کے قربان ۔
مانجھی ۔ افیم بہت کھاتے ہو معلوم دیتا ہے ۔
خوجی ۔ (مسکرا کر) ہاں خوب پہچان گئے ۔ آپ قیافہ شناس بھی ہیں خیر سے یہ تم کیوں کر پوچھ گئے ۔ بھائی شوق ہو تو گھولوں ۔
مانجھی ۔ ڈت ۔ بس الگ رہیو ۔ ہم افیم کو چھوتے تک نہیں ۔
خوجی ۔ (بگڑ کر) او گیدی ۔ ملے کا آدمی تم اور جھک مارتا ہے ۔ نکالوں قرولی ۔
آزاد ۔ ہاں ہاں خواجہ صاحب ۔ دیکھیے دیکھیے جانے دیجئے گا ۔ ذرا قرولی میان ہی میں رہے ۔
میرزا ۔ جناب خواجہ بدیع صاحب آپ اپنی طرف دیکھیے درگذر کیجیے بد تمیز ہے ۔
خوجی ۔ خیر آپ لوگوں کی خاطر ہے ورنہ ادھیڑ کے رکھ دیتا پاجی کو (اکڑ کر) مجھے بھی کوئی اور سمجھا ہے ۔ یہاں سیف اللہ کے اکھاڑے میں کشتی لڑا کئے ہیں ۔ دل لگی ہے کچھ ۔ کہنے لگا ڈت ۔ واہ اچھی دو دو بک ہے ۔ اس وقت آپ لوگ بیچ میں نہ پڑیں تو پھر کس ہی نکال دیا ہوتا ۔

زن مرید

سرِ شام دلارام نازک اندام یعنی میرزا صاحب کی زوجہ شوخ دگلفام نے پردے کے پاس آکر کہا آج اس وقت کچھ چہل پہل نہیں کیا ہوا خوجی دنیا سے سدھارا۔ میرزا صاحب نے خوجی سے کہا کہ حضرت کوئی ذرا چھیڑیئے، دیکھیئے بیگم صاحب کھڑی تقاضۂ شدید کر رہی ہیں۔

خوجی۔ واللہ وہ پھڑکتا ہوا لطیفہ سناؤں کہ لوٹ لوٹ جائیے۔ جامے میں مارے خوشی کے پھولے نہ سمایئے۔

بیگم۔ اچھا کہو سنائیے۔ یہ زبانی داخلہ بہت سنا ہے جب منہ سے پھوٹے بھی کچھ۔

خوجی۔ پھر افیم پلوایئے گا؟

بیگم۔ ہاں ہاں کہو تو۔ مرد تو پوست ہی کے کھیت میں دفنا دئے جاؤ۔ کافور کی جگہ افیم ہی ہو تو سہی۔

خوجی۔ ایک شخص تھے خوشنویس جواہر رقم خاں اور ان کے بھائی جان یاقوت قلم خاں، دونوں اس کے مقابل میں گرد۔ حافظ نوراللہ اور ہادی علی تک کی گرم بازاری سرد۔ مگر بے عیب تو بس خدا کی ذات ہے یا میاں خوجی کی۔ باقی خدا کا نام اور نستعلیق تمام ان حضرت میں ایک سخت عیب یہ تھا کہ غلط نویس نہ تھے۔

آزاد۔ اتنا بڑا جانگلو دیکھا نہ سنا۔

خوجی۔ خدا ان لوگوں سے بچائے۔ میرا تو ناک میں دم آگیا۔ بات پوری سنی نہیں اور اعتراض جمانے کو موجود۔ خم ٹھوک کر لڑنے کو مستعد۔ بات کاٹنے پر ادھار رکھائے ہوئے۔ خوجی مردود کا یہ مطلب ہے کہ وہ غلط نویس نہ تھا مگر یہ عیب تھا کہ اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے تھے۔ ایک شخص کو قرآن شریف لکھوانے کی ضرورت ہوئی، سوچے کہ ان سے بڑھ کر کوئی خوشنویس نہیں۔ اگر دس پانچ روپیہ زیادہ بھی صرف ہوں تو بلا سے مگر لکھوائیں گے انھیں سے۔ روپیہ کی ایسی تیسی۔

بیگم۔ اے واہ ری عقل کوئی آپ ہی کے سے جانگلو ہوں گے گلی بہ گلی چھاپہ خانے ہیں۔ کوئی چھپا ہوا قرآن کیوں نہ لے لیا۔

خوجی۔ حضور وہ سیدھے سادے مسلمان تھے منطق نہیں پڑھنے تھے۔ خیر صاحب خوشنویس کے پاس پہنچے کہا کہ حضرت جو اجرت فرمایئے دونگا۔ مگر دست بستہ ایک عرض ہے کہیئے کہوں کہیئے نہ کہوں۔ انھوں نے کہا ضرور فرمائیے۔ خدا اور خدا کا رسول گواہ ہے کہ ایسے لکھوں کہ جو دیکھے پھڑک جائے وہ نسخہ ہو کہ کیمیاگر بھی وجد کرنے لگے۔ ہاں حضرت، یہ تو صحیح ہے کہ ذرا اپنی طرف سے نہ بڑھا دیجیئے گا۔ اور چاہے خدائی بھر کے کلام کو اصلاح دیجیئے۔ لیکن اللہ میاں کی شان میں یہ گستاخی ناجائز ہے۔ خوشنویس نے کہا کیا مجال۔ یہ کلام مجید ہے ممکن کیا کہ اس عاصی کے قلم سے ایک نقطہ بھی بدلنے پائے۔ توبہ توبہ۔ آپ مطمئن رہیئے۔ ایسا نہ ہونے پائے گا۔ خیر حضرت وہ تو گھر گئے ادھر میاں خوشنویس لکھنے بیٹھے جب ختم کر چکے تو کتاب پاک لے کر چلے۔ کوئی ایک مہینے میں قرآن لکھ ڈالا۔ لیجیئے حضور قرآن موجود ہے ملاحظہ فرمائیے۔ میری محنت پر نظر ڈالیے اور غور کیجیئے کہ دیدہ ریزی کا کام ہے۔ انھوں نے سر جھکایا اور تھوڑی دیر غور کر کے کہا کہ ایک بات صاف فرما دیجیئے کہیں کچھ اپنی طرف سے تو نہیں ملا دیا ہے۔ خوشنویس نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ بدلتے یا بڑھاتے ہوئے ہاتھ کانپتے تھے۔ مگر اس میں جا بجا شیطان اور ابلیس کا

نام تھا میں نے سوچا کہ کتاب مقدس اور شیطان کا لفظ۔ اچھی بات نہیں۔ لہذا کہیں آپ کے باپ کا نام لکھ دیا کہیں شیطان کی جگہ اپنے پدر بزرگوار کا نام لکھ دیا۔

بیگم۔ بس یہی لطیفہ۔ یہ تو پُرانا لطیفہ ہے۔

خوجی۔ جی اس دھاندلی کی سند نہیں اب افیم پلانے کا وقت آیا تو دھاندلی کی سند لینے لگیں۔

اتنے میں میرزا صاحب نے خوجی کو افیم کے عوض خالی پلا دیا۔ کہیں بالکل خالی پانی ہی نہ سمجھ لیجیئے گا اس میں ذرا سا کتھا بھی ملا تھا جس میں رنگ آ جائے۔ جھٹپٹا وقت خوجی کو دن کو اونٹ کی گردن تو سوجھتی ہی نہ تھی۔ بھلا شب کے وقت افیم اور کتھے کے رنگ میں کیا تمیز کرتے، آپ نے غنیمت سمجھ کر پیالے کا پیالہ چڑھا لیا مگر واہ ری افیم اور واہ رے تیرے خیال پینتے ہی حضرت غین ہو گئے۔ دین و دنیا سے بے فکر خبر ہی نہیں۔ جب چاندنی نے سبزے میں کھیت کیا اور رات بھیگی تو میاں آزاد نے اپنے بستر پہ آرام فرمایا اور میرزا صاحب نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے کمرے کو رشک گلزار بنا دیا تو خوجی کلبلا کر اُٹھ بیٹھے۔

خوجی۔ ایں! چو طرفہ سناٹا۔ ہو کا عالم۔ آدمی کیا جانور تک نظر نہیں آتے اور نشہ ہرن۔ بھئی کچھ عجب بکس افیم تھی کہ گویا پی ہی نہیں۔ مگر پہلے تو بڑا زور کیا تھا میں غین ہی ہو گیا تھا۔

خیر اب ذرا میاں خواجہ بدیع صاحب کی دہشت ملاحظہ فرمائیے چنیا بیگم نے انگلیوں پر نچایا۔ جمائیوں کی ڈاک بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے پانی جاری ہونے لگا بدن سنسنا رہا ہے۔ کلیجہ بلیوں اُچھلتا ہے۔ خون خشک اپنی قضا کے خود نوحہ خوان نزع کی حالت میں سسکتے رہے۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی۔ ڈبیا جیب سے نکالی کہ شاید کھرچن درچن ادھچن پوچھن پڑی پڑائی ہو تو اس دم جی جائیں۔ دیکھا تو صفا چٹ بس سن سے جان نکل گئی۔ آدھی رات کا وقت۔ انسان کیا معنی مرغ و ماہی تک آرام میں۔ اب افیم آئے تو کہاں سے۔ سوچے کہ بھئی چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے جائیں گے اور بیچ کھیت جائیں گے افیم کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ہی لائیں۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ دن سے چل کھڑے ہوئے۔ گلی میں کانسٹیبل سے مڈبھیڑ ہوئی۔

کانسٹیبل۔ کون؟

خوجی۔ ہم ہیں خواجہ بدیع ملازم سرکار!

کانسٹیبل۔ کہاں کام کرتے ہو۔ دفتر میں کام کرتے ہو نہ۔ کس دفتر میں؟

خوجی۔ پولیس کے دفتر میں۔ مانک جی بھائی جی کی جگہ پر آج سے کام کرتے ہیں۔ یار اس وقت کہیں سے ذرا سی افیم لاؤ تو بڑا احسان ہو۔ آخر استاد پالا ہمیں سے پڑے گا تمھارے ہی دفتر میں ہیں سیاہ و سفید کا ہمیں کو اختیار ہے۔

کانسٹیبل۔ ہاں ہاں ابھی اسی دم اور میں تو خود افیم کھاتا ہوں۔ افیم تو لو یہ ہے مگر اس وقت گھولو گے کس میں؟

خوجی۔ واہ رے کانسٹیبل ہو کر باتیں۔ گھر کی حکومت۔ سرکاری پیادے کو سب مانتے ہیں۔

کانسٹیبل۔ اچھا چلو پلا دیں۔

خوجی۔ (خوش ہو کر مارے خوشی کے) واہ صوبہ دار صاحب بڑے بُرے وقت کام آئے۔ ہم آپ کو جانیئے افیمی آدمی۔ شام کو افیم کھانا بھول گئے۔ آدھی رات کو یاد آیا۔ ڈبیا کھولی تو سناٹا۔ لے کہیں سے پانی اور پیالی دلواؤ تو جی اُٹھیں ورنہ این جانب کی خیر نہیں بس اب کوئی دم کا مہمان ہوں۔

الغرض کانسٹیبل نے حضرت خواجہ صاحب کو خوب افیم پلوائی اور خوجی نے مرلکبوں کی طرح چسکی لگائی۔ گھر کو لوٹے تو راستہ

بھول گئے جاتے کہیں ہیں اور پاؤں کہیں پڑتا ہے ایک بھلے مانس کے دروازہ پر پہنچے تو پینک میں سوجھی کہ یہی میرزا صاحب کا مکان ہے ۔ واہ ری پینک ۔پھر کیا تھا وحشت کو خدا سلامت رکھے ۔زنجیر درکھڑکانے اور غل مچانے کھولو ۔کھولو دروازہ کھولو کھولو بھئی اُف اب تو پاؤں ڈگمگاتے ہیں ۔کھڑا نہیں ہوا جاتا ۔کھولو۔ دروازہ کھول دینا۔

اب سنئے کہ میاں خواجہ بدیع صاحب باہر کھڑے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّاتے اور دروازہ دھم دھماتے ہیں اندر اس مکان میں ایک صاحب رہتے تھے اُنیس صدی کی پیدائش ۔خوجی کے چچا ۔کوئی ایک اوپر دس برس کا سن کھیل کود کے دن ۔دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں ۔قد چشم بد دُور تین کم سوا دو انچ کا سوائے ہڈی اور پوست کے گوشت اور چربی کا نام بھی نہیں اور اُن کی بیوی خاصی ویل تی ہیں کئی مسٹنڈی بڑے ڈیل ڈول کی عورت بھج بنی ہوئی لمبے چوڑے ہاتھ پاؤں اُٹھتی جوانی مگر ایک آنکھ کانی چال مستانہ بول چال بے باکانہ ایک گھونسا تان کے لگا دے تو شیدی لندھور کا بھی بھرکس نکال جائے ۔کوئی دو بیس کم بیس برس کی عمر دونو میٹھی نیند سو رہے تھے کہ خوجی نے دھم دھمانا شروع کیا ۔

میاں (چونک کر) ایں یا خداوندا بچائیو، یہ اس اندھیری رات میں کون آیا! بھئی اُف مارے ڈر کے روح کانپتی ہے ۔کیسا اندھیرا گھُپ ہے ۔

اپنے حساب اُٹھنے والے کو کچھ کہتا ہوں ۔مگر بیوی کو جگاؤں اور مردانہ کپڑے پہنا کر ساتھ لے جاؤں تو وہ بھی کانپنے لگے کہ ہاں بڑودہ کے پہلوانوں کا گھر ہے یہاں سے بچ کر جانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے ۔

خوجی ۔کھولو میٹھی نیند سونے والو کھولو ۔یہاں جاتے دیر نہیں ہوئی اور کواڑ سے جھپ سے بند کر لیے کھٹیا ڈٹیا سب غائب کر دی۔

میاں ۔ (سرہانے جا کر) بیگم بیگم او بیگم کیا سو گئیں۔

واں سنتا کون ہے ۔جوانی کی نیند دل لگی ہے ۔کوئی چارپائی اُلٹ دے تو کانوں کان خبر نہ ہو ۔سر پر چکی چلے ۔میاں کی روح فنا آنکھوں کو مارے ڈر کے ایک ہاتھ سے بند کیے ہوئے بیوی کے سرہانے کھڑے ہیں مگر تھر تھر کانپ رہے ہیں ۔ ایک بار جیاں پر کھیل کر کچ کچا کر خوب زور سے شانہ ہلایا ۔او بیگم سنتی ہو کہ نہیں ۔جگی ہیں مگر سون کھینچے پڑی ہیں ۔

بیگم (ہاتھ جھٹک کر) اے وہ لیکے شانہ اکھاڑ ڈالا ۔اللہ کرے یہ ہاتھ ٹوٹیں ہماری میٹھی میٹھی نیند مارے ہچکولوں کے تلخ کر دی واہ اللہ جانتا ہے میں تو سمجھی بالا ڈولا آ گیا ۔خدا خدا کر کے ذری آنکھ لگی تو یہ پٹکی پڑی ابکی جگایا تو تم جانو گے ۔پھر اپنی واؤں تو بیٹھ کے روتے ہیں ۔بے عزت چل دور ہو۔

میاں ۔لاحول ولا قوۃ ۔کیا پھر سو گئیں ۔جیسے نیند کے ہاتھ کوئی بک جاتا ہے ۔بیگم او بیگم (ڈرتے ڈرتے) اُٹھتی ہو کہ نہیں۔

بیگم ۔اے اُوئی ۔کیا ہے کیا؟ کچھ منہ سے بولو گے بھی ۔بیگم بیگم اچھی رٹ لگائی ہے ۔ڈر لگتا ہو تو منہ ڈھانپ کے سو رہو ایک تو آپ نہ سوئیں اور دوسرے ہماری نیند بھی حرام کریں۔

خوجی ۔ دھم دھس ۔کھڑ کھڑ کھڑ ۔کھولو ۔ مر گیا پکارتے پکارتے ۔

میاں ۔بھئی یہ کون ہمارا دشمن اس وقت آیا ہے ۔خدا ہی خیر کرے ۔بیگم او بیگم خدا کرے بہری ہو جائے ۔ان کی نیند سے اپنی نیند عذاب میں ہے ۔دیکھو تو یہ کواڑ کون توڑے ڈالتا ہے ۔بندہ تو اس اندھیاری میں گھسنے والا نہیں ۔ ذری تم ہی دروازہ تک جا کے دیکھ لو۔

بیگم۔ جی میری بیزار اٹھتی ہے۔ تمھاری تو وُہی مثل ہے کہ روٹی کھائے دس بارہ دودھ پیئے مٹکا سارا کام کرنے کو ننھا بچارا۔
پہلے تو میں عورت ذات جو ڈر گئی تو پھر کیسی ہو جانے کون موا آیا ہے۔ چور چکار سے بیوی کو بھڑ واتے ہیں۔ اے لعنت خدا
پھٹے سے مُنہ مردوے بنتے ہیں۔ مُجرواُ سے کہتے ہیں کہ باہر جا کر چور سے لڑو۔
خوجی۔ اجی بیگم صاحب بخدا کی قسم افیم لانے گیا تھا ذرا دروازہ کھلوا دیجئے۔ یہ میرزا صاحب اور مولا آزاد تو میری جان کے
دشمن ہیں۔
بیگم نے جو افیم کا نام سنا تو آگ بھبھوکا ہو گئیں۔ اُٹھ کر میاں کو ایک لات لگائی تو دھم سے ایک لڑھکنی کھائی اور بیوی نے
اوپر سے اور کوسنا شروع کیا۔ اس افیم کو آگ لگے پینے والوں کا ستیا ناس جائے۔ ایک تو میرے ماں باپ نے اس نکھٹو کے
کھونٹے میں باندھا دوسرے اس کے ماں باپ نے افیم اس کی گھٹی میں ڈال دی۔ چلو بس ہو چکی زندگی اور تم نے جو قسم کھائی تھی کہ
آج سے افیم نہ پیوں گا۔ نہ تمھاری قسم کا اعتبار نہ زبان کا۔ قسم بھی کوئی مولی گاجر ہے کہ کر کر کے چبا گئے۔
میاں۔ (گر دھاڑ پوچھ کر) کیوں جی اور جو میں بھی ایک لات کس کے جمانے کے لائق ہوتا تو پھر کیسی ٹھہرتی؟
راوی۔ جو ہوتے نہ اس لائق۔ ایسے ہوتے تو جورو کی جوتیاں ہی کیوں کھاتے مگر میاں صاحب دل ہی دل میں اپنے باپ کو
صلواتیں سنا رہے ہیں۔ واہ اچھے ماں باپ تھے۔ یہاں دھان پان آدمی۔ بیوی لا کے تھما دی دیونی ہشت مشت یہاں مُردے
سے بدتر۔ ہاتھ پاؤں ہڈی ہڈی گن لیجیئے۔ وہ تو بیاہ کر کے چھٹی پا گئے لاتیں ہمیں کھانا پڑتی ہیں۔ میں تو سمجھا کہ اپنا کام ہی تمام ہو گیا
مگر تھا بے حیا کہ پھر (جیوں کا تیوں) موجود۔
بیگم۔ میرا تو قاعدہ ہے کہ پہلے تو باتوں سے سمجھاتی ہوں اور کوئی نہ سمجھے تو لاتوں سے خبر لیتی ہوں۔ میں تو اس فکر میں ہوں کہ تم کو کھلا
پلا کر خاصا ہٹا کٹا بناؤں ہمسائی طعنے تو نہ دیں۔ اور تم ہو افیم تو جی جلے یا نہ جلے۔
میاں۔ تمھاری جان کی قسم کون مُردود چنڈو کے قریب بھی گیا ہو آج تک یا کبھی افیم کی صورت بھی دیکھی ہو۔ اور یوں خواہ مخواہ بدگمانی
کا کونسا علاج ہے ذری چل کے دیکھو تو آخر ہے کون۔ کوئی ہمارا دشمن ہے کہ آن کر میاں بیوی کو لڑوا دیا۔ تم کسی کی سنتی تو ہو نہیں۔
آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کس کر ایک لات جما دی۔
میاں خواجہ بدیع صاحب اس اثنا میں اونگھ گئے۔ زنجیر پکڑے پھنک میں کھڑے ہیں۔ یہ بیوی میاں چلے تو اس قطع سے کہ بیوی آگے
آگے دست پناہ ہاتھ میں لیے ہوئے اور میاں پیچھے پیچھے مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے ہوئے۔ راہ میں جو بیوی کا ہاتھ ذرا چھوٹ
جائے تو غل مچائیں کہ ہائے مرا۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی پکڑ لے جائے۔ دروازہ کھولا تو خوجی دھڑ سے گرے سر کے بل اور میاں مارے خوف کے
سانپ کر خوجی پر ارا را کر کے آ رہے اور بیوی نے دونوں کو دبوچا۔ اچھی تگڈم ہوئی، مگر خواجہ صاحب اس پھرتی سے نکل کر بھاگے
تو ناک کی سیدھ پہ چلے۔ فتنہ تو برپا ہو ہی گیا تھا۔ سیدھے مرزا کے مکان پر داخل۔ وہاں دیکھا کہ خدمتگار پڑا خراٹے پر خراٹے
لے رہا ہے۔ چپکے سے حضرت بھی اپنی کھٹیا پر دراز ہوئے مگر مارے ہنسی کے بُرا حال سوچے کہ ہم تو تھے ہی لیکن یہ میاں صاحب
ہمارے بھی چچا نکلے وہ تو کل حال ان کو معلوم نہ ہوا۔ ورنہ صبح تک نہ ضبط ہو سکتی۔ بارے بخیر گذشت۔

ؔ بیوی۔

اخبارِ جنگ

اِدھر غنچۂ صبح کھلکھلایا، اُدھر میاں آزاد کو اُس شکرلب بیگم کا جھپکڑا نظر آیا۔

نظر میں تیزیاں تیغ اجل کی — لب شیریں میں شیرینی عسل[1] کی
غضب آنکھوں میں قتل کیف لبریز — سنان ہر مژہ دل کے لیے تیر

میاں آزاد نظر بھر کر اس جادو جمال زہر تمثال کو دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ میرزا صاحب بھی انگڑائیاں لیتے ہوئے پلنگ پر سے اُٹھے بیگم صاحب بالکل براگندہ نقاب، بے تکلفی سے کھڑی میاں آزاد کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں۔ اپنے شوہر کی جو آہٹ پائی تو بدن کو چُرالیا اور ایک طرارا بھرا تو زینن کی اوٹ میں تھیں۔

میرزا آداب عرض ہے۔

آزاد۔ کورنش کیجئے حضرت آج تو کسی ایسے آدمی کے پاس لے چلیئے جو پولیٹیکل امور سے خوب واقف ہو۔ ہم سُن بھی تو لیں کہ روسیوں تصد اب کیا ہے؟ جنگ کی ٹھہری یا نہیں ٹھہری، چھڑی یا ابھی کچھ دیر ہے؟ حضرت اب تو چاہے جو ہو بندۂ درگاہ جائیں اور بیچ کھیت جائیں مگر اب روز روز ٹالنا عقل کے خلاف ہے۔ ہم آپ کی حسن آرا سے وعدہ کر چکے ہیں۔ وہ ہر دم میری نظروں کے سامنے رہتی ہے۔

بیگم۔ ہے تو ایسا ہی۔ قول مرداں جان دارد۔

میرزا۔ کہیئے آج کیا قصد ہیں۔ کدھر کے دھادے ہیں؟

آزاد۔ اس وقت ہم کو کسی ایسے لائق آدمی کے پاس لے چلیئے جو معاملات موجودہ ٹرکی سے خوب واقف ہو۔ ہمیں وہاں کا کچھ حال معلوم ہی نہیں کہ ہو کیا رہا ہے۔ وہاں کوئی جنگ ہوئی یا ابھی روسی کُندے ہی تول تول کے رہ جاتے ہیں۔ کچھ سُن تو لیں۔ پھر وہاں کے رنگ ڈھنگ تو معلوم ہوں۔ کسی انگریزی خوان کے پاس لے چلیئے۔ انگریزی اخبارات کہیں سے مل جائیں تو واہ جی واہ۔ ہم خود ہی سب حالات پڑھ لیں۔ کاہے کو کسی کے پوچھنے کی حاجت رہے۔

میرزا۔ بہت خوب چلیے۔ میرے ایک دوست ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول ہیں بڑے طبّاع آدمی، انگریزی اخبارات کے کارسپانڈنٹ بھی ہیں اور خلیق مرد آدمی، یار باش۔ زندہ دل۔

بیگم۔ اے کچھ کھاتے تو جاؤ۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

آزا۔ اجی نہیں اب جانے ہی کی دھن ہے۔ جانے دیجیئے کوئی دو گھنٹے میں آئے جاتے ہیں۔

بیگم۔ اچھا تو پھر بے چائے پلائے تو ہم نہ جانے دینے کے۔ چائے پیتے جاؤ گرما گرم پھر چاہے جب آؤ۔

آزاد۔ بہت خوب۔ آپ کا حکم بسر و چشم منظور۔ لائیے چائے مگر اس کے تیار کرانے میں ذرا دیر لگے گی۔

زینن۔ اے حضور تیار رہے دیر کاہے کی۔

---

[1] شہد

یہ کہہ کر زینن چائے لائی اور آزاد و میرزا صاحب نے بڑے شوق سے پی۔

آزاد۔ اب تو جانے دیجئے گا۔

بیگم ۔ واہ وا۔ آپ ہمیں کوئی بدتمیز سمجھتے ہیں۔ یہ کہاں کا سلیقہ ہے کہ چائے پلائیے اور گلوری نہ کھلائیے۔

میرزا۔ پھر لپ چھپ بنا دو دو چار گلوریاں۔

بیگم (تنک کر) تمھاری سی پھرتی اور تیزی کوئی کہاں سے لائے؟

آزاد۔ (اپنے دل ہی دل میں) ہونھ شوخی اور تیزی کا کوئی تم سے سبق سیکھے۔

خیر بیگم نے گلوریاں بنائیں۔ زینن ایک خاصدان میں رکھ لائی اور میاں آزاد نے کھائیں اور میرزا صاحب کو کھلائیں۔

آزاد۔ اب اور تو کچھ باقی نہیں رہا۔ سوچ لیجئے۔ ابھی سویرا ہے۔

بیگم۔ جی بس اب آپ مٹر گشت کو جائیں۔ دوپہر کو آؤ چاہے تیسرے پہر کو۔

آزاد اور میرزا صاحب اور میاں خواجہ بدیع مل کر ہیڈ ماسٹر کے مکان پر گئے تھوڑی دور مکان تھا چلے اور کھٹ سے داخل۔

ہیڈ ماسٹر (میرزا سے) آخاہ۔ آج یہ چھ دن کے بعد آپ کہاں بھول پڑے۔ حضور مزاج مقدس۔

میرزا۔ شکر ہے آپ کا مزاج!

ہیڈ ماسٹر۔ (آزاد کی طرف اشارہ کرکے) آپ کی تعریف کیجئے۔

میرزا۔ آپ میرے بھائی عزیز اور دوست ہیں۔ بڑے لائق فائق بزرگوار۔ ٹرکی جانے کا قصد ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ ٹرکی! یہ کہیے۔ آغا مولانا محمد آزاد صاحب؟

میرزا ۔ جی ہاں۔ آپ ہی ہیں۔

ہیڈ ماسٹر (آزاد سے) حضرت آئیے بغل گیر تو ہوں۔ خدا سب کو ایسی ہی توفیق خیر دے۔ آپ نے بڑی ہمّت کی ہے ع

آفریں باد بریں ہمّتِ مردانۂ تو

آزاد۔ حضرت تازہ حالات روم و روس کے کچھ بتائیے کہ وہاں ہو کیا رہا ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ ٹرکی کی حالت قابلِ افسوس ہے۔ بڑی نازک حالت ہوگئی اور دیکھ لیجئے گا کہ رفتہ رفتہ اس کے اعضا و جوارح ہی اس کے دشمن ہو جائیں گے (خوجی کی طرف اشارہ کرکے) آپ کون بزرگ ہیں؟

خوجی۔ مجھ سے نہ پوچھئے۔ جی بندے کو لوگ خواجہ بدیع صاحب علیہ الرحمۃ والغفران کہتے ہیں۔

آزاد۔ (ہیڈ ماسٹر سے) اب روس سے ہوتی ہے نا

ہیڈ ماسٹر۔ جی نہیں رعایا سے مگر سازش روسیہ ضرور ہے اس میں اصلا شک نہیں۔

آزاد۔ تخت پر تو بالفعل حضرت مراد آفندی ہیں نہ؟

ہیڈ ماسٹر۔ جی ہاں۔ مگر چوں مد حساب اندر۔

خوجی۔ یا چوں خط بہ کتاب اندر۔ چوں بُو بگلاب اندر۔ چوں افیم بہ ڈبیا اندر۔ چوں نشہ بہ پوستا اندر۔

ہیڈ ماسٹر۔ آپ بھی طرفہ معجون ہیں۔

آزاد۔ کیا خاص حضرت سلطان المعظم کی رعایا باغی ہے؟

ہیڈ ماسٹر۔ جی ہاں۔ اکثر صوبے بگڑ گئے اور جنگ ہو رہی ہے۔

میرزا۔ سرویہ والا بڑا شریر معلوم ہوتا ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ جی ہاں ایک تار برقی سے معلوم ہوا تھا کہ ٹرکی اور سرویہ میں جنگ ہوا ہی چاہتی ہے۔ شہزادہ ملن اُدھار کھائے بیٹھے ہیں کہ ٹرکی سے لڑیں۔

میرزا۔ بھلا سرویہ ہے کہاں؟

آزاد۔ سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ ہے سرویہ کی تو کیا اصل حقیقت ہے کہ روم کے منہ چڑھے مگر در پردہ روس منحوس کی سازش ہے۔ یہ سب اسی کے کانٹے بوئے ہوئے ہیں۔

ہیڈ ماسٹر۔ جی ہاں روسی سپہ سالار اُن کے کمانیر ہوئے ہیں۔ اب اس سے بڑھ کر اور کیا مدد ہوگی۔ خیر۔ سرویہ تو ایک طرف، ٹیلیگرام سے منکشف ہوا کہ مانٹی نیگرو نے بھی اشتہار جنگ دے دیا۔

آزاد۔ ہاں! لاحول ولا قوۃ۔ بُری ہوئی۔

خوجی۔ بُری ہوئی تو پھر جاتے کیوں ہو۔ کیا تباہی آئی کہ چلے روم۔ روم۔ شامت اعمال!!!

ہیڈ ماسٹر۔ سرویہ کی فوج سرحد۔ سے گذر گئی۔ ترکوں سے ایک جنگ بھی ہوئی سنا کہ غنیم نے لشکر سلطانی سے زک فاش پائی۔ مگر سرویہ والے کہتے ہیں کہ سب غلط ہے ہم ڈٹے ہوئے ہیں۔ زیت شہراور مقاموں میں ترکوں نے جو فتح پائی اس کو اہل سرویہ مخفی رکھتے۔ ان کا قول ہے کہ ہم نے ترکوں کو سرحد بو سیتا پر زک دی۔

خوجی۔ واہ کہیں دی نہ ہو مگر آپ نے تو ایسے ایسے شہر بتائے کہ میرے ہوش اُڑ گئے۔ یہ زیت کس شہر کا نام ہے اور دھون کون مقام ہے۔ دیکھئے تو کل ہم بھی جاتے ہیں۔ قسم خدائے پاک کی اتنی قرولیاں بھونکی ہوں کہ پرے کے پرے صاف ہو جائیں۔ دل لگی ہے قبلہ کچھ۔

آزاد۔ یہ روسی سپہ سالار جو سرویہ کی طرف سے لڑتے ہیں تو سرکاری طور پہ یا اپنی ہی خوشی سے۔

ہیڈ ماسٹر۔ ہوس آف لارڈز میں لارڈ ڈربی صاحب نے بجواب سوال لارڈ کمبرڈون کے بیان کیا کہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ روسی افسر جو سرویہ کی فوج میں مقرر ہوئے وہ گورنمنٹ روس کی اجازت سے آئے ہوں۔ آج کی تار برقی بڑی تشویشناک ہے۔

خوجی۔ اللھم احفظنا من کل بلیات۔ مَیں تو یہ خبریں سن سن کر نیم جان ہو رہا ہوں۔ منوں خون خشک ہوا جاتا ہے۔

ہیڈ ماسٹر۔ ۶ جولائی کے ٹیلیگرام مرسلہ لندن سے منکشف ہوا کہ ترکوں اور مانٹی نیگرو میں بڑی گرما گرمی سے جنگ ہوئی۔ دریائے سیوا اور ورنیا جہاں ملتے ہیں وہاں ایک شہر ہے، ولیتا۔ اسی جگہ جنگ ہوئی اور افسوس صد افسوس کہ نتیجہ جنگ ہمارے حق میں مضر ہے۔ مانٹی نیگرو والوں نے قلعہ میڈن فتح کر لیا۔ یہ قلعہ نہایت مستحکم ہے۔

خوجی۔ بس تڑکا ہو گیا۔ ہم تو اپنے حساب ہندوستان چھوڑنے والے کو کچھ کہتے ہیں۔

آزاد۔ ہاں صاحب اور کیا تار ہے۔ حضرت یہ تو خبر بری سنائی۔ الامان!

ہیڈ ماسٹر۔ دوسری خبر یہ ہے کہ سرویہ اور ترکوں میں کچھ عرصہ تک سخت جنگ ہوئی۔ مگر فتح و شکست نہ اُن کو نہ اُن کو۔

اور افسوس یہ ہے کہ اہل سرویہ کی فوج کی کمان روسی افسر جنرل چرنیف کے سپرد ہے - اب سرویہ سے فوج صوفیہ کی طرف بڑھتی جاتی ہے - ایک خبر یہ ہے کہ ترکوں نے سرویہ کی فوج کو مقام ملبینا میں زک دی اور سرویہ کی فوج کے نو سو آدمی مقتول ہوئے مگر وہ کچھ اور ہی کہتے ہیں ان کا قول ہے کہ ہم کو زک نہیں ملی - ہمارے صرف دو سو آدمی مارے گئے اور ہماری فوج سرحد ژنکا سے اُتر گئی اور ترکوں کو ہٹا کر نو دی بازار میں بھگا دیا -

خوجی - اجی اس جنگ کا انجام کیا ہوتا ہے بس اتنا بتا دیجیئے؟

میرزا - خبر نہیں -

آزاد - افسوس - کمال رنج ہوا - انتہا کا قلق -

خوجی - بھائی سنتے ہو - میاں آزاد - یار واپس چلو اجی شرط تو یہی ہے نہ کہ تمغے لٹکا کر آؤ - پھر یہ خبریں تمغے لٹکانے کی کہاں ہیں - ہے کہ نہیں - آپ واپس چلیئے اور تمغہ میں ایک بنوا دوں گا -

آزاد - ابھی تک یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجام جنگ کا کیا ہوگا - جنگ ودسردار د طرفین سے بجوش و خروش لڑائی ہو رہی ہے اور سامان بھی کم نہیں دیکھیں کون دب کے رہتا ہے؟

ہیڈ ماسٹر - سرویہ کا تو کیا منہ ہے کہ ترکی کے منہ چڑھتا یہ سب اسی گرگ باراں دیدہ کی سازش ہے اور اغوا کا انجام بد ہے - خدا خیر کرے بڑی مہیب جنگ ہوگی اور ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر سرویہ نے شکست پائی تو روس خود خم ٹھونک کے لڑنے پر آمادہ ہو جائے گا پھر البتہ لوہے سے لوہا لڑے گا - مگر دیکھیئے ترکی بھی کیسے لڑتے ہیں؟ بلا کے جری ہیں -

آزاد - جی اس میں کیا شک ہے - ان کی جرأت کے بھی آج جھنڈے گڑے ہوئے ہیں - وہ بڑے لڑنے بھڑنے والے ہیں - روسیوں سے کیا کچھ کم تھوڑا ہی ہیں مگر سامان ندارد ٹکا پاس نہیں - جنرل اور افسر کم اور بدنظمی بہت -

خوجی - یہ آپ نے کیا فرمایا کہ ٹکا پاس نہیں - کیا افیم کا محصول نہیں آتا؟

الغرض میاں آزاد اور میرزا صاحب اور خوجی ہیڈ ماسٹر سے رخصت ہوئے اور گھر پہنچے -

بمبئی سے بھی کوچ ہُوا

میاں آزاد اور میرزا صاحب اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص نے باہر سے آواز دی۔ میرزا صاحب نے زیبن سے کہا کہ جاؤ دیکھو تو کون ہے۔ میاں خلیفہ ہوں تو کہنا اس وقت ہم خط نہ بنوائیں گے۔ تیسرے پہر کو آجائیے۔ زیبن آٹا گوندھ رہی تھی۔ اچھا کہہ کر خاموش ہو رہی۔ اس نے پھر باہر سے آواز دی اور ساتھ ہی خدمتگار نے بھی پکارا۔ تب تو زیبن کو مجبور ہو کر اٹھنا ہی پڑا۔ مگر ناک بھوں چڑھاتی، بڑبڑاتی اور خدمتگار کو بے نقط سناتی ہوئی اٹھی۔ ٹھیکری پڑ جائے ایسی نوکری پر جو ہے میری جان کا گاہک۔ جسے دیکھو میرا ہی دشمن واہ ایک کام چھوڑ دوسرے پر لپک۔ اگلی چاند ہو تو میں تنخواہ لے کے اپنے گھر بیٹھ رہوں گی کیا نگوڑی نوکری کا بھی کچھ کال ہے۔ زیبن کا قاعدہ تھا کہ کام سب کرتی تھی مگر بڑبڑا کر۔ ہزار طعن باتیں بنا کر۔ بات بات پہ تنک جانا تو گویا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ مگر ع۔ ناز برآں کن کہ خریدار تست۔ اپنے کام میں برق تھی۔ اس سے اس کی خاطر بھی ہوتی تھی۔ الغرض منہ پھلا کر اور آٹے کو پٹک کر زیبن باہر گئیں۔ پہلے تو جاتے ہی خدمتگار کی خوب لے دے کی۔ کیا گھر بھر میں ہی ایک بیٹھی ہوں جب پکارتا ہے مجھی کو پکارتا ہے۔ موئے اُتو کے منہ میں نام پڑ گیا ہے۔ خدمتگار کی جانی دشمن بات بات پر للکارا کرتی تھی۔ خیر زیبن اور خدمتگار میں تو تو میں میں ہو چکی۔ اس کے بعد خدمتگار نے کہا کہ یہ آئے ہیں۔ میاں سے جا کر ان کا پیغام کہہ دو۔ مگر ذرا سمجھ بوجھ کر کہنا۔ سب باتیں سن لو۔ اچھی طرح اور میاں سے کہہ دو کہ جی چاہے تو باہر ہی آن کر سُن لیجیے۔ زیبن اندر آئیں۔

میرزا صاحب۔ کون ہے۔ کون آیا، کون ہے؟

زیبن۔ وہ آیا ہے۔ ملّاح یا جانے کون۔

میرزا صاحب۔ کہتا کیا ہے؟

زیبن۔ حضور وہ کہتا ہے کہ آج جہاز روانہ ہوگا۔ ابھی دس گھنٹے کی دیر ہے۔ تیار ہو رہیے۔

بیگم نے جو جہاز کا لفظ سنا اور معلوم ہوا کہ آج ہی جہاز روانہ ہوگا تو بس دھک سے رہ گئیں۔ چہرے کی سُرخی خیر باد کہہ گئی۔ زردی نے اپنا عمل کر لیا۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ آنکھوں سے حسرت ٹپکتی تھی۔ ضبط نہ کرتیں تو آنسو جاری ہو جاتے۔ مگر بہت ہی سنبھالا اور حسرت کے ساتھ میاں آزاد کی طرف دیکھنے لگیں۔

آزاد آپ جانیئے جہانیاں جہاں گشت۔ پرلے سرے کے تجربہ کار آدمی بیگم کے دل کی بات چٹکیوں میں تاڑ لی۔ مگر دم بخود۔

میرزا۔ (آزاد سے) لیجیئے حضرت۔ اب کوچ کی تیاری کیجیئے۔

آزاد۔ بسم اللہ۔ تیار مستعد۔ یہاں کچھ بڑا لمبا چوڑا سامان تو کرنا نہیں خیمہ خرگاہ نہیں۔ ایک بیگ ایک دری۔ آفتابہ ایک لکڑی چلیے اللہ اللہ خیر صلاح۔ جس وقت کہیئے جھپ سے موجود۔ میرا سامان سب لیس ہے۔ وقت پر دن سے اٹھ کھڑا ہونگا۔ آپ کچھ فکر نہ کیجیئے۔

خوجی (پردے کے پاس سے) یہاں بھی مضمون واحد ہے۔ ایک ٹھلیا۔ ایک پیالی۔ چانڈو پینے کی ایک نگالی ایک کٹارا ایک دونا مٹھائی کا ایک چاقو ایک قرولی۔ بس اللہ خیر صلا توپ بندوق کٹار تلوار وہاں مول لے لیں گے۔ بندہ بھی کیل کانٹے سے

درست ہے۔

اس تقریر پر میاں آزاد اور میرزا اسد بیگ صاحب دونوں ہنس پڑے خوب کھلکھلائے۔ مگر بیگم صاحب کے لب پر ہنسی نہ آئی بلکہ انھوں نے ایسی صورت بنائی کہ ان کے میاں جی سمجھ گئے اور ہنسی کو ضبط کیا۔ میرزا صاحب خوب جانتے تھے کہ ان کی بیوی پاک دامن ہیں اور اس سے بھی خوب واقف تھے کہ حسن آرا میاں آزاد پر عاشق ہیں پھر ان سے کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بدظن ہو جاتے ، سمجھ گئے کہ جتنے دن میاں آزاد یہاں رہے ہیں۔ اب ان کی جدائی شاق کیونکر نہ گذرے ، خیر اشارے سے بیوی کو سمجھایا لیکن اس وقت تو قلب کا کچھ عجب ہی حال تھا اور اس بیقراری سے سچا عشق ظاہر ہوتا تھا جس کو میرزا صاحب اور میاں آزاد دونوں بھانپ گئے۔ میرزا باہر گئے کہ اس آدمی سے گفتگو کریں اور یہاں میاں آزاد اور بیگم صاحب اکیلے رہ گئے۔

آزاد۔ آپ گھبرائیے نہیں میں جلد واپس آؤں گا۔

بیگم۔ (آہ سرد کھینچ کر) ہائے اگر اتنی تشفی کر دو تو میں جی اٹھوں۔

آزاد۔ استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ آپ کو تو حسن آرا کی وجہ سے مجھ سے محبت ہو گئی ہے مجھ کو دیکھیے کہ تیر عشق کی خلش سے کیسے کیسے کرب سہہ رہا ہوں۔

بیگم۔ کہنا آسان کرنا مشکل ہے۔ اُف اندھیرا سا چھا گیا۔ کیا آج ہی جاؤ گے اُف! آج ہی؟

آزاد۔ انشاء اللہ۔ زندگی ہے تو ہنسی خوشی پھر ملیں گے۔

بیگم۔ منزلوں کا سفر، کالے کوسوں، مجھے تو جیسے مایوسی سی ہے۔

اتنے میں میرزا صاحب نے باہر سے آکر کہا کہ صبح کو گجر دم جہاز روانہ ہوگا خدا کرے بخیر و عافیت واپس آئیے اور ہم بھی شریک تقریب سعید ہوں۔

آزاد۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

میرزا۔ بھئی میرا تو دل گواہی دیتا ہے کہ آپ سرخرو ہی ہو کر آئیں گے۔ آج تو آپ جاتے ہیں۔ مگر خدا وہ دن جلد دکھائے گا کہ پھر اسی مکان میں ہوں گے۔ انشاء اللہ۔

خوجی۔ مولانا محمد آزاد صاحب کہیئے اب چلنے کا وقت قریب آیا۔ کچھ خواجہ بدیع کی بھی فکر ہے۔ وہ قرولی لیتے ہی لیتے رہ گئے۔ افیون کا کیا بندوبست کیا ہے یار کہیں ایسا نہ ہو کہ افیون راہ میں نہ ملے اور ہم جیتے جی مر مٹیں۔ ذری زمین کو بازار تک بھیج کر لونڈے کی پھاندی اور کوئی ساٹھ ستر کنارے تو نازک نازک سے منگوا دیجیئے میرا بھائی۔ نہیں تو میں جیتا نہ بچوں گا۔

زمین۔ ہاں زمین ہی تو گھر بھر میں فالتو ہے۔ لپک کر بازار سے نے کیوں نہیں آتے کیا چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی یا پاؤں کی مہندی چھٹ جائے گی اور افیم لینے میں عورت ذات کہاں جاؤں گی بھلا۔

بیگم۔ (آزاد سے) رستہ میں اس سٹران کے سبب خُوب چہل پہل رہے گی۔ جی تو نہ گھبرائے گا؟

آزاد۔ ہاں۔ مگر دیکھیئے گیا کیا حماقتیں کرتے ہیں۔ خدا ہی خیر کرے یہ جاتا ہوں کہ شاید غم غلط ہو مگر خوف معلوم ہوتا ہے۔

خوجی۔ اچھا پھر مورچے پر ہماری کیفیت دیکھیئے گا۔ ابھی جو چاہے کہہ۔ یعنیئے آپ سے سو قدم آگے ہی رہوں تو سہی۔

الغرض چلنے کا وقت آگیا اور میاں آزاد نے اپنا اور خوجی کا اسباب باندھا بگھی تیار ہوئی سب سامان چُست کس سب لیس بیگم صاحب نے پھرتی کر کے چار گرہ سبز اطلس لے کر ادریب سیا اور اس میں ایک اشرفی رکھ دی۔ جس وقت میاں آزاد نے چلنے کے لیے لکڑی اٹھائی

اس وقت بیگم بیچاری بے اختیار رو دی مگر دل کو تھام لیا اور پھر منہ دھویا۔ چلتے وقت میاں آزاد نے کہا کہ دیکھئے بیگم صاحب اب اس وقت دل کو قابو میں رکھیے ورنہ راہ میں دو چار روز تک میرا بڑا برا حال ہوگا اگر مجھ سے واقعی میں دلی محبت ہے تو میرا کہا مان لیجیے، غم کو اپنے قریب آنے ہی نہ دیجیئے۔ ورنہ آج سے خط پر خط بھیجوں گا۔ خاطر جمع رکھیئے اور حسن آرا کے نام بھی خطوط کا تار باندھ دوں گا۔ بیگم صاحب نے بڑھ کر اپنے پیارے اور نازک ہاتھوں سے امام ضامن کی اشرفی باندھ دی اور کہا کہ امام ضامن کی ضامنی جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی طرح منہ بھی دکھاؤ۔ اور اللہ کرے منہ مانگی مراد پاؤ۔

آزاد۔ خدا حافظ!

میاں آزاد اور میرزا صاحب اور خوجی جا کر بگھی پر بیٹھے ساحل بحر کی طرف چلے تو اثنائے راہ میں میرزا صاحب سے انھوں نے کہا کہ واسطے خدا کے اپنی بیوی کو خوب سمجھاتے رہیئے گا آپ کا ذمہ ہے۔

خوجی نے بیڈھب بیڈھب، سوال ابھی سے شروع کر دیئے۔

خوجی۔ ہمیں کوئی نہانے کو کہے گا تو ہم قرولی ہی بھونک، دینگے۔

میرزا۔ تو جب کوئی کہے نہ۔

خوجی۔ ہاں بس اتنا یاد رکھیئے گا دری۔

میرزا۔ کچھ زبردستی تو ہے نہیں چاہے نہایئے چاہے نہ نہایئے کچھ کسی کا اجارہ ہے؟

خوجی۔ دیکھئے ہم پھر جتائے دیتے ہیں کہ ہم گتا چوس چوس کر سمندر کے باپ میں پھینکیں گے اور جو کوئی بولے گا تو ہم دبوچ بیٹھیں گے، ہاں ایسے ویسے نہیں ہیاں۔

آزاد۔ اجی اب زیادہ فکر نہ کیجیے میں نے سب بندوبست کر لیا ہے۔

خوجی۔ آپ کے انتظام کو بس دور ہی سے سلام ہے۔

میرزا۔ اجی نہیں گھبراتے کیوں ہو؟

خوجی۔ خدا کرے افیم روز کی روز ملتی جائے۔

آزاد۔ افیم منوں ٹنوں لیجیئے۔ یہ کیا بات ہے۔

خوجی۔ اور قرولی؟

آزاد۔ واہی ہو خاصے۔

خوجی۔ واہ کیا شرافت ہے آپ کی۔ گالیاں ہی دینے لگے واہ قبلہ!

میرزا۔ اجی اب خدا کا نام لو۔ یہ اُول جلول باتیں نہ کرو۔

میاں آزاد کا جہاز پر سوار ہونا

میاں آزاد جس وقت ساحلِ بحر کے قریب گئے تو خوجی سے کہا کہ کمر کسیئے حضرت، آپ تو کچھ ڈھیلے ڈھالے سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت خوجی نے جو غور سے پانی کی صورت دیکھی تو گول گول دیدے پھاڑ دیئے، لہروں اور ان کے تھپیڑوں پر نظر ڈالی تو کفن پھاڑ کر چیخ اُٹھے اور کوئی پچاس قدم اُلٹے پاؤں بھاگے۔ ہاں پر خدا جانے کس مصلحت سے کسی نے ایک میخ گاڑی تھی، ٹھوکر جو کھائی تو اراراد ھوں، ہڑھکتے ہی حضرت نے غل مچایا کہ بھلا بے گیدی یہاں بھی ہماری جان کا گاہک آن ہی موجود ہوا اچھا بچہ، ٹھہر تو جا ڈچیتیا یا ہو کہ عمر بھر یاد ہی تو کرے مردک ہم جو پیٹھ کی طرف منہ او نھنہ کے رُخ دُم کیے بھاگے جاتے تھے تو گیدی نے اچھی گھات پائی۔ ایک ٹھنی چلتے چلتے بتا ہی دی اب اوندھے پڑے بہروپیے کو للکار رہے ہیں مگر اُٹھنے کی قسم کھائی ہے۔ اتنے میں میرزا صاحب اور میاں آزاد بھی لگے پر جا پہنچے۔

آزاد۔ بس اُٹھیے اُٹھیے۔ بڑی دیر تک سو یا کیے۔

خوجی۔ (جھاڑ پونچھ کر) پہلوان کبھی چت تو گرے ہی گا نہیں۔ جب گرے گا پٹ۔ گرا اور زمین پکڑ لی۔

آزاد۔ اب سفر کی تیاری ہے نا؟

خوجی۔ توبہ کر بندے سے بھائی خشکی خشکی چلو تو بندہ ساتھ ہے ورنہ سلام پانی کی صورت دیکھی اور زہرہ آب ہو گیا۔ میں تو لاتے ہی ٹھٹھر ٹھٹھر کر گھنگڑ بن جاؤں گا۔ روم تک جا کون سکے گا؟

یہ کہہ کر میاں خوجی بگٹٹ بھاگے۔ آزاد اور میرزا صاحب بھی ساتھ ہی جھپٹے۔ لینا۔ لینا۔ جانے نہ پائے۔ چور چور ادھوڑی استر کا چور ہے۔ راہ میں ایک شخص نے میاں خوجی کا ٹیٹوا لیا۔ پہلے تو بہت ہی جھلائے اور لگے گاؤ زوریاں کرنے۔ مگر آزاد اور میرزا بھی آن ہی موجود ہوئے چھوڑ دو چھوڑ دو۔ لو بھئی ہم آ گئے۔

میرزا۔ (آزاد کے کان میں) حضرت یہ یوں نہیں جانے کے ان کو خوب افیم پلوایئے اور اُلّو بنایئے۔ جب یہ نشے میں غین ہوں تو لاد لود کر جہاز میں بٹھا دیں گے۔

آزاد۔ اچھی ترکیب ہے (خوجی سے) ارے میاں خوجی۔

خوجی۔ خواجہ صاحب نہیں کہتے۔ خوجی کی ایسی تیسی۔ خواجہ بدیع خاصہ نام ہے خوجی کیا معنی؟

آزاد۔ خواجہ صاحب قبلہ۔ آپ نے آج افیم تو پی ہی نہیں۔

خوجی۔ یہ کاہے سے معلوم ہوا آپ کو؟

میرزا۔ آنکھوں سے جمائیوں سے۔

آزاد۔ کیوں صاحب آپ نے افیم پیتے دیکھا تھا انہیں؟

میرزا۔ جی نہیں۔ میں تو خود ٹوکنے کو تھا۔
خوجی۔ ہاں حضرت کچھ نشہ تو ہم کو بھی ہلکا معلوم ہوتا ہے (جماہی آئی) بیشک افیم نہ پی ہوگی۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو اپنے ہوش کا حال ہے۔
آزاد۔ اس وقت جماہی بھی آئی آپ کو۔ وہ لیجیئے دوسری آئی خدا ہی خیر کرے۔
میرزا۔ تیسری آئی۔ واللہ اسوقت تو جماہیوں کی ڈاک بیٹھ گئی۔
خوجی۔ بھائی بندہ بے پیئے اب بات تو کرنے کا نہیں۔
میاں خواجہ بدیع صاحب نے پیالیاں نکالیں۔ افیم گھولی اور چسکی لگائی۔ آزاد ہشاش بشاش کہ نہ پرتہ جمائی۔ میرزا خوش کہ ہماری تدبیر کارگر ہوئی۔ خوجی نے افیم جو پی تو مارے ہوس کے ذرا زیادہ پی گئے۔ پیتے ہی غین آنکھیں بیر بہوٹی۔ آزاد نے ایک چھپرکھٹ پر لاد کر حضرت کو کشتی پر سوار کیا اور وہاں سے جہاز پر۔ خوجی کو سر و پا ہی کی خبر نہیں ورنہ وہ رولا لاتے کہ الامان۔

میرزا ہمایوں فر

شاہزادہ ہمایوں فر کا حال سنیئے کہ انھوں نے ایک روز سپہر آرا کو دیکھ پایا۔ دل دے بیٹھے۔ دوسرے روز عورت (عاشق النساء) کا بہروپ بھر کر سپہر آرا سے گلے مل آئے۔ راز کھل گیا۔ مگر عشق کا زور اور تیز ہو گیا۔ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مہری کے ہاتھ نامہ بھیجا۔ کہ مہری کو بھیج کر لب بام وقت شام ٹہلنے لگے مگر سوچتے جاتے تھے کہ کہیں دونوں پری پیکر بہنیں خفا نہ ہو گئی ہوں تو پھر بڑی بیڈھب ٹھہرے بات کی بات جائے اور شاید جان کے بھی لالے پڑ جائیں۔ اوران کی قہر آلود آنکھیں غضب ڈھائیں دل پر بجلی گرائیں۔ دیکھیں مہری کیا پیغام لاتی ہے کیسی خبر سناتی ہے، خدا کرے مہری کو ساتھ لے کر مہتابی پر چلی آئیں اور ہم کو جھمکڑا دکھائیں۔

اتنے میں مہری آئی۔ شہزادئ میرزا ہمایوں فر تاڑ گئے کہ ٹکا سا جواب دیا بُری خبر لائی چیں بجبیں ہے۔ خداوندا خیر کیجیو۔ مہری قریب آن کر منہ پُھلا کے کھڑی ہو گئی، مگر خاموش۔

ہمایوں فر۔ پھر اب کہو نہ صاف۔

مہری۔ حضور کیا عرض کروں۔

ہمایوں فر۔ وہ تو ہم تمھاری چال ہی سے سمجھ گئے تھے کہ بیڈھب ہوئی کہ چلو بس۔

مہری۔ حضور اب لونڈی وہاں نہ جانے کی۔

ہمایوں فر۔ جانا آنا سمجھا جائے گا پہلے مطلب کی بات تو بتاؤ کہ ہوا کیا؟

مہری۔ میں نے جا کر پردے کے پاس سے سُنا کہ آپ ہی کی باتیں چپکے چپکے کر رہی ہیں۔ ایک بولیں کہ ادھر جی کچھ ہو گا بھی جُل تو دے گئے مگر ہمارا دل تو صاف ہے۔ دوسری بہن نے رکھائی کے ساتھ باتیں کیں۔ اور چھوٹی بہن تو بس برس ہی پڑیں۔ اُف بس پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ کھڑی کانپ رہی تھی کہ کس مصیبت میں پڑی چھٹکی بہت تیز ہو کے بولیں کہ اب نہ آنا اور آؤ گی تو تم جانو گی۔ اور اُن سے کان کھول کے کہہ دینا کہ بہت چل نہ نکلیں۔ اتنے بڑے شہزادے ہو کے اور شریفوں کی بہو بیٹیوں سے یہ باتیں! ہم کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ شہزادے ہیں اس سے چھوڑ دیا بہت ہی بگڑیں۔ حضور میں چور کی طرح چپکے چپکے سنتی رہی۔ لیکن وہ جھلا ہی کیں۔ میں نے قدموں پر سر رکھ دیا اور۔

ہمایوں فر۔ خوب کیا۔ مگر تم پردے کے پاس تھوڑی دیر اور کیوں نہ باتیں سنا کیں؟

مہری۔ حضور وہ موئی غڑاپ سے نکل آئی اور لونڈی نے جھپ سے پاؤں کھجلانا شروع کیا۔ پوچھا کیا ہوا۔ میں نے کہا کچھ نہیں کنکڑی پاؤں میں چبھ گئی۔

ہمایوں فر۔ افسوس۔ تو بہت ہی بگڑیں۔

مہری۔ قربان جاؤں حضور بس کچھ عرض نہیں کر سکتی۔ اپنے آپے ہی میں نہیں تھیں۔

ہمایوں فر۔ ہم نے بڑی غلطی کی۔ ان دونوں شریف زادیوں کی یہ حیا پروری بس دل میں کھپ گئی۔ آفریں ہم سے یہ ایک حرکت بڑی ہی لغو سرزد ہوئی ہمیں جانا نہ تھا۔ مگر ان دونوں کو بھی عصمت کا کس درجہ خیال ہے۔ واہ واہ۔ اے سبحان اللہ۔ اللہ اللہ اس قدر آزادی اور مطلق العنانی سے رہیں اور باایںہمہ عفت کو اتنا عزیز رکھیں۔ آفریں۔ آفریں۔ خدا ہی خوب جانتا ہے کہ ہم نے بدی کا کبھی خیال ہی نہیں کیا۔ ہاں ان کو منظور ہوتا تو نکاح ہو جاتا پھر اس میں عیب کیا ہے؟ نکاح کچھ گناہ ہے۔

مہری۔ حضور ذری سوچیں تو۔ جان بخشی ہو تو عرض کروں۔

ہمایوں فر۔ بخشی۔ کہو۔

مہری۔ آج تک اس طرح کسی نے بیاہ کیا ہے بھلا۔ اور حضور نے جا کر یہ بن ناحق کو کہا کہ آؤ بہن گلے ملیں۔

ہمایوں فر۔ ہاں کہتی تو سچ ہو۔ یہ بڑی غلطی ہوئی۔

مہری۔ اب جانے دانے کا قصد نہ کیجیئے۔

ہمایوں فر عین حالت بیقراری میں لب بام آئے تو عروس مراد نے جلوہ دکھایا، شور و شیون کا اثر ہوا۔ نظارۂ جمال مہر پیکر ہوا۔ ادھر مہتابی پر دلبر طناز۔ اُدھر لب بام ہمایوں فر شہید خرام ناز۔ حسن آرا بیگم بڑے ٹھسّے سے مہتابی پر چڑھی ہیں۔ مگر ادھر پشت کیے اور نقاب زرّیں رخ پر ڈالے کھڑی ہیں ؎

مشتاق بیقرار ہیں دیدار کے ترے ۔۔۔ گھونگھٹ تو اپنے مکھڑے سے ظالم ذرا اُٹھا

یہ لیجیئے وہ سپہر آرا بھی بناؤ چناؤ کر کے مہتابی پر تشریف لائیں اور آتے ہی شہزادے سے بے خبری میں آنکھیں لڑائیں۔ آنکھیں لڑاتے ہی شوخی کے ساتھ اُچک کر وہ ہو رہیں اور دم کے دم میں حسن آرا بھی نظر سے اوجھل تھیں۔ حضرت ہمایوں فر محبّت آمیز اشارے کر ہی رہے تھے اور لب زخم جگر چنگاریاں بھر ہی رہے تھے کہ حسن آرا جھپک کر کوٹھے پر اور سپہر آرا اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی زینے پر۔ ارے! ہائے اس دیدار بت پندار نے اس سوختہ جان کے دل پر اور بھی بجلی گرائی۔ اس بے رحمی کے صدقے کہ دکھاتے ہی صورت چھپائی۔ نظر بھر کر دیکھنے بھی نہ پایا۔ الٰہی یہ سحر ہے یا چھلاوا۔ جب اُن تبان شعلہ رو کو نظر سے غائب پایا تو بدن سے چنگاریاں اُڑنے لگیں اور سینے میں شعلے بھڑک اُٹھے۔ ہے ہے ایسی ہی حیا چھٹ پڑی تھی تو کوٹھے پر کیوں آئیں اور آئیں تو متوالی انکھڑیاں کیوں لڑائیں۔

اب اِدھر کی کیفیت سنیئے۔ حسن آرا کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت میرزا ہمایوں فر اس وقت لب بام مصروف خرام ہیں اور ناظورۂ مہ پارا کی دید سے فائز المرام ہیں۔ جب سپہر آرا مہتابی پر آئی اور شہزادے کے بخت بیدار کی رسائی سے ان سے بیخبری میں آنکھ لڑائی تو چپکے سے کہا کہ بہن ہیں بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ وہ تاک جھانک سے باز نہیں آتے ہیں۔ ٹکا سا جواب دیا تو دور ہی سے کھڑے آنکھیں لڑاتے ہیں۔ حسن آرا نے نظارہ بھرا تو تڑسے کوٹھے پر اور سپہر آرا جو مُڑتی سے جھپٹی تو گھٹ سے نیچے واہ رے شباب۔ واہ ری کمسنی۔ واہ رے الھڑ پن۔ وہاں دونوں بہنوں میں باتیں ہونے لگیں۔

حسن آرا۔ پٹکی پڑے۔ اے اور اچھا گھر پر کھ لیا ہے۔

سپہر آرا۔ میرا بس چلے تو اس کا گھر اُجڑوا دوں۔

حسن آرا۔ ستم کرتی ہو۔ کعبۂ دل کو ڈھاتی ہو۔

سپہر آرا۔ باجی اللہ خیر کرے۔ یہ تو موا پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑا ہے جب دیکھو کوٹھے پر کھڑا ہے۔

حسن آرا۔ اے تو تم کاہے کو اپنی زبان خراب کرتی ہو۔
سپہر آرا۔ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے جیسے۔
حسن آرا۔ پھر آدمی ہی تو ہیں وہ بھی۔ دل ہی تو ہے۔ آدمی کا آدمی ہی پہ دل آتا ہے یا بیل بکری پہ۔
سپہر آرا۔ باجی آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر کیا پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں۔
حسن آرا۔ اُس مہری نگوڑی کو تو دیکھو کیسی ہڑ دنگا بیگنی ہے، چٹاخ پٹاخ۔
سپہر آرا۔ اُف بجلی ہے بجلی۔ وہ تو سوار کو گھوڑے پر سے اُتار لے ہم سے یارانہ پیدا کرنا چاہتی تھی۔ خام یار رہ۔
حسن آرا۔ اب جانے وہ کیا کیا نہ کر گذریں۔ کہیں رات کو نہ پھاندیں ہم لڑکیاں بھلا دھینگا مشتی کیا جانیں۔
سپہر آرا۔ توبہ توبہ اللہ جانتا ہے جو ادھر کا رُخ بھی اب کرے۔ ایک بال تو موئے کی کھوپڑی پر نظر نہیں آئے۔
حسن آرا۔ تو ایسے کلمے کیوں زبان سے نکالتی ہو۔ بہن لاکھ گیا گذرا ہے پھر شاہزادہ ہے۔
سپہر آرا۔ کیا کروں نگوڑے دل سے کس بس نہیں چلتا جینے سے بیزار ہو گئی۔
حسن آرا (بہن کو چھاتی سے لگا کر) یہ کیوں۔ یہ کیوں (بوسے لیکر) دل کو تسکین دو پیاری۔ ہماری آبرو اللہ کے ہاتھ ہے۔ دنیا کے یہی کارخانے ہیں۔ اپنا دل صاف ہونا چاہیئے سو ہے۔
سپہر آرا۔ جوں جوں غور کرتی ہوں کلیجہ بلّیوں اچھلتا ہے۔ کیا جھپ سے بہن بنا گیا۔ عاشق النسا بیگم کے بھیس میں صورت دکھا گیا باجی تم چاہے نہ مانو یہ موا بہروپیا ہے کوئی۔ کیا روپ بھرا تھا۔ ہائیں!
حسن آرا۔ اور ہیں بھی کوئی نازک آدمی۔
سپہر آرا۔ اے علی کی سنوار ایسی نزاکت کو ایڑی چوٹی پر قربان کر دو۔ تمھارا وہ کھڑا ہے بہن، سچ کہتی ہوں گلاب کے پھول کی رنگت پھیکی پڑ جائے، وہ کون ایسے سوگھڑ ہیں؛

اتنے میں ایک مغلانی آئی۔

مغلانی۔ لیجیئے بڑی بیگم صاحب نے یہ مٹھائی دی ہے اور فرمایا ہے کہ آج شب کو عید گاہ تو نہ چلیئے گا۔
حسن آرا (طشتری لیکر) یہ مٹھائی کہاں سے آئی ہے۔
مغلانی۔ اے حضور۔ وہ جو اس دن آئی تھیں نئی تھیں (آتی نہیں تھیں) بیگم صاحب انھوں نے بڑی بیگم صاحب کے لیے دو خوان بھیجے ہیں لوزیات کے سو بڑی بیگم صاحب نے یہ طشتری آپ کے لیے دی ہے۔
مغلانی۔ بڑی بیگم صاحب آتی ہیں۔
حسن آرا۔ کہاں کہاں۔ اے کہاں آتی ہیں؟
مغلانی۔ وہ کیا آئیں۔
سپہر آرا۔ دیکھوں
بڑی بیگم (زینے کے پاس سے) بُٹیا ذرا ادھر جھانکنا!
سپہر آرا۔ (دوپٹا سنبھال کر) حاضر ہوئی، ارشاد۔
حسن آرا۔ کیسے امّاں جان اس وقت ہُوا میں آپ کیوں نکلیں؟

بڑی بیگم۔ میں اوپر ہی آتی ہوں۔ (حسن آرا اور سپہر آرا تیزی کے ساتھ نیچے ہی دوڑ گئیں)

حسن آرا۔ اماں جان اوپر جا کے کیا کیجیے گا۔

سپہر آرا۔ چڑھنے اُترنے میں اور تکلیف ہی ہوگی۔ ہم تو آپ یہاں موجود ہیں۔

بڑی بیگم۔ آج پڑوس سے دو خوان آئے ہیں مٹھائی کے وہی تمھاری گوئیاں (ہنس کر) جو اس دن آئی تھیں۔ انھیں کے ہاں سے ہم نے دو روپیہ دلوا دیے وہ جو عورت ساتھ تھی اس نے کہا کہ بیگم صاحب نے حسن آرا بیگم اور سپہر آرا بیگم کو کل بلوایا ہے سو کل کسی وقت سواری پر چلی جانا اور حسینی خانم اور نصیبن اور فرخندہ کو ساتھ لیتی جانا۔ دو چار گھڑی دل بہلانا۔ پھر چلی آنا۔

راوی۔ ارے غضب اب بُری ہوئی۔ بڑی بیگم کو کچھ معلوم تو تھا ہی نہیں۔ اب ان سے کہے کون بھلا۔ جریب ہاتھ میں ہے چھوٹتے ہی جمائیں۔ سپہر آرا اور حسن آرا اب ہاں کہیں تو کیوں کر اور نہیں کہیں تو بڑی بیگم وجہ پوچھیں۔ ہندی کی چندی نکالیں۔ اُف ستم ستم۔

حسن آرا۔ کل کی تو کل کے ہاتھ ہے اماں جان۔

سپہر آرا۔ سمجھا جائے گا۔ نیت شب حرام۔

حسن آرا (سپہر آرا کے کان میں) ہے ہے اللہ بچائے ہم دونوں کی آبرو۔

سپہر آرا۔ ذری میرے قلب پر ہاتھ رکھنا۔

حسن آرا (ہاتھ رکھ کر) اُف۔ ذری میرے دل پر ہاتھ رکھنا۔

سپہر آرا۔ ارے!

بڑی بیگم۔ کیا چوری چھپے باتیں کر رہی ہو؟ میں تو اسی مارے تمھارے ادھر آتی نہیں کہ اپنے لڑکیاں لڑکیاں کیا جانیں کیا باتیں کرتی ہیں بیچ بوڑھی ان میں کیا بیٹھوں۔ تمھارا جی چاہے تو روح افزا کو بھی بلوا لو۔ اس کو بھی کل اپنے ساتھ لیتی جانا۔

راوی۔ جی بس انھیں کی کسر ہے اور تو سب مصالحہ موجود ہے۔ (بڑی بیگم تو چل دیں جلو میں خیر ہوئی لونڈیاں باندیاں ساتھ۔ ادھر حسن آرا اور سپہر آرا باتیں کرنے لگیں)

حسن آرا۔ اب بڑی ٹیڑھی کھیر ہے

سپہر آرا۔ پھر علاج؟

حسن آرا۔ پھر (میرے کی کیل ناک سے نکال کر) یہ

سپہر آرا۔ (چھین کر) یہ کیا حرکت ہے بھلا۔ سوچیے سوچیے۔ کوئی تدبیر نکل ہی آئے گی۔

حسن آرا۔ کیا خاک نکلے گی

سپہر آرا۔ ایک کام کریں۔ اب بے خوشامد کے کام نہ نکلے گا۔

حسن آرا۔ ہاں پھر اب تو ہوئی سو ہوئی۔ مگر بہن بڑی بُری ہوئی۔

سپہر آرا۔ یہاں بناوٹ سجاوٹ سے منزلوں بھاگتے ہیں لگاوٹ کا نام ہی نہیں جانتے سرمہ کاجل مسی افشاں سے واسطہ ہی نہیں رکھا گر پھر بھی بلا سے نہ بچے۔ اب ان کے نام ایک خط لکھیے اور صاف صاف مطلب سمجھا دیجیے اور ذرا ملائمت سے لکھیے گا کہ ان کو بھی وقت آنے لگے نہیں تو آخر شکل کیا کرو گی۔ موذی کے پنجے میں پھنس کر چھٹکارا معلوم۔ اچھے اچھے نکلے یا دیں جب ادھوال نہ دو گی تو اماں جان سے لسر کا لگا یا اور وہ بھی کتنی بھولی ہیں۔

حسن آرا۔ بس بالکل عقل سے بے بہرہ۔

راوی۔ بڑی بیگم بیچاری پر یہ ناحق کا عتاب ہے۔ اب لے انھیں کیا معلوم کہ یہاں ایک اور گل کھلا۔

حسن آرا کا شکایت نامہ

مرے رنج کی نہ کچھ ابتدا نہ مری خوشی کی ہے انتہا
جو جلوں تو نارِ جحیم ہوں جو ہنسوں تو باغِ نعیم ہوں
نہیں اس جہاں پہ نظر مجھے کہ مآل سے ہے خبر مجھے
نہ ہوائے لعل و گہر مجھے نہ میں طالب زر و سیم ہوں

ارے ظالم کچھ خوفِ خدا بھی ہے۔ میاں آخر حشر میں کیا منہ دکھاؤ گے۔ یہ گورکھ دھندا پھیلا رکھا ہے۔ اپنے آپے میں ہوکر گئے گذرے کیوں جی شریفوں کی یہی حرکتیں ہوتی ہیں کہ عاشق النساء بیگم بن کر بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں میں آئے، کوٹھے پر تاک جھانک لگائے۔ شرم نہیں آتی بہن بنا گئے ہو اور اب اپنے گھر ملاتے ہو۔ منہ دھو رکھیئے۔ تمھاری شہزادی کا خیال آتا ہے ورنہ خاتونِ جنت کی قسم جہاں کے ہو وہیں پہنچاتی۔ اب ذری بہت چل نہ نکلیئے پیٹ سے پاؤں نکالے ہیں۔ میرے دل پر جو تمھاری طرف سے غبار ہے وہ حشر تک نہ جائے گا۔ حشر کے دن خدا کے سامنے بخار نکالوں گی۔ بہت منہ نہ چڑھیئے ذرا جھینپو۔ کچھ تو شرماؤ۔ میاں یہ مردوں کے ہتھکنڈے نہیں ہیں شریف زادیوں کو دق کرنا کونسی بھل مانسی ہے۔ اے لعنت خدا۔ اگر اکیا آدمی بھیجا تو خدا سمجھے تم سے۔ اور ہم تو ہیرے کی کیل ناک سے نکال کر لیے بیٹھے ہیں۔ ذرا اونچ نیچ ہوئی اور کھا کر سو رہے۔ خون تمھاری گردن پر جتا دیا ہے اور تمھارے نامۂ اعمال میں تو نکیرین نے لکھ ہی لیا ہے ؎

حیا سے منہ نہ موڑیں گے ستائے جس کا جی چاہے — وفاداری میں ہم کو آزمائے جس کا جی چاہے
کبھی مانند گوہر آبرو صفدر نہ جائے گی — بظاہر خاک میں مجھ کو ملائے جس کا جی چاہے

اس وقت بدن میں آگ لگی ہے شعلے نکل رہے ہیں۔ خیر اسی میں ہے کہ اب اس حرکت سے باز آؤ ورنہ تم جانو گے۔ مجھے لفاظی اور لسانی تو آتی ہی نہیں مگر سچ کہتی ہوں اب اگر ایسی بات ہوئی تو کنوئیں میں پھاند پڑوں گی۔ تم ایسے بے حیاؤں کو خط لکھنا ناگوار ہے مگر کروں کیا مجبور ہوں۔ خیر ہماری عصمت کا اللہ مالک ہے۔ ہماری عفت کا خدا حافظ و ناصر۔ اب تمھارے ظلم سہنے کی تاب نہیں ہے۔ خبردار جتا دیا۔ مانو اچھا نہ مانو خیر ایسے رسوا ہو کہ خدائی بھر میں لوگ تم سے نفرت کرنے لگیں۔ اپنے دل میں تم سمجھے کیا ہو۔ میاں یاد رکھو جو یہی ہتھکنڈے رہے تو ایک دن اپنی ہی محل سرا کی طرف سے دیکھ لینا کہ آگے پیچھے ہم دونوں کا تابوت نکلا ہے تم اپنے دل میں سمجھے کیا ہو۔ ہمارا خدا ہماری پاکدامنی کا گواہ ہے پس تم ناحق سر دھنتے ہو۔ اگر نکاح کا شوق چرایا ہے تو اماں جان کی خدمت میں عرض کرو۔ پیغام بھیجو۔ ہم لڑکیاں کیا جانیں۔ ان باتوں میں بھلا ہم کو دخل کیا ہے۔ بہت اندھیر نہ مچاؤ۔ ان فضول باتوں سے باز آؤ ورنہ تم جانو گے اور تو ہمارا کیا بس ہے۔ زیادہ باتیں بنانا عبث ہے مگر اپنی جان پر تو دسترس ہے۔ یاد رکھیئے اگر ایسی ہی چھیڑ چھاڑ رہی تو ہماری مفت میں جان جائے گی۔ ہاں البتہ تم پر آنچ نہ آنے پائے گی۔ اگر آپ کا گلا آب دم خنجر کا مشتاق ہے تو کسی سفاک بت بے پیر سے دل ملایئے کوئے قاتل میں جایئے ہم گھر گرہست شریف زادیاں ان باتوں سے ہمیں کیا واسطہ، دل لینا جانیں نہ دل دینا۔ دل آنا اور دل جانا ان سب کو ہم ڈھکوسلا سمجھتے ہیں۔ اب ادھر کا رُخ نہ کیجیئے گا۔ مہری کو

مجھ سے نہ بھیج دیجیئے گا۔

راقم

کانٹوں میں نہ ہو اگر اُلجھنا تھوڑا سا لکھا بہت سمجھنا

یہ خط ایک معتبر آدمی کو دے کر روانہ کیا۔

میرزا ہمایوں فرخانۂ باغ میں گلگشت کر رہے تھے۔ آدمی نے تسلیمات عرض کر کے خط دیا اور چمپت ہوا۔ خط پڑھنے کے قبل فرطِ طرب سے یہ غزل جھوم جھوم کر پڑھی ؎

وہ بُت جلوہ آرا ہوا چاہتا ہے خدا جانے اب کیا ہُوا چاہتا ہے

راوی۔ جی بجا ہے۔ ذری خط تو پڑھ لیجیئے ؎

وہ اٹھکھیلی کی چال چلنے لگے ہیں کوئی فتنہ برپا ہُوا چاہتا ہے

راوی۔ اب اُن کا مہتابی پر چڑھنا بھی موقوف کروا دیجیئے گا۔

بہت تیز ہے آج کل تیرِ مژگاں کوئی دل نشانہ ہُوا چاہتا ہے

وہ رخسار پر ملنے والے ہیں غازہ یہ قرآں مُطلا ہُوا چاہتا ہے

مرے قتل کرنے کو آتا ہے قاتل تمام آج قصہ ہوا چاہتا ہے

خط کھولا اور پڑھنے لگے، اب اس وقت کی کیفیت نہ پوچھیئے۔ کبھی ذرا خط کو چوم لیا۔ کبھی آنکھوں سے لگا لیا۔ کبھی خدا کا سجدۂ شکر بجا لائے۔ کسی فقرے نے رُلا دیا۔ کسی نے ہنسا دیا۔ مگر جب کل خط پڑھ چکے تو خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی۔ رنج اس وجہ سے کہ تابوت اور جان دینے کی بُری سنائی۔ دل ہی دل میں کہنے لگے کہ ہائے اس بت پندار وطرحدار کو کیا معلوم کہ یہ کیسا نازپروردہ ہے بگو دیوانہ ہوگیا مگر اب بھی نازک طبیعت ہوں۔ یہ مکتوب الفت اسلوب بھی اسی امر پر دال ہے کہ لگاوٹ اور وصال کا محبوب مطلوب کو ضرور خیال ہے۔ غفلت کے پردے ایسے پڑے کہ عقل ہی سے ہم لڑ پڑے۔ دل صید رنج والم ہے۔ محفلِ عشرت اب محفلِ ماتم ہے۔

داغِ الفت لگا دیا کس نے نقشِ ہستی مٹا دیا کس نے

گُل سے شبنم بنا دیا کس نے ہنس رہا تھا، رولا دیا کس نے

ایک عالم ہے آج کیوں بیہوش رُخ سے پردہ اُٹھا دیا کس نے

زلف تیری اگر نہیں لیلےٰ مجھ کو مجنوں بنا دیا کس نے

دل جو چھالے کی طرح پھوٹ گیا کس نے چھیڑا، دُکھا دیا کس نے

دوپہری پیکر مہمانوں کا آنا

چار بجے کے وقت دربان نے آواز دی۔

دربان۔ ماما جی دروازہ کھولو۔ ماما جی پیاری کی اماں (دھم دھم دھم دھم) دروازہ کھول دو۔

ماما۔ دل بہار دیکھو کون پکارتا ہے۔

دل بہار۔ اے واہ پھر کھول کیوں نہیں دیتیں!

ماما۔ میری اٹھتی ہے جوتی۔ میں دن بھر کی تھکی ماندی ہوئی۔

دل بہار۔ اور یہاں کون چندن چوکی پر بیٹھا ہے؟

دربان۔ اجی لڑ لینا پیچھے پہلے کنواڑے کھول جاؤ۔

مغلانی۔ ارے کوئی دروازہ کھول دو اٹھ کے۔

دل بہار۔ ہونھ، کیا حکومتیں جتا رہی ہیں۔

ماما۔ ہاں جانو بیوی یہی ہیں گھر کی مالکن۔ آپ نہیں اٹھتیں۔

دربان۔ اجی کھولو تو سواریاں آئی ہیں۔

حسن آرا۔ (چونک کر) کہاں سے کیا؟

دربان۔ جی حضور سواریاں آئی ہیں۔

حسن آرا۔ ماما مغلانی۔ دل بہار پیاری کی اماں۔ ارے کیا سب کی سب مرگئیں اب آپ جائیں دروازہ کھولنے ہم۔

اتنے میں حسن آرا کی آواز سن کر ماما۔ اصیل۔ مغلانی۔ دل بہار۔ چھانی سب کی سب ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور دروازہ کھولنے لپکیں اور سپہر آرا بھی جاگ اٹھی۔

سپہر آرا۔ کون ہے باجی؟

حسن آرا۔ کیا جانے دستی[1] روشن ہے اور دو تین خاص بردار ساتھ ہیں اور دو فنس ہیں جانے کون آیا ہے۔

سپہر آرا۔ فنس پر پردہ پڑا ہے یا مردانی سواریاں ہیں؟

حسن آرا۔ نہیں بہن مردانی نہیں ہیں۔

حسن آرا اور سپہر آرا نے باسی ہی پانی سے منہ دھویا اور ماما نے پردہ کرا کے سواریاں اتروائیں۔

سپہر آرا۔ اخاہ روح افزا بہن ہیں اور بہار النسا بیگم بھی آئی ہیں۔

بہار النسا۔ بہن اچھی تو رہیں؟

سپہر آرا۔ دعا کرتے ہیں۔

---

[1] مشعل۔

حسن آرا۔ دو برس کے بعد آپ دونوں کو دیکھا۔
روح افزا۔ ہاں اور کیا؟
بہار النساء۔ اماں جان کہاں ہیں؟
سپہر آرا۔ آج طبیعت کچھ سست ہے۔
روح افزا۔ ہاں تو اب سویرے ملیں گے۔ آؤ حسن آرا اور ہم ایک پلنگ پر اور بہار النسا بہن اور سپہر آرا ایک پر سورہیں۔ اس وقت آنکھیں جھکی پڑتی ہیں۔

حسن آرا بیگم صاحب حسب معمول سویرے منہ اندھیرے اٹھیں سپہر آرا کو جگایا۔ دونوں بہنوں نے منہ ہاتھ دھویا اور وضو کر کے امام باڑے میں نماز صبح ادا کی۔ اس کے بعد حسن آرا بہ لحن داؤدی مناجات نظامی گنجوی پڑھنے لگیں اور ادھر سپہر آرا بیگم نے وظیفہ شروع کر دیا۔

جب حسن آرا نے مناجات اور سپہر آرا نے وظیفہ سے فراغت پائی تو چھوٹی بہن بڑی بہن کے پاس آئیں اور بصد اداب بجا لائیں۔

سپہر آرا۔ اماں جان بندگی!
بڑی بیگم۔ اللہ زندگی دے۔ اچھے گھر جاؤ۔
حسن آرا۔ اماں جان تسلیمات عرض کرتی ہوں۔
بڑی بیگم۔ جیتی رہو۔
ماما۔ دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔
بڑی بیگم۔ خدا ان کو تندرستی دے میرے تو دل کی چین۔ کلیجے کی ٹھنڈک آنکھوں کی سکھ ہیں۔
ماما۔ بیگم صاحب ان دونوں کا سبھاؤ اچھا ہے۔ واہ کیا مجاز پایا ہے، ہنس مکھ اور آنکھوں میں سیل۔
سپہر آرا۔ چلیئے اب تعریفیں رہنے دیجئے زیادہ مٹھاس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔
حسن آرا۔ اماں جان ہاں دیکھیئے خوب یاد آیا۔ رات بہار النسا بہن اور روح افزا بیگم آئی ہیں۔
بڑی بیگم۔ ہاں شکر ہے دیکھا میری بائیں آنکھ پھڑکتی تھی کل میں بھی کہوں کہ اللہ کیا خوش خبری سنوں گی کہاں ہیں کہاں بلاؤ بیٹیا یہ کیا ابھی تک یہاں آنے کی نوبت ہی نہ آئی۔
سپہر آرا۔ ابھی سو رہی ہیں۔ رات کو کہتی تھیں کہ آنکھیں جھپکی پڑتی ہیں۔ سفر میں نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔
بڑی بیگم۔ اے تو جگا دو بٹیا!
حسن آرا۔ اماں جان ذرا اور سونے دیجیئے۔
بڑی بیگم۔ بہار النساء اچھی تو ہیں؟
سپہر آرا۔ جی ہاں فضل الٰہی ہے۔
بڑی بیگم۔ روح افزا سنا تھا کچھ ماندی تھی۔ دبلی ہو گئی ہو گی؟
سپہر آرا۔ ہاں اماں جان ان کی اس موئے ڈنگو کی بیماری نے بالکل اری پری اڑا دی۔

اتنے میں حسن آرا اور سپہر آرا اپنے کمرے میں گئیں تو دیکھا کہ دونوں غافل سو رہی ہیں۔ اتنے میں روح افزا نے عجب ناز سے

کروٹ بدلی اور انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھی۔
سپہر آرا۔ بندگی!
روح افزا (آنکھیں ملتی ہوئی) بندگی بہن۔
سپہر آرا۔ خوب میٹھی نیند سوئیں۔
روح افزا۔ ابتک نیند کا خمار باقی ہے۔
سپہر آرا۔ اماں جان بلاتی ہیں۔
روح افزا۔ نماز پڑھ لیں تو چلیں۔
حسن آرا (بہار النسا کا ہاتھ پکڑ کر) اے بہن اب اُٹھو۔
بہار النسا (چشم نیم باز) اللہ اتنا دن چڑھ آیا۔ سارے میں دھوپ پھیل گئی۔
حسن آرا۔ اُٹھیے، چلیئے اماں جان بُلا رہی ہیں۔
بہار النسا۔ (اُٹھ کر) نماز پڑھ لیں تو چلیں۔
سپہر آرا۔ وہ تو جان کھائے جاتی ہیں کہ ہمیں منہ دکھا لیں پھر چلی جائیں۔
بہار النسا۔ اچھا روح افزا کو جگاؤ۔
سپہر آرا۔ (ہنس کر) اے وہ کیا بیٹھی ہیں سامنے۔

بہار النسا اور روح افزا نے منہ دھویا اور نماز کے لیے کھڑی ہوئیں۔ دونوں نے نماز صبح پڑھی اور تھوڑی دیر وظیفہ پڑھ کر سپہر آرا اور حسن آرا کے ساتھ چلیں۔ بڑی بیگم کے پاس جاتے ہی روح افزا پھرتی سے بڑی بیگم سے چمٹ گئی۔ (اماں جان بندگی عرض) بہار النسا بھی بڑی بیگم سے گلے ملیں اور ادب کے ساتھ فرش پر بیٹھیں۔

بڑی بیگم (روح افزا سے) اب تو اس بیماری نے پیچھا چھوڑا کیا کہتے ہیں تو بہ، مجھے تو اس کا نام بھی نہیں آتا۔
سپہر آرا۔ (مسکرا کر) ڈنگو بخار۔ آپ تو روز روز بھول جاتی ہیں۔
بڑی بیگم۔ ہاں وہی ڈنکو۔
سپہر آرا۔ (قہقہہ لگا کر) ڈنکو نہیں ڈنگو۔
روح افزا۔ اب ایک مہینے سے پیچھا چھوڑا ہے کہیں میری تو جان پر بن آئی تھی۔
بڑی بیگم۔ چہرہ کیسا زرد پڑ گیا ہے۔ اے ہے تو بتی سا منہ نکل آیا۔
بہار النسا۔ ابتو آپ انھیں اچھی دیکھتی ہیں۔ یہ تو گھل کے کانٹا ہو گئی تھیں۔
بڑی بیگم۔ حکیم محمد حسین نے علاج کیا تھا نہ وہاں۔
روح افزا۔ جی نہیں۔ وہ تو خود بیچارے اسی ڈنگو لنگوڑے میں مبتلا تھے۔ دولہا بھائی ایک ڈاکٹر (ڈاکٹر) کو لائے تھے۔
بڑی بیگم۔ بہار النساء۔ یہ تم بہنوں خط کیوں نہیں بھیجتی ہو میاں سے خطوں پر خط جاتے ہیں مگر جواب ہی نہیں آتا۔
بہار النساء۔ اماں جان خطوں کا تو میں تار باندھ دوں مگر جب کوئی لکھنے والا بھی ہو۔
روح افزا۔ یہ تو گرہستی کے دھندے میں ایسی پڑ گئیں کہ پڑھا لکھا سیکھا سکھایا سب چوپٹ کر دیا۔

حسن آرا۔ اور دولہا بھائی نے تو خط لکھنے کی قسم کھائی ہے۔
سپہر آرا۔ ہاں ان کو جیسے چڑ سی معلوم ہوتی ہے۔
روح افزا۔ دن بھر بیٹھے شعر کہا کرتے ہیں۔ بس اور کچھ نہیں۔ ذری سا لفافہ لکھنا پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔
بڑی بیگم۔ (بہار النساء سے) کہو تمھاری ساس تو اچھی ہیں۔
بہار النسا۔ ہاں نہ مجھے موت آتی ہے نہ اُنھیں۔
بڑی بیگم۔ بڑی کلہ دراز عورت ہے۔
روح افزا۔ اُٹھتے جُوتا بیٹھتے لات۔ یہ بات وہ بات لا میرے ہاتھ۔ کل پرسوں تک دولھا بھائی یہاں آئیں گے تو میں ان کو خوب جھاڑوں گی۔
حسن آرا۔ وہ بیچارے کیا کریں۔ ان سے کچھ بس چلتا ہے۔
بڑی بیگم۔ دیکھو سچی بات یہ ہے کہ تمھاری بہن بھی ذرا تیز مزاج ہیں، ہاں۔ صاحبزادی بھی ذرا سی بات پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔
سپہر آرا۔ جو ایک گرم ہو اور ایک نرم ہو تو بات بنے اور جو دونوں تیز ہوئیں تو کیسے بنے۔
بہار النسا۔ اب تم اپنی ساس سے نہ لڑنا۔ تم نرم ہی رہنا۔ میرے تو ناک میں دم آگیا۔ اللہ نہ کرے ایسی ساس کسی کو ملے۔
بڑی بیگم۔ خورشید مرزا یہاں آئیں تو میں ان کو سمجھا دوں۔
بہار النسا۔ واہ اماں جان مجھ سے ان سے حشر تک نہ بنے گی جو لونڈی باندی مجھ سے اچھی طرح باتیں کرے تو جل مرتی ہیں اور میں جان بوجھ کر اور جلاتی ہوں۔
بڑی بیگم (پیٹھ ٹھونک کر) شاباش برخوردار۔
حسن آرا۔ مل جل کر رہو بہن۔
بہار النسا۔ اب جب تم سسرال جاؤ گی اور ایسی ہی ساس پاؤ گی اور پھر مل جل کے رہو گی تو سات بار سلام کروں گی۔
حسن آرا۔ آخر یہ جھگڑا ہی کا ہے کا ہے؟
بہار النسا۔ کہہ دوں گی۔
روح افزا۔ جھگڑا سارا یہ ہے کہ دولھا بھائی ان کی خاطر بہت کرتے ہیں وہیں۔ ان کی ساس جلی مرتی ہیں کہ جورو کی خاطر کیوں کی اس نے۔
سپہر آرا۔ کیا ماں کی خاطر نہیں کرتے ہیں؟
روح افزا۔ ماں کے سامنے مارے ڈر کے ان سے اچھی طرح باتیں تو کی نہیں جاتیں تم خاطر کرنا لیے پھرتی ہو۔
بہار النسا۔ میں تو اللہ جانتا ہے ہزاروں دفعہ طرح دیجاتی ہوں مگر جب نہیں رہا جاتا تو میں بھی بکنے لگتی ہوں۔ مجھے تو انھوں نے بے حیا کر دیا بس اب وہ ایک کہتی ہیں تو میں دس سناتی ہوں۔
بڑی بیگم (پھر پیٹھ ٹھونک کر) شاباش!

حسن آرا۔ میری طرف سے بھی پیٹھ ٹھونک دیجیئے گا

بہار النسا۔ اچھا حسن آرا جو کسی تیکھی اور تیز ساس سے پالا پڑا تو دکھا دوں گی۔

حسن آرا۔ واہ۔

سپہر آرا۔ ہم تو اس طرح رہیں کہ ساس اپنی لڑکیوں سے زیادہ پیار کرے۔

بہار النسا۔ جب آدمی ہو نہ۔

سپہر آرا۔ بہن ہم تو چٹکیوں میں آدمی بنالیں۔

بہار النسا۔ ابھی ناتجربہ کار ہو نہ۔ ہم کو تو ایسا دق کر رکھا ہے اللہ کرے مرجائے وہ بام۔

بڑی بیگم۔ پھر وہی باتیں کرنے لگیں؟

روح افزا۔ اے ہاں یہ کیا گھڑی گھڑی بدشگونی نکالتی ہو منہ سے وہ مریں چاہے چولھے میں پڑیں تم اپنے تئیں تو نہ کوسو۔

حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا اور بہار النسا بڑی بیگم کے پاس سے اُٹھ کر کمرے میں گئیں اور چاروں وہاں جاکر نکھرنے لگیں۔ بس اب قیامت کا سامنا ہے۔ چاروں نوخیز۔ چاروں تیز۔ چاروں شوخ اور متین چاروں عفیفہ اور حسین۔

دو ادھر نکھر رہی ہیں دو اُدھر سنگار کر رہی ہیں ؎

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو　　　طلب ہوتا ہے شانہ آئینہ کو یاد کرتے ہیں

سبحان اللہ کیا شعر ہے ہزار بار لکھیں مگر پھر بھی جی چاہے کہ لکھتے ہی جائیں۔ حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا تو بن ٹھن کے موجود ہو گئیں مگر بہار النسا بیگم کے ابھی گیسو ہی سنورتے ہیں۔ آئینہ روبرو ہے صورت پسند نہیں آتی مانگ ٹیڑھی ہو گئی ہو باف کا جوبن ہی نہیں ظاہر ہوتا۔ چھپکا بے موقع ہے یا الٰہی۔

روح افزا۔ انھیں جب دیکھو ناک چوٹی میں گرفتار رہتی ہیں۔

بہار النسا۔ تم آئے دن یہی طعنے دیا کرتی ہو۔

حسن آرا۔ اب آخر بہن کب تک سنگار ہو گا؟

روح افزا۔ ایسی تو صورت بھی نہیں اللہ نے بنائی ہے۔

بہار النسا۔ اے آپ تو بڑی قبول صورت ہیں نہ۔ ہمارے تلوے کو بھی نہیں پہنچتیں۔

گو بہار النسا سب سے زیادہ بنی ٹھنی تھی مگر حسن آرا کی خوبصورتی اُس سادگی میں بھی چوگنی تھی۔

بہار النسا نے کوئی دو گھنٹے میں کنگھی چوٹی سے فراغت پائی مگر اس وقت واقع میں بھلی معلوم ہوتی تھیں اور ع دیکھ آئینہ میں کہتی تھیں کہ اللہ ری میں۔ روح افزا گو ڈھنگو کی بدولت دُبلی ہو گئی تھیں اور چہرے میں وہ سرخی اور رعنائی بھی نہ تھی مگر پھر کمسن تھیں حسین تھیں۔ سپہر آرا کی شوخی اور کج ادائی سب سے نرالے گئی۔ مگر حسن آرا کے بھولے پن اور اسی کے ساتھ بانکی ادا نے اس کے جوبن کو دوبالا کر دیا تھا۔ چاروں نکھر کر اُس وسیع و فراخ پُر بہار ہوا دار کمرے میں فرش مکلف پر چھپر کھٹ کے پاس بیٹھی باتیں کرنے لگیں۔ سپہر آرا ٹھٹولی کرتی تھیں۔ حسن آرا نزاکت کے ساتھ گلوریاں بناتی تھیں۔

میرزا ہمایوں فر اور اصنام رشک قمر

اتنے میں بہار النسا نے کہا کہ اس وقت کالی کالی گھٹا چھائی ہے۔ جی چاہتا ہے مہتابی پر سے دریا کی موجیں دیکھیں۔ روح افزا بھی جھپ سے راضی ہو گئی۔ سپہر آرا بھی خوش خوش اُٹھ کھڑی ہو گئیں۔ ہاں ہاں چلیئے چلیئے، مگر حسن آرا کو یاد آ گئی کہ مرزا ہمایوں فر ضرور خبر پائیں گے اور ضرور کوٹھے پر آئیں گے اور ضرور ستائیں گے۔ لیکن مجبور تھی۔ چاروں طرف پھرتی کے ساتھ زینے پر چڑھنے لگیں۔ ہائے اس وقت کی شوخی بس غضب تھی سپہر آرا کہتی ہیں کہ سب کے پہلے میں ہی مہتابی پر پہنچوں۔ بہار النسا کی نزاکت اور تیزی اور ہی جوبن دکھاتی ہے۔ روح افزا ہنس ہنس کر سپہر آرا کے شانے سے شانہ لڑاتی ہے۔ مگر حسن آرا پھر آپ جانیے نستعلیق ناز و انداز سے خراماں خراماں زینوں پر قدم رکھتی ہیں۔ چاروں غارتگر دین و ایمان مہتابی پر داخل ہوئیں۔

کسی ہمراز نے میرزا ہمایوں فر سے جا کر کہہ دیا کہ پیر و مرشد! اس وقت تو سامنے والا کوٹھا پرستان ہے۔ اندر کا اکھاڑا ہو رہا ہے۔ ایک غنچہ کھلا ہوا ہے سامنے۔ ان کو تاب کہاں، تڑپ سے کوٹھے پر آئے تو

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ ۔۔۔ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

سپہر آرا جھپٹ کے کمرے میں ہو رہی۔ روح افزا تڑ سے وہیں بیٹھ گئیں۔ حسن آرا نے ذقن بھری تو راہ لی ہیں۔ مگر بہار النسا بیگم نے بیدھڑک آنکھیں لڑائیں۔ میرزا ہمایوں فر نے بہت جھک دور ہی سے آداب عرض کیا۔

بہار النسا۔ آنکھیں ہی پھوٹیں جو ادھر دیکھے۔

ہمایوں فر (ہاتھ کے اشارے سے) اپنا گلا اپنے آپ کاٹ ڈالوں گا۔

بہار النسا۔ بسم اللہ۔

اتنے میں ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگیں اور چاروں پری پیکر بانکپن کے ساتھ نیچے چل دیں۔ میرزا ہمایوں فر منہ تاکتے رہ گئے۔

حسن آرا (بہار النسا سے) آپ تو خوب ڈٹ کے کھڑی ہو گئیں۔

بہار النسا۔ کیوں کیا کوئی گھول کے پی جائے گا؟

روح افزا۔ یہ شہزادے ہیں ہمایوں فر۔

سپہر آرا۔ تم کیوں کر جانتی ہو بہن؟

روح افزا۔ اے واہ اور سنیئے گا۔ جانو ہم یہاں کبھی آئے ہی نہیں۔ یہ بہت دن تک کلکتہ میں رہے۔ لڑکپن میں ہم کھیلا کیئے ان کے ساتھ۔

بہار النسا۔ اے بہن چیچیں لگا یا کیے ہیں ان کو۔ لڑکپن میں بڑے خبصورت (خوبصورت) تھے۔

روح افزا۔ اور کیا اب نہیں ہیں؟

بہار النسا۔ دور سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ہے ہے ان کی ماں اور دادی سے جھوٹم جھوٹا ہوا کرتا تھا۔ ساس بہوؤں میں پل بھر تو بنتی نہیں تھی۔ جب دیکھو کھٹ پٹ۔

روح افزا۔ تم تو خوش ہوا کرتی ہو گی۔

سپہر آرا۔ آیئے شطرنج کھیلیں۔

بہار النسا۔ یہاں آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں تم شطرنج کے منصوبے میں ہو!

اتنے میں بڑی بیگم نے پانچ سیب ایک انار کچھ انگور اور چلغوزے بھیجے۔

ماما۔ لیجیے یہ میوہ بڑی بیگم صاحب نے دیا ہے۔

چاروں بہنوں نے میوہ مزے مزے چکھا، چہل ہوتی جاتی تھی۔ ایک دوسرے کے ہاتھ سے چھین کے کھاتی تھیں، قہقہے پڑتے تھے شانے سے شانے لڑتے تھے۔ جوانی کی اُمنگ شباب کی ترنگ۔

اب سنیئے میرزا ہمایوں فر ٹکٹکی باندھے تاک رہے ہیں ؎

نہ مڑ کر بھی بیدرد قاتل نے دیکھا   تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

جب بڑی دیر تک مہتابی کو سونا پایا تو بیچارہ یہ شعر زبان پر لایا ؎

کل بدآموز نے کیا تم کو سکھایا ہے کہ ہائے   آج وہ آنکھ وہ چشمک وہ اشارہ ہی نہیں

شہزادۂ بلند اختر میرزا ہمایوں فر نے جب اُن غیرت لعبتان چینی سر لوح بیاض نازنینی کو نظر سے اوجھل پایا تو ان کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھایا دم گھبرایا۔ بہار النسا کا آنکھیں لڑانا یاد آیا۔ حسن آرا کی تیزی اور شوخی کے خیال نے تڑپایا جگر میں خار غم ہجر کی خلش۔ سینہ میں نائرۂ رنج جدائی کی طپش۔ دل میں دھڑکا۔ جی میں کھٹکا۔ گل سا چہرۂ خنداں مرجھا گیا غنچۂ دل کملا گیا۔

فرطِ مسرّت سے چاروں بہنوں کا کھلکھلانا

سویرے منہ اندھیرے چاروں عفیفہ و پاکبازہ خوبرو دیان طنّاز وضو کر کے امام باڑے میں جانماز بچھا کر نماز پڑھ رہی تھیں۔
پہلے تو حسن آرا اور بہار النسا میں بحث ہوئی۔

بہار النسا۔ الگ الگ مصلے بچھاؤ۔

حسن آرا۔ یہ کیوں ایک جگہ نماز پڑھنا کیا کچھ گناہ ہے؟

بہار النسا۔ اے اتنا نہیں جانتیں کہ جماعت سے عورتیں نماز نہیں پڑھ سکتیں۔

حسن آرا۔ تو بہن امام عورتوں میں نہیں جائز ہے یا ایک ساتھ پڑھنا۔

بہار النسا۔ اچھا چلو۔

چاروں نے نماز ادا کی۔ سپہر آرا وظیفہ اور روح افزا مناجات پڑھ رہی تھیں۔ حسن آرا نے عندلیب شاخسار جادو طرازی حضرت لسان الغیب حافظ شیرازی جعل اللہ مقامہ فی الجنان کا دیوان معرفت توامان اٹھا لیا اور بہار النسا بیگم نے حسن دان منگوا کر نکھرنا شروع کیا۔ اپنے مذاق کے موافق سب کی سب مصروف ہوئیں۔

حسن آرا۔ بس صبح تو نکھار۔ شام تو سنگار۔ یا میرے اللہ حسن دان۔ سنگار دان۔ آئینہ۔ کنگھی چوٹی۔ پھلیل۔ مسّی۔ عطر اس کے سوا تمھیں اور کسی شے سے واسطہ ہی نہیں۔

بہار النسا۔ بس اب باتیں نہ کرو۔ مانگ ٹیڑھی ہو گئی۔ تمھاری باتوں میں خیال بٹ گیا۔

حسن آرا۔ (ہنس کر) ہے ہے غضب ہو گیا۔ یہاں تو دولھا بھائی بھی نہیں ہیں آخر یہ نکھار دکھاؤ گی کسے؟

بہار النسا۔ ہم اٹھ کے یہاں سے چلے جائیں گے۔ تم چھیڑتی جاتی ہو ایک تو موا چھپکا سیدھا نہیں رہتا۔

حسن آرا (قہقہہ لگا کر) اے ہے۔ اب تک مانگ کا خیال تھا۔ اب چھپکے کا خیال ہے۔

بہار النسا۔ اچھا ایک دن ہم تمھاری مشاطہ بنیں۔ اللہ گواہ ہے وہ جوبن آجائے کہ جس کا حق ہے۔

حسن آرا۔ پھر اب صاف صاف کہلواتی ہو بہن اس سر کی قسم یاد رکھو تم لاکھ بنو ٹھنو ہمارا جوبن تو خدا داد ہے۔ ہمیں بناؤ چناؤ کی حاجت ہی کیا ہے بھلا؟

بہار النسا۔ اپنے منہ میاں مٹھو بن لو۔

حسن آرا۔ ہاں یہ دعویٰ

بہار النسا۔ کیوں کیا کچھ جھوٹ ہے؟

حسن آرا۔ اور نہیں، سچ بھی ہے۔

بہار النسا۔ اچھا یہ پڑھیں تو پوچھیں۔ جو یہ دونوں کہیں وہ ٹھیک ہے۔

حسن آرا۔ منظور مگر کچھ بد لیجیئے۔

بہار النسا۔ یہاں بد کے پاس نہیں کھڑے ہوتے۔

روح افزا۔ کیا صحبت ہو رہی ہے؟

سپہر آرا۔ کیا سوتی تھیں اب تک؟

بہار النسا۔ بی حسن آرا کچھ فرماتی ہیں۔

سپہر آرا۔ ہم سے رائے لیجیے تو ہم بتائیں۔

حسن آرا (سپہر آرا سے) بہار النسا اپنے کو پرستان کی پری جنت کی حور سمجھتی ہیں اور ہم اُن کے نزدیک کچھ ہئیں نہیں۔ بس اب تم اور بہن روح افزا دونوں انصاف سے کہہ دو۔

سپہر آرا۔ جس طرح بہار النسا بہن نکھرتی ہیں سنورتی ہیں۔ اس طرح اگر تم بھی نکھرو تو چاند کا ٹکڑا بن جاؤ۔ تمھارے چہرے پر سُرخی اور سفیدی اور رعنائی کے علاوہ نمکینی بھی بہت ہے مگر وہ گوری چٹی ہیں۔ بس نمک نہیں ہے مگر ہاں حسین ضرور ہیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

روح افزا۔ دونوں حسین ہیں مگر حسن آرا بڑھ چڑھ کر۔ یہ تو ہم نہ کہیں گے کہ بہار النساء بہن میں نمکینی نہیں ہے مگر ہاں حسن آرا سے کم ہی کم۔

بہار النسا۔ چلو خیر۔

حسن آرا۔ اب آپ چاہے بُرا مانیے۔

استنے میں ایک فٹن کھڑکھڑاتی ہوئی آئی۔ مشکی جوڑی جتی ہوئی کوچمین سُرخ وردی پہنے ہوئے چوبداروں کی سی پگڑی جمائے بیٹھا ہے۔ پیچھے دو سائیس کالی وردیاں ڈانٹے کھڑے ہیں۔ فٹن ایوان سپہر توامان کے برآمدے میں ٹھہری اور ایک جوان رعنا بلند و بالا گلعذار ہنس مکھ باغ و بہار اُترا۔

دربان۔ (جھک کر) بندگی حضور۔

خاں صاحب۔ (زمین دوز ہو کر) سلام غریب پرور۔

ماما۔ (مسکرا کر) اچھے رہے حضور۔ آج بہت دن پیچھے دیکھا۔

حسن آرا۔ یہ گاڑی کس کی آئی۔

روح افزا۔ ہاں کوئی آیا ہے۔

بہار النسا۔ پوچھو پوچھو کسی سے؟ مردانی سواریاں ہیں یا زنانی؟

سپہر آرا۔ (جھانک کر) جانے کون ہے مگر جوڑی تو اچھی ہے

بہار النسا۔ رنگت کیا ہے؟

سپہر آرا۔ کالی۔ وہ۔ مشکی مشکی۔

روح افزا۔ پالکی گاڑی ہے یا فٹن ہے؟

سپہر آرا۔ نہیں کوئی چھ سات سو روپیہ کی فٹن ہے۔

بہار النسا۔ میں کہتی ہی تھی کہ آتے ہونگے۔

سپہر آرا۔ کیا دولھا بھائی آئے؟

روح افزا۔ (تالیاں بجا کر) چلو آگئے اب باتیں ہونگی۔
ماما۔ (پردے کے پاس سے) نواب صاحب ابھی ابھی فٹن سے اُترے۔
بہار النسا۔ چل جھوٹی۔
ماما۔ اللہ کی قسم ابھی ابھی گاڑی پر سے اُترے ہیں۔ ابھی ابھی تو آئے۔
روح افزا۔ واہ کہیں آئے نہ ہوں۔
ماما۔ مجھے لڑکے کی قسم اپنے۔
سپہر آرا۔ فٹن آتی تو کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ سنتے۔ کوئی بات بھی ہے۔
ماما۔ ہائے اللہ میں کس کے سامنے سر پھوڑوں اپنا۔ اور جو آئے ہوں؟
حسن آرا۔ آئے کیوں کر ہوں، وہی بے تکی ہانکے جائے گی۔
ماما۔ اونھ نہ سہی۔

حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا اور بہار النسا اس ماما کی بیوقوفی اور بڑ چڑے پن اور قسمیں کھانے پر بہت ہی ہنسیں۔ ماما نے بُرا مانا کہ میں لاکھ قسموں پر قسمیں کھاتی جاتی ہوں ان کو یقین ہی نہیں آتا۔ خیر نواب خورشید علی خاں فٹن سے اُترے تو ایک مغلانی نے بڑی بیگم سے جا کر کہا کہ آپ کے داماد آئے ہیں۔ بہار النسا بیگم کے دولھا نواب صاحب داخل ہوئے۔

نواب۔ (بڑی بیگم سے) آداب بجالاتا ہوں۔
بڑی بیگم (متانت سے) آؤ برخوردار میری بائیں آنکھ جب پھڑکتی ہے کوئی نہ کوئی آتا ضرور ہے۔ اُس دن آنکھ پھڑکی تو دولھا کہاں آئیں۔ یہ روح افزا کی کیا حالت ہوگئی ہے بھائی، وہ صورت ہی نہیں رہی۔ گل کے کانٹے ہوگئی ہے۔
نواب۔ اب تو بہت اچھی ہیں مگر پرہیز نہیں کرتیں۔ تمنیا مرچ نہ ہو تو کھانا نہ کھائیں پھر بھلا اچھی کیونکر ہوں، آپ ذری تاکید رکھیئے گا۔
بڑی بیگم۔ واہ میری تاکید۔ تم برابر والے ہو۔ جب تمہارا کہنا نہیں کرتیں تو پھر کس کا کہنا مانیں گی۔ تم اپنے طور پر سمجھاؤ۔ بھلا النسا سمجھائے کہو اب تو سنا تمہاری وکالت خوب چمکی ہے۔
نواب۔ جی ہاں آپ بزرگوں کی دعا سے۔ صاحب تو مجھ کو چار سو کی منصفی دلوانے تھے مگر میں نے منظور نہ کی۔ مجھے بہت کچھ خدا کے فضل سے یوں ہی مل رہا ہے۔
بڑی بیگم۔ ماں تو تمہاری اچھی ہیں؟
نواب۔ جی ہاں بخیریت ہیں۔
بڑی بیگم۔ خفا تو نہیں ہوتیں کہ سسرال کیوں جاتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ساس پھسلائے۔
نواب۔ (مسکرا کر) جی نہیں۔ واہ
بڑی بیگم۔ بیٹا! زمانہ بہت نازک جاتا ہے۔ جہاں رہو اللہ کرے خوش رہو۔ بس ہماری تو یہی دعا ہے۔ زندگی تندرستی کھانے بھر کو رزق چاہیئے یہی ہزار نعمت ہے۔
نواب۔ بجا ہے۔

تھوڑی دیر تک باتیں کر کے نواب ممدوح سے بڑی بیگم نے کہا کہ وہ کمرہ ہے سامنے، وہاں فرش بچھا ہوا ہے بیٹو

آرام کرو۔ نواب صاحب سلام کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے کی طرف چلے جب کمرے کے قریب پہنچے تو ٹھٹک گئے اس وقت حسن آرا اور روح افزا لہرا لہرا کر آہستہ آہستہ پڑھ رہی تھیں۔

شراب تند دے ایسی ہی ساقی　　　　کہ جس سے غم رہے معلق نہ باقی

نواب صاحب ایک رسیا آدمی بڑی دیر تک وہ لحن داؤدی اور نغمہ روح افزا سنا کیئے۔ اس کے بعد کہا کہ اللہ اللہ! آج تو گانا ہو رہا ہے۔

حسن آرا۔ (دانتوں کے تلے اُنگلی دبا کر) ارے! ہم تو بھاگتے ہیں۔

بہار النسا۔ اے بیٹھو بھی کیا کچھ چوری پڑی ہے ؟

روح افزا۔ آیئے آیئے! آیئے آیئے نہ۔

نواب۔ خلل انداز تو نہ ہوں گا؟

روح افزا۔ جی بجا ہے۔ آپ کی بیوی مثنوی پڑھ رہی ہیں۔ آپ جانیں وہ جانیں۔

اتنے میں نواب صاحب اندر تشریف لائے۔ وضع سُنیئے۔ جرّاب خاکی رنگ کا۔ گھٹنا چُست صوفیانہ رنگ۔ کرتہ سفید فلالین کا اس پر سیاہ بیش بہا بانات کا دگلا۔ اور سبز گرنٹ کی گوٹ۔ دس روپیہ کی سلا ئی گھڑی اور زنجیر طلائی سیاہ گرنٹ کی اُتو کی ہوئی بانکی ترکی وار ٹوپی اور ایک سفید دلائی اوڑھے ہوئے۔ پاؤں میں تین روپیہ کا سیاہ وارنش کا بوٹ۔ عطر سے از سرتاپا بسے ہوئے سُرخ و سفید مشین آدمی۔ حسن آرا اور سپہر آرا نے نیچی گردن کر کے بندگی کی۔ روح افزا نے کہا کہ بے اطلاع کیسے ہمارے کمرے میں کیوں چلے آئے صاحب

نواب۔ حکم ہو تو اُلٹے پاؤں واپس جاؤں

بہار النسا۔ بسم اللہ بن بلائے کوئی نہیں آنے پاتا۔

نواب۔ حسن آرا بیگم کو ہم نے کوئی پورے سوا برس کے بعد دیکھا۔

حسن آرا (گردن نیچی کر کے آہستہ سے) نہیں دولھا بھائی آپ کو یاد نہیں ہے ساون میں آپ ایک مقدمے کی پیروی کے لیے آئے تھے۔

سپہر آرا۔ جی ہاں دو دن آپ رہے تھے یہاں۔

نواب۔ ہاں سچ کہا خوب یاد آیا۔

بہار النسا۔ آپ کی سالی سپہر آرا بیگم کو بڑا اشتیاق ہے کہ آپ کے ساتھ بگھی پر ہوا کھانے جائیں۔

سپہر آرا۔ واہ کیا جھوٹ موٹ لگاتی ہو۔ بھلا میں نے کب کہا تھا؟

روح افزا۔ ہم گواہ ہیں۔

نواب۔ اچھا پھر اس میں عیب ہی کیا ہے ہم نے تو ان سے (بہار النسا کی طرف اشارہ کر کے) کہا تھا کہ دو گھڑی چلا کرو ہوا کھانے۔

بہار النسا۔ اپنی عنایت تہ کر رکھیے۔

روح افزا۔ اس وقت تو دولھا بھائی ان سے دور قرآن درمیاں بالکل نواب نادر حسین معلوم ہوتے ہیں۔

حسن آرا۔ اے ہاں خوب یاد آیا۔ جہاں آرا بہن کہہ گئی تھیں کہ جب خورشید دولھا آئیں تو ہم کو ضرور بلا لینا۔ بھیجدوں رقعہ۔

نواب - ضرور بلواؤ آنکھیں ان کو ڈھونڈھتی ہیں۔
سپہر آرا۔ وہ اب کی شکایت کرتی تھیں کہ خورشید دولھا آئے اور ہم سے نہ ملے۔
نواب ہاں سچ کہتی ہیں۔

اتنے میں روح افزا ایک شیشے کی تشتری میں چکنی ڈلیاں رکھ کر لائیں اور نواب صاحب کے سامنے لے گئیں۔ نواب صاحب نے دو اُٹھالیں اور کھالیں۔ چباتے ہی آخ تھو۔ آخ تھو۔

نواب۔ پانی منگواؤ واسطے خدا کے۔

حضرات ناظرین سمجھے بھی۔ کیا سمجھے؟ سالی نے بہنوئی سے اچھی دل لگی کی بہنوئی اور سالی میں چہل ہوئی۔ آپ کوئی قاضی ہیں۔ وہ چکنی ڈلیاں لکھنؤ کے چابک دست کامل فن کمہاروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں (مٹی کی)، نواب صاحب خاک نہ سمجھے۔ جھپ سے منہ میں رکھ ہی تو لیں چباتے ہی مزا کرکرا ہوگیا اور اُدھر اُن پریزادوں نے قہقہہ لگانا شروع کیا اور حضرت بہت ہی جھینپے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب منہ دھو چکے تو سپہر آرا نے گلوری دی۔

نواب۔ (گلوری کھول کر) اب بے دیکھے کھانے والے کی ایسی تیسی۔ کہیں اس میں مرچیں نہ جھونک دی ہوں (پان کھا کر) اس وقت آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔

حسن آرا۔ باسی کھیر کھائیے تو لاؤں؟

نواب۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔

حسن آرا جا کر ایک قفلی اُٹھا لائی۔ نواب صاحب نے بڑی خوشی سے لی مگر کھولتے ہیں تو مینڈ کی اُچک کردہ ہورہی۔

نواب۔ معقول یہ روح افزا سے بھی بڑھ کر نکلیں۔ بڑی تو بڑی بی چھوٹی۔ بی سبحان اللہ۔ یک نہ شد دو شد۔ انھوں نے مٹی کی سیپاری کھلائی۔ انھوں نے مینڈ کی کی کھیر بنائی۔ ع مینڈ کی راز کام پیدا شد۔

حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا اور بہار النسا مارے ہنسی کے لوٹ رہی تھیں۔

دریں دریائے بے پایاں

بحرِ زخار ناپیدا کنار میں ایک جہاز مثل محبوبانِ طناز اٹھکھیلیاں کرتا چلا آتا ہے۔ بادِ خنک و طرب انگیز کا جھونکا جگر تک کو سرد ہی پہنچاتا ہے۔ سوائے لاجوردی آسمان اور نیلی چادر آب کے کالے کوسوں تک کچھ اور نظر ہی نہیں آتا ہے۔ آزاد عالی نژاد کو کبھی یادِ صنم، کبھی خیالِ وصال۔ گو لاکھ ضبط کیا مگر آنسو چشمِ خونچکاں سے نکل ہی آئے۔

عین حالتِ جنوں میں دیوانہ وار گھومتے تھے کہ ایک بُتِ زرّیں کمر پری پیکر نازک بدن غنچہ دہن نے آہ سرد بھر کر جو نظر ڈالی۔ کنکھیوں سے دیکھا دیدہ و دانستہ بات ٹالی۔ یہ یورپین لیڈی صاحب حسن و جمال تھی۔ زہرہ تمثال مشتری خصال تھی۔ از سرتا پا سیاہ ریشمی لباس زیب تن اور وہ جوبن وہ چھبن کہ خدا کی قدرت مجسم نظر آتی تھی۔ صباحت و وجاہت صدقے ہوئی جاتی تھی۔

میاں آزاد بادلِ ناشاد جہاز پر اپنی پیاری حسن آرا کی یاد میں سر دھنتے تھے چپکے چپکے ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے کسی سے کچھ کہتے تھے نہ سنتے تھے۔ مگر اس بُت جادو جمال نے جو کنکھیوں سے ان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ رنگ رو باختہ ہیں بھانپ گئی کہ حضرت عشق کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔ تھوڑی دیر تک ان کی کیفیت بغور دیکھا کی بعد ازاں اپنے شوہر سے یوں ہمکلام ہوئی:۔

مس (م) (یعنی مس ونیشیا) چارلی پیارے دیکھو وہ ہندوستانی جنٹلمین جو سامنے ٹہل رہا ہے دیکھا؟ وہ وہ۔

صاحب (ص) (یعنی لفٹننٹ ایلٹن صاحب) ہاں ہاں دیکھا۔ پھر؟

م۔ چارلی پیارے اس جنٹلمین سے کیوں کر پوچھیں کہ آہ سرد اور دل پُر درد کا سبب کیا ہے۔ بتاؤ؟

اِتنے میں جہاز کے ایک کونے سے آواز آئی کہ (او گیدی نہ ہوئی قرولی۔ نہ ہُوا تمنچہ ورنہ لاش پھڑکتی ہوتی اس وقت) میاں آزاد سمجھ گئے کہ حضرت خواجہ بدیع صاحب کو دُور سے شیطان نے انگلی دکھائی۔ وحشت سر پر سوار ہوئی۔ قرولی یاد آئی، ڈرے کہ ایسا نہ ہو کہ کسی یورپین سے لڑ پڑیں۔ افیم کی ترنگ میں بے وجہ جھگڑ پڑیں۔ قریب جا کر پوچھا کہ کس پر بگڑے؟ کون یاد آیا؟ کس پر غل مچایا؟

خوجی ـ (یعنی خواجہ بدیع الزمان بدیع) اجی جاؤ بھی یہاں تسکا ہاتھ سے جاتا رہا۔ واللہ گرفتار ہی کر لیا تھا گیدی کو پاتا تو اتنی قرولیاں لگاتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آتا۔ مگر میرا پاؤں پھسل گیا اور وہ نکل گیا۔

آزاد۔ (مسکرا کر) یار ایک آنچ کی ہمیشہ کسر رہ جاتی ہے۔ خیر ابکی چپڑ غٹو کرنا گیدی کو۔ یہ تھا کون؟

خوجی ـ تھا کون؟ تھا کون؟ ہوتا کون؟ وہی بہروپیا مردود۔ اور کس کو پڑی تھی بھلا۔

آزاد ـ بہروپیا؟

خوجی ـ جی ہاں بہروپیا۔ بڑا تعجب ہُوا آپ کو

آزاد۔ بھئی ہاں تعجب کہیں لینے جانا ہے۔ کیا بہروپیا بھی جہاز پر سوار ہو لیا ہے بڑا گولا ہے بھئی۔

خوجی۔ سوار نہیں ہوا تو آیا کہاں سے۔ ٹھہر جا گیدی تو خواجہ بدیع جو قرولیاں ہی نہ بھونکی ہوں (مونچھوں پر تاؤ دیکر

انشاء اللہ۔
آزاد۔ کیا سوتے تھے خوجی یا پینک میں تھے؟
خوجی۔ خوجی کی ایسی تیسی مردود کی۔ پھر تم نے خوجی کہا ہم کو کیوں جی؟
آزاد۔ معاف کرنا بھئی۔ قصور ہوا۔
خوجی۔ واہ اچھا قصور ہوا۔ کسی کو دو جوتے لگائیے اور کہیئے قصور ہوا۔ خواجہ بدیع صریح مجھ کمبخت کا نام تھا۔
آزاد۔ نام تھا۔ کیا اب نہیں ہے؟
خوجی۔ جب دیکھو خوجی خوجی۔ خوجی کی ایسی تیسی مردک کی۔
آزاد۔ جناب خواجہ بدیع صاحب یہ بہروپیا کمبخت کہاں سے آ گیا؟
خوجی۔ ارے صاحب اب تو خواب میں بھی آنے لگا۔ ابھی ابھی میں سوتا تھا۔ میرے ہاتھ میں اس وقت افیم کی ڈبیا تھی پھینک کے ڈبیا اور ے کے کتارا جو نیچے جھپٹا تو دو کوس نکل گیا، مگر شامت اعمال سے ایک مقام پر ذرا سا پانی[1] پڑا تھا۔ روح فنا ہو گئی، پھسلا تو اراراد ھوں۔
آزاد۔ کیا گر پڑے؟ ارے توبہ!
خوجی۔ بس کچھ نہ پوچھیئے۔ پھر آپ جانیئے میرا گرنا۔ یہ معلوم ہوا جیسے ہاتھی پہاڑ سے گرا دھڑام۔ دھڑام۔
آزاد۔ اس میں کیا شک ہے۔ آپ کے ہاتھ پاؤں ہی کیسے ہیں۔ وہ تو کہیئے بڑی خیریت گذری۔
خوجی۔ اور کیا۔ اللہ نے بچایا!
آزاد۔ تو یہ کہیئے ہتے پر سے اکھڑ گیا۔
خوجی۔ اوہ جاتا کہاں ہے گیدی رگید کے ہار دوں قرولیاں تو خواجہ بدیع یہاں کیدانی کر چکے ہیں۔

لفٹنٹ اپلیٹن اور مس وینشیا دونوں میاں آزاد اور خوجی کی تقریر سنتے تھے۔ اپلیٹن تو اردو خوب سمجھتے تھے، مگر وینشیا ناواقف تھیں۔ اپلیٹن نے ترجمہ کر کے بتایا تو وینشیا نے قہقہہ لگایا کہ معقول یہ ٹھیک۔ انچھ بھر کا آدمی ایک ایک ماشہ کے ہاتھ پاؤں اور اس کے گرنے سے اتنی بڑی آواز ہوئی کہ جیسے ہاتھی گرے۔

ص۔ سڑی ہے کوئی۔
م۔ پکا سودائی معلوم ہوتا ہے۔
ص۔ خدا جانے کیا واہی تباہی بکتا تھا۔ ذرا سی بات بات پر بھونکتے ہیں آپ۔
م۔ اہا ہا۔ تم چپ رہو ہم اس جنٹلمین سے پوچھتے ہیں کہ یہ کون پاگل ہے؛ پس انہیں باتوں باتوں میں ہم اس کا بھی پوچھ لیں گے۔ ہے نہ!
ص۔ اچھا۔ مگر ہندوستانی بدتمیز ہوتے ہیں۔ تم گفتگو نہ کرو اس سے۔
م۔ اب تو اتنے دن ہم بھی ہندوستان میں رہ آئے ہیں؛ ہم سے یہ باتیں نہ کرو۔ اچھا تمہیں پوچھو۔
ص۔ (رانگلی کے اشارے سے میاں آزاد کو بلایا)

---

[1] افیمچی پانی سے بہت ڈرتے ہیں۔

میاں آزاد ایسی بھلا کب سننے والے تھے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ اپیلٹن پلٹنی آدمی چہرہ مارے غصے کے لال ہوا۔ غیظ وغضب سے عجب حال ہوا۔ خیال ہوا کہ دینشیا قہقہے لگائے گی تالیاں بجائے گی کہ ایک نگر رکا لا آدمی تک مخاطب نہ ہوا۔ بات کا جواب تک نہ دیا۔ دینشیا نے جو یہ کیفیت دیکھی تو اٹھلاتی اور مسکراتی ہوئی میاں آزاد کی طرف گئی میاں آزاد لیڈیوں سے بولنے چالنے اور جنٹلمینوں میں رہنے کے عادی تو تھے ہی، انھوں نے ایک معزز اور خوبرو اور کمسن لیڈی کو جو مخاطب پایا تو بصد ادب ٹوپی اتاری اور تسلیم بجا لائے۔ مسکرائے اور پوچھا کہ آپ کہاں تشریف لے جائیں گی؟

م۔ انگلستان۔

آزاد۔ ہاں ہندوستان میں کس قدر عرصہ تک رہنے کا اتفاق ہوا؟

م۔ بہت کم۔ یہی کوئی برس سوا برس۔ یہ پستہ قد آدمی کون ہے؟

آزاد۔ جی ایک مسخرہ ہے۔

م۔ خوب باتیں کرتا ہے ہنستے ہنستے اس وقت پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

آزاد۔ جی ہاں بڑا مسخرہ ہے۔

م۔ (اپنے شوہر کی طرف مخاطب ہو کر) چارلی یہ جنٹلمین کہتے ہیں کہ وہ بونا مسخرہ ہے (آزاد سے) یہ لفٹنٹ اپیلٹن ہیں، میرے شوہر آئیے آپ سے ان کی ملاقات کرادوں۔

آزاد۔ (ہاتھ بڑھا کر) گڈ مارننگ سر۔

ص۔ (مصافحہ کرکے) گڈ مارننگ۔ آپ کہاں جائیں گے؟

آزاد۔ ٹرکی۔

م۔ ہاں! کیوں؟ کوئی خاص کام ہے یا صرف بہ طریق سیر وسیاحت؟ وہاں تو آج کل جنگ چھڑی ہے۔

آزاد۔ جی ہاں میں بھی اسی لیے جاتا ہوں۔

ص۔ اگر آپ مجھے معاف کریں تو ایک بات دریافت کروں۔ اس وقت آپ آہ سرد کیوں بھرتے تھے۔ آپ کی ٹھنڈی سانسوں کی طرف میری بیوی نے مجھے متوجہ کیا۔ اس کا کوئی سبب خاص ضرور ہے۔

آزاد۔ کیا عرض کروں کسی ایسے نے مجھے ٹرکی جانے کا حکم دیا ہے کہ اس کی تصویر ہر وقت نظر کے سامنے رہتی ہے۔

م۔ ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے۔ آپ کی شادی ہوئی ہے؟

آزاد۔ جی نہیں میں ناکتخدا ہوں۔ مگر ٹرکی سے سرخرو واپس آنے پر میری شادی منحصر ہے۔

م۔ میں سمجھ گئی۔

ص۔ اخاہ میاں آزاد تو آپ کا نام نہیں ہے؟

آزاد۔ (متحیر ہو کر) ہاں ہے تو یہی نام۔ آپ کو کیونکر معلوم ہوا؟

ص۔ ایک اخبار میں ہم نے آپ کا ذکر خیر دیکھا تھا۔ آپ تو بڑے لائق فائق اور مشہور و معروف جنٹلمین ہیں۔ میاں آزاد ٹھیک ٹھیک حال بتاؤ کہ کس زن ماہرو کی دلفریبیوں نے ٹرکی جانے پر مجبور کردیا۔

آزاد۔ دل چوٹ کھا گیا اور کیا بتائیں۔
م۔ نام معشوق سمن بر کیا ہے؟
آزاد۔ حسن آرا بیگم۔
م۔ کیا پیارا نام ہے (بھولے پن کے ساتھ) جی چاہتا ہے، اس کا نام چوم لوں۔
ص۔ (مسکرا کر) ایں واہ! بہت بھلا معلوم ہوا۔
م۔ مس حسن آرا بیگم پڑھی لکھی تو ضرور رہتی ہونگی۔
آزاد۔ نہایت تربیت یافتہ لیڈی ہیں۔ ذی الطبع۔ حلیم المزاج۔ خوش فکر۔ ہنس مکھ۔
م۔ حسین تو ضرور رہی ہونگی۔
ص۔ حسین تو ایسی ہیں کہ ہندوستان سے ٹرکی بھیجا۔ یہی ثبوت حسن گلوسوز کافی ہے۔ قیامت کی پری چہرہ ہونگی۔

اہیلٹن کسی ضرورت سے ذرا نا خدا کے پاس گئے تو مس دینشیا نے بڑی بے تکلفی سے پوچھا کہ حسن آرا بیگم کی صورت قطع وضع چال ڈھال خو بو کیسی ہے؟ میاں آزاد رسیا آدمی تو تھے ہی، ان کو دل لگی جو سوجھی تو انھوں نے دبے دانتوں کہا کہ بس بعینہٖ آپ ہی کا سا مکھڑا ہے۔ ایسی ہی گوری گوری گردن۔ ایسی ہی سیم تن۔ ایسی ہی عنبریں مو۔ ایسی ہی قوس ابرو۔ ایسا ہی بوٹا سا قد۔

م۔ (شرما کر) تو مس حسن آرا میری چھوٹی بہن معلوم ہوتی ہیں۔ کیوں صاحب، ہمارے گورے پن کی در پردہ خوب تعریف کی۔
آزاد۔ (ہاتھ جوڑ کر) معاف کیجیئے گا۔ آپ کو اپنے معشوق پری چہرہ کا ہمشکل پایا تو اس قدر مکالمے کی جرأت ہوئی، ورنہ ہم تھے اور آہ سرد۔ ہم تھے اور دل پُر درد۔
م۔ مس حسن آرا میں سنگدل) ذرا کیوں)؟
راوی بُت تو سنگدل ہوا ہی کرتے ہیں۔
ص۔ مس حسن آرا کی باتیں ہو رہی ہیں؟ کیا سن ہے ان کا؟
آزاد۔ یہی کوئی چودہ پندرہ سال۔

اتنے میں جہاز پر ایک دل لگی باز کو سوجھی کہ آؤ خوجی کو بنائیں اور خوب قہقہے لگائیں۔ دو چار اور زندہ دل ان کے شریک حال ہو گئے جب دیکھا کہ میاں خوجی پینک میں سو گئے تو ایک شخص نے دو تمتیا مرچیں ان کی ناک میں ڈال دیں اور ذقن بھر کے بیس قدم پرے ہو رہا۔ خوجی نے جو آنکھ کھولی، آچھیں آچھیں آچھیں آچھیں۔ باولے کتے کی طرح ادھر ادھر پھرنے لگے۔ مس وینشیا اور لفٹننٹ اہیلٹن اور میاں آزاد اور جہاز کے مسافر ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے۔ حضرت خواجہ بدیع صاحب بہت ہی جھلائے اور خوب ہی گرمائے۔ اب آپ ہی آپ بے نقط سنا رہے ہیں۔

آزاد۔ بھائی خواجہ بدیع صاحب۔
خوجی۔ بس الگ رہیے گا (آچھیں)
آزاد۔ آخر یہ ہوا کیا کچھ بتاؤ تو؟
خوجی۔ چلیئے آپ کو کیا وہ چاہیے جو کچھ ہو۔ (آچھیں)،

آزاد- یار یہ اسی بہروپئے کا سارا فساد ہے۔ آپ نے اچھے گھر بھیانہ دیا۔

خوجی- دیکھئے تو کتنی رہا چین، قرولیاں بھونکی ہوں مردود کو کرتا چین، یاد ہی تو کرے رکھیں)

آزاد- مگر تم گرگر پڑتے ہو۔ میاں ایک دفعہ جی کڑا کر کے گرفتار ہی کرلو۔

خوجی- ہونھ! کیا ہنسی ٹھٹھا ہے گرفتار کرلینا (آجھیں)

م- اسوقت اس نے کیا کیا؟

خوجی- ناک میں مرچیں ڈال دیں گیدی نے۔

اس پر اور بھی قہقہہ پڑا اور قہقہے کی آواز نے میاں خوجی کو اور بھی چوندھیا دیا پاتے تو سب کو کچا ہی کھا جاتے اور بہروپئے کی تو ہڈی تک نہ باقی رہتی۔ مگر خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔

آزاد- اب کی آپ ناک میں بیٹھے رہیئے۔ بس آتے ہی گرفتار کر لیجئے۔ مگر ہے بڑا شریر۔ سچ مچ ناک میں دم کردیا۔

خوجی- اُف اوہ! کچھ ٹھکانا ہے۔ یہ ناک میں مرچیں جھونکنا کیا معنی۔ یہ ناک کان کی دل لگی کیسی؟

آزاد- اور کیا صاحب، یہ بڑی بیجا بات ہے۔

خوجی- بیجا اور بجا کے بھروسے نہ رہیئے گا۔ میں ایک آدھ دن ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر کے دھر دوں گا۔ کہاں کے بڑے کڑے خاں ہیں۔ آپ کوئی نرما سمجھے ہو مجھے۔ میں نے بھی کمیدانی کی ہے۔

م- (میاں آزاد سے) کیا کہتا ہے؟

آزاد- (ترجمہ کر کے) کہتا ہے کہ میں فوج میں کپتان رہ چکا ہوں۔

م- ول۔ کپتان صاحب۔

خوجی- واہ وا واہ۔

آزاد- اور کیوں بندہ پرور یہ خاکسار نے کیا کیا تھا جو حضور نے لے ڈالا۔ اس وقت کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے کردوں گا اور چنیں و چناں۔

خوجی (آنکھیں کھول کر) ارے یہ آپ تھے؟

آزاد- اور نہیں تو کیا آپ کے باپ تھے۔

خوجی- بھائی معاف کرنا۔

آزاد- یار کوئی تدبیر ایسی کرو کہ بہروپیا پکڑ لیا جائے۔

خوجی- تم بولو نہیں۔ بس دیکھتے جاؤ صبح شام میں گرفتار ہی کیا چاہتا ہوں گیدی کو۔

آزاد- لیکن اب ذرا ہوشیار سوئیے گا۔ بہروپیا گیا جہنم میں ایسا نہ ہو کوئی حریف روپے دو پلے غائب کردے۔ بیوقوف کہیں کا۔ ابے گدھے یہاں بہروپیا کہاں۔

خوجی- بس خردی بزرگی ہو چکی۔ نہیں جو کہے گا سنے گا بھی۔ بس رخصت دلوریا بدھنا اٹھا کر بندہ چلتا ہے۔ یارانہ ہو چکا اور سنیئے ہم گدھے ہیں۔ کیا جانے کتنے گدھے ہم نے بنا دیئے۔

آزاد- چلیئے گدھے نہیں گدھے گر سہی۔ لیکن جائیے گا کہاں یہ بھی خشکی ہے کچھ۔ معقول!

خوجی۔ او جہاز کے کپتان۔ او ناخدا۔ جہاز روک لے۔

آزاد۔ ایں! جہاز روک لے!! کیا خوب!!!

م۔ (زور سے قہقہہ لگا کر) کیا جہاز کو روکنے کا حکم دیتا ہے؟

ص۔ (ہنس کر) ہاں بہت بگڑے ہیں۔

خوجی۔ اے جہاز روک لے۔ او نا خدا۔

ص۔ وہ یوں نہ سنے گا دو چار ہاتھ ترولی کے لگائیے تو پھر سنے گا۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ خدمتگار نے آکر صاحب سے کہا حضور (حاضری) چنی گئی۔

م۔ میاں آزاد سے بھی کہو کہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔

ص۔ مسٹر آزاد! میری بیوی کی خواہش ہے کہ اس وقت ہم اور آپ ساتھ کھانا کھائیں، ہم اپنی کیبن میں کھاتے ہیں۔

آزاد۔ کیا مضائقہ!

م۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ مِٹھا اُٹھا کیجیے دو گھڑی غم ہی غلط ہو گا۔

آزاد۔ میں کمال مشکور ہوا۔

م۔ مسٹر آزاد! ہم دونوں کو تمھارے ساتھ ایک قسم کی ہمدردی ہے۔

آزاد۔ میں تہ دل سے ممنون ہوں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں مگر اس قدر مشکور ہوں کہ زبان سے ادا نہیں ہوتا۔

ص۔ جو اس وقت تمھاری کیفیت، وہی میری کیفیت ہے۔

حاضری نوش جان کر کے ڈینشیا اور اپیلیش اور میاں آزاد بے تکلفی کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے اِدھر اُدھر یہ دونوں بیچ میں اس صنم رعنا کو لیے ٹہلنے لگے۔ آزاد کو ڈینشیا کی ایک چھب بھاتی تھی اور وہ زن جمیلہ کبھی بقصد شوخی اٹھلاتی تھی۔ کبھی ناز و انداز کے ساتھ مسکراتی تھی۔ واہ رے آزاد واللہ خوش قسمت ہو تو ایسا ہو۔ بلاتشبیہ اپنے وقت کے کنہیا تھے۔

اتنے میں میاں خوجی کو بت رنگین ادا ڈینشیا نے ایک ادائے دلربا کے ساتھ انگلی کے اشارے سے بلایا۔ خواجہ بدیع نے جو دیکھا کہ ایک غنچہ دہن گلبدن کی ان کے حال پر کمال عنایت ہے تو ریشہ خطمی ہو گئے اور بہت اکڑتے اور اینڈتے ہوئے چلے۔ کندے تولتے ہوئے آپ میم صاحب کے پاس پہنچے۔

آزاد۔ ٹوپی اتار کر سلام کرو، ٹوپی اتارو خوجی۔

خوجی کا لفظ کہنا تھا کہ خواجہ بدیع صاحب کے غصّے کے تھرمامیٹر کا پارہ ایک سو بیس درجے پر پہنچا۔ بس پلٹ پڑے۔ اور پلٹتے ہی اُلٹے پاؤں بھاگنے لگے۔

آزاد۔ او گیدی (مسکرا کر) او گیدی۔ جو پلٹ گیا نہ تو اتنی قرولیاں بھونکی ہوں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔

م۔ (ہنس کر) کیا ہم سے خفا ہو گئے۔ حضور۔ اے یہ آکے پھر پلٹنا کیا معنے۔ اِدھر آئیے صاحب۔

آزاد۔ (خوجی کو روک کر) کیوں بھئی کیا شیطان نے پھر انگلی دکھا دی میاں خوجی؟

خوجی۔ خوجی مردک پر خدا کی مار۔ خوجی گیدی پر شیطان کی پھٹکار۔ ایک دفعہ خوجی کہا میں خون پی کے رہ گیا۔ اب پھر دوہرایا۔

خدا جانے کب کا دیا اس گاڑھے وقت آڑے آتا ہے ورنہ واللہ مارے قردلیوں کے بھٹا سا سر اُڑا دیتیا۔ لاکھ گیا گذرا ہوں تو کیا ہوا۔ عمر بھر رسالداری اور کمیدانی ہی کیا کیئے ہیں۔ گھاس نہیں کھودی ہے جی ہاں۔

م ۔ اخاہ یہ خوجی کے لفظ پر بگڑے، ہم سمجھے ہم سے روٹھ گئے۔

خوجی۔ (ریشہ خطمی ہو کر) نہیں میم صاحب ایسی بات آپ فرماتی ہیں۔

آزاد۔ ذرا اِن سے اِن کی زوجۂ مکرمہ کا حال پوچھیئے!

م ۔ کیا آپ کی بیوی کے بھی آپ کے سے لمبے چوڑے ہاتھ پاؤں ہیں؟

آزاد۔ ان کی بیوی کا نام بوا زعفران ہے۔ دیونی ہے دیونی۔

خوجی نے جو بوا زعفران کا نام سُنا تو چہرہ زرد۔ دل سرد۔ رنگ فق کلیجہ شق ہو گیا اور یاد جو آیا کہ خوب بے بھاؤ کی پڑی تھیں تو سہم گئے۔ ایک دفعہ ہی آنکھیں بند کر لیں۔ وئیشیا سمجھی نہیں کہ کیا اسرار ہے، مگر میاں آزاد تو واقف کار تھے، سمجھا یا تو خوب کھلکھلائیں۔

چوری

حسن آرا کے گھر میں چور داخل ہوا۔ شور و غل مچا۔ شہزادہ ہمایوں فر مع اپنے ایک دوست میر صاحب کے خیر خبر لینے پہنچے۔ نواب صاحب (بہار النسا کے شوہر) سے مردانے میں بات چیت شروع ہوئی۔

میر ۔ حضرت یہ چور آخر آیا کدھر سے اور پکڑا کیونکر گیا؟

نواب ۔ میں پھر پھرا کر کوئی دس بجے کے وقت شہر سے آیا تو پھاٹک کے پاس سرنگ گھوڑے نے ٹھوکر لی۔ کوئی بیس منٹ تک مشعل روشن کرا کے میں نے گھوڑے کو دیکھا اور ایک آدھ گھنٹے تک باغ میں ٹہلا کیا۔ گیارہ بجے اندر گیا۔ دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا۔ لوٹتے پوٹتے بارہ بج گئے۔ مگر ایک بجے پھر آنکھ کھل گئی، ٹہلا کیا۔ دو کے عمل میں خوب میٹھی نیند آئی۔ بس ایک دفعہ ہی حضرت سلامت غل کی آواز سنی تو چونک اٹھا۔ معلوم ہوا کہ چور آیا ہے۔ تلوار لے کر دوڑ پڑا۔ اب سنیئے چور جو گھبرایا تو زینے پر چڑھنے لگا۔ میں تو اوپر سے آ رہا ہوں اور وہ نیچے سے زینوں پر چڑھتا ہے۔ بیچوں بیچ میں مڈبھیڑ ہوئی اس نے چھری نکالی مگر میں نے ایک ہاتھ چھوڑا۔ ولایتی چھلچھلتی ہوئی پڑی۔ ذرا ہاتھ اوچھا نہ پڑے تو بھنڈارا کھل جائے مگر بچ نکلا۔ پھر تبلہ تلوار کی چمک کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے۔ بھلا ایسا سما کہ ہوش پیترا جو اس فقرہ ہو گئے بھاگتے۔ راہ نہ ملی۔ پاؤں کہیں رکھتا ہے۔ قدم کہیں پڑتا ہے۔ زینہ اترتے اترتے دوبارہ ٹھوکر کھائی۔ اب چھت پر پہنچے۔ وہاں مستورات کھڑی غل مچا رہی تھیں جھپٹ کے چاہا کہ نیچے کود پڑے مگر جب تک میں پہنچوں پہنچوں میری چھوٹی سالی نے اس پھرتی سے رسی کا پھندا بنا کر پھینکا کہ الجھ کر اراراکے گرا۔ اٹھ کے بھاگنے ہی کو تھا کہ بندۂ درگاہ گلے پر تڑاق سے موجود۔ جاتے ہی چپاپ پیٹھ عورتوں نے دینا شروع کی۔ اب ہزاروں قسمیں دے رہی ہیں کہ نہ چھوڑے تو ہمارا ہی مردہ دیکھے۔ نہ چھوڑے تو ہمیں کو روئے۔ ہمیں کو پیٹے کرے۔ مگر کچھ مٹی تو تھا ہی نہیں کہ چھوڑ دیتا۔ چو طرفہ سے خوب گھالے رہا۔ اتنے میں خدمتگار سپاہی نوکر چاکر سب آن موجود ہوئے۔ مشکیں کسی گئیں۔ حضرت کی اور کشاں کشاں لوگ ان کو یہاں لائے تب سے بے بھاؤ کی پڑ رہی ہیں۔ ان پر مجھ کو دھمکاتا ہے مردک کہ جب چھوٹوں گا تو حلال ہی کر ڈالوں گا۔ مگر یہاں ان بھروں میں کب آتے ہیں۔

شہزادہ ۔ ابھی بکنے دیجیے نامعقول کو۔ ذرا کسی آدمی کو حکم دیجیئے کہ دیکھیے بید کے نشان تو نہیں ہیں۔ ابھی تو سارا آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔

نواب ۔ بہت خوب۔ حسین علی دیکھ تو لو۔

حسین علی ۔ اے صاحب مار کے بید ہی بید کے نشان ہیں۔

شہزادہ ۔ ہاں تو سزا یافتہ ہیں حضور یہ کہیئے۔

نواب ۔ (شہزادے سے) یہ آپ نے کہاں اس وقت تکلیف فرمائی؟

شہزادہ ۔ میں نے کہا چل کر دیکھوں تو کیا واردات خدانخواستہ ہوئی بارے شکر ہے کہ بخیر گذشت۔ آپ اس قدر قریب ہیں مگر خدا آپ کو توفیق ہی نہیں دیتا کہ کبھی غریب خانہ پر تشریف لایئے سچ ہے ع

شاہاں کم التفات بحال گدا کنند

نواب ۔ پیر و مرشد کیا عرض کروں ۔ بوجوہ چند در چند حاضر نہ ہو سکا۔ معاف فرمایئے گا ۔ ذرا دم کے دم تشریف رکھیے ۔ حقّہ نوش جان فرمایئے۔

شہزادہ ۔ بہت اچھا حضرت ہم تو بے تکلف آدمی ہیں ۔

نواب ۔ چلیئے کوٹھی میں بیٹھیں یہاں اوس معنر ہے ۔

شہزادہ ۔ اے حضرت اس وقت حبس ہیں تو کچھ بیٹھنا نہیں اچھا معلوم ہوتا ہے ۔

نواب ۔ کیا مضائقہ ۔ کرسیاں لاؤ جی ۔ مونڈھے نکالو ۔

نواب صاحب اور شہزادہ ہمایوں فر اور میر صاحب کرسیوں پر دروازے کے قریب متمکن ہوئے تو یوں باہم چہ میگوئیاں ہونے لگیں

شہزادہ ۔ حضرت آپ کی سالی تو واللہ بڑی شیر دل نکلیں ۔

نواب ۔ جی ہاں ۔

مکان کے اندر اُن مہوشان زہرہ تمثال اور گلرخانِ جادو جمال کے فرشتہ خاں کو بھی خبر نہیں کہ باہر میرزا ہمایوں فر تشریف رکھتے تھے ۔ آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں ؎

مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شست ہے

سپہر آرا ۔ ہے ہے باجی ہیں نے جب اس کالے کالے مسٹنڈے کو دیکھا تو سن سے جان نکل گئی ۔

روح افزا ۔ موا تمبا کو کا پنڈا اتھا موٹے موٹے ہاتھ پاؤں ۔

سپہر ۔ جنازہ نکلے مونڈی کاٹے کا ۔ علمبر دار کا علم ٹوٹ پڑے ۔

حسن آرا ۔ وہ تو خیر گذری کہ عندرق ہاتھ سے گر پڑا نہیں تو سب موش لے جاتا ۔

سپہر ۔ بہار النسا بہن کی چڑچڑی ساس لاکھوں ہی سناتیں کہ میری بہو کا گہنا سب بیچ کھایا ۔

بہار النسا ۔ چور چور کی بھنک کان میں پڑی تو میں کلبلا کر چونک اٹھی ۔ بھاگی تو جُوڑا بھی کھل گیا ۔ اللہ جانتا ہے بڑی محنت سے باندھا تھا ۔ چلو خیر ۔

روح افزا ۔ قہقہہ لگا کر ۔ بس ہماری باجی کو دن رات چوٹی کنگھی بناؤ چناؤ ہی کی فکر رہتی ہے ۔

حسن آرا ۔ بی خاتونِ جنت کی قسم جتنا ان کو اس بات کا خیال ہے اور جس قدر یہ بنی ٹھنی رہتی ہیں ۔ اسی قدر شوق ہمارے خاندان بھر میں تو کسی کو نہیں ہے جبھی تو دولھا بھائی ان پر ریجھے ہوئے ہیں ۔ کیوں بہن ۔

بہار ۔ چلو بیٹھی رہو ۔ چھوٹا منہ بڑی بات

سپہر ۔ بگڑ گئیں ۔ بگڑ گئیں جیسے کوئی ان کی دھمکی میں آجائے گا ۔

روح ۔ باجی ذرا تمھیں اپنے دل میں سوچو کہ کہاں تو چور کی بات چیت ہو رہی تھی اور کہاں تم نے اپنے جوڑے کا ذکر چھیڑ دیا اور کہے سے چڑتی ہو ۔

حسن آرا ۔ اماں جان روز کہا کرتی ہیں کہ خورشید دولھا کو بہار النسا کے ساتھ عشق ہے ۔

ؔ لوٹ لے جانا ۔

بہار۔ ہونھ۔ عشق ہے۔ کالے سر کی ایک تو اُن سے بچنے نہیں پاتی ہے۔ عشق ہے آئیں وہاں سے بڑی وہ بن کے عشق نہیں ہے: وہ ہے۔

سپہر۔ کیا دولھا بھائی سے کچھ اچھی ہیں آپ؟

بہار۔ جائیے بُرے ہی سہی۔ پھر آپ کو کیا؟ اے ہاں ٹر ٹر لگائی ہے ناحق بن ناحق کون اچھا ہے۔ کون بُرا ہے۔ پھر۔

اب لطیفہ سُنیئے کہ میرزا ہمایوں فر باہر بیٹھے چپکے چپکے ساری گفتگو سُن رہے تھے۔ بعض بعض پیاری پیاری بھولی بھولی باتوں پر ہنسی بڑی دقتوں سے منضبط کر سکے۔ نواب بیچارے کٹ کٹ گئے مگر چپ مجبوراً اندر جا کر سمجھائیں تو بھی خلاف ادب ہے چپکے بیٹھے رہیں تو بھی رہا نہیں جاتا۔ جان عذاب میں تھی۔ مگر اب تخفیف تصدیع۔ یار زندہ وصحبت باقی۔

ادھر شاہزادۂ والا نژاد فرخ نہاد بادل شاد اپنے دولت خانۂ عظمت کاشانہ کی طرف بصد زیب وتجمل میر صاحب سے باتیں کرتے اور فرط طرب سے مستانہ وار قدم دھرتے روانہ ہوئے ادھر نواب صاحب نے محلسرا میں تشریف ارزانی فرمائی اور یوں باتیں کرنے لگے۔

نواب۔ تم لوگوں کی بھی عجب عادت ہے۔ جب دیکھو گی کہ کوئی غیر آدمی آن کر بیٹھا ہے بس تب ہی خواہ مخواہ غل مچاؤ گی۔ اس وقت ایک بھلے مانس بیٹھے تھے اور یہاں چہل ہو رہی تھی۔ ایک بولی دولھا بھائی ان پر ریجھے ہیں۔ دوسری بولیں تم کو سوائے بناؤ چناؤ اور سنگار پٹار کے اور بھی کچھ آتا ہے، گھر بھر کا کچا چٹھا کہہ سنایا اور میں دل ہی دل میں کٹ کٹ کے رہ گیا۔

بہار۔ وہ بھلے مانس نگوڑا کون سڑی سودائی تھا جو اتنے وقت پنچایت کرنے آ بیٹھا۔

روح۔ اے تو اب کوئی ان کے مارے اپنے گھر میں بات نہ کرے۔ گھونٹ کر مار نہ ڈالیئے۔ واہ یا تو دولھا بھائی اتنی انگریزیت برتتے ہیں کہ ڈاکٹر کو منہ دکھاؤ یا اتنا پردہ کہ کوئی اپنی چار دیواری میں بھی نہ بولے۔

حسن آرا۔ ہم بھی تو سنیں دولھا بھائی وہ بھلے مانس کون تھے؟

نواب۔ اجی یہی جو سامنے رہتے ہیں شہزادے۔

بہار۔ ہمایوں فر!

نواب۔ ہاں ہاں۔

حسن آرا۔ ارے تو آپ نے ہم سے آ کر کہہ کیوں نہ دیا؟

روح۔ اے ہاں پھر ہم کاہے کو بولتے۔

بہار۔ اپنی خطا نہ کہیں گے۔ دوسروں کو مفت مفت للکاریں گے۔

نواب۔ اس وقت وہاں سے آنے کا موقع نہ تھا۔ حسن آرا تمھاری بڑی تعریف کرتے تھے۔

حسن آرا۔ (رنگ فق)

سپہر۔ (کلیجا دھک دھک کرنے لگا)

روح افزا نے حسن آرا کے چپکے سے چٹکی لی۔ حسن آرا کا خون خشک ہو گیا کہ بار خدایا کہیں کسی موذی نے اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر تو نہیں کچھ پٹی پڑھا دی ہے۔ بہار النسا تو رازدان تھی ہی، بات ٹال دی۔

بہار۔ اب وہ چور کہاں بھیجا گیا؟
نواب۔ مجھ سے ہمایوں فر نے پوچھا کہ چور کو کس نے گرفتار کیا۔ میں نے کہا میری چھوٹی سالی نے۔ بہت ہی ہنسے اور کہنے لگے کہ بڑی عقلمند معلوم ہوتی ہیں۔
بہار۔ ارے! ابھی تعریف کرتے تھے حسن آرا کی۔
نواب۔ ہاں بہت خوش ہوئے۔

یہ بات جو سُنی تو حسن آرا کی جان میں جان آئی۔ نواب باہر گئے کہ باغ میں مسہری پر مزے سے آرام کریں تو ان بہنوں کو باہم مکالمہ کرنے کا اچھا موقع ملا۔ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں۔

حسن آرا۔ اف! اللہ جانتا ہے میں تو دھک سے رہ گئی۔ ہے ہے تھرتھر کانپتی تھی کہ یا اللہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ ان کا عورت کے بھیس میں یہاں آنا اور بیٹھنا اور گلوریاں کھانا اور بیدھڑک ہم کو بے حجاب دیکھ جانا اور خط جو آنا۔ سارا کچا چٹھا کسی گھر کے بھیدی نے دولھا بھائی سے کہہ دیا۔
روح۔ میں بھی یہی سمجھی بہن۔ جبھی تو میں نے چٹکی لی کہ ہے ہے غضب ہی ہوگیا۔
بہار۔ میری بُری گت تھی اس وقت اُسی سے میں نے بات کاٹ دی کہ کسی وقت اکیلے میں باتوں باتوں میں ٹوہ لوں گی کہ آخرش یہ ماجرا کیا ہے کچھ سُنیں تو سہی۔
سپہر۔ سچ کہوں میں تو بھاگ جانے کو تھی۔ جی چاہتا تھا جا کے کنوئیں میں کود پڑوں۔
حسن آرا۔ ہاں صورت دکھانے کے لائق تو نہ رہتی پھر۔
سپہر۔ اور اس موئے کی بدذاتی اور ڈھٹائی تو دیکھو کہ چور کا نام سنتے ہی آڈٹا۔ بھلا کیا وجہ تھی اس کی؟ ایسا کہاں کا بڑا رستم تھا؟ خاصہ بدذات ہے چھٹا ہوا۔
حسن آرا۔ تین بجے ساڑھے تین بجے کے وقت آپ جو آئے تو کیوں آئے۔
روح۔ میں بتاؤں۔ اس کو یہ خبر نہ ہوگی کہ دولھا بھائی گھر پر ہیں نہیں تو نہ آتا۔ اور جو یہ نہ ہوتے تو چوری کے پھیر میں وہ تو گھر میں گھس پڑتا۔
بہار۔ نہیں واہ۔ شہزادہ ہے۔ کوئی ایسا ویسا ہے۔
سپہر۔ کام تو شہدوں کے ایسے ہیں۔

اب ایک اور لطیفہ سُنیئے۔ چور آیا غل غپاڑا ہوا۔ پکڑا گیا۔ زمانہ بھر میں ہلڑ مچا۔ محلہ بھر جاگ اُٹھا۔ چور تھانے پہنچا مگر بڑی بیگم صاحب ابھی تک خراٹے ہی لے رہی ہیں۔ جب بیدار ہوئیں تو بی مغلانی کو آواز دی۔

بڑی بیگم۔ مغلانی۔ اے مغلانی۔ کیا مر گئی!
مغلانی۔ جی کہیئے!
بیگم۔ کچھ غل سا مچا تھا ابھی۔
راوی۔ سبحان اللہ۔ بہت جلد چیتیں[1]۔

---

[1] چیتنا = ہوشیار ہونا۔

مغلانی۔ ہاں بیگم صاحب کچھ آواز تو آئی تھی۔
بیگم۔ ذری کسی سے پوچھو تو۔
مغلانی۔ اے بیوی پوچھنا اس میں کیا ہے، بھیڑ یا ویڑ یا آیا ہوگا۔
بیگم۔ میں نے آج ہاتھی کو خواب میں دیکھا ہے۔ اللہ بچائے۔
پیاری کی ماں۔ بیگم صاحب۔ رات چور آیا تھا۔
بیگم۔ اُف اللہ بچائے۔ مغلانی جا کے پوچھو تو۔ دیکھو خیریت ہے نہ۔ بس تم اتنا پوچھنا روح افزا سے کہ بڑی بیگم صاحب پوچھتی ہیں یہ غل کیسا مچا تھا؟

حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا تینوں کی تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ کوئی دس منٹ تک قہقہہ رہا۔ شاید ہمارے ناظرین پوچھیں کہ ہمارا انسا بیگم کہاں تھیں بس ناگفتہ بہ۔ نواب صاحب جانیں اور وہ جانیں۔

حسن آرا۔ اماں جان بہت جلد جاگیں۔ بی مغلانی کیا تم بھی گھوڑے بیچ کر سوئی تھیں۔ اللہ ری نیند۔
مغلانی۔ ذری آنکھ لگ گئی تھی۔ مگر کچھ غل کی آواز ضرور آئی تھی۔
حسن آرا۔ کچھ کچھ! محلہ بھر جاگ اُٹھا۔ تمھارے نزدیک کچھ ہی کچھ غل تھا۔ ٹھیک۔
روح۔ دونوں اچھی رہیں۔ چور آیا۔ غل مچایا۔ کوٹھوں کوٹھوں دوڑا۔ پکڑا گیا۔ تھانے بھیجا۔ اب جب سب کے سب سونے لگے تو تم آن کے پوچھتی ہو کہ کیا غل مچا تھا؟
سپہر۔ اے کاہے کے واسطے بہکاتی ہو۔ بی مغلانی تم جا کے سو رہو۔ غل تھا نہ ڈل تھا۔ کوئی سوتے سوتے بڑا اُٹھا ہوگا۔ تم جاؤ سو رہو۔
حسن آرا۔ جا کے بڑی بیگم صاحب سے کہہ دو کہ چور آیا تھا، مگر جاگ ہوگئی۔
مغلانی۔ اے خدا نہ کرے۔ بُری فال منہ سے نہ نکالو۔

تینوں بہنیں مغلانی کی سادگی پر بے اختیار ہنس پڑیں۔

حسن آرا۔ اُف ہنس ہنس پیٹ میں بل پڑ گئے۔
مغلانی۔ اے گیا چولھے میں لگوڑا چور۔ ادھر آنے کا رُخ کرے تو آنکھیں ہی پھوٹ جائیں موئے کی۔ کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔ اندر سے باہر تک اللہ کی عنایت سے پچاس آدمی۔ چور مونڈی کاٹا آئے گا ادھر سے۔
سپہر۔ دیکھو تو سہی بھلا۔ اور پھر بُری فال منہ سے نکالنا۔
مغلانی۔ ابھی بڑی بیگم سن لیں تو غل مچائیں۔
سپہر۔ اور نہیں تو کیا ان کو ایسی باتوں سے بڑی چڑ ہے۔ بی مغلانی کو نیند کے جھونک میں اٹھنا بڑا ناگوار گذرا تھا۔ بہانہ آئیں تو ان سب نے مل کر بنا ڈالا۔ جھنجھلائی ہوئی گئیں اور بڑی بیگم سے یوں کہنے لگیں۔
مغلانی۔ اے حضور نہ کچھ ہے نہ وچھ ہے۔ بیکار و بیکار کو جگایا۔
بیگم۔ آخر کچھ کہو گی بھی یا بڑبڑایا کرو گی۔
مغلانی۔ دلیٹ کر کہوں کیا بیوی۔

بیگم۔ آخر کہیں گئی تھیں۔ کچھ پیغام کہا۔ غل کیسا تھا۔ چور آئے تھے۔ بھیڑیا تھا۔ کیا تھا؟
مغلانی۔ نہ بھیڑیا تھا نہ چور تھا نہ کہیں غل تھا نہ شور تھا۔ کوئی سوتے سوتے بَرّا اُٹھا بس اور تھا کیا۔
بیگم۔ پیاری کی ماں!
پیاری کی ماں۔ آئی حضور کہیئے۔
بیگم۔ تم باہر جاکر آدمیوں سے ابھی پوچھو کہ یہ غل کیسا تھا؟
پیاری کی ماں۔ بیوی میں ابھی گھڑی ڈیڑھ گھڑی ہوئی کہ باہر سے آئی ہوں۔ کوٹھے پر کل مُنھا آیا تھا۔ کوٹھری کا قلف (قفل) توڑ کر جمع جتھا ٹوٹتا تھا مل (مگر) صندوق جب اُٹھایا تو بھڑ بھڑا کے گر پڑا ہاتھ سے بس جاگ ہو گئی۔ اتنے میں نواب صاحب کوٹھے پر سے ننگی تلوار لے کر دوڑ آئے۔
بیگم۔ ہاں ہاں پھر؟ کھانسی بھی نگوڑی اسی وقت آتی ہے۔
پیاری کی ماں۔ پھر چور کو پکڑ لیا بس نیچے لے کیا سئیس پکڑ کے۔ بیں آتو آ محلہ بھر جاگ اُٹھا۔ سب دوڑ آئے۔ بیوی میں کیا کہوں۔ کئی گھونسے پڑے۔ دے کّی۔ کچومر نکال ڈالا۔
مغلانی۔ اب چکّی پیسنی پڑے گی۔
بیگم۔ تو تو کہتی تھی کہ کوئی سوتے سوتے بَرّا اُٹھا تھا۔ جھوٹی زمانے بھر کی۔ ذرا صاف صاف نہ پوچھا گیا۔ چل حاہٹ۔
مغلانی۔ اے بیوی حسن آرا بیگم۔
بیگم۔ بس چلو اب بہت باتیں نہ بناؤ۔ شرمائے نہ شرمانے دے۔
روح۔ (حسن آرا سے) اب نہ سوؤ نہیں تو نماز قضا ہو جائے گی۔
سپہر۔ اے نہیں ابھی کوئی چار کا عمل ہوگا۔
حسن آرا۔ چار بج گئے۔ ہماری بھی آنکھیں جھکی پڑتی ہیں۔ ابھی دو گھنٹے رات ہے۔
بہار النسا بھی تشریف لائیں۔
بہار۔ اب دو گھنٹے رات کہاں ہے چار بج گئے۔ ساڑھے پانچ بجے تڑکا ہوتا ہے۔
حسن آرا۔ ہاں جب ہی ؎ مرغان سحر چیک رہے ہیں گلہائے چمن مہک رہے ہیں
بہار۔ چشم بد دور، ہماری بہن کیا جلد شعر کہہ لیتی ہیں۔ کسی روز اپنے دولھا بھائی کو شعر سناؤ۔
حسن آرا۔ واہ ہم کیا اور ہمارے شعر کیا۔ کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربا۔
بہار۔ اے تم سب نے مل کر قہقہہ لگایا تھا۔ نواب سمجھے کہ ان کی تم کسی بات پر ہنس رہی ہو۔ ہم سے کہا کہ تمھاری بہنیں ہم پر ہنس رہی ہیں۔ پھر ہم بھی چھیڑیں گے تو اپنی واؤن[1] بُرا نہ لگے۔
روح۔ اونھ۔ اونھ۔ چھیڑیں گے۔
سپہر۔ کیئے شوق سے چھیڑیں۔
حسن آرا۔ بڑی بہن کے پیارے دولھا ہیں نہیں تو ہم سب مل کر ان کو بنا لیتے ہیں۔

---

[1] باری۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

میاں آزاد فرخ نہاد نے جو ایک پری رُخ مہ پارہ تربیت یافتہ خاتون نیک سیرت کو اس درجہ ہمدرد پایا تھا، تو وحشتِ دل کسی قدر دور ہوئی جب کبھی حسن آرا کا چاند سا مکھڑا اور بھولی بھالی پیاری پیاری باتیں یاد آتی تھیں تو دو گھڑی غم غلط کرنے کے لیے ویفشیا کے پاس جا بیٹھتے تھے۔ اس وقت وہ ویفشیا کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ جہاز کے کپتان نے سب کو اطلاع دی کہ ایک گھنٹے میں بڑی سخت آندھی آنے والی ہے مستعد ہو رہو۔ یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی سب کے ہوش حواس غائب ہو گئے اور جہاز پر کھلبلی مچ گئی۔

ویفشیا۔ آندھی ہے کہاں۔ ہمیں تو آندھی واندھی کچھ بھی نظر نہیں آتی۔

آزاد۔ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کہا کیا۔ خاصہ صاف مطلع ہے۔ یہ انھوں نے بیٹھے بٹھائے اچھا شگوفہ چھوڑا۔ کہنے لگے آندھی آئی۔

صاحب۔ اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہوگی، بے وجہ کبھی کپتان آندھی کا نام زبان پر نہ لاتا، مگر بظاہر آندھی کے ذرا بھی آثار نہیں پائے جاتے۔

اتنے میں چو طرفہ سے یاس و بیم کی صدائیں آنے لگیں۔ ایک تو پیر فرتوت جو طفلی سے صدہا بار جہاز پر سوار ہوئے تھے کف افسوس مل مل کر کہنے لگے کہ یہ آندھی نہیں پیام اجل ہے۔ شاید دس کس طرح بچ نکلیں ورنہ اب ڈوبے اور اب ڈوبے۔ ایک معمر لیڈی نے کہا کہ اب جہاز کی خیریت نظر نہیں آتی۔ آندھی بہت ہی سخت آنے والی ہے۔ ایک نوجوان فرانسیسی نے جو قریب کھڑا ہوا تھا پوچھا کہ پھر آخر کیا تدبیر کی جائے، سفر کسی طرح ممکن ہے یا نہیں، لیڈی نے آہ سرد بھر کر کہا کہ بیٹا، اب زیست سے ہاتھ دھو رکھو اور دنیا سے کوچ کرنے کی تیاریاں کرو۔

یہ ہوش ربا فقرہ سن کر نوجوان نے بصد حسرت ایک نوخیز لڑکی کی طرف دیکھا اور دونوں کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

میاں آزاد کے قریب دو بھائی کھڑے باہم باتیں کرتے تھے۔ ایک نے کہا ہائے اب ہم اپنے بوڑھے باپ کو کیونکر دیکھیں گے اور جب وہ ہمارے ڈوبنے کی خبر سنیں گے۔ تو ان کا کیا حال ہوگا۔ چھوٹا بھائی آبدیدہ ہو کر بولا ہم ہی حاصل عمر ہیں اور دونوں کے دونوں یہاں اور دونوں ڈوبیں گے۔ ساری خدائی میں اور نہ کوئی رشتہ دار ہے نہ دوست ہے نہ یار ہے انھیں تسکین دینے والا بھی تو کوئی نہیں ہے۔

اتنے میں کپتان نے پھر سب کو اطلاع دی کہ خبردار۔ ہوشیار آندھی آن پہنچی۔ جہاز کا خدا حافظ ہے۔ امید زیست منقطع ہو گئی۔ سب دستِ بدعا ہو کر خدا اس مصیبت سے بچائے۔ یہ فقرہ سن کر ایک شخص بولا کہ دعا مانگنا محض فضول ہے۔ دعا سے کہیں آندھی کو کوئی روک سکتا ہے۔ اسپلین نے کہا ہاں ہے تو ایسا ہی مگر انسان کے دل کو ایک قسم کی تسکین تو ہوتی ہے کہ شاید خدا ہماری اس مصیبت کے وقت سُن لے۔

خوجی (چونک کر) ہائیں یہ غل کیسا ہے۔ بھئی کیا ٹرکی آن پہنچے۔ چلو سفر تو ختم ہوا۔ بھائی آزاد یہاں اُترتے ہی پوچھنا کہ افیم

کہاں بکتی ہے؟ یا راب تین ہی چار دن کی رہ گئی ہے۔
آزاد۔ افیم گئی جہنم میں کچھ سبنت کی بھی خبر ہے۔ انھیں افیم ہی کی پڑی ہے۔
خوجی۔ (آنکھیں کھول کر) کیوں کیوں۔ یہ کیا بات۔ آخر یہ سب کے سب چلاتے کیوں ہیں؟
آزاد۔ ناخدا نے کہا کہ بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔ جہاز اب کسی صورت بچ نہیں سکتا۔ لوگوں کے جی چھوٹ گئے۔ آپ کو افیم کی تلاش ہے۔
خوجی۔ بُری سناتی۔ کہتے تھے ٹرکی ورکی جانے کا قصد نہ کرو نہ مانا نہ مانا۔ لو اب بھگتو۔ خدا خیر کرے جہاز تباہ ہو تو چین میں پہنچے کر افیم تو ملے بہت سی اور حسن آرا بھی وہاں سے قریب ہونگی۔
آزاد۔ ہائے کمبخت پھر یاد دلائی۔ ہائے حسن آرا بیچاری۔ جب ہمارے ڈوبنے کا حال سُنے گی تو کُڑھ کُڑھ مرے گی۔ گھٹ گھٹ کے مرے گی۔
خوجی۔ صبر کرو بھائی آزاد صبر کرو۔ لیکن ہمیں تو آسمان افیمیوں کے دل کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ یہ آندھی کی خبر کس نے اُڑا دی؟

جہاز پر ایک عجب طرح کی کھلبلی مچی ہوئی ہے کہ اتنے میں ہوا کا زور ذرا کم ہوگیا اور رُخ بدل گیا۔ ناخدا نے اب ان سب کو یہ مژدہ سنایا کہ اگر خدا نے چاہا تو آندھی زیادہ نہ ستائے گی اور تھوڑی ہی دیر میں فرو ہو جائے گی۔ آدھ گھنٹے میں وہ طوفان فرو ہوا۔ ناخدا نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا اس طرح کی تیز ہوا آنے والی تھی کہ ہمیں شک کی جگہ یقین ہوگیا تھا کہ جہاز کسی طرح نہ بچے گا اور بہت جلد ڈوب جائے گا۔

دفعتہً ہوا از خود فرو ہوگئی اور وہ تیزی اور تندی سب جاتی رہی۔ معلوم ہوتا ہے کوئی اندیشہ ہی نہ تھا۔ یہ خدا کی شان ہے ورنہ اب تک خدا جانے جہاز کہاں کا کہاں پہنچا ہوتا۔ بارے الحمد للہ کہ بخیر گذشت۔ سب کی جان میں جان آئی۔ مگر خوجی بیچارے البتہ پریشان تھے کہ اچھے گھر بیعانہ دیا۔ ایک نہ ایک دن غرقاب ضرور ہونگے۔ ان کی رائے ہے کہ چاہے بھونک بھونک کے انسان مرے مگر پانی میں ڈوب کر نہ مرے۔

تباہی! تباہی!! تباہی!!!

ایک روز جہاز کے ناخدا نے سب کو پھر اطلاع دی کہ ایک گھنٹے میں بڑی سخت آندھی آنے والی ہے، مستعد ہو رہو۔ یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی سب کے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ جہاز کے ناخدا نے آلہ بیرومیٹر کے ذریعے سے جہاز والوں کو بصد حزن و ملال آگاہ کر دیا کہ بہت جلد طوفانِ عظیم آنے والا ہے۔ اس ناگہانی کے دفعیہ کا انسان ضعیف البنیان میں یارا نہیں۔ مشیت ایزدی میں چارا نہیں۔

میاں آزاد کا جہاز جس کا پیارا نام جنی ڈینس (GENNIE DEANS) تھا۔ معشوقانِ طنّاز کی طرح اٹھکھیلیاں کرتا جاتا تھا۔ ناخدا نے پھر اطلاع دی کہ طوفان آتا ہے۔ بیرومیٹر سے طوفانِ عظیم کی آمد آمد صاف ظاہر ہے۔ لوگو خبردار ہوشیار۔ طرفۃ العین میں مصیبت سے دوچار ہونا ہے۔ زندگی سے ہاتھ دھونا ہے۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جان کے لالے پڑے۔ حیرت تھی کہ یا الٰہی جائیں تو کہاں جائیں اس بحرِ ناپیدا کنار اور طوفان حسرت بار سے نجات کیوں کر پائیں۔ دل بیقرار و بیتاب تھا، زہرہ آب آب تھا۔ دیکھا کہ کپتان کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس کے لفٹنٹ بھی سب سٹی پٹی بھول گئے۔ ہیچوے یعنی سیڑھیوں سے تختے پر آتے تھے اور گھبرا کر پھر اوپر چڑھ جاتے تھے اس سبب سے آتش غم اور بھی تیز ہوئی۔

اتنے میں ہوا نے وہ زور باندھا کہ الاماں، الاماں۔ ناخدا نے صرف ایک مین سیل (MAIN SAIL) تو بدستور رہنے دیا، باقی اور سب اتار لیے۔ اب جہاز راہِ خدا پر چھوڑ دیا گیا۔ موجوں کی یہ کیفیت کہ آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔ جہاز تھپیڑے کھا کر گنبد کی طرح اُدھر سے اِدھر آتا تھا اور اِدھر سے اُدھر جاتا تھا۔ سمندر اس درجہ جوش و خروش پر تھا کہ الحذر الحذر۔ جہاز والے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے جان و مال کو رو بیٹھے۔ سمندر کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر بدن کانپ اٹھتا تھا۔ مرد و زن یا علی مدد دے یا خدا بچائیو کا غل مچاتے تھے۔ بچے سہم کر اپنی ماؤں سے چمٹے جاتے تھے۔ کوئی عورت منہ ڈھانپ کے روتی تھی کہ ہائے عمر بھر کی کمائی اس سمندر میں گنوائی۔ کوئی اپنے پیارے معصوم بچے کو چھاتی سے لگا کر کہتی تھی کہ اماں کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے بیٹا ہم تم سے اور تم ہم سے رخصت ہوتے ہو۔ وہ نادان مسکراتا تھا اور اس بھولے پن سے اپنی مادرِ مہربان کے دل پر بجلیاں گراتا تھا۔

اب سنیئے کہ جہاز بھر میں تو کہرام مچا تھا مگر خوجی افیمی لمبی تانے سو رہے تھے اس نیند پر خدا کی مار۔ اس پینک پر شیطان کی پھٹکار۔ میاں آزاد نے جگایا کہ خواجہ صاحب اُٹھیئے طوفان آیا ہے۔ حضرت نے لیٹے ہی لیٹے بھنبھنا کر فرمایا کہ چُپ گیدی، ہم نے خواب میں بہروپیا پکڑ پایا ہے۔ تب تو میاں آزاد جھلائے اور کس کر ایک لات لگائی۔ خوجی کلبلا کر اُٹھ بیٹھے تو تلاطم کا عالم دیکھا۔ ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ سمندر کی بھیانک صورت دیکھی تو کانپ اُٹھے۔ دیکھا ہر زن و مرد مبتلائے بلا ہے ہر سمت آہ و بکا ہے۔ پانی بلیوں اُچھلتا ہے۔ مفر کی کوئی صورت نہیں۔

ناخدا خوب سمجھتا تھا کہ حالت ہر گھڑی نازک ہوتی جاتی ہے۔ طوفان ہے کہ اُمنڈا چلا آتا ہے۔ موج کے تھپیڑے اس قدر بلند ہوتے تھے کہ کلیجہ بانسوں اچھلتا تھا۔ لیکن آزمودہ کار تھا اس کی پھرتی اور استقلال سے لوگوں کو کچھ یونہی

سی تشفی ہوئی تھی کہ شاید جان بچ نکلے - اپنے اپنے مذہب اور عقیدے کے بموجب اہل جہاز جناب باری سے دعا مانگتے تھے۔

اب سنیئے کہ جس مقام پر جہاز غرق ہوتا تھا اُس کے سامنے ایک چھوٹا اور پُرفضا ٹاپو تھا۔ جزیرۂ پیرم - یہ جزیرہ ساحل یمن سے چار میل کے فاصلے پر ہے - طول ساڑھے چار میل عرض دو میل - سطح بحر سے ۲۳۰ فٹ بلند - اس کے گوشہ جنوب و مغرب میں ایک نہایت دلکش بندرگاہ ہے - دو چار آدمیوں نے اس جزیرہ کو بصد حسرت دیکھ کر کہا کہ ہائے خدا جانے یہ کون ٹاپو ہے؟ آزاد خوب واقف تھے کہ یہ جزیرہ پیرم ہے - انھوں نے کئی یورپین سیاحوں سے کہا تھا کہ اگر اس جزیرے میں کوئلے کا بندوبست ہو تو خوب بات ہے، مگر اکثروں نے جواب دیا کہ جزیرۂ مذکور میں پانی کی عنقائیت ہے - یہ جزیرہ جہاز والوں کو ترساتا تھا اور سب کے سب دست بدعا تھے کہ یا الٰہی کسی طرح اس ٹاپو تک جہاز مع الخیر پہنچ جائے تیری بندہ نوازی کے صدقے ہمیں جزیرہ تک پہنچا دے۔

اتنے میں ناخدا نے حکم دیا کہ ALL HANDS AHOY

اس جگرخراش فقرے سے جہاز میں کہرام مچ گیا - صدائے ماتم ہر گوشہ سے بلند ہوئی - جہاز کے مسافروں کی پریشانی اور مایوسی دہ چند ہوئی - پاؤں خواب آلود ہوئے - جسم شعلے کی طرح تھرانے لگا -

ناخدا نے پھر پکار کر کہا، ALL HANDS AHOY

یعنی جتنے آدمی جہاز میں ہیں سب مستعر شے پر آجائیں - اہل جہاز نے شورالامان بلند کیا تو یہی معلوم ہوا کہ ادھر حاملان عرش اور ثور فلک اور ادھر خفتگان تہ خاک اور گاؤ زمین کانپ اٹھے - ہر فرد بشر کے چہرے پر بیکسی برستی تھی۔

آزاد فرخ نہاد تو ایک جری اور دلیر آدمی تھے کوشش بلیغ کی کہ بنی نوع انسان کی جان بچائیں - کپتان اور اس کے نفٹننٹ اور اہل جہاز سب آزاد کے عاشق تھے - ایک قسم کی دلی محبت ہو گئی تھی - آزاد نے سعی مشکور کی کہ اہل جہاز ڈوبنے سے بچ جائیں - مگر یہ خیال محال تھا - کپتان نے اس وقت بڑی مایوسی سے کہا کہ کیا اس وقت یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں جو میرے اسسٹنٹوں کو مدد دے اور بندگانِ خدا کی جان بچائے - بس تو جی کر خدا کر کے جان بچانے میں کوشش موفور کر رہا ہوں السعیٔ منی والاتمام من اللہ تعالیٰ

پھر کپتان نے غل مچا کر کہا - LOWER THE LIFE BOATS

واضح ہو کہ ہر جہاز کے ساتھ چند لائف بوٹ رہتے ہیں - رسیوں اور زنجیروں سے جکڑے ہوئے - اب وہ وقت آگیا تھا کہ لائیف بوٹ سے مدد لی جائے - لائیف بوٹ جہاز کے غرقاب ہونے کے وقت کام آتے ہیں - ناخدا نے کہا کہ لائیف بوٹ جو اس جہاز کے ساتھ ہیں، ان کو نیچا کرو - آزاد نے اس میں بڑی مدد دی -

اب جہاز ڈوبنے ہی کو تھا - دس فٹ سے زیادہ پانی جہاز کے ہولڈ میں آگیا تھا - آزاد نے کپتان سے کہا کہ پانی کو پمپ کے ذریعہ سے نکالو ورنہ غضب ہی ہو جائے گا - کپتان نے کہا کہ پمپ کے ذریعہ سے پانی نکالنا بیکار ہے۔

آزاد - کیوں؟

کپتان - پہلے تو آندھی کا ذرا بھی گمان نہ تھا - دفعۃً طوفان جو آیا تو امواج بحر پہاڑ کی بلند چوٹی کے برابر اونچی ہونے لگیں - جو تختے پر تھی سب کو بہالے گئیں۔

آزاد نے کپتان کی بڑی تعریف کی اور لائیف بوٹ کو بچا لیا۔ اس وقت آزاد کی پھرتی اور ہمدردی اور سچی شجاعت کے اہلِ جہاز تہ دل سے مداح تھے اور وینشیا اس جری نوجوان کو حسرت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ آزاد نے بہت سے لڑکوں اور عورتوں کو لائیف بوٹ میں جگہ دی۔ اس کام میں جو اس کی سچی ہمدردی اور بسالت پر دال تھا اس کی جان خود معرضِ خطر میں تھی مگر آزاد کی جرأت اور شجاعت اعلیٰ درجہ کی تھی۔

آزاد اس وقت عورتوں اور بچوں کو مدد دے رہے تھے کہ وہ جہاز سے لائیف بوٹ میں کود آویں۔ انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ پھر وینشیا نے بصد حسرت ان کو بآوازِ بلند پکارا۔

آزاد اور سب کو چھوڑ کر وینشیا کی طرف آئے اور اُن کو گود میں اٹھا کر لائیف بوٹ کی طرف لے گئے۔ وینشیا نے کہا پیارے آزاد میری جان سے زیادہ پیارے ایپلٹن کو تو لاؤ۔ اتنے میں ایپلٹن بھی آیا۔ وینشیا اور ایپلٹن دونوں لائیف بوٹ میں کودے اور آزاد نے فرطِ طرب سے تین بار کہا:-

HIP, HIP, HURRAH

دوسرے لائیف بوٹ میں بھی آزاد کی کوشش موفور سے کئی آدمی کودے۔ جہاز کے کپتان نے جہاز کو اس وقت چھوڑا جب تین بار چکر کھا کر وہ غرقاب ہونے کو تھا۔ ناخدا لائف بوٹ میں کودا تو میاں آزاد نے بآوازِ بلند کہا۔

SAVE THE COMPASS ANBLE YOU TO

STEER FOR THE LAND

یعنی کمپاس اپنے ساتھ لیتے آؤ تاکہ اس کے ذریعہ سے لائیف بوٹ خشکی کی طرف جا سکیں۔ ناخدا نے کمپاس لیا۔ جزیرہ بیرم سامنے نظر آتا تھا مگر فرطِ یاس سے کسی کو امید نہ تھی کہ وہاں تک پہنچ سکیں گے۔

بیرم کے باشندے بمقتضائے ہمدردی انسانی نہایت حسرت اور غایت ملال کے ساتھ دیکھتے تھے کہ ایک جہاز ڈوب رہا ہے۔ ان لوگوں نے جزیرے کے ساحل پر خوب تیز روشنی کی اور کئی من تیل برابر ڈالتے گئے تاکہ شعلے بلند ہوں اور اہلِ جہاز نے اگر یاس اور غم اور پریشانی کے سبب سے اس جزیرے کو نہ دیکھا ہو تو روشنی سے سمجھ جائیں کہ زمین قریب ہے۔ تین مختلف مقامات پر آگ جلائی گئی۔ صدہا آدمی اس واقعہ ہوشربا کے دیکھنے کے لیے اپنے اپنے مکان چھوڑ کر ساحلِ بحر پر آن کھڑے ہوئے تھے اور غل مچا رہے تھے۔ اکثر رقیق القلب آدمی پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے اور تہ دل سے آرزومند تھے کہ جہاز ڈوبنے سے بچ جائے مگر بعض ذات شریف اس مصیبت کو دیکھ دیکھ کر کھلے جاتے تھے کہ سویرے منہ اندھیرے گھرے ہیں خوب رقمیں چیریں گے۔ یہ شقی القلب بدکردار ناہنجار ناخداترس مارے خوشی کے تالیاں بجاتے تھے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے اور باہم خوش خوش گپیں اڑاتے تھے۔

ایک لہر آئی۔ جہاز تہ و بالا ہونے لگا۔ وہ گئی تو دوسری آئی۔ ہنوز جہاز سنبھلنے نہ پایا تھا کہ تیسری موج کے تھپیڑوں نے آفت ڈھائی۔ میاں آزاد بکمال شجاعت و استقلال پھر جہاز پر کودنے ہی کو تھے کہ ناخدا نے میاں خوجی کو بھی ان کے لائیف بوٹ میں بہزار خرابی پہنچایا۔ آتے ہی انھوں نے غل مچایا کہ ارے یارو افیم کی ڈبیا تو وہیں رہ گئی۔ یہاں کوئی بندۂ خدا ذری لپک کے ہماری ڈبیا لے آئے۔ آزاد کو جو پایا تو چمٹ گئے۔ بھائی آزاد جب اتنا بڑا جہاز نہ بچ سکا تو یہ ننھی ننھی کشتیاں بھلا کیوں کر بچیں گی۔ آزاد نے کہا۔ خدا مالک۔ جب زور سے آندھی آتی ہے تو تناور درخت بھی چپٹ پڑتے ہیں۔ کبھی کسی نے

یہ نہ دیکھا ہوگا کہ آندھی چلنے سے گھانس ٹوٹ گئی۔

آزاد جزیرہ پیرم کے ساحل پہ آئے اور آتے ہی مارے تھکاوٹ کے گر پڑے۔ کپتان اسمتھ اور ایبلین نے آزاد کی پیٹھ ٹھونکی۔

وینشیا نے بصد ادائے دلربا میاں آزاد کا شکریہ ادا کیا اور کہا تمام عمر تمھاری مشکور رہونگی کہ تم نے میرے شوہر کی جان بچائی۔

عروس مہ لقا وینشیا نے اپنے پیارے پیارے ہاتھوں میں جام بادۂ ناب لے کر کہا۔ آؤ اٹھو دوا پئو۔ آزاد نے وینشیا کی طرف دیکھا تو اُس سرمایۂ نازنینی غیرت لعبتان چینی نے پھر کسی قدر تیکھی ہوکر کہا کہ اُٹھو دوا پی لو۔ آزاد اُٹھے، بیٹھے اور شراب ناب راح روح کیمیائے فتوح کو دوا سمجھ کر ہونٹوں سے لگایا مگر پیتے ہوئے جھجکے۔ وینشیا نے زبردستی اپنے ہاتھ سے شراب پلادی۔

ایبلین نے آزاد سے کہا کہ اب اس وقت مجھ سے اور کچھ نہیں کہا جاتا۔ صرف اس قدر کہتا ہوں کہ ضرورت کے وقت جان جوکھم کے وقت مجھ کو ضرور یاد کرنا۔ ایبلین کو اب اپنا درم ناخریدہ غلام سمجھو۔

وینشیا۔ آزاد جیسے بہن کو اپنے بھائی کی محبت ہوتی ہے ویسی ہی مجھ کو تمھاری محبت ہے۔

آزاد۔ اب اس وقت کوئی اس قدر تشفی کر دے کہ میں تم کو اور تمھارے پیارے شوہر کو پھر بھی دیکھوں گا، تو میں جی اُٹھوں گا۔

آتش زنی

جمعرات کے دن استانی جی کی آمد آمد کی خبر سن کر حسن آرا اور اس کی بہنیں خوش تھیں، کیوں کہ استانی جی کو ان سب سے دلی محبت تھی۔ بڑی بیگم نے کہا بیٹا آج جمعرات ہے ماستانی جی وعدہ کر گئی ہیں آتی ہوں گی۔ وہ مثل اپنی خاص بیٹیوں کے تم کو سمجھتی ہیں۔

اتنے میں استانی جی ڈولی سے اُتر کر آئیں اور بولیں کہ اگرچہ آج مجھکو آنا نہ تھا کیونکہ ایک جگہ جانے کا اقرار کر لیا ہے مگر وعدہ کے موافق چلی آئی۔

بڑی بیگم۔ اب تم دو چار روز یہیں رہو ذرا لڑکیوں کا دل بہلے۔

استانی جی۔ اب پرسوں سے آ کر کہانیاں شروع کروں گی۔

بیگم (حساب لگا کر) نا بہن۔ پرسوں سنیچر ہے۔ ہم سنیچر کو کوئی کام نہ شروع کرنے دیں گے۔

حسن آرا۔ امی جان یہ ہفتے کے دن بیچارے نے بھلا کیا قصور کیا ہے۔ سب دن اسی کے ہیں۔

بیگم۔ بابا ابھی ناکردہ کار ہو۔ جب بوڑھی ہو گی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔

استانی۔ کیسا سنیچر اور کس کا پیر۔ سب دن اللہ کے ہیں۔ سنیچر نے کیا بگاڑا ہے اور پیر میں کون سے لڈو رکھے ہیں۔ سوائے وہی دقیانوسی باتوں کے۔

بیگم۔ حسن آرا تو بھلا بچہ ہی ہیں ابھی۔ وہ بچہ بن کے چھوٹ جائیں گی تم بڑی بوڑھی ہو کیوں مُفت عذاب میں پڑتی ہو۔

اُستانی۔ (مسکرا کر) خیر چلو ہم اپنی بھگت لیں گے۔

بیگم۔ بھلا سنیچر کے دن کوئی کام شروع کر کے دیکھ نہ لو۔

استانی۔ اے واہ۔ کیا ہوگا کہا؟

اتنے میں پانچ بجے اور استانی جی گھبرا کر بولیں کہ ہم کو جانے دو بھئی۔

بیگم۔ یہ کیوں۔ یہ کیوں؟

استانی۔ کسی سے اقرار ہے۔ سمجھ جاؤ کل ضرور آؤں گی اور یا اگر گاؤں چلی گئی تو پھر پرسوں۔

بیگم۔ اچھا جاؤ۔ اللہ کرے، جلد آؤ۔

کوئی چھ بجے کے وقت حسن آرا اور سپہر آرا اور بہار النسا اور روح افزا نے گھر کے حمام میں خوب غسل کیا اور نکھر کر مہتابی پر جو آئیں تو معلوم ہوا کہ چار چاند سر شام نظر آئے۔

اتنے میں بڑی بیگم صاحب تشریف لائیں۔

سپہر۔ اخاہ اس وقت تو اماں جان کوٹھے پر آتی ہیں۔ کہاں تکلیف کی اس وقت۔

حسن۔ بہار النسا بہن کہتی ہیں کہ ہم رات کو ایک دیا روشن کریں کوئی اس کو بجھا نہیں سکتا۔

بہار۔ ہاں کیا کچھ جھوٹ کہتے ہیں۔ آزما لو نہ آج ہی سہی۔
روح ۔ اے کیا ہوگا کیا آخر ش۔ ایک نہیں ہزار دفعہ آزماؤ تو کیا۔
سپہر۔ سب سے پہلے ہم جاکر چراغ کو بجھائیں گے۔ وہ بات ہی کیا ہے۔
بڑی بیگم نے جریب سیدھی کی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔
بیگم۔ لو میں تو جاتی ہوں اب۔
حسن۔ ہائیں ہائیں۔ کہاں کہاں۔ اماں جان کہاں چلیں۔ آئیں کیا چلیں کیا! اے ذرا بیٹھیے۔
بہار۔ اتنی تکلیف کی اور ایسی جلدی چلیں۔
بڑی بیگم انتہا کی ضعیف الاعتقاد پرانے فیشن کی عورت تھیں۔ جادو ٹونے گنڈے تعویذ بھوت پریت ان سب باتوں کی دل سے معتقد انھوں نے جو یہ باتیں سنیں تو سخت ناگوار ہوا۔
بیگم۔ اب تم لوگوں کے بیچ میں کون بیٹھے بھلا؟
بہار۔ (متحیر ہو کر) کیا۔ کیوں؟
بیگم۔ یہاں تو کفر کی باتیں ہوتی ہیں۔
بہار۔ واہ اماں جان۔ کفر کی باتیں کیسی؟ اللہ نہ کرے کفر کی باتیں ہم کو آئیں۔
بیگم۔ اب یہ کفر کی باتیں نہیں تو کیا ہیں۔ بھلا رات کے وقت کیا جانے کیسا چراغ ہو تم جو وہاں جاکر نام لو اور جان کو خدانخواستہ ہتھیلی پر رکھ کے جاؤ تو اچھا کہ برا۔
سپہر۔ اے تو اماں جان۔ وہاں کیا کوئی بیٹھا ہوگا کہ ہم گئے اور وہ نگل گیا۔
حسن آرا۔ اجی یہ سب باتیں ہیں۔
بیگم۔ باتیں ہیں! اللہ نہ کرے کہ کسی دن چپیٹ[1] میں آجاؤ۔
بہار۔ ناحق بن ناحق حجت کرتی جاتی ہیں۔ ایسی بڑی بہادر بنی ہیں۔ وہ تو حجت کرتی ہیں خواہی نخواہی۔ مانتی ہی نہیں۔
بیگم۔ اور جو ڈر جائیں تو کیسی ہوتی؟
سپہر۔ ہاں دیکھئے تو سہی۔ ہم لاکھ حجت کرتے تھے تو کیا تھا۔ ان کو تو سمجھنا چاہیئے تھا۔ یہ سب سے بڑی ہو کے سب سے چھوٹی بنی جاتی ہیں۔
بہار۔ ہاں اب تو باتیں بناؤ ہی گی۔ اب تو چڑھ بنی ہے۔
بیگم۔ ایک دفعہ میرا کوئی سولہ سترہ برس کا سن ہوگا۔ جب دو تین بیویوں نے آپس میں بحث کی کہ ہم اندھیاری رات میں حتائی پر چڑھ کر پیپل کے پتے توڑیں گے۔ دو تین ایک طرف تھیں اور میں اور جعفر بیگم ایک طرف۔ خیر جب رات ہوئی تو ہم نے کہا اچھا اب توڑو پیپل کے پتے تو جانیں۔ وہ ڈھیٹ تو تھیں ہی۔ حتائی پر جھٹ چڑھ گئیں اور بہت سی ٹہنیاں اور کونپلیں توڑ کر نیچے کی چھت پر آنے لگیں۔ بس زینوں پر ایک نے دیکھا کہ ایک ذرا سا بچہ کھڑا ہنس رہا ہے۔ دوڑ کر اس نے دوسری کو دکھایا۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے بچہ نہ جانے کہاں عنیب (غائب) ہوگیا۔ اے بس اتنے میں دیواروں سے ایک ہاتھ نکلا پھر تو یہ چیخ اٹھیں اور جب تک ہم لوگ دوڑ

---

[1] لپیٹ۔

کو بلائیں اور جائیں جائیں تب تک یہ بیہوش ہوگئیں۔ ہم سے اس وقت اکیلا نہ جایا گیا۔ نہ ہماری مجھولی کو جرأت ہوئی۔ مگر نیچے آواز دی۔ تو وہاں سے دو چار عورتیں آئیں اور ایک خواجہ سرا زینے پر پہنچا تو دیکھا کہ وونوں کی دونوں بیہوش پڑی ہیں۔ اور پنڈا بس کچھ نہ پوچھو۔ ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے جیسے یخ کے مثال اور پیپل کا پیڑ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جڑ سے ہل جائے گا۔ اب اکھڑا اور اب اُکھڑا، اور پتے ایسے بولیں کہ اُف میری تو جان نکل گئی اور میری مجھولی جعفری بیگم تھر تھر کانپتی تھی۔ مگر خواجہ سرا اور ایک سیدانی نے ان کو اٹھا کر بٹھایا، کیوڑا اور پانی پلایا اور منہ پر خوب چھینٹے دیئے۔ جب ذرا ہوش آیا تو نیچے اُتریں۔ مگر ایسی سہمی تھیں کہ رات کو چونک چونک پڑتی تھیں۔ ایک نے بڑے اصرار سے مجھ کو اپنی چار پائی پر سلایا۔ اور دوسری کی یہ کیفیت تھی کہ لحاف میں لپٹی لپٹائی چپ چاپ پڑی تھی۔ رات کو کوئی دو تین بار سے چیخ چیخ اٹھیں اور تڑکے جو جا کر دیکھا تو پیپل کے پتوں کی رنگت ہی اور تھی۔

سپہر۔ یہ ہوا کیا تھا اماں جان؟

بیگم۔ ہوا کیا تھا۔ اب تمھیں کیا بتاؤں کیا ہوا تھا۔

بہار۔ یہ ہیکڑی کی لیتی ہیں۔ ابھی جمّا جمّا (جمعہ) آٹھ دن کی پیدائش ہے۔

سپہر۔ اونہہ اونہہ، تمھارا تو سر ملنے لگا ہے اور نہیں؟

رات کو گیارہ بجے کے وقت چاروں بہنیں چاندنی کے لطف اٹھا رہی تھیں اور بڑی بیگم بھی خلاف معمول حسن آرا کے پلنگ پر لیٹی ہوئی باتیں کرتی تھیں کہ دفعتہً مغلانی نے کہا۔ اے حضور ذری چپ تو رہیئے یہ غل کیسا ہو رہا ہے؟

بیگم۔ ہاں غل تو بہت ہے۔ کہیں چور آیا۔

سپہر۔ اے یہ روشنی کیسی ہے؟

روح۔ آگ لگی ہے کہیں۔

حسن آرا۔ (پلنگ پر کھڑی ہو کر) ارے وہ شعلے نکل رہے ہیں۔ اُف بڑی آگ لگی ہے کہیں۔

بہار۔ بی مغلانی ذرا تم بلا تو لاؤ (ہاتھ مل کر) ہائے اب کیا کریں؟

بیگم۔ گھبراؤ نہیں گھبراؤ نہیں۔ ذری خورشید دولھا کو بلاؤ۔ ارے یہ تو بالکل قریب ہے۔

نواب۔ کہاں ہو سب کی سب واسطے خدا کے ضروری ضروری اسباب باندھ کر الگ کرو۔ پڑوس ہی شہزادے کے ہاں آگ لگ گئی اور ہوا تیز ہے۔ اس وقت خیریت نہیں نظر آتی۔ جلد زیور اور جواہرات الگ کر لو۔ اسباب اور کپڑے کو جہنم میں ڈالو (خدمتگار کو پکار کر) دیکھو ابھی گھوڑے کھلواؤ اور کھوگاڑیاں ابھی ابھی کمپونڈ سے نکال کر میدان میں باہر کھڑی کر دیں۔

بہار۔ (ہاتھ مل کر) ہائے اُف کیا ہوگا۔

نواب۔ (گھبرا کر) اُف غضب ہو گیا۔

حسن آرا۔ ہائے ہائے شعلے آسمان کی خبر لانے لگے۔

نیچے اُتر کر حسن آرا اور بہار النسا نے بڑی پھرتی سے زیور اور جواہرات کے ڈبے اور صندوقچے باہر نکالے۔ سپہر آرا اور روح افزا سے کہا خبردار یہاں سے ہٹنا نہیں۔ بڑی بیگم چپ چاپ دیکھتی جاتی تھیں اور ان کو حیرت سی تھی کہ ہو کیا رہا ہے۔ لونڈیاں اصیلیں، مغلانیاں ادھر ادھر کی چیزیں یکجا کرتی پھرتی تھیں۔ اتنے میں تینوں بہنیں سب انتظام کر کے پھر کوٹھے پر گئیں۔ مگر روح افزا وہیں کھڑی رہی۔ کوٹھے پر جو گئیں تو رنگ فق ہو گیا۔ دیکھا کہ شہزادہ ہمایوں فر کی کوٹھی میں چو طرفہ آگ لگی ہے اور ہر سمت سے

شعلے بلند ہیں۔ یہ اتنی دور پر کھڑی تھیں مگر گرمی اثر دکھاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایسے مقام پر ہیں جہاں چوطرفہ بھٹی ہی بھٹی ہے۔ دھنیاں جو چٹخیں تو بس یہی معلوم ہوا کہ گویا رعد گرج رہا تھا۔ تڑ تڑ چٹاخ چٹاخ۔

بہار۔ ہائے لاکھوں پر پانی پڑ گیا۔

حسن آرا۔ اس وقت کوئی اُس بیچارے کے دل سے پوچھے۔ ہائے کیا گذرتی ہوگی؟

سپہر۔ بہن اِدھر تو آؤ۔ افوہ۔ دیکھو ہزاروں آدمی جمع ہیں۔

بہار۔ اس کھڑکی ہی سے صاف معلوم ہوتا ہے صاحب[1] لوگ بھی ہیں۔

حسن آرا۔ پھر بہن شہزادے ہیں کہ کوئی ایسے ویسے۔

سپہر۔ اے باجی جان وہ کون ہے۔ ہے ہے وہ کون ہے:

اتنے میں لوگوں نے اس قدر غل مچایا کہ آسمان سر پر اُٹھا لیا اور رونے کی آواز آنے لگی۔

بہار۔ کہاں کون ہے۔ کون ہے سپہر آرا؟

سپہر۔ بہار النسا سے لپٹ کر (رو رو کر) ہائے وہ مہتابی پر کون ہے؟

حسن آرا (ہاتھ مل کر) ارے یہ تو ہمایوں فر ہیں، ہائے ستم اب یہ کیوں کر بچیں گے؟

سپہر۔ (پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی) باجی ہائے باجی۔ یہ اب ہو گا کیا۔ چوطرفہ آگ ہے۔ بچے گا کیونکر بیچارہ۔ اُف اُف۔ اُف۔

بہار۔ ہائے اس کی جوانی پر ترس آتا ہے۔

حسن آرا منہ ڈھانپ کر خوب روئی۔ سپہر آرا کا یہ عالم کہ آنسوؤں کا تار نہیں ٹوٹتا اور بہار النسا حسرت کی نظر سے اُس سرو جویبار رعنائی کی مصیبت کو بصد حزن و ملال دیکھنے اور کفِ افسوس ملنے لگی۔ میرزا ہمایوں فر مہتابی پر تن تنہا اس تاک میں سوئے تھے کہ شاید ان بتانِ طنّاز و خوبانِ سراپا ناز کا جھمکڑا بعد مدت نظر آئے۔ لیکن ٹھنڈی ہوا جو چلی تو آنکھ لگ گئی۔ کئی دن سے نیند بھر کے سونے نہیں پائے تھے۔ لہٰذا سوئے تو گویا گھوڑے بیچ کر۔ دنیا و ما فیہا سے بے خبر۔

اب سنیئے کہ جب چھت پر میرزا ہمایوں فر کی مسہری بچھی تو انھوں نے خدمتگار خاص کو حکم دیا کہ مہتابی پر لے جا کر بچھا آ۔ مگر کسی سے ذکر نہ کرنا۔ وہ پلنگ بچھا آیا اور ایک روز کی رخصت لے کر گھر گیا۔ یہاں اور کسی آدمی کو معلوم نہ تھا کہ ہمایوں فر کہاں ہیں۔ جب آگ لگی تو وہ سب دوڑے آئے کہ شہزادے کو اُٹھائیں۔ مگر بستر خالی پایا تو سمجھے کہ کہیں گئے ہونگے۔ یہ کسی کو خیال نہ ہوا کہ مہتابی پر جا کر دیکھے اور کوئی علم غیب تو پڑھا ہی نہیں۔ یہ بیچارے بیدار ہوئے تو کب جب مہتابی کے نیچے کے حصے میں چوطرفہ آگ لگ چکی تھی۔ خدمتگاروں اور حاضرین و ناظرین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسباب و سباب کے بٹورنے کی کسی کو فکر نہ تھی۔ یہی سوچتے تھے کہ خدا کسی طرح سے اس وقت اس بیچارے کی جان بچائے مگر سب کو بالکل نا امیدی ہجوم یاس میں کوئی اس شہزادے بلند ارادہ کی جوانی اور خوش بیانی یاد کر کے روتا تھا۔ کوئی سر دھن کے کہتا تھا کہ یار و اس بیچارے کی بڈھی ماں کے دل پر اس سانحے سے کیسی گذرے گی۔ خاص شہر سے بھی جوق جوق آدمی جمع ہو گئے اور لین میں بگل دیا گیا۔ سپاہی اور چوکیدار اور برق انداز اور رسّہ سا اور باشندگانِ شہر اُٹھے چلے آتے تھے۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے دریا سے ہزاروں گھڑے پانی لایا جاتا تھا۔ سقّے اور مزدور بڑی سرگرمی سے آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ کہرام مچا ہوا تھا۔ صاحب کلکٹر انجینئر اور ڈپٹی کلکٹر صاحب اور تحصیلدار اور انسپکٹر پولیس ہزاروں

---

[1] انگریز۔

آدمی جوق درجوق جمع تھے۔ پانی کی یہ کیفیت کہ صدہا مشکیں بھر بھر کے آتی تھیں اور برابر کوشش کی جاتی تھی کہ آگ بجھائی جائے مگر ہوا اس تیزی پر تھی کہ الامان۔ پانی تیل کا کام دیتا تھا۔

میرزا ہمایوں فر اس حالت یاس و نومیدی میں بس یہی سوچتے تھے کہ بارخدایا جن بُتوں کے نظارے کی فکر میں مجھ پر یہ مصیبت پڑی کہ اب تھوڑی دیر میں جل بھُن کر خاک ہو جاؤں گا ان کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ہمایوں فر نے ہمارے ہی عشق میں اپنی جان شیریں گنوائی تو میں سمجھوں گا کہ جی اُٹھا۔

اتنے میں اُدھر نظر پڑی تو دیکھا کہ وہ خوبان پری تمثال مصروف ماتم ہیں روح افزا اور حسن آرا اور گھر بھر کی عورتیں کوٹھے پر کھڑی ہیں اور شور وشیون کرتی ہیں۔ سوچے کہ اللہ اللہ ہمارے سوگ کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ خیر شکر ہے کہ جس کے لیے جان دی اس کو نزع کے قبل اپنا سوگ کرتے تو دیکھ لیا۔ اتنے میں صاحب کلکٹر بہادر نے جن کو شہزادۂ ہمایوں فر سے بڑی محبت تھی آواز بلند یوں کہا۔

کلکٹر صاحب ۔شہزادۂ ہمایوں فر گھبراؤ نہیں۔ خدا کو یاد کرو، وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔

میرزا ہمایوں فر کو اس وقت اپنا چھوٹا بھائی یاد آیا اور گو وہ لڑکا ان کے ساتھ یہاں نہ تھا۔ لیکن اس وقت اجل کو ہم آغوش دیکھ کر اُن کے اوسان خطا ہو گئے۔ خیال نہ رہا کہ وہ گھر ہی پر ہے۔ ساتھ نہیں آیا۔ کلکٹر سے پوچھا کہ :-

IS MY YOUNGER BROTHER ALIVE?

میرا چھوٹا بھائی تو جیتا بچا ؟

صاحب کلکٹر نے لوگوں سے پوچھا کہ ان کا چھوٹا بھائی کہاں ہے ؟ انھوں نے کہا حضور وہ تو ان کے ساتھ نہ تھا مارے گھبراہٹ کے ان کے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ اس وقت آپ کہہ دیں کہ وہ لڑکا ہمارے پاس ہے۔

ک۔ (YES HE IS SAFE) ہاں وہ محفوظ ہے۔

شہزادہ۔ (عجیب بھیانک آواز سے) (THEN I DIE IN PEACE) ہاں اب میں آرام سے مرونگا۔

پھر بھائی کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ بھائی گھر بار تمھارے سپرد ہے ماں کو تسلی دو کہ ہمایوں فر نہیں سہی میں تو ہوں۔ اس جگر خراش فقرے کو سن کر صاحب کلکٹر اور کُل حاضرین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اتنے میں میرزا ہمایوں فر نے جب دیکھا کہ بچنے کی ذرا بھی امید نہیں، آگ کے شعلے قریب آتے چلے اور ہوا نے اور بھی زیادہ زور باندھا تو ایک مرتبہ نعرہ بلند کیا اور ایک درد انگیز آواز سے کہا کہ یارو الوداع ! پھر حسن آرا اور سپہر آرا کی طرف نظر کر کے ٹوپی سر سے اُتاری اور تین بار بصد حسرت سلام کیا۔ حسن آرا اور سپہر آرا اور بہار النسا دیواروں سے سر ٹکرانے لگیں کہ ہائے یہ کیا ستم بپا ہوا۔ میرزا ہمایوں فر نے جب دیکھا کہ وہ پری پیکر دیوار سے سر ٹکرا رہی ہیں تو اُن کے شیشۂ دل پر ٹھیس لگی کہ ہائے دھان پان نازک بدن ہیں ایسا نہ ہو چوٹ آ جائے۔ ہاتھ جوڑے اور اشارے سے منع کیا کہ یہ نہ کرو۔ لیکن وہ دونوں بہنیں اس وقت ایسی حالت میں نہ تھیں کہ ہمایوں فر کو آنکھ بھر کر دیکھ سکتیں۔ اشک مانع نظارہ تھے۔ میرزا ہمایوں فر نے ایک دفعہ ہی بصد حسرت ان کی طرف دیکھا۔

سپہر آرا کھڑکی کے پاس جا کر اور میرزا ہمایوں فر کو گویا آخری مرتبہ دیکھ کر سر پٹکنے لگی۔ ہمایوں فر کے عشق کا کیا کہنا اپنے محبوب شیریں حرکات کو اس ماتم اور سر کوبی کی حالت زار میں دیکھ کر اپنا صدمہ بھول گئے۔ گو اجل ہر سمت سے ان کو اپنی بھیانک صورت دکھاتی تھی اور دم بدم زندگی سے مایوسی ہوتی جاتی تھی لیکن دست بستہ دور ہی سے کہا۔ اگر یہ کرو گی تو ہم اپنی جان دے دیں گے۔

حضرات ناظرین کیا غضب کا فقرہ ہے۔ ہائے یہ الفاظ خون رُلاتے ہیں "ہم اپنی جان دیدیں گے"، ہائے کیا دھمکی ہے۔ گویا جان کے بچنے کی امید ہی تو تھی۔ چو طرفہ آگ کے شعلے آسمان تک بلند۔ دھواں ہر سمت ابر کی طرح چھایا ہوا۔ کڑیاں اور دھنیاں تڑاتڑ چٹختی ہیں۔ بھاگنے کی کوئی تدبیر نہیں۔ آگ بجھاتے بجھاتے لوگ عاجز آ گئے۔ ہوا کہتی ہے کہ میں آج ہی تیزی دکھاؤں گی! اور حضرت فرماتے ہیں کہ اگر یہ کرو گی تو ہم جان دے دیں گے۔ اب سپہر آرا اور حسن آرا کے آنسو نہیں نکلتے تھے، دونوں مثل پیکر تصویر خاموش لیکن کلیجا بلیوں اچھلتا تھا اور روتیں تو بخار چھٹ جاتا، مگر ان کا غم نہ رونے سے اور بھی بڑھ گیا۔ اب اس درجہ کو پہنچا جس میں زندگی کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ حیرت نے دامن پکڑا۔ آنکھوں سے حسرت ٹپکتی تھی۔ چال ڈھال سے حیرت کے آثار عیاں تھے۔ بڑی بیگم سکتے کے عالم میں۔ کچھ تو یہ خیال کہ ہائے اس نوجوان شہزادے کی جان مفت میں جاتی ہے۔ کچھ یہ سوچ کہ لڑکیوں سے کہاں کی جان بچا ن نکلی بڑی بیگم نے خوب دعا مانگی کہ یا الٰہی اس بیچارے کی جان بچا۔ ہے ہے اس کی سو برس کی ماں اس خبر کو سنکر کیا کرے گی؟ اس پر تو بجلی ہی گر پڑے گی۔ بہار النسا برابر روتی جاتی تھی۔ روح افزا کبھی کھڑکی کی طرف جاتی تھی کبھی ہمایوں فر کی حالت زار دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی۔

اتنے میں جب آگ بہت ہی قریب آ گئی تو مرزا ہمایوں فر کا استقلال ہاتھ سے جاتا رہا۔ ادھر اُدھر ساری چھت پر سراسیمگی اور آشفتہ حالی سے گھومنے لگے۔ اتنے میں ایک خدمتگار قدیم نے ایک طرف گھس کر کڑیوں اور جلتے بلتے دروازوں اور دھنیوں اور بلیوں کو ہٹا کر پانی چھڑکوانا شروع کیا۔ ہزاروں مشکیں پانی کی پڑتی تھیں مگر بے سود۔ میرزا ہمایوں فر کا بچنا محال تھا۔ ہوا نے اور بھی زور باندھا، اب یہاں تک نوبت آئی کہ جو لوگ قریب کھڑے تھے وہ آنچ اور حرارت کے سبب سے دُور دُور بھاگنے لگے اور صاحب کلکٹر بہادر نے زمین پر بیٹھ کر فرط بیقراری سے رونا شروع کیا۔ اب آگ میرزا ہمایوں فر سے صرف ایک گز کے فاصلے پر ہے اور لپکے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ حسن آرا اور سپہر آرا کی طرف ٹوپی اتار کر سلام کیا۔ (جس کو وہ مطلق نہ دیکھ سکیں) اور بدن کو تول کر اور ایک نعرہ اللہ اکبر بلند کر کے دھم سے کود پڑے اور ساتھ ہی سپہر آرا بھی بآواز بلند چیخ کر کھڑکی سے کود ی۔ ہائے ستم کا سامنا ہے۔ عجب سوح فرسا سانحہ ہے خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اے توبہ اے توبہ۔ الامان الامان!

اب سنیئے کہ میرزا ہمایوں فر نے جب دیکھا کہ مفر کی کوئی صورت نہیں اب اجل نے دبوچ ہی لیا تو یہ جان پر کھیل گئے۔ سوچے کہ یوں بھی مریں گے وہ وں بھی مریں گے پھر بچنے کی تدبیر سے کیوں غافل رہیں؛ انھوں نے بکمال استقلال بدن کو تولا اور سامنے کی ایک چھت پر کودنے کا قصد کیا۔ مگر وہاں تک جانا محال تھا۔ نیچے ہی گر پڑے۔ اگر ذرا دو بالشت ہٹ کر گریں تو جل بھُن کے خاک ہو جائیں مگر زندگی تھی بچ گئے۔ گرے تو گھانس پر یہاں زمین بالکل نرم اور نم تھی گرتے ہی بیہوش ہو گئے لوگ چاروں طرف سے دوڑے اور ہاتھوں ہاتھ زمین پر سے اٹھا لیا۔

کلکٹر۔ سول سرجن صاحب کہاں ہیں؟

سول سرجن سپہر آرا کو کھڑکی پر سے کودتے ہوئے دیکھ کر ادھر جھپٹے تھے۔ دیکھے تو سپہر آرا کو ذرا بھی چوٹ نہیں لگی تھی بلکہ سپہر آرا نے اُٹھتے ہی کہا کہ لوگو! اگر ہمارا شہزادہ بچا تو ہمیں دکھا دو، اور نہیں تو اس کی قبر میں ہم کو بھی زندہ دفنا دو۔ سو دو سو آدمیوں نے سپہر آرا کو گھیر لیا اور ڈاکٹروں نے تشفی دی۔

اتنے میں نواب صاحب آ گئے اور سپہر آرا کو الگ لے جا کر سمجھانے لگے کہ تم گھبراؤ نہیں، شہزادے بخیریت ہیں۔

سپہر۔ ہائے دولھا بھائی میں کیوں کر مانوں؟

نواب۔ نہیں بہن۔ آؤ اُنھیں ہم ابھی ابھی دکھائے دیتے ہیں۔

سپہر۔ پھر دکھاؤ دولھا بھائی!

نواب۔ اک ذرا ٹھہرو۔ بھیڑ ذرا چھنٹ جائے تو دکھا دیں۔ تب تک گھر چلی چلو۔

سپہر۔ پھر دکھاؤ گے۔

نواب۔ ضرور خدا کی قسم ضرور دکھائیں گے۔

سپہر۔ ہمارے سر پہ ہاتھ رکھ کے کہو۔

نواب۔ (سر پہ ہاتھ رکھ کر) اس سر کی قسم ضرور دکھا دیں گے اب چلی چلو، اتنا کہنا مان لو۔

سپہر۔ اچھے کیوں کر بیں۔ بچے کس طرح؟

نواب۔ کود پڑے، اللہ نے بچا لیا۔

بہزار خرابی نواب نامدار سپہر آرا کو گھر لے گئے۔

اب سنیئے کہ وہاں سپہر آرا کے گرنے سے کہرام مچا تھا۔ مگر جب سپہر آرا کھڑی ہوئی تو سب کی جان میں جان آئی۔ سپہر آرا اور نواب صاحب گھر میں داخل ہوئے۔

نواب۔ اللہ نے آج دوبارہ زندگی دی۔

بیگم۔ اُف بڑی عزت رکھی اللہ نے۔

روح۔ کیا جانے اب تک کیا کا کیا ہو گیا ہوتا۔

بہار۔ آؤ سپہر آرا پنکھا جھلیں تم پلنگ پر لیٹ رہو۔

بیگم۔ ان کو لٹا دو اب۔ اور مغلانی تم خوب پنکھا جھلو اور مہری سے کہو ایک طرف سے وہ جھلے۔

نواب۔ میں جا کر دیکھوں تو ہمایوں فر کی کیا کیفیت ہے۔

بہار۔ اے زندہ تو بچے بیچارے۔

نواب۔ ہاں امید تو ہے ضرور بچ جائیں گے۔

شہزادہ۔ اُف۔ دل قابو میں نہیں ہے۔

کلکٹر۔ اجی آپ کے کودتے ہی آگ بھی بجھ گئی۔

شہزادہ۔ میرے ہی ساتھ عداوت تھی۔ (کوئی ہے) دیکھو پڑوس میں جا کر بیگم صاحب کو ہماری طرف سے آداب عرض کرو۔ اور کہہ دو کہ آپ بزرگوں کی دعا سے بچ گیا۔ یا مہری کو بھیج دو۔ تھوڑی دیر میں بڑی بیگم صاحب کے ہاں ایک مہری پہنچی۔ یہ وہی مہری تھی جس کو شہزادہ ہمایوں فر نے حسن آرا اور سپہر آرا کے پاس پیغام لے کر بھیجا تھا۔ جس کو حسن آرا نے ڈانٹ بتائی تھی۔ سپہر آرا نے سیکڑوں صلواتیں سنائی تھیں۔ یا تو وہ وقت تھا کہ ان دونوں بہنوں کو اس کی صورت سے نفرت تھی اور یا اب دیکھتے ہی کھل گئیں۔ حسن آرا بیگم مہری کو دیکھ کر کسی قدر شرمائیں۔ مگر سپہر آرا دیکھتے ہی فرط بیقراری سے بول اُٹھی کہ (کیسے ہیں) مہری آداب بجا لائی اور نہایت ادب کے ساتھ یوں کہنے لگی۔

مہری۔ اے حضور، اللہ نے بڑا فضل کیا۔ کیا جانے کس کا دیا لیا اس گاڑھے وقت (روفت) آڑے آیا۔ شہر بھر یا تو ملتا تھا کہ

ایسے لائق شہزادے اور کس بے کسی میں ہیں۔ اللہ جانتا ہے میرے تو اوسان خطا ہو گئے تھے بس جی چاہے کہ آگ میں کود پڑوں بارے اللہ نے بہت بچا دیا۔ کیا جانے کس نگوڑے جہنمی نے یہ شعبدہ کیا۔ اب تو بولتے چالتے ہیں لیکن ذری ذری در د ہوتا ہے۔ پھر حضور اس مہتابی کو دیکھئے اور کودنے کو دیکھئے۔

بیگم۔ شہزادوں پر سایہ ہوتا ہے۔ اللہ ان کا بچانے والا ہے۔

مہری۔ لونڈی کو حضور کی خدمت میں بھیجا ہے کہ جا کر دلا سا دوں کہ اب اچھے ہیں۔ فرمایا ہے کہ آپ بزرگوں کی دعا سے بچ گیا۔ آپ کا بہت خیال ہے۔

بیگم۔ ہماری طرف سے دعا کہنا اور کہنا کہ اللہ نے آپ کو دوبارہ زندگی دی۔ خدا تمہیں خضر کی عمر دے اور خوش وخرم رہو۔ مگر علاج سے غافل نہ رہنا۔

مہری۔ نہیں حضور۔ بھلا علاج سے بے غافل رہ سکتے ہیں اور بڑے صاحب تو آپ ڈاکٹر (ڈاکٹر) سے کہہ گئے کہ دن رات ایک گورا ڈاکٹر یہاں رہا کرے۔

بیگم۔ دیکھو اللہ کو بچانا ہوتا ہے تو یوں بچاتا ہے۔

مہری۔ (سپہر آرا سے) اب آپ کا مجاز (مزاج) کیسا ہے۔ اُف پڑوس میں رہنے سہنے سے آپ کو بھی حد بھر محبت ہو گئی ہے بھی ہماری سرکار کو یہ نہیں معلوم ہوا۔

بڑی بیگم (خاموش) اور متحیر۔ حسن آرا چپ چاپ سنتی رہی۔ بہار النسا نے روح افزا کے چٹکی لی۔ روح افزا مثل پیکر تصویر خاموش رہی۔ مہری اپنے دل میں خوش کہ سپہر آرا نے اس قدر محبت ظاہر کی کہ کھڑکی پر سے کود پڑیں۔

مہری۔ ہے اجازت پھر۔ اب جا کے سرکار کو دیکھوں ذری۔

بیگم۔ ہماری طرف سے دعا کہنا۔ ہے ہے میں یہی سوچتی تھی کہ اب ہونا کیا ہے توبہ۔ توبہ۔

مہری رخصت ہوئی۔ شہزادے سے جا کر کہا کہ حضور کہہ آئی۔ کل پرسوں جب حضور بالکل اچھے ہو جائیں گے تو ایک خوش خبری سناؤں گی حضور کو۔ لونڈی نے انعام کا کام کیا۔ مگر حضور اللہ کرے جلد اچھے ہوں۔

اتنے میں میرزا ہمایوں فر نے کہا کہ اب ہم اس وقت سوتے ہیں پنکھا قلی کو بھیجو کہ پنکھا کھینچے۔

شب کو شہزادہ درد کی چمک کے سبب تلملایا کیا۔ اسسٹنٹ سرجن دلاسا دیتے تھے کہ حضور گھبرائیں نہیں۔ دو تین دن میں بدستور سابق چلنے پھرنے لگیے گا۔ ٹانگ کی ہڈی میں چوٹ آئی ہے مگر ہڈی ٹوٹ نہیں گئی ہے اور قلب کے صدمے کا صاحب سول سرجن بہادر نے اچھے طور پر علاج کیا ہے۔ اب آپ اگر سونے کا خیال کیجئے اور ذرا آرام فرمائیے تو خوب ہو۔

سویرے منہ اندھیرے صاحب سول سرجن تشریف لائے تو دیکھا کہ شہزادہ میٹھی نیند سو رہے ہیں اسسٹنٹ سرجن سے دریافت کیا کہ شب کو طبیعت کیسی تھی۔ انھوں نے کل حال بتایا اور ضروری ہدایت کے بعد اور مریضوں کو دیکھنے چلے گئے۔ کوئی دس بجے کے قریب میرزا ہمایوں فر کی آنکھ کھلی تو ڈاکٹر صاحب نے کہا (صاحب آئے تھے) میں نے آپ کا حال کہہ دیا۔ ایک دوا بدل دی ہے وہ دکان سے آگئی ہے منہ دھو کے ایک خوراک پی لیجئے انشاء اللہ درد میں بھی کمی ہو جائے گی اور قلب کو بھی تسکین ہو گی۔

اتنے میں رؤسا اور امراء اور عمائد شہر اور خوش باش اور مہاجن دعمال عیادت کے لیے جوق جوق آئے۔ سب نے شب کے سانحہ ہوشربا سے کمال افسوس ظاہر کیا۔

حسن آرا بیگم کی بیماری

آتش زنی کے پندرہ بیس روز بعد ایک دن خاتون مہ لقا سپہر آرا بیگم تڑکے گجردم خواب ناز سے بیدار ہوئیں۔ حسن آرا بیگم کو جگایا کہ باجی جان اُٹھیے اذان ہو چکی، نماز پڑھ لیجیے۔ حسن آرا نے کہا اس وقت مارے درد کے سر پھٹا پڑتا ہے اور جی بے چین ہے۔ سپہر آرا نے روح افزا بیگم کو جگایا اور دونوں بہنوں نے نماز صبح پڑھی۔ اس کے بعد روح افزا نے پوچھا کہ حسن آرا کیسی ہے؟ سپہر آرا بولیں، رات تو اچھی تھیں اس وقت نماز نہیں پڑھی، کہتی ہیں کہ سر درد کرتا ہے اور طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اتنے میں بہار النسا بیگم بھی بعد ناز و انداز آئیں اور آتے ہی مسکرائیں۔ روح افزا بولی۔ باجی اس وقت حسن آرا بے چین ہیں۔ ذری دیکھیے تو۔

بہار النسا۔ ایں! کیوں کیسی ہیں؟

سپہر آرا۔ میں نے کہا باجی اٹھو۔ نماز صبح پڑھ لو۔ بولیں اس وقت درد سر ہے اور طبیعت بے چین ہے۔

بہار النسا نماز پڑھ کر حسن آرا کے پلنگ پر جا بیٹھیں اور آہستہ سے پوچھا کیسی ہو حسن آرا؟ حسن آرا نے کہا بہن کیا بتائیں چار بجے سے مارے درد کے سر پھٹا پڑتا ہے اور اس وقت دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔

بہار۔ کچھ بدہضمی کی شکایت تو نہیں ہے؟

حسن آرا۔ ہاں کھٹی ڈکاریں تو آتی تھیں۔

روح افزا۔ پیشانی ذرا ذرا گرم ہے۔

سپہر۔ اور پاؤں جیسے یخ۔

بہار۔ یہی تو بُرا۔ بھلا ڈکاریں کتنے وقت سے آتی ہیں؟

حسن۔ کوئی دو بجے ہونگے۔ ہاں بس نیند کا عمل ہوگا۔ اس وقت بات کرنا بُرا معلوم ہوتا ہے اور ہونٹ سوکھ کے کانٹا ہو گئے ہیں۔

بہار النسا بیگم نے سپہر آرا سے کہا کہ جا کے امّاں جان کو تو بلا لاؤ اور جہری سے کہو اُن کو بھی باہر سے بلا لائیں۔ سپہر آرا بڑی بیگم کو اور مغلانی نواب صاحب کو بلانے گئی۔

بڑی بیگم آہستہ آہستہ حسن آرا کے پاس آئیں اور نواب صاحب بھی تشریف لائے۔ بڑی بیگم نے حسن آرا سے پوچھا کہ کھٹی ڈکاریں کتنے وقت آتی تھیں؟ حسن آرا نے کہا۔ جی دو بجے کے وقت۔

بڑی بیگم پُرانے فیشن کی ضعیف الاعتقاد عورت تو تھیں ہی، بولیں کہ نظر کا اسرار ہے۔

حسن آرا۔ اے نہیں امّی جان۔ اسرار وسرار سب باتیں ہیں۔

بیگم۔ مغلانی سے کہو فال کھلوائے۔

سپہر۔ ہاں یہ بات مانی۔ لائیے ہم خود فال دیکھیں گے۔

بیگم۔ نظر کا اسرار ضرور ہے بیٹی۔ تم ناحق کو حجت کرتی ہو۔

روح۔ اس کے تو ہم بھی قائل نہیں۔

بیگم - پیاری کی ماں - جا کے حافظ جی سے تعویذ تو لا ؤ -
پیاری کی ماں - بہت خوب وہی نہ جو صحت (مسجد) میں رہتے ہیں -
بیگم - ہاں ہاں لکھنا تعویذ لکھ دیجیئے -
حسن آرا - اماں جان نہ منگوایئے ہم کو تعویذ دعویذ کا اعتقاد نہیں -
بہار - اے واہ - کیسی بچوں کی باتیں کرتی ہو -
روح - اچھا اعتقاد چاہے نہ ہو - مگر ہرج ہی کیا ہے -
سپہر - لو میں دیوان حافظ لے آئی -
بیگم - پھر فال دیکھو - خورشید دولہا مطلب بتا دیں گے -
نواب - یہ گنڈا تعویذ تو ہوا ہی کرے گا - علاج کی فکر کرنی چاہیئے - کہیئے تو ڈاکٹر کو بلا لاؤں -
بیگم - نہیں بیٹا ڈاکٹر واکٹر نہیں حکیم صاحب کو بلاؤ - ڈاکٹروں کی دوا گرم ہوتی ہے آگ (حسن آرا کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر) اُف پسینے میں ڈوبی ہوئی ہے -

سپہر آرا نے سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْم - اے حافظ شیرازی میری فال صحیح صحیح بتا دو تو تمھارے دیوان کو مٹھائی سے تولوں یہ کہہ کر دیوان کھولا تو یہ مطلع نظر سے گذرا ؎

روز ہجراں و شب فرقت یار آخر شد　　　زدم ایں فال و گذشت اختر و کار آخر شد

بڑی بیگم پڑھی لکھی تو تھیں ہی نہیں (آخر شد) جو اُنھوں نے سنا تو ہوش اُڑ گئے - منہ پر ہوائی چھٹنے لگی - گردن جھکائی اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے -
حسن آرا - ہاں - ہائیں اماں جان -
نواب - آپ سمجھیں نہیں - اس کے معنی تو سمجھ لیجیئے -
بیگم - (آبدیدہ ہو کر) اس وقت انھوں نے کیا پڑھا؟
نواب - انھوں نے جو پڑھا اس کے یہ معنی کہ جدائی کا دن اور دوست کی فرقت کی شب گئی گذری - اب کا رغم تمام ہوا لو شادیانے بجاؤ -
بیگم - رات حاضرات کریں گے -
حسن آرا - کوئی فال دیکھتا ہے - کوئی حاضرات کرتا ہے - کوئی گنڈا تعویذ لاتا ہے - کوئی حافظ جی کے پاس جاتا ہے اور حکیم کی فکر نہیں اور میرا بُرا حال ہے -
نواب - میں جا کر حکیم صاحب کو بگھی پر اپنے ساتھ لے آتا ہے -
حسن آرا - ہاں بھائی بڑا احسان کرو ہے - یہ لوگ گنڈے تعویذ ہی کے پھیر میں پڑے رہیں گے -
بیگم - اب ان کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اپنی سالی کا علاج کریں -
نواب صاحب تو حکیم کو بلانے گئے اور یہاں بڑی بیگم نے تھوڑی دُور سے ایک عورت کو بلوایا جس کے جھاڑنے پھونکنے کی دھوم تھی - کوئی اڑتیس برس کا سن - یہ عورت ایک ہی کائیاں تھی - آئی اور مسکرا کر بڑی بیگم کو سلام کیا اور پوچھا کہ خیریت ہے

بیگم صاحب - بڑی بیگم نے کہا حسن آرا کا پنڈا پھیکا ہے اور جی گھبراتا ہے - رات دو بجے سے بے چینی بتاتی ہیں - پسینوں سے رومال تر ہو گیا - ڈوب پر ڈوب آرہا ہے - اِتنے پسینے آئے کبھی کسی کو نہیں دیکھے - تم ذری اچھی طرح دیکھو تو - محمدی خانم کہل گئیں کہ اچھا شکار ہاتھ لگا - اِن کے آنے سے بڑی بیگم کو تو ڈھارس ہوئی مگر حسن آرا بد دماغ ہو گئیں - اس خاتون پری پیکر کو ضعیف الاعتقادی اور دقیانوسی خیالات سے بڑی نفرت تھی - بس چلتا تو محمدی خانم کو نکلوا دیتیں ۔

اتنے میں مغلانی نے آن کر کہا حضور حکیم صاحب آ گئے ہیں پردہ ہو جائے تو آئیں - بڑی بیگم کو تو محمدی خانم پٹی پڑھا چکی تھیں کہ خبردار حکیم جی کا علاج تین دن تک نہ کرنا - انھوں نے چپکے سے مغلانی کو ایک کونے میں بلایا اور کہا ذری خورشید دولھا کو بلا لاؤ - مغلانی نے کہا نواب صاحب چلیئے بیگم صاحب کو حضور سے کچھ کہنا ہے - نواب صاحب اندر تشریف لائے تو بڑی بیگم نے آہستہ سے یوں گفتگو کی -

بیگم - محمدی خانم کہتی ہیں کہ تین دن تک علاج نہ ہونا چاہیئے جن کا سایہ ہے -

نواب - محمدی خانم کون ؟

بیگم - ہیں، ایک ادھر مکان ہے - وہ ان باتوں کو خوب جانتی ہیں -

نواب - اجی کچھ خبر ہے - آپ ذرا پردے میں بیٹھیں - اب اتنی دور سے جا کے حکیم صاحب کو لایا ہوں - نبض تو دیکھنے دیجیئے -

روح - یہاں پردہ ہے، آپ بلائیے -

حکیم صاحب تشریف لائے - میانہ قامت - گول بدن - بیالیس چوالیس برس کا سن - سفید ڈھیلے پانچوں کا پاجامہ چکن کا کرتہ - شربتی کا انگرکھا - چوگوشیہ ٹوپی - سر پہ ٹوپی عقیق کا کنٹھا ہاتھ میں - کپڑے صاف ستھرے - آن کر کرسی پر متمکن ہوئے -

نواب - دو بجے کھٹی ڈکاریں آئیں اور چار بجے سے بخار ہے اور بے چینی -

نواب - (پردے کے پاس سے) نبض دکھاؤ -

حکیم - (نبض دیکھ کر) شب کو کوئی ثقیل چیز تو نہیں کھائی تھی ؟

حسن آرا - (بہت آہستہ سے) نہیں معمولی غذا تھی -

حکیم - حرارت شبینہ جو باعث تحریک ہوئی بسبب حدوث ان شکایات کا ہے جو آپ نے فرمائیں - ہنوز کوئی مرض ان اسباب سے پیدا نہیں ہوا - تغیر اوقات سے اختلاف واقع ہو گیا ہے -

حسن آرا - پیاس کے مارے کلیجہ منہ کو آتا ہے -

حکیم - آلو کا پانی استعمال میں لایئے - شیخ الرئیس نے جناب نواب صاحب ساٹھ فائدے آلو بخارا کے لکھے ہیں - اکسیر ہے اکسیر - ڈاکٹروں کے ہاں یہ مسکن ادویہ نہیں ہیں - وہ سوائے کنین کے اور کچھ نہیں جانتے -

نواب - مگر کنین ہے تو مفید -

حکیم - لاریب مگر ہر قسم کے بخار کو فائدہ نہ بخشے گی -

نواب - بے چین بہت ہیں -

حکیم - ضیافت طبع اور سکون باعث دفع خفقان و وحشت دل و حرارت دماغ ہوگا -

حسن آرا۔ (چپکے سے) دولہا بھائی نسخہ جلد لکھوائیے!

حکیم۔ بس عرق کیوڑا اور آب آلو کو بہت بڑا مفرح اور مسکن ہے۔ نوش فرمائیں۔ غذا میں تقلیل کیجیئے اور اسباب راحت میں زیادتی۔ فوراً حرارت دماغ کم ہو جائے گی اور وحشت دل بھی دور ہو گی۔ چونکہ ڈکار کھٹی آ چکی ہے لہٰذا بقول معروف اطبّا صوم و نوم دونوں ازالہ مرض کے لیے کافی ہیں، مگر صاحبزادی کی تشفی کے لیے احتیاطاً نسخہ بتا دیا۔ سوا سطے انشراح طبیعت کے اس امر پر توجہ ہونی چاہیئے کہ جس سے حیلۂ طبیعت پیدا ہو اور طبیعت مرض سے غافل ہو جائے۔ شیخ الرئیس نے آداب خلوت لطیف مزاجاں خصوصاً نسواں کے واسطے راحت اور سکون کو اولیٰ کہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد آب آلو اور عرق کیوڑا حسن آرا بیگم کو پلایا اور دس منٹ کے بعد پھر دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں ذرا تسکین ہوئی۔ بڑی بیگم سے کہا۔ امی جان دیکھتے دیکھتے ہی قلب کو سکون ہوا۔ آپ جو سائے اور حاضرات اور گنڈے تعویذ ہی کی فکر میں رہتیں تو میں اور بے چین ہو جاتی۔ سر کے درد کی دوا حکیم صاحب نے کچھ نہ دی۔ اتنی دیر بیٹھے رہے۔ قانونچہ بھر کا حال کہہ سنایا مگر درد سر کی دوا نہ بتائی۔ حکیم تو حاذق ہیں مگر بکتے بہت ہیں۔ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا کہ حکیم کے حکیم اور مصاحب کے مصاحب لیکن بلا کا مقرر آدمی ہے زبان رکتی ہی نہیں۔ تڑ پڑ۔ تڑ پڑ۔ اور لطف یہ کہ ایک لفظ بھی بے مطلب منہ سے نہیں نکلتا۔ ایسی مسلسل تقریر ہے کہ صلّ علیٰ۔

ان کے والد بزرگوار بھی بڑے نامی گرامی حکیم تھے۔

حسن آرا۔ ہاں فال میں کون شعر نکلا تھا؟

نواب۔ (ہنس کر) مضمون خیز شعر ہے ؎

روز ہجران و شب فرقت یار آخر شد
زدم این فال و گذشت اختر و کار آخر شد

حسن آرا۔ (مسکرا کر) اماں جان کے تو ہوش اُڑ گئے کہ اتنی بڑی لڑکی گئی ہاتھ سے۔

بہار۔ اللہ نہ کرے۔ کیا واہیات باتیں زبان سے نکالتی ہو۔

حسن آرا (ہنس کر) بہار النسا بہن وہ دیکھو جوڑا کھلا جاتا ہے۔

بہار۔ (تنک کر) خیر آپ کی بلا سے۔ ہم اپنے آپ سمجھ لیں گے، سوائے وہی چھیڑ ملخانی کے۔

بیگم۔ محمدی خانم۔ تم کل آنا اب مگر آنا ضرور۔

حسن آرا۔ (مسکرا کر) ضرور ضرور جن کا سایہ ہے جن کا۔

محمدی۔ اے بیوی میں نے پچاسوں باری کہا کہ جھٹپٹے میں دونوں وقت ملتے کوٹھے پر نہ جائیے۔

سپہر۔ بی مغلانی تم پر بھی کبھی کوئی جن عاشق ہوا ہے۔

محمدی۔ اے اب ہم پر کوئی مؤا کیا عاشق ہو گا۔ چونڈا سفید ہو گیا۔ سر ہلنے لگا۔ گالوں پر جھریاں پڑ گئیں۔ منہ پوپلا ہو گیا۔

اتنی ہی دیر میں حسن آرا پھر بے چین ہوئیں اور مارے درد سر کے تڑپنے لگیں۔ نواب صاحب کو اطلاع دی گئی۔ محمدی خانم پھر پردے میں بیٹھیں اور نواب صاحب تشریف لائے۔ حسن آرا نے کہا دولہا بھائی! میں تو ہلکان ہو گئی۔ اب اس وقت سر کا درد مارے ڈالتا ہے۔

نواب۔ درد سر کا علاج ڈاکٹروں کے پاس ہے حکیم بیچارے کیا جانیں میں ہسپتال سے ایک شیشی ابھی منگواتا ہوں۔ دیکھو

چٹکیوں میں درد سر جاتا رہے بات کرتے خدا کی قسم۔ نواب صاحب نے اسسٹنٹ سرجن کے پاس چٹھی بھیجی اور آدھ گھنٹے میں شیشی آئی۔

حسن آرا نے شیشی کی دوا سونگھی تو کوئی بیس منٹ میں کہا اب درد بہت کم ہو گیا۔

روح۔ یہ لٹکے ڈاکٹروں ہی کے ہیں۔ حکیم کیا جانیں بچارے!

بیگم۔ جب ڈاکٹر نہیں تھے تب تو کوئی بیمار ہو کے بچتا ہی نہ تھا۔

حسن آرا۔ اس سے کیا مطلب؟ یوں تو گاؤں میں برسوں حکیم کا گذر ہی نہیں ہوتا پھر کیا وہ لوگ بیمار ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ ایسا ہوتا تو کوئی گنوار نظر ہی نہ آتا۔

بیگم۔ چلو اچھا ڈاکٹر ہی اچھے سہی۔

شام کے وقت باغ سے باغبان ہٹا دیئے گئے اور پردہ ہو گیا۔ حسن آرا نے مسہری پہ وہیں آرام کیا۔ روح افزا اور بہار النسا اور سپہر آرا اور بڑی بیگم صاحب اور نواب صاحب کرسیوں پر متمکن ہوئے۔

حسن آرا۔ کیا فرحت ہے اس وقت۔ ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی آرہی ہیں اور پھولوں کی بھینی بھینی مہک مشام روح کو مست کرتی ہے۔

روح۔ یہ خوشبو روح افزا ہے۔

حسن آرا۔ (مسکرا کر) اخاہ۔ اب تو ہماری بہن بڑی زبان آور ہو گئی ہیں۔

بڑی بیگم صاحب جریب ٹیک کر باغ کی سیر کرنے لگیں۔ مغلانیاں اصیلیں ادب کے ساتھ ہمراہ۔ حضور یہ کیاری خوب سینچی گئی ہے۔ دیکھیئے یہ درخت میوے سے کیسا لدا ہے؟ اے بیگم صاحب اس چھوٹی موٹی کو بھی اللہ نے کیا بنایا ہے۔ ایں! واہ! اے واہ۔ ذری چھو لو بس اینٹھ گئیں۔

اتنے میں ایک روش کے قریب سانپ نکلا۔ مغلانیاں۔ اصیلیں بھاگیں۔ نواب صاحب دوڑ پڑے اور لکڑی لے کر سانپ کو مار ڈالا۔

بیگم۔ یہ سانپ نہیں تھا۔ یہ بلّیات میں سے ہے۔

رات کو محمدی خانم آئیں اور چپکے چپکے بیگم سے کچھ باتیں کر کے کہا کہ بس اب بلائیے۔ بڑی بیگم نے بہار النسا کو آواز دی۔ بہار النسا نے حسن آرا سے کہا کہ وہ اس وقت حاضرات کریں گی۔ تم ان باتوں کو مانو یا نہ مانو مگر اماں جان کا حکم تو نہ ٹالو۔ کہنا مان لو۔ تمہارا کیا ہرج ہے اس میں۔ حسن آرا نے کہا جو ہو ہم تو نہ مانیں گے۔ بہار النسا تنک مزاج تو تھی ہی تنک کر چلی گئیں۔

روح افزا اور سپہر آرا نے منت و خوشامد سے بہت سمجھایا کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ تم اپنے چپ بیٹھی رہنا چلو چھٹی ہوئی۔

روح۔ دولہا بھائی۔ محمدی خانم گھر میں آئی ہیں۔ اماں جان نے باجی کی زبانی کہلا بھیجا کہ حاضرات کریں گی۔ حسن آرا کو بھیجدو۔ اور یہ کہتی ہیں ہم نہ جائیں گے۔ آپ سمجھائیے انھیں۔

اتنے میں بہار النسا چھم چھم کرتی ہوئی پھر آئیں اور بڑی تیکھی ادا سے کہا۔ بس جب اس قدر کی خود رائی مزاج میں سمائی تو پھر کہنا اور سننا کیا۔ جو جی چاہے وہ کرو۔ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا افسوس ان بہنوں میں ایک یہی بے شعور ہیں۔ بہار النسا بہت تیکھی ہوئیں۔ چلیئے آپ کی بلا سے ہم بے شعور ہی سہی پھر کسی کو کیا۔ چاہیئے تھا کہ اس وقت حسن آرا کو سمجھاتے وہ سمجھاتا تو رہا چھپر پر اور پٹی پڑھاتے ہیں کہ نہ جانا۔ خیر نہ چلیں۔

حسن آرا۔ اچھا چلو صاحب چلیں۔

محمدی خانم نے کہا اے حسن آرا بیگم ذری غسل کر ڈالیے۔ صاف پاک ہو کر آئیے۔ حسن آرا سوچی کہ ابھی شام تک تو بخار میں پھنک رہی تھی، اس وقت نہاؤں تو چار دن تک چارپائی سے اٹھنا دوبھر ہو جائے۔ روح افزا نے حسن آرا سے کہا کہ بہن واسطے خدا کے کہیں نہانا وہانا نہیں۔ یہ تو دوانی ہو گئی ہیں۔ تم ان کے کہنے میں نہ جانا۔ سپہر آرا اور روح افزا اور حسن آرا نے باہم صلاح کی کہ نہائیں دھوئیں نہیں اور آن کر کہہ دیں کہ نہا چکے۔ سفید کپڑے بدل کر حسن آرا اپنی بہنوں کے ساتھ آئیں۔ محمدی خانم نے اُن کو ٹکٹکی کے سامنے بٹھایا۔ سوہے کی اوڑھنی اوڑھے ہوئے تھیں۔ سُرخا سُرخ مہین لباس اور اس پر عطر سہاگ کی بو باس۔ گلے میں بیلے کا طوق۔ ہاتھوں میں بیلے کے گجرے۔ کانوں میں پھولوں کی بجلیاں اور حلقے۔ سر پر بہت گھنا چھپکا۔ قادر پھول والے کے ہاتھ کا بنا ہوا۔ اس ٹھاٹھ سے حسن آرا بیگم آئیں۔ اس گلبدن نے جو پھولوں کا گہنا پہنا تو کھل گئی۔ ازراہِ مذاق ہنستے ہنستے کہا کہ میرے دونوں شانے بھاری معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر عمداً ایک بار انگڑائی لی۔ روح افزا یہ کیفیت دیکھ کر ہنس پڑی۔

بہار۔ دیکھنا نہ۔

حسن آرا نے سر نیچا کر کے ذرا دو منٹ تک سکوت کیا۔

محمدی خانم آن کر بیٹھیں۔ ایک ٹوکری میں مٹھائی رکھی گئی۔ پنج میل[1] کوری رکابی میں پان دسا دری۔ تاکید کر دی تھی کہ تنبول نے قینچی نہ لگائی ہو۔ پاؤں پر چنبیلی کے پھول رکھے تھے اور پھولوں پر دو سینکیں عطر کی۔ محمدی خانم نے چھوٹی مٹی سے زمین کو لیپا تھا۔ اس پر لوبان جلایا، ایک طرف عطر عروس کی شیشی اور دوسری جانب حنا کے تیل کی کُپی صفائی کے ساتھ پنی سے منی ہوئی۔ گوٹے سے منہ بندھا اور پھُندنا سُرخا سُرخ لٹکا ہوا تھا۔ ایک سمت کلاؤں کی لچھی دو کوری کلھیاں اس پر دو کورے سکورے رکھے ہوئے حسن آرا بیگم کھارو ے کی لُنگی پر بٹھائی گئیں۔ محمدی خانم نے ماش ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھنا شروع کیا اور ایک دفعہ ہی منہ کے قریب لے جا کر اور دم کر کے سر پر کھینچ مارے اور کہا کہ (حاضر شو بر سر ایں حسن آرا ہر کہ سحر باشد ہر کہ جادو باشد یا پری باشد کہ سایہ باشد بر سر ایں حاضر شود و جواب گوید) حسن آرا کو بے اختیار ہنسی آئی۔

حسن آرا۔ چہ خوش چہ انباشد۔

روح۔ جواب گوید۔ جواب گوید۔

تھوڑی دیر میں حسن آرا نے گردن ہلا کر محمدی خانم کو ایک ٹکر دی۔ محمدی خانم چیخ کر بھاگیں اور ادھر روح افزا اور بہار النسا نے ہنسی کو ضبط کیا۔

محمدی۔ دیکھو ہم تو کہتے تھے وہی ہوا نہ آخر۔

حسن آرا (مسکرا کر) حاضر شود۔ حاضر شود۔

روح۔ (قہقہہ لگا کر) ہر کہ باشد۔ ہر کہ باشد۔

حسن آرا (ہنس کر) سایہ باشد یا پری باشد۔ اُف بہن مارے ہنسی کے بُرا حال ہے۔

نواب (زینے کے پاس سے) کہو کیا حال ہے؟

روح۔ اچھا حال ہے۔ حاضر شود۔ جواب گوید۔ اُف خوب (خوب زور سے قہقہہ لگا کر) آتے ادھر آتے ہی ایک ایسی ٹکر

---

[1] نئی

دی کہ محمدی خانم بیس قدم کے فاصلے پر بھاگیں، اب سامنے آتے ڈرتی ہیں۔

روح افزا اور بہار النسا اور سپہر آرا خوب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ بڑی بیگم بھی مسکرائیں، مگر ہاں محمدی خانم البتہ دل ہی دل میں حسن آرا کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ جس وقت حسن آرا نے ٹکر دی تھی گو چوٹ تو بہت آئی تھی مگر محمدی خانم کھل گئی تھیں کہ مار لیا ہے۔ لیکن قہقہہ پڑتے ہی دھک سے رہ گئیں۔ ارے یہ تو ان لڑکیوں نے مل کے بنا ڈالا۔ ہم کیا سمجھے اور ہوا کیا!

محمدی خانم نے کہا کہ اچھا اب ہم اور تدبیر کریں گے۔ یہ کہہ کر پندرہ کا نقش ایک کاغذ پر لکھا:۔

پندرہ کا نقش

۸	۱	۶
۳	۵	۷
۴	۹	۲

روح افزا اور سپہر آرا نے حسن آرا بیگم کو پٹی پڑھائی کہ اب کی تھوڑی دیر جھوم جھام کر ایک دفعہ محمدی خانم کو ایسی ٹکر دو کہ ذرا کچھ دن سینکیں۔ یہ نقش حسن آرا کو دیا گیا۔ محمدی خانم نے کہا اس کے سوراخ سے چراغ کو دیکھو۔ دیکھتے ہی حسن آرا جھومنے لگی۔ محمدی خانم نے پوچھا تم کون ہو؟

حسن آرا۔ (جھومتی ہوئی) تم خود کون ہو۔ عورت ذات اور حاضرات۔

محمدی۔ اِن کو آپ کیوں ستاتے ہو؟

حسن آرا۔ ہم ان پر عاشق[1] ہیں۔

محمدی۔ ان کو چھوڑ دیجئے۔

حسن۔ (خوب جھوم کر) کبھی نہ چھوڑیں گے، ہرگز نہ چھوڑیں گے۔

محمدی۔ ان سے کیا خطا ہوئی ؟

حسن۔ یہ حسین ہیں۔ جوان ہیں۔ پری چہرہ ہیں۔ رنگین ہیں۔

یہ لفظ زبان سے ادا کرتے ہوئے حسن آرا لجاتی تھی اور محمدی خانم جامے میں پھولے نہیں سماتی تھی۔

محمدی۔ ان کو آپ نے کہاں دیکھا؟

حسن۔ دونوں وقت ملتے ہماری سواری نکلی تو ہم نے دیکھا کہ ایک ماہر دکمسن عورت لب بام نکھر کر کھڑی ہے۔ عطر کی خوشبو سے ہم مست ہو گئے۔

محمدی۔ لاؤ فلیتہ[2]۔

بیگم۔ فلیتہ لاؤ۔

بہار۔ اے مغلانی وہ فتیلہ اُٹھا دو۔

---

[1] یہ گویا حسن آرا کی زبان سے جن بول رہا ہے۔ [2] بتی۔

حسن۔ (کھلکھلا کر) امی جان بندگی۔ یہ فلیتہ کیا ہوگا؟

روح۔ خانم صاحب سلام۔

سپہر۔ چلو بس حاضرات داضرات سے فراغت پائی۔

محمدی خانم سخت خفیف ہوئیں اور جھلا کر بولیں کہ اک ذری او تامل کیجیئے۔ بڑی بیگم لڑکیوں پر بہت خفا ہوئیں، واہ ہر بات میں خودرائی اچھی نہیں ہوتی۔ کوئی اپنے گھر آئے تو اس کی خاطر کرنا چاہیئے یا ہنسنا چاہیئے اس کو۔ ہمیں یہ بیہودگی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ حسن آرا اور روح افزا خاموش ہو رہیں۔ مگر سپہر آرا نے شیریں ادائی کے ساتھ کہا کہ اماں جان آپ کا حکم تو باجی جان بجالائیں مگر ہمیں ہنسی آئے گی تو ہم ضرور ضرور ہنسیں گے۔ بی مغلانی بولیں۔ اے تم جم جم ہنسو ہنسی کو کون منع کرتا ہے۔ ہنستے ہی ہنستے گھر بستے ہیں مگر کہنا ایک دفعہ اور مان لو۔

محمدی خانم تو اُٹھ کے چل دیں، مگر یہاں بارہ بجے رات تک حاضرات ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ خوب قہقہے پڑے۔ حسن آرا اور روح افزا اور سپہر آرا اور نواب صاحب ایک طرف تھے اور بڑی بیگم اور بہار النسا اُن کی رائے کے خلاف۔ حسن آرا نے کہا اماں جان خاتون جنت کی قسم جو ہمیں ذرا بھی کچھ معلوم ہوتا ہو کہ کوئی سر پہ آیا ہے اور پھولوں کا گہنا پہن کر جو ہم نے کہا کہ شانے بھاری معلوم ہوتے ہیں، وہ تو فقط محمدی خانم کے چھیڑنے کو تھا۔

سویرے منہ اندھیرے سپہر آرا خوابِ ناز سے بیدار ہوئیں تو حسب معمول روح افزا بیگم اور حسن آرا بیگم کو جگایا۔ روح افزا بسم اللہ کرکے اٹھ بیٹھیں۔ مگر حسن آرا کی کیفیت دگرگوں پائی۔ تپ شدید۔ ضعف انتہا کا۔ تشنگی کا غلبہ۔ لب خشک۔ تالو میں کانٹے پڑے ہوئے۔ بے چینی اُس دن سے بھی زیادہ۔ بات کرنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ آواز سے نقاہت صاف برستی تھی۔ روح افزا اور سپہر آرا تھوڑی دیر تک پلنگ کے پاس سرہانے بیٹھی رہیں کہ اتنے میں مؤذن کی آواز آئی۔ دونوں نے اُٹھ کر نماز صبح پڑھی۔ نماز سے فراغت پائی ہی تھی کہ بہار النسا بیگم تشریف لائیں۔

روح۔ باجی آج حسن آرا کل سے بھی زیادہ بے چین ہیں۔

بہار۔ کیوں کیوں؟

روح۔ پنڈے پر ہاتھ رکھو تو معلوم ہوتا ہے جیسے پھنک گیا۔ اس قدر گرم ہے۔

بہار۔ پھر شگوفہ لائیں۔

سپہر۔ کل جاگی بھی دیر تک تھیں۔

بہار النسا نے نبض پر ہاتھ رکھا تو تپ شدید۔ حسن آرا بیگم آہستہ سے بولیں۔ باجی آج تو مارے ضعف اور پیاس کے ناک میں دم آگیا۔

بہار النسا نے پیاری سے کہا (پیاری جا کے اُن کو تو جگا لا) پیاری نے نواب صاحب کو جگایا۔ اُٹھیے چلیئے آپ کو بلاتی ہیں۔ نواب صاحب انگڑائی لیتے ہوئے اُٹھے۔ پوچھا کیوں خیریت تو ہے۔ پیاری نے کہا۔ جی آج بھی ماندی ہو گئیں۔ نواب صاحب نے اُٹھ کر منہ دھویا اور تشریف لائے۔ حسن آرا بیگم اپنی نازک پلنگڑی پر لیٹی ہوئی بہار النسا سے کہہ رہی تھیں کہ ذری ذری سردی سی معلوم ہوتی ہے۔ کچھ اُڑھا دیجیئے۔ اتنے میں نواب صاحب کی جو آمد آمد سنی اور پیاری نے آن کر کہا کہ آتے ہیں، تو حسن آرا بیگم نے اپنا ڈوپٹہ پائجامہ سنبھالا۔ اس وقت سر کے بال بکھرے ہوئے کچھ کچھ سرہانے کے اِدھر اُدھر لٹک رہے تھے اور ڈوپٹا

کھسک کر سینے کے نیچے آگیا تھا۔ روح افزا نے ایک دولائی اُڑھا دی۔ اور حسن آرا نے سر کو دوپٹے سے ڈھانپ لیا۔ نواب صاحب تشریف لائے۔

بہار۔ اے آج پھر رنگ لائیں۔

نواب۔ لاحول ولا قوۃ۔ کل کچھ بے احتیاطی تو نہیں ہوئی تھی؟

روح۔ رات بارہ بجے سوئی تھیں۔ مگر روز دس گیارہ بجے تو یوں بھی سوتی تھیں۔

اتنے میں بڑی بیگم صاحب کو بھی کسی نے خبر دی۔ اولاد کی محبت۔ بیتاب و مضطر ہو کر جریب ٹیکتی ہوئی آئیں۔ نواب صاحب اور بہارالنسا بیگم اور روح افزا اور سپہر آرا سب نے جھک کر ادب کے ساتھ آداب عرض کیا۔ بڑی بیگم نے حسن آرا کی پیشانی نورانی پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اللہ اس وقت تو میرا ہاتھ جلا جاتا ہے، کیا رات بھی بنڈا پھیکا تھا؟

سپہر۔ جی نہیں۔ جب بارہ کا گجر بجا ٹھن ٹھن تب تک باتیں کرتی تھیں، خاصی اچھی تھیں۔

بڑی بیگم نے اُس وقت کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ صدقہ بھی اُتارا۔ قرآن کی ہوا بھی دی۔ منت بھی مانی کہ یہ اچھی ہو جائیں تو مسجد میں گھی کے چراغ جلاؤں۔

نواب صاحب پھر حکیم کو بُلا لائے۔ الغرض دس دن تک حکیم صاحب کا علاج ہوا مگر افاقہ نہ ہوا۔ گیارھویں روز ڈاکٹر صاحب بُلائے گئے، چھ دن تک وہ معالج رہے۔ بعدازاں صاحب سول سرجن اور اسسٹنٹ سرجن دونوں کی صلاح و اتفاق رائے سے معالجہ ہوا تو سوا مہینے میں حسن آرا بیگم نے آرام پایا۔

سول سرجن نے صلاح دی کہ تغیر آب و ہوا ازبس ضروری ہے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے کے لیے بیگم صاحب کو کہیں اور لے جائیے۔

روح۔ اماں جان ڈاکٹر کہہ گئے ہیں کہ ــــــــ

بیگم۔ ہاں یہاں تو اب مہینا دو مہینا نہ رہنا چاہیئے۔

نواب۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو اپنے ہاں لے جاؤں۔ وہاں ایک مکان خالی ہے اس میں رہا کریں۔

اس حیص بیص اور مشورے میں دو دن گذر گئے۔ اور سب تو راضی تھے مگر بڑی بیگم کی مرضی نہ تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ اگر بہارالنسا کی ساس سے ان سے بنتی ہوتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ تیسرے دن نواب صاحب بہارالنسا بیگم کو لے کر بڑی بیگم سے رخصت ہوئے اور چلے گئے صبح کو تو نواب صاحب اور بہارالنسا رخصت ہوئے اور شام کو حسن آرا کی طبیعت پھر ناساز ہو گئی۔ ۱۱ بجے دن تک یوں ہی سی حرارت تھی، مگر بارہ بجے سے شدید تپ چڑھی یہاں تک کہ ہذیان بکنے لگیں اور کئی بار ٹٹی پر ہمردے دے مارا۔ اب سنیئے حسن آرا کی تو یہ کیفیت اور مینہ کہتا تھا کہ آج ہی برسوں گا۔ وہ موسلادھار برسا کہ چار گھنٹے کامل پرنالے چلا کیے رات ایسی تیرہ و تار کہ الامان بجلی کا بار بار کوندنا اور بھی ستم ڈھاتا تھا اور رعد اس زور سے گرجتا تھا کہ کان کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ اب فرمائیے ڈاکٹر کو کون بلائے اور حکیم کے ہاں کون جائے۔ بڑی بیگم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

حسن آرا۔ اُف اماں جان ذرا ہاتھ تو دو۔

بیگم۔ (ہاتھ دیکر) افوہ۔ کیسا جل رہا ہے۔

سپہر آرا نے اپنی پیاری بہن کی جو یہ حالت دیکھی تو آبدیدہ ہو گئی۔

روح افزا سناتے ہیں کہ بار بار بخار آنا اچھا نہیں۔ بڑی بیگم کو اب کلی یقین ہو گیا کہ اس سایہ کا اتارنا محمد خانم سے محال ہے اس کے لیے کوئی بڑا عامل چاہیئے۔ سوچیں کہ کل استانی جی کو بلاؤں گی۔ دو دن کا اقرار کر گئیں اور آج تک نہ آئیں۔ کوئی خاص وجہ ضرور ہوئی ہو گی۔ سویرے ہی آدمی بھیجوں گی تڑکے گجر دم ساتے میں حسن آرا نے جو کئی بار ہچکیاں لیں تو بڑی بیگم نے حال تباہ کیا۔ اور کونے میں جا کر خوب روئیں۔ سپہر آرا پلنگ کے پاس بیٹھی ہوئی مایوسی کے ساتھ اپنی بہن کی حالت دیکھتی تھی۔ روح افزا حسرت سے تکتی تھی۔ مغلانیاں اصیلیں دم بخود کھڑی تھیں۔ کمرے میں کئی لمپ روشن تھے مگر ہوا جو زناٹے کی چلتی تھی تو گل ہو ہو جاتے تھے۔ بڑی بیگم بار بار آن کر پیشانی اور سینے اور نبض اور تلوؤں کو دیکھتی تھیں اور آبدیدہ ہو جاتی تھیں۔ جب حالت نہایت بیقراری کی دیکھی تو سمجھ گئیں کہ حسن آرا ہماری آس توڑ کر دغا دیے جاتی ہیں۔ ایک عورت نے بڑی بیگم سے کہا کہ حضور اب چاہے مینہ برسے چاہے کہیں بجلی گرے حکیم صاحب کے پاس آدمی ضرور بھیجیئے۔

بیگم۔ مغلانی بتاؤ اب میں کیا کروں؟

مغلانی۔ حضور اللہ کرے ان کی آئی ہوئی ہم سب کو لگ جائے۔ اللہ ان کو بچا لے۔

حسن آرا۔ (سر پر ہاتھ دھر کے) اُف اللہ میں اسی دم مر جاؤں۔

روح۔ اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے یہ باتیں نہ کرو بہن۔

حسن آرا۔ روح افزا بہن۔ ہے ہے میرا تو دم گھٹتا جاتا ہے۔

سحر کاذب کے وقت مینہ تھما۔ تب بڑی بیگم کو معلوم ہوا کہ ایک سائیس اور ایک گھوڑا بجلی کی نذر ہوا۔ گھوڑے کے مرنے کا کمال افسوس کیا۔ یہ گھوڑا ان کے شوہر کی خاص سواری کا تھا۔ اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور گویا پنشن پاتا تھا صبح کو حسن آرا کی طبیعت ذرا ٹھہری یہاں تک کہ نماز صبح بھی ادا کی۔ دفعتہً بڑی بیگم کو بہار النسا یاد آئیں۔ مغلانی سے کہا کہ یہ مینہ تو عالمگیر تھا خدا جانے کس قدر فاصلے تک برسا ہو گا۔ خورشید اور بہار النسا نے راہ میں بڑی تکلیف اُٹھائی ہو گی۔ ہم اپنے گھر میں تھے لیکن کلیجا منہ کو آتا ہے۔ دل ہاتھوں اچھلتا ہے۔ ان کی سفر میں کیا حالت ہوئی ہو گی۔ مغلانی نے سمجھایا کہ حضور ریل کی سواری کچھ چھکڑے کی سواری تو ہے نہیں کہ خدانخواستہ کچھ خوف کی جگہ ہو۔ حضور ہیں۔ بہار النسا بیگم ہیں۔ دو عورتیں خدمت کے لیے ساتھ ہیں۔ چار سپاہی ہیں۔ خدمتگار ہے۔ اتنے آدمی ہیں پھر ڈر کیا ہے۔ بڑی بیگم نے کہا یہ سب ایک ہی درجہ میں تھوڑا ہی بیٹھے ہوں گے۔ لوگ کہتے ہیں ریل میں درجے بنے ہوتے ہیں۔ مغلانی بولی پھر کیا ہوا۔ حضور اور بیگم اور دونوں عورتیں تو ایک ہی جگہ پر ہوں گی۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ اللہ مالک ہے۔ وہ بڑا کریم ہے اور حضور خدا جانے ریل اس وقت کتنے اسٹیشن نکل گئی ہو۔

نو بجے کے وقت حکیم صاحب تشریف لائے۔ پردہ کیا گیا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی حال پوچھا نسخہ لکھا اور کہہ گئے کہ کل صبح پھر حاضر ہوں گا مگر شب کو پھر تپ آ گئی اور بے چینی اُس روز سے بھی زیادہ ہوئی۔ اسی طور پر ایک ہفتہ گذرا اس عرصہ میں نواب صاحب کے تین خط آئے۔ بڑی بیگم کو تشفی ہوئی کہ نواب اور بہار النسا مع الخیر اپنے گھر پہنچ گئے۔

روح افزا اور سپہر آرا نے باہم مشورہ کر کے نواب صاحب کے نام خط لکھا کہ حسن آرا کی طبیعت روز بروز بے لطف ہوتی جاتی ہے۔ حکیم صاحب کے معالجے سے ذرا افاقہ نہ ہوا اور ڈاکٹر کا علاج بھی سوا مہینے تک کیا تھا مگر پھر بخار آ گیا۔ اب ہم سب کی صلاح یہی ہے کہ آپ اس خط کے دیکھتے ہی یہاں آئیں اور ہم سب کو وہاں لے جائیں۔ تاکہ ڈاکٹر کی صلاح کے مطابق تغیر آب و ہوا ہو اور حکیم جی کی بھی یہی صلاح ہے۔

یہ خط نواب صاحب نے پڑھ کر بہار النسا بیگم کو سنا دیا۔ انھوں نے کہا کہ جاؤ اور جس طرح ممکن ہو سمجھا بجھا کر لے ہی آؤ۔

جس وقت مہری نے جا کر خبر دی کہ نواب صاحب آئے ہیں۔ روح افزا اور سپہر آرا ایسی خوش ہوئیں کہ عمر بھر میں شاید دو ہی تین مرتبہ اس درجہ محظوظ ہوئی ہوں گی۔ بڑی بیگم کو بھی تشفی ہوئی اور نواب صاحب کمرے میں داخل ہی ہوئے تھے کہ حسن آرا نے کہا کہ لو اب ہم اچھے ہو گئے۔ نواب صاحب نے بڑی بیگم کو با ادب سلام کیا اور بیٹھے۔

روح ۔ دولھا بھائی ان کی تو یہ کیفیت ہے کہ دم بھر چین نہیں۔ بخار الگ۔ ضعف الگ۔ پیاس کے مارے ہونٹھ بالکل کانٹا ہوئے جاتے تھے اور تڑپتی جاتی تھیں اور اُدھر مینہ کہے کہ میں آج ہی برسوں گا۔ اور بجلی ایسے لوکے ایسی چمکے کہ الٰہی توبہ اصطبل پر گری تو کلیجہ دہل گیا۔ دروازے بند تھے مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی توڑے پھینکے دیتا ہے۔ اسی بیچ بھونچال بھی آیا۔ اف ہم سب گھبرا اٹھے تھے۔

بڑی بیگم صاحب نے نواب نامدار کے لیے کچھ ولایتی انار اور کشمش اور پستہ بھیجا۔ مغلانی نے آن کر کہا کہ حضور چائے بھی تیار ہے لاؤں۔ نواب صاحب نے کہا نہیں۔ اب اس وقت نہیں شام کو۔ روح افزا بیگم نے پوچھا۔ دولھا بھائی وہاں جائیں گے تو رہیں گے کہاں؟ نواب صاحب تو پہلے ہی سے بندوبست کر چکے تھے۔ کہا کہ ہم کو اس کا خود ہی خیال تھا۔ پڑوس میں ایک صاف ستھری اور وسیع کوٹھی ہے۔ اس کو آراستہ کر دیا ہے نہایت دلچسپ مقام ہے۔ ایک مہینے میں آرام ہو جائے گا انشاء اللہ! ڈاکٹر سب دوست ہیں اور اگر بڑی بیگم صاحب اصرار کریں گی تو حکیم صاحب کا علاج بھی ہوگا۔ وہاں ایک سے ایک بڑھ کر حکیم ہے۔

بڑی بیگم کو یقین واثق ہو گیا تھا کہ اگر حسن آرا چند سے اور اسی طرح علیل رہی تو آنکھیں چھت سے لگ جائیں گی اور پھر کسی طبیب کا بس نہ چل سکے گا۔ لہٰذا انھوں نے منظور کر لیا کہ حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا کو لے کر ایک مہینے کے لیے وہاں جا کے رہیں۔ بہار النسا اور روح افزا دونوں کی سسرال وہیں تھی۔ نواب صاحب سے انھوں نے کہہ دیا کہ یہ صلاح مجھے پسند ہے۔ دوسرے روز روح افزا اور حسن آرا اور سپہر آرا اور بڑی بیگم اور مغلانی اور کئی پیش خدمتیں اور نوکر چاکر نواب صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے۔ نواب صاحب نے پورا درجہ کرایہ پر لیا اور بردہ باندھ کر ایک طرف اور سب نوکر بیٹھے اور دوسری طرف یہ سب کو لے کر بیٹھے۔

کانسل کی عنایت اور قسطنطنیہ کی زیارت

اب سنیئے کہ میاں آزاد کا نام دور دور تک مشہور ہو گیا تھا جس اخبار کو کھولو جس میگزین کو پڑھو آزاد ہی آزاد کا ذکر خیر ہے۔ اسکندریہ کے ایک ہوٹل میں میاں آزاد مع خوجی کے فروکش ہوئے۔ کھانا کھانے کا وقت آیا تو خوجی تنک لائے۔

خوجی - لاحول ولا قوۃ۔ یہاں کھانے والے کی اپنے حساب ایسی تیسی۔ ہم کوئی بات خلاف شرع نہ کریں گے۔ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ ذرا سی تکلیف کے لیے ہم اپنا مذہب نہ دیں گے۔ آپ شوق سے جائیں اور مزے مزے کھائیں، ہم درگذرے۔

آزاد - اور افیم کھانا خلاف شرع نہیں ہے۔

خوجی - ہرگز نہیں، اور اگر ہے بھی تو کیا فرض ہے کہ ایک امر خلاف شرع کریں تو کل امور خلاف شرع ہی کریں؟

آزاد - ابے نامعقول یہ کس گدھے نے تجھ سے کہا کہ یہاں کھانا کھانا شرع کے خلاف ہے؟ میز کرسی دیکھی اور بک اُٹھے کہ شرع کے خلاف - اگر لحم خوک یا شراب ہو تو خیر ہم کہیں خلاف شرع ہے۔ اس میں کیا ہے صاف ستھرا انتظام مسلمان پکانے والے مگر خبط کا کیا علاج ہے۔

خوجی - جی وہ خبط ہی سہی آپ رہنے دیجئیے۔ ہونہہ!!

آزاد - ہونہہ! ہونہہ کیا معنی۔ کھانا کھاؤ نہیں تو جہنم میں جاؤ۔

خوجی - جہنم میں وہ جائیں گے جو یہاں کھانا کھائیں گے اور اینجانب سیدھے بہشت میں دندنائیں گے۔

آزاد - جی اس میں کیا شک ہے۔ اور وہاں افیم کہاں سے آئے گی؟

خوجی - ہم کسی نانبائی کی دکان پر کباب اور روٹی یا باقرخانی اور گوشت یا پلاؤ مول لے کے کھائیں گے۔ مسلمان ہی کا ملک ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دو ترک آئے اور اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر مزے سے کھانے لگے۔ آزاد کی چڑھ بنی۔ پوچھا خواجہ بدیع صاحب مزاج مقطع۔ بول گیدی اب شرمایا یا نہیں۔ کیا اب بھی وہی دم خم ہیں۔ جھینپو جھینپو مجھ سے نہ کہو۔ دل میں ذرا شرماؤ - پھٹے سے منہ۔

خوجی نے پہلے تو کہا کہ یہ مسلمان نہیں ہیں۔ پھر کہا شاید ہوں کوئی ایسے ویسے۔ آزاد نے کہا ایسے ویسے نہیں۔ خاص الخاص ترک ہیں۔ اور روم میں سب میز کرسی پر نصاریٰ کے ساتھ کھاتے ہیں۔ خوجی کو اب تک اس بات کا یقین نہ آیا۔ غور سے دیکھا کیے۔ کہا شراب ان لوگوں نے نہیں مانگی۔ ذرا ان سے پر و بال تو ملاؤں۔

خوجی - (ترکوں کے پاس جا کر) کیوں حضرت آپ کا نام کیا ہے؟

ایک ترک - احمد آفندی۔

خوجی - اور آپ کا اسم شریف؟

دوسرا ترکی۔ عبدالصمد۔
خوجی۔ دولت خانہ؟
ایک۔ خاص استنبول۔
خوجی۔ اور آپ؟
دوسرا۔ میں اڈریانوپل کا باشندہ ہوں۔ مگر دس بارہ برس سے سفر میں ہوں۔ ہندوستان میں دو برس رہا۔ کلکتہ گیا، بمبئی، لاہور، دہلی اور چین میں رہا اور عدن میں رہا۔ فرانس گیا، انگلستان میں چھ مہینے رہا۔
خوجی۔ آپ لوگ یہاں ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں؟
احمد۔ برابر۔
خوجی۔ شرع کے خلاف نہیں ہے؟
عبدالصمد۔ شرع کے خلاف؟ واہ۔ شرع کے خلاف کیوں؟
احمد۔ آپ کا اسم شریف؟
آزاد۔ میاں آزاد۔

احمد آفندی اور عبدالصمد دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مصافحہ کیا اور کہا آخاہ میاں آزاد تخلص ہو؟

آزاد۔ آپ کہاں سے جانتے ہیں مجھے؟
عبدالصمد۔ آپ شہرۂ آفاق ہیں۔
خوجی (آہستہ سے) شیطان کے بڑے بھائی یہی تو ہیں۔
احمد۔ آپ کا بڑا نام ہے۔
عبدالصمد۔ آپ چل کر ہمارے ملک کے کانسل سے تو ملیئے۔ وہ بھی آپ کے نام نامی سے واقف ہو گئے ہیں۔ ضرور چلیئے۔
آزاد۔ حاضر ہوں مگر رسائی وہاں تک محال ہے۔
عبدالصمد۔ آپ کے لیے اور رسائی کی ضرورت۔ آپ کا نام نیک ایسا مشہور ہے کہ جہاں چاہے چلے جائیے بے جھجک ہم آپ کو لے چلیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد آزاد نے کپڑے بدلے اور ان دونوں روسائے ٹرکی کے ہمرکاب کانسل سلطنت روم کی خدمت میں مستفید ہونے چلے۔ آزاد نے اثنائے راہ میں کہا کہ گو میں نے ہندوستان میں ہر قسم کی تعلیم پائی ہے اور ان امور کو خوب سمجھ سکتا ہوں لیکن پھر بھی اگر کوئی خاص طرز ملاقات ہو تو اطلاع دیجئیے۔ احمد آفندی نے بیان کیا کہ کانسل ممدوح بڑے سادہ مزاج آدمی ہیں۔ آپ چاہے سلام بھی نہ کریں ان کو اس کی کچھ پروا نہیں۔ وہ خود ایک دن آپ کا تذکرہ کرتے تھے۔

میاں آزاد جو وہاں پہنچے اور احمد آفندی نے جاتے ہی کہا (میاں آزاد آپ ہی ہیں) تو کانسل ممدوح نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا اور پوچھا آپ عربی بول سکتے ہیں؟ میاں آزاد نے عربی میں جواب دیا۔

کانسل۔ آپ کی ملاقات سے ہم بہت خوش ہوئے۔
آزاد۔ عنایت، بندہ پروری

کانسل۔ جزیرۂ پیرم کے پاس آپ کا جہاز غرق ہو گیا تھا؟

آزاد۔ جی ہاں۔

کانسل۔ ہم نے تار میں پڑھا تھا۔

آزاد۔ تقدیر میں تباہی آئی۔

کانسل۔ آپ کی بڑی تعریف ہے۔ اب آپ کب جائیں گے؟

آزاد۔ بہت جلد۔ اب جنگ کا کیا حال ہے؟

کانسل۔ اب روس نے اشتہار جنگ دیدیا ہے۔ دریائے پرتھ سے روسی لشکر عبور کرتا ہے اور ہماری باٹری اکثر مقامات پر اُن پر آگ برساتی ہے خصوصاً اُڈلیسہ کے پاس۔

آزاد۔ اُف جی چاہتا ہے فوراً پہنچوں۔ اب ایک منٹ کا قیام بھی شاق گذرتا ہے۔

احمد آفندی اور عبدالصمد شام کے وقت میاں آزاد کو اسکندریہ کی سیر کے لیے لے گئے۔ اس شہر میں میاں آزاد نے یورپ اور ایشیا کے مختلف اقوام کے لوگ دیکھے۔ ٹرکی کے افسران اعلیٰ اور قسطنطنیہ کے عمائد اور رؤسا جو وہاں تشریف رکھتے تھے ان کی خدمات ہمایوں میں بھی میاں آزاد نے نیاز حاصل کیا۔ اور جو شخص ان سے ملا تپاک ہی کے ساتھ پیش آیا۔

حضرت خواجہ بدیع صاحب کو میاں آزاد ہوٹل ہی میں چھوڑ گئے۔

خوجی سوچے کہ بیٹھے بیٹھے مکھیاں کب تک مارا کریں گے۔ دیکھیں کوئی ہندوستانی بھائی ہوں تو گپیں اڑائیں۔ اِدھر اُدھر ٹہلے آخرکار ایک ہندوستانی سے ملاقات ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ خواجہ صاحب نے پوچھا۔ کیوں بھئی اسکندریہ میں افیم ملتی ہے؟ کوئی چانڈو خانہ ہے؟ کہیں مدک اُڑتی ہے؟ ایک دم سے تین چار سوال کیے اور اس بیچارے کو دم بھی نہ لینے دیا۔ وہ ان کے بھی استاد نکلے۔ کسی بات کا جواب ہی نہ دیا۔ خوجی تیکھے آدمی۔ ان کو بھلا یہ تاب کہاں کہ کسی سے سوال کریں اور وہ جواب نہ دے۔ بگڑ کھڑے ہوئے۔ قسم خدا پاک کی بس اس وقت لاش پھڑکتی ہوتی۔ واللہ لاش پھڑکتی ہوتی۔ ہو نہ خواجہ بدیع کو کیا وہ سمجھے ہیں۔ نہ ہوئی قرولی ورنہ تماشا دکھا دیتا۔ انھوں نے جو اس قدر وحشت کی لی تو وہ بیچارا سمجھا کہ یہ پاگل ہے۔ اگر بولوں گا تو خدا جانے کاٹ کھائے۔ چکت دے، چوٹ کرے، لڑ پڑے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ چپکے ہو رہو۔ اس کے سکوت سے میاں خوجی سمجھے کہ دب نکلا۔ اور بھی اکڑ گئے۔ اس نے جو اس دیوانے کو اکڑتے دیکھا تو سمجھا کہ اب چوٹ کیا ہی چاہتا ہے ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ پیچھے ہٹنا تھا کہ میاں خوجی اور بھی شیر ہو گئے۔ مگر کندے تول تول کر رہ جاتے تھے۔ پوچھا بھلا ٹھنڈا پانی بھی یہاں مل سکتا ہے۔ مگر اس قدر سرد ہو کہ دانتوں میں لگے۔ وہ جھٹ پٹ آب سرد لایا۔ خوجی نے پیا تو آب حیات کا مزہ پایا۔ پانی ہے یا آب زندگانی ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟

اللہ اللہ۔ اب میاں خوجی اپنے وقت کے بادشاہ ہو گئے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟ اُف ری تیری سخاوت۔ اس آدمی کو اور بھی یقین ہو گیا کہ اس شخص کو خلل دماغ ضرور ہے۔ حالت تو اس درجہ ردی ہے اور حاتم کی قبر پر لات مارنے کو مستعد ہیں۔ اس سے مانگوں تو کیا مانگوں۔ اس کے پلّے ٹکا تو ہے نہیں۔ خوجی نے پھر اکڑ کر کہا کہ مانگ کچھ۔ جو جی چاہے سو مانگ۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا جو ہاتھ میں ہے دے دیجیئے۔ خوجی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ارے غضب۔ او ظالم۔ خدا تم سے سمجھے۔ جان تک مانگتا تو میں دریغ نہ کرتا، چنیا بیگم نہیں دی جاتی۔ اس کو اگر اتنا معلوم ہو جاتا کہ حضرت خواجہ صاحب کے دست مبارک میں افیم ہے اور افیم پر حضرت ہزار جان سے عاشق ہیں تو کچھ اور مانگتا۔ مگر شامت اعمال پھر خوجی تنتے ہوئے بولے۔ ؎

جو جا ہے سو مانگ آتش درگاہ الٰہی سے
محروم کبھی پھرتے دیکھا نہیں سائل کو

اُس شخص سے پوچھا کہ تم یہاں کب سے ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟ نام کیا ہے؟ باشندے کس صوبے کے ہو؟ اس نے جواب دیا حضرت میں یہاں ہوٹل میں نوکر ہوں۔ میرا نام تہور خاں ہے۔ امروہہ کا رہنے والا ہوں۔

خوجی۔ اخاہ۔ یہ امروہہ۔ یہی امروہہ نہ۔

تہور خاں (تہور) یہ کون؟

خوجی۔ (جھلا کر) اجی یہی۔ لاحول۔ مراد آباد کے پاس جو ہے۔

تہور۔ جی ہاں۔

خوجی۔ یہاں کب سے ہو؟

تہور۔ ابی سینیا کی لڑائی کے وقت سے۔

خوجی۔ بھلا اس ہوٹل میں مسلمان لوگ کھاتے ہیں؟

تہور۔ برابر۔ کیوں؟

خوجی۔ ہم تو نہ کھائیں۔

تہور۔ پہلے میں سمجھا تھا کہ آپ کوئی پاگل ہیں، مگر اب تشفی ہوئی۔

خوجی نے وہ مجنونانہ حرکتیں کیں کہ ہوٹل والوں کو دل لگی ہاتھ آئی۔ بگڑے دل تو ہر شہر اور ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ دو ایک دل لگی بازوں نے مسکوٹ کی کہ خوجی کو چھیڑنا چاہیئے۔ اس ہوٹل میں ایک شخص اس کام پر مقرر تھا کہ پنکھا قلیوں کی نگرانی کرے۔ یہ شخص بونا تھا۔ خاص قاہرہ کا رہنے والا۔ لوگ سوچے کہ اس بونے اور خوجی سے پکڑ ہو تو خوب بات ہے۔ بونا بڑا شریر آدمی تھا پرلے سرے کا شہدا۔ لوگوں نے اس سے جا کر کہا کہ چلو تمہاری کشتی بدی گئی ہے۔

بونا۔ چلو چلو۔

لوگ۔ وہ دیکھو۔ ایک آدمی ہندوستان سے آیا ہے۔

بونا۔ جوڑ تو اچھی ہے۔

لوگ۔ پھر جُٹ جاؤ۔

یہ سُن کر بونا میاں خوجی کے قریب گیا اور جھک کر سلام کیا۔ خوجی نے جو دیکھا کہ ایک شخص ہم سے بھی او نچے ہیں تو اکڑ کر اور اینڈ کر آنکھوں سے سلام کا جواب دیا۔ بونا اپنے دل میں سوچا کہ ٹھہر جاتا کہاں ہے تو یہی جو چاہا بنا کر چھوڑوں۔ ادھر اُدھر دیکھ کر ایک دفعہ ہی موقع جو پایا تو میاں خوجی کی ٹوپی اتار کر چٹاخ سے ایک دھول جمائی اور ٹوپی پھینک کر بھاگا، مگر ذرا ذرا سے پاؤں بھاگ کے جاتا کہاں۔ خوجی بھی جھپٹے آگے آگے بونا اور پیچھے پیچھے میاں خوجی۔ اوگیدی۔ او مردک نہ ہوئی قرولی واللہ اس دم بھونک ہی دیتا غچ سے۔ تھوڑی دیر میں بونے نے کہا اب سانس نہیں لی جاتی اور خوجی نے لپک کر ہاتھ پکڑا۔

خوجی۔ کیوں بے۔

بونا۔ (منہ چڑھانے لگا۔)

خوجی۔ اب بولو۔
بونا۔ (پھر منہ چڑھایا)
اتنے میں خوجی کو غصّہ آیا تو حضرت نے ایک دھپ جڑی تڑ سے پڑی اور چٹاخ کی آواز گونجنے لگی۔
خوجی۔ اور لے گا؟
بونا۔ (اپنی زبان میں) چھوڑ۔ نہیں مار ہی ڈالوں گا۔
خوجی۔ ہات تیرے کی۔
بونا۔ آج رات کو گلا گھونٹوں گا۔

میاں آزاد احمد آفندی کے ساتھ ہوٹل میں آئے۔ اسباب لیا اور خوجی سے کہا آج شب کو یہاں ٹھہرو، میں کانسل کے ہاں مدعو ہوں۔ جب جہاز پر سوار ہونگا تم کو بلا لوں گا۔ خوجی اس وقت زمین پر قدم نہیں رکھتے تھے۔ عمر بھر میں اُنھوں نے آج پہلی ہی مرتبہ ایک آدمی کو نیچا دکھایا تھا۔

خوجی۔ اس وقت ایک کشتی اور نکالی۔
آزاد۔ کشتی کیسی؟
خوجی۔ کشتی کیسی کیا معنی۔ کیسی ہوتی ہے کشتی؟
آزاد۔ معلوم ہوتا ہے پٹے ہو۔
خوجی۔ اس پٹنے والے کی ایسی تیسی اور کہنے والے کو کیا کہوں۔
آزاد۔ (تہور خاں سے) کیا ہوا کیا؟
تہور۔ جی یہاں ایک بونا ہے۔ اُس نے ایک دھول لگائی۔
آزاد۔ دیکھا نہیں تو سمجھا ہی تھا کہ پٹے ہوں گے۔
خوجی۔ سُن تو لو۔
تہور۔ بس دھول کھا کر یہ لپکے اس کو کئی چپتیں لگائیں اور اُٹھا کر دے پٹخا۔
خوجی۔ وہ پٹخنی تیائی ہے کہ یاد ہی تو کرتا ہوگا۔ دو مہینے تک کھٹیا سے نہ اُٹھ سکے گا۔
تہور۔ بجا ہے وہ دیکھیے سامنے اکڑ رہا ہے۔
آزاد۔ یہی ہے۔ وہ تو اس وقت بھی اکڑ رہا ہے۔ تم تو کہتے تھے کہ دو مہینے تک اُٹھ ہی نہ سکے گا۔
خوجی۔ ہوا تو چلنے دو۔

الغرض آزاد اسباب لے کر احمد آفندی کے ساتھ کانسل کے ہاں گئے۔ شب کو میاں خوجی ہوٹل میں سوئے۔ کوئی نو بجے رات کو اُٹھے تو دیکھا کہ لمپ گل ہوگیا ہے۔ اُنھوں نے پکارا۔ کوئی ہے؟ پانی پلاؤ۔ ایک آدمی نے دروازہ کھولا پانی دیا۔ گلاس لے کے خوجی نے پیا۔ لیٹ رہے۔ اتنے میں اس کمرے میں چٹاخ کی آواز گونجی۔ ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ یہ آواز کیسی تھی۔ یہ میاں خوجی کی کھوپڑی پر دھول لگی تھی۔ آگ بھبوکا ہو کر خوجی اُٹھے تو دیکھا کہ ایک پستہ قد آدمی بھاگا جاتا ہے۔

خوجی۔ ارے لاحول۔ یہ تو وہی بونا مردک معلوم ہوتا ہے۔ پانی اسی نے پلایا تھا اور چپت بھی اسی نے جڑ دی۔ او گیدی۔ کیا

تڑکا نہ ہوگا۔ ذبح کرکے رکھ دوں تو سہی۔

یہ کہہ کر خوجی کمرے میں آئے۔

اب سنیئے اِدھر تو بونے صاحب کمرے سے باہر گئے اور اُدھر خواجہ بدیع صاحب کو دست آنے شروع ہوئے۔ وجہ یہ کہ پانی میں بونے نے جمالگوٹہ ملا دیا تھا، اثر دکھایا ہی چاہے۔

ٹرکی کے کانسل کے یہاں میاں آزاد فرخ نہاد ایک صاف شفاف اور رفیع و وسیع کمرے میں آرام کر رہے تھے کہ دفعتہ ایک گھنٹی اس زور سے بجی کہ میاں آزاد کی آنکھ کھل گئی اور انھوں نے سنا کہ ایک شخص ان کو کمرے کے باہر بلاتا ہے۔ پوچھا کون ہے؟ کہا، حضور کا خادم۔ ہوٹل سے ایک آدمی آیا ہے اور آپ کو بلاتا ہے۔

میاں آزاد نے کہا لاحول ولاقوۃ۔ مدت کے بعد آرام کے ساتھ سونا نصیب ہوا تھا۔ اس خوجی مردک کے سبب سے سونے نہ پائے۔ بلاؤ صاحب بلاؤ۔ وہاں پھر جھگڑے ہو گئے کسی سے۔ عجب پاگل ہے نالائق۔ خدا سمجھے اس سے۔ بھلا اس وقت آدھی رات ڈھل گئی۔ پوچھیئے یہاں کیا کام تھا؟ میاں آزاد اُٹھ کر باہر گئے تو دیکھا کہ دو آدمی کھڑے ہیں۔ ایک کانسل کا نوکر جس کو انھوں نے میاں آزاد کی خدمت کے لیے مقرر کیا تھا اور دوسرا کوئی اجنبی تھا جس کو میاں آزاد نے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آزاد۔ (اپنے دل میں) ایں! سمجھے تھے کہ میاں خوجی ہوں گے۔

اجنبی۔ ہوٹل سے آیا ہوں۔ منیجر نے بھیجا ہے اور یہ چٹھی دی ہے۔

آزاد نے خط لیا پڑھا تو رنگ فق ہو گیا۔

مسٹر آزاد!

جس شخص کو آپ یہاں چھوڑ گئے تھے وہ گیارہ بجے رات سے علیل ہو گئے ہیں۔ اب تک چودہ دست آ چکے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ اگر دو چار دست اور آئے تو یہ مر جائیں گے۔ آپ آیئے۔ آپ کے دوست کی بھی یہی خواہش ہے۔ ہمارے نزدیک اب یہ بڈھا آدمی دو ہی چار گھنٹے کا مہمان ہے۔

(آپ کا دوست، منیجر ہوٹل)

آزاد۔ (اپنے دل میں، اور سنیئے۔ اچھا رنگ لائے۔ چلتے چلاتے دغا دے گئے۔ اب نہ بچیں گے۔ جب ڈاکٹر نے جواب دے دیا تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ افسوس!

نوکر۔ حضور، گاڑی بھی لیتا آیا ہوں۔

آزاد۔ ہم کپڑے پہن لیں تو ابھی چلتے ہیں۔

کپڑے پہن کر میاں آزاد گاڑی پر سوار ہوئے۔ گھوڑے ہوا ہوئے اور دن سے ہوٹل میں داخل۔ میاں آزاد نے دیکھا کہ کمرے میں خوجی لیٹے ہیں اور منیجر اور ڈاکٹر سرہانے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ آزاد کو دیکھ کر خوجی نے سلام کیا اور کہا الوداع! خدا کرے تم ٹرکی سے سرخرو آؤ اور حسن آرا بیگم کو عقد نکاح میں لاؤ۔

خوجی نے آزاد سے بہ منت و سماجت کہا کہ اس وقت سورۂ یٰسین کسی سے پڑھوایئے۔ آزاد نے منیجر سے کہا کسی حافظ کو بلوایئے چنانچہ ایک شخص یمن کے باشندے ملا فرقان بلوائے گئے۔ خوجی کے قریب بیٹھ کر انھوں نے سورۂ یٰسین قرأت کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔

آزاد - لاکھوں عیب اس شخص میں ہیں - مگر اپنے مذہب کا پکا - شرع کا پابند - روزہ دار - شب زندہ دار - مگر افسوس!
خوجی - کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو ایسے اذیت کوش ہوئے
جان پڑی تب بار شکم تھے مرکے وبالِ دوش ہوئے

آزاد - اجی تم دو دن میں اچھے ہو جاؤ گے، سمجھے؟
خوجی - اجی واہ - میں مروں یا جہنم میں جاؤں مگر بھائی واسطے خدا کے ذرا جان کا خیال رکھنا - ایسا نہ ہو کوئی جلتا ہو - تم آگ میں پھاند پڑو - خدا تمہارا حافظ و ناصر ہے - ہم تو اب چلتے ہیں - خطا معاف - اب تک ہنسی خوشی تمہارا ساتھ دیا، اب مجبوری ہے -

صبح کے وقت میاں آزاد خوجی کو کانسل کے ہاں لے گئے اور کہا کہ یہ شخص میرا رفیق قدیم ہے - جب میں ہندوستان سے چلا تو اس نے میرا ساتھ دیا - اب یہاں آکر سخت علیل ہو گیا - ڈاکٹر کی رائے ہے کہ چار روز میں اگر بچ گیا تو خیر ورنہ اس کے مر جانے میں شک نہیں - اگر آپ کو تکلیف نہ ہو اور آپ بدل اجازت دیں تو اس کو یہاں چھوڑ جاؤں - اگر صحت پائے تو آپ ازراہِ نوازش اس کو جہاز پر ہندوستان واپس بھیجئے گا، کمال ممنون ہوں گا - کانسل نے کہا یہ بات ہی کون ہے جو آپ اس قدر منت و سماجت کرتے ہیں - آپ ان کو یہاں چھوڑ جائیے - دو آدمی اِن کی خدمت کے لیے تعینات رہیں گے، ڈاکٹروں کی قلت نہیں، ہر طرح آرام کے ساتھ بقیہ عمر بسر کریں گے - آپ مطمئن رہیئے - اب آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ جلد جائیے اور ضرور جائیے - دریائے پرتھ سے لشکر روس عبور کرنے کو ہے - بڑی سخت جنگ ہوگی - خدا خیر کرے - دیکھئے کیا انجام ہوتا ہے -

آزاد نے خوجی کو سمجھایا کہ اب مجبور ہو کر ہم کو تمہارا ساتھ چھوڑنا پڑتا ہے - کل صبح کو جہاز روانہ ہوگا - تم یہاں رہو اور چین کرو -
خوجی نے کہا بدرجۂ مجبوری رہنا پڑتا ہے -
خوجی - ایک بات یاد رکھنا کہ ٹرکی میں سب سے مل جل کے رہنا - شکر رنجی نہ ہونے پائے - واسطے خدا کے باتفاق رہنا - جوتی پیزار لڑائی جھگڑے سے مطلب بر آری معلوم - اور کبھی خواجہ بدیع کو بھی یاد کرنا - ہائے افسوس - یار جدائی ایسی شاق گذرتی ہے کہ بس کیا بیان کروں -

آزاد رخصت ہو کر جہاز پر سوار ہوئے - اتنے عرصے کے بعد خواجہ صاحب کی مفارقت ان کو سخت شاق گذری - عالم تنہائی میں طرح طرح کے خیالات دل میں جگہ پاتے تھے - سوچے کہ ٹرکی تو پہنچ ہی جائیں گے اور کانسل نے جو خطوط افسرانِ عالی مقام اور عمائد ذوی الاحترام کے نام لکھ دیئے ہیں اُن کے ذریعے سے کوئی نہ کوئی عہدہ بھی ضرور پائیں گے مگر یقین نہیں آتا کہ حسن آرا بیگم کو عقد نکاح میں لائیں - چنے کے برابر ایک گولی کام تمام کر دے گی - تھوڑی دیر کے بعد سو رہے، پھر اُٹھے اِدھر اُدھر کی سیر دیکھی - صبح ہو گئی، شام ہوئی - ایک مرتبہ سوئے تو خواب دیکھا کہ حسن آرا بیگم کے دروازے پر یہ پہنچے - اور حسن آرا نے ان کو اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا گلدستہ دکھایا - مگر دفعتہً کسی شخص نے توپ داغی اور ان کی آنکھ کھل گئی تو نہ حسن آرا نہ گلدستہ - ناخدا نے کہا سمجھئے قسطنطنیہ پہنچ گئے - آزاد قسطنطنیہ کے نام سے ایسے خوش ہوئے کہ جامے میں پھولے نہ سمائے - شکر خدا بجا لائے کہ قسطنطنیہ تک زندہ تو آئے -

---

محمد عسکری

بہار النسا بیگم کے ایک عزیز محمد عسکری حسن آرا کو دل دے بیٹھے۔ بہار کو حسن آرا اور آزاد کا قصہ معلوم نہیں تھا۔ انھوں نے باتوں باتوں میں حسن آرا کا عندیہ لیا، جواب صاف پایا۔ آخر بہار النسا بیگم نے محمد عسکری کو بلوایا اور چپکے سے کہا کہ کل ہم نے حسن آرا سے تھا تذکرہ کیا مگر اللہ جانے کیا سبب ہے کہ وہ ذری بولیں تک نہیں، اور ان کے بشرہ سے ایسا پایا جاتا تھا کہ جیسے کسی پر خدا ناکردہ ان کا دل آیا ہے۔ میں تو دھک سے رہ گئی۔ ماشاء اللہ آبرو رکھے باتیں ہوتے ہوتے حسن آرا اخبار پڑھنے لگیں۔ اخبار پڑھتے پڑھتے روئیں خوب زار زار روئیں۔ پھر پڑھا تو کہا۔ اب ذری تشفی ہوئی۔ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں۔ سپہ آرا نے البتہ پڑھ کر ہم سے کہا کہ رہن شادی وادی کے خیال سے درگذرو۔ کیا جانے کیا بھید ہے۔ اندر ہی اندر ہنڈیا پک رہی ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے ذرا حال نہیں کھلتا۔ میں نے اس اخبار میں نشان بنا دیا ہے۔ مگر لاکھ لاکھ تدبیریں کیں کہ اخبار انھوں نے نہ دیا نہ دیا۔ اس وقت میں چوری سے اخبار لے آئی ہوں دیکھو یہاں پر پڑھ رہی تھیں۔ پڑھو تو اس میں لکھا کیا ہے۔

محمد عسکری نے اخبار کا وہ مضمون پڑھ کر کہا کسی بے تکے نے لکھا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے آزاد نامی کوئی شخص ہے۔ اس سے حسن آرا بیگم نے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم روم جا کر روسیوں سے لڑ داور وہاں سے سرخرو واپس آؤ تو میں تمھارے ساتھ شادی کروں۔ اب یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ میاں آزاد ہیں کون! اب بہن تم ایک کام کرو، جب حسن آرا بیگم اور تم پاس بیٹھی ہو تو آزاد کا ذکر ضرور چھیڑو۔ کہنا عسکری ابھی ابھی اخبار پڑھتا تھا اس کا ایک دوست ہے آزاد۔ اخبار میں آزاد کی تعریف پڑھ کر عسکری بہت خوش ہوا۔ پھر کہتا تھا کہ آزاد نانبائی کا لڑکا ہے اس طعامچی بچے کی خوش قسمتی کو دیکھو کہاں جا کے شپّہ لڑایا۔

اب تو بہار النسا بہن کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ آزاد کی طرف سے حسن آرا کا دل پھر جائے۔ آزاد یاد ہی نہ آئے۔ میں اخباروں میں آزاد کی ہجو چھپواؤں تم زبانی مذمت کرو۔ اور جس اخبار میں طبع ہو وہ کسی ترکیب سے حسن آرا کو ضرور دکھا دو۔ خدا نے چاہا تو چٹکیوں میں دل پھر جائے۔ مگر حیرت ہے کہ بار خدایا یہ آزاد کون بزرگوار ہیں۔ بہار النسا متحیر و ششدر کہ یہ اسرار کیا ہے۔

یہ گفتگو کر کے محمد عسکری رخصت ہوئے۔ بہار النسا بیگم اس اخبار کو چپکے سے حسن آرا کے صندوق پر رکھ آئیں۔ محمد عسکری نے گھر پر جا کر حسن آرا اور آزاد کی باہمی ناچاقی کی نسبت سیکڑوں ہی تدبیریں سوچیں۔ ٹھان لی کہ دن رات اسی غور و فکر میں رہوں گا کہ کسی تدبیر معقول سے آزاد کے نام پر حسن آرا لاحول پڑھنے لگیں۔ سوچے کہ پہلے تو کسی اخبار میں کچھ لے دے کر یہ چھپوا دوں کہ آزاد نامی ایک نان پز کا لونڈا آج کل روپوش ہے کئی ہزار روپے ایک مہاجن کے لے کر چل دیا ہے۔ سنا ہے کہ اب مصر کی طرف بھاگ گیا ہے۔ اگر کسی کو اس کا حال معلوم ہو تو بتائیے۔ اس کے بعد ایک خط چھپوا دوں کہ آزاد مصر نہیں گیا بلکہ پرسوں تک حیدر آباد میں تھا۔ یہ وہ شخص ہے جو ۱۸۵۷ء کے غدر میں ایک سرغنہ تھا مگر گورنمنٹ کو اس کے خیالات سے ذرا بھی واقفیت نہیں ہونے پائی۔ یہ شخص بڑا نامی ڈاکو ہے۔ وسط ہند کے اکثر مقامات میں اس نے ڈاکے مارے اور کئی آدمیوں کو زخمی کیا ہے۔ یہ شخص مختلف مقامات میں اپنے کو مختلف ناموں سے مشہور کرتا ہے۔ پھر کسی اور اخبار میں چھپوا دوں کہ ایک شخص آزاد نامی کسی نوجوان بیگم کو دھوکا دے کر بھاگ گیا ہے اگر اس پر بھی حسن آرا کا عشق کم نہ ہو تو کسی اخبار میں آزاد کی وفات کی تاریخ درج کر دوں۔ تاکہ

حسن آرا مایوس ہوکر آزاد کو رو بیٹھے اور پھر ہمارے ساتھ دھوم دھڑلے سے شادی ہو۔

ادھر کا حال سنیئے کہ سپہر آرا اور حسن آرا کوٹھے کے کوٹھے سے سیر دریا کرتی تھیں کہ بہار النسا بیگم بھی پہنچیں۔

بہار۔ اس وقت عسکری بہت خوش تھا کہ اخبار میں اس کے دوست کی بڑی تعریف چھپی ہے۔

حسن۔ کون دوست؟

بہار۔ کیا جانے کیا نام بتایا تھا۔ بھلا سا نام ہے۔ کہتا تھا اخبار میں تعریف کے پل باندھ دیئے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا ہے توبہ۔ تو بہ بھلا ہی سا نام ہے۔

سپہر۔ قاسم خاں۔ تہور علی۔ رفیع الدین؟

بہار۔ نہیں، تہور علی نہ رفیع الدین۔

حسن۔ محمد غوث آزاد؟

بہار۔ ہاں ہاں۔ آزاد۔ آزاد۔ کہتا تھا آزاد میرا بڑا دوست ہے مگر نان پُز کا لڑکا ہے۔

حسن۔ (چونک کر) کس کا؟

بہار۔ نان پُز کا لڑکا بتاتا تھا۔

سپہر۔ واہ اچھے آپ کے عسکری ہیں جو نان بائیوں کے چھوکروں سے یارانہ کرتے پھرتے ہیں۔ یہی آپ اُن کی تعریف کرتی تھیں بجا ہیئے بس دیکھ لیا۔

حسن آرا سکتے کے عالم میں تھی۔ سوچی کہ آزاد کے حالات سے کسی کو یہاں اطلاع تو ہے ہی نہیں۔ شاید نانبائی ہی ہو، مگر یہ خیال ہزنگ محال ہے یہ نورانی صورت یہ اخلاق یہ علم و فضل شائستگی یہ جرأت یہ جوانمردی نانبائی کیوں کر پا سکتا ہے نانبائی پھر نانبائی ہے۔ آزاد تو کوئی شاہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ نانبائی میں یہ باتیں کہاں۔ نان بائی میاں آزاد کی سی شستہ تقریر اور علمیت اور ایسی صورت شکل کہاں پائے۔ بھلا کوئی بات بھی ہے۔

سپہر آرا بولی۔ باجی! خاتونِ جنت کی قسم جو اس میں ذری بال برابر فرق بھی ہو کہ بہار النسا بیگم اُدھار کھائے بیٹھی ہیں کہ محمد عسکری کے ساتھ تمھارا نکاح ہو۔ کل تم چوک اس قدر گئیں کہ ان کے سامنے اخبار پڑھ کر رونے لگیں اور پھر ہنس دیں۔ بس وہ تاڑ گئیں۔ حسن آرا بولی، اُس وقت تو میں از خود رفتہ تھی۔ سپہر آرا نے کہا، باجی بس وہی اخبار لے جا کر انھوں نے عسکری سے پڑھوایا ہوگا۔ ساری کارستانی اسی کی ہے۔ تم چاہے مانو یا نہ مانو۔ ہم تو یہی کہیں گے۔ باجی اللہ جانتا ہے کھُپ گئی ہے۔ ممکن کیا کہ جھوٹ ہو بھلا ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا عسکری کے ہتھکنڈوں سے اب ڈرتی رہنا۔ وہ بڑا نٹ کھٹ معلوم ہوتا ہے۔ دیکھیئے ابھی کیا کیا باتیں بناتا ہے کیا کیا تہمتیں تراشتا ہے۔ مگر بھرے ہیں نہ آ جانا۔ آزاد کو نانبائی بنا دیا۔ اے تیری قدرت شانِ خدا۔

شام کو بہار النسا بیگم کی صلاح سے محمد عسکری نے حسن آرا کے نام ایک خط لکھا۔ مغلانی کو دیا کہ جا کے حسن آرا کے ہاتھ میں دینا، مگر خبردار خبردار یہ نہ کہنا کہ بہار النسا کے سامنے دیا ہے۔ مغلانی نے خط لیا اور جا کے حسن آرا کو دیا۔

حسن۔ کس کا خط ہے؟

م۔ پڑھ لیجئے۔

سپہر۔ کیا ڈاک پر آیا ہے؟
حسن۔ نہیں۔

حسن آرا نے خط کھول کر پڑھا۔ مضمون ملاحظہ فرمائیے :۔

حسن آرا بیگم کی خدمت ہمایوں میں کورنش۔ میں جتائے دیتا ہوں کہ آزاد کے پھیر میں نہ پڑیئے۔ وہ نیچ قوم آپ کے قابل نہیں۔ نانبائی کا لڑکا، تنور روشن کرنے میں طاق، آٹا گوندھنے میں مشاق۔ وہ اور آپ کے لائق ہو۔ اے توبہ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اوّل تو پاجی، دوسرے مزاج میں تلون۔ برق کی چشمک کو تو شاید پائداری بھی ہو، مگر اس کے مزاج کو قیام نہیں اور پھر طرّہ یہ کہ اَن پڑھ۔ میں اچھا ہوں یا برا، بہار النسا بہن مجھے خوب جانتی ہیں مجھے جھوٹ بولنے سے کیا واسطہ؟ آزاد میرے دشمن ہیں نہیں۔ مجھے اُن سے کسی قسم کی خصومت نہیں ہے۔ بلکہ میں اس شخص کو جانتا ہوں اور بخوبی جانتا ہوں۔ اس خاص سبب سے میں آپ کو صلاح دیتا ہوں کہ آپ کا اس کا خیال دل سے دور کر دیں۔ جس وقت میں نے سنا کہ آزاد پر آپ عاشق ہیں میرا دل پھٹ گیا۔ اب ہم تو یہی دعا مانگتے ہیں کہ خیر سے وہ دن آئے کہ تمھارے دل سے اس بد وضع کے عشق کا خیال دور ہو جائے۔

(حررہ محمد عسکری)

اس خط کو حسن آرا نے دوبارہ پڑھا اور جواب میں فقط ایک شعر لکھا ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

سپہر آرا نے کہا کیوں باجی، ہم کیا کہتے تھے؟ دیکھا وہی بات ہوئی نہ اور جھوٹ تو اسی سے ثابت ہے کہ میاں آزاد کو اَن پڑھ بتاتے ہیں۔ شانِ خدا۔ یہ اور آزاد کو اَن پڑھ کہیں۔ اللہ جانتا ہے ان لوگوں کو خوفِ خدا بھی نہیں ہے۔ اُف۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ جھوٹ بھی تو کتنا اور کیسے نیک بنے جاتے ہیں کہ مجھے جھوٹ بولنے سے کیا واسطہ۔ سچ ہے ہم تو کہتے ہی تھے کہ بڑا نٹ کھٹ معلوم ہوتا ہے وہی بات ظاہر ہو گئی۔ مغلانی نے وہ کاغذ لے جا کر محمد عسکری کو دیا۔

ایں گُلِ دیگر شگفت

کوہ قاف کی پری میڈا بصد شانِ دلبری ترکی کے وزیرِ جنگ حمید بے کو پٹی پڑھا کر خنداں و فرحاں اپنی ہمجولی کے پاس گئی اور کہا لو بہن فتح ہے۔ کل تک کوئی گل کھلے گا۔ آزاد نے مجھے ٹھکرایا۔ میں نے آزاد کو روسی جاسوس بنایا۔ وزیرِ جنگ سنتے ہی دنگ ہو گئے، مگر سچ کہوں بہن کہنے کو تو کہہ آئی لیکن اب سوچتی ہوں کہ حد بھر بُرا کیا۔ ہمجولی بولی بہن ہے یونہی مگر عورت کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں جب کسی مرد کو چاہے اور وہ اس کو نہ چاہے۔ تم نے جی کڑا کر کے کہا تو مگر کہنے کا پھل پایا۔ دیکھو اتنا تو ہم بھی کہیں گے کہ تین باتوں سے خالی نہیں۔ یا تو آزاد کی صحت میں فرق ہے۔ کسی عارضے کے سبب سے تمہارا کہنا نہ مانا اور شادی سے انکار کیا۔ یا کسی ایسی پری چہرہ پہ دل آیا ہے کہ تم ایسی حسین تک کی پروا نہ کی۔ اور یا قول کا سچا ہے۔ ممکن ہے کہ جس رشکِ قمر پر اس کا دل آیا ہے وہ تم سے اچھی نہ ہو مگر قول کا اس درجہ خیال ہو کہ جو بات ایک دفعہ زبان سے نکلے وہ نہ ٹلے گی۔ میڈا نے کہا سنو بہن ہماری تو اس جوان رعنا پر جان جاتی ہے۔ اس کی صورت ہر دم نظر کے سامنے رہتی تھی۔ غمزے ہمیں کرنے چاہئیں یا انھیں۔ وزیرِ جنگ سے ہم نے کہہ دیا کہ میاں آزاد کو جنگی عہدہ نہ دیجیئے گا۔ نہیں تو بہت پچھتائیے گا۔ متحیر ہو کر بولے کیا۔ کیوں۔ کیسا۔ میں نے کہا۔ وہ روسیوں کا جاسوس ہے۔ ہندوستان سے نہیں آیا وایا۔ وہ اخبار میں اس جوانمرد کا حال پڑھ چکے تھے بشرے سے پایا جاتا تھا۔ پہلے تو ان کو یقین نہ آیا۔ مگر جب میں نے برقعِ عارض نقاب سے اُلٹ دیا تو دانتوں کے تلے انگلی دبائی۔ یہ تو وعدہ نہیں کیا کہ میاں آزاد کو ٹرکی سے نکلوا دیں گے یا قید کریں گے مگر غور اور خوض کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کل ہی پرسوں تک کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلے گا۔ ہمجولی بولی۔ بہن بُرا کیا مگر اب تو جو کیا وہ کیا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب اس کا غم ہی کیا ہے؟

گو میڈا نے میاں آزاد کی تباہی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا۔ مگر بار بار سوچتی تھی کہ بُرا کیا بہت بُرا کیا۔ ایک بیگناہ بیچارے کو مفت میں ضرر پہنچایا۔ ہندوستان اس قدر دور دراز ملک سے آیا ہے کہ اپنے معشوق کے حکم کی تعمیل کرے۔ ترکوں کی طرف سے لڑے۔ جان رہے یا جائے مگر بانکپن اور پاس وضع میں فرق نہ آئے۔ ایسے وضعدار اور گلعذار جوان کے ساتھ میں اس بے مہری سے پیش آئی۔ بار بار میڈا کے دل میں خیال آتا تھا کہ جا کر وزیرِ جنگ سے کہہ دے کہ آزاد بیچارہ بیگناہ ہے مگر پھر سوچتی تھی کہ وزیرِ جنگ سے صاف صاف کہہ دیا تو بڑی بدنامی ہو گی۔

میاں آزاد بیچارے کوٹھی میں بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ انھیں کیا خبر کہ میڈا نے ستم ڈھایا ہے۔ بہتان کا طوفان باندھا ہے۔ صبح کا سہانا سماں۔ خوش و خرم تھے کہ اب عہدہ پایا۔ یوں لڑیں گے اور یوں مقابلہ کریں گے اور غنیم کو نیچا دکھائیں گے اور تمغے لٹکائیں گے۔ ہندوستان تک نام ہوگا۔ عاشق شادکام ہوگا۔

میاں آزاد یہ سوچ ہی رہے تھے کہ چند افسر دار آفس یعنی (صیغۂ جنگ) کے ہُرمزجی کی کوٹھی پر آئے۔ جہاں آزاد مقیم تھے اور دریافت کیا کہ یہاں آزاد نامی کوئی شخص آئے ہیں۔ آزاد نے جو اپنا نام سنا تو باہر نکل آئے دیکھا کہ چند جنٹلمین کوٹھی کے احاطے میں زینہ کے پاس کھڑے ہیں۔

آزاد۔ جی، آزاد میرا ہی نام ہے۔

افسر۔ وہ جو ہندوستان سے آئے ہیں؟

آزاد۔ جی ہاں وہی ہوں۔ آپ صاحبوں کو گورنمنٹ سے کوئی تعلق ہے؟

افسر۔ نہیں مطلق نہیں۔ اور آپ کو؟

آزاد۔ میں تازہ وارد ہوں۔ حضرت وزیر جنگ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض حال کیا تھا۔ اغلب ہے کہ کوئی عہدہ عنقریب ملے۔

ان میں سے ایک نوجوان اور حسین ترکی افسر نے سر ہلایا جس کے یہ معنی تھے کہ مل چکا۔ جاسوسوں کو عہدے نہیں ملا کرتے۔

افسر۔ آپ نے حمید پاشا سے جو کچھ کہا تھا اس کی صداقت کا ثبوت آپ دے سکتے ہیں؟

آزاد۔ ثبوت کیسا؟

افسر۔ کبھی برٹش گورنمنٹ یا کسی اور یورپین گورنمنٹ کی نوکری کی ہے؟

آزاد۔ کبھی نہیں۔

افسر چلے گئے۔ میاں آزاد کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے پوپ کے اشعار مطالعہ کر رہے تھے کہ دفعتہً وہی افسر جن سے ابھی ابھی گفتگو ہوئی تھی آئے اور ایک افسر نے آزاد سے کہا کہ تم قیدی ہو۔

آزاد۔ (چونک کر) کیا؟

افسر۔ آپ قید کر دیئے گئے۔

آزاد۔ وجہ؟

افسر۔ گورنمنٹ ترکی کا حکم۔

افسر موصوف نے دو آدمیوں کو بلایا اور کہا اس جنٹلمین کے ساتھ جاؤ۔ آزاد بصد تعظیم چلے۔ آدھ گھنٹے کے عرصے میں بیچارے میاں آزاد سول قید خانے میں تھے۔ آزاد نے افسروں سے لاکھ لاکھ پوچھا کہ آخر میرا جرم کیا ہے۔ اس قدر تو بتا دیجئے مگر افسروں نے کہا ہمیں اجازت نہیں ہے ورنہ ضرور بتا دیتے۔

میاں آزاد دل میں سوچنے لگے کہ آخر ہم سے جرم کونسا سرزد ہوا جس کے جلو میں یہ مصیبت سہی۔ گھنٹوں سوچا کیے مگر کسی جرم کے مرتکب ہوئے ہوتے تو یاد آتا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ کونسی خطا سرزد ہوئی؟ میدان کارزار کے عوض قید خانہ نصیب ہوا۔

اس غم و غصہ میں میاں آزاد کی آنکھ لگ گئی تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ٹمبڈا کوہ قاف کی پری سرہانے کھڑی یہ اشعار سنا رہی ہے (مومن)؎

اللہ غم بتاں میں یک چند — بے فائدہ جان کو کھپایا

یہ عشق وہ بدبلا ہے جس نے — ہاروت کو چاہ میں پھنسایا

سمجھا نہ کہ ہے رہ خطرناک — دین و دل عقل کو لٹایا

آنکھ جو کھلی تو نہ ٹمبڈا نہ اشعار عاشقانہ۔ فقط میاں آزاد اور قید خانہ۔ اتنے میں ہرمزجی بھائی ایک لمبی ٹوپی پہنے ہوئے آئے۔

ہرمز۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ کا جرم کیا ہے؟ اب گھبرائیے نہیں۔ آج کل جنگ کے سبب سے یہاں انواع و اقسام کی کارروائیاں

ہو رہی ہیں اور نفاق لوگوں میں بہت ہے مگر واقعی حیرت ہے کہ آپ کے ساتھ اور گورنمنٹ ٹرکی اس طرح پیش آئے ۔
آزاد۔ افسوس صد افسوس کہ ترکوں کی حمایت کے لیے وطن چھوڑا اور یہاں آئے ــــــــ مگر
ہرمز۔ کوئی بات پوشیدہ طور پر ہوئی ہے کہ حکام نے مجبور ہو کر آپ کو قید کر دیا اب میں رخصت ہوتا ہوں مگر آپ دل مضبوط رکھیئے گا میں پھر آؤں گا ۔
آزاد۔ بجز آپ کی ذات کے یہاں اور کوئی دوست نظر نہیں آتا ۔ اور آپ سے صرف دو دن کی ملاقات ہے کسی قسم کا دعویٰ نہیں ۔
ہرمز۔ مجھے آپ اپنے قدیم احباب کی طرح پکا دوست سمجھیئے ۔

ہرمزجی رخصت ہو کر گھر گئے ۔ میاں آزاد اپنے دل میں اس پارسی جنٹلمین کے کمال مشکور ہوئے ۔

تین دن اسی طرح پر گذرے ۔ میاں آزاد سول قید خانے میں رہے ۔ کبھی حسن آرا یاد آتی تھیں کبھی وینشیا اور اپلیٹن کبھی ناول پڑھتے تھے ۔ کبھی ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے ۔

چوتھے روز میاں آزاد حضور وزیر جنگ طلب ہوئے ۔ حضور ممدوح کے سکرٹری نے کہا کہ میاں آزاد تم نے غلط بیان کیا کہ تم ہندی ہو ۔ تمھاری نسبت بیان ہے کہ تم روسی جاسوس ہو ۔ اور روس سے خاص اس غرض سے آئے ہو کہ سلطنتِ عثمانیہ کے حالات اور میدانِ جنگ کی کارروائی سے اپنی گورنمنٹ کو اطلاع دو اور جہاں کہیں موقع پاؤ ہمیں شکست دلوادو ۔ یہ بہت بڑا جرم ہے ۔ تم کسی طرح رہا نہیں ہو سکتے ۔
آزاد۔ یہ الزام محض غلط ہے ۔ کسی دشمن نے تہمت تراشی ہے ۔ میں بعد ادب عرض کرتا ہوں کہ میں ایسے جرم کا مرتکب نہیں ہوں ۔ میں ہندی کشمیری الاصل ہوں[1] ۔ روسی نہیں ہوں ۔ میں سوچتا تھا کہ یا خدا کس جرم کا نادانستہ مرتکب ہوا کہ گرفتار کیا گیا ۔ لیکن اب مجھے ذرا بھی خوف نہیں ہے ۔ اب مجھے یہ بتائیے کہ یہ کس شخص نے بیان کیا ۔

وزیر جنگ پر فرض تھا کہ اس کے نام سے میاں آزاد کو اطلاع دیں ۔ کہا ۔ میڈم ا ۔ میڈم ا کا نام سنتے ہی آزاد خاموش ہو گئے ۔ مگر ان کی خاموشی اور ان کے بشرے سے پایا جاتا تھا کہ ان کے شیشۂ دل پر ٹھیس لگی ۔
وزیر۔ اب کیا آپ کہتے ہیں ؟
آزاد۔ (خاموش)
وزیر۔ اچھا اب اس وقت آپ وہیں جائیں پرسوں پھر بلوائے جائیے گا ۔ مجھے ابھی اس معاملے میں بہت سے امور کی تحقیقات کرنی ہے ۔

میاں آزاد پھر سول قید خانے میں آئے ؎

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

ہرمزجی ایک روز ان کے پاس پھر آئے اور تشفی آمیز باتوں سے ان کو سمجھایا کہ گھبرائیے نہیں رہائی کی کوئی نہ کوئی صورت جلد پیدا ہونے والی ہے ۔
آزاد۔ رہائی کی تو اب امید نہیں رہی اور بعد جنگ رہائی ہوئی بھی تو کیا فائدہ ؟
ہرمز۔ میرا قصد ہے کہ خود وزیر جنگ کے سکرٹری کی خدمت میں ایک عرضداشت بھیجوں اور کہوں کہ میاں آزاد کے ہندی ہونے والے اور ہندوستان سے آنے کا یہی کافی ثبوت ہے کہ میرے والد نے اپنے خط کے ذریعہ سے ان کو میرے پاس بھیجا ۔
آزاد۔ اور جس ٹرین جہاز پر آئے ۔ لفٹننٹ اپلیٹن کے ساتھ بمبئی سے روانہ ہوئے ۔ جہاز کے ناخدا مسٹر سمتھ مجھے خوب جانتے ہیں ۔

---

[1] رتن ناتھ سرشار خود بھی کشمیری پنڈت تھے ۔

شطرنج

شہزادہ ہمایوں فر بہادر کو جب ہم نے نواب صاحب کے مکان پر چھوڑا تو وہ خواب ناز میں تھے۔ نور کے تڑکے بستر استراحت سے اُٹھے اور غسل کیا۔ ورزش کی۔ کپڑے پہنے اور گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا کھانے چلے۔ سپہر آرا بیگم کوٹھی کے کمرے پر اس وقت بعد ادائے نماز صبح مناجات پڑھ رہی تھیں۔ جس وقت شہزادہ ہمایوں فر کا کمیت خوش خرام کمرے کی دیوار کے قریب سے گذرا سپہر آرا نے اپنی خلقی نازک آواز سے یہ شعر پڑھا۔

قافلہ شد و اپسیٔ ما بہیں ۔۔۔ لے کس ما بے کسیٔ ما بہیں

ہمایوں فر نے جھروکے کی طرف نظر کی اور آہ سرد بھر کر دل ہی دل میں کہا کہ بارخدایا میری دعائے سحری کچھ رنگ اثر جمائے یہ معشوق سیم تن ہاتھ آئے۔

سپہر آرا بیگم کو ذرا بھی خبر نہ تھی کہ شہزادہ بہادر گلگوں بادرفتار پر سوار زیر دیوار مناجات کے اشعار سن رہے تھے اور جنون کی امنگ میں سر دھن رہے ہیں۔

میرزا ہمایوں فر بہادر نے فرس تیز گام کی باگ جو اٹھائی تو دم کے دم میں کوٹھی سامنے نظر آئی۔ اس وقت حسن آرا اور سپہر آرا اور بہار النسا جھروکے کی راہ سے قدرت حق کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔

میرزا ہمایوں فر بہادر کے پہنچتے ہی نواب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

نواب۔ یہ صبح صبح آپ کہاں سوار ہو گئے تھے۔ میں جو یہاں آیا تو سنا کہ سوار ہو گئے۔

شہزادہ۔ جی ہاں۔ ذرا ہوا کھانے گیا تھا۔ صبح و شام ہوا کھانے کا عادی ہوں۔

نواب۔ ضرور چاہیئے صحت کے حق میں اکسیر کی خاصیت رکھتا ہے۔

شہزادہ۔ آپ روز ورزش کرتے ہیں؟

نواب۔ جی ہاں تھوڑی بہت۔

نواب۔ حافظ جی! حافظ جی صاحب!

حافظ۔ حضور والا ارشاد۔

نواب۔ آپ کے واسطے کچھ نوا کہہ تو لائیے۔

شہزادہ۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔

نواب۔ تکلف! تکلف برطرف۔ خانۂ بے تکلف ہے۔

میرزا ہمایوں فر اور نواب صاحب نے سیب اور کشمش اور پستے مزے مزے چکھے۔

شہزادہ۔ آئیے ہم سے آپ سے شطرنج ہو۔

نواب۔ بسم اللہ۔ حافظ جی شطرنج بچھے۔

حافظ جی اور میرزا نثار حسین بیگ اور مولوی صاحب اور شہزادہ ہمایوں فر اور نواب صاحب شطرنج کھیلنے بیٹھے پہلی

بازی میں نواب صاحب نے دس ہی پانچ چالوں میں ہمایوں فر کا رُخ پیٹ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پیل رُخی کی مگر شہزادے نے مات کردیا۔ دوسری بازی قائم اٹھی۔ تیسری بازی میں شہزادے کے دو رُخ رہ گئے اور نواب صاحب کے پاس فیل۔

شہزادہ۔ واقعی مات نہیں۔

نواب۔ وہ تو آپ کو یاد ہے۔

میرزا ہمایوں فر نے چوتھی بازی کھیلی۔ حافظ جی نواب صاحب کو بتاتے تھے اور میرزا صاحب شہزادے کی طرف تھے۔ پہلے میرزا ہمایوں کا رُخ پیادے کے مُنہ دھوکے سے پٹ گیا۔ نواب صاحب نے کہا حضرت اب فرمائیے۔ ہے یہ مات یا نہیں؟ تھوڑی دیر کے بعد ایسی چال پڑی کہ شہزادے نے نواب صاحب کا فرزین پیٹ لیا۔

نواب۔ ارے؟

حافظ۔ لاحول ولا قوۃ۔

نواب۔ دھوکے کی چال تھی۔

شہزادہ۔ بجا ہے۔ ہم کوئی مہرہ پیٹیں تو دھوکے کی چال ہے اور حضور پیٹ لیں تو استادی ہے۔

نواب۔ خیر اب تو بازی کم ہی ہوگئی۔

شہزادہ۔ اب کی برابر ہو جائیں گے۔

نواب۔ ہاں پھر اب تو فرزین ہی نہ دار رہے۔

حافظ۔ حضور وہ پیل تو پیجئے۔

نواب۔ ہاں (پیل ہٹ کر) کشت۔

شہزادہ۔ یہ لے کشت۔

نواب۔ (پیل سے گھوڑا پیٹ کر) پھر کشت۔

شہزادہ۔ ارے۔ — **میرزا**۔ کچھ حرج نہیں ہے خداوند۔

نواب۔ مات ہے۔ — **میرزا**۔ اس گھر میں بادشاہ کو آجائیے

حافظ۔ اب پیادہ پیٹ کر گھوڑے کی کشت۔ — **شہزادہ**۔ نہیں صاحب اپنے فرزین کی بھی خبر ہے؟

حافظ۔ کیوں۔ — **شہزادہ**۔ گھوڑے کی کشت۔

حافظ۔ اچھا پھر

شہزادہ۔ اس گھر میں آئے۔ یہ پیل کی کشت۔ وہ کشت۔ یہ گھوڑے کی کشت۔ فرزین پٹ گیا۔

حافظ۔ سبحان اللہ خوب سوچے حضور۔

میرزا۔ افسوس۔

شہزادہ۔ بھئی ایک طرف رہو۔

نواب۔ ہاں یہ تھالی کے بیگن ہونا کیا معنی؟

اس بازی میں شہزادہ برابر ہو گیا۔

بیگناہ قیدی

وزیر جنگ نے آزاد کو کوئی ڈیڑھ مہینے کے بعد طلب فرمایا۔ پیشتر جب ان سے سوال کیے گئے تو مُبیڈ ا اور قید کا نام سُن کر مارے طیش کے جواب شافی نہ دے سکے، لہذا وزیر جنگ نے ان کو سول قید خانے کو واپس بھیجا اور کہا کہ ہم برٹش سفیر متعینہ قسطنطنیہ کے ذریعے سے چال چلن کا حال گورنمنٹ ہندوستان سے دریافت کریں گے، اگر تم اصل میں ہندی ہو تو فوراً رہا کیے جاؤگے میاں آزاد کا فوٹو لیا گیا اور وہ صاحب گورنر جنرل ہند کی خدمت میں بھیجا گیا۔ گورنمنٹ ہند نے جواب بھیجا جس سے ظاہر ہوا کہ آزاد روسی جاسوس نہیں ہے۔

میاں آزاد نے بکمال فصاحت وبلاغت بیان کیا کہ میں ایک ہندی کشمیری الاصل ہوں۔ روسی جاسوسی جس نے مجھے کہا وہ جھوٹ بولا۔ میں خادم اسلام اور عاشق اسلام ہوں اور خاص اسی غرض سے آیا ہوں کہ جنگ میں شریک ہوکر ترکوں کو مدد دوں، مگر خوبیٔ قسمت نے مجھے قید خانہ دکھایا۔

وزیر جنگ نے مبیڈا کو بلوایا اور کہا افسوس ہے کہ تمھارا بیان غلط نکلا میاں آزاد روسی جاسوس نہیں ہیں۔ ہندوستان سے خاص کر اسی لیے آئے ہیں کہ ہماری فوج کی طرف سے روسیوں کا مقابلہ کریں۔ بہت سے ثبوت بہم پہنچے ہیں۔ گورنمنٹ ہند نے لکھا ہے کہ کامل تحقیقات کے بعد معلوم ہوا ہے کہ میاں آزاد کا چال چلن بہاں اچھا تھا۔ یہ فقرہ سنتے ہی مُبیڈا کا رنگ فق ہوگیا۔

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

کمال افسوس تھا کہ یہ میں نے کیا کیا؟ یہ بات اب ٹرکی بھر میں مشہور ہو جائے گی اور میری سخت بدنامی ہوگی۔ اپنی ہمجولی سے جاکر کل حال بیان کیا۔

اب آزاد کا حال سنیئے اور تبدیلوں کے ساتھ یہ جگر فگار درد رسیدہ نوجوان غم غلط کرتا اور دل بہلاتا تھا۔

ایک روز آزاد نے ایک ناول میں کسی عاشق ناکام کا حال جو پڑھا تو ان کو اپنی نامرادی پر کمال افسوس ہوا۔ اور حسن آرا بیگم یاد آئیں۔ بڑی دیر تک تڑپتے رہے۔ دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ دو تین دن میں میاں آزاد کی اور بھی ردّی حالت ہوئی۔ یہاں تک کہ قید خانے کے منتظم نے اطبّا کو بلوایا اور ان کی صلاح سے میاں آزاد کو اجازت دی گئی کہ صبح وشام سمندر کے قریب ہوا کھایا کریں۔

ایک روز میاں آزاد فرس تندخو پر سوار ایک دلکش مقام پر بستی کے باہر جا رہے تھے تو دیکھا کہ سامنے سے ایک گھوڑا جگمٹ آرہا ہے۔ جب ان کے فرس آہو شکار کے قریب پہنچا تو انھوں نے پیچھے پھر کر دیکھا! ایک نوجوان نوخیز اس گلگوں سبک خیز پر طنطنہ رعنائی و دبدبۂ دلربائی متمکن تھا۔

جوان حسین ونازنین نے لجاتے اور شرماتے ہوئے میاں آزاد کو جھک کر سلام کیا۔ آزاد نے سلام کا جواب دیا مگر دل میں سمجھنے لگے کہ یا خدا یہ کون طفل پری چہرہ ہے؟ آزاد نے خود مبادرت کی اور یوں سوال کیے:۔

آزاد۔ (فرانسیسی زبان میں) آپ ترکی ہیں؟

طفل۔ جی نہیں میں پارسی ہوں۔
آزاد۔ اسم شریف آپ کا ؟
طفل۔ حسن جی جمال جی۔
آزاد۔ (اپنے دل میں) اسم بامسمیٰ ہے۔ اس وقت آپ کہاں سے تشریف لاتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں؟
طفل۔ ہوٹل سے ہرمزجی پارسی کی کوٹھی گیا۔ ہرمزجی سے ملاقات نہیں ہوئی میں نے سنا ہے کہ ہندوستان سے ایک صاحب آئے ہیں۔ میاں آزاد انہیں کی ملاقات کے لیے گیا مگر ملاقات نہ ہوئی۔
آزاد۔ آپ آزاد سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟
طفل۔ یہاں ایک لیڈی ہیں، وہ مجھ سے آزاد کے اخلاق اور تہذیب اور خوش کلامی اور شیریں بیانی کی ازبس مداح ہیں اور سنا ہے بڑے عالم اور حسین آدمی ہیں۔
آزاد۔ آپ سے کس لیڈی نے کہا اور اس کو کس قدر زمانہ ہُوا ؟
طفل۔ کوئی ایک مہینے کے قریب ہُوا ہوگا۔
آزاد۔ لیڈی کا نام معلوم ہے؟
طفل۔ آپ شاید نہ واقف ہوں۔ میڈا اس کا نام ہے۔

میڈا کا نام سنتے ہی میاں آزاد کا رنگ فق ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر پوچھا کہ آپ ان کو کیا جانتے ہیں۔ طفل خوبرو نے مسکرا کر کہا۔ یہاں جس قدر رنگین و پاکباز نوجوان ہیں سب اس عفیفہ سے واقف ہیں۔ ان کے حسن وجمال کی دُردُور یک وعموم ہے۔ میاں آزاد نے بغور دیکھا کہ اس بُت جادو جمال کی تعریف کرنے کے وقت طفل خوبرو کے گال اور بھی سُرخ ہوگئے مسکرا کر آزاد بولے۔ ہاں ہیں تو ایسی ہی خوبرو۔ مگر چشم بد دور آپ بھی کچھ ان سے کم نہیں۔ طفل عنبر مو نے نخرے کے ساتھ کہا۔ ہاں مگر ہم تو مرد ہیں حسن وجمال ہمارے لیے فخر کا مقام نہیں۔ آزاد نے کہا یہ سچ لیکن خوبرو مرد ہو یا عورت ہو ہر دلعزیز ضرور ہوتا ہے اور خدا جھوٹ نہ بلائے اگر آپ میڈا کے ساتھ شادی کرنا پسند کریں تو وہ فوراً منظور کر لیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج تک آپ کا سا حسین جوان نظر سے نہیں گذرا۔ طفل خوبرو نے مسکرا کر جواب دیا۔ مگر میاں آزاد کا گھوڑا اُس وقت الف ہوگیا تھا۔ سُن نہ سکے۔ بڑی دیر تک میاں آزاد اس کے ساتھ سیر کیا کیے۔ ایک سوار پیچھے پیچھے بہ نظر احتیاط ان کے ساتھ تھا کہ مبادا کہیں بھاگ جائیں۔

کبھی میاں آزاد اور وہ پری زاد ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ جاتے تھے، کبھی گھوڑا دوڑاتے تھے۔ آزاد نے کہا حضرت آپ گھوڑے پر خوب جمتے ہیں۔ فرمائیے اب کب ملاقات ہوگی۔ طفل خوبرو نے پھر مسکرا کر کہا جب فرمائیے اور جہاں فرمائیے حاضر ہوں۔ آپ فروکش کہاں ہیں؟ اب میاں آزاد بتائیں تو کیا بتائیں۔ یہ کہنے سے رہے کہ قید خانے میں ہوں۔ سوار حفاظت کے لیے ساتھ ہے۔ رنگ زرد ہوگیا۔ گھبرا کر بولے کہ آپ یہیں ملیے۔ میں روز صبح وشام ہوا کھانے آتا ہوں۔ طفل خوبرو نے کہا بہت اچھا۔

آزاد سوار قید خانے چلے آئے۔

دوسرے روز صبح کو میاں آزاد نے اس طفل خوبرو کو نہ پایا۔ بڑی دیر تک منتظر رہے مگر پتہ نہ ملا۔ شام کو پھر حسب معمول ہوا کھانے آئے تو دیکھا کہ وہ پریزاد اسپ صرصر تگ پر سوار آہستہ آہستہ آتا ہے۔ دونوں کی چار آنکھیں ہوئیں۔ آزاد نے سلام

کیا۔ طفل خوبرو نے جھک کر جواب دیا۔

آزاد۔ آج صبح کو آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔

طفل۔ جی ہاں میں میڈا کے ہاں گیا تھا۔ بڑے تپاک کے ساتھ مجھ سے پیش آتی ہیں۔ افسوس ہے کہ آپ نے اس حور لقا ماہ سیما کو نہیں دیکھا۔ قابل دید ہے، ہر عضوِ بدن سانچے میں ڈھلا ہے۔

آزاد اپنے دل میں سوچنے لگے کہ اللہ اللہ میڈا کے حسن و جمال میں تاثیر ہے کہ ایسا خوبصورت حور طلعت نوجوان تک ریجھا ہوا ہے۔ میڈا کی پیاری پیاری ادا اور گورے گورے گال اور مستانہ چال ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ طفل خوبرو نے جو دیکھا کہ حضرت آہ سرد کھینچ رہے ہیں تو مسکرا دیا۔ آزاد کہنے ہی کو تھے کہ تم بعینہ میڈا کی طرح مسکراتے ہو لیکن سوچے کہ غضب ہی ہو گیا تھا۔ اس سے تو میں کہہ چکا ہوں کہ میڈا کو آج تک میں نے دیکھا ہی نہیں۔ طفل خوبرو سے انہوں نے پوچھا کہ میاں آزاد اب کہاں ہیں اُن کا حال بھی معلوم ہے؟ وہ بری چہرہ مسکرا کر بولا کہ اسی سنگدلی کی بدولت وہ قید خانے میں پڑے ہیں۔ ان معشوقوں میں یہی تو عیب ہے کہ سنگدل ہوتے ہیں۔

آزاد اس فقرے پر آبدیدہ ہو گئے۔

اسی طرح کئی دن تک دونوں ملتے رہے۔ آخر کار ایک روز طفل خوبرو نے کہا کہ میاں آزاد مجھے بہت نہ اُڑاؤ۔ آزاد تم ہی ہو اور میں میڈا ہوں۔ آزاد سخت متحیر ہو کر بولے کہ کیا؟ اوہ بڑا دھوکا ہوا۔ تمہارے مسکرانے سے مجھے شک گذرا تھا مگر شام کے وقت میں اچھی طرح پہچان نہ سکا۔ میڈا نے کہا کہ میاں آزاد میں ہی تمہاری مصیبت کا باعث ہوئی اب تم معاف کرو۔

میڈا نوخیز لیڈی تو تھی ہی اور بلا کی حسین و نازنین جادو جمال و زہرہ تمثال۔ شوخی کے ساتھ جو اس نے معافی چاہی تو آزاد اس ادا پر ہزار جان سے شیدا ہو گئے۔

دونوں گھوڑوں پر سے ایک جھاڑی میں گئے۔ دونوں گلے مل کر خوب روئے۔ آزاد اپنی مصیبت اور پریشانی یاد کر کے رو دیئے اور میڈا اس خیال سے روئی کہ میرے سبب سے یہ بیچارہ بیگناہ قید ہوا۔

جونیر افسر جو ساتھ تھا کسی قدر فاصلے پر کھڑا رہا اور یہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر رخصت ہوئے۔ آزاد پھر زندان میں گئے۔

میاں خواجہ بدیع صاحب

خواجہ بدیع صاحب اسکندریہ میں چین سے رہے۔ ٹرکی کے کانسل متعینۂ مصر نے ان کی بڑی خاطر کی۔ خوجی تیسرے چوتھے سلام کر لیتے تھے۔ پندرہ روز میں خوجی خاصے ٹانٹھے بھلے چنگے ہو گئے۔ اسکندریہ کی حضرت نے خوب سیر کی۔ جب کئی روز تک اچھے رہے بیماری نے بالکل مفارقت کی تو ایک دن کانسل کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ اب فدوی حضور کے اقبال سے صحیح ہو گیا، عوارض نے پیچھا چھوڑا، امید ہے کہ اجازت دی جائے۔ دریافت کیا گیا کہ سائل کس امر کی اجازت چاہتا ہے؟ کہا صرف یہ چاہتا ہوں کہ میاں آزاد کے پاس بھیجدیا جاؤں۔ کانسل نے حکم دیا کہ جو جہاز قسطنطنیہ جاتا ہو اُس پر خوجی بھیج دیئے جائیں۔ سفر خرچ کے علاوہ زر نقد اور کپڑا بھی ان کو دیا جائے۔

ایک دن خواجہ بدیع صاحب لڑھکتے پڑھکتے چلے جاتے تھے کہ مالٹا کی ایک عورت نے ان کو دیکھا (دو ماشے کا قد) اور دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں دیکھ کر مسکرائی۔ میاں خوجی اور بھی تن گئے اب اکڑے ہی جاتے ہیں۔ زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ سمجھے کہ عورت ہم پر ریجھ گئی۔ دل ہی دل میں سوچتے جاتے تھے کہ واللہ واہ رے ہم جس ملک میں جاتے ہیں۔ انگلیاں اٹھتی ہیں چھوٹے بڑے سب ہمیں کو دیکھتے ہیں۔ وہ عورت اور بھی غور سے دیکھنے لگی اور حضرت کے اکڑنے پر خوب ہی کھلکھلائی۔ آپ سوچے کہ یہ نخرے کرتی ہے۔ شاید اس ملک میں یہی ریت ہو کہ جوان طناز اور خوبرو کو دیکھا اور ہنسنے لگی اور ماشاءاللہ آپ کے طناز اور وجیہہ ہونے میں شک بھی نہ تھا اور کسی کو ہوتا یا نہ ہوتا خواجہ صاحب کو تو ذرا بھی شک نہ تھا۔ یہ اپنے کو کلے ٹھلے کا گبھرو ہی سمجھتے تھے۔ عورت کو کھلکھلاتے ہوئے پایا تو خوق چرایا کہ اس سے چہل[۱] ہو۔ قریب جاکر اور منہ بنا کر غور سے دیکھا۔ عورت کو اور بھی ہنسی آئی۔ اس پر خوجی اکڑ کر بولے رنہ ہوئے میاں آزاد) ورنہ حسن آرا تک کو بھول جاتے۔ واہ کیا پری ہے؟ اور مجھ گبھرو کو دیکھ کر کھلی جاتی ہے۔

خواجہ صاحب ایسے مزے میں آئے کہ حوالی موالی اور حاضرین کو ڈپٹنے لگے۔ ایک سے کہا تو یہاں کیوں کھڑا ہے بے۔ دوسرے کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا چلا جا یہاں سے برابر۔ تیسرے سے خطاب کر کے بولے او گیدی جاتا ہے یا نکالوں قرولی چوتھے سے پیلے ہو کر کہا۔ یہاں کیا تماشا ہے کچھ۔ اردگرد کے لوگ سمجھے کہ مسخرہ ہے کوئی۔ بعض کو گمان ہوا کہ بولانہ ہے۔ جوں جوں خوجی صاحب بگڑتے تھے حوالی موالی اور بھی بناتے اور کھلکھلاتے تھے۔ آپ نے عورت کی طرف مخاطب ہو کر اشارے سے کہا چلو ہم تم اس طرف چلیں۔ اس پر اور بھی قہقہہ پڑا۔ اور سب نے پھبتیوں پر اڑایا۔ اتنے میں دو تین عورتیں اور بھی کھڑی ہو گئیں۔ تب تو خوجی مونچھوں پر تاؤ دینے لگے۔ اللہ اللہ ہم بھی اتنے ہو لیے۔ اب عورتیں ہم پر ریجھنے لگیں سارے تیری قدرت خوجی اور عورتیں ان پر ریجھیں شانِ خدا۔ خوجی تماشا بن گئے۔ بار بار اکڑنا اور بھی لطف دکھاتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس عورت نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ خوجی مسکرائے۔ مسکرانا تھا کہ اس نے ایک دھول جمائی۔ ہاتھ چھڑانے ہی کو تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایک اور چپت جڑی۔ تیسرے نے چپکے سے دھپ لگائی۔ ادھر دیکھتے ہیں تو ادھر سے پڑتی ہے اور اُدھر نظر اٹھاتے ہیں تو ادھر تڑاتڑ کی آواز آتی ہے۔ سمجھے کہ ہم پر جو عورت عاشق ہوئی تو یہاں کے باشندے جل مرے۔

---

[۱] چھیڑ چھاڑ۔

میاں خواجہ بدیع صاحب سوچے کہ افیم کھانے کا وقت آن پہنچا۔ اگر گھر جاتے ہیں تو یہ عورت چھوٹتی ہے اور اگر یہاں پینے کی خواہش کریں تو پانی ندارد ہے۔ اشارے سے حضرت نے پانی مانگا۔ کٹوری میں دیا گیا۔ افیم گھولی۔ پی۔
خواجہ صاحب نے پھر اشارہ کیا۔ کہ چلو ہم تم ادھر طرف چل کھڑے ہوں، عورت مسکرا دی۔ اتنے میں کسی نے پیچھے سے چٹکی لی تو خوجی صاحب پلٹ پڑے۔ دیکھا تو وہ بونے ایک وہی ذات شریف جنھوں نے پانی کے ساتھ ہوٹل میں جما لگوٹہ پلا دیا تھا۔ دوسرے ان کے کوئی یار وفادار تھے۔ خوجی نے اپنے پرانے دوست کو گھور کر دیکھا اور تن گئے۔ کیوں بچہ تم ابھی شرارت سے باز نہیں آتے ابھی ایک کشتی نکال چکا ہوں۔ اب آج پھر سر کھجلایا۔ ہڈیاں چلچلانے لگیں۔ میرے ہاتھ میں بھی کھجلی ہوتی ہے۔ جھپٹ کر میاں خوجی نے ایک چپت جڑ دی۔ دونوں بونے چمٹ گئے۔ خوجی نے کہا ہائیں ہائیں۔ ایک۔ ایک۔ ایک۔ ایک۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ خوجی جھلا گئے۔ ایک بونے کی گردن دبائی اور زور سے پٹخنی دی۔ چاروں شانے چت۔ وہ مارا وہ مارا کہہ ہی چکے تھے کہ دوسرے بونے نے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیا اور لڑکھڑا کر خوجی گرے مگر بونا بھی ساتھ ہی گرا۔ حوالی موالی خوب ہنسے، قہقہے پر قہقہہ پڑا اور خوجی زمین سے اٹھ کر خوب ہی اکڑے۔ ہات تیرے گیدی کی، ابے ہم تو نہتے لڑتے ہیں اور جو کہیں قرولی ہوتی تو تو یہ ہی بھلی۔
بونوں نے دور جا کر خوجی پر ڈھیلے پھینکے۔
خوجی۔ لو جان من اب تو تمھارے دیوانے پر کلوخ اندازی بھی ہونے لگی۔

لاکھ ہو گردش ایام یہ حاضر ہے مدام اُنس رکھتی ہے نہایت نسب ہجراں ہم سے

راوی۔ یہ شعر بھی کس درجہ حسب حال ہے، بالکل چسپاں۔
عورت تھوڑی دیر میں چل دی۔ خوجی بادل پُر درد اُٹھے اور جہاں ٹکے تھے وہاں جا کر سوچنے لگے کہ یہ عورت بے طور ہم پر ریجھی ہے۔ خدا نے چاہا تو صبح شام ہی نکاح ہو جائے انشاء اللہ۔ پھر میاں آزاد البتہ کہیں گے کہ ہاں بھئی خوجی کارے کردہ۔
لوگوں نے جا کر حضرت کانسل سے بھی جڑ دی کہ یہ میاں خوجی کوئی مسخرے ہیں۔ شہر میں جس طرف جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں۔ آدمی کیا تماشا ہے۔ کانسل نے ان کو بلوایا۔
خوجی۔ سات بار سلام کر کے حاضر ہے غلام۔
کانسل۔ اب کیا چاہتے ہو؟
خوجی۔ پیر و مرشد۔ باز ہو اے چشم آرزو ست
کانسل۔ ہندوستان جانے کا ارادہ ہے؟
خوجی۔ ہاں حضور!
کانسل۔ اچھا ہم جلد بھیج دیں گے۔
خوجی۔ (سلام کر کے) شکر نعمت ہائے تو چندانکہ نعمت ہائے تو
کانسل۔ اچھا رخصت۔
خوجی۔ آداب حضور۔
شام کو خوجی سوچے کہ میں نے ہندوستان جانے کی درخواست کیوں کی؟ آزاد بیچارے کو اکیلا تن تنہا یکہ بینی و دو گوش چھوڑ دینا وضع اہل آبرو کے خلاف ہے۔ گو آدمی لائق فائق اور فہمیدہ ہے مگر کم سن اور ناآزمودہ کار ہے۔ سوچ کر ایک عرضی حضرت نے

لکھی۔ کانسل کے پاس بھیجی۔ خط پڑھ کران کو یقین ہوگیا کہ یا تو سڑی ہے یا مسخرہ۔

تیسرے روز کانسل نے میاں خوجی کو طلب کیا اور کہا آپ کیا چاہتے ہیں؟ خوجی جھک کرآداب بجا لائے اور کہا خداوندا بس اب حضور کی پرورش چاہتا ہوں۔"

"کیا پرورش چاہتے ہو۔ کچھ معلوم تو ہو؟"

"وہی جو عرضی میں عرض کر چکا ہوں۔"

"عرضی تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

"ہاں دیکھا نہ۔ میں تو سمجھا ہی تھا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے گی (ہنس کر) واللہ واہ رے ہیں۔ واہ رے ہم جو کام کیا کمال کا درجہ حاصل کیے بغیر نہ چھوڑا۔ کشتی لڑے تو ایسی ہی۔ اُس گرانڈیل (دہ تیغے تگڑے جوان (بولے) کو ہوٹل میں مارا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ دو پہلوانوں کو چٹکیوں میں لڑا دیا۔ افیم کھائی تو ایسی صبح شام پینک ہی میں رہے۔ کچھ دنیا و ما فیہا کی خبر نہیں۔ جہاز کے ڈوبنے کا غم نہیں۔ افیم کی ڈبیا جانے کا خیال فوراً آیا۔ فارسی پڑھی تو ایسی۔ یہ خود قبول دیتے کہ عرضی کا مطلب سمجھ میں نہ آیا اور کیونکر سمجھیں۔ سمجھنا کیا ہنسی ٹھٹھا ہے؟"

"بولو اب کیا چاہتے ہو؟"

"وہی جو عرضی میں لکھا ہے۔ ہونہہ سمجھنے کے نام لیں۔ ذرا عرضی کھولو پڑھو تو منشیوں کی تحریر منشی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے ویسے کیا سمجھیں۔ ہائے نہ ہوئے آزاد اس وقت وہی داد دیتے۔ بس ایک وہ منشی ہے دوسرے خواجہ بدیع۔"

"آزاد کے پاس جانا چاہتے ہو؟"

"چاہتے وہی ہیں جو عرضی میں لکھا ہے۔ بس کہہ دیا۔"

"عرضی میں کیا اُول جلول لکھا۔"

"صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را   تحسین ناشناس و سکوتِ سخن شناس"

"ہم کچھ نہیں سمجھتے کہ تم کیا بک رہے ہو۔"

"تم سے امید بھی نہیں کہ خواجہ بدیع کی بات سمجھ لو۔ ایک ایک فقرا ہر سہ دفتر ابوالفضل ہے ؎

"ابھی تیغ زباں سے لوں میں کار ذوالفقار آتش   کوئی کافر جو ہو منکر میری معجز بیانی کا"

"آزاد کے پاس جاؤ تو کل بھیجدوں۔"

"بس وہی خواہش ہے جو کچھ عرضی میں ظاہر کی۔ واہ کیا کیا فقرے لکھے ہیں۔

اے قبائے بادشاہی راست بر بالائے تو
دوسرا مصرعہ یاد نیست لہذا حذف شد والائے تو

لطفِ سخن یہ ہے کہ چپٹ قافیہ ملا دیا۔ واہ رے ہیں۔ خواجہ بدیع فرد ہے فرد ثانی نہیں رکھتا۔ اور یہ لوگ بھلا کیا سمجھیں گے۔

کانسل۔ تم سڑی ہو۔ بس چل دو۔ جاؤ یہاں سے۔

جس وقت ہندوستانی نے ان کو سمجھایا کہ کانسل خفا ہو گئے اور حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے چلے جاؤ تم سڑی ہو تو خوجی کی آنکھیں خون کبوتر کی سی سرخ ہو گئیں اور جھلا کر کہا کہ افسوس کیسے ناقدر داں میں آ پھنسے۔ واہ واللہ وہ عرضی لکھی کہ پھڑک جاؤ۔ ابتدا اس شعر

سے کی ہے سینئے گا ذرا ؎

اے قبائے بادشاہی راست بر بالائے تو

دوسرا مصرعہ یاد نیست لہذا حذف شد والائے تو

کیوں سچ کہنا۔ نہ کہوگے واہ رے ہم۔ بالائے تو والائے تو والائے تو واہ وہ فقرہ ملایا ہے کہ سبحان اللہ۔

ہندوستانی (ہند) اے یہ تو سب ہوا ہی کرے گا۔ یہ تو بتاؤ کہ اب کانسل صاحب بہادر کو کیا جواب دوگے؟

خوجی۔ وہی جو عرضی میں لکھا ہے۔

ہند۔ واہی ہو۔

خوجی۔ او گیدی آتنی قرولیاں بھونکی ہونگی کہ۔

ہندوستانی سامنے سے ہٹ گیا۔ کانسل سے کہا خداوند یہ سٹری ہے پکا سودائی، اس کو یہاں سے ہٹائیے۔ خوجی سمجھے کہ ہم نے جو یہاں کئی کشتیاں نکالیں تو ہوا بندھ گئی۔ لوگ اب ہم سے ڈرنے لگے۔ خیر دیکھو آزاد سے کہوں گا کہ وہ عرضی لکھی کہ کوئی سمجھ نہ سکا۔ اور وہ شعر تو سن کر آزاد پھڑک جائیں گے۔

الغرض کانسل نے دو آدمی مقرر کیے کہ جو جہاز اسکندریہ سے قسطنطنیہ جائے اُس پر ان کو سوار کرا دو اور چھ مہینے کے کھانے کے لیے دیدو۔ نقد اور کپڑا۔

ہندی۔ دو آدمی انھوں نے مقرر کیے ہیں کہ آپ کو آزاد کے پاس بھیجدیں۔

خوجی۔ بہت اچھی بات ہے۔

ہندی۔ اب آپ وہیں جائیے جہاں ٹکے ہیں۔

خوجی۔ اچھا سلام کرلوں۔

کانسل کے قریب جا کر کہا حضور آداب عرض ہے۔ بلا لیا، مگر کچھ دن ہم سے پڑھ لو تو فارسی لکھنا آجائے۔ داشتہ آید بکار۔ اگرچہ بود سر مار۔ افسوس ہے کہ ایسے نیک آدمی اور فارسی ذرا بھی نہ سمجھ سکیں۔ ہائے افسوس وائے افسوس۔ بیر شو بیاموز۔

ہندی۔ چلو اب بکو نہ بہت بیہودہ بے تُکا آدمی۔

خوجی۔ کیا؟

ہندی۔ بھائی صاحب ہمارے وطن کے ہو۔ لڑو نہ ہم سے۔

خوجی۔ اچھا اچھا یار ہم کمیدانی کر چکے ہیں۔ فوج میں رہ چکے ہیں، وہ سپہ گری کی بُو نہیں جاتی، مجبور ہیں۔

خدا شاہد ہے ہم نے دل لگانے کی سزا پائی

رہتی ہے یاد ابروئے دلبر تمام رات — کٹتی ہے زندگی تہ خنجر تمام رات
اُس آفتاب کی جو مجھے لو لگی رہی — دُھنتا رہا میں شمع صفت سر تمام رات
اے گردشِ فلک ترا خانہ خراب ہو
رہتے ہیں ہم عذاب میں دن بھر تمام رات

خاتون شیریں ادا حسن آرا بیگم شب کے وقت صاف ستھرے سفید کپڑے پہن کر مہتابی پر ٹہل رہی تھیں۔ سپہر آرا چاندنی پر بیٹھی ہوئی بہار النسا سے باتیں کرتی تھیں۔ مغلانی ادب کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ حسن آرا نے پھولوں کا گہنا پہنا تھا جس کی بُو عنبر بار سے بہشت کی لپٹیں آتی تھیں چاندنی نے کھیت کیا تھا۔ سامنے لق و دق میدان اور سہانا سماں کھیت لہلہاتے تھے۔ غنچے کھلے جاتے تھے۔ رات خوب بھیگی تھی۔ چوطرفہ سناٹا۔ اتنے میں تینوں بہنوں نے دیکھا کہ مغرب کی سمت آگ روشن ہوئی حسن آرا اور سپہر آرا متحیر ہوئیں کہ یہ آگ کیسی ہے۔

حسن آرا۔ اے بہن یہ روشنی کیسی ہے؟ اللہ نہ کرے کہیں آگ تو نہیں لگی؟ روشنی تیز ہوتی جاتی ہے۔ وہ دیکھو سامنے کی طرف آگ لگی ہے۔

سپہر آرا۔ خدا جانے کس بیچارے فلک ستائے کا گھر جل رہا ہے۔ ہائے اس وقت کوئی اس کے دل سے پوچھے کہ اس کے قلب پر کیسی گذرتی ہوگی۔ اس طرف کیا ہے بہار النسا بہن؟

بہار۔ جانے بھی دو۔ کچھ ہوگا بھی۔ ایک دفعہ تو کہہ چکے ہیں۔ اب ہر گھڑی کون نام لے۔ یہ ہندوؤں کا مرگھٹ ہے جہاں ان کے مُردے جلائے جاتے ہیں۔

یہ فقرہ سنتے ہی سپہر آرا کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہوگیا۔ گو لاکھ دل کو سمجھایا مگر اس درجہ خائف ہوئی کہ کانپنے لگی۔ بہار النساء سمجھ گئی۔ پوچھا سپہر آرا تم چپ کیوں ہو رہیں۔ دفعتہً سپہر آرا نے دل کو مضبوط کر کے جواب دیا مگر زبان مارے خوف کے لڑکھڑاتی تھی۔ مغلانی نے کہا چلیئے بیگم صاحب نیچے کے کوٹھے پر بیٹھیے اسی مارے تو ہم آنے نہیں دیتے یہاں کسی کو۔ رات کا سماں۔ میدان کا واسطہ۔ مرگھٹ سامنے۔ چاروں طرف ہو کا عالم۔ یہ تو جنگل ہے جنگل۔ شہر اس کو کون کہتا ہے۔ خاصہ جنگل ہے۔

چاروں طرف وحشت نظر آتی ہے چلیے نیچے کے کوٹھے پر چل کے بیٹھیں۔ حسن آرا نے جو اپنی بہن کی یہ کیفیت دیکھی تو پاس جا کر بہت سمجھایا۔ ہائیں۔ ہائیں۔ سپہر آرا۔ اے واہ پڑھی لکھی ہو کر نادان بنی جاتی ہو۔ چلو منہ دھو ڈالو۔ آخر اس رونے سے مطلب؟ چلو کتنا فالو۔ اتنا اور ایسا بھی ڈر کیا ہے۔ واہ مُردے سے خوف ہی کیا۔ زندہ ہو تو مار بیٹھے۔ کنویں میں ڈھکیل دے چھری بھونک دے۔ مار ڈالے۔ کاٹ کھائے اور مُردہ کیا کر سکتا ہے۔ چاہے جلاؤ چاہے دفناؤ چاہے تکّے تکّے اڑاؤ اس کا بس تھوڑا ہی چل سکتا ہے۔ بہار النسا نے کہا بہن ابھی لڑکی ہے ننھا سا کلیجہ۔ تم اپنی نہ کہو۔ تم ذرا سیانی ہو۔ نام خدا مگر یہ تو ایسی باتوں سے سہم جایا ہی چاہیں۔ اٹھو سپہر آرا ملیں نیچے کے کوٹھے پر۔

سپہر آرا نے حسن آرا سے کہا۔ باجی جان اللہ جانتا ہے کچھ ڈر کے سبب سے نہیں۔ مگر کیا جانے ہمیں اس دم کیا یاد آیا، ہائے اندر والے کو کیوں کر سمجھاؤں۔ قلب کی کچھ عجب کیفیت ہے قابو ہی میں نہیں۔ حسن آرا نے جو یہ کیفیت سنی تو بے اختیار رونے لگی۔ بہار النسا نے کہا لو ایک نشد دو شد۔ اب کس کس کو سمجھاؤں۔ یہ تو دونوں کی دونوں اس دم رو رہی ہیں بس یہاں سے چلو یہ بیٹھے بٹھائے ہُوا کیا۔

الغرض بہار النسا دونوں بہنوں کو نیچے کے کوٹھے پر لے گئی۔ مغلانی نے منہ دھلایا، پنکھا جھلا۔
حسن آرا بیگم کو میاں آزاد یاد آئے۔ اور طرح طرح کے خیالات نے دل میں جگہ پائی۔ خوب پھوٹ پھوٹ روئی۔ بہار النسا دنگ کہ یا الٰہی یہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر دردِ دل سے واقف نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد بہار النسا ادھر اُدھر کی باتیں کر کے چلی گئیں۔ حسن آرا نے تنہائی میں سپہر آرا سے یوں باتیں کیں :۔

حسن۔ تم خود بھی روئیں اور ہم کو بھی رُلایا۔ بہار النسا بہن جانتی سب ہیں۔ مگر بھول بھول جاتی ہیں۔ اب ہر گھڑی انھیں سمجھانے کون بیٹھے۔ ہائے کیا جانے آزاد پر کیا گزری ہوگی۔ ہم تو یہاں خس خانوں میں رہتے ہیں۔ اچھی سے اچھی غذا کھاتے ہیں۔ مسہریوں اور قیمتی پلنگڑیوں پر مزے سے سوتے ہیں ہنستے ہیں بولتے ہیں۔ وہ بیچارہ مورچوں پر جاتا ہوگا۔ رن کی زمین میں غنیم سے مقابلہ کرتا ہوگا۔ یہ سب کانٹے میرے ہی بوئے ہوئے ہیں۔ شکوہ کروں تو کس سے اور شکایت کروں تو کس سے۔ از ماست کہ بر ماست۔

سپہر آرا۔ باجی جان ہائے کیا ستم ہوا، نہ خط کتابت نہ پیام سلام۔ وہ ادھر تڑپ رہے ہوں گے ہم ادھر تڑپتے ہیں۔ اللہ جانے کیا ہوتا ہے؟ اس وقت دریا کے کنارے دھواں اُٹھتے ہوئے جو دیکھا تو سن سے جان نکل گئی۔ آزاد یاد آئے۔ ہائے ایسے ہی میدانوں میں وہ بھی گولی بارود کا مقابلہ کر رہے ہونگے۔

حسن آرا اور بھی زار زار روئی یہاں تک کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ سپہر آرا نے جی کڑا کر کے سمجھایا کہ بہن اب سونے کا خیال کرو، رات بہت آئی۔ مگر حسن آرا نے بجز خاموشی کے کچھ جواب نہ دیا، ور برابر روتی ہی گئی۔ مغلانی نے چپکے چپکے سمجھانا شروع کیا۔ بیوی دنیا میں رہ کر انسان کو سب سہنا ہے رنج بھی غم بھی سب ہی کچھ۔ اب ان باتوں کا کہاں تک خیال رکھیئے گا۔ بس سو رہیئے اللہ فضل کرے گا۔
حسن آرا بیگم بڑی دیر تک کروٹیں بدلا کیں۔ کسی پہلو چین نہ آیا۔ تین بجے سوئیں تو خواب میں میاں آزاد کو دیکھا۔
اتنے میں ایک توپ دغنے کی آواز آئی۔ حسن آرا کی آنکھ کھل گئی تو مرغِ سحر کی آواز کان میں آئی۔ اخاہ۔ تڑکا ہی ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حسن آرا کی طبیعت نہایت بشاش تھی، مگر تھوڑی دیر میں خواب جو یاد آیا تو تڑپنے لگی۔
سپہر۔ باجی جان بندگی رات کو خوب نیند آئی۔ اس وقت بھی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔
حسن۔ آزاد کو آج خواب میں دیکھا۔ جنگ کے میدان میں پڑے سسک رہے تھے۔ آزاد نے ہمیں اور ہم نے آزاد کو مفت عبد الم کیا۔ مجھے سوجھی کیا کہ جانے دیا۔

بہار۔ اماں جان ہم دونوں سے بہت خفا ہیں۔ رات اتنا روئیں کہ توبہ ہی بھلی۔ بڑی دیر تک ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہیں۔ میں نے بہت سمجھایا کہ اماں جان روئیے نہیں حسن آرا آپ کا کہا ضرور مان لیں گی۔ ایسی بات ہے بھلا آپ کے حکم سے انکار کریں؟
حسن۔ ہاں ہاں سمجھی۔
بہار۔ وہ تو صاف صاف کہتی ہیں کہ عسکری بڑا ہونہار ہے۔
سپہر۔ اچھا پھر؟

بہار - پھر پھر نخی ہو۔ سمجھتی تھوڑا ہی ہو۔
حسن - اے چپ رہو سپہر آرا۔
سپہر - نہیں معلوم تو ہو اماں جان کہتی کیا ہیں؟
بہار - کون، وہ تو صاف صاف کہتی ہیں کہ عسکری لڑکا سعید ہے۔
سپہر - تو ایجاب و قبول بھی شرع کے رو سے کوئی چیز ہے یا کچھ بھی نہیں؟
بہار - اللہ ری ڈھٹائی، اُف۔
حسن - یہ سپہر آرا اس وقت خواہی نخواہی بات بڑھاتی ہیں۔
سپہر - ہمیں یہ باتیں بھلی نہیں معلوم ہوتیں۔
بہار - بھلی ہوں معلوم تو کیا اور نہ ہوں معلوم تو کیا - تم ہی ہو کیا - کل کی لڑکی ہو - مگر باتیں بڑھ بڑھ کر بناتی ہو۔
حسن - اے بہن جانے بھی دو - اور کوئی ذکر چھیڑو۔
بہار - ذکر وکر نہیں - ہونا وہی ہے جو اماں جان کہتی ہیں - عسکری گھر بھر کو پسند ہے تم ہو کیا بیچاری اور تمھاری رائے کیا؟
سپہر - تو اس بک بک سے کیا فائدہ بہن بیس دفعہ کہہ چکی کہ اس بات کو طول نہ دو - مانتی ہی نہیں۔
بہار النسا بولی - اللہ جانتا ہے اس میں خون ہو جائے گا مگر اماں جان کی بات نہ ٹلے گی اور موا آزاد خدائی خوار ہے کون؟ ایڑی چوٹی پر سے اپنی قربان کر دوں - واہ خدا جانے کہاں سے آیا - نام معلوم نہ نشان چلی ہیں باتیں بنانے۔
حسن آرا نے جو یہ تقریر سُنی تو آگ بھبوکا ہو گئی - اگر بہار النسا بڑی بہن نہ ہوتیں تو عمر بھر ان کی صورت نہ دیکھتی۔
سپہر آرا نے جو یہ کلمات بہار النسا کی زبان سے سُنے تو تڑ سے جواب دیا - باجی بڑی ہو بس اور کیا کہوں - کوئی اور کہتا تو منہ نوچ لیتی اور جائیے اماں جان سے بھی کہہ دیجیئے کہ اب عسکری لپکری کا نام زبان پر لائیں نہ اور ہم سے کوئی اس قسم کی بات کہی تو ہم زہر ہی کھالیں گے - جائیے کہہ دیجیئے چوری کیا ہے لائیں وہاں سے عسکری۔
حسن آرا اور سپہر آرا تھوڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہیں - اس کے بعد حسن آرا نے کہا بہن یہ بہار النسا کو کیا ہوا کہ ہم سے پھر گئیں؟ سپہر آرا بولیں - ہُوا کیا قسمت کی خوبی اور کیا ہُوا - یہ عسکری کہاں سے آن کے کود پڑے - گھر بھر پر اس نے جادو کر دیا - اماں جان تک ہم سے خلاف ہو گئیں - بس حد ہے نہ۔
حسن آرا نے کہا - اب کیا تدبیر کریں؟ کچھ کرتے دھرتے بن ہی نہیں پڑتی۔
خواص - رزینے کے پاس سے، چلیئے دونوں صاحب، بڑی بیگم صاحب بلاتی ہیں (قریب جاکر) بہار النسا بیگم کہتی تھیں کہ آپ ان دونوں کا بیاہ کر دیجیئے - اور محمد عسکری کو حسن آرا بیگم کے واسطے تجویز کرتی ہیں اور کیا معلوم کیا کیا کہتی ہیں۔ بہت گرمائی ہوئی ہیں - میں تو اچھی طرح سُن ہی نہ سکی۔
بڑی بیگم نے حسن آرا کو بلوایا تو ناچار جانا پڑا۔
حسن آرا - بندگی اماں جان!
بڑی بیگم نے منہ پھیر لیا - حسن آرا کو سخت شاق گذرا - آبدیدہ ہو گئی - یہ پہلا ہی مرتبہ تھا کہ بڑی بیگم نے اس درجہ بے اعتنائی کی ہو - حسن آرا چپ چپ بیٹھی رہی - مثل پیکر تصویر خاموش - اتنے میں بہار النسا بولیں۔

بہار۔ اماں جان تم سے سخت ناراض ہیں حسن آرا۔

بڑی بیگم صاحب نے کہنا شروع کیا کہ عسکری سا لڑکا کوئی مشال (مشعل) لے کر بھی ڈھونڈھے تو نہ پائے۔ ایک تو پڑھا لکھا دوسرے حکیم تیسرے خاندان اچھا۔ پھر ہونہار، آج کل کے زمانے کے لڑکوں کی طرح آوارہ نہیں ہے۔ ہر طرح اچھا، مگر ان کی ضد، اور مجھے ضد سے نفرت۔ جب یہ میرے کہنے میں نہیں ہیں تو پھر مجھ سے واسطہ کیا!

بڑی بیگم نے ایک ماما کو حکم دیا کہ کسی آدمی کو بھیج کر عسکری میاں کو بلاؤ اور خود شہ نشین میں جا بیٹھیں۔ حسن آرا اُٹھ کر کوٹھے پر گئی اور جاتے ہی مسہری پر لیٹی۔ اور لیٹتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگیں۔

بہار کمرے میں تشریف لائیں۔ حسن آرا کی طرف مخاطب ہو کر بولیں۔ ہم سے عسکری نے اس وقت کہا کہ چلو کوٹھے پر چل کر بیٹھیں۔ ہم نے کہا چلو اچھا۔ تم دونوں اس پردے کی آڑ میں ہو جاؤ تو وہ بھی بیٹھیں۔ کھانا نکلوایا جائے۔ اماں جان کو سچ مچ بدہضمی ہے۔

حسن آرا نے جو محمد عسکری کا نام سُنا تو کانپ اُٹھی۔ سپہر آرا نے حسن آرا اور حسن آرا نے سپہر آرا کی طرف دیکھا۔ بہارالنسا نے ماما سے کہا، ذری وہ کرسی تو باہر برآمدے میں بچھا دو۔ بیٹھو محمد عسکری۔

عسکری۔ جی ہاں بیٹھا ہوں۔ آپ تکلیف نہ کیجیے۔ خوب ہوادار مکان ہے۔

بہار۔ ہاں خوب ہوا چلتی ہے۔

عسکری۔ اب حسن آرا کی طبیعت کیسی ہے؟

بہار۔ پوچھ لو۔

عسکری۔ نہیں بتاؤ تو آخر؟

بہار۔ اب تو فضل الٰہی ہے۔ اچھی ہیں۔ وہاں البتہ سخت علیل ہو گئی تھیں تو ہم نے یہاں بُلا لیا۔ یہاں جب سے آئی ہیں تب سے صحت ہے۔

عسکری۔ شکر ہے۔

بہارالنسا اور حسن آرا اور سپہر آرا نے تھوڑی دیر میں کھانا کھایا۔ محمد عسکری رخصت ہوئے۔ بہارالنسا نے کہا حسن آرا اب بولو۔ کیا کہتی ہو، حسن آرا نے کہا۔ کیا کیا کون بات ہے؟ سپہر آرا تنک کر بولی اب کوئی اور بات بھی ہے یا دن رات یہی تذکرہ ہے؟

حسن آرا کو بہارالنسا بیگم کی گفتگو ازبس ناگوار گذری مگر سکوت اختیار کیا۔ بہارالنسا نے پھر کہا چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے عسکری کی نسبت جو ہمارا خیال ہے وہ نہ ٹلے گا۔ اور وہی ہونا ہے نہیں تو اماں جان ابھی ابھی آج ہی قسم کھا چکی ہیں۔ کہ صورت نہ دیکھیں گی تم دونوں کی بس اب تمھیں اختیار ہے۔ چاہے مانو چاہے نہ مانو۔

دو دن اسی کیفیت میں گذرے۔ بڑی بیگم، حسن آرا اور سپہر آرا دونوں سے نہ بولیں۔ جب کبھی حسن آرا سامنے جائیں بڑی بیگم منہ پھیر لیں۔ دونوں بہنیں سخت مصیبت میں مبتلا تھیں۔ دن رات گریہ و زاری۔ سوچیں کہ یہاں تو سب کے سب ہمارے خلاف ہیں۔ آؤ روح افزا بیگم کو بلوائیں۔ شاید وہ ہمارا ساتھ دیں۔ مغلانی کو حکم دیا کہ تم خود ڈولی پہ سوار ہو کر کسی بہانہ سے روح افزا بہن کے پاس جاؤ اور کہو اللہ کے لیے آپ دو دن کے لیے یہاں آ جائیے، ہماری جان پر بن آئی ہے اور تم صاف صاف کہنا کہ ایک نہ ایک دن دونوں بہنیں زہر کھا لیں گی۔ جس طرح بن پڑے، ان کو لے ہی آؤ۔

مغلانی نے کہا میں ابھی ابھی جاتی ہوں۔ جہاں تک بن پڑے گا بہت کہوں گی اور کہنا کیا۔ حضور وہ جس وقت یہ باتیں سنیں گی فوراً خود ہی دل نہ مانے گا کہ نہ آئیں۔ خدانخواستہ ایسی حالت ہو اور وہ نہ آئیں۔

اتنے میں بہار النسا نے کہلا بھیجا کہ عسکری آئے ہیں۔ نبض دیکھیں گے پردہ کرو۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بہار النسا بیگم ناز و ادا سے کوٹھے پر تشریف لائیں اور آتے ہی کہا۔ اے حسن آرا ذری پردہ کر کے محمد عسکری کو نبض دکھا دو زینے پر کھڑے ہیں۔ حسن آرا مجبور رہو گئی۔ اچھا کہہ کر کرے میں گئی۔ سپہر آرا کو اشارے سے بلایا اور کہا بہار النسا بہن تو باہر ہی بیٹھیں گی۔ ہمارے عوض تم نبض دکھاؤ دیکھو تو یہ عسکری ہیں کتنے۔ سپہر آرا نے مسکرا کر کہا اچھا اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر نبض دکھائی۔

عسکری۔ دوسرا ہاتھ لائیے۔

بہار۔ بخار تو نہیں ہے خدانخواستہ؟

عسکری۔ خفیف سا ہے۔ ضعف بہت ہے اور کیوں کر نہ ہو سخت تپ تھی۔ نسخہ لکھ کر بھیجوں گا۔

حسن آرا نے بہار النسا کو اشارے سے بلایا۔

حسن۔ بڑے نبّاض ہیں آپ کے عسکری۔

بہار۔ کیا شک بھی ہے۔

حسن۔ اُف۔ مارے ہنسی کے بُرا حال ہے اس وقت وارے حکیم۔

سپہر۔ نیم حکیم خطرۂ جان۔ نیم ملّا خطرۂ ایمان۔

بہار۔ یہ کاہے سے۔ کچھ وجہ بھی تو ہو یا یوں ہی بے وجہ؟

حسن۔ نبض کس کی دیکھی تھی؟

بہار۔ تمھاری۔

حسن۔ اے واہ کہیں دیکھی نہ ہو۔ بس دیکھ لی حکمت۔

بہار۔ پھر کس کی نبض دیکھی۔ کیا سپہر آرا بیٹھ گئی تھیں؟

سپہر۔ (ہنس کر) ہاں اور نہیں تو کیا؟ بندگی۔ ضعف بتاتے تھے۔ ضعف ہمارے دشمنوں کو ہو۔ واہ مفت میں بدشگونی کی بات اور خفیف سا بخار بھی بتایا۔

بہار۔ (شرما کر) بھلا علاج میں کیا ہنسی کرنی تھی۔

محمد عسکری شاداں و فرحاں گھر گئے اور آج خوش کیوں نہ ہوں گے۔ سپہر آرا کی نبض دیکھی۔ حسن آرا سے باتیں کیں اور انھوں نے ہنسی ہنسی میں انھیں بیوقوف بنایا۔ سوچے کہ اب کی جاؤں گا تو کہوں گا۔ ایک ہوئی یاد رکھیے گا۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد نکاح ہو۔ اب نیم راضی ہو گئی ہیں۔

حِصّۂ دُوُم

بات بڑھ گئی

دونوں بہنیں باتیں کر رہی تھیں کہ بہار النسا بیگم آئیں۔

حسن۔ (مسکرا کر) آئیے۔

بہار۔ آج ہم تم سے بہت خوش ہوئے

سپہر۔ بھلا خیر شکر ہے۔

بہار۔ کہنا مانا نہ۔ خوش ہو گئے۔

سپہر۔ کیا کہنا مانا؟

حسن۔ نبض دکھائی اسی کے سبب سے خوش ہوئیں۔

بہار۔ ہاں اللہ جانتا ہے جی خوش ہو گیا۔

حسن۔ اور نبض دکھائی کس نے؟

سپہر۔ نبض دکھائیں ہم اور خوش آپ اُن سے ہوں۔

حسن۔ اور اس میں خوشی کی بات ہی کیا ہے؟

بہار۔ اب دس بارہ دن میں اماں جان تم سے پوچھیں گی کہ محمد عسکری کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھا جاتا ہے کہو منظور ہے؟

حسن۔ (چونک کر) کیا؟

سپہر۔ کیا کیا؟

بہار۔ تمہاری اور ان کی شادی کی فکر ہے۔ ان کا تو محمد عسکری کے ساتھ نکاح ہوا داخل ہے۔ اس میں ذرا شک نہیں۔

حسن۔ اُف۔

اُف کہہ کر حسن آرا گر پڑی اور خوب ہی روئی۔

اب سنیئے کہ روح افزا بیگم کے ہاں بی مغلانی ڈولی پر گئیں اور روح افزا سے کہا حضور بس اب دیر نہ لگائیے۔ جلدی کیجیئے روح افزا ازبس متحیر ہوئی کہ یہ کیا کہہ رہی ہے پلو چھا کہتی کیا ہو۔ بی مغلانی جلدی کیسی۔ کس امر میں جلدی کروں مغلانی نے کہا تین دن سے گھر کی کچھ عجب ہی کیفیت ہے۔ بڑی بیگم صاحب بیزار خرابی کھانا کھاتی ہیں۔ حسن آرا بیگم دن رات روتی ہی رہتی ہیں۔ سپہر آرا کو ہر دم اُداس پایا۔ بہار النسا بیگم سے ان دونوں بہنوں سے نہیں بنتی۔ جلی کٹی سنایا کرتی ہیں۔

روح افزا سخت ملول ہو کر بولی۔ یہ تم نے بُری سُنائی۔

مغلانی۔ اب کسی ترکیب سے آپ چلی چلیں۔

تھوڑی دیر کے بعد روح افزا بیگم فنس پر سوار ہوئیں مصری ساتھ چلی اور ایک سپاہی۔ بی مغلانی کی ڈولی پیچھے پیچھے۔ دن سنے داخل ہوئیں۔ روح افزا کو دیکھ کر بڑی بیگم متحیر ہوئیں۔

روح افزا۔ اما جان بندگی!
بیگم۔ جیتی رہو۔ تم کیوں کر آئیں؟
روح۔ چلی آئی۔
بہار۔ کیا روح افزا آئی ہیں؟
روح۔ جی ہاں۔ بندگی۔ شہ نشین سے باہر آئیے۔
بہار۔ کب آئیں؟
روح۔ ایلو اور سنو۔ ابھی ابھی چلی آتی ہوں۔
بہار۔ خوب آئیں۔
روح۔ حسن آرا، سپہر آرا کہاں ہیں؟
بہار۔ ہونگی کہیں۔
روح۔ کیا؟
بہار۔ ہمیں ان کا حال معلوم نہیں۔ کوٹھے پر ہیں۔
روح۔ بلوائیے۔
بہار۔ ہم سب سے دونوں بہنیں خفا ہیں۔
روح۔ ایں! یہ آپ آج کیا کہہ رہی ہیں۔ خفگی کیسی؟ اما جان یہ کہتی کیا ہیں؟
بیگم۔ ہمیں نہیں معلوم۔
روح۔ اے ذری حسن آرا کو تو بلانا۔

حسن آرا اور سپہر آرا کو جو روح افزا کے آنے کی خبر ہوئی تو باچھیں کھل گئیں۔ اتنے میں بہار النسا اور روح افزا اُن دونوں کے پاس آئیں۔ مارے خوشی کے سپہر آرا روح افزا سے گلے ملیں اور خوب روئیں۔

روح۔ ایں۔ اے واہ جیسے کوئی۔
بہار۔ بیٹھو۔ بیٹھو۔
روح۔ حسن آرا، تم کو کیا ہو گیا؟ وہ صورت ہی نہیں۔ وہ رنگ روپ ہی نہیں۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ ہماری تو سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

حسن آرا نے جواب نہ دیا مگر رونے لگی۔

روح۔ (گلے مل کر) ہائیں! ہائیں!!
سپہر۔ آپ کو یہاں کا حال بھی معلوم ہے۔ یہاں سب ہم سے خلاف ہیں اور اللہ جانتا ہے بے وجہ۔ اور یہ سب ہماری بہن کے سبب سے۔ بہار النسا بیگم صاحب۔ جی ہاں۔ کیا جانے اما جان سے کیا کیا کہا جا کر۔ اب وہ اتنی خفا ہیں کہ بات کیا جو بندگی کریں تو منہ پھیر لیتی ہیں۔ کھانا بڑی خرابی سے کھاتی ہیں۔ اور بہار النسا بہن ہماری دونوں کی شکایتیں کرتی جاتی ہیں اب بھی باز نہیں آتیں۔ ہم کیا بتائیں بہن کہ آج کل کیسی گذرتی ہے۔ کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سب حرام ہے۔ اور ان کی قطع تو آپ نے دیکھ لی ہے۔ پہچان نہیں پڑتیں۔ آخر کوئی تو سبب ہے۔

بہار - تم کہ لو سب تو پھر ہم بھی کہیں - ہم ساری داستان کہ سنائیں گے۔
حسن - وہ کہہ چکیں اب آپ فرمائیں۔
بہار - ناک میں دم کر دیا۔
روح - یا اللہ ایسی عداوت ہے کہ سرے ہی سے شکایت۔
بہار - تمھیں کچھ حال تو معلوم ہی نہیں۔
روح - اے تو بتاؤ؟
حسن - ہاں فرمائیے!
بہار - دیکھو روح افزا تم فہمیدہ ہو - ذرا غور سے سُنو۔
سپہر - اب کچھ کہیئے گا بھی؟
بہار - بڑی بوڑھی کا کہنا لڑکیوں کو ماننا چاہیئے یا نہیں - یہ بتائیے پہلے۔
روح - ضرور۔
بہار - بس اب ان سے پوچھ لو۔
روح - کس سے پوچھوں؟ یا اللہ - کوئی بتاتا ہی نہیں۔
بہار - حسن آرا اتنا یاد رکھنا کہ شادی تمھاری عسکری ہی کے ساتھ ہوگی اور وہ جس موئے کا تم کو خیال ہے وہ دل سے دور کر دو۔
روح - ائیں - ائیں! باجی کوئی ایسی تقریر کرتا ہے۔
بہار - اب بے اس کے مانیں ہی گی نہیں یہ - کیوں جی عسکری میں کیا بُرائی ہے - شریف نہیں ہے وہ یا پڑھا لکھا نہیں یا خوش قطع نہیں ہے - آخر وہ بات کیا ہے اس میں جو یہ انکار کریں - اور اگر ایسا ہی انکار ہے تو خدا حافظ بس ہو چکی۔
سپہر - اب ہم سے چپ نہیں رہا جاتا - اور چپ کیوں رہیں - کلیجا پیپ ہو گیا - چپ کا کوئی ٹھکانا بھی ہے - اب اس سے بڑھ کر لعد کیا ہوگا - اماں جان نے بولنا تک چھوڑ دیا، بات کرو تو منہ پھیر لیں۔
حسن آرا - اچھا وہ جو کہیں می زیبد - بڑی بہن ہیں۔
سپہر - ہاں بیشک - مگر بڑی بہنوں کو ایسا نہ چاہیئے۔
روح - تو یہ کہو - بات بڑھ گئی ہے - اس قدر نوبت پہنچی اور ہم کو اطلاع ہی نہیں اور روز آدمی آتے جاتے تھے - ذری بھی کچھ حال معلوم ہوتا تو فوراً ہی آجاتی۔
بہار - اب آئی ہو تو کیا بنا لوگی؟ یہ ایک نہ مانیں گی۔
روح - وہ تو شاید مان بھی جائیں مگر آپ کا مان جانا البتہ ذری مشکل ہے۔
بہار - ہاں تو یہ کہیے - آپ اُن کی طرف سے لڑنے آئی ہیں - خیر
روح - ہاں ہم سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ خواہی نخواہی جھگڑا ہو بے کار بے کار
حسن - اور کیا - پوچھو کہ لڑائی ہے کس بات کی۔
بہار - اچھا تم اتنا کہہ دو کہ عسکری کے ساتھ نکاح منظور ہے۔

روح - ارے تو باجی یہ ہمیں نہیں اچھا معلوم ہوتا کہ بے سمجھے بوجھے قبولوا لیتی ہو۔
بہار - اچھا نہ سہی۔ تو یہ خود مختار ہیں پھر؟
سپہر۔ اجی آپ سے کیا واسطہ۔ ہم عسکری کا نام نہیں سننا چاہتے۔
حسن آرا نے روح افزا سے کہا۔ بہن اب میں کیا کروں ۔ اماں جان اور بندگی کے جواب میں منہ پھیر لیں۔ ہے ہے خون آنکھوں میں اتر آیا۔ مگر مجبوری ہے ۔ اور یہ بہار النسا بہن اس کے کہنے میں جاتی ہیں جن کو یہ بڑا حکیم اور یہ وہ سمجھتی ہیں۔
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بڑی بیگم صاحب جریب ٹیکتی ہوئی تشریف لائیں۔
روح - آئیے اماں جان۔ حسن آرا بندگی کرو۔
حسن - (آہستہ سے) بندگی اماں جان!
بیگم نے جواب نہ دیا۔
روح - اماں جان حسن آرا بندگی کرتی ہیں۔
بیگم - میں اونچا نہیں سنتی ہوں۔
روح - نہیں آپ نے جواب نہیں دیا نہ۔
بیگم - کوئی تو وجہ ایسی ہے۔
روح - ہمیں کیا معلوم۔
بیگم - میں اس وقت صاف کہے دیتی ہوں کہ عسکری کے ساتھ نکاح ضرور ہوگا۔ اس میں چاہے ساری خدائی ایک طرف ہو کسی کی نہ سنوں گی۔ حسن آرا سے کہو کان کھول کے سن لیں۔ میں جان دوں گی۔ مگر کر دنگی یہی جو کہتی ہوں اس میں فرق نہ پڑے گا۔ یہ نہ مانیں گی تو زہر کھاؤں گی۔ مگر کر دنگی یہی جو کہہ رہی ہوں - ایک دفعہ میں نے دھوکا کھایا تھا کہ ایک جگہ سے پیغام آیا اور میں نے منظور کر لیا - اور پھر وہ لڑکا چور نکلا۔ مگر عسکری کو تو گودی کھلایا ہے۔ نام خدا ہونہار ہے ہوشیار لکھنے پڑھنے میں طاق اور وضعدار۔ سیدھا لائق - بس اگر یہ ہوا تو میں جان دے دوں گی بس۔
اس تقریر نے حسن آرا کے ساتھ وہ کیا جو موت جان کے ساتھ کرتی ہے۔ بڑی بیگم تو کہہ کر چلی گئیں۔ حسن آرا اس قدر روئی کہ آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ روح افزا نے سمجھایا تو حسن آرا نے کہا۔ بہن اب سمجھنا بیکار ہے - اماں جان مانیں گی نہیں اور ہم سوا آزاد کے اور کسی سے شادی نہ کریں گے۔ نتیجہ یہی ہونا ہے کہ ہم ہی نہ ہونگے - جنازہ کل پرسوں تک نکلتا ہوگا۔ سپہر آرا نے جو یہ سنا تو حسن آرا سے چمٹ کر خوب زار زار روئی۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

حسن آرا بیگم کی جان عذاب میں تھی۔ بڑی بیگم سے بول چال ترک۔ بہار النسا سے محبت یک قلم القط۔ محمد عسکری روز ایک نیا گل کھلاتے تھے۔ روح افزا بھی ان سے خلاف ہو گئی تھیں۔ مغلانی اور مہری کو سمجھا دیا تھا۔ اگر حسن آرا کی کوئی بات مانی تو گھر سے نکال دی جاؤ گی۔ بہار النسا کے شوہر نواب صاحب بھی اپنی بیوی ہی کا جنبہ کرتے تھے۔ ہاں ایک سپہر آرا بیچاری البتہ ان کی ہمدرد تھی۔ دونوں بہنوں کا کھانا حرام، دن کو گریہ زاری، شب کو اختر شماری۔ ایک دم چین نہیں۔ دونوں صید مصائب، دونوں کا گھر بھر دشمن۔ ہنسا بولنا بالائے طاق۔ زار زار رونے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔

محمد عسکری ایک ہی کائیاں۔ حسن آرا کے جمال مبین پر ہزار جان سے عاشق۔ بہار النسا بیگم کے دل میں ان کی جگہ۔ بڑی بیگم ان کی مداح۔ روح افزا ان کی ثنا خواں۔ مغلانی کو پانچ روپے دیئے ان کا دم بھرنے لگی۔ پیاری کو جوڑا بنوا دیا۔ اس کی یہ کیفیت کہ ادھر محمد عسکری دروازے پر آئے اور وہ کودتی ہوئی دوڑی کہ "عسکری میاں آئے۔" نواب صاحب ان کے لنگوٹیے یار۔ حافظ جی کو بھی گانٹھ لیا تھا۔

حسن آرا اور سپہر آرا کے لیے کوٹھے پر کھانا بھیج دیا جاتا تھا اور دوسرے تیسرے دن جب روح افزا رہتی تھیں ان سے تھوڑی دیر کے لیے ملتی تھیں۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔ ایک روز روح افزا چپکے چپکے اوپر آئیں۔ دیکھا کمرے کے سب دروازے بند ہیں۔ متحیر تھیں کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ دروازے بند۔ سناٹا۔ کوئی منکتا تک نہیں۔ ایک شیشے کی راہ سے جھانک کر دیکھا کہ حسن آرا ہچکیاں لے کر رو رہی ہیں اور سپہر آرا سر بزانوئے تفکر نہایت ہی اداس۔ تھوڑی دیر تک کھڑی دیکھا کیں۔

روح۔ اے مہری ذری برف کا پانی تو لاؤ صراحی میں۔

مہری صراحی میں برف کا پانی لے کر آئی۔

روح افزا نے کہا واسطے خدا کے بتاؤ تو ماجرا کیا ہے؟ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں کیوں بھرتی ہو کیا ہوا کیا؟ گھر میں ہنسی خوشی درکنار جب دیکھو آئے دن نت نیا جھگڑا جسے دیکھو منہ پھلائے بیٹھا ہے یہ ہوا کیا ہے آخر ہمیں تو کچھ تعل بیڑا ہی نہیں معلوم ہوتا۔

حسن آرا نے جواب نہ دیا۔ سپہر آرا نے کہا کہ جلے ہوئے کو جلانا مرے ہوئے کو مارنا کس مذہب میں روا ہے بھلا۔ جان بوجھ کر انجان بنتی ہو بہن۔ بھلا تم سے کوئی بات پوشیدہ ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ تم بھی ہمارے خلاف ہو گئیں۔ خیر اللہ مالک ہے۔

روح افزا تنک کر بولیں۔ چہ خوش۔ تمہاری تو نئی باتیں ہیں۔ جلے کو جلانا۔ اللہ اللہ یہ کلمہ اور ہماری نسبت۔ جہاں تمہارا پسینہ گرے وہاں ہم لہو گرائیں اور تم سمجھتی ہو کہ ہم تمہیں جلاتے ہیں۔

حسن آرا نے کہا سنو باجی۔ اب صاف کہلواتی ہو تو بسم اللہ۔ یہ بتاؤ کہ تم جانتی کونسی بات نہیں ہو جو پوچھتی ہو۔ جو بہار النسا بہن پوچھتیں تو ہم سمجھتے کہ چھیڑنے کے لیے کہتی ہیں۔ مگر بہن تمہارا پوچھنا البتہ برا معلوم ہوتا ہے۔ روح افزا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پوچھا وہی ان کا معاملہ نہ۔ وہ جن کو بہار النسا بہن اٹھائی چولھا کہتی ہیں۔ حسن آرا نے کہا۔ جس کا جو جی چاہے سو کہے۔ مگر آپ سے امید نہ تھی۔ روح افزا بولیں۔ اے تو ہم سے کیا واسطہ۔ باجی کہتی ہیں کچھ ہم کہتے ہیں۔

حسن آرا نے کہا تم سے ہم صاف صاف کہہ چکے کہ آزاد کو ہم نے دل دیا بُرا کیا یا بھلا کیا۔ اگر اس میں کوئی بدی کی بات ہو تو اللہ ہم سے سمجھے پھر اب عسکری کو دل کیوں کر دیں۔ یا تو عمر بھر کنوارے پنے میں بسر کریں گے یا آزاد کے ساتھ نکاح ہوگا۔ بہن تم اتنا تو سوچو اپنے دل میں کہ ہمارا قصور اس میں کیا ہے جو کوئی بدی کی بات دیکھو تو سرزنش کرو۔ ٹوکو۔

سپہر آرا بولیں بس ہم اس بات سے خوش ہو گئے کہ صاف صاف کہہ دیا۔ اے آخر ش خوف کا ہے کا ہے۔ کچھ معلوم تو ہو۔ کہہ دیا سمجھا دیا کہ آزاد آئیں گے تب ہی نکاح ہوگا ورنہ نکاح نہ ہوگا۔ ایسے ایسے تین سو ساٹھ عسکری ہوں تو کیا ہے۔ ہزار دفعہ کہہ دیا۔ لاکھ بار کہہ دیا۔ پھر اب کیوں کر کہیں۔ کہتے تو جانتے ہیں کہ جو کوئی بدی کی بات ہو تو تنبیہہ کرو۔

اتنے میں بی مغلانی نے آن کر کہا۔ لیجئے حضور کہا ہے یہ تصویر ہمارے کمرے میں لٹکا دیجیے۔ روح افزا نے تصویر لے لی۔ دیکھتے ہی مسکرائی اور کہا بس یہی چھیڑ خانی تو اچھی نہیں۔ پہلے تو تصویر چھپا لی۔ مگر تھوڑی دیر میں سپہر آرا کو دے کر کہا۔ بھلا بوجھا تو تو کس کی ہے۔ سپہر آرا نے تصویر لے کر کہا۔ کیا معلوم کس کی ہے مگر اوہ بہن ایسی بھدی تصویر آج تک نہیں دیکھی۔ واہ ماشاءاللہ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ غبی آدمی ہے۔ ہونٹ بھدے دانت نکلے ہوئے آنکھیں ذرا ذرا سی۔ گال پھولے پھولے۔ ناک بڑی اور لمبی۔ بھوں خراب۔ سارا نقشہ بُرا ہے۔ واہ ماشاءاللہ کیا تصویر دکھائی ہے آپ نے، اسے ہٹاؤ بھی۔ کیا جانے کس موئے گھامڑ کی تصویر ہے۔

روح افزا نے کہا۔ ماشاءاللہ کیا نظر ہے آپ کی۔ بس جاؤ دیکھ لیا۔ یہ بھونڈی تصویر ہے۔ چلو بس رہنے دو۔ ایسا ایک جوان تو نظر نہیں آتا پتلے پتلے ہونٹھ۔ لال لال گورا گورا مکھڑا اور پیارے پیارے گال۔ کلے ٹھلے کا جوان گبھرو ہے۔

حسن۔ بتاؤ روح افزا بہن کہ اماں جان سے کیوں کر بولیں۔ اب ہماری تو تو نعم ہی ٹوٹ گئی بے لحاظی بھی کی مگر وہی ڈھاک کے تین پات اچھا اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے۔ ہم شادی نہیں کرتے بے حیا ہے ہی رہے سہی۔ پھر اس میں شرم ہی کیا ہے۔ کل بہار النسا بیگم نے وہ بات کہی کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہائے غضب۔ روح افزا نے کہا کس نے بہار النسا بیگم نے۔ بہار النسا بہن نہیں سمجھیں اب۔ حسن آرا بولی۔ پہلے سن تو لو بہن وہ بات کہی کہ دل پر اب تک صدمہ ہے۔ کہنے لگیں کہ ہمارے پاس کیوں آ کے بیٹھیں گی۔ اپنے ہونے سوتے کے پاس بیٹھیں گی۔ ہے ہے یہ آسمان کیوں نہیں پھٹ پڑتا۔ ارے غضب۔ ہمارے حق میں اور یہ کلمہ اور ایک دفعہ کہا تھا کہ بی مغلانی تم نہیں سمجھیں یہ حسن آرا کی کھٹ چالیں ہیں۔ اب بولیے جگر پاش پاش ہو کہ نہ ہو؟ مگر کہوں کس سے کوئی سننے والا بھی ہو جب۔ خیر جی اللہ مالک ہے۔ ہم بیگناہ ہیں۔ اس سے تو وہاں اپنے شہر ہی میں اچھے تھے۔

بہار النسا بیگم نے آن کر کہا۔ روح افزا لو سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا اب دونوں سے پوچھ لو منظور ہو تو تیاریاں ہوں۔ روح افزا اور بہار النسا نے چپکے چپکے کچھ باتیں کیں۔ بہار النسا چلی گئی۔ روح افزا نے ان دونوں بہنوں سے آن کر کہا بڑا بڑا سامنا ہے۔ اماں جان نے قسم کھائی ہے کہ عسکری ہی کے ساتھ حسن آرا کا نکاح ہو۔ اور سپہر آرا کے لیے نواب باقر علی خاں کے بھتیجے کو تجویز کیا ہے۔ اگر تم دونوں منظور کرو گی تو خیر ورنہ اماں جان تمہاری صورت عمر بھر نہ دیکھیں گی اور بھی بہت سی باتیں کہیں۔ کہاں تک بیان کروں۔ کہتی تھیں کہ شاید اماں جان ایک مکان میں ساتھ نہ رہیں۔ حسن آرا نے متحیر ہو کر پوچھا۔ کیا؟ سپہر آرا نے دانتوں تلے انگلی دبائی۔

مغلانی نے زینے پر سے کہا حضور اخبار آیا ہے۔ پڑھیے تو لاؤں نہیں تو نواب صاحب کے پاس بھیج دوں۔ حسن آرا نے کہا۔ لاؤ لاؤ ہم پڑھ لیں تو بھیجے جانا۔ سپہر آرا دوڑ کر اخبار لائی۔ حسن آرا نے ادھر ادھر مضمون اور سطریں پڑھیں۔ پڑھتے پڑھتے دفعتاً ایک مضمون کی سرخی نظر پڑی۔ دیکھتے ہی چونک اُٹھی۔ بشرے سے حیرت اور مسرت نمودار تھی۔

" ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ میاں آزاد ٹرکی میں ایک سائیس کی نوجوان بیوی پر عاشق ہوئے۔ لاحول ولاقوۃ۔ لاحول ولاقوۃ۔ اے پھٹکار کجا یہ قول و اقرار کجا یہ کردار۔

اس شخص نے اپنے اس خرقۂ سالوس سے اُس خاتون عفیفہ کو بڑا دھوکا دیا۔ مگر للہ الحمد کہ وہ معصوم ہی رہی۔ ہم کو یقین واثق ہے کہ جب بیگم یہ خبر وحشت اثر سنے گی تو آزاد کے نام پر لاحول پڑھے گی، مگر افسوس ہے کہ اس بیچاری تک یہ خبر نہ پہنچنے پائے گی۔ وہ شب روز آزاد کی جدائی میں جلے گی اور یہ خبر ہی نہ ہونے پائے گی کہ میاں آزاد وہاں گلچھرے اُڑا رہے ہیں۔ بیگم کو شکر کرنا چاہیئے کہ ایسے دون منش کے زورِ[1] سے انھوں نے نجات پائی "

حسن۔ سپہر آرا ہم تو ایسا نہیں سمجھتے تھے۔

سپہر۔ باجی یہ سب غلط ہے۔

حسن۔ کیا قسمت کی خوبی ہے جو کام ہوا بُرا ہی ہوا۔

سپہر۔ یہ سب افترا پردازی ہے۔

حسن۔ اخبار والے نے خوب لکھا ہے:

کہ خبثِ نفس نگردد بسالہا معلوم

سپہر۔ باجی جان ہم تو فال دیکھیں گے۔

سپہر آرا نے فال دیکھی کہ یہ خبر سچ ہے یا غلط؟ یہ غزل نکلی۔

خوش آمد گل وزاں خوشتر نباشد — کہ در دستت بجز ساغر نباشد
بیا اے شیخ در خمخانۂ ما — شرابے خور کہ در کوثر نباشد

سپہر آرا کو تو ڈھارس ہوگئی کہ حافظ شیرازی نے سچا سچا حال بتایا۔

حسن آرا نے کہا۔ ہمارا تو شیشۂ دل چور چور ہوگیا۔ ہائے ہم کیا جانتے تھے کہ عشق خانہ خراب، یہ نتیجہ اور بُرا دن دکھائے گا۔

نامِ اُلفت سے ہم نہ تھے آگاہ — کسی یوسف کی تھی نہ ہرگز چاہ
عیش و عشرت سے کٹتی تھی اوقات — چہچہوں میں گذرتے تھے دن رات
جان دیتے نہ تھے کسی گُل پر — ہنستے تھے نالہائے بلبل پر
دم نکلتا تھا تیغ ابرو سے — دل اُلجھتا تھا ذکر گیسو سے
قیس کا سنتے تھے جو افسانہ — کہتے تھے وہ بشر تھا دیوانہ

مگر ہے ہے یہ معلوم ہی نہ تھا۔

جب طبیعت کسی پہ آئے گی
ساری حکمت یہ بھول جائے گی

سپہر۔ اگر یہ سچ ہے تو بڑا چھچھورا پن کیا۔ یہ سوجھی کیا؟ پھر اتنی دُور گئے کیا کرنے تھے؟ مگر یہ خبر ضرور غلط ہے۔

روح افزا جو کوٹھے پر آئی تو سپہر آرا نے کہا ذرا باجی کو تو دیکھو۔ پوچھا کیوں کیوں کیسی ہے۔ کہا کیا بتاؤں ایسا

---

[1] فریب جھوٹ۔

بخار ہے کہ نبض پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔ بدن خدانخواستہ تنور کی طرح جل رہا ہے۔ روح افزا نے دلائی ہٹا کر دیکھا تو کہا اُف یہ اتنی ہی دیر میں تپ آ گئی۔

نواب صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا تو رنگ فق ہو گیا۔ پوچھا یہ حال کب سے ہے؟ ہمیں کسی نے اطلاع بھی نہ کی۔ حسن آرا نے بہت آہستہ سے کہا۔ دولھا بھائی۔ اس کے بعد کچھ کہنے کو تھی مگر غشی طاری ہو گئی۔ بڑی بیگم نے کہا، سورۂ حمد دم کرو۔ سورۂ حمد دم کرو۔ روح افزا نے کہا دولھا بھائی ڈاکٹر کو بلواؤ۔ اتنے میں محمد عسکری صاحب تشریف لائے۔

عسکری۔ ہم آئیں۔

بہار۔ اے چلے بھی آؤ اس وقت۔ عسکری ذری نبض تو دیکھو میرے بھائی کچھ تبا۔ اے یہ دم کے دم میں کیا ہو گیا۔

عسکری۔ (نبض دیکھ کر) بڑے حکیم صاحب کو بہت جلد بلوائیے۔

بہار النسا نے محمد عسکری کو علیحدہ لے جا کر پوچھا۔ بھائی عسکری سچ سچ بتانا حسن آرا کیسی ہے؟ محمد عسکری نے کہا۔ بہن کیا بتاؤں نبض ہی نہیں ملتی۔ اس فقرے پر بہار النسا نے دوہتڑ پیٹنا شروع کیا۔ عسکری نے کہا اب مجھے جانے دو مگر جب تک وہ آئیں یہاں خدا جانے کیا ہو جائے گا؟ بہار النسا اور بھی روئی اور سر پیٹنے لگی۔ نواب صاحب نے آن کر سمجھایا اور کہا یہ وقت دوا اور علاج کا ہے۔ اور رونا تو عمر بھر ہے۔ بہار النسا جی کڑا کر کے کمرے میں آئی۔ آنکھیں لہو کی بوٹیاں بدن تھر تھر کانپ رہا ہے۔

محمد عسکری فوراً پالکی پر سوار ہو کر بڑے حکیم صاحب کو بلانے گئے اور نواب صاحب نے کوچمین کو حکم دیا کہ ابھی ابھی فٹن تیار کرو۔ ذرا دیر نہ ہو۔ ہمایوں فر نے پوچھا خیر تو ہے۔ یہ آج سب کے سب بدحواس کیوں ہیں؟

نواب صاحب نے حال بیان کیا تو ہمایوں فر بھی آبدیدہ ہو گئے۔ کہا آپ یہاں ہی رہیں، میں جا کر سول سرجن کو ساتھ لاتا ہوں۔

نواب صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ ہمایوں فر فٹن پر سوار ہو کر سول سرجن صاحب کے ہاں گئے۔ کارڈ بھیجا۔ پرنس میرزا ہمایوں فر بہادر پڑھ کر صاحب ممدوح باہر نکل آئے اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملا کر حال پوچھا اور کہا میں ابھی ساتھ چلتا ہوں۔ اسی دم سول سرجن آئے نواب صاحب کو اطلاع کی گئی۔ باہر آئے صاحب سے ہاتھ ملایا۔ خواص نے آن کر کہا پردہ کرا دیا گیا۔ آئیے حضور! سول سرجن اور نواب صاحب اندر تشریف لے گئے۔ حسن آرا بیگم کی نبض دیکھی جیبی گھڑی ملا کے پھر نبض دیکھی۔ حال پوچھا کہا ہم جانتے ہیں کہ کسی سانحے کی خبر سُنی ہے جس کے صدمے سے اس درجہ بیتاب ہو گئیں۔ کسی عزیز کے مرنے کی خبر سُنی ہو یا کسی بینک میں روپیہ رکھا ہو اور دوالہ نکل گیا ہو، یا کوئی اور بات اس قسم کی ہوئی ہو۔ ہے کچھ ایسا ہی۔ قلب پر صدمہ پہنچا ہے۔ نواب صاحب سے قلم دوات کاغذ مانگا، پیاری نے حاضر کیا۔ نسخہ لکھا اور کہا جانسن اینڈ کمپنی کی کوٹھی سے منگواؤ۔ آٹھ بجے ہم پھر آئیں گے۔ نواب صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک طبیعت کیسی ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ردی حالت ہے۔ بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ علاج مشکل ہے۔ نواب صاحب نے باہر جا کر ایک اشرفی پاکٹ میں رکھ کر صاحب سول سرجن تشریف لے گئے۔ حکیم معمر آدمی تجربہ کار۔ لائق فائق۔ عالم و فاضل۔ تمام شہر میں ہوا بندھی تھی۔ لوگوں کا مقولہ تھا کہ دستِ شفا ہے۔ حکیم صاحب محمد عسکری کے ساتھ تشریف لائے۔ بسم اللہ کہہ کر نبض دیکھی اور سوال کرنے شروع کیے۔

حکیم۔ گھر میں کسی سے لڑائی یا تکرار ہوئی تھی؟

عسکری۔ ان کی دادی —— وہ والدہ کسی امر پر ان سے ناراض تھیں مگر کوئی جھگڑا نہ تھا۔

حکیم۔ ہمارے علم و یقین میں کسی امر کے رنج اور انتہا کے غم نے ان کو بیمار کر دیا۔

حکیم صاحب نے پھر نبض دیکھی۔ باہر جا کر بیٹھے۔ محمد عسکری کے کان میں کہا (کام تمام ہو گیا) نسخہ لکھ کر تشریف لے گئے۔

میرزا ہمایوں فر اور نواب صاحب اور محمد عسکری باہم مشورہ کرنے لگے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ تو شہزادہ ہمایوں فر نے کہا ان کی رائے ہے کہ اگر حکیم کا علاج ہوا تو بچنا محال ہے۔

سوداگر کی دکان سے دوا آئی۔ ایک (مارک) یعنی ایک مرتبہ کی مقدار دوا دی گئی۔ نواب صاحب نے جانچ کر دوا دی۔ اب حسن آرا کی کیفیت سنیئے کہ انتہا کی نقیہ۔ آنکھیں چھت سے لگی ہوئیں۔ تشنگی کا غلبہ۔ قلب اُٹھ جاتا تھا۔ بے چینی کی حد نہ تھی۔ بہار النسا انتہا سے زیادہ مضطر و بیقرار تھی۔ جب حکیم نے کہا کہ گھر میں کسی سے جھگڑا تو نہیں ہوا۔ تو بہار النسا بیگم اپنے دل میں سخت خفیف ہوئیں۔ سپہر آرا کو خوب معلوم تھا کہ حسن آرا کو بیماری کیا ہے۔ بڑی بیگم بیچاری چپ چاپ بیٹھی حسن آرا کی کیفیت دیکھ رہی تھیں۔ اس درجہ غم تھا کہ زبان سے کوئی کلمہ نہیں نکلتا تھا۔ مگر آنکھیں اشکبار اور دل مضطر و بیقرار۔

نواب۔ حسن آرا بیگم۔ حسن آرا بیگم۔

حسن آرا نے آنکھیں کھول کر دیکھا مگر بات کرنے کی طاقت نہ تھی۔

بہار۔ بولو پیاری بہن۔ آہستہ سے کچھ کہو۔

سول سرجن صاحب پھر آئے پردہ کیا گیا۔ زبان دیکھی۔ نبض دیکھی۔ نسخہ لکھا اور کہا۔ دو گولیاں آئیں گی۔ دونوں اسی وقت کھلا دیجیئے اور شیشی میں عرق آئے گا وہ گولی کھانے کے آدھ گھنٹے کے بعد پلا دیجیئے۔ ایک مارک آدھ آدھ گھنٹے کے بعد ایک ایک مارک پلانا۔ صبح کو ہم پھر آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ اگر رات کو طبیعت زیادہ بے چین ہو تو ہم کو فوراً اطلاع دیجیئے گا۔ پانی بہت کم پلائیں اس کا ضرور خیال رہے اور جس طرح کمرہ صاف ہے اسی طرح صفائی کا خیال رہے۔

حسن۔ (آہستہ سے) قلب از بس ضعیف ہے۔

نواب۔ کہتی ہیں قلب بہت ضعیف ہے۔

سول سرجن۔ پوچھیئے کوئی وجہ بیان کر سکتی ہیں؟

حسن۔ ہاں دل پر صدمہ پہنچا تھا۔

سول۔ ہم سمجھے ہی تھے۔

یہ کہہ کر سول سرجن صاحب باہر تشریف لے گئے۔

رات بھر حسن آرا تڑپا کی۔ بڑی بیگم آٹھ دس دفعہ اِدھر اُدھر جا کر منہ ڈھانپ ڈھانپ کر روئیں۔ بہار النسا اور روح افزا آپس میں مل مل کر اشکبار ہوئیں اور سپہر آرا کی تو عجیب ہی کیفیت تھی۔ اشک تمام شب آنکھوں سے جاری رہے۔ نواب صاحب نے سرہانے بیٹھے بیٹھے تڑکا کر دیا۔ مغلانیوں اصیلوں نے آنکھوں میں رات کاٹی۔ باہر شہزادہ ہمایوں فر مثل ماہی بے آب تڑپ رہے تھے۔

ٹھیک چھ بجے کے وقت سول سرجن صاحب تشریف لائے

سول۔ رات کو دوسری مرتبہ نسخہ لکھا اس نے فائدہ کیا؟

نواب۔ جی ہاں، ہچکیاں بند ہو گئیں۔

سول۔ بخار شب کو کیسا تھا؟

نواب ۔ کبھی کم کبھی زیادہ ۔ تین بجے کے وقت اس قدر شدت تھی کہ پیشانی پر ہاتھ رکھنا محال تھا۔ سارا بدن پھنک رہا تھا اور بار بار پانی مانگتی تھی۔

سول ۔ (نبض دیکھ کر) کم ہے۔

اس کے بعد صاحب سول سرجن نے ایک آلہ چوبی سے قلب اور جگر کا امتحان لیا اور باہر آن کر نواب صاحب سے کہا "بہت کم امید ہے"

حسن آرا نے سپہر آرا سے کہا، بہن اب تو بچنے کی امید نہیں ۔ تم لوگ تو چشم ظاہر بین سے دیکھتے ہو تمہیں ہمارا حال کیا معلوم کہ قلب کی کیا کیفیت ہے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ زہر کی بجھی ہوئی برچھی کوئی بھونک رہا ہے۔

اب سنیئے کہ بڑی بیگم صاحب نماز پڑھ رہی ہیں۔ بہار النسا چھت پر مغلانی سے باتیں کرتی ہیں۔ نواب صاحب اور میرزا ہمایوں فر بہادر حکیم جی کی نسبت باتیں کر رہے تھے۔ حکیم صاحب ایک گھنٹے کے لیے رخصت ہو کر گھر گئے تھے۔ محمد عسکری بھی ہمراہ رکاب حکیم صاحب چلے گئے کہ دفعتہً اندر سے رونے کی آواز آئی۔ سب دنگ کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ نواب صاحب فوراً لپکے۔ بڑی بیگم غل مچاتی ہوئی زینوں پر جاتی تھیں۔

نواب ۔ کیا ہوا کیا، ہوا کیا۔

بہار ۔ (سر پیٹ کر) جو کچھ ہونا تھا، ہو گیا۔

سپہر آرا کونے میں کھڑی سر پیٹ رہی ہے۔ روح افزا سر بالین زار زار روتی ہے۔ بڑی بیگم صاحب نے اینٹ اٹھائی اور زور سے سر پر لگائی۔

نواب صاحب نے جا کر دیکھا تو حسن آرا بالکل مُردے کی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔

نواب ۔ یہ کیا ہوا!

نواب صاحب نے نبض دیکھی اور کہا نہیں ابھی گرم ہے۔ گھر بھر مصروف گریہ و زاری تھا کہرام مچا ہوا۔ تمام محلے سے بکا اور بین کی آواز بلند تھی۔ سپہر آرا نے تین دفعہ دیوار سے سر ٹکرایا تو خون جاری ہو گیا۔ مغلانی نے لاکھ لاکھ سمجھایا مگر بیکار۔

نواب ۔ ارے ذرا چپ رہو میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوتا۔

یہ کہہ کر نواب صاحب گاڑی پر سوار ہوئے اور ڈاکٹر کے ہاں گئے۔

قیدی کی رہائی

اتنے عرصے تک قید میں رہ کر میاں آزاد نہایت ہی پریشان ہوئے۔ ایک روز انھوں نے وزیر جنگ کے نام خط لکھا:

حضور اقدس!

مَیں قید خانے میں بیٹھا ہوا اس شخص کی طرف مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھتا ہوں جس کی بدولت ناکردہ گناہ قید ہو گیا۔

آنچہ کردی تو بمن ہیچ بہ انسان نہ کند
مرگ با جاں نکند کفر بہ ایماں نہ کند

مگر افسوس ہے کہ گو اب وہ بھی میرے خلاف نہیں۔ مگر نامساعدت بخت کو کوئی کیا کرے۔ میں صاف صاف لکھوں گا کہ حضور نے تحقیقات کامل نہ کی اور یہاں تک اس معاملے میں اغماض فرمایا کہ اب تک میری خبر ہی نہیں لی۔ جُرم تو یہی عاید ہوا کہ میں روسی جاسوس ہوں۔ مگر ہندوستان اور انگلستان اور مالٹا تک سے خطوط آئے کہ یہ شخص روسی جاسوس نہیں۔ ہندی ہے۔ لیکن اس پر بھی قید خانے سے نجات نہ ملی۔ افسوس صد افسوس۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ اب کس مصلحت سے قید ہوں۔

(عریضۂ فدوی آزاد مجرم)

یہ خط صاحب سپرنٹنڈنٹ سول جیل کے ذریعے سے وزیر جنگ کے پاس بھیجا گیا۔ انھوں نے پڑھا اور اس پر لکھ دیا، جلد رہائی ہو گی۔

میاں آزاد کے پاس یہ جواب بھیج دیا گیا۔ پڑھ کر خاموش ہو رہے۔

اب سنیئے کہ دوسرے روز سول قید خانے میں ایک اور قیدی آیا۔ میاں آزاد نے دیکھا کہ ایک سُرخ و سفید آدمی ہے۔ نہایت ہی حسین و وجیہہ۔ باہم گفتگو ہونے لگی۔

آزاد۔ آپ کس ملک کے باشندے ہیں؟

دوسرا قیدی۔ فرنچ ہوں۔ اور آپ؟

آزاد۔ ہندی۔

فرنچ۔ یہاں کب سے ہیں آپ؟

آزاد۔ ابھی چند روز ہوئے۔

فرنچ۔ ہماری نسبت مشہور کیا گیا ہے کہ روسی جاسوس ہے۔

آزاد۔ ہاں! تو آپ ہمدرد ہیں ہمارے۔

فرنچ۔ کیا آپ پر بھی یہی جرم عاید ہوا ہے؟

آزاد۔ جی ہاں۔

فرنچ۔ اندھیر ہے اندھیر

آزاد۔ جنگ کا زمانہ ہے نہ۔ جاسوس کے نام سے تو لوگ بھڑکا ہی چاہیں۔
فرنچ۔ یہ سچ ہے مگر انتظام بھی ٹھیک نہیں ہے۔
آزاد۔ ابھی میں اس کی نسبت کچھ رائے نہیں دے سکتا۔
فرنچ۔ ہاں۔ واقف نہیں ہیں بخوبی آپ۔
دو دن آزاد اور فرانسیسی مل جل کر رہے تھے کہ فرانسیسی نے کہا حضرت اب ہم اور آپ رازدان ہو جائیں۔
آزاد۔ رازدان ہو جائیں اس کے کیا معنی؟
فرنچ۔ ہم آپ سے راز کی باتیں کہیں اور آپ ہم سے۔
آزاد۔ بہتر۔
فرنچ۔ ہم روسی جاسوس تو نہیں مگر جب سے قید ہوئے تب سے ترکوں کے خلاف ہو گئے۔
آزاد۔ ترک بڑے پاکباز اور سچے آدمی ہیں۔
فرنچ۔ آپ ابھی واقف نہیں ہم سے پوچھئے۔
آزاد۔ ہم ترکوں کے عاشق ہیں۔
فرنچ۔ ابھی اس حالت میں بھی۔
آزاد۔ بیشک۔
فرنچ۔ آپ کو بے وجہ قید کر دیا۔
آزاد۔ خوب کیا۔

شب کو قیدی کا پتا نہ ملا۔ میاں آزاد نے ادھر ادھر جستجو کی مگر بیسود۔ لوگوں سے پوچھا مگر بیکار۔ حیرت تھی کہ یاالہٰی یہ کیا اسرار ہے؟ معلوم ہوتا ہے قیدی بھاگ کھڑا ہوا۔ صبح کو وزیر جنگ کے پاس ایک شخص عرضی لے کر گیا جس کا مضمون یہ تھا:-

حضور والا!

حسب الارشاد واجب الانقیاد خاکسار دو دن تک سول جیل میں رہا۔ میاں آزاد نامی قیدی سے ملاقات کی۔ مختلف امور کی نسبت گفتگو ہوئی۔ آدمی نہایت فہمیدہ و سنجیدہ و ذی علم ہے۔ روسی جاسوس کہنا اس پر تہمت تراشنا ہے۔ نہایت ملول اور افسردہ ہے۔ خود میں نے کئی بار ترکوں کی شکایت کی مگر آزاد نے مجھ سے اتفاق رائے نہ کیا۔ یہ شخص ترکوں کا عاشق زار اور روم کا جاں نثار ہے۔ کمال قلق اور افسوس کا مقام ہے کہ ایسے جانباز اور خیر طلب کے ساتھ لوگ اس طرح پیش آئیں۔ حضور۔ از راہ نوازش و کرم اسی وقت اس بیگناہ کی رہائی کا حکم صادر فرمائیں۔"

یہ عرضی پڑھ کر وزیر جنگ نے حکم دیا کہ تم خود جا کر رہا کرو۔ اور کہو پرسوں ہم سے ملاقات کریں۔

یہ صاحب سینیر یعنی اعلیٰ ناظم قید خانہ سول تھے۔ اور وزیر جنگ کے حکم کے بموجب میاں آزاد کے پاس قیدیوں کی طرح رہے۔ تاکہ اس بہانے سے ان کے کل حالات دریافت کریں۔ تھوڑی دیر میں ناظم ممدوح گھوڑے پر سوار ہو کر قید خانے کے پھاٹک پر پہنچے۔ حکم دیا کہ میاں آزاد کو طلب کرو۔ آزاد آئے تو دیکھا کہ جو صاحب کل شام کو قیدی تھے وہ اس وقت حاکم

بنے گھوڑے پر سوار سامنے کھڑے ہیں۔

آزاد۔ کل تو آپ ہمارے ہمدرد بنے تھے مگر خوب خوب بھرے دیے آپ فرانسیسی بنے تھے۔ بھلا کوئی کلمہ خلاف ظلم زبان سے نہ نکلا اور نکلتا کیونکر؟

ناظم۔ اب آپ رخصت ہوں۔

آزاد۔ قیدخانے کو سلام ہے۔

ناظم۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ آپ نے رہائی پائی مگر افسوس ہے کہ اس قدر عرصے تک آپ کو مفت میں مصیبت سہنا پڑی۔

میاں آزاد ہشاش بشاس قیدخانے سے چلے۔ ہرمزجی پارسی کی کوٹھی پہ پہنچے۔ میاں آزاد اور ہرمزجی نے کھانا کھایا اور آرام کیا۔ شام کو خاتون مرتفاص میڈا تشریف لائیں اور بہت جھک کر میاں آزاد کو سلام کیا۔ آزاد نے مسکرا کر جواب دیا۔

میڈا۔ آپ سے قول و اقرار ہو گیا ہے کہ گذشتہ را صلواۃ۔ یہ مسکرانا کیا معنی، جو کچھ ہوا ہوا میں اپنی غلطی اور حماقت پر خود منفعل ہوں۔

چھوٹا موٹا بونا

میاں آزاد فریح نہاد ہرمزجی بھائی کی کوٹھی میں بآرام تمام بیٹھے ناول پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے دفعتہً غل مچا کر کہا۔ راوگیدی نہ ہوئی قرولی) آزاد کے کان کھڑے ہوئے۔ ایں! یہ کس کی آواز آئی بھئی؟ قرولی اور گیدی۔ میاں آزاد سخت متحیر ہوئے، سُننے کو تھے کہ پھر آواز آئی۔ قسم خدا کی کتارا کھینچ ماروں گا اوگیدی۔

آزاد۔ کوئی ہے؟

چپراسی۔ حکم حاضر ہوں۔

آزاد۔ یہ باہر کیا غل مچ رہا ہے؟

چپراسی۔ ایک پستہ قد آدمی ہے۔ کہتا ہے کوٹھی کے اندر جانے دو۔

آزاد۔ آنے دو۔

چپراسی نے اس آدمی سے جا کر کہا۔ اچھا چلیے اندر چلیے۔ تشریف لائیے، تو آزاد نے ہنس کر کہا۔ اخاہ خوجی میں بھاؤ بھئی خوب آئے۔

خوجی۔ شکر ہے کہ تم کو صحیح و تندرست پایا۔

آزاد۔ سخت مصیبت میں مبتلا ہوئے تھے۔

آزاد نے مختصر طور پر سب حال بیان کیا کہ اتنے عرصے تک قید خانے میں رہے چھ چھ دفعہ تحقیقات ہوئی جرم ثابت نہ ہُوا۔ مگر اتفاق وقت اور شامت اعمال قید سے رہائی نہ ہوئی۔ آخر کار وزیر جنگ کی خدمت میں عرضی بھیجی۔ خدا خدا کر کے اب رہائی پائی۔

اتفاق سے میڈا بھی انا البرق کہتی ہوئی تشریف لائیں۔

آزاد۔ لو وہ آگئیں۔

خوجی۔ ارے غضب ہوگیا۔

آزاد۔ یہ کیوں۔

خوجی۔ ابھی ہم نے اُٹھنے ہوتے تو ریکھتی۔

حضرت نے وحشت میں آن کر ہوٹل کی ایک میز کا کپڑا اوڑھ لیا اور تولیا سر میں باندھا اور ایک چھُری (فورک) ہاتھ میں لے کر اکڑوں بن کے کھڑے ہوئے۔

آزاد نے ایستادہ ہو کر میڈا سے مصافحہ کیا۔ میڈا کا جوبن دیکھ کر خوجی ہزار جان سے عاشق ہو گئے اور بڑے غور سے گھورا کیے۔ آزاد سے کہنے لگے قسم خدا کی وہ جھگڑا ہے کہ دید نہ شنید۔

بصورت تو بُتے کمتر آفرید خدا   تراکشیده و درست از قلم کشید خدا
چو کرد وصف تو بر صفحۂ وجود رقم   صد آفرین زبان قلم شنید خدا

میڈا نے جوان پر نظر ڈالی تو عجیب الخلقت آدمی دیکھ کر مسکرا دی۔

خوجی ازبس محظوظ ہوئے۔

خوجی۔ کیوں میاں آزاد سچ کہنا۔ اینجانب کے دیکھتے ہی کھل گئیں۔ واہ رے ہم۔ جو عورت دیکھتی ہے گھنٹوں گھورا کرتی ہے۔ جوانی کی اُمنگ اور حسن گلو سوز بھی کیا چیز ہے۔

میڈا نے آزاد سے پوچھا یہ کون شخص ہے ؟ آزاد نے کہا یہ ایک پاگل ہے۔ اس کو یہ خبط ہے کہ جو عورت مجھے دیکھتی ہے ریجھ جاتی ہے۔ تم ذرا اس کو بناؤ۔ اس وقت میڈا شوخ تو تھی ہی اتنی شہ پاتے ہی خوجی کو خوب بنایا۔ اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ حضرت ریشہ خطمی ہو گئے۔ مسکراتے ہوئے گئے اور قریب جا کر کرسی پر جا ڈٹے۔

میڈا (ہاتھ میں ہاتھ دیکر) آپ کا نام کیا ہے۔

خوجی (آزاد سے) سمجھاتے جاؤ جی۔

آزاد نے سمجھانا شروع کیا یہ جو کہتی تھی۔ ان کو سمجھاتے تھے اور وہ جو کچھ کہتے تھے ان کو سمجھاتے تھے۔

خوجی۔ آپ کی ملاقات سے بہت خوش ہُوا۔

میڈا۔ (مسکرا کر) کل آپ کی دعوت ہے۔

خوجی (توند پر ہاتھ رکھ کر) منظور!

میڈا۔ آپ شراب پیتے ہیں؟

خوجی۔ ہاں۔ نہیں۔ مگر۔ اچھا۔ نہیں نہیں۔

آزاد۔ مرد آدمی ایک بات کہو تو میں سمجھاؤں یہ نہیں اور ہاں اور مگر اور اچھا کیا معنی؟

خوجی۔ کہو افیم پیتا ہوں۔

میڈا۔ یہ آپ کا گلاب سا چہرہ کمھلا جائے گا۔ افیم نہ پینا چاہیئے۔ شراب پیو گے؟

میڈا نے خوجی کا ہاتھ چوم لیا۔ اللہ اللہ اب کیا پوچھنا ہے۔ اب تو دماغ عرش بریں پر ہے۔ مزاج ہی نہیں ملتا۔ بکھلے جاتے ہیں۔ اکڑے اور آزاد کی طرف گھور کر دیکھا۔ اور کہا کیوں اُستاد۔ سچ کہنا ہم کیسے جوان رعنا ہیں اور تس پر ابھی بنے ٹھنے نہیں۔ ورنہ سیکڑوں بار ہاتھ چوم لیتی۔ واہ رے ہم۔

آزاد۔ چین لکھتا ہے۔

خوجی۔ چلو چلو نظر نہ لگاؤ۔ واہ۔

میڈا۔ آپ کا نام کیا ہے ؟ بتایئے۔

آزاد (اُردو میں) ان کا نام خوجی۔

خوجی۔ (بگڑ کر) کس مردود کا نام خوجی ہے ؟ حضور مجھے لوگ جناب خواجہ بدیع صاحب کہتے ہیں۔

میڈا۔ او ہو ہو کیا پیارا نام ہے۔

خوجی۔ (رزمین دوز ہو کر سلام کیا) کہوں کتنی تعریف کی ہے نام کی نہ کہو گے اور جو خوجی کہتے تو نظروں سے گر جاتے۔

میڈا۔ آپ کچھ تھوڑا تھوڑا گانا بھی جانتے ہیں۔

آزاد۔ انکار نہ کرنا کہو ہاں جانتا ہوں۔

خوجی۔ ہاں اور ناچنا بھی جانتا ہوں۔

میڈا۔ آہو ہوہو۔ تو پھر ناچو۔

خوجی نے ناچنا شروع کیا۔ میڈا اور آزاد کی یہ کیفیت کہ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

میڈا۔ اُف۔ بس اب ختم کرو۔

میڈا تھوڑی دیر میں ہوٹل سے گئیں تو میاں خوجی کے دماغ عرش بریں پر تھے۔ زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے تھے۔ میاں آزاد نے کہا۔ خواجہ صاحب ذرا ادھر تشریف لائیے۔ فرمایا ہشت۔ پھر آزاد نے کہا قبلہ ذرا اس طرف مخاطب ہو جیئے۔ آپ نے کہا ہشت۔

تھوڑی دیر میں میڈا کا خط آیا۔ آدمی نے آن کر خوجی کو دیا اور کہا آپ کے نام ہے۔ آزاد بولے جناب خواجہ صاحب ہم کو تو ذرا خط دکھا دیجئے۔

خوجی۔ بس بس چلیئے الگ ہٹیئے۔

آزاد۔ لاؤ ہم پڑھ دیں تم سے بھلا کیا پڑھا جائے گا؟

خوجی۔ (حامل خط سے) تم باہر ٹھہرو۔

حامل خط۔ بہت اچھا۔

خوجی (آزاد سے) عجب آدمی ہیں آپ۔ میں نے تو ایسا آدمی ہی نہیں دیکھا۔ صریح دیکھتے ہیں۔ کہ میڈا کا نوکر جو خط لایا ہے وہ کھڑا اُس رہا ہے اور کہنے لگے تم سے بھلا کیا پڑھا جائے گا؟ بڑے عالم کے دو بن کے آئے ہیں وہاں سے لاحول ولا قوۃ۔

آزاد۔ اچھا اب تو دکھا دو۔

خوجی نے خط کو تین بار چوما اور میاں آزاد کو دے دیا۔ آزاد نے پڑھا تو یوں لکھا تھا۔ میرے پیارے جوان! تمھاری ایک ایک ادا نے میرے دل میں جگہ کر لی ہے تمھارا سرو قد اور تمھاری سارس کی سی گردن اور بیل کے سے گول گول دیدے اور بندر کی سی حرکتیں جب یاد آتی ہیں تو میں اُچھل اُچھل پڑتی ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ آج کس وقت آؤ گے۔ ایسا نہ ہو کہ نہ آؤ۔ یہ خط اپنے دوست آزاد کو نہ دکھانا مگر تمھیں اسی کی قسم جس کو سب سے زیادہ چاہتے ہو کہ اس خط کو گن کر سو بار چوم لینا اور وعدے پر ضرور آنا۔

میاں آزاد نے یہ خط پڑھ کر خواجہ بدیع کو سنایا تو از بس مسرور ہوئے

خوجی۔ افسوس ہے کہ تم کو کل حالات معلوم ہو گئے مگر اُس پری چہرہ سے نہ کہہ دینا۔

آزاد۔ ضرور کہوں اور بالضرور کہوں۔

خوجی۔ رہا تھا ل کر اے غضب بڑی بُری ہوئی۔

آزاد۔ میں تو جا کر شکایت کروں گا کہ ہم سے کیوں مخفی رکھا۔ واہ کیا دل لگی ہے۔

خوجی۔ (سر پیٹ کر) لاحول لاحول۔ لعنت بکار شیطان۔

آزاد۔ میں ابھی ابھی ایک چٹھی بھیجتا ہوں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔

خوجی۔ ارے ہائے افسوس اور مجھ سے کہتے ہو کہ آپ گھبرائیے نہیں۔

آزاد۔ بھائی سنو۔ ہم کو تو حسد ہوتا ہے۔

خوجی۔ پھر چاہے جو ہو سو ہو جائیے کہ دیکھئے۔ وہ ہم پر عاشق ہم اس کے عاشق زار تم ایسے ہزار لگی لپٹی باتیں کریں۔ ہوگا کیا لے توبہ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔ لا حول ولا قوۃ۔

آزاد اپنے دل میں خوب ہی ہنسے۔ مگر خواجہ بدیع صاحب کو شک کی جگہ یقین بلکہ عین ایمان دو دن تھا کہ مُیڈا کی ہم پر جان جاتی ہے۔ آزاد اور بھی پُرچکٹ دیتے جاتے تھے۔

آزاد۔ یار اب تمھارے ساتھ نہ رہیں گے۔

خوجی۔ وجہ۔

آزاد۔ بس سمجھ گئے ہم اب ساتھ نہ ہوگا۔

خوجی۔ آخر وجہ بتائیے؟

آزاد۔ غضب خدا کا مُیڈا ہم سے ماہرو اور ہمارے سامنے تمھارا عشق ظاہر کرے۔

خوجی (کھلکھلا کر ہنس پڑے) ہا ہا ہا ہا۔ اب سمجھے۔ ہم جوان ہی ایسے ہیں۔ اس کو کوئی کیا کرے۔ لیکن تم اگر خلاف ہو گئے تو واللہ میں مُیڈا سے بات تک نہ کروں مجھ کو جان تک سے زیادہ تم عزیز ہو۔ قسم خدا کی اب دنیا میں تمھارے سوا اور کوئی میرا مربی اور سرپرست نہیں ہے باپ دادا مربی آقا جو کچھ ہو تم ہو۔ بس فقط تم اور کوئی نہیں اور ہم تو اب بوڑھے ہوئے۔ یہ تو اس پریچہرہ کی عنایت ہے کہ ہم پر اور یہ کرم۔ مگر ہاں اس میں شک نہیں کہ ہم کلّے ٹھلے کے گبھرو جوان ہیں۔

آزاد۔ یہ تو میں خوب جانتا ہوں۔

خوجی۔ ہاں بس اس میں جو شک کرے وہ کافر۔

آزاد۔ ہر کہ شک آرد۔

خوجی۔ سگ ست۔

آزاد۔ مگر ایسا رسیجھی کہ ہاتھ تک چوم لیا۔ واہ واہ۔

خوجی۔ (اکڑ کر) ابھی اسکندریہ میں تم نہ تھے۔ وہاں بھی ایک گرانڈیل اور خوبرو عورت ہم پر عاشق ہو گئی تھی۔ مگر خرابی کیا تھی۔ نہ ہم اس کی بات سمجھیں نہ وہ ہماری سمجھ سکے۔ اشاروں سے البتہ خوب باتیں ہوئیں۔

خوجی نے میاں آزاد سے پوچھا کیوں میاں بھلا فارسی میں خط لکھیں تو کیسا؟ آزاد نے کہا فارسی یہاں کوئی کیا جانے بھلا اردو میں لکھو تو سب سمجھ جائیں۔ خوجی نے مُیڈا کے نام خط کا جواب اس طرح بھیجا۔

عزیز از جان۔ سعادت نشان۔ نورچشم۔ روشن لقا مُیڈا کو بعد سلام و نیاز کے گلدستوں کے یہ واضح ہو جائے کہ تمھارا نیاز نامہ مورخہ تاریخ آج کا واسطے اس کے کہ میں آؤں گا یا نہیں بیان کردوں میں نے پایا۔ مژدۂ پیغام لایا۔ خط میں نے بغور پڑھا۔ فائدہ بخشا۔ اچھا لکھا ہے بقول صفدرؔ ؎

ستم سنتے ہیں نیم جاں کیسے کیسے ۔۔۔ وہ لیتے ہیں روز امتحاں کیسے کیسے

میں وقت مقررہ کے پہلے ہی آؤں گا۔ تم پر جان دیتا ہوں۔ ہر روز صبح کو اُٹھ کر نام لیتا ہوں۔ برسوں کا عاشق ہوں۔

لے فقرہ ونیا۔ ابھارنا۔ اکسانا۔

خواجہ صاحب نے خط لکھ کر مس میڈا کے آدمی کو دیا اور اکڑ کر آزاد سے کہا۔ کیوں قبلہ کہیے۔ اب بولیئے۔ ہونہ سمجھے تھے کہ بس ایک ہم ٹھہرے خوبرو جوان ہیں۔ اجی فضلنا بعضکم علی بعض۔ اس نے بھی دیکھا کہ سُرخ و سفید اور رنگین مزاج اور شگفتہ جبین آدمی ہے۔ بشرے سے بانکپن برستا ہے اب اس کو چھوڑ کے اور کس کے ساتھ شادی کروں۔ چلیئے تڑ سے خط لکھ بھیجا۔ آزاد نے کہا اس میں کیا فرق ہے۔ آپ ایک جوان رعنا اور زیبا اندام ہیں۔ بھلا آپ پر نہ کیونکر ریجھتی۔ اور آپ پر نہ ریجھتی تو پھر کس پر ریجھتی۔ مگر خط تو گھسٹوالو۔ میاں خلیفہ[لہ] کو بلاؤ۔

اتنے میں مس میڈا بھی آگئیں۔ آزاد نے کہا لو وہ تو خود ہی یہاں آگئیں۔

میڈا نے کہا چلیئے اس کمرے میں ہمیں کچھ کہنا ہے۔ خوجی کی باچھیں کھل گئیں۔ میاں آزاد کی طرف بڑے غرور سے دیکھا اور میڈا کے ساتھ کمرے میں گئے۔ میڈا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی تڑ سے ایک چپت دی اور پھرتی کے ساتھ کمرے کے باہر تھی۔ خوجی نے ٹوپی اُٹھالی اور سوچے کہ بیڈھب سامنا ہے۔ اچھے گھر بیعانہ دیا۔ ابھی سے کھوپڑی سہلانے لگیں، مگر کچھ مضائقہ نہیں۔ سمجھا جائے گا۔ باہر تشریف لائے۔

آزاد۔ کہو کیا کہا؟

خوجی۔ ایک بوسہ لیا اور طرارہ بھرا تو کمرے کے باہر تھی۔

آزاد۔ بڑے خوش قسمت ہو۔

خوجی۔ (ایک مونچھ پر تاؤ دیکر) ہیں ہی۔ ہیں نہیں تو یوں ہی۔

آزاد۔ تم نے بھی بوسہ لیا؟

خوجی۔ لینے کو تھا مگر وہ شوخی کے ساتھ چل دی۔

میڈا نے خوجی سے کہا چلو باہر چاندنی میں سیر کریں۔ خوجی نے کہا چلیے۔ میاں آزاد کو بھی ساتھ لیا اور تینوں سیر چمن کرنے لگے۔ میڈا نے کہا آپ کا نام ہم بھول گئے۔ خوجی بولے کہ خواجہ بدیع صاحب میرا نام ہے۔

میڈا۔ یہاں ایک فرانسیسی افسر ہے (روشفا) وہ مجھے عرصے سے چاہتا ہے۔ پہلے تم اُس سے لڑو۔ پھر ہمارے ساتھ شادی ہو۔

ایک مرتبہ میاں آزاد نے عمداً اور قصداً کہا ارے میاں خوجی ذرا ایک بات تو سنو۔ خوجی کے غصّے کا پارہ ایک سو بیس درجے پر تھا۔

خوجی پر خدا کرے آسمان پھٹ پڑے۔ خوجی مردک ہے۔ اسی دم خوجی گدھے سُور کا جنازہ نکلے۔ خوجی مردود کی ایسی تیسی۔ اب خوش ہوئے معشوق کے سامنے رنگ پھیکا کرتے ہو۔ خوجی خوجی۔ ماں باپ نے خواجہ بدیع نام رکھا۔ یاروں دوستوں نے خواجہ صاحب، خواجہ صاحب، کہا۔ آپ خوجی بنائے دیتے ہیں۔

آزاد۔ معاف کیجیئے۔

خوجی۔ پھنک گیا۔ پھنک گیا۔ از سرتا پا پھونک دیا۔ خوجی کہہ کر معافی کے خواہاں ہونا جلے کو اور جلانا۔

آزاد۔ اچھا پھر اب تو معاف کرو۔

خوجی۔ اور کروں گا کیا آخر معاف کرنے کے سوا اور کیا ہے۔ رنگ پھیکا کر دیا۔

لہ حجام۔

مُیڈا نے کہا کہیئے پھر اس افسر سے کس دن لڑائی ہوگی؟ خوجی نے کہا ہم حاضر ہیں پچاس افسروں سے جنگ کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہم کمیدانی کر چکے ہیں۔ رسالدار رہ چکے ہیں۔ دگلے والی پلٹن نے وہ نام کیا کہ باید و شاید۔ ایسی لڑی ایسی لڑی کہ واہ ہے۔ اور ہم نے دگلے والی پلٹن کی وہ رسالداری کی کہ دھوم ہے کوئی پلٹن ایسی نہ تھی۔ اختری[1] نادری جنگی افسر جیسے وہ تھے ویسے ہم تھے۔ دونوں فوجی افسر جب لڑیں گے تو خوب لڑیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ میاں آزاد ہم کو ایک قرولی خرید دیں۔

میاں آزاد اور مس مُیڈا اور ہرمزجی نے باہم مشورہ کیا اور مشورہ کر کے خوجی سے کہا کہ کل صبح کو آپ تیار ہو رہیئے گا۔ خواجہ صاحب نے کہا اجی ہم اب تیار ہیں۔ سویرے منہ اندھیرے میاں خوجی اُٹھے۔ مُنہ ہاتھ دھویا۔ جوڑی کے کئی ہاتھ ہلائے کوئی تین چار۔ جی اور نہیں تو کیا۔ سینکیا پہلوان ہیں کہ باتیں کپڑے پہن کر لیس ہو رہے۔ تھوڑی دیر میں مُیڈا ناز و انداز کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی آئیں اور خوجی کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

خوجی۔ واہ رے میں معشوق نے دیکھا اور باچھیں کھل گئیں۔

آزاد نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ عبید اللہ اُس کمرے میں بیٹھے ہیں ذرا اُن کو بلالو۔ عبید اللہ ایک مشہور و معروف ترکی پہلوان تھے۔ جیسے ہی وہ سامنے آئے اور میاں آزاد نے کہا کہ لیجیے آپ کے رقیب یہی ہیں۔ خوجی کے ہوش اڑ گئے یا الٰہی یہ ڈھور کا ڈھور۔ دنیا بھر کے آدمیوں سے دو ہتھی اونچا۔ اس سے عہدہ برا ہونا محال ہے۔ آج ذلیل ہوئے مگر خیر شاید ڈپٹ میں آ جائے۔ ترکی پہلوان نے جو سکھایا پڑھایا ہوا تھا قہر آلود نظر ڈالی تو خوجی کے رہے سہے حواس اور بھی غائب ہو گئے۔ دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ آج ہڈی پسلی ٹوٹی۔ یہ تو کچّا ہی کھا جائے گا۔ ایک چپت دے تو زمین میں دھنس جائیں۔ مقابلہ اس سے کون کرے گا بھلا۔ ترکی پہلوان نے پھر ان کی طرف قہر کی نظر سے دیکھا۔ خوجی مارے ڈر کے ذرا تھوڑی دور ہٹ بیٹھے۔ مُیڈا نے کہا آپ تو ابھی سے ڈرنے لگے۔ خوجی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک دفعہ بیٹھ گئے اور کہا یارو ذرا ڈاکٹر کو بلاؤ۔ اس طرح کا درد ہو رہا ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ ایک دفعہ جب ہم دگلے والی پلٹن میں نوکر تھے تب بھی ہوا تھا اور اب بھی ہو رہا ہے اگر مر گئے تو چلیئے۔

ہماری جان گئی، آپ کی ادا ٹھہری

افسوس یہ ہے کہ ہم اس وقت اپنی پھکیتی اور پہلوانی کے جوہر نہ دکھا سکے، واللہ اُٹھا کے پٹخنی دیتا تو توبہ ہی بھلی۔

اتنے میں ترکی پہلوان نے ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو خوجی کرسی پر سے دس قدم کے فاصلے پر جا گرے اور تیور بدل کر کہا۔

او گیدی۔ نہ ہوئی قرولی ورنہ ڈھیر کر دیتا۔

آخر کار اس بات پر فیصلہ ہوا کہ خوجی کا درد رفع ہو جائے تو پھر کسی روز زور آزمائی ہوگی۔

---

[1] واجد علی شاہ آخری بادشاہ اودھ کی پلٹنوں کے نام۔

کہرام

ناظرین باتمکین کو یاد ہوگا کہ نواب نامدار نے جب حسن آرا بیگم کی حالت زار دیکھی تو ڈاکٹر صاحب کے پاس دوڑے گئے۔ صاحب سول سرجن فوراً ساتھ آئے۔ اِدھر میرزا ہمایوں فر بہادر صاحب انسپکٹر جنرل اسپتال کو بلا لائے۔ حسن آرا کی اس کیفیت سے محلے بھر میں کہرام مچ گیا۔ جسے دیکھو کھڑا ماتم کر رہا ہے۔ سپہر آرا بُت بنی ہوئی کھڑی ہے۔ بڑی بیگم کے سر سے خون کے تُرّاٹے جاری تھے۔ بہار النسا سرِ بالین بکا و بین کرتی تھیں۔ روح افزا سکتے کے عالم میں تھی۔ الغرض اندر باہر کہرام مچا ہوا تھا۔

بڑی بیگم نے رو رو کر کہا۔ ہائے میرے دل کی چین۔ کلیجہ کی ٹھنڈک۔ ارے لوگو میں لٹ گئی۔ ہائے مجھ نصیبوں جلی کی موت نہ آئی۔ ہائے یہ روزِ بد میں نے دیکھا۔ حسن آرا اپنے ابّا کے پاس چلیں۔ ہائے کل بھائی کو روتی تھیں آج خود ہی اُٹھ گئیں۔ سپہر آرا دوڑ کر بڑی بہن کی لاش سے چمٹ گئی۔ اور چھاتی سے لگا کر کہا۔ ہائے باجی جان۔ عدم کے جانے کی تیاریاں کر دیں۔ ہمیں ساتھ نہ لیا۔ اب ہم کڑھ کڑھ کر مریں گے۔ باجی جان دغا دے چلیں۔ اُف اُف۔ اے مرے اللہ (زور سے) ہائے ہائے ہائے ہائے ہائے ہائے۔ باجی جان کچھ قول بھی یاد ہے کہ —— ارے! ہائے۔

ہائے کہہ کر حسن آرا کے تکیئے پر سر رکھ دیا۔

مغلانی اور ایک ماما نے سپہر آرا کو زبردستی وہاں سے ہٹایا کہ اتنے میں بہار النسا نے دولائی جو منہ پر سے اُٹھائی اور حسن آرا کا زرد زرد چہرہ نظر سے گذرا تو خوب زور سے سر پیٹا۔ ہے ہے، یہ وہی حسن آرا ہیں۔ ہائے لوگو دھوکا ہُوا ہے۔ یہ حسن آرا نہیں ہے (شانہ ہلا کر) بہن کب تک سویا کرو گی؟ نماز کا وقت آگیا بہن اٹھو۔ وضو تو کر لو۔ کیا اب نہ جاگو گی؟ ہائے (کان کے پاس منہ لے جا کر) بہن کیا اب سچ مچ نہ جاگو گی؟ (سر پیٹ کر) یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہُوا۔

مغلانی۔ ابھی ابھی باتیں کرتی تھیں۔

ماما۔ ایک ہی ہچکی میں کام تمام ہوگیا۔

پیاری کی ماں۔ نصیبوں کی گردش۔ ہائے نصیبوں کی گردش۔

سپہر۔ ہے ہے اب ہم آنکھ بھر کر دیکھیں بھی نہیں۔ دو گھڑی اور صورت دیکھنے دو۔ ارے للہ مجھے نہ روکو۔

اس فقرے پر کل عورتیں انتہا سے زیادہ اشکبار ہوئیں اور ماتم کی آواز ایسی بلند ہوئی کہ الامان الحذر۔

بیگم۔ ہائے مدتوں کی آس توڑ دی۔ میں ابھی ابھی باتیں کر کے نیچے گئی کہ بس چٹ پٹ ہوگئی۔

یہ کہہ کر تین بار پٹی پر سر ٹکرایا۔ تو مغلانی نے کہا ہائیں! ہائیں۔ ابھی خون جاری ہے۔ یہ کیا کرتی ہیں حضور آپ یہ کریں گی تو سپہر آرا کو کون سمجھائے گا۔

بیگم۔ مجھ فلک ستائی کو کیا معلوم تھا کہ یوں دیکھتے دیکھتے میری کمر توڑ جائیں گی ہائے برسوں آمین اللہ کر کے پالا اب سیانی ہوئیں تو دغا دے چلیں (ہاتھ مل کر) لوگو میں کیا کروں؟

بہار النسا کا یہ حال تھا کہ کبھی سرہانے پر جا کر سر پیٹتی کبھی پائینتی۔

سپہر۔ رمنہ سے دولائی ہسپتال میں کس کے سپرد کیے جاتی ہو باجی جان ہائے اتنا تو بتا دو۔ اماں جان تو بیچاری بڈھی ہیں اور تم اور بھی ان کی کمر توڑ چلیں باجی ہائے باجی۔ ہم روئیں پیٹیں اور تم کو ذرا خبر نہ ہو۔

بڑی بیگم سپہر آرا کو گلے سے لگا کر خوب روئیں۔

شہر بھر میں خبر ہو گئی جس نے سنا کف افسوس ملا۔ ڈولیوں پر ڈولیاں اور فنسوں پر فنسیں آنے لگیں۔ باہر صدہا آدمیوں کا جماؤ۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے۔

اتنے میں نواب صاحب نے کہا پردہ کرو، ڈاکٹر صاحب آتے ہیں۔ پردہ ہو گیا۔ مگر بڑی بیگم حسن آرا کی لاش کے قریب ہی بیٹھی رہیں۔ وقت ہی ایسا تھا۔ صاحب انسپکٹر جنرل اور صاحب سول سرجن تشریف لائے نبض دیکھی، آلات چوبی سے جگر کا امتحان لیا، انگریزی میں باہم یوں گفتگو کرنے لگے؛

سول سرجن۔ زندہ ہے

انسپکٹر جنرل۔ ہاں۔ ہاں۔

سول۔ یہ لوگ ناحق گھبرا گئے۔

انسپکٹر۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو بالکل بیہوش ہے۔ دوسرے نبض بڑی دقت سے ملتی ہے۔ انتہا کا ضعف ہے۔ کیا کوئی صدمہ پہنچا تھا۔

سول۔ ہاں گھر میں شاید کچھ لڑائی ہوئی تھی۔

صاحب انسپکٹر جنرل نے نسخہ لکھا اور سول سرجن کو بھی دکھایا۔

بیگم۔ کیا حال ہے؟

سول۔ غفلت ہے گھبرائیے نہیں آپ لوگ۔

بیگم۔ کیا زندہ ہے؟

سول۔ ہاں بیشک زندہ ہے۔ بیشک زندہ ہے۔

بیگم۔ زندہ۔ زندہ ہے۔ حسن آرا زندہ ہے۔ سچ!

سول۔ بیشک ابھی آنکھ کھول دیں گی۔

بیگم۔ اُف فوہ۔ ارے میں خواب دیکھ رہی ہوں یا سچ مچ؟

انسپکٹر۔ ابھی اچھی ہو جائے گی آپ گھبرائیے نہیں۔

ان دونوں نے کچھ چٹکلے کیے تو دوا کے آنے کے قبل ہی حسن آرا کی نبض گرم ہو گئی۔

سول۔ حضور بیگم صاحب ذرا نبض پر ہاتھ رکھیے۔

بڑی بیگم نے جو نبض پر ہاتھ رکھا تو کہا شکر ہے شکر ہے۔

بہار النسا اور روح افزا اور سپہر آرا بڑے غور سے سن رہی تھیں۔

سپہر۔ شکر ہے۔ شکر ہے۔ ہزار شکر کا مقام ہے۔

بہار۔ ہم سب جی اٹھے۔

روح - ابھی کیا معلوم۔
بہار - بس اب ہمیں کچھ فکر نہیں۔
دوائی آئی فوراً پلائی گئی۔
انسپکٹر - ہم باہر کوٹھی میں ٹھہرے ہیں۔
سول - جب یہ آپ سے باتیں کریں گی۔ تب ہم جائیں گے۔
حسن آرا ایک گھنٹے تک چپ چاپ لیٹی رہی۔ ایک گھنٹے کے بعد پانی مانگا۔ پانی پی کر کہا اب ذرا ذرا آرام سا معلوم ہوتا ہے۔ اُف ہلکان ہوگئی مجھے کچھ خبر ہی نہیں کہ کیا ہوا ہوش ہی نہ تھا خبر کیونکر ہوتی۔ اُف نوہ۔ اس کے بعد کہا ہمیں نیند آتی ہے۔ بڑی بیگم نے کہا کیا معلوم سونا اس وقت اچھا یا بُرا۔
نواب - ضرور سوئیں صحت کی دلیل ہے۔ اب آرام کیجئے۔ پنکھا برابر جھلا جائے آدھ آدھ گھنٹے میں بدلی ہو۔ مگر از برائے خدا غل نہ مچنے پائے۔
روح افزا استانی کے پاس جاکر باتیں کرنے لگیں۔
اُستانی جی - مبارک ہو۔
دو گھنٹے کامل حسن آرا نے آرام کیا۔ جاگیں منہ دھویا اور کہا اماں جان اب طبیعت کچھ کچھ بحال ہے۔ اس عرصے میں بہار النسا اور محمد عسکری میں باہم جو گفتگو ہوئی سننے کے قابل ہے۔
بہار - محمد عسکری غضب ہی ہوگیا تھا۔ سمجھے کیا تھے بُرا کیا جو اماں جان کو یا کسی اور کو معلوم ہو جائے تو ہماری صورت سے بیزار ہو جائیں۔ اُف جان ہی لی تھی خدانخواستہ بیچاری کی۔
عسکری - ایک بات کہوں۔ بس اب خاموشی ہی کا موقع ہے۔ اس کا ذکر نہ کیجیئے۔ میں اپنے دل میں خود خفیف ہوں۔
بہار - ہم تو حسن آرا کے معاملات میں دخل ہی نہ دیں گے۔
عسکری - بالکل نہیں، کچھ واسطہ ہی نہ رکھنا چاہیئے ورنہ۔
بہار - ورنہ اب کی خدا جانے کیا ہو جائے بیٹھے بٹھائے۔
عسکری - اس میں کیا شک ہے۔ خدا نے بڑی خیر کی۔ ورنہ ایسا غضب ہوا تھا کہ شاید خون ہماری ہی گردن پر ہوتا۔
حسن آرا نے بڑی بیگم صاحب سے کہا۔ اماں جان گلوری کھانے کو جی چاہتا ہے۔ بڑی بیگم نے کہا بے ڈاکٹر کے پوچھے میں گلوری تو نہ دوں گی۔ مگر الائچی چاہے کھا لو۔
ایک الائچی حسن آرا بیگم کو دی۔
نواب صاحب نے کہا میں ڈاکٹر کے ہاں گیا تھا۔ میں نے کہا سو رہی ہیں۔ کہا صحت کی علامت ہے۔
بیگم - شکر ہے شکر ہے۔ خدا کا شکر ہے۔
نواب - فرمایا سونے دو۔ جگاتا نہیں، خود ہی جاگیں گی۔
بیگم - دو گھنٹے تو سوئیں۔ اب اور کیا سوئیں۔
نواب - خود ہی جاگیں نہ۔

حسن - جی ہاں۔
نواب - یہ دوا لایا ہوں۔ ابھی پلا دیجئے، اسی وقت۔
حسن - کڑوی ہوگی۔
نواب - اس درجہ خوشبو ہے کہ عطر کو بھول جاؤ۔ سونگھ کر دیکھ لو چاہے۔
بیگم - نہیں نہیں۔ دوا کو سونگھتے نہیں۔ اثر جاتا رہتا ہے۔
حسن - کیوں اماں جان؟
بیگم - اثر جاتا رہتا ہے۔

حسن آرا مسکرانے لگیں۔ بڑی بیگم نے کہا تم نہ مانو گی ہم تو سونگھنے نہ دیں گے۔ اس پر بہار النسا اور روح افزا اور سپہر آرا کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ استانی جی بولیں شکر ہے پاک پروردگار کا کہ اب ہم ہنس بول رہے ہیں۔ شکر کرو۔ شکر کرو۔

الغرض ایک ہفتے کے بعد بڑی بیگم صاحب صاحبزادیوں کو لے کر روانہ ہوئیں۔

عیدالضحیٰ کی تیاریاں

عید سعید کے ایک دن قبل عروس ماہ سیما حسن آرا اور خاتون رنگین ادا سپہر آرا پردہ کرا کر مصروف گلگشت چمن تھیں کہ اتنے میں ایک دربان نے مہری کو پکار کر کہا عباسی ذرا پردہ کرو دو سواریاں اتریں گی۔

دونوں بہنیں طرارہ بھر کے مکان کے اندر ہو رہیں۔ تبھی کھڑکھڑاتی ہوئی احاطے میں آئی اور پھاٹک کے قریب ٹھہری۔ کو چمن اور دربان اور سپاہی الگ ہٹ گئے۔ پہلے نواب صاحب گاڑی پر سے اترے، اس کے بعد مہریوں نے چاروں طرف پردہ کر لیا۔ جہاں آرا بیگم اور گیتی آرا بیگم بدن کو چراتے نازوادا سے قدم اٹھاتے چھم چھم کرتی ہوئی اندر تشریف لے گئیں حسن آرا و سپہر آرا سے ملیں اور سب کی سب مل کر بڑی بیگم کے پاس گئیں۔

گیتی آرا۔ آداب عرض ہے امی جان۔

بڑی بیگم۔ جیتی رہو۔ ممتا: دولھا نہیں آئے؟

گیتی۔ آئے تو ہیں۔

بڑی بیگم۔ روح افزا کی آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں تم دونوں کو۔

جہاں آرا۔ امی جان پارسال حسینؔ کا تیجا کر کے کوئی دوسرے دن ملی تھیں ہم سے مگر ہاں اُن سے ملنے کو البتہ کوئی ——— کے برس ہوئے ہوں گے؟ (گیتی آرا کی طرف مخاطب ہو کر)

گیتی۔ اسے کوئی ڈیڑھ برس ہوا ہوگا۔

اتنے میں نواب ممتاز علی خاں بہادر جہاں آرا کے شوہر بھی آئے، بڑی بیگم صاحب کی خدمت میں باادب آداب بجالائے۔ انھوں نے دعا دی پاس بٹھایا باتیں کیں۔ ایک فراخ کمرہ جو فرش وفروش مکلف سے آراستہ تھا۔ ان کے لیے تجویز اگیا دو گھڑی دن رہے حضور بیگم صاحب نے مہری کو حکم دیا کہ مالیوں سے کہو مہندی توڑ کر بھیجیں مگر پتی پتی الگ ہو۔ سر شام ہی آ جائے۔ مہری نے تعمیل کی۔ مالی جھٹپٹے[1] وقت جھرمٹے میں مہندی لے کر ڈیوڑھی پر حاضر ہوا۔ عباسی مہری باہر آئی۔ مہری لگن لے آئی جب لگن میں مہندی بھر چکی تو مالی نے کہا بڑی بیگم صاحب کو دعائے دولت پہنچا دو کہ حضور گنگا دین مہندی توڑ لایا۔ عباسی بیگم صاحب کے پاس لگن لے گئی آداب بجالائی اور کہا حضور مہندی حاضر ہے۔

بڑی بیگم۔ پتی پتی الگ ہے نہ۔ ڈنٹھل تو نہیں ہے؟

مہری۔ جی نہیں حضور۔

بڑی بیگم۔ خواصوں کو حکم دو کہ اچھی طرح دیکھ لیں۔ کوئی کیڑا وبڑا نہ ہو اور دھو کر پیش خدمتوں کو دیں کہ وہ خوب باریک سرمہ سا پیس لائیں۔ آج نوبجے لڑکیوں کے ہاتھوں میں لگائی جائے گی۔

سب حکم کے مطابق چلیں اور اپنے اپنے کام میں مشغول ہوئیں۔ بڑی بیگم صاحب نے دونوں کو حکم دیا کہ عطر کے کنٹر

---

[1] جھٹپٹا۔ جھرمٹا۔ لوکرا۔

اور خوشبودار تیل لے آؤ۔ شام کے وقت منشی نثار حسین صاحب کے کارخانہ سے عطر کے کنٹر اور تیل لاکر بیگم صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔

جہاں آرا بیگم نے ہر طرح کے عطر کو سونگھ کر کہا امی جان ہمیں تو یہ پسند ہے کیتکی کا عطر کیسی نازک اور بھینی خوشبو ہے حنا کا عطر بھی اچھا ہے مگر بہت تیز ہے۔

بڑی بیگم۔ اچھا کیتکی کے عطر کا کنٹر رکھ لو۔ تم بھی پسند کرو گی گیتی آرا؟

گیتی آرا۔ ہم تو موتیا کا عطر لیں گے۔

بڑی بیگم۔ دونوں کنٹر رکھ لو۔ باقی پھیر دو۔

اتنے میں آٹھ بجے اور زورن نے آکر عرض کیا کہ حضور خاصہ تیار ہے۔ حکم ہوا نکالو۔ پیش خدمت اور خواصیں حکم پاتے ہی اٹھیں باورچی خانے گئیں۔ خوانوں میں رکابیاں اور قابیں لگانی شروع کر دیں۔ ایک خوان میں پیالے لگا ئے۔ کسی میں شیرمال اور پراٹھے، کسی میں دو رغ اور کباب و پلاؤ وغیرہ۔ کسی میں اچار مربا۔ خوانوں پر خوانپچے ڈھکے۔ اور خوان پوش ڈھانپ کر عرض کیا حضور کھانا نکالا گیا۔ خواصیں سلفچی آفتابہ لائیں ہاتھ دھلایا۔ ایک خواص نے دسترخوان بچھایا۔ دوسری نے دسترخوان کے چاروں طرف لگنے روشن کیے پیش خدمتوں نے دسترخوان پر پیالے چننے شروع کیے۔ جب چن چکیں تو آداب بجالائیں اور ہٹ گئیں۔ آبدار خانے والی صراحی اور گلاس لے کر باادب کھڑی ہوئی۔ سب نے بسم اللہ کہہ کر کھانا تناول فرمانا شروع کیا۔

سپہر۔ آج پلاؤ میں ذرا نمک کم کر دیا ہے۔

حسن۔ نورا کندن قلیہ چکھیئے۔

گیتی۔ زیرہ بریانی خوب خوش ذائقہ پکی ہے اس میں سلونا پن ہے۔

سپہر۔ شامی کباب؟

بڑی بیگم۔ پلاؤ میں ذری نمک کم ہے اور تو سب ہمیں پسند ہے۔

گیتی۔ یہ اچار کہاں کا ہے امی جان؟

بڑی بیگم۔ بیچ کی سرا کا۔

گیتی۔ آج کیا جانے کتنے دن بعد امی جان کے ساتھ کھانا کھایا۔

حسن۔ جی ہاں جہاں آرا بہن تو کبھی کبھی خط لکھتی بھی تھیں مگر آپ نے وہ سون کھینچی کہ توبہ ہی بھلی۔

اب سنیئے کہ اِدھر تو یہ تینوں بہنیں بڑی بیگم صاحب کے ساتھ کھانا کھاتی تھیں ادھر نواب صاحب اور جہاں آرا بیگم کے مابین الگ کمرے میں مزے مزے کی باتیں ہوتی جاتی تھیں۔

نواب۔ بڑی خوش خور ہیں آپ کی امی جان صاحب۔

جہان۔ اے آخر یہ کیوں۔ یہ کاہے سے کہا آپ نے؟

نواب۔ اور تو خیر مگر پلاؤ ماشاء اللہ خوب پکا ہے آب و نمک کتنا درست ہے۔

جہان۔ (مسکرا کر) یا الٰہی بندہ بشر ہے۔ ذری نمک کم ہوگیا تو طعنے دینے لگے۔ آپ کا باورچی سو بار مر کے بھی زندہ ہو تو ایسا کندن قلیہ نہ پک سکے۔

نواب (ہنس کر) ہم تو اس پلاؤ پہ عاشق ہیں۔

جہان۔ چلو بس بہت باتیں بنانے کو رہنے دو۔

نواب۔ زبو بریانی خوش ذائقہ ہے اور اچار تو ایسا ہم نے کبھی نہیں کھایا تھا۔ ایمان کی بات ہے۔

جہان۔ یہ دلّی سے آیا ہے حسین بخش کے ہاتھ کا اور یہ آم کا اچار بیج کی سرا کا ہے۔

ادھر بڑی بیگم صاحب نے حکم دیا کہ کھانا بڑھاؤ۔ مغلانیوں نے خوانوں میں تاب اور رکابیاں لگا کر کھانا بڑھایا۔ ایک پیش خدمت دسترخوان اُٹھا کرلے گئی۔ ایک خواص تسلا لائی۔ دوسری بیسن دانی لیے کھڑی تھی۔ پہلے بیگم صاحب نے گرم پانی سے ہاتھ دھویا۔ اس کے بعد لڑکیوں نے۔ خواص نے دست پاک حاضر کیا۔ ہاتھ پونچھے۔ خواصوں نے پاندان کھولا اور خاصدان میں گلوریاں رکھ کر سامنے حاضر کیا۔ بھنڈی خانے والی پیچوان تیار کرکے لائی۔ بیگم صاحب پلنگڑی پر لیٹ کر منک لیا اور دھواں دھار پیچوان پینے لگیں۔

اتنے میں جہاں آرا بیگم بھی آئیں اور چاروں بہنیں علیحدہ کمرے میں جاکر باتیں کرنے لگیں۔

بڑی۔ مہندی پس کے تیار ہوئی؟

مغلانی۔ حاضر ہے حضور۔

بڑی۔ لڑکیوں کو بلاؤ۔

مغلانی۔ بہت خوب۔

مغلانی نے جا کر کہا، بیگم صاحب یاد فرماتی ہیں۔

مغلانیوں نے دونوں ناکتخداؤں کے ہاتھوں میں پہلے مہندی لگائی اور ہتھیلی پر چھلّا رکھ کر ارنڈ کے پتے لپیٹ دیئے، اُن پر سوہا لپیٹا اور زربفت کا حنابند باندھا۔ پھر جہاں آرا اور گیتی آرا کے ہاتھوں میں مہندی لگائی اور اسی طرح ارنڈ کے پتے اور سوہا لپیٹ کر اطلس کا حنابند باندھا۔

جہاں۔ بی مغلانی! امی جان کے ہاتھوں میں تو لگاؤ۔

بڑی بیگم۔ نہیں بس صرف پوروں پر۔

بی مغلانی نے بیگم صاحب کے دسوں پوروں پر مہندی لگائی۔ حسن آرا سپہر آرا نے ایک ہی پلنگڑی پر آرام کیا۔ پلنگڑی کے نیچے ایک مغلانی لیٹی رہی کہ حنابند کھل نہ جائے۔

بڑی بیگم۔ دیکھو تم دیکھتی رہنا چپکے کی نیند ہے۔

سپہر۔ نہیں اماں جان۔ مجال ہے کھل جائے۔

حسن۔ اچھا تو بی مغلانی کو یہاں سونے دو نہ۔

گیتی۔ ہماری پلنگڑی بھی پاس ہی لا کے بچھا دو۔

گیتی آرا بھی بہنوں کے پاس ہی پلنگڑی پر لیٹیں۔

جہاں آرا بیگم اپنے کمرے میں حضور نواب صاحب سے مزے مزے کی باتیں کرتی تھیں۔

نواب۔ تمہاری سب بہنوں میں حسن آرا بیگم چشم بد دُور بڑی نستعلیق ہیں۔

جہاں - رہتی ہیں - اور آپ کی ہمشیرہ جان بس کی گانٹھ - ساس سے دو گھڑی بھی نہیں بنتی - شادی کے دوسرے ہی مہینے ماں بیٹیوں میں پخ چلوادی -

نواب - بجا ہے - انھوں نے رو وا دیا وہ خود کٹ مری - لڑکے سے اُن سے بنتی ہی کب تھی - اور تم اپنی بہار النسا کو بھول بھول جاتی ہو - خدا کی قسم اُن کے میاں ہم سے کہتے تھے کہ بھائی بعض اوقات ناک میں دم آجاتا ہے - ایک دفعہ کہہ بیٹھیں کہ تم ساس کا ہے کو ہو تم تو میری سوت ہو - بھلا یہ باتیں کہیں شریفوں کی بہو بیٹیوں میں جائز ہیں - مگر ہم خدا کا شکر کرتے ہیں کہ ہم کو فہمیدہ بیوی ملی - اللہ جانتا ہے جو بہار النسا کی سی بیوی ملتی نہ تو -

جہاں - اے کیا باتیں کرتے ہو؟ یہ ملتی وہ ملتی - اب سونے دو - تڑکے اٹھنا ہے - ذری سی مہندی تم بھی لگالو -

نواب - اجی ہٹاؤ بھی -

جہاں - ہماری خاطر سے -

نواب - میں عورتوں کے جھگڑے میں نہیں پڑتا -

جہاں - نہیں خدا کی قسم تم کو لگانا پڑے گی - میں نہ مانوں گی کسی صورت -

نواب - تم بھی ایک نیا رنگ لاتی ہو ناحق قسم کھا بیٹھتی ہو - بے سمجھے بوجھے -

جہاں - پھر لگاؤ - اتنا ہمارا ہی کہنا کرو -

نواب - تمھاری بھی عجیب ضد ہے - باہر جاؤں گا تو لوگ ہنسیں گے - یہ سنگار عورتوں کو زیبا ہے - باہم کو مفت میں نکو[1] بنواؤ گی -

جہاں - اے واہ آج شب عید ہے سب ہی لگاتے ہیں - ہاں جو آدمیت سے خارج ہیں ان کی اور بات ہے (مسکرا کر)

نواب - چلیے ہم آدمیت سے خارج ہی سہی -

جہاں - واہ تو ہم کیوں کرانیں سے لگاؤ ہمارے سر کی قسم -

نواب - اچھا صاحب لاؤ تمھاری خاطر منظور ہے - تم ضد ہی کرتی ہو تو ہم مجبور ہیں -

نواب صاحب نے ایک ہاتھ میں تھوڑی مہندی ملی اور کہا گرم پانی منگواؤ ہم دھوئیں گے -

جہاں - واہ وا - چہ خوش ابھی لگائی کیا تم نے - ملو تو اچھی طرح سے ورنہ اس سے تو نہ لگائی ہوتی -

نواب - لو لگا کے شہیدوں میں داخل ہو گئے -

گرم پانی سے تسلے میں ہاتھ دھو کر نواب صاحب نے گلوریاں چکھیں -

بڑی بیگم صاحب نے حکم دیا کہ چار بجے ہمیں جگا دینا - پیش خدمتیں اور بی مغلانی ٹھیک چار بجے اُٹھیں -

مغلانی - (آہستہ سے پاؤں دبا کے) حضور!

بڑی بیگم - حسن آرا اور سپہر آرا اور گیتی آرا کو جگا دو - اور ان کو بھی اٹھاؤ (جہاں آرا کو)

مغلانی - شمع لاؤ - تسلہ لاؤ -

حسن آرا بیگم اور سپہر آرا کو جگایا گیتی آرا بھی اُٹھیں - مگر جہاں آرا ابھی خواب ناز میں ہیں - خیر لگن میں ہاتھ کھولے گئے پیش خدمتوں نے مہندی چھڑائی -

---

[1] بدنام -

حسن - بس اب چھوٹ گئی - پانی کا لوٹا لاؤ - گرم پانی کیا ہے یا نہیں -

پیش خدمت - جی ہاں -

سپہر - اوہ - مثال آگ گرم ہے - ذری ٹھنڈا پانی ملاؤ -

جب سب لڑکیاں ہاتھ دھو چکیں تو بڑی بیگم صاحب نے حکم دیا کہ عطر کے کنٹر لاؤ - مغلانی دو شیشوں میں عطر لائی - لڑکیاں شمع کے سامنے ہاتھ لے گئیں - مغلانیوں نے عطر ملا -

بڑی - اے شمع کے سامنے ہاتھ نہ لے جاؤ، رنگ شرما جاتا ہے -

حسن - بہت خوب (نزاکت سے ہاتھ ہٹا کر)

ایک مغلانی نے جا کر خواص سے کہا کہ جہاں آرا بیگم کو جگا دو - جہاں آرا بیگم جوانی کی نیند کے نشہ میں متوالی ہو رہی تھیں - لاکھ لاکھ جگایا مگر انگڑائیاں لے لے کر کروٹیں بدلا کیں - بارے خدا خدا کر کے پانچ بجے آنکھ کھلی -

خواص - حضور صبح ہو گئی -

جہاں - اوئی سونے دو ذری -

خواص - بیگم صاحب نے بھیجا ہے کہ اُٹھیے ہاتھ دھوئیے -

جہاں - لوٹا اور تسلہ منگواؤ -

خواص - سب حاضر ہے -

خواص نے حنا بند کھولا - پتوں کو الگ کیا، مہندی لگن میں جھڑائی - ہاتھ پر پانی ڈالا، پیش خدمت نے دست پاک[1] پیش کیا -

جہاں - ہمارا صندوقچہ لاؤ اور عطر نکالو -

عطر ہاتھوں میں مل کر نواب صاحب کو جگایا اور کہا دیکھو ہمارے ہاتھ میں مہندی کیسی رچی ہے ؟

نواب - دستِ نگارین چوم کر -

مہندی مل کر ہے چوٹ مرجاں پر ہاتھ لانا نگار کیا کہنا

جہاں - گھوڑے بیچ کر سوئے تھے - دیکھو خاصہ تڑکا ہے -

نواب - تڑکا نہیں بلکہ دھوپ نکل آئی - خدا جھوٹ نہ بلائے چار تو بجے نہ ہوں گے ابھی - ذرا حقہ منگواؤ -

جہاں - اُٹھ کے بیٹھو - عید ہے آج لیٹے کیا ہو -

نواب - ہماری تو عید شب کو ہوگی -

جہاں آرا بیگم منہ تو دھو ہی چکی تھیں - دوپٹہ سنبھال کر ادب کے ساتھ بڑی بیگم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اداب بجا لا کر بیٹھیں -

بڑی بیگم - مہندی اچھی طرح رنگائی تھی رات ؟

جہاں - جی ہاں امی جان - مگر چھلا رکھنا بھول گئی -

---

[1] رومال -

بڑی بیگم۔ بی مغلانی ممتاز دولھا کو بھی جگا دو۔

مغلانی۔ حضور اٹھے ہیں۔

عید کے بیش بہا جوڑے پہلے ہی سے تیار ہو گئے تھے۔ امیر کا گھر، کسی چیز کی کمی نہیں۔ لاکھوں روپیہ کا اسباب زیور جواہرات کپڑا اپوشاکیں سب ہی کچھ تھا۔ مغلانیاں اور خواصیں اور نوکروں چاکروں کے لیے بھی ان کی حیثیت کے موافق جوڑے بنے تھے۔

بی مغلانی کی لڑکی پیاری کی آنکھ جو کھلی تو لحاف ہی کے اندر سے پکارا کہ حضور ہمارا جوڑا نکلوا دیجیے تو ہم پہن لیں۔

مغلانی۔ این! اے واہ ہے ابھی لحاف ہی کے اندر پڑی ہے اور جوڑے کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ اٹھو بٹیا۔ بڑی حضور کو آداب بجالاؤ اور سب کو بندگی کرو۔ نہاؤ منہ ہاتھ دھوؤ تو پہنو۔ یہ گھبراہٹ۔ کچھ ٹھکانا ہے۔

سپہر۔ پیاری کے لیے کچھ بنا ہی نہیں ابکی۔

پیاری۔ واہ ہم سے بڑی بیگم صاحب نے فرما دیا ہے۔ آپ ہم کو جھٹلاتی ہیں۔ ہمیں سب معلوم ہے۔

گیتی۔ (آہستہ سے) پہلے میاں تو کوئی تجویز پھر جوڑا اچھا کانا۔

پیاری۔ حضور بہو تیرے ہو جائیں گے۔

اس بھولے پن کے ساتھ پیاری نے یہ فقرہ کہا کہ چاروں بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ بیگم صاحب نے پوچھا کیا ہنسیں؟ سپہر آرا بولیں۔ کچھ نہیں اماں جان اس پیاری کی باتوں پر ہنسی آئی۔ ہزار داستان کی طرح چہکتی ہے۔

حُسن۔ اماں جان بیا بانی کی ڈومنیوں کو بلایا ہے۔

بڑی۔ ڈومنیاں حاضر ہوں گی فوراً۔ آج انھیں کی تو عید ہے۔ انعام لینے نہ آئیں گی کیا؟ اب ذری دھوپ نکلے تو نہاؤ۔ حمام کرو۔ کپڑے پہنو۔ ڈومنیاں دومنیاں سب آپ ہی حاضر ہوں گی۔

اتنے میں رونے[1] نے عباسی مہری کو پکارا اور وہ چمکتی ہوئی باہر گئی۔

رونا۔ وہ کنٹر جو ہم لائے تھے اُن میں جو پسند ہو وہ رکھ لو اور جو پسند نہ ہو وہ واپس کر دو۔

مہری۔ ہم لائے تھے! میں لایا تھا نہیں کہتا آج عید نہ ہوتی تو نکلوا دیتی کھڑے کھڑے۔

بڑی بیگم صاحب کے ہاں چھ مہینے ادھر کل مغلانیاں اور مہریاں اور خواصیں بڑی بوڑھی عورتیں تھیں مگر یہ عباسی مہری جو کوئی ایک مہینے سے نوکر ہوئی تھی نوجوان اور بلا کی حسینہ تھی۔ جوانی اور جوبن پھٹا پڑتا تھا اور شوخی ایک ایک رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ حسن آرا بیگم اور سپہر آرا دونوں اس کے ساتھ عنایت سے پیش آتیں تھیں۔ گو عباسی نوکر تھی مگر بہو بی تھی۔ عباسی نے جو رونے کو للکارا تو وہ خاموش ہو رہا۔ اتنے میں نواب صاحب کی جو اُس طرار اور گلعذار مہری پر نظر پڑی تو میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے۔

نواب۔ کیا ہے بی مہری صاحب؟

عباسی۔ (انگلیاں مٹکا کر) اے حضور ہے کیا یہ ٹکے کا آدمی اور ہم سے جب بات کرتا ہے تو اپنے کو ہم کہتا ہے۔ موا گنوار۔

نواب۔ اچھا جانے دو۔ اب تم اپنی طرف دیکھو۔

عباسی۔ اے حضور میں کچھ کہتی تھوڑا ہی ہوں۔ مگر یہ بدتمیز آدمی ہے۔ محلات کی ڈیوڑھی پر آج سے نہ آنے پائے جو بیگم صاحب سے یا صاحبزادیوں سے جا کے کہہ دوں۔ موا ہولا خبط۔

---

[1] ہرکارہ

روتا۔ حضور یہ تو اندر کی جانے والی ہے۔ جو چاہے وہاں جاکے کہہ دے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ فقط عطر کے کنٹر مانگے تھے بس ہزاروں صلواتیں سنائیں۔

نواب۔ اچھا چپ رہو بدتمیز کنٹر آ جائیں گے۔

عباسی ایک عورت طرار سمجھ گئی کہ میاں ریجھے ہیں۔ سر کو اس زور سے جھٹکا دیا کہ دوپٹہ کھسک گیا اور گوری گوری گردن صاف نظر آئی۔ نواب صاحب اور بھی ہزار جان سے عاشق زار ہو گئے اور گھورنا شروع کیا۔ روتا بوڑھا خرانٹ اور تجربہ کار آدمی تھا، چتونوں سے تاڑ گیا کہ نواب صاحب کا اس نوخیز مہری پہ دل آیا ہے۔ عباسی کے ہاتھ جوڑ کر کہا اب خطا معاف کرو اور کنٹر ذرا لا دو۔

نواب۔ جو عطر پسند ہو وہ رکھ لو، باقی پھیر دو۔

عباسی دل میں کھلی جاتی تھی کہ نواب کی نظر پڑی۔ اب چاندی ہے۔ پانچوں گھی میں ہیں اور روتا جلا مرتا تھا۔ ٹھان لی کہ چاہے نوکری جائے مگر کسی نہ کسی کے ذریعہ سے بیگم صاحب کو ضرور اس بات کی اطلاع دوں گا کہ نواب صاحب عباسی مہری پہ ریجھ گئے اور کھلا بھیجوں گا کہ بے طور دل آیا ہے جانتے کہاں ہیں۔ میری نوکری جاتے تو پروا نہیں مگر عباسی نہ رہنے پائے۔

بڑی بیگم نے جہاں آرا سے کہا ممتاز دولہا سے کہہ دو کہ پہلے وہ حمام کر آئیں پھر سواریاں جائیں گی۔ جہاں آرا نواب صاحب کے پاس گئیں۔

جہاں۔ (اندر بلوا کر) امی جان کہتی ہیں تم جاکے حمام کر آؤ پھر ہم سب جائیں گے۔

نواب۔ سردی ہیں تو ہم ابھی نہ جائیں گے۔

جہان۔ اے واہ اچھی سردی ہے۔ جاؤ ہمارے سر کی قسم امی جان کو خوش کرو۔

نواب صاحب دوشالہ اوڑھ کر اٹھے۔ ساس کی خدمت میں آداب عرض کیا۔ بڑی بیگم نے کہا جیتے رہو۔ جاؤ پہلے تم حمام کر آؤ پھر سواریاں جائیں۔ ہم عورتوں کے نہانے میں بڑا بکھیڑا ہوتا ہے۔

ادھر محلدار نے ڈیوڑھی پر حکم دیا کہ ممتاز دولہا برآمد ہوتے ہیں۔ چوبدار اور خدمتگار تیار رہیں اور نگیں بھی تیار رہیں۔ حمام خانے جائیں گے۔ سب نے تعمیل حکم کی۔

اتنے میں نواب صاحب برآمد ہوئے اور سوار ہو کر چلے۔ ہرکارہ پہلے ہی سے دوڑ گیا۔ حمامی نے کہا نواب صاحب آتے ہیں۔ تیار رہو۔ جب سواری داخل ہوئی تو حمامی آداب بجا لائے۔ چوبدار نے پردہ اٹھایا۔ حمام کا دروازہ کھولا۔ تشریف لے گئے۔ پانچ منٹ تک توقف کر کے کپڑے اتارے۔ لنگی باندھی۔ حمامی نے بھی کپڑے اتارے اور کھڑاؤں سامنے رکھی۔ ایک حمامی نے کھیسا اٹھایا۔ دوسرے نے دروازہ کھولا۔ حمام کے اندر داخل ہو کر حوض پر متمکن ہوئے اور نہا کر گھر گئے۔

محلدار۔ (بڑی بیگم سے) حضور تشریف لے آئے۔

بیگم۔ حکم دو کہ فنسیں نکالی جائیں۔ سواریاں جائیں گی۔ مہریاں تیار ہوں۔

فنسیں نکالی گئیں۔ قنات گھر گئی۔ چار فنسوں پر چاروں سوار ہوئیں۔ مہریاں بصد شان دلربائی فنس کا کونا دبائے ناز سے قدم بڑھائے ساتھ ساتھ جاتی تھیں اور اپنی اپنی ادائے رنگین سے تماشائیوں کو بھاتی تھیں۔ سپاہی اور چوبدار بھی ہمراہ تھے۔ بڑے ٹھسے سے سواریاں حمام میں داخل ہوئیں۔ حمامی فنس کے قریب آن کر آداب بجا لائے۔ الغرض حمام کر کے اپنے دولتخانے پر تشریف لائیں۔ یہاں بڑی بیگم صاحب نے محلدار سے کہا جاؤ چوبدار کو حکم دو کہ امیرن چوڑی والی کو بلا لائے۔ چوڑی والی آئی۔

پہلے حسن آرا اور سپہر آرا کو چوڑیاں پہنائیں، اس کے بعد بڑی بیگم صاحب نے جہاں آرا اور گیتی آرا سے کہا ذری آگے بڑھو بیٹھو۔ چوڑی والی نے ان کے ہاتھ کی چوڑیاں الگ کیں جہاں آرا بیگم نے ایک سلمے کا جوڑا پسند کیا جس کے بندوں پر موتی جڑے ہوئے تھے اور سبز بانک تھی۔ چوڑی والی نے جوڑا لگایا۔

اتفاق سے جہاں آرا کے سر سے دوپٹہ کھسک گیا تھا۔ بڑی بیگم صاحب ضعیف الاعتقاد تو نہیں ہی، کسی قدر ترش ہو کر کہا۔ بیٹا، سر پہ دوپٹہ ڈال لو ننگے سر چوڑی نہ پہنو جب چوڑیاں پہن چکیں تو دونوں نے چوڑی والی کو سلام کیا۔ اس نے دعا دی کہ وارث زندہ رہے، کوکھ مانگ سے ٹھنڈی رہو۔

جہان۔ (اُٹھ کر) اماں جان بندگی۔

گیتی۔ اماں جان تسلیمات عرض ہے۔

بڑی۔ پھلو۔ پھولو۔ پوتا کھلاؤ۔

بڑی بیگم نے حکم دیا کہ دیوان خانے میں دُنبے اور مینڈھے اور بکرے ذبح کراؤ بھر کیا تھا اُن بے زبانوں پر چھری تیز ہونے لگی۔

عباسی۔ دیکھتے رہنا یہ لوگ بوٹیاں نہ اُڑا دیں۔

چوبدار۔ بہت خوب۔

عباسی۔ کہیں بھیڑ وبڑ تو نہیں ہے کوئی،

چوبدار۔ کیا مجال۔ حلال کر کے دھر دوں بوچے کو۔

جہاں آرا اور گیتی آرا نے لباس بیش بہا زیب تن کیا۔ سبز گرنٹ کا پائجامہ اُس پر کارچوبی آڑی بیل کا کام موتیوں کی بنت ٹکی ہوئی۔ سنہری کرن لگی ہوئی لوزات کی گوٹ دوپٹہ جامدانی کا اس پر کام کامدانی کا۔

دوسری کا دوپٹہ ململ کا پیازی رنگا ہوا ہلکا۔ اُتو کی ہوئی اودی گوٹ۔ شلوکا پھنسا ہوا آستینوں دار کامدانی کا خوش رنگ گلنار۔ ایک کی جامہ وار کی رضائی۔ دوسری کی فوق البھڑک دلائی۔ موتیوں کا چھپکا زیب سر۔ ماتھے پر جڑاؤ چاند ٹیکی۔ چوٹی پر سیس پھول۔ کانوں میں پتے جھمکے انتیاں۔ بجلیاں کرن پھول۔ گلے میں دُھکدھکی چمپاکلی موتیوں کا ہار۔ بازوؤں پر نورتن جوشن۔ دست سیمیں پر ہیرے کے کڑے موتیوں کی پہچیاں چوہے دنتیاں۔ پاؤں میں چھڑے کڑے چھاگل۔ جہاں آرا بیگم ہر ہفت آرائش سے مزین اور گیتی آرا چیل پیرائش سے مشین ہوئیں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوہ قاف کی پریاں آئیں ہیں۔ ایک تو یوں ہی کمسن اور نوخیز تھیں، اس آرائش اور نکھار نے جوبن کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔

نواب صاحب باہر تشریف لے گئے۔ عباسی عمداً اور قصداً خوب بن ٹھن کر دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ سُرمئی گرنٹ کا لہنگا۔ پڑاتے کی ہاتھ بھر چوڑی گوٹ۔ گوٹ پر آٹھ آٹھ پلیٹیں اُس پر تاج بنے ہوئے۔ سُرخ گرنٹ کا نیفہ۔ جو یاقوت احمر کو خون رلائے۔ اُس میں لاہور کا اُودا ریشمی ازار بند پڑا ہوا گچھے دار اور کرن ٹکی ہوئی۔ پور پور چھلے کانوں میں انتیاں[1]۔

نواب۔ اوہو اوہو۔ اس وقت تو بڑے ٹھسے سے کھڑی ہو۔

عباسی۔ (گلوری چبا کر) جی ہاں حضور سب حضور ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔

نواب۔ چلو تم کو عید گاہ لے چلیں۔

---

[1] بڑی بالی۔

عباسی۔ (مسکرا کر) بندگی۔

نواب۔ کیوں کیا کچھ ہرج ہے؟ بگھی پر بیٹھ لینا۔

عباسی۔ کیا نکلوائیے گا گھر سے۔

نواب۔ اب ہم کو دو چار روز اور ٹکنا پڑا یہاں۔

عباسی۔ (دوپٹے کو سنبھال کر) یہ کاہے سے؟

نواب۔ تمہیں جانو۔

عباسی۔ حضور کوئی آ نہ جائے اب سوار ہو جائیے۔

نواب۔ بہت اچھا۔ مگر......

مگر کہہ ہی چکے تھے کہ محلدار آ پڑی۔ نواب صاحب نے پردہ اٹھایا اور تڑ سے باہر ہو رہے۔ چوبدار نے کہا بسم اللہ۔ حضرت فٹن پر سوار ہو کر عیدگاہ گئے۔ اُدھر بڑی بیگم صاحب نے دریافت کیا کہ حسن آرا اور سپہر آرا نے پوشاک بدلی۔ مغلانی نے کہا حضور پہن رہی ہیں۔

ان کی پوشاک کا حال سنیئے۔ دونوں بہنوں کے لیے ایک ہی قسم کا جوڑا بنا تھا۔ سنہری اطلس کا پائجامہ چھڑیاں ٹکی ہوئیں گوٹ کے اوپر مقیش۔ کریب کا بہار دار دوپٹہ بانکڑی ٹکی ہوئی۔ کانوں میں کرن پھول اور بجلیاں گلے میں آڑی ہیکل۔ جگنو۔ دھکدھکی۔ ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے اور جڑاؤ کنگن۔ بازوؤں پر نورتن۔ پاؤں میں پازیب اور چھڑے۔

حسن آرا اور سپہر آرا کی پوشاک اور زیور میں فرق صرف اس قدر تھا کہ حسن آرا کریب کا دوپٹہ اوڑھے تھیں اور سپہر آرا کا کامدانی کا گلابی تھا، گیتی آرا کا دوپٹہ آبی تھا۔

ان دونوں بہنوں کی اٹھتی جوانی اور رخسار تاباں اور پیشانی نورانی۔ دست صنائی شان بزنائی دلربائی اس وقت عجب لطف و بہار دکھاتی تھی۔ جہاں آرا نے مسکرا کر کہا چشم بددور ہماری دونوں بہنیں چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں۔

حسن۔ (لجا کر) بنائیے بنائیے۔

روزِ عید اور چہل پہل

نواب گردوں مدار مع یاران موافق واحباب صادق عیدگاہ میں تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ساقنیں بناؤ چناؤ کر کے ٹھسّے کے ساتھ بیٹھی ہیں۔ تختوں پر سفید سفید چاندنیاں بچھی ہیں۔ سامنے پاندان رکھا ہے۔ برنجی حقے لگے ہوئے ہیں۔ دائیں بائیں ایک ایک لگن نیچے آگ روشن چلمیں بھرنے کے لیے دو دو آدمی حاضر ہیں۔ یاران سرپل کا جھرمٹ ہے۔ بالوں اور چھولداریوں میں گھس گھس کے دم لگاتے ہیں آسمان تک پہنچاتے ہیں۔ کسی کی چھولداری میں دائرہ بج رہا ہے۔ کسی ساقن کے سامنے ڈھولکی پر گا رہی ہے اور چمک دمک کے تماشائیوں کو لبھاتی ہے۔ ساقی چکارہ بجاتے ہیں۔ بیگنی پھبتیاں سناتے ہیں۔ حلوائیوں کی دکان پر دھوم ہے۔ افیمیوں اور مٹھورں کا ہجوم ہے۔ کھلونے والے بھولے بھالے کھلونے رکھے دکان جمائے۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ ننھے ننھے بچے مچل رہے ہیں کہ ہم تو مٹی کا بوا لیں گے دو پیسے دیں گے۔

عیدگاہ کے پھاٹک پر پہنچے تو ہوادار اور گاڑی اور فٹن اور گھوڑوں کا تانتا لگا ہوا۔ حوض پر بیٹھے۔ منہ ہاتھ دھویا دست پاک سے ہاتھ پونچھا۔ اتنے میں آواز آئی الصلوٰۃ الصلوٰۃ۔ نمازی جھک پڑے صفیں بندھیں پیش نماز آگے کھڑے ہوئے۔ نواب صاحب بھی ایک صف میں داخل ہو گئے۔ نماز پڑھ کر احباب سے بغل گیر ہوئے۔

نواب۔ بھائی نثار علی صاحب ہیں۔ آج شب کو ضرور آئیے گا۔

نثار علی۔ بہت خوب جلسہ ولسہ دکھائیے گا؟

نواب۔ ضرور۔ ضرور۔

سبحان علی خاں۔ حضرت اب اس شہر میں کوئی اس قابل ہی نہیں کہ گانا سُنئے اور دو ایک ہیں بھی تو صورت حرام۔

نواب۔ خیر دو گھڑی کا لطف ہی سہی۔ آپ بھی ضرور آئیے گا۔

سبحان علی خاں۔ انشاء اللہ۔

نواب۔ انشاء اللہ نہیں۔ کہیئے ضرور آؤں گا۔

نثار علی۔ ابھی ہم لیتے آئیں گے۔ ان کو اور محلے بھر کو۔

چوبداروں کو نواب صاحب نے حکم دیا کہ پیپڑی اور جوری خرید لو کھلونے والوں سے کھلونے لو اور رنگسازوں سے کاٹھ کی فنسیں اور گڑیوں کے پلنگ اور رنگے ہوئے صندوق اور کشتیاں لے آؤ۔ خدام بادشمنے کل سودا خرید کر دوسری بگھی میں رکھ دیا اور حضور نواب صاحب روانہ ہوئے۔ بگھیوں میں گھر پہنچے۔ باہر کمرے میں بیٹھے۔ رفقا نے نذر دکھائی۔ اس کے بعد اندر تشریف لے گئے۔ محلدار نے پردہ اُٹھایا۔ خدمتگاروں اور چوبداروں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا۔

بڑی بیگم۔ آ گئے۔ کہو عیدگاہ میں کچھ مجمع وجمع تھا۔

نواب۔ جی ہاں۔ کچھ تھا تو۔ مگر آگے کا سا بھیڑ بھڑکا کہاں؟

بڑی بیگم۔ میلا اچھا تھا؟

نواب ۔ جی۔ باقنوں کی دکانیں کثرت سے تھیں۔
بڑی ۔ نماز کے قبل تو پہنچ گئے ہوگے؟
نواب ۔ آدھ گھنٹے کی دیر تھی ۔
حسن آرا ۔ دولھا بھائی ہماری عیدی لائیے ۔
سپہر آرا ۔ اماں جان نے پانچ پانچ اشرفیاں دی ہیں۔

نواب صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اشرفیاں نکالیں اور دو دو اشرفیاں دونوں چھوٹی سالیوں کو دیں۔ بیگم صاحب کو آداب عرض کرکے کمرے کی طرف چلے کمرے میں پلنگ پر لیٹے۔ پان کھایا۔ جہاں آرا بیگم بھی اٹھ کر گئیں۔ اور ان کے پیچھے پیچھے گیتی آرا۔

گیتی آرا ۔ دولھا بھائی ہماری عیدی!
نواب ۔ شام کو دیں گے ۔
گیتی آرا ۔ واہ ہنسی ہنسی میں عیدی اُڑادی ۔ لائیے ۔
نواب ۔ (مسکرا کر) کہہ تو دیا ۔
گیتی آرا ۔ اللہ جانتا ہے ہم آپ کا بڑا لحاظ کرتے ہیں اور آپ ہم سے ہنستے[1] ہیں۔
جہاں آرا ۔ اے ہاں وہ لحاظ کرتی ہے اور تم ہنستے ہو۔ پھر وہ بھی کچھ کہے تو شکایت نہ کرنا ہم سے۔
نواب ۔ تو میں ہنسا کیا۔
گیتی آرا ۔ (مسکرا کر) اے لو کچھ ہنسے ہی نہیں؟

اتنے میں رکابدار نے محلدار کو پکارا۔

محلدار ۔ کہو کیا کام ہے؟
رکابدار ۔ یہ ڈالی پہنچا دو۔

دو قابوں میں نان خطائی۔ ایک قاب میں جوزی کسی میں نہایت خستہ پیڑی۔ سیر بھر سمنک میں آٹھ سیر گھی کھپایا ہوا۔ اچاری میں میٹھے کی سرخ سرخ مچھلیاں معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ تو ام آبدار اور برف سا سفید۔ اچاری پر سرخ اطلس اور کلابتوں کی ڈوری بندھی ہوئی۔ ادھر اُدھر مقیش کے پھُندنے لٹکتے ہوئے۔ بیگم صاحب کے سامنے ڈالی لگائی گئی۔ اس کے بعد رحیم بخش باورچی آیا۔ ایک قاب میں شامی کباب ایک میں پراٹھے بلدار مغلی خستہ کسی میں پسندے کباب کسی میں کوفتے کباب سرخ عمدہ باقر خانی۔ ایک قاب میں ہوائی روٹی۔ ایک میں نان پنیر۔ کوری کاغذی ہنڈیاں شکر قند کی گلتھی۔ برابر کی بالائی دی ہوئی کیوڑا اپڑا۔ یہ ڈالی بھی بیگم صاحب کے سامنے پیش ہوئی۔ اس کے بعد خوشلبا کبڑن آئی اس کی بیٹی سنہر دیا بھی اس کے ساتھ تھی۔ گلبدن کا لہنگا پھڑکتا ہوا۔ گلشن لوٹ کا دوپٹہ اودی گوٹ بنگے کے سامنے ایک ٹٹو اٹک رہا ہے۔ دونوں نے آداب عرض کرکے ڈالیاں پیش کیں۔ ڈالی میں کیلے کے ہرے بڑے بڑے پتے بچھے ہوئے۔ رنگترے، امرود، کیلے گنڈیریاں۔ چکوترے، مہتابی کل فواکہ قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ محبوبن کسگرن[2] ایک خوان میں کاغذی آبخورے۔ صراحیاں۔ تو تھیاں۔ جھجھریاں مٹی کے کبوتر۔ توتے۔ مور لگا کر لائی اور ڈالی پیش کی۔ بڑی بیگم صاحب نے کہا ممتاز دولھا کے سامنے لے جاؤ۔ کہو جو شے پسند ہو

---

[1] ہنستا ۔ مذاق کرنا ۔ [2] کمھارن۔

رکھ لیں۔

پیش خدمتیں اور مغلانیاں ادب کے ساتھ لے گئیں۔

نواب۔ اوہ یہ سب کاہے کو اٹھا لائیں؟

پیش خدمت۔ حضور حکم دیا ہے بیگم صاحب نے۔

نواب۔ تو اس قدر قابیں اور خوان کیوں اُٹھا لائیں؟ اچھا خیر جوزی اور یہ اچاری سُرخ مچھلیوں کی اور شامی کباب یہاں رکھ دو، باقی سب اُٹھا لے جاؤ۔

پیش خدمت۔ حضور یہ چکوترے رکھ لیجئے۔

نواب۔ اچھا رکھ دو۔

پیش خدمت۔ اس میں سے کچھ نہ پسند فرمائیے گا۔ محبوبن جولائی ہے۔

نواب۔ اچھا لاؤ مزا چھاں رکھتی جاؤ۔

پھر اُٹھا کر بیگم صاحب کے پاس لے گئیں۔ لڑکیوں نے اپنی اپنی پسند کے موافق چیزیں چن لیں۔ مغلانی کی لڑکی بیا پاسی کو کھلونے دیئے۔

بیگم صاحب نے صندوقچہ کھولا اور انعام تقسیم کیا۔ باورچی کو ایک اشرفی، رکابدار کو دو اشرفیاں، محبوبن کو دس روپیہ۔ کبڑن کو دس روپیہ۔

بڑی بیگم۔ (محلدار سے) روئے کو حکم دو کہ میاں بانی کی ڈومنیوں کو تاکید کر آئے کہ پانچ بجے یہاں حاضر ہو جائیں۔

اتنے میں حسن آرا کی خالہ زاد بہنیں آئیں، پردہ کرایا گیا، فنسوں پر سے اُتریں سب بہنوں سے بغل گیر ہوئیں۔

نظیر بیگم۔ جہاں آرا کب آئیں۔

حسن آرا۔ کل کہلا نہیں بھیجا تھا؟

نظیر بیگم۔ ہم سے تو مہری نے نہیں کہا۔

سپہر آرا۔ عباسی تم نے ان کے یہاں جا کے یہ نہیں کہا کہ جہاں آرا بیگم اور گیتی آرا بیگم آئی ہیں؟ واہ واہ۔ پوری بات تو سُن لیا کرو۔

زیب النسا۔ اور ہم نے پوچھا بھی۔ مگر یہ اماں جان سے باتیں کرتی رہیں۔ انھوں نے سُنا نہیں۔ کیا ممتاز دولھا بھی آئے ہیں؟

جہاں آرا۔ ہاں۔

زیب النسا۔ دیکھو تو سہی آج ہم کیسا آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے ہم کو بڑا رنج ہے۔

نظیر بیگم۔ (جہاں آرا کے کان میں) آج تو بڑا جوبن ہے بہن اور کیوں نہ ہو ممتاز دولھا بھی تو یہیں ہیں۔

جہاں آرا۔ (مسکرا کر) آپ سے کم ہی کم۔

اس کے بعد اور سواریاں آئیں اور تھوڑی ہی دیر میں غنچہ کھلا ہوا نظر آنے لگا۔

نواب صاحب نے خبر پائی کہ نظیر بیگم اور زیب النسا بیگم آئی ہیں۔ محلدار سے کہا کہ زیب النسا بیگم سے ہمارا سلام کہدو جا کے۔

محلدار۔ (زیب النسا سے) نواب صاحب نے کہا کہ ہمارا سلام کہہ دو۔

زیب النسا۔ کہو آپ اپنا سلام رہنے دیں۔

محلدار نے جاکر کہا حضور وہ کہتی ہیں کہ آپ اپنا سلام رہنے دیں۔ نواب صاحب ہنسے۔ کہا جاکر پوچھو آؤ کر آپ خفا کیوں ہیں۔ یہ کونسی انسانیت ہے کہ ہم آداب عرض کرتے ہیں اور آپ کہتی ہیں کہ اپنا سلام رہنے دو۔ محلدار نے نواب صاحب کا پیغام کہا تو نظیر بیگم اور گیتی آرا کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

زیب النسا۔ کہیئے۔ اچھا ہم انسان نہیں حیوان ہی سہی مگر حیوان اور انسان فعلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ ہم آپ سے بولتے ہی نہیں۔ آپ کیوں ہمیں چھیڑتے ہیں۔

محلدار نے کہا مجھے اچھی سزا ملی۔ اِدھر آؤں پھر اُدھر جاؤں۔ جاکر کہا خداوند وہ خفا ہوتی ہیں۔ کہتی ہیں ہم آپ سے نہیں بولتے۔ آپ کیوں باربار چھیڑ خانی کرتے ہیں؟

نواب۔ (مسکرا کر) نظیر بیگم سے کہو کہ دیکھیئے آپ کی بہن سلام کا جواب تک نہیں دیتیں۔

محلدار نے نظیر بیگم سے کہا۔

نظیر بیگم۔ کہو آپ جانیں وہ جانیں ہم سے کیا واسطہ۔

محلدار۔ حضور وہ کہتی ہیں وہ جانیں آپ جانیں۔

نواب۔ زیب النسا بیگم سے کہو آپ کے میاں آج کل کہاں ہیں؟

محلدار نے یہ فقرہ کہا تو زیب النسا اور بھی تیکھی ہوئیں۔ کہا جاکے کہہ دو یہ سب کانٹے تمھارے ہی بوئے ہوئے ہیں۔ میں خوب جانتی ہوں بس اب بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنائیں۔ میری زبان نہ کھلوائیں۔

ان فقروں پر نواب صاحب بہت ہنسے، مگر حسن آرا اور سپہر آرا اور گیتی آرا دنگ تھیں کہ ان دونوں میں کیوں ٹھن چلی۔

اب سُنیے کہ زیب النسا بیگم کے شوہر اور ممتاز علی خاں بہادر میں رشتہ کے علاوہ دلی دوستی تھی۔ انھوں نے ایک دن کہا ہم چاہتے ہیں کہ ایک شادی اور کریں مگر بیوی حسین اور تربیت یافتہ ہو۔ نواب صاحب نے کہا بہتر ہے۔ تین چار دن کے بعد رقعہ لکھا کہ ایک رئیس سے جن کی صاحبزادی تربیت یافتہ اور خوبرو قوس ابرو ہیں ہم نے آپ کی نسبت کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیں خوش قسمت ہو یا بدنصیب ایسی جمیلہ بڑے خوش قسمتوں کو ملتی ہیں۔ زیب النسا کے چھوٹے دیور نے یہ خط اتفاق سے پڑا پایا اور بھاوج کو حرف بحرف سُنا دیا۔ سوتیا ڈاہ۔ سنتے ہی آگ ہو گئیں۔ خط پھر پڑھوایا۔

دیور۔ اپنے بہنوئی کی باتیں دیکھیں آپ نے۔

زیب النسا۔ میں تو سر سے پاؤں تک پھنک رہی ہوں اس وقت۔

دیور۔ مگر بھائی صاحب سے ہمارا نام نہ لے دیجئے گا۔

زیب النسا۔ اوہ کچھ ٹھکانا ہے۔ یہ اندر ہی اندر ہنڈیا پک رہی ہے حسین اور پڑھی لکھی ڈھونڈھی جاتی ہے۔ ایڑی چوٹی پر قربان کردوں۔

اب سالی اور بہنوئی کا جھگڑا ناظرین کی سمجھ میں آگیا ہوگا۔

بارہ بجے کے وقت نواب صاحب نے کہا۔ حضرات ہم تو ذرا جاکر سوئیں گے، آپ سب صاحب ناچ دیکھیئے۔

ظریف۔ بچہ خوش۔

طاقت مہمان نہ داشت خانہ بمہمان گذاشت

نواب - جی نہیں ایک سبب ہے۔
ظریف - بس ایک ہی سبب ہے فرمائیے کیا سبب ہے؟
نواب - دردِ سر - واللہ سر پھٹا جاتا ہے۔
احباب نے اصرار کیا کہ آپ اندر نہ جائیے - درد سر ہے تو یہاں ہی پلنگ پر آرام فرمائیے۔ مگر نواب صاحب نے خوشامد کی کہ جانے دیجئے طبیعت کسی قدر بے لطف ہے یہاں نیند نہ آئے گی - یہ کہہ کر حسب اجازت احباب زنان خانے میں تشریف لے گئے وہاں ڈومنیاں گاتی تھیں اور ہمجولیاں فرطِ طرب سے قہقہے لگاتی تھیں - یہ چپکے سے اپنے کمرے میں تشریف لے گئے پیش خدمت سے کہا حقہ بھر لاؤ - وہ حقہ بھرنے گئی تو بڑی بیگم صاحب نے دریافت کیا کہ حقہ کون مانگتا ہے عرض کیا حضور نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔
بڑی بیگم - کیوں یہاں کیوں حقہ بھروانے بھیجا - طبیعت تو اچھی ہے؟ ذری جا کے پوچھ آؤ۔
خواص - (نواب صاحب سے) حضور بیگم صاحب پوچھتی ہیں - کہ مزاج تو اچھا ہے۔
نواب - ہاں ہاں فضل الٰہی ہے مگر دو دن کو سونے کا عادی ہوں آج لیٹا تک نہیں میں نے کہا ذرا کمر سیدھی کر لوں - گھبرائیے نہیں میں اچھا ہوں۔
خواص نے جا کر عرض کیا کہ دن کو سوئے نہیں تھے اس لیے چلے آئے طبیعت اللہ کے فضل سے اچھی ہے۔
نظیر بیگم - (جہاں آرا کے کان میں) ہم سمجھ گئے۔
گیتی آرا - (آہستہ سے) آپ کی سمجھ کے قربان۔
حسن آرا - جہاں آرا بہن شرماتی کیوں ہو؟
جہاں آرا - اخاہ تم کو بھی ہمارے لیے زبان آئی۔
سپہر آرا - اے بہن دولھا بھائی جلسہ چھوڑ کے کیوں چلے آئے ؟
حسن آرا - (مسکرا کر) ان کو کیا معلوم - یہ دولھا بھائی جانیں۔
جہاں آرا - چھوٹی ہو - اب کیا کہوں؟
اتنے میں بڑی بیگم صاحب نے کہا جہاں آرا جاؤ دو گھڑی تم بھی سو رہو - تم بھی آج دن بھر نہیں سوئیں - کہیں خدانخواستہ طبیعت میں ہرج نہ ہو جائے - بہنوں نے مسکرانا شروع کیا - جہاں آرا بیٹھی رہیں تو بڑی بیگم نے پھر کہا اے جا کے لیٹ رہو دم بھر، چلو اٹھو ماہیں - جہاں آرا اٹھیں تو ہمجولیوں نے آنکھ سے اشارہ بازی شروع کی۔
ایک - اے ذری بیٹھو بہن جلدی کیا ہے جانا۔
دوسری - اونہہ اونہہ - اللہ ری شتابی - اُف ری عجلت جائیے جائیے۔
تیسری - اس بیتابی کو دیکھیے - اللہ اللہ۔
چوتھی - اے تو ہنسنے پر نہ جاؤ بہن - کس شوق سے جاتی تھیں بیچاری۔
جہاں آرا پھر کچھ جھیپ کر بیٹھ گئیں تو سب بہنیں مسکرانے لگیں، اور عباسی بھی ایک ادائے دلربا کے ساتھ زیرلب مسکرائیں یہ اور بھی شرمائیں۔
بڑی بیگم - اے جانے دو - کیوں دق کرتی ہو سب کی سب مل کر

زیب النسا۔ ہم کیا کچھ روکتے ہیں خالہ جان۔

نظیر بیگم۔ اے جاؤ نہ۔ ہمارے ہی کہنے سے تو بیٹھ گئی ہیں نا اونھ۔

حسن آرا۔ جائیے جائیے۔ دیکھئے اماں جان کا حکم ہے۔

بڑی بیگم۔ جاؤ بیٹی ایک دم کے لیے لیٹ رہو۔ دن بھر کی تھکی ہو۔

زیب النسا۔ (مسکرا کر آہستہ سے) افوہ بہت تھک گئی ہیں۔

جہاں آرا جھیپ کر پائینچے اُٹھاتی ناز و ادا سے قدم رکھتی چلیں۔ کمرے میں پہنچیں۔ تو نواب صاحب نے کہا اخاہ۔ بہت جلد آئیں آپ۔ دروازہ تاکتے تاکتے آنکھیں تھک گئیں۔ بارے اتنی دیر کے بعد کہیں چھم چھم کی آواز کان میں آئی۔

جہاں آرا۔ (تنک کر) اے آج تم کہاں گھر میں گھسے آن کے۔ آج باہر کی سیر ہے یا یہاں کی۔ ہم گا نا سُن رہے تھے کہ آپ داخل ہوئے یہ سوجھی کیا۔ خالہ جان نے بار بار کہا۔ جاؤ جاؤ تو اُٹھنا پڑا۔ ورنہ اللہ جانتا ہے ہم تو ہرگز نہ اُٹھتے۔ بھولیاں اشارے کرنے لگیں۔ تمہارے سبب آج ہمیں جھیپنا پڑا۔

نواب۔ چلو خیر عید کے دن سب معاف ہے۔

پردے پڑ گئے خواص باہر چلی آئی۔

اِدھر ڈومنیاں کسی کا آنچل پکڑتی ہیں۔ کسی کا دوپٹہ نہیں چھوڑتیں۔ روپیہ، دو روپیہ، اٹھنی، چونی جس نے دیا لیا اور پھر رستا ناشروع کیا۔ چار بجے جہاں آرا کی آنکھ کھلی چپکے سے اُٹھیں اور دلائی اوڑھ کر دبے پاؤں جانے ہی کو تھیں کہ نواب صاحب بھی جاگ اُٹھے۔

نواب۔ کہاں جاتی ہو سردی میں۔

جہاں۔ اے واہ چہ خوش۔ اے لو اور سنو سردی کی اچھی کہی۔

نواب۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ منہ دھوؤ۔ پان کھاؤ۔ جانا جلدی کیا ہے۔

جہاں۔ اے واہ۔

(اے واہ) کہہ کر جانے ہی کو تھیں کہ نواب صاحب نے دُلائی پکڑ لی تو جہاں آرا بیگم نے دلربائی کے ساتھ جھٹک کر کہا چلو چھوڑ دو، بس ہمیں یہ ہنسی نہیں بھاتی۔ وہاں سب ہمیں ہنسیں گی۔ تم نے تو بے حیائی کا جامہ پہن لیا یار دوست ہنسیں گے تمہیں پروا کیا ہے اس کی۔ اٹھو باہر جاؤ۔

نواب صاحب آنکھ ملتے ہوئے اُٹھے۔ افوہ ابھی تو تین بھی نہیں بجے جہاں آرا نو چار کا گجر اپنے کانوں سُن چکی تھیں۔ کہا تم کو کچھ خبر بھی ہے آؤ کچھ کچھ بدتے ہو۔ تین بج گئے۔

نواب صاحب نے کہا آؤ بدتے ہیں۔

جہاں آرا۔ کیا کیا بدتے ہو؛

نواب۔ ایک اشرفی لاؤ ہاتھ پر ہاتھ مارو۔

جہاں آرا۔ ہم لے لیں گے۔ اللہ جانتا ہے تم بد بد کے مکرتے ہو ہم نہیں بدتے۔

نواب۔ نکل گئیں نہ۔ ہم نہیں جانتے۔ ہم ایک اشرفی لیں گے۔

جہاں آرا۔ ہو رجو اُسکٹے تم؟

اب۔ تو ایک اشرفی دیں گے۔ قرآن کی قسم۔

جہاں آرا نے کہا دیکھو شرعی قسم کھائی ہے یاد رکھنا۔ عباسی کے بجے ہوں گے؟ عباسی نے کہا حضور اب پانچ بجیں گے چار بج گئے دیر ہوئی۔

ہان آرا۔ لائیے اشرفی۔ اشرفی ہوئی۔

نواب صاحب نے کہا ارے پانچ کا عمل ہے، لاحول ولا قوۃ۔

نواب صاحب باہر تشریف لے گئے تو یاروں نے بنانا شروع کیا۔ اب تو ورد سر نہیں ہے حضرت۔ فرمائیے یقین ہے اب سر کا درد جاتا رہا ہوگا۔

ادھر جہاں آرا جو کمرے میں پہنچیں تو ان کی بہنوں نے اُن کو ہنسنا شروع کیا۔

یب النسا۔ آپ تشریف لائیں۔

سن آرا۔ باجی جان بندگی (مسکرا کر) اے لو ہم تو ادب سے بندگی کرتے ہیں اور آپ بنکھی ہو کر گھورتی ہیں۔ واہ بہن واہ۔

نظیر بیگم۔ اب تو آنکھیں نہیں جھکی پڑتیں۔

جہاں آرا۔ تم کو شاید سوتے میں بے چینی ہوتی ہے (حبیب کی چھیڑ خانی سے باز نہیں آتیں۔

ڈومنیوں نے جہاں آرا بیگم کا آنچل پکڑا اور کہا لائیے۔ جہاں آرا نے دو روپیہ دیئے۔

ڈومنی۔ اے واہ سبحان اللہ۔ آپ سے اور دو روپیہ لیں؟

جہاں آرا۔ (دو اور ملا کر) اچھا لو۔

فوج ظفر موج

میاں آزاد ہرمزجی بھائی کی کوٹھی سے رخصت ہو کر اپنے رجمنٹ میں شریک ہونے گئے تھے کہ تھوڑی دیر میں گھڑگھڑاہٹ کی آواز آئی۔ خوجی نے چونک کر کہا یہ کیا ہے؟ یہ آواز کیسی آئی؟ اتو وکس قدر گھڑگھڑاہٹ ہے کہ خدا کی پناہ۔ اخّاہ اب ہم اس کا علم سمجھ گئے۔ زلزلہ آنے والا ہے۔ ہرمزجی زلزلہ کے معنی نہیں سمجھے مگر خوجی کو شک کے عوض یقین کامل تھا کہ ضرور زلزلہ آنے والا ہے۔ ایک مرتبہ میاں آزاد سے سن چکے تھے کہ جب زلزلہ آتا ہے تو اکثر مقامات پر قبل زلزلہ زمین کے اندر سے ایک قسم کی آواز آنے لگتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص زمین کے اندر بندوقیں داغ رہا ہے یا چاند ماری ہوتی ہے۔

اتنے میں ہرمزجی کے آدمی نے کہا حضور فوج جاتی ہے۔ ہرمزجی اور میڈا اور میاں خواجہ بدیع صاحب کوٹھے پر گئے۔ دیکھا فوج سامنے آرہی ہے۔ پہلے توپ خانہ دیکھا یہ اسی کی گھڑگھڑاہٹ تھی۔ اس کے بعد پایہ بہ پایہ قرینہ بہ قرینہ فوج آتی رہی۔ دیکھتے دیکھتے مس میڈا کی نظر میاں آزاد پر پڑی بائیں ہاتھ سے گھوڑے کی باگ اٹھائے عظمت وصولت کے ساتھ بیٹھے ران پٹری جمائے یہ جا وہ جا۔ خوجی کی سنیئے کوٹھے پر سے پکارتے ہیں میاں آزاد! میاں آزاد ہوت! ارے میاں ادھر ادھر۔

ہرمزجی۔ ہائیں! خاموش رہو جی۔ بھلا یہ کوئی موقع ہے کسی کو پکارنے کا۔

خوجی۔ واہ یہ عجب ڈرپوک آدمی ہیں۔ کیا کوئی گولی مارتا یا توپ کھینچ مارتا ہم بھی تو پلٹنوں میں رہ چکے ہیں بھائی۔ رسالداریاں کیں کمیدانیاں کیں۔ سپاہی پر سپاہی کا ہاتھ ہرگز نہ اٹھے گا۔

اب سنیئے جس وقت شہر سے فوج ظفر موج جنگی سامان اور آن بان کے ساتھ معرکہ رستخیز کے لیے چلی تو تمام شہر میں دھوم مچ گئی کہ لشکر فیروزی اثر موریچے پر جاتا ہے۔ گو افسران فوجی اور ترکی سپاہی سب خوبرو اور سب کڑیل جوان تھے مگر بسالت کے نہنگ بحر کشام مشہور خاص و عام حمیّت اسلام کے عاشق دلدادہ میاں آزاد زبان حال و قال سے یہی کہتے تھے کہ ؎

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من
آں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرے

ترکوں کی فوج دیکھنے کے قابل ہوتی ہے جو سپاہی ہے خوبروئی کی جان۔ جو افسر ہے بسالت کی کان۔ جوان طناز کشیدہ قامت خوش انداز خوبرو۔ خوش خو۔ بہار طبع رنگین مزاج بڑے کس بل کے لوگ ہیں اور جیوٹ جیالے۔ میدان کارزار میں پہنچے اور شیر ژیان بن گئے وہ ملک کے نام پر جان دیتے ہیں۔ چاہے دو دن تک کھانا نہ ملے مگر غنیم کو پشت نہ دکھائیں گے۔ قتل کریں گے اور مر جائیں گے۔ لو کی شدت اور آفتاب کی حدت سردی کی کثرت ایک کو نہ مانیں۔ چاہے برف گرے۔ کہرا پڑے یا ہوا سے جگر تک ٹھٹھرا جائے مگر ترک سپاہی کا قدم پیچھے نہ ہٹے گا۔ اس میں ہر چہ بادا باد۔ اور یوں تو شکست کھانے سے کوئی قوم روئے زمین پر نہیں بچی ہے یہ دنیا کے کارخانے ہیں جس میں انسان کو دخل نہیں۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

ترکوں کے حسن گلوسوز کا ادنیٰ ثبوت ہے کہ جن ترکوں کو قید کر کے روسی لے گئے تھے جب اُن کو رہا کیا اور وہ ٹرکی کی طرف واپس آنے لگے تو روسی لیڈیوں نے رونا شروع کیا اور مچل گئیں کہ ان کے ساتھ ہم جائیں گے۔ اکثر لیڈیوں کو بڑی دقت سے روسیوں نے باز رکھا۔ ورنہ ان خوشرو جوانوں سے وہ اس درجہ ملتفت ہو گئی تھیں کہ گھر سے نکلی جاتی تھیں۔ سچ ہے

سعدیا روز ازل حسن بہ ترکاں دادند

یہ پیشتر کی ایک جنگ کا حال ہے۔

روسی اس وقت بہت ہی جھیپے۔ جب ریل کے اسٹیشن پر ستر اسی جوان اور نوخیز لیڈیاں نکھر نکھر کر ٹوٹ گئیں اور کہا ان ترکوں کے ساتھ ہمیں بھی جانے دو ہمارا اُن کی ادا پر دل آیا ہے۔ بعض بعض ڈھاڑھیں مار مار کر روئیں اور اکثر آبدیدہ ہو گئیں۔ ان ترکوں کے دل کی اس وقت عجیب کیفیت ہو گئی۔ ان کے جمال مبین کا ادنیٰ ثبوت یہ تھا۔

ادھر اُدھر کچھ خواتین نازو ادا کے ساتھ ان جوانوں پر گل افشانی کرتی تھیں ان میں ایک بیوہ ان بھی تھی۔ صندلی رنگ شوخ و شنگ اگ بھبوکا۔ اس پری نے بصد شان دلبری ایک مرتبہ میاں آزاد پر تاک کر پھول پھینکا تو آزاد نے ہاتھ سے روک کر پھول کو چوم لیا اور آنکھوں سے لگا کر بٹن میں لگا لیا۔

رسالہ آگے بڑھا تو مکتب کے چند لڑکوں نے نعرہ مارا اور ترکی زبان میں دعا مانگی کہ خداوندا ان نوجوانوں کو نیک نام اور فائز المرام کر۔

الغرض تمام شہر میں دھوم مچی تھی اور خلق خدا دست بدعا تھی کہ غنیم ایک ہی حملے میں بول جائے۔ چھوٹے بڑے، امیر فقیر، امند درد مند سب یہی دعا مانگتے تھے

جب فوج شہر سے باہر پہنچی تو آزاد پاشا اور ایک افسر علیقو پاشا نامی سے باتیں ہونے لگیں۔

علیقو۔ آپ نے ملاحظہ کیا کس قدر جوش ہے؟

آزاد۔ بیشک اور یہ جوش قابل قدر ہے۔

علیقو۔ جس دوشیزۂ پری چہرہ کی ہدایت کے موجب آپ یہاں آئے ہیں اس کا نام کیا ہے؟

آزاد۔ فخر کے ساتھ، حُسن آرا بیگم۔

علیقو۔ اگر کامیاب ہو گئے تو فہو المراد۔ ورنہ بیچاری سمجھے گی کہ اس نے تم کو قتل کیا۔

آزاد۔ نہیں قضا سے کسی حالت میں انسان کو مفر نہیں۔

خونریز ہوا ہے وہ صنم حکم قضا سے ۔۔۔ جلاد کبھی مورد الزام نہیں ہے

اور مجھے جان کی تو فکر ہی نہیں۔ فکر ہے تو اس قدر کہ اس بت عربدہ جو کی آرزو بر آئے۔

الغرض علیقو پاشا اور میاں آزاد سے عرصہ دراز تک گفتگو رہی۔ قریب شام ایک گاؤں کے متصل باغ میں فوج نے پڑاؤ ڈالا اور سپاہی رنگ رلیاں منانے لگے۔ کوئی گاتا ہے کوئی شادیانے بجاتا ہے۔

میدان کارزار

رستم سیستان شجاعت پہلوان ہفت خوان منازل بسالت میاں آزاد فرخ نہاد رجمنٹ کے ساتھ کئی دن مختلف مقامات میں پڑاؤ ڈالتے ایک دن ایک دلکش مقام پر پہنچے۔ پشتِ توسن سے اتر کر لبِ چشمہ سار علیقو پاشا کے ساتھ ٹہلنے لگے۔

علیقو۔ ہماری سپاہ جرار اور افسرانِ آزمودہ کار کا جوش وخروش روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔ دو سمت جنگ چھڑ گئی ہے۔ ایک یہاں دوسری ایشیا میں۔ احمد مختار پاشا افواج متعینہ ایشیائے کوچک کے سپہ سالار مقرر ہوئے ہیں۔ دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ جنگ دو سردار د۔ خدا جس کو فتح دے۔

اِدھر یہ باتیں ہوتی تھیں۔ اُدھر لشکری سفر کے تھکے ہوئے کمر کھول رہے تھے۔ کوئی گھوڑے سے اتر کر سستانے لگا۔ کسی نے سبزہ زار پر فرس بادرفتار کو چھوڑ دیا کہ آزادی کے ساتھ پھرے۔ کوئی ترکی چُرٹ پیتا ہے۔ کوئی دریا کی موج زنی دیکھتا ہے۔ الغرض سب اپنے اپنے کام میں تھے کہ دفعتہً گرد نمودار ہوئی۔ سب کی نظر گرد ہی کی طرف تھی۔ یا الٰہی یہ گرد کیسی ہے۔ میاں آزاد بھی حیرت سے دیکھنے لگے۔

میاں آزاد کچھ پوچھنے ہی کو تھے کہ سامنے سے کئی سوار نظر آئے۔ افسر کمانیر اپنے خیمے سے بدحواس ہو کر نکلے اور فرطِ اشتیاق سے کوئی دس بارہ قدم بڑھ کر سواروں کا استقبال کیا۔ ایک نوجوان سوار نے لفافہ دے کر کہا وزیر جنگ نے دیا ہے۔

افسر کمانیر نے لفافہ پڑھا تو خاص وزیر جنگ کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ کھولا خط پڑھا۔

افسر کمانیر۔ کوچ۔ کوچ کا حکم ہے۔

وزیر جنگ نے لکھا تھا کہ اگر ذرا بھی توقف ہوا تو تمہاری سپاہ کو روسی بالکل بھون ڈالیں گے۔ تھوڑی دیر تک افسروں میں سرگوشی ہوتی رہی۔

قاعدے کے موافق کوچ کا حکم دیا گیا تو لشکری سخت متحیر ہوئے کہ یا الٰہی کون آفت آنے والی ہے کہ پہنچتے دیر نہیں اور کوچ کا حکم ہو گیا مگر نہ دم لیا نہ بیچار گی۔ طرہ اس پر یہ ہے کہ پاس حمیت۔ جوش وخروش کی یہ کیفیت کہ سپاہی زمین پر قدم نہیں رکھتے۔ دل سے لگی ہے کہ فوج روسیہ کو نیچا دکھائیں۔ وہ وہ تدبیریں عمل میں لائیں کہ دشمن منہ کی کھائیں اور پھر حشر تک مقابلے پر نہ آئیں حکم پانے کی دیر تھی دم کے دم میں سب لیس۔ قرینے کے کوچ ہوا۔ شام تک فوج نے بآسانی وآرام راستہ طے کیا، مگر آفتاب کے غروب ہونے ہی وہ تاریکی چھائی کہ الامان افسر کمانیر نے پہلے ہی سے روشنی کا انتظام مناسب کر دیا تھا۔ القصہ بعد خرابی بسیار ایک مقام پر پہنچے۔

سپاہیوں نے ادھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی عمدہ مقام ہاتھ آئے مگر بجز ایک قبرستان کے اور کچھ نہ دیکھا۔ سب کی صلاح ہوئی کہ قبرستان ہی میں پڑاؤ ڈالیں۔ افسر اور سپاہی اور سوار اور کنڈر سب قبرستان میں داخل ہوئے۔

علیقو پاشا اور آزاد پاشا میں بڑا یارانہ تھا۔ ایک ہی قبر پر لیٹ کر باتیں کرنے لگے۔ علیقو پاشا نے کہا آدمیوں اور گھوڑوں کی جس قدر قلت ہو گی اسی قدر آسانی سے فوج کوچ کرے گی۔ اگر کالم بڑا ہو تو سڑک پر کوچ کے وقت سخت دقت

پڑے گی۔ جتنے افسر کسی کالم کی کمان کرتے ہوں ان کو دائیں بائیں کے کالموں کا حال معلوم رہنا چاہیئے۔ آج اس مرتبہ کے کوچ میں ذرا گڑبڑ ہو گیا تھا۔ چار میل انسان ایک گھنٹے میں چل سکتا ہے لیکن سپاہی فوج کے ساتھ ایک گھنٹے میں چار میل نہیں جا سکتا اور اس قدر بار لے کر اس کے علاوہ جب کوچ کر کے منزل مقصود پر پہنچا تو آرام نہیں ملتا۔ نہ گدگدا بچھونا پاتا ہے نہ عمدہ غذا۔ زمین پر سونا نصیب ہوتا ہے۔ ادھر پڑاؤ پر پہنچتے ہی حکم ہوتا ہے کہ فلاں ڈیوٹی (کام) پر جاؤ اور کھانا اکثر خراب ملتا ہے۔

آزاد پاشا۔ یورپ کے ملکوں میں اوسط وقت کوچ کرنے کا کیا ہے؟

علیقو پاشا۔ فوج پیادہ کے لیے تین میل فی گھنٹہ رسالے کے لیے پانچ میل اور توپ خانے کے لیے بھی پانچ میل۔ اگر کالم بڑے ہوئے اور فوج زیادہ ہوئی تو اس سے بھی کم زمین طے کرے گی۔ فوج پیادہ انتہا ڈھائی میل فی گھنٹہ جائے گی اور سڑک خراب ہوئی تو ڈیڑھ میل سے زیادہ گھنٹے میں فوج نہیں جا سکتی۔

اکثر بڑی بڑی لڑائیوں کی کوچ کی حالتوں اور اور امور پر ہم نے غور کیا ہے ایک مقام ہے منگھا۔ وہاں نو میل زمین پانچ گھنٹے میں طے کی حالانکہ بڑی عجلت تھی۔ افسر کمانیر نے نادری حکم دیا تھا کہ بہت جلد جاؤ۔ ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کا ایک لشکری چودہ گھنٹوں میں صرف بارہ میل جا سکا۔

آزاد پاشا۔ ہراول کی فوج کے ساتھ ہم کئی بار مصنوعی جنگ میں گئے تھے۔

علیقو پاشا۔ ہم کو بکٹ کی فوج کے ساتھ رہنا بہت ہی پسند ہے۔

اس پر ایک لفٹنٹ نے مسکرا کر کہا۔ ہم کو تو دن رات سونا اور آرام کرنا پسند ہے بکٹ اور طلایہ اور ہراول سب سے طبیعت کو نفور ہے۔

اتنے میں آواز آئی دھنتا۔ ایں! یہ توپ کیسی دغی؟ سب کے کان کھڑے ہوئے۔ افسر کمانیر سخت متحیر تھے کہ یہ آواز کہاں سے آئی اور واقعی حیرت اور پریشانی کی بات تھی۔ اتنے میں پھر آواز آئی، دھنتا۔ جو لوگ غافل سو رہے تھے وہ ٹھک جاگ اٹھے۔ اب تمام لشکر میں کھلبلی پڑ گئی۔ ایں کیا روسی آ گئے۔ یہ توپ کہاں دغی۔ فوراً حکم ہوا کہ جو کمر کسے ہوئے مسلح ہیں وہ گھوڑوں پر کاٹھیاں دھریں اور جو مسلح نہیں ہیں وہ کمر کسیں اور معاً تیار ہو جائیں۔ دو منٹ کے عرصے میں ہراول کے سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے آن پہنچے۔ آتے ہی غل مچا کر ایک ایک نے کچا چٹھا کہہ سنایا۔

افسر کمانیر نے حال دریافت کیا تو سواروں نے کہا کہ یہاں سے آدھ میل کے فاصلے پر ایک قلعہ ہے اس میں ترکی فوج کے چند سپاہی تھے۔ چھ ہزار روسیوں نے ان کو گھیر لیا۔ ترکوں کی قلت اور روسیوں کی کثرت سے یہ نتیجہ ہوا کہ قلعہ کی ایک دیوار توڑ کر ترک نکل گئے۔ قلعہ خالی پا کر روسی اپنے قبضے میں لے آئے۔ اب ان کو گوئیدوں نے خبر دی کہ ترکی فوج آن پہنچی۔ افسر کمانیر نے کہا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ گولے کیوں چلانے شروع کیے معلوم ہوتا ہے کہ روسیوں کی جماعت ہماری جماعت سے کم ہے۔ خوف دلانے کے لیے گولہ اندازی شروع کر دی۔ ورنہ اگر روسی سپاہ کافی ہوتی تو اس وقت وہ دو چار کالموں سے ہمیں گھیر لیتے۔ کل افسروں اور جونیر افسروں کو بلا کر مشورہ کیا۔ اور مشورہ کے بعد انواع واقسام کے احکام مناسب جاری کرنے لگے۔ تاکہ فوج قرینے سے آراستہ ہو جائے۔

افسر کمانیر۔ رن مہتابیں روشن کرو۔

آزاد پاشا۔ اب آخری رائے کیا قرار پائی۔ گڑھی پر حملہ ہوگا یا ملتوی ہوگا؟

علیقو پاشا۔ حملہ ہو نہ ہو۔ توپ کا جواب ضرور دینا چاہیئے۔

نکل کر کل کالموں کو درستی کے ساتھ آراستہ کیجئے۔ پھر توپ خانے سے

احمد مختار پاشا۔ پہلے اس قبرستان سے تھوڑی دور میدان میں

اُس کا جواب دیا گیا۔

کام لیجئے۔ اتنے میں پھر توپ دغی اور ادھر سے

قلعہ خاص تھا نہایت مستحکم اور عظیم الشان۔

اب سنیے کہ یہ قلعہ دریائے ڈینیوب سے کئی کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔ بیچ میں

قلعے گو وسعت میں چھوٹے تھے مگر سر بفلک کشیدہ ساز بس مضبوط

اردگرد چو طرفہ چھوٹے چھوٹے قلعے چاروں کونوں پر ایک ایک۔ یہ

ترکی زبان میں اس کو صف شکن کہتے تھے۔ اس کی عظمت کی ادنیٰ

اور سب میں توپیں چڑھی ہوئیں۔ اس قلعے میں ایک بہت بڑی توپ تھی۔

اس صف شکن کی پیشانی پر یہ مصرعہ کندہ تھا:-

تعریف یہ ہے کہ درزی اس میں بیٹھ کر سی سکتے تھے۔

بترس اے مدعی از من کہ آتش در دہن دارم

اس توپ پر روسیوں کو بڑا ناز تھا جب ترکوں نے قلعے کو خالی کیا تو صف شکن میں کیل ٹھونک دی تھی۔ قاعدہ ہے کہ جب کبھی میدان

میں لڑائی ہوتی ہے تو بھاگنے کے وقت اکثر توپ میں کیل ٹھونک دیتے ہیں تاکہ غنیم آئے تو دفعتہً توپ کو کام میں نہ لا سکے۔ قلعہ خاص کا بہت بڑا

رقبہ تھا۔ قلعہ کیا تھا گویا ایک شہر آباد تھا۔ زراعت بھی اس میں ہوتی تھی۔ دریا سے کاٹ کر ایک نہر لائے تھے جو قلعے کے چاروں طرف جاری

تھی۔ نہر کے اردگرد کچھ فاصلے پر بنسواڑی تھی۔ اس درجہ گھنی کہ گولہ دِقّت سے اس پار جائے۔ بنسواڑی کے بعد ببول کے درخت یہ بھی گھنے

تھے۔ ان کے بعد ایک اور نہر تھی۔ نہایت عمیق۔ نہر کے بعد گہری گہری کھائیاں۔ اُن کے بعد اونچی نیچی زمین اور پھر ریت اور بالو۔ ان سب

کے بعد پھر بنسواڑی اور چاروں کونوں کے اردگرد نہریں اور کھائیاں اور جنگل۔

حضرت وزیر جنگ کی طبیعت داری کے صدقے کہ دار السلطنت ہی میں بیٹھے بیٹھے اس قلعہ کی فکر کی ورنہ روسی اس میں جم جاتے

تو نکالنا مشکل تھا۔ روسیوں نے ترکی فوج کے آنے کی خبر پا کر توپیں داغنا شروع کیں۔ دونوں طرف رن جھنا ہیں روشن ہوئیں اور

توپوں پر تپیاں پڑنے لگیں اور دھنا دھنا کی آوازیں آنے لگیں۔

طرفین سے گولوں کی بوچھاڑ ہونے لگی اور ایک گولہ عین فوج میں آن کر پھٹا تو ایک ٹکڑا علیفو پاشا کے گھوڑے کے پٹھے پر پڑا،

اور میاں آزاد کا سمند وفا پسند بھی کسی قدر جھجکا۔ علیفو کا گھوڑا گرا۔ مگر وہ پھرتی کے ساتھ اچک گئے۔

آزاد۔ شاباش بچے!

بچے کہا ہی تھا کہ ایک سوار کا گھوڑا دوسرے گولے کے ٹکڑے سے دھم سے زمین پر آ رہا اور میاں آزاد کے کان کے پاس سے

بھی ایک گولی سنسناتی ہوئی نکل گئی۔

آزاد پاشا۔ ایں یہ گولی کہاں سے آئی؟

ایک افسر۔ (غل مچا کر) ایں! اگر قلعہ دو میل ہے تو یہ گولی کہاں سے اتنی دور آئی۔

دوسرا افسر۔ بیشک دو میل۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پشت پر سے روسیوں نے باڑھ ماری۔ دائیں۔ دائیں۔ دائیں تمام فوج میں کھلبلی مچ گئی۔

طرفین سے گولہ اندازوں نے گولے اتارے۔ توپوں کے دغنے کی آواز سن کر گاؤں والوں کا زہرہ آب آب ہوا جاتا تھا اور

آواز بازگشت اور بھی ستم ڈھاتی تھی۔ ترکی گولہ اندازوں نے چار گولے ایسے اتارے کہ ایک قلعے کے برج کو ڈھا دیا۔

شبخون

صف شکنوں کی جان وروح معزز و ممدوح میاں آزاد فرخ نہاد نے اس دشت بلاخیز میں لشکریوں کے ساتھ شب کو قیام کیا۔ سپاہیوں اور سواروں نے اشجار سر فلک کشیدہ کے سایہ میں آگ روشن کی تاکہ زمستان کی سرد مہری پر اوس پڑ جائے اور فوج ظفر موج باد خنک کے جھونکوں سے نجات پائے۔ ادھر آگ کے شعلے بھڑکے ادھر مرغان خوش الحان نشیمن اور آشیاں سے زمین پر گرنے لگے۔

کمانیر نے کہا جنگل میں تو ہمارے سوار موجود ہی ہیں۔ روسی فوج کے کالم کو بخوبی روکیں گے اور توپیں بھی ہیں۔ بکٹ کی فوج کو اپنے پاس بلا لینا چاہیئے تاکہ قلعہ سے جو گولہ آئے اس سے ہمیں ضرور نہ پہنچے۔ یہ کہہ کر فوراً بکٹ کی فوج کے پاس حکم بھیجا کہ تم معاً ہمارے کالم سے آملو۔ اگر روسی فوج میدان میں ہو تو باڑھ چلاؤ، ہم سمجھ جائیں گے۔ قلعے میں ہو تو مقابلہ فضول ہے فوراً ہم سے مل جاؤ اور باہر ہو تو بندوقیں سر کرو۔ خبردار ہٹنا نہیں۔

تھوڑی دیر میں بکٹ کی فوج اپنے جنرل کے کالم سے مل گئی۔ مگر قلعے سے توپ کی آواز نہ آئی۔ کمانیر نے اپنے اسسٹنٹوں سے مشورہ کیا اور بہت جلد یہ رائے قرار پائی کہ جو سوار جنگل میں ہیں ان کی کمک اس وقت ضرور ہے۔ جنرل نے نصف فوج تو اسی میدان میں چھوڑ دی۔ اس حصہ فوج کے پاس صرف دو توپیں تھیں۔ باقی ماندہ فوج لے کر چلے ہی تھے کہ جنگل کی طرف سے دائیں دائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ تو جنگ شروع ہو گئی۔ کمانیر نے ایک فلاینگ کالم بسر کردگی آزاد پاشا جو تیرا افسر رسالہ روانہ کیا۔ فلاینگ کالم فوج سے تیز جاتا ہے۔ عجلت یہ تھی کہ سواروں کو ڈھارس ہو اور کمک وقت سے پہلے ہی پہنچ جائے۔ اب سنیئے کہ دو سو سواروں میں سے صرف اسی قدر عرصے میں بیس زخمی اور دس ضائع ہو چکے تھے اور چھ گھوڑوں پر گولیاں پڑی تھیں۔ یہ لوگ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے، مگر روسی فوج بہت بڑھ آئی۔ روسیوں کی طرف سے صرف دس سوار زخمی ہوئے اور دو مرے جس میں ایک افسر تھا۔ آزاد پاشا کے کالم نے سواروں کو مدد دی۔ اور طرفین سے بندوقیں دغنے لگیں۔ فیر پر فیر اڑتی تھی۔ روسیوں کے دو سو سوار جنگل کی ایک اور سمت سے آکر اس کالم پر گرے اور اب مصیبت یہ پڑی کہ ادھر تو باڑھ پر باڑھ پڑتی تھی اور اُدھر تلوار کی لڑائی دست بدست شروع ہو گئی۔ جب تک جنرل کا کالم کمک کو آئے روسیوں نے کسی قدر غلبہ حاصل کر لیا اور ان سواروں میں چند ہی باقی رہ گئے تھے کہ جنرل کی فوج ترکی بھی دھم سے آ کودی۔ پھر کیا تھا۔ روسی فوج کا جو کالم آگے بڑھا تھا اور جس سے دست بدست جنگ ہوتی تھی اس کو ترکوں نے کاٹ کر پھینک دیا اور ادھر آزاد پاشا کا کالم بڑھا تو روسی فوج نے اس سے مقابلہ کیا تھوڑی دیر تک روسی غالب رہے مگر آزاد پاشا بکمال بسالت بڑھتے ہی گئے۔ ان کا فرس دغا پسند سب سے دس قدم آگے جاتا تھا۔ جب روسیوں نے دیکھا کہ ترکی فوج آن ہی پہنچی تو دریا میں گھوڑے ڈال دیے۔

یہ وہ دریا تھا جس سے نہریں کٹ کر قلعہ معلیٰ کے ارد گرد جاری تھیں۔ ادھر روسیوں نے دریا میں گھوڑے ڈالے اُدھر ترکوں نے باڑھ ماری۔ روسی پلٹ پڑے اور بکمال شجاعت ترکوں کی فوج تک آ گئے۔ لیکن نصف سے زیادہ کو آزاد پاشا کے کالم نے فنا فی النار کر دیا۔ اس مقام پر روسیوں نے بڑی چالاکی کی تھی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر دریا سے باہر نہیں آتے تو ترکی رسالہ ہمارے ایک سوار کو بھی نہ چھوڑے گا۔ اور سب اسی دریا میں لقمۂ نہنگ اجل ہوں گے۔ لہٰذا دریا سے گھوڑے نکالے اور برسر مقابلہ آئے۔

جب روسیوں نے دیکھا کہ نصف سے زیادہ مردانِ کاری کام آئے تو تلواریں سوت سوت کر پِل پڑے۔ ترکوں نے اب بھی بندوق

ہی سے کام لیا۔ اور نصف کے قریب باقیماندہ روسیوں کا بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ترکی فوج اس مقام پر نہایت استقلال کے ساتھ لڑی۔ اب سیوں کے کوئی سوا سو آدمی باقی رہ گئے۔ وہ بھی جان بکف ترکوں پر آ گرے۔ تلواروں کی لڑائی شروع ہوئی۔ تین روسیوں نے آزاد پاشا کے گھوڑے کو زخمی کر دیا۔ مگر واہ رے آزاد۔ ایک روسی نے گھوڑے کے پیچھے پر تلوار لگائی ہی تھی کہ آزاد نے تلا ہُوا ہاتھ لگایا تو بھنڈار تک کھل گیا۔ دوسرا جھپٹا اس نے تاک کر سر اُڑانا چاہا مگر ایک ترکی سوار نے خود روسی کا سر بھُٹا سا اُڑا دیا۔ تیسرے روسی نے بڑھ کر آزاد کے گھوڑے کی ٹانگ پر ہاتھ لگایا اور گھوڑا تڑپ کر دس پانچ قدم پیچھے ہٹا مگر ایک ترک نے روسی کی دونوں ٹانگیں ایک ضرب شمشیر میں اُڑا دیں۔

الغرض تھوڑے ہی عرصہ میں ترکی فوج نے غنیم کو کاٹ کے پھینک دیا۔ اور جنرل کے کالم سے جا ملی تین سو بندوقیں دو سو تلواریں اور پچپن گھوڑے ترکوں کے ہاتھ آئے۔

قلعے کے لشکر روسیہ نے جو اس شکست کی خبر سنی تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سٹی پٹی سب بھول گئے۔ چال تو اچھی چلے تھے مگر سپہ سالار افواج ترک نے ان کی سیکڑوں آرزوؤں کا خون کیا۔ بکٹ کی فوج قلعہ کے پاس چھوڑ کر خود جنگل کی طرف چڑھ دوڑے اور ایک فلانیک کالم فوراً روانہ کر دیا۔ جب آزاد پاشا واپس آئے تو سپہ سالار نے ان کی تعریف کی اور کہا کہ سینیر افسر رسالہ کی علالت کے سبب سے مناسب معلوم ہوا کہ آزاد پاشا ہی بھیجے جائیں۔ اس کے بعد حکم دیا کہ بکٹ کے سواروں سے قلعے کی فوج روس کا حال دریافت کرنے کے لیے سوار بھیجے جائیں فوراً حکم کی تعمیل ہوئی اور سواروں نے آن کر کہا کہ قلعے سے تمام شب ایک توپ نہیں دغی۔ مگر اردگرد کے قلعوں میں کئی بار سن مہتابیں روشن ہوئی تھیں معلوم ہوتا ہے افسران فوج دُوربین کے ذریعے جنگ کی کیفیت دیکھتے ہوں گے۔ ایک بار کوئی چالیس سوار دریا کے اس پار نظر آئے تھے شاید وہ کمک کو جاتے ہوں۔ اور شاید اور سوار بھی ان کے پیچھے ہوں۔ مگر بکٹ کی فوج نے ان پر گولیاں چلائیں تو وہ بھاگ کے قلعے میں ہو رہے اور جنگل کی فوج کو روسی مدد نہ پہنچا سکے۔ میاں آزاد کا سینہ فرطِ طرب سے باغ باغ تھا۔ عرش بریں پر دماغ تھا۔ جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے بھلے جاتے تھے کہ آج پہلی فتح پائی۔ اور ہمت مردانہ اور یاوری طالع سے روسیوں نے شکست کھائی۔

کمسن ہیں وہ کیا جانیں ارمان کسے کہتے ہیں

الٰہی خیر کیجیو۔ آج بڑی بیگم صاحب کے ایوان فلک توامان کی مہتابی پر پریوں کا جمگھٹا بے طور نظر آتا ہے۔ الٰہی یہ اندر کا اکھاڑا ہے یا حورانِ بہشتی زمین پر اُتر آئیں۔ جہاں آرا جادو جمال گیتی آرا مشتری خصال۔ حسن آرا عالم نور از پا تا فرق، سپہر آرا زرق برق۔ چاندوں نو عمر، چاروں نوخیز نگاہیں اشارت آشنا۔ ادائیں دلآویز۔ وہ جامہ وار کی رعنائیاں اور رنگین دُلائیاں۔ وہ مستعلق چال وہ گورے گورے گال کہ عابد شب زندہ دار کی بھی قلبیا تمام ہو جائے۔ آہو چشموں کی چھل بل دیکھ کر دلم ہو جائے اور یہ شعر زبان پر لائے ؎

بعشقم مبتلا کردی چہ کردی دلم درد آشنا کردی چہ کردی

اتنے میں شہزادۂ عالی گہر مرزا ہمایوں فر کے ایک مصاحب خاص نے اپنے آقائے نامدار سے جا کر کہا حضور ذرا کوٹھے پر تشریف لائیں سامنے والی محلسرا پر پریوں کا تخت اُتر آیا ہے۔

ہمایوں فر کی باچھیں کھل گئیں۔ بت ماہ سیما سپہر آرا کے درد فراق میں شب و روز سر دھنتے تھے۔ یہ نوید بہجت خیز اور مژدۂ طرب انگیز سن کر جان میں جان آئی۔ دفورِ مسرت سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دوڑتے ہوئے کوٹھے پر آئے۔

چاروں بہنیں دریا کی موجزنی اور روانی کے مزے لوٹ رہی تھیں اور یہ خبر ہی نہیں کہ عاشق زار مصروف نظارہ بازی ہے شہزادہ دلدادہ نے آوازِ بلند عین حالت بیتابی میں اس بیت کو ترجمانِ دل کیا۔

یا بن دہ دل غمین مرا یا شنو نالۂ حزین مرا

یہ شعر سنتے ہی وہ چاروں طرارے بھر کر نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ میرزا ہمایوں فر چھت پر ہی دو زانو بیٹھ گئے۔ ان کے دوست نواب احمد مرزا صاحب نے سمجھایا۔ کہا بھائی کچھ خیر ہے بھلا وہاں کسی کا گذر کیونکر ممکن ہے۔ اس خیال سے درگذرو۔ ورنہ مفت میں جگت ہنسائی ہوگی۔

شہزادہ۔ بھائی میں تو نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی کوئی گناہ ہے۔

نواب۔ واللہ! تو پھر یہ ہائے ہائے کاہے کی ہے یہ کون مشکل بات ہے۔

شہزادہ۔ ہائے مشکل تو یہی ہے کہ آسان نہیں۔ آپ ہی ہماری مشکل آسان کیجیئے تو جانیں۔

نواب۔ میں بیڑا اُٹھاتا ہوں۔ اٹھواڑے کی مہلت دیجیئے بس زیادہ نہیں۔

ادھر تو یہ باتیں ہوتی تھیں۔ اب اُدھر کا حال سنیئے کہ نامحرم کو دیکھ کر چاروں پریاں شوخی اور ادا کے ساتھ طرارہ بھر کے نظر سے غائب ہو گئیں۔

حسن آرا اور سپہر آرا تو ہمایوں فر سے خوب واقف تھیں مگر جہاں آرا اور گیتی آرا نے دانتوں کے تلے انگلی دبائی اور متحیر ہو کر یوں باتیں کرنے لگیں۔

جہان آرا۔ اے کون تھا شکل صورت سے تو کوئی رئیس معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا۔ (دبے دانتوں) ہیں ایک۔ اسی مکان میں رہتے ہیں۔

سپہر آرا۔ کبھی باہر رہتے ہیں کبھی سامنے والی کوٹھری ہیں۔
گیتی آرا۔ یو سب دانتوں کیوں کہتی ہو۔ بتاؤ تو آخر ماجرا کیا ہے۔
جہاں آرا۔ ہاں ہے کچھ دال میں کالا کالا ضرور جب تک آگ نہیں ہوتی دھواں نہیں اُٹھتا۔
حسن آرا۔ اے واہ ہے۔ اور سنیئے گا اب رنگ لائی گلہری۔
گیتی آرا۔ یہ ہے کون۔ بے جان پہچان کے اتنا ڈھیٹ نہ ہو!۔
سپہر آرا۔ اے خیر ہے ہو کہاں اس وقت۔

یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ عباسی بھری ولایتی انار اور سیب لائی۔ جہاں آرا بیگم نے کہا عباسی یہ سامنے والی کوٹھی میں کون رہتا ہے۔ عباسی مسکرا کر بولی حضور یہ حال ہم سے نہ پوچھیئے۔ یہ بڑی کہانی ہے کسی دن فرصت کے وقت عرض کروں گی۔ جہاں آرا اور گیتی آرا کا ماتھا ٹھنکا سب یقین واثق ہو گیا کہ ان کا گمان بے اصل نہ تھا۔ کہا۔ نہیں اسی دم بتاؤ اور ضرور بتاؤ۔

عباسی۔ حضور نادر مرزا کی سالی کی زبانی میں نے سنا تھا۔ ہمایوں فر کی شادی ابھی نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ شادی ہو تو سپہر آرا ہی کے ساتھ ہو اور نہیں تو پھر نہ ہو۔

سپہر آرا۔ (ہنس کر) اے چپ بھی رہ واہ بڑی وہ بن کے آئی ہے وہاں سے۔
عباسی۔ تو اس میں چوری کیا ہے۔ کیا بیاہ کسی کا ہوتا نہیں۔
سپہر آرا۔ (ہنس کر) اللہ جانتا ہے ہمیں ہنسی آتی ہے۔
راوی۔ کیوں نہیں ہنسی ضرور آتی ہوگی۔

کیونکر نہ ہنسیں سُن کر حال دل عاشق کو ۔۔۔ کم سن ہیں وہ کیا جانیں ارمان کسے کہتے ہیں

اتنے میں کسی نے ہمایوں فر کے محل سے یہ شعر گانا شروع کیا۔

تم ذرا پہلو سے اُٹھے ہم پھڑک کر رہ گئے
یوں بھی دیکھا تھا کسی کا دم نکل جاتے ہوئے

عباسی۔ یہ حضور اُنھیں کی آواز ہے اللہ جانتا ہے وہی ہیں۔
سپہر آرا (ہنس کر) اے کیوں جھوٹ موٹ قسم کھاتی ہو عباسی۔
حسن آرا۔ ان کو ہمایوں فر نے کچھ رشوت دی ہے۔ جب ہی ان کی سی کہہ رہی ہیں۔
گیتی آرا۔ جو یہ بات ہے تو ہم خالہ جان سے کہیں گے کیا بُرا ہے۔ ابھی تو عمر ہیں۔ بیس اکیس برس کا سن اور شہزادے۔ حسین۔ روپیہ والے۔ کیا بُرائی کیا ہے ہم خالہ سے ضرور کہیں گے۔
جہاں آرا۔ مگر پہلے ان کی (حسن آرا) کی تو فکر کرو۔
گیتی آرا۔ اس بکھیڑے میں ہم نہ پڑیں گے۔ مگر سپہر آرا کے لیے تو خالہ جان سے ضرور کہیں گے چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ ہمایوں فر کو ہم نے اس وقت آنکھ بھر کر دیکھ لیا ہے بڑے خوبصورت ہیں اور ابھی چشم بد دُور کل کے لڑکے ہیں۔
سپہر آرا۔ (ہنس کر) وہ خوبصورت کیا معنی بلا تشبیہہ یوسف ثانی سہی مگر اپنی اپنی پسند ہے۔ شادی بیاہ میں کسی کا کیا اجارہ اور کل کے لڑکے کیا معنی؟ کیا ننھے ہیں کچھ۔

جہاں آرا اور گیتی آرا دونوں بہنیں مل کر بڑی بیگم کے پاس پہنچیں۔ جہان آرا بیگم سے یوں گفتگو کی :۔

جہان آرا۔ خالہ جان اب دعوتیں نہ کھلوائیے گا کیا منظور کیا ہے؟

بڑی بیگم۔ کیسی دعوتیں بٹی۔ جو جی چاہے پکواؤ کھاؤ منع کس نے کیا ہے۔

جہان آرا۔ ارے یہ دعوتیں نہیں خالہ جان۔ بڑی دعوت میں یں آپ کے ہزاروں روپیہ صرف ہوں اور ہفتوں تک ناچ رنگ رہے۔

بڑی بیگم۔ کیا کہا؟ ہم نہیں سمجھے۔ ناچ رنگ کیسا؟ ابھی تو ڈومنیوں کا گا نا سُن چکی ہو اُس روز۔ جی چاہے تو پھر بلوا بھیجنا۔

گیتی آرا۔ نہیں خالہ جان۔ یہ نہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اب ہماری بہنوں کی شادی کی فکر نہ کیجیئے گا۔ اب اللہ کی عنایت سے سیانی ہوئی ہیں، اب کچھ فکر تو ضرور کیجیے۔

بڑی بیگم۔ اب کسی دن فرصت کے وقت کہوں گی، وہ جانیں تم جانو۔

گیتی آرا۔ خالہ جان! یہ جو سامنے رہتے ہیں شہزادے یہ کیا کچھ بُرے ہیں کچھ؟

بڑی بیگم۔ سچ تو کہتی ہو ہمیں اب تک خیال ہی نہ تھا ان کا۔

گیتی آرا۔ کوئی ایسے ویسے ہیں کیا۔

بڑی بیگم۔ اچھا دیکھو۔ فکر کروں گی۔ سپہر آرا کے لیے۔ اچھے ہیں۔ ابھی لڑکا ہی تو ہے۔

بڑی بیگم سے پکّی پوڑھی کر کے جہان آرا اور گیتی آرا پھر چھت پر آئیں حسن آرا بیگم مینا بازار پڑھ رہی تھیں۔

گیتی آرا۔ چلو اسے رکھو مطلب کی بات سنو۔ ہم نے خالہ جان سے جا کر کہا انھوں نے منظور کر لیا ہے۔ ہم نے کہا کہ یہ شہزادے جو سامنے رہتے ہیں کیا بُرے ہیں؟ بڑی تعریف کی خالہ جان نے کہا ہم کو بھی پسند ہے۔

سپہر آرا مہتابی پر ہمایوں فر کی چاہ میں گئیں۔ لگی بُری ہوتی ہے۔ کنکھیوں سے چپکے چپکے شہزادے پر نظر ڈالی۔ اس وقت مزا ہمایوں فر دو شالہ اوڑھے ہوئے کمرے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ سپہر آرا نے آہستہ سے کنکری پھینکی شہزادے نے جو گردن پھیری تا سپہر آرا کا چاند سا مکھڑا نظر آیا۔ مگر سپہر آرا چھب[1] دکھا کر فوراً ہٹ گئی۔

ہمایوں فر۔ واہ۔ بھلا ایسی ستم ظریفی سے کیا ملتا ہے۔ خدا کے لیے ایک نظر دیکھ لو۔

سپہر آرا۔ آڑ میں کھڑی تھی صورت تو نہیں دکھائی مگر دوپٹے کے آنچل کو ہوا کے رخ پر چھوڑ دیا۔

ایک خدمت گار نے جو اُن کی تقریر سنی تو اوپر آیا۔ دیکھا اکیلے کھڑے ہوئے ہیں۔ گھبرایا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ شہزادے نے یہ شعر آواز بلند پڑھا۔

جنگجو کجکلہاں صلح و صفا نیز کنند غنچہ سا زند دل و کار صبا نیز کنند

واسطے خدا کے ایک نظر ادھر دیکھو صورت تو دکھا دو۔

سپہر آرا نے ہاتھ دکھایا۔

ہمایوں فر۔ اس دست حنائی کے قربان۔ مگر

قانع بہ تجلّی نشود شایقِ دیدار پروانہ بہ مہتاب تسلّی نتواں کرد

میں تو صورت کے نظارے کا طالب ہوں۔

---

[1] ادا۔

جب سپہر آرا بیگم کو معلوم ہُوا کہ گیتی آرا اور جہان آرا آگئیں تو دل میں سوچی کہ بیڈھب ہوئی۔ اب یہ دونوں تاڑ جائیں گی۔ ناچار مہتابی سے اُتری۔ جہاں آرا نے کمرے میں حسن آرا سے پوچھا کہ سپہر آرا کہاں ہیں؟

حسن آرا۔ ابھی ابھی یہاں تھیں۔ کیا جانے کہاں چلی گئیں۔

مغلانی۔ واہ کیا اُتر رہی ہیں مہتابی پر سے؟

جہان آرا (گردن پھیر کر) ایں! اے لو وہ تو مہتابی کی ہوا کھا رہی تھیں۔

گیتی آرا۔ (مسکرا کر) چہ خوش۔ یہ کہیئے۔

سپہر آرا بہت ہی شرمائی۔ مگر مجبوری کا مقام تھا۔ کرتی کیا مہتابی سے اُترتے ہوئے مغلانی اور تینوں بہنوں نے دیکھ لیا تھا۔

اب جہان آرا نے بنانا شروع کیا۔

جہان آرا۔ کہاں گئی تھیں آپ؟

سپہر آرا۔ (لجا کر) واہ میں دیکھتی تھی کہ وہ میں یا چلے گئے۔

جہان آرا۔ اے تو منہ کیوں لال ہُوا جاتا ہے۔

گیتی۔ آخر شرماتی کیوں ہو؟

سپہر۔ اے واہ۔ دونوں بہنیں مل کر ہمیں بناتی ہو۔

گیتی۔ بتاؤ تو آخر مہتابی پر کس کو دیکھنے گئی تھیں۔

سپہر۔ بس اب چھیڑ خانی نہ کرو باجی۔

گیتی۔ اے لو پھر شرما گئیں۔

جہان۔ نہیں اب شادی ہونا مشکل نہیں ہے۔

حسن آرا۔ آپ اماں جان سے کہیئے اور ہمارے سامنے کہلا دیجیے تو بس پھر چٹ پٹ فکر ہو جائے۔

گیتی۔ جو وہ سُن لیں کہ گیتی آرا بیگم ہماری سفارش کرتی ہیں تو ہمارے بڑے احسان مند ہوں۔

سپہر۔ آپ ہیں کس خیال میں؟

گیتی۔ اس خیال میں کہ تمہارا اور ہمایوں فر کا عقد ہو۔

سپہر۔ ہو چکا ہمیں پسند ہی نہیں۔

سپہر آرا دل ہی دل میں کھلی جاتی تھی کہ اب ہمایوں فر کے ساتھ شادی ہوگی اور برسوں کی تمنائیں پوری ہوں گی۔ مگر ظاہر میں گویا دل لگی ہو رہی تھی۔ اس طرح پیش آتی تھیں بات ہوئی اور مسکرا دیا، بات ہوئی اور قہقہہ لگایا۔ حسن آرا نے بھانپ لیا کہ سپہر آرا کا عشق روز بروز بڑھتا جاتا ہے لہذا ان کو جرأت ہوئی کہ اس معاملے میں بات چیت کریں۔ بڑی بیگم کے پاس جا کر کہا کیوں اماں جان گیتی آرا بہن کہتی تو ٹھیک ہیں سپہر اب کچھ فکر ہونی چاہیئے۔

بڑی بیگم۔ ہاں ہاں۔ میں غافل نہیں ہوں۔

جہان۔ تو پھر اب کب؟

بیگم۔ دیکھو کسی سے کہوں سنوں۔

گیتی۔ ان کے کوئی عزیز رشتہ دار ہیں؟ ضرور ہونگے۔
بیگم۔ ہاں ہاں۔ نواب جعفر کے ہاں ان کی پھوپی کی بیٹی بیاہی ہے اور مرزا اسکندر بخت ان کے حقیقی چچا ہیں۔ ان کی بیوی کا سے ہم سے بھی دور دراز کا رشتہ ہے۔
حسن آرا۔ بس انھیں کو بلایئے۔
بیگم۔ آج بیبیوں کی مہری کو۔
عباسی۔ حضور ان دونوں خاندانوں کو میں جانتی ہوں جب کہیئے جاؤں۔
جہان۔ ذرا بناؤ چناؤ کر کے جانا۔
بیگم۔ ذری سپہر آرا سے پوچھ لو۔ دیکھو منظور ہے یا نہیں۔
حسن آرا۔ ہم سے پوچھ لیجئے اماں جان!
گیتی۔ (ہنس کر) ایں! اس کے کیا معنی؟

جہاں آرا اور گیتی آرا نے مل کر حسن آرا کو خوب بنایا اور حسن آرا بیچاری اس وقت بن گئی۔ بڑی بیگم نے کہا کہ سپہر آرا سے دریافت کرلو۔ اس پر حسن آرا بول اٹھی کہ ہم سے پوچھ لیجئے۔ مطلب یہ تھا کہ ہم سپہر آرا کے دل کی باتیں خوب جانتے ہیں۔ ہم سے دریافت فرمایئے مگر ان دونوں نے صرف حسن آرا کے چھیڑنے اور دو گھڑی کی دل لگی کے لیے یہ معنی لگائے کہ حسن آرا اپنی شادی چاہتی ہیں، جب ہی کہتی ہیں کہ ہم سے پوچھ لیجئے

جہاں آرا۔ ہاں تو پہلے تم سے پوچھیں۔ اچھا پوچھا۔ جواب دو۔
گیتی۔ تو پوچھنے کے طریق سے پوچھو یہ کیونکر پوچھتی ہو۔
جہان۔ اچھا حسن آرا بہن اگر مرزا ہمایوں فر کے ساتھ تمھاری شادی ہو تو تم کو پسند ہے یا نہیں؟
حسن آرا۔ تو ہم نے یہ کہا تھا کہ ہم سے پوچھو۔ ہم نے تو یہ کہا تھا کہ سپہر آرا سے کیا پوچھتی ہو۔
گیتی آرا اور جہان آرا کو لے کر ہنستی ہوئی اوپر گئیں۔ دیکھا سپہر آرا بڑے ٹھٹے سے ٹہل رہی ہیں۔
جہان آرا۔ لو اب سب بات ٹھیک ہو گئی۔ اب ذراسی بھی کسر نہیں ہے۔

شادی کی چھیڑ چھاڑ

میرزا ہمایوں فر بہادر مدت کے بعد اپنے گلبدن غنچہ دہن معشوق کا جمال باکمال مشاہدہ کر کے از خود رفتہ ہو گئے تھے اور ادھر جہاں آرا اور گیتی آرا بیگم نے اپنی خالہ سے کہنا شروع کیا کہ شہزادے کے ساتھ سپہر آرا بیگم کی شادی قرار پائے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ سپہر آرا بیگم دل میں تو خوش ہوئیں کہ اگر شہزادہ ہمایوں فر سے شادی ہو تو مدت کی آرزو بر آئے مگر ظاہر میں منظور نہیں کرتی تھیں۔

جہاں آرا۔ میرزا ہمایوں فر میں آپ نے عیب کیا دیکھا؟

گیتی آرا۔ اے بہن۔ وہ بعد پیسل شل نہیں سُنی۔ من بھائے مونڈ یا ہلائے۔

سپہر آرا۔ ہم ایسی باتیں سنتے ہی نہیں۔

حسن آرا۔ تو بولتی کیوں ہو پھر

سپہر آرا۔ کیا باتیں کرنے میں کسی کا اجارہ ہے کچھ۔ واہ اب کوئی بولے بھی نہیں۔

جہاں آرا۔ اللہ جانتا ہے دل میں کھلی جاتی ہیں۔

گیتی۔ خالہ جان کی منظوری کا ہمیں انتظار تھا۔ اُنھوں نے منظور کر لیا۔ اب کیا ہوتا ہے شادی ہوئی داخل ہے۔

سپہر۔ تو آپ گھڑی گھڑی چھیڑ خانی کیوں کرتی ہیں؟

جہاں۔ اب شادی نہیں رُکتی۔ جوڑی اچھی۔ دونوں گورے چٹے۔

حسن۔ یہ آپ نے اتنی جلدی دیکھا کیوں کر۔

جہاں۔ اور سُنو۔ کیا خدانخواستہ کوئی آنکھ کا اندھا ہے۔

گیتی۔ ایک ہفتے تک ہم ڈومنیوں کا ناچ دیکھیں گے۔

حسن۔ آپ کے طفیل میں ہم بھی دیکھ لیں گے۔

عباسی۔ اے حضور کیا سچ مچ نکاح ہی ٹھہر گیا ہے۔ مبارک مبارک۔

سپہر۔ سُنا عباسی تم نہ بیچ میں بولا کرو۔ ہماری باتوں میں تم کون بولنے والی ہو؟

حسن۔ اب مبارک باد بھی نہ دے!

عباسی۔ حضور آپ کہنے دیجئے۔ اللہ وہ دن جلد دکھائے تو لونڈی جھک کر سلام کرے گی۔

جہاں۔ اب یہ تو بتاؤ کہ ہمایوں فر کا نام کیا رکھا جائے گا؟

حسن۔ ہم تو فرخ دولھا کہا کریں گے۔ بس اس سے اچھا خطاب نہ ملے گا جس کا جی چاہے جو کہے ہم کو یہی نام پسند ہے۔ فرخ دولھا دیکھو امّاں جان سے پوچھیں۔ دیکھیں وہ کیا کہتی ہیں۔

حسن آرا بیگم ناز و ادائے دلربا کے ساتھ بڑی بیگم کے پاس گئیں۔ اور بھولے پن سے پوچھا۔ کیوں امّاں جان سپہر آرا کے دولھا کا خطاب کیا تجویز ہوا ہے۔ بڑی بیگم نے حسن آرا کو سر سے پانوں تک دیکھا مگر جواب نہیں دیا۔ تو انھوں نے پھر پوچھا امّاں جان بتائیے

مرزا ہمایوں فر کا خطاب کیا ہوگا؟
بڑی بیگم۔ کچھ خیر ہے۔ ہا۔ ابھی بات نہ چیت خطاب کی فکر پڑ گئی۔
حسن۔ فرخ دولہا خطاب رکھیں گے۔
بڑی بیگم۔ تو بٹیا ابھی زبان سے نہ نکالو۔ جب سب باتیں ٹھیک ہو جائیں تب خطاب سوچ لینا۔
مغلانی اور محلدار مسکرائیں اور حسن آرا کے شوق اور بھولے پن کا عرصے تک ذکر رہا۔
اتنے میں پیاری چھوکری نے آن کر کہا کہ بڑی بیگم صاحب پوچھتی ہیں کچھ مٹھائی کھائیے گا۔ ابھی تازی تازی شیرینی آئی ہے۔ حکم ہو تو لاؤں؟
حسن۔ کہاں سے آئی ہے؟
سپہر۔ اماں جان نے مول منگائی ہوگی۔
پیاری۔ جی نہیں حضور وہ جو سامنے شہزادے رہتے ہیں اُن کے ہاں سے آئی ہے۔
سپہر آرا نے جو شہزادے کا نام سنا تو جھینپنے لگی۔ حسن آرا نے مسکرا کر کہا فرخ دولہا نے ہمارے واسطے مٹھائی بھیجی ہوگی۔
گیتی۔ جاؤ پیاری لے آؤ۔ کہو مانگتی ہیں؟
جہان۔ اب یہ نہیں معلوم ہوا کس کے واسطے بھیجی۔
پیاری مٹھائی لائی۔ سپہر آرا کے سوا سب نے کھائی۔
جہان۔ اے اب بہت شرماؤ نہیں کھاتی کیوں نہیں ہو؟
سپہر۔ جی کی خوشی۔ ہم نہیں کھاتے۔
گیتی۔ جی میں معلوم ہو کہ ان کے میاں کے ہاں سے آئی ہے۔
جہان۔ اے ہے تو ابھی سے ان کے میاں کیوں کہتی ہو؟
سپہر۔ دیکھتی جاؤ جہان آرا بہن۔ ہم کو چھیڑے جاتی ہیں۔ پھر ہم کچھ کہیں گے تو بُرا مانیں گی۔
گیتی۔ (ہنس کر) اے تو ہم نے کہا کیا بہن۔ خواہی نخواہی بُرا مانتی ہو۔
سپہر۔ میاں میاں تم نے نہیں کہا۔
اس پر قہقہہ پڑا اور سپہر آرا بیگم اُٹھ کے چل دیں۔ جاتے ہی بڑی بیگم سے جڑ دی۔ دیکھیے اماں جان ہمیں سب مل کے دق کرتی ہیں۔ بڑی بیگم نے کہا۔ تم روز بروز بچہ ہی بنی جاتی ہو۔ دق کیا کرتی ہیں چٹکیاں لیتی ہیں کاٹے کھاتی ہیں آخر دق کیا کرتی ہیں۔ سپہر آرا نے کہا واہیات باتیں کرتی ہیں۔ بڑی بیگم مسکرائیں خدا جانے کتنے سال کے بعد آج ذرا مسکرا دیں۔ پوچھا کیا واہیات باتیں کچھ کہو گی بھی۔
سپہر آرا۔ میاں ٹیاں کرتی ہیں۔
بڑی بیگم۔ واہ واہ۔ چلو تم اپنا کام کرو۔ بہنیں ہیں ہنستی ہیں دو گھڑی۔
سپہر۔ تو ہمیں ایسی ہنسی گوارا نہیں ہے۔
بڑی بیگم۔ تم نے مٹھائی کھائی۔
سپہر آرا۔ نہیں اماں جان ہم نے تو چھوئی تک نہیں۔

بڑی بیگم - یہ کیوں۔
سپہر آرا۔ اس وقت خواہش نہ تھی۔
بڑی بیگم نے سپہر آرا کو مٹھائی کھلائی اور سمجھایا کہ اب تم سیانی ہوئیں۔ بہنوں سے ذرا ذرا سی بات پر بگڑا نہ کرو۔ کوئی بچہ تو ہو نہیں۔ بڑی بہنیں ہیں اگر ایک بات بیجا بھی کہی تو اس کا بُرا ماننا کیا۔
سپہر۔ اور تو کوئی کچھ نہیں کہتا مگر گیتی آرا بہن بہت بڑھ بڑھ کے باتیں بناتی ہیں۔
اتنے میں بڑی بیگم کوٹھے پر پہنچ گئیں۔
عباسی۔ حضور ادھر دیکھئے۔
گیتی آرا نے پوچھا خالہ جان خیر تو ہے۔ اس وقت آپ کہاں آئیں؟ بڑی بیگم نے کہا تم سب مل کے ہماری لڑکی کو دق کرتی ہو اس کی کیا وجہ؟ وہ بیچاری ہمارے پاس دوڑی آئی۔
گیتی۔ خالہ جان یہ بنتی ہیں۔
حسن۔ پوچھیے ہوا کیا تھا۔
بڑی بیگم۔ اب کیا جانیں ہم سے تو آن کر کہا کہ گیتی آرا بہن ہم سے واہیات باتیں کرتی ہیں۔ میں نے کہا کچھ خبر ہے لڑکی واہیات بات کیا گالیاں دیتی ہیں۔
جہان۔ خالہ جان ہوا یہ کہ انھوں نے کہا تم مٹھائی نہ چھوؤ یہ ہمارے واسطے سامنے والے محل سے آئی ہے۔
اس پر قہقہہ پڑا۔ بڑی بیگم نے کہا تم برابر والیاں آپس میں ہنسو۔ ہم جاتے ہیں۔
سپہر آرا۔ جس نے کہا ہو اُس کے دیدے پٹم ہو جائیں۔
حسن آرا۔ اے کوستی کیوں ہو!
عباسی مہری نے مرزا ہمایوں فر کے ایک خدمتگار سے باتوں باتوں میں کہا کہ تمھارے شہزادے کا نکاح ہونے والا ہے، وہ متحیر ہوا کہ نکاح کیسا! کہا ہم نے تو نہیں سُنا۔ شاید ہو۔ کہاں کس گھر میں؟
عباسی۔ ہماری سرکار میں۔
خدمتگار۔ ہاں واہ تو پھر کیا ہے۔ بڑی بہن کے ساتھ یا چھوٹی بہن کے ساتھ؟
عباسی۔ چھوٹی بہن کے ساتھ۔
خدمتگار۔ تو میں جا کے سرکار سے کہوں مگر کیا ان کو اطلاع ہی نہ ہوئی ہوگی؟
عباسی۔ اطلاع تیرا سر ہوئی ہوگی۔ ابھی ابھی کی تو بات ہے۔ اطلاع کیوں کر ہوتی بھلا۔
خدمتگار۔ دیکھو جا کے انعام مانگوں گا۔
عباسی۔ تو میرا نام نہ دینا۔
خدمتگار۔ میں کہوں گا خداوند میرے آقا کی شادی تو بیگم صاحب کے ساتھ ہوتی ہے اور میری شادی بی عباسی کے ساتھ قرار پائی ہے۔
عباسی۔ اے مُوئے درگور ایڑی چوٹی پر قربان کروں۔
خدمتگار۔ ایسی تو صورت دار بھی نہیں ہو۔

عباسی۔ اے واہ صورت دار نہیں ہم بدصورت ہی سہی۔ بس۔
خدمتگار۔ تو آخر ہمارے ساتھ بیاہ کرنے میں عذر کیا ہے۔
عباسی۔ اللہ جانتا ہے میں ہزاروں گالیاں دوں گی۔
خدمتگار۔ پھر ہوگا کیا۔ ہزاروں نہیں لاکھوں گالیاں دو تو کیا پرواہے تو میں جاکر حضور کو اطلاع دوں۔
عباسی۔ ہاں ہاں کہتی تو جاتی ہوں اب کیوں کر کہوں۔
خدمتگار نے سات بار جھک کر سلام کیا اور کہا خداوند اس وقت ایک خوشخبری سنی ہے اور بہت بڑے معتبر آدمی کی زبانی سنی ہے۔ حضور سنیں گے تو بہت ہی خوش ہوں گے مگر خداوند بے انعام لیے نہ بتاؤں گا۔
شہزادہ۔ اگر انعام کے قابل بات ہوگی تو دینگے۔
خدمتگار۔ حضور کے نکاح کی باتیں ہو رہی ہیں۔
شہزادہ۔ پاگل ہوگیا ہے۔
خدمتگار۔ قسم کھا کر عرض کرتا ہوں خداوند کہ سامنے والی بیگم صاحب کی چھوٹی صاحبزادی کے ساتھ نکاح ہونے والا ہے عباسی مہری ملی تھی اس نے کہا ہماری طرف سے آداب بجالانا اور کہنا مبارک ہو خداوند بہت پکی خبر ہے۔

نامہ آزاد

میاں آزاد کو جو معلوم ہوا کہ قسطنطنیہ تک خط و کتابت اور آمد و رفت جاری ہے تو انھوں نے حسن آرا کے نام خط لکھا :

میدانِ جنگ ۔ قلعۂ معلق ۔ جولائی ۲۷ ؍ ۱۸۷۷ء

جانِ آزاد ! اب میدان کارزار ہے اور یلان روم کی شمشیر آبدار ۔ اب جنگ اور توپ و تفنگ سے کام ہے ۔ جس وقت صفِ جنگ میں غنیم کے سامنے جاتا ہوں یہ خیال کہ سرخرو ہونے میں تمھارے ساتھ نکاح ہوگا آتشِ جوانمردی کو اور بھی مشتعل کرتا ہوں ۔ خدا کرے میری آرزو برآئے ۔ آمین !

اب یہاں کا حال سنو ۔ روس اور روم کے درمیان میں ایک دریائے زخار ہے ڈینیوب ۔ یہ دریا دریائے گنگ سے بڑا ہے ۔ اور اس کے کناروں پر بڑے اور مشہور مشہور شہر واقع ہیں ۔ بارش کے سبب سے آج کل دریا بہت بڑھا ہوا ہے ۔ روسیوں نے سعیٔ بلیغ کی کہ عبور کر آئیں ۔ مگر عرصے تک ناکام رہے ۔

روس نے صوبۂ رومینیا سے جو روم کا ماتحت ہے سازش کر لی ۔ جب ترکوں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو انھوں نے قصبۂ کیٹ واقع رومینیا پر قبضہ کر لیا ۔ روسی شمالی کنارۂ دریا کی طرف بڑھتے گئے یہاں تک کہ ۱۸ مئی تک کوئی پونے دو لاکھ آدمی جمع ہو گئے ۔ ترکوں نے ایک جہاز جس کے ساتھ کشتیوں پر توپیں تھیں ایک ٹاپو کی طرف بڑھایا اور ایسے مقام پر لنگر انداز ہوئے کہ جنگل کی آڑ کے سبب سے روسیوں کو ان کا جہاز اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا ۔ مگر تین مستول البتہ درختوں سے بھی اونچے تھے ۔ ان کے سبب سے روسیوں کو معلوم ہو گیا کہ ترک کمینگاہ میں ہیں ۔ روس کے گولہ اندازوں نے چھوٹی چھوٹی توپوں سے گولے اتارنے شروع کیے مگر ترکوں کا بال بیکا نہ ہوا ۔ اس کے بعد دو بڑی بڑی توپوں سے گولے اتارے ۔ انھوں نے چالاکی یہ کی کہ ایک بلند مقام سے گولے مارے ۔ آخرکار ایک گولہ ہمارے جہاز پر پڑا اور میگزین کو اڑا دیا ۔ جس وقت روسیوں نے دیکھا کہ جہاز سے دھواں اٹھا تو نعرۂ خوشی بلند کیا ۔

اس قدر میاں آزاد لکھ چکے تھے کہ ایک افسر نے آن کر پوچھا کیا لکھ رہے ہو ؟

آزاد ۔ ایک خط لکھتا ہوں ۔

افسر ۔ (مسکرا کر) کسی معشوق کے نام ۔

آزاد ۔ (ہنس کر) ہاں ہے تو معشوق کے نام ۔

افسر ۔ تو پھر ہم اس وقت باتیں نہ کریں گے ۔ دل لگا کر لکھیئے ۔

جب جہاز ڈوبنے لگا تو روسیوں نے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھیجیں ۔ انھوں نے نشان لے لیا ۔ ترکوں کے جہاز پر کوئی سوا دو سو آدمیوں کے قریب تھے ۔ جس میں سے پانچ چھ آدمی بچ نکلے ۔

ایک اخبار سے معلوم ہوا کہ روسی اس فتح سے بہت خوش ہوئے ۔ ٹوپیاں اچھلنے لگیں ، سپاہی افسروں اور افسر سپاہیوں کے گلے

ملنے لگے۔ کچھ دن کا عرصہ ہُوا کہ روس اور روم کے جہاز ایک دوسرے کے مقابل لنگر انداز تھے۔ جب ترکوں کو معلوم ہوا کہ شب کو روسیوں کا جہاز بھی آگیا ہے اور تاریکی کے سبب سے ان کو مطلق نظر نہیں آیا تو قصد کیا کہ وہاں سے چلیں۔ پو پھٹتے ہی چلے مگر روسی جہاز نے تعاقب کیا۔ اب سنیئے کہ ایک مقام پر روسیوں نے آلۂ تارپیڈو چھوڑا۔ تم نے اس کا نام بھی نہ سُنا ہوگا۔ یہ بڑا مہیب آلہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے جہاز فوراً پھٹ کر تہِ آب بیٹھ جاتا ہے۔ یہ آلہ پانی کے اندر جا کر جہاز کے نیچے پھٹتا ہے اور نیچے ہی سے جہاز کو اُڑا دیتا ہے۔ ترکوں کو معلوم ہوگیا کہ غنیم نے تارپیڈو چھوڑا ہے۔ انھوں نے بھی ایک تارپیڈو چھوڑا اور وسط میں دونوں باہم ٹکرائے اور سرد ہوگئے۔ جب روسیوں کو معلوم ہُوا کہ ترکوں نے جواب ترکی بہ ترکی دیا تو سخت خفیف ہوئے۔ اب سنیئے کہ ترکوں کے جہاز کا کپتان ایک بڑے اونچے مستول پر جا کھڑا ہوا۔ روسیوں نے اس کی جرأت دیکھ کر گولہ مارا۔ کپتان نے سر کو ذرا ہٹا لیا۔ گولہ دور جا کر دریا میں گرا اور ٹھنڈا ہوگیا۔ روسی گولہ انداز جھلّائے۔ پھر تاک کر دوسرا گولہ چلایا۔ ترکی کپتان نے پھر سر ہٹا لیا اور نشانہ خالی گیا۔ اب روسی گولہ انداز سخت نادم ہوئے۔ جو گولہ انداز نادر اور کامل فن تھا اُس نے بیڑا اُٹھا لیا کہ اب کی اگر کپتان اسی مقام پر کھڑا رہا تو اُڑا دوں گا۔ یہ کہہ کر گولہ اُتارا۔ اس مرتبہ ترکی کپتان نے گولے کے قریب پہنچنے تک ذرا بھی جنبش نہ کی اور اُس کے پچاس گز کے فاصلے پر گولہ پھٹا۔ تب تو ترکوں نے تالیاں بجائیں۔ نعرۂ خوشی بلند کیا اور ہمارے کپتان نے ٹوپی اتار کر روسیوں کو ٹوپی سے تین بار سلام کیا اور مستول سے اُترے۔ روسیوں نے اس افسر کی خود تعریف کی اور بہت ہی شرمندہ ہوئے کہ ان کے گولہ اندازوں کے گولے نے تین بار نشانہ خطا کیا۔ روس اور روم اور جرمنی اور آسٹریا اور فرانس اور انگلستان کُل ملکوں کے اخبار ہمارے کپتان کی تعریف میں عذب البیان ہیں ہوبرٹ پاشا جو صیغۂ جنگ بحری کے افسر ہیں بڑے بڑے کارِ نمایاں کر رہے ہیں۔ گو روسیوں کے پاس تارپیڈو کثرت سے ہیں۔ مگر ہوبرٹ پاشا نے ان کی دال نہ گلنے دی۔

تُرکوں کے افسر اچھے نہیں ہیں میرا دل روتا ہے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں ہاں ترکی سپاہیوں کا ساری خدائی میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جرأت اور استقلال میں بے نظیر، ہمدردی میں لاجواب، مصیبت برداشت کرنے میں عدیم السہیم، خوش رُو، گرانڈیل کرارے جوان۔ جان جائے مگر قدم پیچھے نہ ہٹے گا۔ مگر افسوس صد افسوس کہ افسر اچھے نہیں ملے۔ دل روتا ہے خدا کی قسم دل روتا ہے اور اگر ترکوں نے خدانخواستہ شکست بھی پائی تو میں یہی کہوں گا کہ ترکی سپاہی بسالت میں کسی قوم سے کم نہیں ہیں۔ اس وقت میرا دل بھر آیا۔ میں لکھتا جاتا ہوں اور روتا جاتا ہوں کہ یا خدا، اگر افسروں کی کارروائی اور بے پروائی کا یہی حال ہے تو انجام کیا ہونا ہے۔ خدا کرے افسر بھی سپاہیوں کی طرح جان لڑا دیں۔ آمین۔ آمین۔ ثم آمین۔ ع۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔ روم کی سپاہ پر روم کو ناز ہے مگر ؎

طاؤس را زنقش ونگارے کہ ہست خلق
تحسین کنند و او خجل از پائے زشتِ خویش

جس وقت افسروں کی کارروائی پر نظر ڈالتا ہوں بے اختیار رو دیتا ہوں اگر ترکی خدانخواستہ شکست بھی پائیں تو ساری خدائی میں کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ ترک جری نہیں ہیں۔ کیا مجال ترکوں کی جرأت کے جھنڈے گڑے ہوتے ہیں۔ اگر ہم غنیم کے مقابلے میں دب بھی نکلیں تو رومی سپاہی کی نظر روسی سپاہی کے سامنے نیچی نہ ہوگی کیا طاقت۔ بلکہ ہمارے ملک کے جوانمرد اور شیر دل سپاہی زبانِ حال سے یہی کہیں گے کہ ؎

تمھاری تیغ کا منہ چڑھ کے لے لیا بوسہ — کبھی نہ آپ سے ہم دب کے بانکپن میں رہے

ماہ مئی کے شروع ہی میں کرب کی توپیں مقام باسفورس پر ہونی چاہیئے تھی مگر افسوس ہے کہ اس کی کسی نے فکر نہ کی پھر دل جلے یا نہ جلے۔ جہاز اچھی حالت میں نہیں، مرمت تک نہیں ہوتی۔ افسوس صد افسوس۔ اب فرمائیے سپاہ بیچاری کیا کرے۔ ترکوں کو

یہاں تک منظور ہے کہ تنخواہ نہ ملے مگر آلات حرب تو درست ہوں۔ ہائے افسر لائق ہوتے تو ترک اب تک روس کے چھکے چھڑا دیتے۔ مگر افسروں کی لیاقت ظاہر ہے کسی بات کی پرواہی نہیں اور سب سے زیادہ ستم یہ ہے کہ رشوت کی گرم بازاری ہے۔ روسی رشوت دینے اور سازش کرنے میں طاق ہیں۔ خدا خیر ہی کرے لیکن ع بیدل نیم ہنوز بہ بینم چہ میشود ۔ ترکی میں بارہ بارہ برس کے لڑکے ہتھیار اٹھانے پر آمادہ ہیں اور ترک کسی بات میں غنیم سے کم نہیں مگر افسروں کو کیا کریں۔ سپاہ کے جوش و خروش وفاداری اور جانبازی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی افسر اچھی کارروائی کرتا ہے تو سوار اور پیادے نماز کے وقت دعا مانگتے ہیں کہ یا رخدایا اس کی عمر دراز ہو اور اسی کی طرح کل افسر نیک نام اور فائز المرام ہوں۔ تین مرتبہ دو دو ہزار سپاہیوں نے میرے قدم لیے ہیں اور کہا ہے کہ آزاد پاشا ہم سب تمہارے درم ناخریدہ غلام ہیں کہ تم نے فلاں میدان اور فلاں جنگ میں روم کی عزت رکھ لی۔ خدا جان نثاروں کو سرخرو کرے۔ آمین۔ ع

آفرین باد بریں ہمت مردانۂ تو!

افسروں کا یہ حال ہے کہ ایک دوسرے کے دشمن۔ اگر کسی افسر فوج نے اچھی کارروائی کی تو اور افسر جل مرتے ہیں۔ ہائے افسوس، ہمدردی کا ان میں نام تک نہیں ہے۔ بے پروائی مزاج میں حد سے زیادہ ہے۔ عاقبت اندیشی برائے نام بھی نہیں۔ بعض مراد آفندی کے عزل پر کف افسوس ملتے ہیں اور بیدلی سے کارروائی کرتے ہیں۔ بعض سلطان مرحوم کا اب تک جنبہ کرتے ہیں۔ حالانکہ اب وہ وقت ہے کہ چاہے مراد آفندی سلطان روم ہوں چاہے عبد الحمید خاں۔ فوج کو یکساں کارروائی کرنی چاہیئے۔ اب باہمی رنجش کو بالائے طاق رکھنا لازم ہے اب وہ وقت ہے کہ کل ترک ایک جان دو قالب ہو کر غنیم سے لڑیں۔ یہ بات سپاہ میں تو ہے مگر افسروں میں مطلق نہیں پائی جاتی۔ اعلیٰ افسر ادنیٰ افسر کے خلاف۔ ماتحت افسر کا دشمن پھر بات کیوں کر بنے۔ خدا جانے یہ لوگ اس پھوٹ اور ناچاقی سے کیا کریں گے۔ ہائے افسوس۔ وائے افسوس۔

روس کی آبادی نو کروڑ ہے۔ روم کی آبادی تین کروڑ کے قریب ہے۔ تگنے کا فرق ہے۔ دونوں سلطنتوں میں روپیہ نہیں ہے دونوں کی اندرونی حالت خراب ہے۔ رشوت کی دونوں ملکوں میں گرم بازاری ہے۔ مگر ترک راستباز ہیں۔ تین پانچ نہیں جانتے۔ روسی وعدہ خلاف اور عہد شکن ہیں۔ ترکوں نے جو کہا وہ کیا اور جو کیا وہ وعدے اور عہد کے موافق کیا۔ ترک اب نشے سے نفرت کرتے ہیں۔ درجۂ اول کے خوش مزاج اور پاک باز جنٹلمین ہیں۔ ان کی جرأت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اگر کوئی دق کرے یا چھیڑے تو آگ ہو جائیں اور شیر کی طرح بپھر پڑیں ورنہ ان کی مہمان نوازی اور انسانیت میں اصلا فرق نہیں۔

ایک لائق انگریز کی رائے ہے کہ تمام عالم میں جانوران باربرداری کے ساتھ انسان اس رحمدلی اور سلوک کے ساتھ نہیں پیش آتے جس قدر رحمدلی اور محبت کے ساتھ ترک پیش آتے ہیں۔

ایک عیسائی پادری کے سامنے چند آدمیوں نے کہا کہ ترک بڑے عیاش ہوتے ہیں۔ پادری صاحب نے جواب دیا کہ با ایں ہمہ جن نیکیوں کا ہمارے ملک میں زبانی داخلہ ہے ان کا سچا برتاؤ ترکی ہی میں ہوتا ہے۔

آہا خوب یاد آیا ہے۔ میں تو روسیوں کے ڈینیوب عبور کرنے کا حال بیان کرتا تھا جب روسیوں نے دیکھا کہ دریا کی طغیانی کم نہیں ہوتی تو سخت پریشان ہوئے۔ اس حالت میں پلوں کا بنانا محال تھا۔ شمالی کنارۂ دریا پر روسی فوج بیکار پڑی تھی مگر اس سے روسیوں کا فائدہ بھی ہوا۔ انھوں نے اس عرصے میں خوب تیاری کر لی اور قس علیٰ ہذا۔ ترکوں نے بھی تیاری کی طرفین کا فائدہ ہوا۔ افسوس یہ ہے کہ ترکوں کی کل کارروائیوں سے روسی واقف ہو جاتے تھے مگر روسیوں کی کارروائیاں خفیہ رہتی تھیں۔ اس مقام پر پھر پھوٹ کے سوا آتا ہے۔ یہ افسروں کی غلطی اور سخت بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ سپاہی بیچاروں کا کیا قصور۔ روسیوں نے لاکھوں آدمی دریا پر جمع کر دیئے

اور ترکوں کو کانوں کان خبر ہی نہیں۔ اگر رعایا کو خبر ہو جاتی تو فدیہ جنگ اور بعض افسروں کو فوراً گرفتار کر لیتے کہ ہمارے ملک کی عزت تمھارے ہاتھ ہے اور تم غافل ہو مگر رعایا کو اس کی خبر ہی نہ تھی کہ روسی کیا کارروائی کر رہے ہیں۔ سپاہی جان بکف آمادہ تھے کہ ٹرکی کے نام پر اپنا خون بہائیں اور غنیم کو نیچا دکھائیں۔ مگر جب افسر بھی ویسے ہوں۔ کتنی حسرت کی بات ہے۔

اس غفلت سے خدا سمجھے کہ روسی ڈینیوب کے کنارے قلعے بنائے جاتے تھے اور ترک ذرا بھی اُس کا دفع دخل نہیں کرتے تھے۔

آخر کار اُن کے بوٹ آنا شروع ہوئے۔ پہلے بوٹ کے آدمی جب اُترے تو ترکوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ اتنے میں اور بوٹ آئے۔

اس جنگ کی نسبت سرکاری طور پر مشتہر ہوا ہے کہ روسیوں کی جماعت کم تھی مگر وہ ایسے مقام پر تھے جہاں سے غنیم ان پر گولے برساتا تھا اور وہ اُس آسانی سے روسیوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔

معتبر طور پر معلوم ہوا ہے کہ ترکوں نے اس جنگ میں روسیوں کے لوحِ دل پر اپنی بسالت کا نقش منقوش کر دیا۔ روسی افسر خود مقر ہیں کہ انھوں نے با وصف تجربہ کاری تمام عمر میں ایسے جری لڑنے والے نہیں دیکھے تھے۔ گولی پر گولی کھاتے تھے اور دراتے ہوئے چلے جاتے تھے۔

اس جنگ میں ترکوں کے ساتھ سرکیشیا کی فوج بھی تھی۔ ان سواروں نے اعلےٰ درجے کی شجاعت کے ساتھ جنگ کی۔ لڑنے کے وقت ایسے خونخوار ہو جاتے تھے کہ الامان جو مشہور رہا ہے کہ ترکوں نے بڑے بڑے جور کیے۔ اس کی اصلیت یہ ہے کہ سرکیشیا کے باشندوں کی روس سے جانی دشمنی ہے۔ ان کو خوب یاد ہے کہ روسیوں نے ان پر سخت ظلم کیے تھے۔ لہٰذا جب کبھی روس میدانِ جنگ میں زخمی ہوتے تھے۔ سرکیشیا کے سوار فوراً گھوڑوں سے اُتر کر ان کی ناک اور کان کاٹ لیتے تھے۔

میدانِ جنگ میں جو کچھ کارروائی میں نے کی اُس کا بیان شاید شیخی پر محمول ہو۔ مگر اس قدر میں ضرور لکھوں گا کہ جب اس قلعے میں جس بیٹھ کر میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ روسی فوج مقیم تھی۔ اور جب تین طرف سے ترک اس قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور دونوں طرف سے تفنگ آتش فشانی کرتی تھی تو تمھارا پیارا آزاد جان پر کھیل کر صرف پانچ سو سواروں کو ساتھ لے کر قلعے کے اندر گیا تھا۔

جب روسیوں کا ایک کالم رات کے وقت دفعتہً جنگل کے ایک کونے سے ہماری فوج پر حملہ آور ہوا تھا تو تمھارا پیارا آزاد ہی اس کے مقابلے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اور غنیم کو شکست فاش دی تھی۔ نازک نازک وقتوں میں جبکہ غنیم کی خبر لانا اور اس کی نقل و حرکت کرنا نہایت ہی جرأت کا کام تھا۔ آزاد ہی صرف دس بارہ سوار لے کر جاتا تھا اور خبر لاتا تھا۔ آزاد نے روسی افسر رسالہ سے دست بدست جنگ کی اور اس کو زخمی کر کے اپنے سواروں کو بچایا اور اپنی فوج کو روسیوں کی نقل و حرکت سے اطلاع دی۔

میرے سمندِ بسالت پر یہ خیال تازیانے کا کام کرتا ہے کہ اگر اسی طرح میں کامیاب اور سرخرو رہا تو ایک روز حسن آرا بیگم، پیاری حسن آرا آزاد کی چاہیتی بیوی ہوں گی جو کسی کو اس وقت یہ معلوم ہو جائے کہ تم نے اس اقرار سے مجھے ترکی بھیجا ہے کہ سرخرو آؤں اور ترکوں کی طرف سے مورچے پر جاؤں اور پھر تمھارے ساتھ نکاح ہو تو تم کو ضرور ہنسے۔ کیونکہ ہندوستان کی رسوم کے خلاف ہے۔ مگر تم نے مجھے جس غرض سے بھیجا ہے وہ تمھاری حمیت پر دال ہے۔ کوئی شریف زادہ تم پر حرف نہیں رکھ سکتا۔ پھر عالم گواہ عصمت اوست۔ تمھاری پاک بازی اور پاکدامنی کا حال خدا خوب جانتا ہے۔ مجھے ہر دم یہی خیال رہتا ہے کہ خدا جانے میری جدائی سے تم پر کیا گذرتا ہوگا۔ مگر استقلال کو ہاتھ سے نہ دینا۔ صبر عجب نعمت ہے۔

کتنے مزے کا غم ہے امید وصال میں
رل مل کے رہ گئی ہے خوشی بھی ملال میں

یہاں کے افسر مجھ سے بہت خوش ہیں۔ وزیر جنگ مداح۔ افسر اعلیٰ میرا دم بھرتے ہیں۔
خوجی مسخرے کو میں قسطنطنیہ ہی میں چھوڑ آیا ہوں لیکن اگر قلعے میں جمنا ہوا تو بلا لوں گا۔
عدم رسی خط کی شکایت تو ضرور کرتی ہوگی۔ مگر

تو ای کبوتر بام حرم چہ میدانی طپیدن دل مرغان رشتہ بر پارا

میدان جنگ سے کیوں کر خط بھیجوں، بعض بعض مقاموں پر اب تک رستہ بند تھا۔ آمد و رفت محال تھی۔ یہاں سے یہ خط قسطنطنیہ جائے گا اور وہاں سے ہندوستان۔ تمھارے پاس عرصے میں پہنچے گا۔
سپہر آرا کو دلاسا دیا کرو۔

ابھی کمسن ہیں کسی بات کا کچھ ہوش نہیں

اس خط کا جواب اس پتہ سے بھیجنا "قسطنطنیہ روم۔ کوٹھی ہرمزجی بھائی۔ نزد آزاد پاشا برسد"
(نومید مہجور از وطن دور۔ آزاد)

ہمایوں باغبان

اب سنئیے کہ شہزادہ فرخ گہر مرزا ہمایوں فر بہادر کئی مہینے تک نیپال کی ترائی میں شیروں کا شکار کیا کیے۔ صید افگنی کا ان کو کمال شوق تھا۔ تین مہینے کے بعد سیر و سیاحت اور صید افگنی کر کے واپس آئے تو حسن آرا بیگم کے قصر پُر فضا کے قریب اپنی دلکشا کوٹھی میں فروکش ہوئے۔ آتے ہی رفقا سے دریافت کیا کہ کو پڑوسی کیسے ہیں۔ کبھی کبھی ٹوہ لگاتے رہے تھے یا نہیں۔ نور محمد رفیق نے جو ہمراہ تھے یوں عرض کیا:

نور محمد۔ حضور خدمتگار نے بہت صحیح حال کہا تھا۔

شہزادہ۔ ہاں۔ ہم نے خوب تحقیقات کی تھی مگر سُنا کہ وہ فقرہ بازی ہی تھی۔

نور محمد۔ حضور عباسی مجھے ملی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ شہزادے بہادر شادی کا نام سنتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ واہ سپہر آرا بیگم روز مہتابی پر جا جا کے دیکھتی تھیں۔

شہزادہ۔ ہائے افسوس ہم کو لوگوں نے بہکایا۔

نور محمد۔ خداوند غلام نے تو کئی بار عرض کیا تھا مگر حضور نے ایک نہ سُنی مجبور۔ اگر حضور غلام کی التماس قبول کرتے تو اب تک شادی ہو گئی ہوتی۔

شہزادہ۔ خیر پھر اب تو مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید کا نقشہ ہے۔

نور محمد۔ اگر حضور حکم دیں تو عباسی کو جا کے بلا لاؤں۔

شہزادہ۔ اہو ہو ہو۔ اگر ایسا ہو تو سبحان اللہ۔ جاؤ مگر وہ آئیگی ؟

نور محمد۔ خداوند وہ آئے اور اس کا باپ آئے۔

شہزادہ۔ (مسکرا کر) نہیں اس کے باپ سے ہم کو کیا واسطہ ہے۔ آپ جا کے اس کو لے آئیں۔ بوڑھی عورت ہے نہ۔

نور محمد۔ حضور ابھی۔ برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن۔

شہزادہ۔ اچھا لاؤ بھی۔

نور محمد نے اپنے خدمتگار کو حکم دیا کہ عباسی کو جا کر بلا لاؤ۔ عباسی چمکتی ہوتی آئیں۔ نور محمد دوسرے زینے سے عباسی کو مرزا ہمایوں فر کے پاس لے گئے۔ شہزادے نے دیکھا تو پھڑک گئے۔ اللہ اللہ یہ سن و سال یہ حسن و جمال؟ آئیے بی مہری صاحب کہئے مزاج شریف۔

عباسی۔ (مسکرا کر) حضور کے جان و مال کو دعا دیتے ہیں۔

شہزادہ۔ کہئے حسن آرا بیگم صاحب کا مزاج تو اچھا ہے۔

عباسی۔ ہاں حضور۔

شہزادہ۔ اور دوسری بہن کون ہیں۔ ان کا نام ہم بھول گئے۔

عباسی۔ (مسکرا کر) بجا۔ ان کا نام تو آپ ضرور ہی بھول گئے ہونگے۔ دریں چہ شک۔
شہزادہ۔ ہمیں تو تم حسین معلوم ہوتی ہو قسم خدا کی۔
عباسی۔ اے حضور ہم غریب آدمی۔ بھلا ہمارے حسن کا کس کو خیال ہے۔ جیسے جنگل کے پھولوں کی خوشبو جو کسی آدمی کی ناک تک نہیں جانے پاتی۔
شہزادہ۔ ہمارے گھر پڑ جاؤ۔
عباسی۔ ایں۔ ایلو اور سنو۔ اے حضور بھلا کوئی بات ہے۔ اللہ جانتا ہے کیا مجاز پایا ہے اور ہنسنا بولنا ہی کام بھی آتا ہے حضور۔
شہزادے نے عباسی سے چہل کی تاکہ بالکل بے تکلف ہو جائیں۔ عباسی نے صاف صاف بیان کر دیا کہ سپہر آرا بیگم پیشتر آپ پر جان دیتی تھیں۔ بار بار آپ ہی کا نام لیتی تھیں۔ گھڑی گھڑی مہتابی پر جاتی تھیں۔ گھنٹوں کے بعد وہاں سے آتی تھیں۔ آپ کو چھب دکھانے کے لیے خوب خوب نکھرتی تھیں۔ دن رات آپ ہی کا دم بھرتی تھیں مگر جب سے آپ چلے گئے طبیعت پھر گئی۔ شہزادے نے جیب سے پانچ اشرفیاں دیں اور کہا عباسی اگر ہمیں کسی ترکیب سے لے چلو تو پانچ اشرفیاں اور دوں۔
عباسی۔ اے حضور بھلا میں کیوں کر لے چلوں۔
شہزادہ۔ ہم نہیں جانتے۔ ہمیں ضرور لے چلو۔ واسطے خدا کے۔
عباسی۔ اے منشی جی (نور محمد سے) ذری سمجھاؤ تو حضور کو۔ بھلا میں وہاں کیوں کر لے جا سکتی ہوں۔ رئیسوں کا گھر۔ شریفوں کی بہو بیٹیوں میں غیر مرد کا کیا کام؟
نور محمد۔ کوئی ترکیب تو سوچو۔ تم اللہ کی عنایت سے بڑی تیز طبیعت ہو۔
عباسی۔ اور آج تو ممکن ہی نہیں لو خوب یاد آیا۔
شہزادہ۔ یہ کیوں۔ آج کیا بات ہے؟
عباسی۔ آج مہمان آنے والے ہیں۔
شہزادہ (چونک کر) ایں! مہمان! مہمان آنے والے ہیں مہمان کیسے؟
عباسی۔ حضور گھبرائیں نہیں۔ کوئی مردوا نہیں ہے۔ ایک میم صاحب ہیں۔
شہزادہ۔ کیا دعوت کی ہے۔ یہ ملاقات کہاں سے ہوگئی۔
عباسی۔ میم صاحب نے کسی سے سن لیا تھا کہ بیگم صاحب پڑھی لکھی رئیس زادی ہیں ان کا بنگلہ تو سامنے ہے نہ۔
شہزادہ۔ اخاہ یہ آنے والی ہیں مس فیرنگٹن، پھر کسی ترکیب سے سپہر آرا سے باتیں تو کروا دو۔
عباسی۔ اچھا ایک تدبیر ہے۔ آج باغ میں نشست ہوگی۔ باغ کی دیواریں بلند کر دی گئی ہیں نہ تو اب باغ کا آدمی سڑک سے نہیں سوجھتا باغ ہی میں نشست ہوگی۔ حضور چل کر کسی درخت پر بیٹھ رہیں۔
عباسی رخصت ہوئی۔ شہزادہ ہمایوں فر باغ باغ تھے کہ بعد مدت دیدار یار نصیب ہوگا۔
اتنے میں عباسی لنگا پھڑکاتی اور مسکراتی ہوئیں آئیں۔ لیجیے حضور اب میری پانچ اشرفیاں ادھر ہوں۔ شہزادے نے کہا بتاؤ بتاؤ فتح ہے فتح ہے۔
عباسی۔ اے حضور عباسی جس کام میں ہو اس میں فتح کہاں لینے جانا ہے؟

شہزادہ۔ کیا سپہر آرا سے کہا تھا۔

عباسی۔ نا حضور ہم سے خود باغبان نے کہا کہ بیگم صاحب ہم لوگوں سے پردہ ہی نہیں کرتیں۔

شہزادہ۔ فتح ہے۔ بس اب مار لیا۔

عباسی۔ دو اشرفیاں باغبان کو دینی پڑیں گی۔

شہزادہ۔ اوہ! یہ کون بات ہے۔ ہاں چلیں گے کیونکر؟

عباسی۔ (مسکرا کر) حضور یہ شہزادگی کے ٹھاٹھ تو وہاں ہونگے نہیں۔ دھوتی پہنئیے اور مرزائی پہنئیے اور موٹے کپڑے کی بدقطع ٹوپی دیجیئے اور چادر کمر سے باندھیئے اور ڈھائی تلے کا چمرودھا جوتہ پہنئیے۔ تب وہاں جانے کے قابل ہو جیئے گا۔

شہزادے نے کہا ہمیں سب منظور ہے۔ تم شام کو آؤ اور باغبان کو فوراً بھیجدو۔ عباسی نے جاکے باغبان کو بھیجا۔ شہزادے نے اس کو ایک اشرفی دی اور کہا چودھری جو تم سے پوچھیں کہ یہ کون ہیں تو کہنا ہمارے بھانجے۔ نام پوچھیں تو کہنا "ہمایوں" باغبان نے ہمایوں کا لفظ بخوبی یاد کر لیا۔ سلام کیا اور روانہ ہُوا۔

شام کو ہمایوں فر نے مالیوں کی سی قطع بنائی۔ مگر کپڑے سب سفید تھے۔ جب تاریکی ہوئی تو باغبان آن کر ان کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ہمایوں فر باغ میں پہنچے تو پھڑک گئے۔

دیکھا کہ پھولوں کی روشوں کے وسط میں ایک پکا اور اونچا چبوترہ ہے۔ اُس پر فرش مکلّف بچھا ہے۔ نہایت قیمتی قیمتی کرسیاں اُس پر چو طرفہ خوشنمائی کے ساتھ رکھی ہیں۔ بیچ میں کرسیوں پر حسن آرا بیگم اور سپہر آرا بیگم و جہاں آرا بیگم اور گیتی آرا بیگم اور مس فیر نگٹن ھنکن ہیں۔ باغبان نے گلدستہ بنا کر مرزا ہمایوں فر کو دیا اور کہا جا کے میز پر رکھ دو۔ مرزا ہمایوں فر نے مس فیر نگٹن کو جھک کے سلام کیا اور سپہر آرا کی کرسی کے قریب رکھ دیا۔ پھر جھک کے سلام کیا اور چبوترے کے ایک کونے میں بہ ادب کھڑا ہو گیا۔

سپہر آرا۔ ہیرا یہ کون ہے؟

ہیرا۔ (باغبان) حضور غلام ہے آپ کا۔ بھانجا ہے میرا۔

سپہر آرا۔ کیا نام ہے؟

ہیرا۔ حضور ہمایوں نام ہے۔

جہاں آرا۔ ایں! ہمایوں فر تو نہیں نام ہے؟

سپہر آرا۔ اے واہ۔ ایسے ایسے سیکڑوں موئے باغبان اُن پر سے قربان۔

اتنے میں مس فیر نگٹن نے کہا چلو باغ میں سیر کریں۔ سیر کرتے کرتے مس فیر نگٹن نے ایک طرارہ بھرا تو ایک پٹری سے دوسری پٹری میں ہو رہیں اور وہاں سے جھپٹیں تو ایک اور روش میں تھیں۔ کجا حسن آرا بیگم کی نستعلیق چال کجا فیر نگٹن کے طرارے بھرنا۔

حسن آرا بیگم نے کہا ہمایوں ذری دو پھول توڑ لانا۔ ہمایوں مالی جھپٹے ہی تھے کہ پھول توڑ لائیں کہ دفعتہً اس نے طرارہ بھرا اور تڑ سے پھول توڑ لیا۔ ہمایوں فر دل میں سوچنے لگے کہ اللہ اللہ ہندوستان کی نزاکت دیکھیئے اور ان کی شوخی اور چستی کو۔ یہ دو زینے چڑھنے میں ہانپ جاتی ہیں۔ طاق سے صندوقچہ اُتارنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ وہ دو گھڑی ملن رہے سے کرکٹ کھیلا کرتی ہیں۔ اِدھر جھکیں اُدھر ہو رہیں۔ یہ دوڑیں وہ جھپٹیں اور یہاں یہ کیفیت ہے۔

پہنائے جو اُس گل کو پھولوں کے ہار نزاکت سے دوہری کمر ہو گئی

اتنے میں جہاں آرا بیگم پائنچے اُٹھائے نازوادا سے آئیں مس فیرنگٹن نے اُن کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور کہا آئیے ہم اور آپ ناچیں۔

حسن آرا۔ (دانتوں کے تلے انگلی دباکر) اے ہے کہیں ایسا اماں جان کے سامنے نہ کہنا۔

جہاں آرا۔ آپ لوگ گیند بھی کھیلتی ہیں۔

مس ۔ ہاں ہاں۔ لان ٹینس۔ کرکٹ۔ بیڈ منٹن۔

سپہر آرا۔ ایں! اپشتو بولنے لگیں۔

حسن آرا۔ ہم لوگ ان باتوں کو عیب سمجھتے ہیں۔ عورت اور مرد میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔

مس۔ ول۔ اپنے اپنے ملک کی یہ رسم ہے

حسن آرا۔ (کرسی پر بیٹھ کر) اوئی۔ ہمارا تو دم ہی نکل جائے۔

جہاں آرا۔ ہم تو ہانپنے لگیں بہن۔

سپہر آرا ایک بنچ پر بیٹھنے کو تھیں کہ ہمایوں مالی جھپٹ کر کرسی لے آیا۔

سپہر آرا۔ ارے مالی۔ ذری خوشبودار پھول توڑ لے آ ایک رومال میں باندھ کر مغلانی کو دے دینا کہ ہمارے سرہانے پر رکھ دے۔

ہمایوں مالی نے جوہی اور بیلے چنبیلی کے پھول توڑ کر مغلانی کو دیئے اور کہا سپہر آرا بیگم کے سرہانے رکھ دینا۔ انھیں پھولوں کے ساتھ رومال میں ایک رقعہ بھی باندھ دیا۔

رقعے کا مضمون یہ تھا:۔

جانِ من!

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بساکیں دولت از گفتار خیزد

اور اگر دیدار اور گفتار دونوں نصیب ہوں تو یہ آتش شوق تیز تر گردد۔ کشتۂ خنجر ناز کا اگر علاج منظور ہو تو جلا لو۔ ورنہ ایک بے اعتنائی دم کے دم میں عاشق خستہ جان کا کام تمام کر دے گی۔ اور مسیحا کی مسیحائی بھی کام نہ آئیگی۔

اتنے میں مس فیرنگٹن بھی رخصت ہوئیں اور جلسہ برخاست ہوا۔

ہمایوں باغبان کو اپنے طالع فرخ پر ناز تھا کہ سپہر آرا بیگم کو بے حجاب و براگندہ نقاب دیکھا اور جب جہاں آرا نے کہا کہ ہمایوں فر تو نہیں ہے اور سپہر آرا نیکی ہو کر بولیں کہ ایسے ایسے باغبانوں کو ان پر سے قربان کر دوں تو کمال مسرور ہوئے اور باغبان سے یوں گفتگو کرنے لگے۔

ہمایوں۔ آج تم کو اس قدر انعام دوں گا کہ جی خوش ہو جائے گا۔

باغبان۔ حضور ہی کی بدولت سب کچھ ملتا ہے۔

ہمایوں۔ وہ پیازی دوپٹا اوڑھے کون بیٹھی تھیں؟

باغبان۔ سپہر آرا بیگم۔ یہ بیگم صاحب کی چھوٹی صاحبزادی ہیں۔

ہمایوں۔ کیا ہر روز باغ میں آتی ہیں؟

باغبان۔ جی ہاں کسی دن ناغہ نہیں ہونے پاتا۔ صبح و شام سیر کے لیے آتی ہیں۔

ہمایوں۔ تو ہم بھی ہر روز آیا کریں گے۔ کچھ ہرج تو نہیں ہے۔

باغبان۔ بس اسی طرح پر آنا ہوگا پورے مالی بنے ہوئے۔

اتنے میں جھروکے سے سپہر آرا نے باغبان کو آواز دی۔

سپہر آرا۔ باغبان! مالی!! مالی!!!

باغبان۔ حضور حکم۔

سپہر آرا۔ اے یہ مالی کون آیا تھا ہمایوں ہمایوں؟

باغبان۔ حضور میرا بھانجا ہے۔

سپہر آرا۔ اس کو نوکر رکھ لو۔

ہمایوں باغبان کھڑے سُن رہے تھے۔ باغبان نے کہا حضور وہ سرکار ہی کا نونک کھاتا ہے۔ یوں بھی نوکر ہے اور یوں بھی نوکر ہے۔

سپہر آرا۔ خوش سلیقہ آدمی ہے مگر ہمایوں تو مسلمانوں کا نام ہوتا ہے۔

باغبان۔ ہاں حضور وہ مسلمان ہو گیا ہے۔

دوسرے دن شام کو سپہر آرا اور حسن آرا باغ میں آئیں تو دیکھا چبوترے پر دو نقشے کھینچے ہوئے ہیں۔

سپہر آرا۔ اے باجی جان شطرنج کے نقشے ہیں؟

حسن آرا۔ ایں! ہاں ہیں تو شطرنج ہی کے نقشے۔

سپہر آرا۔ (مسکرا کے) یہ بنائے کس نے؟

حسن آرا۔ کل تک تو نہیں تھے۔

سپہر آرا۔ اہا ہا۔ ہم سمجھ گئے باجی جان۔ یہ ہمایوں باغبان نے بنائے ہونگے۔

حسن آرا۔ ہمایوں باغبان کون ہے؟

سپہر آرا۔ اے وہ جوان سا باغبان ہمارے باغبان کا بھانجا نہیں تھا جس کو جہاں آرا نے ہمایوں فر بنایا تھا۔

حسن آرا۔ آہا۔ وہ؟

باغبان۔ ہاں حضور اُسی نے بنایا ہے۔

سپہر آرا۔ دیکھو تو باجی۔ نقشے دیکھو ذری۔

حسن آرا۔ بڑا ٹیڑھا میڑھا نقشہ ہے۔

سپہر آرا۔ اس کو حل نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔

حسن آرا۔ کچھ زبردستی ہے؛

سپہر آرا۔ اے ہے۔ اتنی بڑی شطرنج کھیلنے والی ہو اور ذری سا نقشہ حل نہ ہو سکے گا۔

حسن آرا۔ تم بھی تو کھیلتی ہو تمہیں حل کردو۔

باغبان۔ حضور اگر حکم ہو تو وہ اور اور نقشہ بھی بنائے۔

حسن آرا۔ ذری غور کرنے دو۔

سپہر آرا۔ جب جانیں کہ حل ہی کرلو۔

حسن آرا۔ ہم سے پہلا نقشہ تو نہ حل ہو سکے گا۔ دوسرے کو دیکھیں۔

ہمایوں باغبان دل ہی دل میں ہنس رہے تھے کہ منہ مانگی مراد پائی۔ اب سپہر آرا سے گفتگو کرنے کا خوب موقع ملے گا۔ مگر انھوں نے ٹھان لی کہ کچھ دن تک رات کو صورت دکھائیں گے۔ دن کے وقت قریب نہ جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ راز کھل جائے۔

حسن آرا (باغبان سے) یہ تمھارے بھانجے کو شطرنج بازی کس نے سکھائی؟

باغبان۔ حضور، اُس کو شوق ہے لڑکپن سے کھیلتا ہے۔

سپہر آرا۔ یہ وصلی کیسی ہے؟

باغبان۔ اسی نے لکھی ہے حضور۔

اس پر یہ اشعار لکھے تھے:۔

دیکھنا مہندی ملی اس سیمبر کی انگلیاں	سیم کا سارا بدن ہے اور زر کی انگلیاں
سورۂ قدر آ کے تربت پر پڑھا میں جی اٹھا	واہ کیا معجز نما ہیں کیا اثر کی انگلیاں
غیرتِ شیریں ہے تو فرہاد وہ شیریں ادا	گل شکر ہیں ہونٹھ پوری نیشکر کی انگلیاں

کر دیا سیراب تا سنح رم میں فوج تشنہ کو
چشمہائے فیض تھیں خیر البشر کی انگلیاں

سپہر آرا۔ اس کا بھانجا بھی خوش مذاق معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا۔ (بے اعتنائی کے ساتھ) ہاں ہو گا۔

سپہر آرا۔ کیا! ہو گا؟

حسن آرا۔ اب اس ذکر کو جانے دو۔

سپہر آرا۔ کیوں۔ کیوں۔ کیوں باجی جان تمھارے چہرے کا رنگ کیوں بدل گیا؟

حسن آرا۔ کل اس کا جواب دوں گی۔

ہمایوں باغبان کے ہوش اُڑ گئے، سمجھے کہ حسن آرا نے بھانپ لیا۔ اب خدا ہی خیر کرے۔ سپہر آرا نے بھولے پن کے ساتھ کہا۔ نہیں باجی جان آخر بتاؤ تو تم اس وقت خفا کیوں ہو۔

حسن آرا۔ یہ مرزا ہمایوں فر کی کارستانی ہے۔

سپہر آرا۔ ایں! اوئی اللہ یہ ہتھکنڈے۔ واہ واہ وا۔

حسن آرا۔ ہمایوں باغبان! ہونہہ اچھا نام رکھا (باغبان سے) سچ سچ بتاؤ یہ ہمایوں کون ہے۔ خبردار جو جھوٹ بولا۔ سچ سچ کہہ دے۔

سپہر آرا۔ بھانجا ہے تیرا؟

حسن آرا۔ بتا خاموش کیوں ہے؟

باغبان۔ حضور حضور۔

حسن آرا۔ کیا حضور حضور لگائی ہے بتاتا نہیں۔

باغبان۔ وہ مسلمان ہوگیا تھا اور حضور میں مالی نہیں ہوں۔ قوم کا کائستھ ہوں مگر گھر بار چھوڑ کر باغبانی کرنے لگا۔ ہمارا بھانجا پڑا لکھا ہو تو تعجب کی کونسی بات ہے۔

حسن آرا۔ چل جھوٹے سچ سچ بتا۔ نہیں اللہ جانتا ہے کھڑے کھڑے نکلوا دوں گی۔

سپہر آرا اپنے دل میں سوچنے لگیں کہ ہمایوں فر نے بطور پرچھا کیا۔ حسن آرا سے کہا باجی جان آخر اس کو مالی بننے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اب تو ان کو خبر پہنچ ہی گئی ہے کہ نکاح ضرور ہوگا، پھر اب بے صبری کیا ہے۔ وہ بھی میں کوئی جلد باز آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ دھوکہ دے کر گھلے مل گئے اب کی باغبان بن کے آئے۔

جہاں آرا۔ اے ہے بہن ہم نے اس روز مارے گرمی کے دوپٹا بھی اتار رکھا تھا۔ اللہ گواہ ہے سزا دینے کے قابل آدمی ہے۔ بھلا منسی کے یہ معنی نہیں کہ گھر بستیوں میں مالی یا چمار بن کے دھنسے۔ گھر سے نکال دینے کے لائق ہے۔ اس کو کچھ چٹا یا ہوگا جب ہی پھنس گیا۔

باغبان خوف سے کانپنے لگا۔ ہمایوں فر نے کہا تم گھبراؤ نہیں ہم سمجھ لیں گے اندیشے کا مقام نہیں۔ یہ کہہ کر ہمایوں فر چپکے سے چلے گئے۔

دوسرے روز شہزادہ بلند ارادہ مرزا ہمایوں فر بہادر نے باغبان کو بلوایا اور کہا آج پھر ہم کو لے چلو۔

باغبان۔ لے چلنے میں تو غلام کو عذر نہیں مگر کل آپ دیکھ ہی چکے۔

ہمایوں۔ تم کو خوف کیا ہے؟

باغبان۔ حضور غریب آدمی ہوں۔

ہمایوں۔ پھر وہ موقوف کر دیں تو ہم نوکر رکھ لیں گے۔

باغبان۔ حضور میں نوکری کو نہیں ڈرتا عزت کو ڈرتا ہوں۔

ہمایوں۔ واہ کیا مہینا پاتے ہو؟

باغبان۔ حضور چھ روپیہ ملتے ہیں۔

ہمایوں۔ آج سے چھ روپیہ ہماری سرکار سے زندگی بھر ملا کریں گے۔

باغبان۔ (سلام کرکے) حضور کیا کہنا خداوند کا۔ مگر میں اپنی عزت کو بہت ڈرتا ہوں۔

ہمایوں۔ آج ہم کو چلنے دو۔ ہمارے آنے کے بعد کچھ اور تو نہیں کہتی تھیں۔

باغبان۔ آپس میں کچھ باتیں کرتی تھیں میں سن نہیں سکا۔ لیجئے اب شام کو میں آؤنگا اور اپنے ساتھ ہی حضور کو لے جاؤں گا۔

ہمایوں۔ بہتر۔ تم ڈرو نہیں۔ ڈرنے کی بات نہیں ہے۔

باغبان سلام کرکے روانہ ہوا۔ ہمایوں فر نے یہ شعر ایک پرچے پر لکھا۔

من تائب و من زاہد لیکن چہ کنم دل را — با طفلِ خوباں دزدیدہ سرے دارد

یہ پرچہ شہزادے ہمایوں نے اپنے پاس رکھا اور دعا مانگنے لگے کہ خدایا شام ہو۔ بار بار کمرے کے باہر جاتے تھے۔ بار بار گھڑی کی طرف دیکھتے تھے۔

اب سنئیے کہ سپہر آرا بیگم تمام رات سوچا کیں کہ یا خدا میں کس سے پوچھوں کہ یہ ہمایوں کون ہے گو رات کا وقت تھا مگر شکل صورت

سے رئیس معلوم ہوتا تھا۔ آدمی خوشرو ہے اور قد و قامت ہمایوں فر کے برابر ہے۔ سوچتے سوچتے یہ تدبیر سوچی کہ باغبان سے دریافت کریں صبح کو پردہ کرا کے باغ میں تنہا ٹہلنے لگیں۔ باغبان کو بلایا اور یوں کہا۔

سپہر آرا۔ ہیرا یہ کل گلدستہ کس نے پیش کیا تھا؟

باغبان۔ حضور کہا ہے نہ کہ بھانجا ہے میرا۔

سپہر آرا۔ چل جھوٹے۔

باغبان۔ حضور آنکھوں کی قسم کھاتا ہوں۔

سپہر آرا۔ تیرا بھانجا اور پڑھا لکھا بس بیٹھ بجی۔

سپہر آرا نے باغبان کو ڈانٹنا شروع کیا۔ ہیرا بیچارہ کانپ رہا تھا کہ اب آج اپنے بھانجے کو کیونکر لاؤں۔ ہمایوں فر نے چاٹ ایسی دی تھی کہ ہیرا اُن کا دم بھرتا تھا۔ ایک اشرفی پائی اور چھ روپیہ مہینا عمر بھر کے لیے مقرر ہو گیا۔ سپہر آرا چاہتی تھی کہ ہیرا صاف صاف بتا دے کہ ہمایوں فر ہی آئے تھے تو انعام بھی دے اور بچا بھی لے۔ ہیرا کو کیا معلوم تھا کہ سپہر آرا بیگم کی دلی خواہش یہ ہے۔

ہیرا۔ ناحق اپنے بھانجے کو بلایا۔

سپہر آرا۔ کچھ دوانہ (دیوانہ) ہوا ہے بڈھے۔ بھانجے کو بلایا! ہونہہ تیرا بھانجا اور اس قدر خوش سلیقہ!

ہیرا۔ اب میں کیا کہوں۔

سپہر آرا۔ کہے گا کیا، تیرا بھانجا اور ایسا حسین ہو۔

ہیرا۔ اچھا بیگم صاحب پھر اگر میرا بھانجا نہ ہو تو ناک کٹوا ڈالوں۔

سپہر آرا۔ صاف صاف بتا دے ہیرا۔ بی مغلانی اس موئے کو ذری سمجھا تو دو۔

مغلانی نے ہیرا کو علیحدہ لے جا کر سمجھانا شروع کیا۔ تجھ کو کیا ہے تو کہہ کیوں نہیں دیتا۔ آخر ش معلوم تو ہو کہ تھا کون؟ اگر سچ سچ بتا دے تو انعام دلوا دوں یہ سامنے والے تھے نہ شہزادے؟

باغبان کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اوہ۔ یہاں تو سب تاڑ گئے اب مفر محال ہے۔ مگر خیر ہمایوں فر تو چھ روپیہ دیئے جائیں گے باغبان کو اس امر کا بہت خیال تھا کہ کہیں بدنام نہ ہو جاؤں۔ بوڑھا آدمی ہوں۔ اس بڑھوتی میں کلنک کا ٹیکا لگے تو کہیں کا نہ رہوں۔

مغلانی۔ ارے بتا دے جو ہمایوں فر آئے ہوں تو سپہر آرا بیگم خوش ہو جائیں۔ اِن کا اُن پر اُن کا اِن پہ دل آیا ہے۔

ہیرا۔ مجھ اسّی برس کے بوڑھے کو تم بناتی ہو۔

مغلانی۔ جناب امیر کی قسم جھوٹ نہیں کہتی۔

ہیرا۔ ہاں آئے تو وہی تھے۔

مغلانی۔ حضور ذرا ادھر آئیے اس نے انعام کے قابل کام کیا ہے۔

سپہر آرا۔ (ہنس کر) اے واہ ہے۔

مغلانی۔ حضور انعام دلوائیں۔

سپہر آرا۔ اے تو کس بات کا انعام! کچھ سڑن ہے۔ واہ واہ!

مغلانی - اب جو کچھ کہنا ہو کہہ دیجیئے ۔ نہیں کوئی آ جائے گا۔
سپہر آرا - آج جب وہ آئیں تو یہ کاغذ دے دینا۔
اس کاغذ پر یہ اشعار لکھے تھے۔

چو رنگین بود جوشِ خلوت نازونیاز امشب　　　تو میکردی عتاب از ناز و من تقصیر میگفتم
تو خنداں ہمچو گل غنچہ سان دل تنگ غم بودم　　　تو از بیداد من از نالۂ شبگیر میگفتم
فلک خاکِ تراخشتِ خم من ساخت اے واعظ　　　تو از تدبیر میگفتی من از تقدیر میگفتم
مزاج نازک او بر نمی تابد غوغا را　　　سخن در محفلش گر از لب تصویر میگفتم

چو شمع از سوز دل مے سوختم من تا سحر گویا
گہے از اشک و گہ از آہ بے تاثیر میگفتم

باغبان - (تخلیئے میں ہمایوں فر سے) خداوند بہت خفا ہوئیں کہ یہ کون تھا اور کہا کہ ہم موقوف کر دیں گے۔
ہمایوں - او ہ اس سے تم کو کیا واسطہ؟
باغبان - حضور مجھے آدھ سیر آٹے سے مطلب ہے ۔ بس اور کچھ نہیں۔
ہمایوں - ہمیں چلنے تو دو۔
جھٹپٹے وقت ہمایوں باغبان ہیرا باغبان کے ہمراہ گئے ۔ سپہر آرا بیگم نکھر کر منتظر تھیں کہ ہمایوں فر آئیں تو آنکھیں سینکیں آب رواں کا باریک دوپٹا عطر موتیا سے بسا ہوا تھا۔
اتنے میں ایک مغلانی نے کہا۔ لیجیئے آ گئے ۔ ہیرا نے پہلے وہ شعر دکھائے جو سپہر آرا بیگم نے لکھے اور بھی خوش ہوئے۔
حسن آرا - ہیرا ذری یہاں آؤ۔
ہیرا - حاضر ہوں حضور (ہاتھ جوڑ کر) حکم۔
حسن آرا - تمہارا بھانجا آیا؟
ہیرا - حاضر ہے حضور ۔ وہاں بیٹھا ہے۔
حسن آرا - بلاؤ!
باغبان - (ہمایوں کو بلا لایا)
ہمایوں نے آداب عرض کیا اور گردن جھکائی۔
حسن آرا - تمہارا کیا نام ہے جی؟
ہمایوں - ہمایوں۔
حسن آرا - ہمایوں؟ کیوں صاحب ہمایوں نام ہے؟ مکان کہاں ہے؟
ہمایوں - کیا عرض کروں!

گھر بار سے کیا فقیر کو کام !　　　کیا لیجیئے چھوڑے گاؤں کا نام

حسن آرا - اخاہ! یہ مالی شاعر بھی ہے خیر سے ۔ کیا شعر بھی کہتے ہو؟

ہمایوں ۔ حضور کچھ بک لیتا ہوں۔
حسن آرا ۔ کچھ سناؤ۔
ہمایوں ۔ اگر اجازت ہو تو زمین پر بیٹھ جاؤں؟
سپہر آرا ۔ بڑے گستاخ ہو تم!
حسن آرا ۔ اچھا مونڈھا لو اور وہیں چبوترے کے نیچے بیٹھو۔ کہیں نوکر بھی ہو؟
ہمایوں ۔ جی ہاں حضور نوکر ہوں۔ آجکل شہزادہ ہمایوں فر کی ہمشیرہ کے ہاں نوکر ہوں۔

اس فقرے پر حسن آرا اور سپہر آرا مسکرانے لگیں۔ جہاں آرا بیگم اور گیتی آرا بیگم اس فقرے کا مطلب نہیں سمجھیں، مگر ہمایوں فر نے خوب کہی۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ شہزادہ ہمایوں فر حسن آرا اور سپہر آرا سے عورت بن کر ایک بار گلے مل آئے تھے۔ اتنے میں بڑی بیگم آ گئیں۔ ہمایوں فر مارے خوف کے بھاگ گئے۔

نوک جھونک

دوسرے روز شہزادہ ہمایوں فر بیتابانہ کوٹھے پر آئے اور اس صنم خانہ عشرت کا شانہ کی طرف نظر ڈالی تو مہتابی پہ اداسی چھائی ہوئی۔ کلیجہ تھام کے بیٹھ گئے۔ درد دل چمکنے لگا۔ دعا مانگی کہ بار خدایا ذرا تو جھلک دیکھ لوں۔

آخر کار جذب دل کی کشش نے تاثیر دکھائی۔ طرفۃ العین میں ایک نورانی شکل مہتابی پر نظر آئی۔ شہزادہ ہمایوں فر کے دل کی کلی کھل گئی، مُنہ مانگی مراد پائی۔

سپہر آرا دل سے تو چاہتی تھیں کہ ہمایوں فر کے چہرۂ زیبا پر نظر غلط انداز ڈالیں۔ مگر پھر بھی حیا مانع تھی۔ تھوڑی دیر تک مہتابی پر اٹھکھیلیاں کرتی زینے کی طرف آئیں۔ میرزا ہمایوں فر نے اشارے سے قسمیں دیں کہ دم بھر اور نہ جاؤ۔ لیکن وہ ایک ادائے دلربا کے ساتھ نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ ہمایوں فر نے مہتابی کو پھر خالی پایا تو کف افسوس مل کے رہ گئے۔ فوراً ہیرا مالی کو بلایا اور کہا آج تم جان پر کھیل جاؤ۔ سویرے ہی سویرے ہم کو لے چلو۔ باغ کے کسی چھپر میں بٹھا دینا۔ ہیرا کو چاٹ تو دے ہی چکے تھے۔ سوچ کر کہا حضور جان جو حکم تو ضرور ہے مگر چلیے کچھ پروا نہیں۔ دوسرے دروازے سے آپ کو لے چلوں۔ ہمایوں فر نے سادے کپڑے پہنے اور ہیرا کے پیچھے پیچھے چلے۔ ہیرا نے دروازہ کھول دیا اور چپکے سے اُن کو بلا لیا۔ ہمایوں فر جا کر ایک کھپریل میں بیٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حسن آرا اور جہاں آرا ہاتھ میں ہاتھ دے کر گلگشت چمن میں مصروف ہیں۔ اتنے میں سپہر آرا بھی ہرن کی طرح چھل بل کرتی ہوئی باغ میں آئیں۔

سپہر آرا۔ باجی جان! ابھی ہمایوں فر کوٹھے پر کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا تو اشارہ بازی کرنے لگے۔ آنچل میں منہ چھپا کر میں وہاں سے چلی آئی۔ رات دن یہ کوٹھے ہی پر ٹنگے رہتے ہیں۔ بیفکرے تو ہیں ہی۔

ہمایوں فر نے مسکرا کر اپنے دل میں یہ شعر پڑھا ؎

کچھ خبر بھی ہے تمھیں اپنے گرفتاروں کی
جان آنکھوں میں ہے اب عشق کے بیماروں کی

حسن آرا۔ تم کوٹھے پر کرنے کیا گئی تھیں؟ جان بوجھ کے جانے سے فائدہ کیا؟ اور زمانے بھر میں اپنے کو رسوا کرنا۔ اب نہ جانا بہن۔

سپہر آرا۔ اُن سے چھپ کے کہاں جاؤں گی۔ ابھی کل ہی رات کو امی جان سے باتیں ہو چکی ہیں۔ صبح و شام پیغام ہوا ہی جاتا ہے۔

جہان آرا۔ (مسکرا کر) اے لو۔ یہ تو صاف صاف طعنے دینے لگیں۔

حسن آرا۔ ایں! اہو ہو ہو۔ تو اب اماں جان سے صاف صاف کہہ دیں۔

سپہر آرا۔ باجی جان! اس معاملہ میں ہمیں چھیڑا نہ کیجیے بیکار۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ جہان آرا کی نظر شہزادے پر پڑی۔ خوشرو اور قوس ابرو جوان دیکھ کر جہان آرا ایک درخت کی آڑ میں ہو رہی اور اشارے سے حسن آرا کو دکھایا کہ اس کھپریل میں کوئی نامحرم بیٹھا ہے۔ حسن آرا نے جھانک کر دیکھا تو ہمایوں فر۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس غیرت مہر رشک ماہ کی شرم آگین نگاہ دیکھتے ہی ہمایوں فر نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ حسن آرا نے ہیرا کو للکارا

حسن آرا۔ بی مغلانی۔ ذری اس موئے باغبان کو بلاؤ۔ کیوں رے موئے نگوڑے کاٹے یہ کیا تیرے ہتھکنڈے ہیں۔ یہ کھپریل میں

کس کو لا کے بٹھایا ہے۔ سپند دلوائے گا کیا۔ ایک دفعہ طرح دی تو اب سر پہ چڑھ گیا۔

ہمایوں۔ معلوم نہ تھا کہ سرکار کے گلگشت کا کون وقت ہے۔

حسن آرا۔ ان باتوں سے ملیگا کیا تمھیں یہاں آکے آپ نے کیا نبایا؛

ہمایوں۔ یہی کیا کم ہے کہ جھڑکیاں اٹھائیں گھڑکیاں کھائیں۔

حسن آرا۔ آخرش شرم و حیا بھی کوئی شے ہے یا بیحیائی ہی کا آسرا ہے؛

ہمایوں۔ اب تو لحاظ ٹوٹ گیا۔ اگر قصور ہوا ہو تو معاف کیجیئے۔

ابھی نہیں ہے وہ تیرا مزاج داں صیاد   اسیر تازہ ہے صفدر خفا نہ ہوا تنا

حسن آرا اور جہاں آرا ایک چھوٹے سے خوشنما خس پوش بنگلے میں بیٹھیں اور حکم دیا کہ پردے ڈال دو۔ سپہر آرا بصد شوخی و دلربائی پائنچے اٹھا کر اس کھپریل کی طرف چلیں جہاں شہزادہ ہمایوں فر تاک میں بیٹھے تھے۔ چھاگل کی آواز سنتے ہی ہمایوں فر کے ہوش اُڑ گئے وہ جوبن وہ شوخ چتون کہ زاہد شب زندہ دار بھی دیکھے تو اُسی بت کا کلمہ پڑھنے لگے۔ شہزادے نے نظر بھر کر دیکھا تو تیر نظر کلیجے کے پار ہو گیا۔

رگ گل سی کمر لچکتی ہوئی   چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

سرو سا قد تو گل سے رخسارے   شانے بازو بھرے بھرے سارے

جب نظر سے نظر دوچار ہوئی
ایک برچھی جگر کے پار ہوئی

ہمایوں۔ (ہاتھ جوڑ کر) ایک نظر غریبوں کی طرف بھی ۔

کیا خدا داد حسن پایا ہے   آپ اللہ نے بنایا ہے

سپہر آرا۔ (اٹھلا کر) جوبن ہے بہ نام خدا پھر کسی کو کیا۔

اس مصرع برجستہ اور اٹھلانے پر ہمایوں فر کا بحر عشق جوش زن اور طائر دل نخچیر[1] پر محن ہوا۔ ہونٹوں پر جان آئی حاضر جوابی نے آتش جنوں اور بھی بھڑکائی۔

ہمایوں۔ او بت ترسا کبھی رحم بھی آتا ہے۔

سپہر آرا۔ عباسی۔ ذری ادھر تو دیکھو کوئی دوانہ یہاں آن بیٹھا ہے۔

عباسی۔ کہاں بیگم صاحب۔ دیکھوں۔ اوئی آپ کون صاحب ہیں (کھلکھلا کر) اے آخر یہ ہیں کون؟ کیا سبز قدم[2] پی ہے یا کالا پانی ہیں تو کچھ نشہ ہی کے طور (ہنس کر) حضور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ اے ہیرا۔ پوچھو تو یہ باغ میں اجنبی (اجنبی) گھس آتے ہیں۔ اور تو کانوں کان خبر ہی نہیں ہوتا۔ بڑھاپے میں ہوش و حواس سب جاتے رہے۔

ہیرا۔ تو کون اجنبی کون ہے؟ یہ تو بھانجا ہے میرا۔ کل بھی آیا تھا۔

عباسی۔ چل جھوٹے۔ مگر سنیئے حضور (ہمایوں فر سے) یہ ڈورے کہیں اور ڈالیے۔ سمجھے آپ۔ بس خیر اسی میں ہے کہ آپ تشریف لے جائیے۔ اللہ جانتا ہے تم پر رحم آتا ہے۔ ایں! یہ ڈھٹائی کوئی اس طرح کہیں جاتا ہے۔

---

[1] شکار صید۔ [2] بھنگ۔

سپہر آرا نے ہمایوں فر کو اشارہ کیا کہ اب یہاں سے جانا ہی اچھا ہے۔ ہمایوں فر نے آہستہ سے کہا ذرا ایک بات سُن لو۔ میں صدقے ایک ہی بات کہوں گا۔ دوسری بات کہوں تو زبان کاٹ ڈالو قسم لو۔

ہمایوں۔ بی عباسی تم ہمیں بھول گئیں۔ آج تو عرش پر سرکار کا دماغ ہے۔

عباسی۔ اے لو میں آپ کو جانتی کب تھی کس دن کی میری آپ کی جان پہچان ہے اور یہ ہمارا نام کس موئے نے ان کو سکھایا؟ واللہ اللہ یہ سکھائے پڑھائے آئے ہیں۔ یہ کیجئے۔ جب ہی ایسے ڈھیٹ ہیں آپ۔

ہمایوں۔ کبھی آغا طاہر کی سرکار میں نوکر تھیں۔ یاد کرو۔

عباسی۔ اخاہ حضور معاف کیجیئے اب اتنی دیر بعد پہچانا۔ حضور آج یہاں کہاں بھول پڑے۔ سویرے سویرے۔

ہمایوں۔ فقط باغ کی سیر کو آیا تھا۔ قضا دامنگیر ہے۔

سپہر آرا۔ ایں! اللہ نہ کرے۔ واہ بدمیتی[1] باتیں منہ سے نکالتے ہو۔

یہ محبت آمیز فقرہ کہہ کر سپہر آرا بھی بنگلے میں گئیں۔ اگر بس چلتا تو تمام دن نہ جاتیں مگر مجبور تھیں۔ خوف تھا کہ مبادا حسن آرا خفا ہو جائیں جہان آرا باتیں سنائیں۔ بنگلے میں جا کر بیٹھیں تو ایسی باتیں کیں کہ گویا ہمایوں فر کے آنے کی ان کو خبر ہی نہ تھی۔ پوچھا باجی جان وہ نقشے حل کیے۔ حسن آرا نے دبے دانتوں جواب دیا۔ نہیں کچھ غلط سلط سے معلوم ہوتے ہیں۔ آج کسی وقت غور کرونگی۔

ہمایوں فر سوچے کہ اب چلنا ہی بہتر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑیں۔ ہیرا باغبان کو بلا کر دو اشرفیاں دیں اور کہا دروازہ کھول دو تو ہم چلے جائیں مگر شام کو ہم سے ضرور ملنا۔ ہیرا نے سلام کیا۔ اشرفیاں لیں۔ دروازہ کھولا اور کہا چپکے سے چلے جائیے۔

اب سُنیئے کہ عباسی بکمال شوخی تیسرے دروازے سے نکل کر پچھواڑے جا کھڑی ہوئی۔ ادھر مرزا ہمایوں فر دروازے کے باہر آئے ادھر عباسی نے کہا۔ ارے! یہ کون ہے۔ ذری ٹھہر د تو سہی۔ ہمایوں فر ہکا بکا ہو گئے۔ ایں۔ ایں عباسی تم اور غل مچاؤ۔ واسطے خدا کے اب بولو چالو نہیں۔ بس ہم کو جانے ہی دو۔

عباسی۔ اے حضور میں فقط دل لگی کرتی تھی۔ آپ جائیں۔

ہمایوں۔ سپہر آرا بیگم پر جان جاتی ہے۔ عباسی اب کوئی فکر کرو۔

عباسی۔ جہان آرا بیگم کا اس وقت یہاں ہونا اچھا بھی ہوا بُرا بھی ہوا۔ انھوں نے سپہر آرا کو خوب للکارا کہ تم بڑی ڈھیٹ ہو۔ نامحرم سے بے جھجک باتیں کرتی ہو۔ ایسا دیدہ دلیر ہے۔ ان کی بڑی بہن نے ان کا جنبہ کیا اور کہا نہیں بہن انھوں نے ہمایوں فر کو دیکھا بھی نہ تھا خوب نوک جھوک ہوئی۔ آپ سے بھی اُن سے بھی۔

ہمایوں۔ بارے بخیر گذشت۔ ہاتھ پاؤں بچا کے چلے آئے۔

عباسی۔ اب حضور جائیں لونڈی کو دیر ہوتی ہے۔

شام کو جہان آرا بیگم نے کھانا کھانے کے وقت ذکر چھیڑا۔ بڑی بیگم نے کہا شریفوں میں یہ دستور نہیں کہ لڑکی والوں کی طرف سے پیغام ہو۔ مگر ہمایوں فر سعادت مند اور معقول پسند لڑکا ہے اور اولاد شاہ شہزادہ ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔

---

[1] منحوس۔

وہ شہزادے، ان کی ماں شہزادی اور پھر لڑکا ہونہار ہے۔ بدچلن نہیں، روپیہ بھی پاس ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے کسی شے کی کمی نہیں۔ مگر جب ان کی طرف سے پیغام بھی ہو۔ جہاں آرا بیگم خاموش ہو رہیں۔ مگر دل میں کچھ سوچتی جاتی تھیں۔ جب کھانا کھا کر فراغت پائی اور چاروں بہنیں اوپر کے کمرے میں جا کر بیٹھیں تو باہم میٹھی میٹھی باتیں ہونے لگیں۔

جہاں آرا۔ امی جان کیا جانے کس فکر میں ہیں۔ وہ پرانی ہی رسم کی پابندی کرتی ہیں اور یہ خبر ہی نہیں کہ کوئی ہمایوں، امی بن گرایا، کوئی کچہری میں جا کر بیٹھا ہے کوئی کوٹھے پر ڈورے ڈالتا ہے۔

گیتی آرا۔ ہے ہے جو امی جان سُن لیں تو تمہارا منہ نوچ ڈالیں کہ گھر میں رہنا مشکل ہو جائے۔

حسن آرا۔ ہے تو ایسا ہی۔ اب ہیرا کو ہم موقوف کر دیں گے۔

سپہر آرا اپنے دل میں سوچتی تھیں کہ عباسی کو گانٹھیں گے اور سمجھا بجھا کر بھیجیں گے کہ اپنی اماں جان سے کہہ کر پیغام بھجوائیں۔ دل میں کمال محظوظ تھیں کہ مراد دلی بر آئی۔ اب تھوڑے ہی دنوں میں دروازے پر شہنائی بجے گی رنگ رلیاں منائیں گے۔

جہاں آرا۔ سپہر آرا۔ شکرگزار تو ہماری نہ ہوئی ہو گی۔

سپہر آرا۔ بندگی، بس یا اور ایک بندگی کروں۔

حسن آرا۔ گویا بڑا احسان کیا۔ بہنوں پر بھی احسان ہوتا ہے۔

جہاں آرا۔ اے کیوں۔ ہوتا کیوں نہیں ہے۔

سپہر آرا۔ اب بڑی ہو کیا کہوں۔ کوئی برابر والی کہتی تو میں بھی جواب دیتی۔

اتنے میں عباسی اُودا دوپٹا پھڑکاتی ہوئی آئی۔ کہا حضور وہ بوکھل سا آدمی جو کچہری میں بیٹھا تھا نہ اُس نے بہت دق کیا۔ سپہر آرا نے پوچھا کس کو دق کیا، تم کو؟ کہا نہیں حضور واہ مجھ کو کیا نگوڑا دق کرتا۔ میں ٹھیک نہ بناتی۔

اب سنیئے کہ مغلانیاں اور محلدار خوشخبری سن کر سپہر آرا بیگم کے پاس گئیں۔ کہا مبارک ہو حضور۔ سپہر آرا انکھیوں چتونوں سے دیکھ کر بولیں۔ کچھ خیر ہے۔ بڑی بدتمیز ہو تم۔ عباسی بھی چمک کر آئی اور ایک مغلانی پر پلچ پڑی۔ اے واہ سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔ عمر بھر شہزادیوں (اب زادیوں) میں رہیں مگر سلیقہ چھو نہیں گیا۔ اپنے گھر میں خدا جانے انسان کیا باتیں کرتا ہے۔ تم جا کے ڈھنڈھورا پیٹ آؤ۔ اور تو اور ہمیں ان بڑھی پر ہنسی آتی ہے۔ بھوں تک کے بال سفید ہو گئے۔ بچپنے کی باتیں ابھی تک نہیں گئیں۔ کیا نزلہ کا عارضہ ہے جب ہی بال سفید ہو گئے۔ بوڑھی مغلانی یہ تقریر سنکر آگ ہو گئی اور پوپلے منہ سے بولی۔ لڑکی جینے کی باتیں کر جُمّا جُمّا (جمعہ جمعہ) آٹھ دن کی پیدائش اور باتیں کیسی کرتی ہے۔ بوڑھی بوڑھی ہم ایسے بوڑھے ہو گئے۔ اب اور بالوں کے سفید ہونے کی نہ کہو۔ تمہاری طرح کوئی مفلس تو رہے نہیں۔ ایمان کی قسم ہمارے ابا بھی شجاع الدولہ کی ذریات میں سے تھے۔ خاتون جنت کی قسم دو دو تولے عطر بالوں میں ڈالتی تھی اور سولہ روپیہ سیر سے کم کا تیل جس نے بالوں میں ڈالا ہو اس سے خدا سمجھے۔ بال تو سفید ہوا ہی چاہیں۔

عباسی۔ (انگلیاں شکا کر) اوئی یہ عطر سے بال سفید ہو گئے؟ ابھی ننھی سی ہیں آپ بھلا کیوں نہیں۔

مغلانی۔ اب تمہارے منہ کون لگے۔ زمانے بھر کی آوارہ۔

عباسی اس فقرہ پر آگ بھبوکا ہو گئی اور جھپٹی تو دوپٹا زمین پر گر پڑا۔ چہرہ مارے غصے کے تمتمانے لگا۔ اتنی بے نقطہ سنائیں کہ مغلانی کے آئے حواس غائب ہو گئے۔ حسن آرا اور جہاں آرا نے تو تعجب کر کے دوپٹا اوڑھایا اور کہا۔ اے ہے کوئی ایسا جامے سے گزر جاتا ہے تم اس وقت اپنے آپے ہی میں نہیں رہیں۔

عباسی۔ حضور کے قدموں کی قسم میری طرف سے پہل نہیں ہوئی یقین نہ آئے تو سپہر آرا بیگم صاحب سے دریافت کر لیجیے۔ میں نے تو یوں ہی ایک بات کہی۔ بس آؤ دیکھا نہ تاؤ اس قدر گالیاں دیں کہ میرا اللہ ہی جانتا ہے۔ ان کے مزاج میں اس بڑھاپے میں اتّی (اتنی) گرمی ہے تو ہمارے تو ابھی گرما گرمی کے دن ہی ہیں۔

سپہر آرا۔ نہیں ہم نے آج تک بی مغلانی کی زبان سے ایسی بات نہیں سُنی تھی۔ عباسی کو کیا، زمانہ بھر کی آوارہ ہے۔ خیر لفظوں میں آوارہ اور خام پارہ کی کیا گفتگو ہے۔

حسن آرا۔ یہ بات کیا ہوئی آخر چھیڑ کس کی تھی۔

عباسی۔ اے حضور میں تو نہ بولی نہ چالی۔ آپ ہی آپ بگڑ اٹھیں۔

جہان آرا۔ یہ تو تم ناحق کہتی ہو عباسی۔ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی۔ بھلا بجا کے دکھا تو دو۔

عباسی۔ خفا مجھ سے اس پر ہوئیں کہ بوڑھی کیوں کہا۔ اپنے حساب میں ابھی بارہ ہی برس کی ہیں۔ کہنے لگیں کہ بال سفید ہو گئے تو کیا ہوا۔ جو زیادہ عطر ملے گا اس کے بال سفید ہو جائیں گے۔ میں پوچھنے ہی کو تھی کہ بال تو عطر سے سفید ہو گئے اور یہ مرکا ہے سے ملنے لگا (ہنس کر) توبہ۔

جہاں آرا۔ ہاں کہنا تو تھا۔ چوک کیوں گئیں۔

عباسی۔ حضور میں نے کہا او چھیں گی۔ ناحق بن ناحق کو جھگڑا بڑھانے سے کیا مطلب۔

دِل افگندیم بِسمِ اللہِ مجریٰہا و مُرسٰہا

روسیوں کی قید سے ایک رات موقعہ پاکر میاں آزاد نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر مرکب سُبک عنان برجولان کو دریائے زخار میں ڈالا۔ یا قسمت یا نصیب کہہ کر چلے۔ قدم قدم پر خوف کھاتے تھے۔ بہت آہستہ آہستہ جاتے تھے کہ مبادا کوئی روسی دیکھ پائے غل مچائے گھوڑا پیچھے دوڑائے دریا میں غنیم سے لڑیں اُلٹی آنتیں گلے پڑیں۔ پندرہ بیس قدم جاکر گھوڑا ہنہنایا۔ اپنے سائے سے کسی قدر بھڑکا پیچھے آیا۔ آزاد سوچے کہ کس مصیبت میں جان ہے اِدھر ٹاپو اُدھر میدان ہے۔ ذرا خبر ہو جائے تو پہرے والا گولی چلائے۔ بارِ یا مشکل گھوڑا ذرا اڑ گیا مگر آزاد چمکار کر راہ پر لائے۔ پھر خائف ہوئے کہ گھوڑے کی سواری اور دریا کا واسطا اور اندھیری رات ہے۔ شب تار رشکِ ظلمات ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ جوں توں کر کے چلے قہرِ درویش برجانِ درویش اتنے میں رعد نے گرجنا شروع کیا اور پورب کی سمت بجلی اس زور سے لوکی کہ الٰہی توبہ۔ توسنِ صبا رفتار و طاؤس نگار برق کی چشمک زنی سے بیقرار ہوا اور پھر ہنہنانے لگا اُدھر آواز رعد اِدھر شیہۂ[۱] فرسِ گلگوں نژاد۔ آزاد سخت تکلیف میں تھے کہ یا الٰہی اب کیا کروں پورب کے رخ جانا ہے اور اسی سمت بجلی چمک رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں کالی کالی گھٹا چو طرفہ چھا گئی اور ننھی ننھی بوندیں بھی پڑنے لگیں اب ستم کا سامنا ہے۔ نیچے دریا اوپر بادل۔ اِدھر اُدھر غنیم کی فوج آزاد یکہ و تنہا بیک بینی و دو گوش۔

اب سنئیے کہ باد مخالف چلنا شروع ہوئی۔ اور آزاد کو اس قدر عرصۂ دراز کے بعد اب معلوم ہوا کہ وہ چڑھاؤ پر جاتے ہیں رہے سہے ہوش اور بھی فضرد ہوئے۔ ناکامی اور نامرادی چو طرفہ مجسم نظر آنے لگی۔ اب یقین واثق ہو گیا کہ زندگی محال ہے۔

اب سنئیے کہ اِدھر برق و باراں نے ستم ڈھایا اور اُدھر موجوں کی جولانی اور دریائے بلا خیز کی طغیانی نے طرفہ آفت بپا کی۔ سچ ہے۔

آزاد کبھی پیشتر اس دریا کی صورت سے بھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ سوچے کہ کدھر جاؤں اور کدھر نہ جاؤں۔ فکر عمیق نے ذرا مدد نہ دی عقل بھی غوطے کھا یا کی۔ اتنے میں رم جھم مینہ برسنے لگا۔

حضرات ناظرین! قیامت کا سامنا ہے یا نہیں۔ آزاد پاشا اس بیکسی اور بے بسی کی حالت میں پشتِ توسن سے گریں۔ کیسا سانحہ جگر دوز ہے۔ اُف ایسا طنّاز چھیلا خوش رو جوان اور یوں گرداب تباہی میں آ گئے۔ آزاد پاشا گرے اور گرتے ہی سنبھلے پیراک تو تھے مگر اس مصیبت کے عالم میں دریا پیرنا دل لگی نہیں ہے اور دریا بھی کون زخار تھا، جس کا اور نہ چھور۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ چڑھاؤ کا ٹنا اور بھی قیامت ہے۔ آزاد پاشا شہ زور تو تھے ہی بسم اللہ کہہ کر کھڑی لگاتے ہوئے چلے۔ مگر پانی کا وہ زور تھا اور ہوا کی وہ تیزی کہ موج کے وہ تھپیڑے اُن کو خس و خاشاک کی طرح اِدھر اُدھر بہائے پھرتے تھے۔ دس قدم بہزار خرابی گئے اور پانی نے بیس قدم پیچھے ہٹا دیا۔ کبھی ملاحی چیرتے تھے کبھی کھڑی لگاتے تھے۔ مگر دس قدم اِدھر یا دس قدم اُدھر ہوش پرّان حواس غائب کرتے دھرتے کچھ بن نہیں پڑتی تھی۔

---

[۱] گھوڑے کا ہنہنانا۔

بیماری کے سبب سے نقیہ اور ماہکان تو ہو ہی گئے تھے کچھ دیر کے بعد دم پھول گیا۔ اب ڈوبے۔ خدا بچائے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ بس اب کوئی دم کے مہمان ہیں تو جان پر کھیل کر کنارے کی طرف جانے کا قصد کیا۔ آٹھ دس بار ناکام ہوئے۔ آخر کار گیارھویں بار جبکہ ڈوبنے ہی کے قریب تھے حسن اتفاق سے ان کا پاؤں تہ پر پڑا اور زور کرکے یہ کنارے تک آئے تو شل۔ ادھر مرے آتے ہی ریت پر گر پڑے تو بیہوش۔ ایک گھنٹہ بعد ہوش آیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ چاندنی نکھری ہوئی ہے اور ان کے پاؤں کنارے پر اس مقام پر ہیں جہاں دریا کا پانی آن کر برجستہ لغفقری[1] واپس جاتا ہے۔ پاؤں کی انگلیوں کی کبھی کبھی پابوسی کرتا ہے۔ اُٹھے تو دیکھا کہ ایک سوار کلے پر کھڑا ہے ہوش اُڑ گئے بھاگنے ہی کو تھے مگر سوار سے بھاگ کے کہاں جاتے، بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان کا مشکی گھوڑا تھا سوار نہ تھا۔ ہنس کر گھوڑے کے قریب گئے اور گردن ہاتھ پھیر کر کہا شاباش! اچھے وقت ملے مگر کہیں پھر دغا نہ دینا۔ گھوڑا ہنہنایا انھوں نے پھر گردن پر ہاتھ پھیرا اور کہا شاباش خوب ساتھ دیا غازی مرد۔

دو گھنٹے کے بعد میاں آزاد گھوڑے پر سوار ہوئے اور راتوں رات دریا کے کنارے کنارے چلے۔ سحر کاذب کے وقت انھوں نے ذرا دم لیا اور پھر چلے تو تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ مقام ملا جہاں شکار کھیلتے ہوئے کشتی پہ گئے تھے۔ جان میں جان آئی اور آگے بڑھے تو ایک ترکی سوار ملا۔

سوار۔ السلام علیکم۔ بحمد اللہ کہ مع الخیر واپس آئے، مگر یہاں تو خبر مشہور تھی کہ قید کر لیے گئے۔

آزاد۔ اب دم لوں تو کُل حال بتاؤں خدا نے بچایا بڑی مصیبت سے دوچار ہوا تھا مگر اس کی بندہ نوازی کے صدقے کہ جان بچا کر بخیریت واپس آیا۔

سوار۔ اب قلعہ میں اور فوج آئی ہے اب لشکر جرار ہمارے پاس ہے۔

قلعہ معلّیٰ میں آزاد پاشا داخل ہوئے تو سواروں اور پیادوں اور افسروں نے دوڑ دوڑ کر استقبال کیا۔ علیفو پاشا نے جھپٹ کر گود میں اُٹھا لیا۔ چو طرفہ خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔

آزاد۔ کوئی اٹھائیسویں روز چھٹکارا ملا۔ اُف مرمٹا۔

علیفو۔ اجی اب چل کے رنگ رلیاں مناؤ۔ سپاہی کے لیے تلوار کے منہ مزا مزاج ہے۔ ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

آزاد۔ اب حالاتِ جنگ تو بتائیے،

علیفو۔ ہم نے اڑتالیس آدمی گرفتار کیے اور ہمارے صرف سات آدمی روسی پکڑ لے گئے۔ ایشیائے کوچک میں یلان ترکی نے علم فتح نصب کر دیئے اور روسیوں کو اس جوانمردی سے ہٹایا کہ بول گئے۔

آزاد۔ ہم نے روسی لشکر کی اکثر باتیں اس قید میں دریافت کیں۔ واقعی بڑے جرار آدمی ہیں۔ میدان کارزار سے ان کے قدم نہ ہٹیں گے۔

اتنے میں ایک افسر نے آزاد سے کہا کہ آپ کے نام ایک خط آیا ہے مگر ہم نے بھانپ لیا کہ کسی معشوق نے بھیجا ہے خط سے بہشت کی لپٹیں آتی ہیں۔ آزاد معاً تاڑ گئے کہ حسن آرا بیگم کا خط ہوگا۔ فرط بیقراری و بیتابی سے کہا واسطے خدا کے جلد لاؤ۔ افسر موصوف نے خط دیا تو آزاد پاشا کا دماغ طبلۂ عطار بن گیا۔ کئی بار بوسے لیے۔ لفافہ دیکھا تو حسن آرا کا نستعلیق خط۔ باچھیں کھل گئیں۔ فرط ابتہاج سے ٹوپی اچھال دی۔

---

[1] الٹے پاؤں۔

خوشی اور رنج

اودھر ترکان تہمتن لشکر شکن اور ادھر روس کے جوانانِ جنگجو میدان نبرد میں بادل سرد و آہ پُر درد پڑے آنکھیں مانگتے تھے۔ دونوں فوجیں ضربتِ شمشیرِ آبدار سے سخت مجروح ہوئی تھیں۔ شام سے آدھی رات تک اس درجہ طاقت اور ہوش و حواس نہ تھے کہ ہل سکیں۔ کوئی بیہوش پڑا تھا کوئی سسک رہا تھا کوئی مرغِ بسمل کی طرح تڑپتا تھا۔ مارے زخموں کے بدن رنگین اور دشت ستم لالہ زار تھا۔ ہر فرد بشر اجل سے دوچار تھا جب عروسِ شب کی زلف تا بکمر پہنچی تو زخمیوں نے العطش العطش کی آواز بلند کی جن لوگوں نے کم زخم کھائے تھے وہ مشکیزوں اور ابریقوں[1] میں پانی لائے۔ ڈاکٹروں نے زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ مگر اس درجہ ہڑبونگ تھا کہ روسی اور رومی میں ذرا فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ روسیوں نے رومیوں کو پانی پلایا۔ ترکوں کے مشکیزے آب سرد سے بھرے ہوئے روسی زخمیوں کے حصہ میں آئے۔ ترکی جراحوں نے مجروحین رُوس کا علاج کیا۔ روسی ڈاکٹروں نے ترکوں کا ہاتھ بٹایا۔ دو تین گھنٹے کے بعد روسی اپنے مورچے پر گئے، رومی[2] اپنے مورچے پر زخمی ڈولیوں میں لد کے آگئے۔

آزاد پاشا زخموں کے سبب سے سخت مصیبت میں تھے۔ آٹھ روز تک ان کی حالت ردّی رہی، یہاں تک کہ ایک دن ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اس حالتِ نومیدی میں آزاد نے حسن آرا کے نام ایک لفافہ منظوم لکھا جس کے حرف حرف سے حسرت اور یاسی ٹپکتی ہے سلفافہ بند کیا اور بصد خشوع و خضوع ایک افسر سے کہا کہ مہربانی کرکے یہ خط اسی وقت روانہ کر دیجیے۔ مگر خدا مسبب الاسباب ہے۔ پندرہ دن کے عرصے میں آزاد پاشا کے زخم بھر گئے۔ اور بیسویں روز پھر مورچے پر گئے۔ آزاد پاشا کی بسالت کا روز ایک نیا ثبوت ملتا تھا۔ جس روز ان کے زخموں میں جراح کامل فن نے ٹانکے لگائے کسی کو امید نہ تھی کہ آزاد اس سختی کو برداشت کر سکیں گے مگر واہ رے آزاد اُف تک نہ کی۔ جراح کا ہاتھ کانپنے لگا تو آزاد پاشا نے مسکرا کر کہا ایں! عمر بھر پیشہ کرتے رہے اور زخموں کو دیکھ کر ڈرتے ہو۔ یہ تو تماشائے جوانمردی ہے۔ ہمیں دیکھیئے کس جوانمردی کے ساتھ لڑے اور زخم کھائے۔ تم سے ٹانکے نہیں لگائے جاتے۔ جس وقت یہ کلمہ آزاد شیر دل کی زبان سے نکلا۔ حاضرین نے نعرۂ توصیف بلند کیا اور سپہ سالار عساکر سلطانی نے پیٹھ ٹھونک کر کہا شاباش۔ آفریں باد بریں ہمّت مردانۂ تو۔ سپہ سالار نے حضور وزیر جنگ کو بھی اس اشجع افسر کی جرأت سے اطلاع بخشی اور وزیر جنگ نے لطیب خاطر پروانۂ خوشنودی عطا فرمایا جو آزاد پاشا کی تعریف و توصیف سے مملو تھا۔

اب سنیئے کہ ایک روز روس کے یلانِ[3] آزمودہ کار ترکی کی فوج جرار صف باندھ کر مقابل میں کھڑی ہوئی رومی جانب میمنہ روسی جانب میسرہ دونوں لشکروں کے جوانان کشور آشوب تلے ہوئے کہ شمشیر ہندی کے جوہر دکھائیں۔ روسی نوجوانانِ لشکر شکن فوجی باجا سنتے ہی مست ہو گئے اور ادھر فوج روم سے بھی صدائے زنگ آنے لگی۔

دائیں دائیں کی آواز سے کوہ دہاموں میں زلزلہ پڑ گیا۔ توپوں پر بجلی پڑتی تھی۔ فوج جان پر کھیل کر لڑتی تھی۔ دم کے دم میں ہزاروں گلرخان گلبدن کفن پوش ہوئے بشمار مردان کارزار صنم اجل سے ہم آغوش ہوئے۔

---

[1] ابریق = لوٹا۔ [2] ترکی۔ [3] یل = پہلوان۔

اس جنگ عظیم میں بھی آزاد پاشا نے بڑے بڑے کارنمایاں کیے جنگل میں انھیں کی تجویز کے مطابق دو پلٹنیں بھیجی گئی تھیں۔ کئی افسروں کی رائے اس کے خلاف تھی مگر آزاد نے طائل قاطع و براہین ساطع سے ان سب کو معقول کر دیا جس وقت روسی چند سواروں کو مقابلہ فوج ترک کے لیے چھوڑ کر جنگل کی سمت گئے تھے آزاد ہی کی صلاح سے تین سو سوار جانب دریائے زغار بھیجے گئے تھے تاکہ اگر جنگل کے شمال کی طرف فوج غنیم بھاگے تو یہ تین سو سوار اس کا مقابلہ کریں اور تین طرف سے غنیم کو گھیر لیں۔ روسیوں نے جب دیکھا کہ دو طرف ترکوں کی فوج محاصرہ کیے ہوئے ہے اور جنگل بھی خالی نہیں ہے تو شمال کی سمت سے حسب پیشینگوئی آزاد بھاگتا چاہا۔ وہاں سواران ترک کے پرے دیکھ کر رہے سہے حواس اور بھی غائب ہو گئے۔ الغرض اس جنگ میں خاص آزاد پاشا کی صلاح اور دوراندیشی سے ترکوں نے غنیم کو شکستِ فاش دی۔ سپہ سالار نے وزیر جنگ کو فوراً اس فتح کی خبر دی اور لکھا کہ اس محاصرہ و مجادلہ میں آزاد پاشا کی دوراندیشی سے ہم کو بڑا فائدہ پہنچا جب جنگ سے نجات ملی اور ترکوں نے کمر کھولی تو نقارۂ فتح و فیروزمندی بلند ہوا ؎

علم برکش اے آفتاب بلند
خراماں شو اے ابرِ مشکیں پرند

تین دن تک اس لشکر نصرت اثر نے دم لیا۔ غنیم نے ایسی شکست پائی کہ پھر مقابلہ نہ کیا۔ چوتھے روز آزاد پاشا کے نام حضور وزیر جنگ کا ایک اور پروانہ خوشنودی پہنچا جس کی رو سے یہ دسٹیر کیولری افسر مقرر ہوئے۔

نہ ہوئی قرولی

اخاہ حضور ہیں۔ آئیے آئیے۔ وہ تو باتیں ہی نہیں چھپی رہتی ہیں۔ مزاج شریف جناب خواجہ بدیع الزماں صاحب کئی دن کے بعد
آج حضور جلوہ گر ہوئے ستھے کہاں۔ آنکھیں حضور کو ڈھونڈھتی تھیں۔ بارے خیر آئے تو۔
اب سنیئے کہ میاں آزاد ایک خوش ادا خوش جمال روسی لیڈی کے خیال میں محو تھے۔ پہرے والے نے کہا کہ صاحب ایک شخص
آپ کا نام لے کر اندر آنا چاہتے تھے، میں نے نہیں آنے دیا۔ آپ ذرا چل کر دیکھ لیجیئے۔ مگر آزاد نے ایک نہ سُنی۔ لیٹے ہوئے نیچے سروں میں
یہ غزل گا رہے تھے:۔

جب آئے وہ محشر بپا کر چلے — کہ خوابیدہ فتنے جگا کر چلے
ہزاروں گریباں ہوئے چاک چاک — وہ اس طرح دامن اٹھا کر چلے
شگفتہ ہوئے ان کے آنے سے گُل — چمن میں وہ کار صبا کر چلے

دفعتہً کان میں آواز آئی (او گیدی نہ ہوئی قرولی) یہ سنتے ہی آزاد چونک پڑے اور جس طرف سے آواز آئی تھی اسی طرف لپکے
دیکھا تو خواجہ بدیع الزماں علیہ الرحمۃ والغفران ہیں۔ خواجہ صاحب جھپٹ کر چمٹ گئے اور کوشش کی کہ آزاد کو گود میں اٹھا لیں۔
آزاد۔ اُف بعد مدت ملاقات ہوئی۔ کوئی تازہ خبر کہیئے۔
خوجی۔ اجی کمر تو کھولنے دو۔ افیم گھولوں چسکی لگاؤں تو ہوش آئے۔ اس وقت تھکا ماندہ مرا پٹا آرہا ہوں۔ سانس تک نہیں سماتی ہے۔
آزاد۔ مس میڈا کا حال تو کہو خوش و خرم ہیں۔
خوجی۔ کمیت خوش خرام پہ سوار سر شام لب جُو ہوا کھانے جاتی ہیں۔ ہرمزجی بھائی کی کوٹھی میں بہت ہی کم آتی ہیں۔ ہر روز اخبار پڑھتی ہیں۔
جہاں تمہارا نام پڑھا بس رونے لگیں۔ ایک دن تمہارے مجروح ہونے کی خبر سُنی تو پھوٹ پھوٹ کر روئیں اور کفِ افسوس ملنے لگیں۔
آزاد۔ ارے یہ انگلی میں کیا ہوا ہے جی۔ جل گئی تھی کیا؟
خوجی (سر پیٹ کر) یہ حسن و جمال گلے کا ہار ہوا۔ افسوس۔
آزاد۔ ایں! یہ ماجرا کیا ہے؟ ایک کان کون کتر لے گیا۔
خوجی۔ نہ اس قدر ہم حسین ہوتے نہ پریاں جان دیتیں نہ یہ نوبت آتی مگر خدا نے ایک ایک رگ ریشے میں حُسن کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔
آزاد۔ سبحان اللہ۔ بس اب دلبستگی ہو گی۔
خوجی۔ جب دل لگی تو ہماری صورت دیکھتے دوڑی آتی ہے۔
آزاد۔ ناک بھی کچھ چپٹی معلوم ہوتی ہے یہ ماجرا کیا ہے؟
خوجی۔ حُسن حُسن حُسن۔ ہائے حُسن بلائے جان ہو گیا۔
آزاد۔ حُسن وسن نہیں۔ آپ کہیں سے پٹ کے آئے ہیں، کمزور مار کھانے کی نشانی کسی سے لڑائی ہوتی ہو گی، اس نے ٹھونگ ڈالا
ہو گا۔ بس اور کیا یہی بات ہوئی ہے اور کچھ نہیں ہوا۔

خوجی۔ اجی ایک پری نے پھولوں کی چھڑیوں سے سزا دی تھی۔
آزاد۔ اے ہے، کیا انتقال کر گئیں۔ افسوس ہے واللہ صد افسوس۔
خوجی۔ نہیں نہیں۔ اِئیں واہ۔
آزاد۔ کوئی خط وط بھی لائے ہو یا یوں ہی آتے ہو ہاتھ جھلاتے ؟
خوجی۔ دو خط ہیں ایک مس میڈا کا۔ دوسرا ہرمزجی بھائی نے دیا ہے۔
آزاد اور خوجی قلعے کے اندر نہر کے کنارے فرش پر بیٹھے اب جو آتا ہے خوجی کو دیکھ کر قہقہہ لگاتا ہے۔ کوئی مسکراتا ہے کوئی منہ آتا ہے۔ وہ تو قطع شریف ہی ایسی ہے کہ جو دیکھے اس کو بے اختیار ہنسی آئے۔
خوجی۔ کیا بھیڑ لگائی ہے۔ چلو اپنا کام کرو۔ کچھ تماشا ہے یہاں۔
آزاد۔ تم کو کسی سے کیا واسطہ کھڑے رہنے دو۔ یونہی کھڑے ہیں۔
خوجی۔ اجی نہیں آپ سمجھتے نہیں ہیں یہ لوگ نظر لگا دیں گے۔ اب تک تو نظر گزر سے خدا نے بچایا ہے۔ اب اس سن میں کہیں چپیٹ کھائیں اور مفت میں اُٹھیں تو غضب ہی ہو جائے ستم ہی بپا ہو۔
آزاد۔ آپ کے ڈنڈیل دیکھ کر عش عش کر رہے ہیں اور کیا۔
خوجی۔ اجی وہ ایک حسن ہی کیا کم ہے اور قسم ہے آزاد کے سر مبارک کی واللہ کس مردک کو آج تک معلوم بھی ہوا ہو کہ ہم اس درجہ جمیل ہیں اور ہمیں اس کا کچھ غرور بھی نہیں۔

مطلق نہیں غرور جمال و کمال پر

آزاد۔ جی ہاں۔ باکمال لوگ حلیم ہی ہوا کرتے ہیں۔
خوجی۔ باکمال اور بے نظیر۔ سنیے بھائی صاحب دنیا میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر شاعر غرین اور بے نظیر ہے۔
راوی۔ اے سبحان اللہ (غرّا کے عوض غرین) کی اچھی کہی یہ لفظ آج ہی سُنا۔
آزاد۔ اب آپ افیم گھولیے۔ ساتھ ہے یا نہیں۔ ہو گی کیوں نہیں۔
خوجی۔ نہیں بھائی۔ ہم تمہارے بھروسے پر آئے ہیں۔ کہیں قتل نہ کر ڈالنا۔ لے بس اب منگواؤ۔ منگواؤ ذرا عمدہ ہو۔ ہاں! یہ نہیں کہ واہیات اٹھالاؤ کسریٹ کے ساتھ تو ہوتی ہی ہو گی۔
آزاد۔ اب آپ مارے پڑے۔ اب تھوڑی دیر میں آنکھیں مانگنے لگیے گا اچھی دل لگی ہے۔ عجب بے تکے ہو واللہ۔ افیم اور تمہارے ساتھ نہ ہو ہائے لاحول بے مرد یہاں افیم کہاں اور کسریٹ میں ماشاء اللہ
خوجی۔ ہائے بے موت مرے۔ واللہ بے موت مرے۔ کسی سے مانگ لو۔
آزاد۔ یہاں افیم کا کسی کو شوق ہی نہیں۔ افیم کیسی۔
خوجی۔ اتنے شریف زادے اور ایک افیمی نہیں۔ واہ خوب بات ہے۔
آزاد۔ جی سب بدقسمت بدنصیب ہیں۔ خوش قسمت تو ایک آپ ہیں۔ بس باقی اللہ اللہ خیر صلّا۔ مگر آج ذرا دل لگی ہو گی جب افیم نہ ملے گی اور تم تلملاؤ گے۔ تڑپو گے۔ بلبلاؤ گے۔
خوجی (جماہی لے کر) لو ابھی سے جماہیاں آنے لگیں آج بے موت مرے یار عزیز کچھ تو فکر کرو یہ کس وقت کا بدلہ لیتے ہو۔

آزاد- اب یہاں یہ حماقت کی باتیں نہ کرو- ورنہ کل لشکری بنائیں گے اور سائیس تک تم کو چٹکیوں پر اڑائیں گے- افیم یہاں نہ ملے گی- آپ اپنی فکر کیجئے - ہاں خوب یاد آیا - قرولیاں جتنی چاہو تو نذر ہیں-

خوجی (افیم کی ڈبیا دکھا کر) یہ بھری ہے افیم کیا اُلّو سمجھے تھے ہونہہ ! آنے کے قبل ہی میں نے ہرمزجی سے کہا کہ حضور افیم منگوا دیں ورنہ ہمارا افشا بگڑ جائے گا یار- وہاں ایسی ایسی پریاں ہم پر عاشق ہوئیں کہ بس کچھ نہ پوچھو - لیجئے ہرمزجی بھائی کا خط ملاحظہ فرمایئے میڈم نے نادری حکم دیا ہے کہ پہلے ہرمزجی کا خط دینا پھر ہمارا- پڑھو- بغور پڑھو-

آزاد نے خط کھولا اور پڑھا تو یہ مطلب تھا :-

ڈیئر مسٹر آزاد ، ذرا خوجی سے خیر و عافیت تو دریافت فرمایئے- بس کچھ نہ پوچھئے کہ ان پر کیسی گذری - اتنا پٹے ، اتنا پٹے کہ الٰہی توبہ دو دانت ٹوٹ گئے - کان کٹ گیا اور گھونسے مُکّے کھائے - اُٹھتے جوتی بیٹھتے لات - مگر بے حیا کی بلا دُور، شرم چہ کُتی ست کہ پیش مرداں آید. پہلے ان سے اس قدر پوچھئے کہ لالہ رُخ کون ہے -

آزاد- ارے میاں خواجہ صاحب یہ لالہ رُخ کون نیکبخت ہیں ؟

خوجی - افوہ - ہم پر چکما چل گیا- واہ رے ہرمزجی- واللہ اگر نمک نہ کھاتا ہوتا تو جا کے قرولی بھونک دیتا - لاحول ولا قوۃ-

آزاد - نہیں تمہیں واللہ بتاؤ تو- بتاؤ ہمارے سر کی قسم یہ لالہ رُخ کون ہیں؟ شاید عاشق ہو گئی آپ پر بھائی ان ہاتھ پاؤں پر خدا جانے کیا جادو ہے کمال ہے) دور سے دیکھا اور عاشق ہو گئیں-

خوجی - اچھا ہرمزجی - اچھا - بھلا فہمیدہ خواہد شد - خیر خیر ؎

سودا کریں گے دل کا کسی دلربا کے ساتھ
اس باوفا کو بیچیں گے اک بے وفا کے ہاتھ

ہائے لالہ رُخ وائے لالہ رُخ جان جاتی ہے مگر موت بھی نہیں آتی غضب ہے ستم ہے -

آزاد- پٹے ہوئے ہو- کچھ حال تو بتاؤ جی- حسین ہے -

خوجی- (جھلا کر) جی نہیں حسین نہیں کالی کلوٹی ہے - بوا زعفران کی بھی چچی ہے آپ بھی واللہ نرے چونچ ہی رہے - بھلا بد قطع بدصورت عورت کو جرأت کیونکر ہوتی کہ ہمارے ساتھ بات کرتی - سوا حسین کے کوئی نظر اُٹھا سکتی ہے - کند ہمجنس باہمجنس پرواز- یاد رکھو حسین پر جب نظر پڑے گی حسین ہی کی پڑے گی - دوسرے کی مجال نہیں-

آزاد- اچھا اب لالہ رُخ کا حال تو بتاؤ مگر پوست کندہ -

خوجی - اجی کام کرو - اس وقت دل قابو میں نہیں ہے-

راوی- آبنوس کا کندہ تھا یا عورت تھی - لاحول ولا قوۃ-

خوجی- ایک دن دل لگی دل لگی میں اُٹھ کے پچاس جوتے لگا دیئے - تڑ تڑ- تڑ تڑ - ہائیں ہائیں - یہ کیا حماقت ہے - ہمیں یہ دل لگی گوارا نہیں ہے - مگر وہ سنتی کس کی ہے - اُف اب فرمایئے جس پر پچاس جُوتے پڑیں اس کی کیا گت ہو گی - ایک روز ہنسی ہنسی کان کاٹ لیا اور لطف یہ کہ چپل چلو کی نوبت آئی - ایک دکان پر کھڑا ہوا سودا خرید رہا تھا پیچھے سے آ کر دس جوتے لگا دیئے - انتہا کی شوخ ایک مرتبہ ایک حوض میں ہم کو ڈھکیل دیا - ناک زخمی ہوئی - ہاتھ زخمی ہوئے - گھٹنے چھل گئے - مر مٹے مگر لاکھوں میں لاجواب ہزاروں میں انتخاب بلکہ یکتائے روزگار-

طرز نگہ نے چھین لیے قدسیوں کے دل
آنکھیں جو اُن کی اُٹھ گئیں دستِ دُعا کے ساتھ

آزاد۔ تو یہ کہیئے ہنسی ہنسی میں خوب جوتیاں کھائیں حضور نے۔

خوجی۔ پھر یہ تو ہوتا ہی ہے۔ سلف سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ سُنا نہیں؟

عاشقاں کشتگانِ معشوق اند　　برنیاید زکشتگاں آواز

ایک دفعہ میں سو رہا تھا۔ آتے کے ساتھ ہی اس زور سے قمچی لگائی کہ میں تڑپ کر چیخ اُٹھا بس آگ ہو گئی کہ ہم پیٹیں اور تم سُننے لگو۔ جاؤ بس ہم نہ بولیں گے۔ روٹھ گئی۔ منایا، بات تک نہ کی۔ آخرکار یہ صلاح ٹھہری کہ عین سر بازار دس آدمی چپتیں لگائیں اور ہم اُف نہ کریں۔ مگر ہائے وہ ادا نہ بھولے گی۔

آزاد۔ کسی روز دل لگی دل لگی میں زہر نہ کھلا دے۔

خوجی۔ (بگڑ کر) کھلا دے! کیوں صاحب۔ کھلا دیں نہیں کہتے کھلا دے۔ کوئی کنڈے والی مقرر کی ہے؟ وہ بھی رئیس زادی ہے۔ آپ کی مس میڈا پر گر پڑے تو کچل جائیں۔ جی ہاں۔ ایسی ویسی نہیں ہے۔

آزاد۔ کیوں صاحب ہمارے سامنے اور آپ میڈا کی ہجو کریں۔ آپ کی لالہ رُخ اس قدر نازک بدن اور میڈا ایسی بھدی ہیں۔

خوجی (مسکرا کر) اچھا پھر دیکھ ہی لوگے۔ گھبراہٹ کاہے کی ہے!

خواجہ بدیع الزمان صاحب نے افیم سے فراغت کر کے کہا لے اب اپنا حال کہہ چلیئے۔ ہماری داستان سُن چکے اب اپنی بیتی کہو۔ ہاں بسم اللہ۔

آزاد۔ ایک برق وش ہم سے تلوار لڑنا چاہتی ہے۔ کیا رائے ہے؟

خوجی۔ کیا! پی ہم نے اور چڑھی آپ کو۔

آزاد۔ واللہ قسم کھا کر کہتا ہوں۔ پیغام بھیجا ہے کہ کسی روز آزاد پاشا سے اور ہم سے یکہ و تنہا تلوار چلے۔

خوجی۔ بھئی قرولی کوئی لڑے تو ہم بھی مستعد ہیں۔ مگر تم نے دریافت تو کیا ہوتا کہ سن کیا ہے۔ شکل کیسی ہے۔ کوئی ایسی ویسی ہے یا کوئی رئیس زادی ہے۔ یہ سب باتیں دریافت کرنی چاہئیں۔

آزاد۔ سب دریافت کر چکے ہیں جی۔ سولہ سترہ برس کا سن ہے اور اس قدر خوبصورت ہے کہ روس میں ثانی نہیں رکھتی۔

خوجی۔ ایسا نہ ہو کہیں دیکھ جاؤ تو پھر حسن آرا اور میڈا سب کو بھول بھال کے وہیں کے ہو رہو۔ ہاں ذرا اس کا خیال رہے اور شاید چکما ہی چکما نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امرد ہو۔ صرف چکما دینے کے لیے یہ جعل کیا ہو۔ تم ابھی بچے ہو ابھی ہم سے دو چار برس چھوٹے ہی ہو گے۔

اتنے میں آزاد کو یاد آیا کہ مس میڈا کا خط تو پڑھا ہی نہیں۔ فوراً خط مانگا اور پڑھ بہت ہی خوش ہوئے۔

پیارے آزاد! آج کل اخبارات میری روح کی غذا ہیں۔ میری آنکھیں تمھارے نام کو فوراً تلاش کر لیتی ہیں۔ او ظالم ستمگر، خط تو بھیجا کر۔ یہاں جان پر بن آئی ہے اور تم نے وہ سکوت اختیار کیا ہے کہ الاماں۔

کبھی نہ آپ سے ہم دب کے بانکپن میں رہے

الٰہی خیر کیجیو۔ آج میدان کارزار میں پریوں کا بے طور جھرمٹ ہے۔ مگران سب حوران بہشتی میں ایک فتنۂ دوراں آفت جان ناتوان پردہ عالم ہے کہ مجنوں اور وامق لیلیٰ اور عذرا کی طرف رخ نہ کرتے۔

اب سنیئے کہ دریا کے قریب روسیوں کو شکست دے کر آزاد پاشا قلعۂ معلّٰی میں آئے۔ لشکریوں نے فرط طرب سے نعرے بلند کیے ٹوپیاں اچھالیں لیکن دوسرے روز اُدھر رزمگاہ میں کوس جنگ زبان حال سے کہنے لگا کہ ہاں شیران بیشہ دغا بھیڑ پڑو۔ آمنے سامنے دونوں فوجیں پرے جماتے ہوئے آراستہ ہو گئیں۔ روس کے انجنیروں نے راتوں رات پل بنا لیا اور سحر کاذب کے وقت کل فوج عبور کر آئی۔ طلایہ کے سواروں نے قلعہ میں خبر پہنچائی تو ترکان صف شکن روئیں تن چلتیوں میں لیس ہو کر قلعے سے میدان میں آئے۔ اُدھر ترکوں کے کاسہ سم گھوڑے عربی نژاد۔ اُدھر روسیوں کے افراس لیلی جمال پریزاد۔ یہ بوئے گل کی طرح کے منزلوں کی خبر لائیں۔ وہ خیال کے مانند دم کے دم میں راہ دور دراز طے کر جائیں۔ یہ چابک خرام وہ سبک گام ادھر ان کی سبک عنانی اُدھر اُن کی برق جولانی میدان میں عجب ہیبت ناک تماشا دکھاتی تھی۔

ایک روسی نے عروس زاہد فریب آتش زن کالائے شکیب کو مخاطب کر کے کہا۔ آج آزاد پاشا سے کہ نامبرآوردہ ترکی افسر جرار صف شکن آزمودہ کار فنون سپہ گری کا مسلم الثبوت اُستاد جوانمرد بریزاد ہے۔ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ شیر کو ٹوکنا آسان نہیں ہے، اُس بانکی دوشیزہ نے تن کر کہا۔ اوہ کیا پروا ہے کیا غم ہے، دیکھا جائے گا۔ وہ ترکی ہے تو ہم ترکی فگن ہیں۔ وہ پولاد پوش تو ہم روئیں تن ہیں۔ اگر اس شمشیر الماس رنگ سے آزاد پاشا کا سر نہ اُڑایا تو کچھ کام نہ کیا۔

اتنے میں ایک گولا آزاد کے سرنگ[1] نقرہ خنگ کی تھوتھنی کے قریب پھٹا۔ گھوڑا بیقرار ہو کر ہٹا کہ دوسرا گولا آیا۔ آزاد نے خوب ران پٹری جمائی اور پھرتی کے ساتھ گولی پر گولی چلائی۔ معرکہ رستخیز خوب گرم تھا۔ اس اثنا میں روسیوں نے ایک حصہ فوج کو سامنے کی ڈھالو پہاڑی پر بھیج دیا اور ہلکی ہلکی توپیں بھی ان کے ساتھ بھیجیں۔ ترکوں کو اس کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ خواجہ بدیع الزمان صاحب دُور سے ایک اونچے درخت کی شاخ پر بیٹھے جنگ کا رنگ دیکھ رہے تھے۔ روس کے سواروں کو جو اس پہاڑی پر جاتے دیکھا تو انہوں نے کفن پھاڑ کر غل مچایا۔ ہوشیار ہوشیار۔ بالا روس کے ہاتھ رہے گا۔ پہاڑ پر فوج چڑھ گئی۔ یارو کچھ خبر بھی ہے۔ ہائے اس وقت اگر توڑے دار بندوق ہوتی تو پرے کے پرے صاف کر دیتا۔

بجا ہے۔ توڑے دار بندوق تو اس جنگ میں بڑے کام آئے۔ فوج غنیم معاً شکست پاتے۔ ایسی دوزخ شرار بندوقیں کسی نے یورپ میں کاہے کو دیکھی تھیں۔ جب خوجی نے دیکھا کہ ترک بالکل غافل ہیں تو درخت سے جھٹ پٹ اُترے اور دوڑ کر ترکوں کو خبر دی پہلے کسی کو اُس مسخرے ہونے کی بات کا یقین نہ آیا مگر بنظر احتیاط دُوربین سے دیکھا تو دس پانچ ٹوپیاں نظر آئیں۔ ارے یہ غضب ہو گیا۔ جس وقت اتنے اونچے ٹیلے سے باڑھ ماریں گے خدا جانے کیا غضب بپا ہو گا۔ آناً فاناً میں کسی کا پتہ نہ لگے گا۔ مشورہ

---

[1] گھوڑا۔

ہوتا ہی تھا کہ پہاڑی سے توپ کا گولہ اتار گیا۔ ترکوں نے دیکھا اب کوچۂ گریز بالکل مسدود تھا۔ مگر کمال جوانمردی قدم جمائے اور گولے پر گولے چلنے لگے۔ اتنے میں روس کے دو سوار بطور قاصد آئے۔ آن کر منجانب سپہ سالار بیان کیا کہ ہماری فوج کا ایک حصہ قلعہ کوہ پر داخل ہو گیا اور وہاں سے اس نے گولے برسانے شروع کیے ہیں۔ اگر جان عزیز رکھتے ہو تو عقل سے کام لو ہتھیار رکھ دو۔ ورنہ ہم بات کرنے کُل فوج کا ستیاناس کر دیں گے۔ ترکوں نے کہا ہم لڑیں گے اور جان دیں گے مگر ہتھیار ہرگز نہ رکھیں گے۔
اب سنیئے کہ جو لوگ پہاڑی پر چڑھ گئے تھے انھوں نے یہ حال دیکھ کر اوپر سے گولیاں ماریں۔ مگر بارود کا چٹکیوں میں خاتمہ ہو گیا۔ روسیوں نے بھی تلوار لی اور طرفین سے شپا شپ چلنے لگی۔ اس عرصے میں آزاد پاشا نے دیکھا کہ ایک فرس شبرنگ پر ایک عروس نوخیز رشکِ گلچہرگان فرنگ بصد شان بزنانی سوار ہے۔ کمر سے تلوار لٹکتی ہے ہاتھ میں خنجر آبدار ہے۔
آزاد پاشا نے از سرتا پا نظر ڈالی تو دل میں سوچے کہ ابھی نام خدا سترھواں اٹھارھواں سال ہے۔ کانِ حسن و جمال ہے ابھی اس قابل ہے کہ دستِ سیمیں اور عذار رنگین کے بوسے لے۔ حورانِ بہشتی کو دور ہی سے سلام کر کے اس کافر بدکیش کی پرستش کرے۔ یہ اور میدان جنگ؟ بار خدایا اس مردم آزار ستمگار کو گزند سے بچا۔ ہائے ہائے ایسا نہ ہو۔ کسی شقی کا ہاتھ اس عربدہ جو سراپا جادو پر پڑے۔ ایک افسر نے ان کی کیفیت دیکھ کر کہا۔ آزاد ذرا سمندِ عشق کی باگ روکے ہوئے پھسل نہ جانا۔ عاشقی معشوقی کا وقت نہیں ہے ترکوں کی عزت پر بن آئی ہے۔ یہی وقت جاں بازی و نبرد آزمائی ہے۔ مرد ہو یا عورت جوان ہو یا پیر فوج غنیم میں جو ہے ہمارے خون کا پیاسا ہے۔

زادۂ ظالم ستمگر مے شود تیغ چوں بشکست خنجر مے شود

آزاد نے کہا لاکھ سنبھلتا ہوں مگر دل ہاتھ سے جاتا ہے۔ اللہ رے حسن۔ اس نگار تند خو نا وک نگاہ ترش رو نے آزاد کو دیکھ کر کہا۔

سنبھل کے رکھیو قدم راہ عشق میں مجنوں کہ اس دیار میں سودا برہنہ پا بھی ہے

یہ کہہ کر سیف اصفہانی برق دم چمکائی۔ گھوڑا بڑھایا اور ایک ترکی سوار پر ایسا تلا ہوا ہاتھ لگایا کہ دست چپ تڑ سے اُڑ گیا اور خون کے فراٹے بہنے لگے پھر گھوڑا بڑھا کر آزاد کے گھوڑے کی طرف جھکی تھی کہ آزاد نے تلوار کو چوم لیا۔ مس کلیرسا نے جھلا کر گھوڑے کو پھیرا اور پھیر کر چاہا کہ آزاد کو ضرب شمشیر سے دو نیم کرے۔ مگر جیسے ہی ہاتھ اُٹھایا آزاد پاشا نے فرس صرصر تک کو آگے بڑھایا اور تلوار کو اپنی شمشیر سے روک کر بائیں ہاتھ سے اس پری چہرہ کے گال پر ہاتھ پھیرا تو ترکوں نے بڑے زور سے نعرہ ارا اور روسی جھینپ گئے۔ مس کلیرسا بھی کسی قدر لجائیں کہ ہزاروں آدمیوں کی جماعت میں اس ترک نے ذرا بھی کرنے گالوں پر ہاتھ پھیرا چہرہ مارے غصے کے تمتمانے لگا۔ طرفین کے آدمی دار و گیر سے تھک کر ہانپ رہے تھے۔ آزاد اور مس کلیرسا کے داؤں پیچ دیکھ کر لڑنا بھڑنا چھوڑا۔ شمشیر زنی اور گولہ اندازی سے منہ موڑا۔ کبھی آزاد جھپٹ کر جاتے تھے اور تلوار دکھا کر گھوڑے کو دو قدم واپس لاتے تھے۔ کبھی وہ تند خو جھلا جھلا کر توسن برق دم کو ایڑ لگاتی تھی چوٹ پر چوٹ آتی تھی۔ مگر آزاد کی یہ کیفیت کہ کچھ چوٹیں تلوار پر روکیں کچھ خالی دیں۔ ہُوا تک نہ چھو سکی اس پرکالۂ آتش نے دو ترکی سواروں کو مجروح اور ایک کو قتل کیا۔ آزاد محو صورت مجنوں وار اُس لیلیٰ وش کے عاشق زار تھے۔ گو بر سر پیکار تھے مگر اس توس ابرو پر ہاتھ نہیں اٹھتا تھا۔ ایک مرتبہ غپا دے کر اُس زن شمشیر فگن نے معاً ایسا ہاتھ جمایا کہ اگر کوئی ناواقف ہوتا تو گردن تن سے جدا ہو جاتی۔ لاش زمین پر پھڑکتی نظر آتی۔ مگر آزاد نے اس طرح بچایا کہ ہاتھ بالکل خالی گیا۔ لیکن ہنوز اچھی طرح سنبھلنے نہ پائے تھے کہ اس عاشق کش کی شمشیر دو پیکر نے کیت خوش خرام

کا آدھا کان اُڑا دیا۔ اس پر روسیوں نے تالیاں بجائیں اور اظہار خوشی کیا۔ گھوڑے کا کان اُڑانا تھا کہ بل کرنے لگی۔ اس وقت کمر کا لچکنا اور بھی ستم ڈھاتا تھا۔ آزاد کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ مس کلیرسا اور آزاد کی چار آنکھیں ہوئیں تو تیرِ نگاہ ان کے کلیجے سے پار ہو گیا۔ ایک ایک رونگٹا عاشقِ نرگسِ بیمار ہو گیا۔ اشارہ کر کے کہا۔ آگے آؤ۔ بڑے مرد ہو تو قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔ اس اشارے نے ان کو اور بھی مار ڈالا۔

یار کرتا ہے اشارے سیکڑوں ہوتے ہیں قتل
چلتی ہے تلوار گویا جنبشِ ابرو نہیں

یہ باتیں اور اشارے ہو ہی رہے تھے کہ یکا یک اس کافر مردم آزار نے بھنڈارے کا ہاتھ لگانا چاہا۔ قریب ہی تھا کہ بھنڈارا کھل جائے۔ مگر آزاد بنوٹ کے استاد آہنی کسرت کی مشق چڑھی ہوئی۔ فوراً تلوار پر تلوار روکی اور اس قدر قریب پہنچ گئے کہ تڑ سے اس گلعذار کے گورے گورے پیارے پیارے گال چوم لیے اور گھوڑا ہٹایا تو دس قدم کے فاصلے پر تھے۔ اس چھینا جھپٹی میں اس کجکلاہ غیرتِ ماہ کی بانکی ٹوپی سر سے گر پڑی اور چوٹی جو گندھی تھی دھینگا مشتی میں کھل کر ادھر اُدھر مارِ خونخوار کی طرح لہرانے لگی۔

اس بوسہ بازی اور خوش اندازی پر روسیوں تک نے قہقہہ لگایا۔ میدانِ جنگ کو کشتِ زعفران بنایا۔ آزاد نے مسکرا کر کہا۔

آئے ہیں وہ کھینچ کر تلوار بہرِ امتحان
جوہر اپنے تو بھی دکھلا ہمتِ مردانہ آج

خوجی۔ جوہر تو دکھا چکے۔ گرما گرمی سے بوسے لے چکے مگر اب خبردار رہیئے گا۔ مزاجِ معشوق برہم ہو گیا ہے۔ ایسا نہ ہو ہمتِ مردانہ رکھی رہے اور بت کافر کام تمام کر دے۔ اب پلٹ آؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔

آزاد۔ چپ گیدی تو افیم گھولنا جانے ان باتوں سے تجھ کو کیا سروکار ہے۔ بیکار ٹائیں ٹائیں لگاتی ہے۔ خبردار جو بولا

خوجی۔ قضا دامنگیر ہے۔ آج بچ کے آؤ تو ناک ناک بدتا ہوں۔

جب اس خاتونِ شیریں حرکات نے دیکھا کہ آزاد پاشا نے ایک چوٹ بھی نہیں کھائی بلکہ ایک بار تلوار کا بوسہ منہ چڑھ کے لیا دوسری مرتبہ گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ تیسری مرتبہ رخسارِ رعنا چوم لیے تو کمال خفیف ہوئی اور اس خفت نے رگِ حمیت کو ایسا جوش دلایا کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ گھوڑے کو آزاد کے گھوڑے سے بھڑا کر تلوار چمکا کر ہاتھ گھمایا اور جما با دم لینا دشوار کر دیا۔ مگر دلاورے آزاد اس استقلال کے ساتھ ہنس ہنس کر چوٹیں بچائیں کہ ناظرین دنگ ہو گئے۔ آخر کار اُن کے فرسِ بادرفتار کی گردن پر ایسا تلا ہوا ہاتھ لگایا کہ گردن کٹ کر وہ گری۔ آزاد فوراً کود ے، کودتے ہی ایک سوار نے اپنا گھوڑا خالی کر دیا اور چشم زدن میں یہ گھوڑے کی پیٹھ پر آ کر اس دلبر نازنین کے مقابلے کو بڑھے۔ اس عرصے میں اس خونخوار نے دو ترکوں کو مجروح کر دیا۔ آزاد پر تلوار لگانے ہی کو تھی کہ انھوں نے پھر تلوار پر تلوار روکی اور بنوٹ کے پیچ سے ہاتھ اور بازو کو اس طرح باندھا کہ تلوار اس بتِ پندار کے دستِ نازک سے چھوٹ پڑی۔ تلوار کے چھوٹتے ہی گلوئے رنگین میں ہاتھ ڈال کر پیشانیِ نورانی کا بوسہ لیا تو گھوڑا ران سے نکل گیا۔

خوجی اس کیفیت کو بلندی سے دیکھتے جاتے تھے۔ ادھر آزاد نے آنکھ کا بوسہ لیا اُدھر خوجی نے کہا شاباش ایک اور۔ آزاد نے بناگوش کو چوما۔ انھوں نے ہانک لگائی ایک خواجہ بدیع کی طرف سے بھی۔ جی بجا ہے۔ منہ دھو رکھیئے۔ خواجہ بدیع کا منہ بوازعفران کے قابل ہے یا مس کلیرسا کے قابل۔ اے توبہ۔ ایا نہ قدرِ خود بشناس۔ مگر واہ رے آزاد۔ واللہ بڑے خوش نصیب نکلے۔ قید بھی ہوئے تو کس آن کے ساتھ۔ زندان کی طرف سدھارے تو کس شان کے ساتھ۔ بیش بہا گھوڑے پر سوار بغل میں نگارِ رشکِ فرخار لطفِ بوس و کنار۔ گھوڑا جو سرپٹ جاتا تھا تو چوٹی کے بال کبھی بکھر بکھر کر رخِ انور پر لہراتے تھے اور چہرۂ نورانی کے اِدھر اُدھر پریشان ہو جاتے تھے۔ یہ شعر حسبِ حال تھا۔

ہوئی شام بکھرے جو چوٹی کے بال　　ہٹی زلف رُخ سے سحر ہو گئی۔

جب مس کلیرسا کا شبدیز سبک خیز اس حالت میں روس کی اس فوج میں داخل ہوا جو آدھ میل کے فاصلے پر کھڑی تھی تو روسیوں نے تین بار نعرۂ خوشی بلند کیا اور کوئی چالیس پچاس آدمیوں نے آزاد کو گھیر لیا۔ دس ایک ہاتھ پکڑے ہیں۔ پانچ دوسرا ہاتھ پکڑے ہیں۔ دو چار نے ٹانگ لی اور چار نے دوسری ٹانگ۔ اس طرح پر جبر غلو کیا کہ آزاد کو بے اختیار ہنسی آئی۔ کہا بھئی آخر یہ ہاتھ اور پاؤں اور کمر پر کیوں قبضہ کیے لیتے ہو؟ اگر ایسا ہی خوف ہے تو اسلحہ کھول لو اور قید کر دو۔ دس بارہ آدمیوں کا پہرا رہے۔ ہم بھاگ کے جائیں گے کہاں۔ روسیوں نے کہا اب یہ بھرّے کسی اور کو دو۔ ایک مرتبہ تم ہمارے پنجے سے پھنس کر چھوٹ گئے ہو۔ اب خلیل خاں فاختہ اُڑا چکے۔ کل اسلحہ تم سے چھین لیے جائیں گے۔ ایک میدان میں تمھارے لیے مکان بنے گا۔ اس کے چاروں طرف ہر وقت سو آدمیوں کا پہرا رہے گا اور دس آدمی شمشیر برہنہ لے کر تمھارے سر پر کھڑے رہیں گے۔ اب کی کامل نگرانی کی جائے گی۔

آزاد۔ ایک ذرا سے آدمی کے لیے یہ بندوبست الاماں۔ الاماں۔

ایک روسی۔ جی بجا ہے۔ آپ ذرا سے آدمی ہیں بچہ خوش۔ درست ہے۔

کرنل۔ مس کلیرسا آپ کا نام سُن کر مقابلے پر گئی تھیں اور سرخرو آئیں۔

آزاد۔ (مسکرا کر) اگر یہی ہتھکنڈے ہیں تو دس پانچ دن میں جوانانِ ترک بندھے چلے آئیں گے۔

کرنل۔ مس کلیرسا سے تو جیت نہ پائے مردوں سے کیا لڑو گے۔

آزاد۔ حضرت اس میں تو شک نہیں کہ ہم اس وقت شکار ہو گئے مگر کس کے صید ہوئے؟ مس کلیرسا کی ادا نے مار ڈالا اور تیغ نگاہ نے زخمی کیا۔

روسی دوشیزہ

شام کے وقت ہلکی پھلکی اور صاف ستھری چھولداری میں خاتون یوسف لقا رنگیں ادا مس کلیرسا بناؤ چناؤ کرکے ایک نازک کرسی پر متمکن تھیں۔ چاندنی نکھری ہوئی۔ بادِ صبا آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ خودرو پھولوں کی بھینی بھینی مہک سے دماغ معطر ہوا جاتا تھا۔

آزاد فرخ نہاد با دلِ ناشاد (جو روسیوں کی قید میں پھر آ گئے تھے) اپنی پیاری حسن آرا کو یاد کرکے سر دُھنتے تھے۔ کہ دفعتہً ایک آدمی نے آن کر کہا۔ چلئے آپ کی طلبی ہے مس کلیرسا بلاتی ہیں۔ آزاد نے پوچھا کیوں؟ کہا وزیر جنگ کا حکم ہے کہ اگر مس کلیرسا ان کا قصور معاف کر دیں تو خیر ورنہ فوراً سائبیریا کے برفستان میں بھیجے جائیں۔ آزاد نے کہا یہ تو ہم کب کے سن چکے ہیں۔ اچھا چلو۔ دس کاسک شمشیر برہنہ لیے ہوئے اُن کے ساتھ چلے۔ آزاد چھولداری کے قریب پہنچے۔ چھولداری کا پردہ اُٹھا۔ آزاد اندر گئے۔ ادب کے ساتھ زمین دوز ہو کر سات بار سلام کیا۔ اور دست بستہ کھڑے ہوئے۔ دیکھا کہ وہ مہ جبین آن بان کے ساتھ بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہے، اور گرد کئی پری جمال عورتیں ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔ ایک شوخ و شنگ کمسن معشوق نے آزاد کی طرف دیکھ کر سلام کیا اور مسکرائی۔ دوسری مہ وش نے اشارے سے مزاج پرسی کی۔ تیسری نے مس کلیرسا سے کہا حضور وہ بے ادب گستاخ حاضر ہے، مگر اُس کافر بدکیش نے ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

تھوڑی دیر کے بعد مس کلیرسا کرسی سے اُٹھی۔ جوشِ شباب سے اکڑتی تھی۔ جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ کبھی پتلی کمر ہزار جگہ سے لچکتی تھی۔ کبھی زبانِ حال سے انا البرق کہتی ہوتی چمکتی تھی۔ پیشانی سے نورِ عالم افروز عیاں ہر ادا جاں ستاں۔ ادھر وہ پیکرِ ماہ پارا ادھر آزاد محوِ نظارہ۔

ٹکٹکی لگائے آزاد چپ چاپ کھڑے تھے۔ اتنے میں مس کلیرسا نے تیکھی چتون کرکے کہا۔ آپ آئیے! کہئے اب کی بناگوش کا بوسہ لیجیے گا یا پیشانی اور دوش کا۔ لبِ لعل کا بوسہ لیجیے آئیے آئیے۔ آزاد تو مبتلائے بلا تھے، اس بیڈھب سوال کا جواب نہ دے سکے۔

مس کلیرسا۔ اے ہے کتنے غریب ہیں بیچارے کچھ جانتے ہی نہیں۔ ظالم ہزاروں آدمیوں میں مجھے ذلیل کیا۔ بوسے پر بوسہ لیا۔ مگر جاتے کہاں ہو۔ ایک ایک بوسہ کا عوض لوں تو سہی۔

اس پر برق دم خادمہ بولی۔ حضور ان کی سزا یہ ہے کہ جس جس مقام کو اُنھوں نے چوما ہے وہاں وہاں ان کے داغ دیا جائے۔ اگر حضور کی چشم میگوں کا بوسہ لیا ہے تو ان کی آنکھ جلتے جلتے لوہے سے داغی جائے۔

دوسری چمک کر بولی۔ بیوی یہ موا ہماری طرف بھی جھکا تھا۔ وہ تو میں نے گھوڑے کی باگ اُٹھائی اور چالیس قدم پر جا کے دم لیا ورنہ میرے گال بھی اس بدبخت نے۔ اب کیا کہوں حضور، کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔

مس کلیرسا۔ اس وقت بھی پاجی پن سے باز نہیں آتا۔ کنکھیوں سے جوبن لوٹ رہا ہے۔ سب سے پہلے اس کی آنکھیں نکالی جائیں سمجھیں تو جا۔

آزاد۔ (آنکھیں نیچی کرکے) سب کچھ ہو سکے گا مگر یہ نہ ہو سکے گا۔

مس کلیرسا۔ اخاہ ابھی ریاست کی بُو نہیں جاتی۔ یہاں آزاد پاشا نہیں ہو۔ یہاں قیدی ہو قضا دامنگیر ہے۔ شامتیں آئی ہیں۔

آزاد۔ اگر اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں۔ تھکا بہت ہوں۔

مس کلیرسا۔ کیا! بیٹھ جاؤں۔ شانِ خدا۔ ہمارے سامنے اور تم بیٹھنے پاؤ۔ یہ شخص کس قدر پاگل ہے (عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر) سُنا کیا فرمائش ہوئی ہے۔ حضور کے دشمنوں کی طبیعت کسی قدر ناساز ہے۔ تھکے بہت ہیں حضور۔ اب ذرا آرام چاہتے ہیں اس ڈھٹائی کو تو دیکھو آپ بے حساب مصاحبت فرمانے کو تشریف لائے ہیں۔ اس سوال پر اُن مہجبینوں نے ان کو بنانا شروع کیا۔ ایک نے مسکرا کر کہا حضور کی اجازت ہو تو پاؤں دبا دوں۔ دوسری بولی سر میں درد ہو تو گلاب کا عطر مل دوں؟

مس کلیرسا۔ سنیئے بندہ پرور۔ وزیر جنگ نے تمھاری نسبت حکم دیا ہے کہ سیبیریا کے برفستان میں قید کیے جاؤ۔ جہاں مارے ٹھٹھرن کے روح تک اینٹھ جاتی ہے اور سردی کی شدت سے جان پر بن آتی ہے۔ اس برفستان میں تم کو بڑی سختیاں سہنا پڑیں گی۔

اتنا کہنا تھا کہ دس کاسک چھولداری میں آئے۔ کہا بس اب آخری حکم ہو گیا۔ چلیئے۔

ایک کاسک۔ مس کلیرسا نے اس وقت بڑی بے رحمی کی۔ افسوس۔

دوسرا۔ ہم سمجھے تھے ان کی سپہ گری کی قدر کریں گے مگر افسوس۔

تیسرا۔ سخت خفیف ہیں کہ ہزارہا آدمیوں میں ذلیل ہوئیں۔

آزاد پاشا نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر مس کلیرسا نے شنوائی نہ کی۔ کرنل نے حکم دیا کہ پرسوں سوموار ان چار آزاد کو لے کر سرحد پر پہنچائیں۔ آزاد کے ہوش اُڑ گئے۔

چھیڑ چھاڑ

حُسن آرا بیگم پیازی رنگ کا دوپٹا سنبھالتی ہوئی روش میں مصروف خرام ناز ہیں۔ ادھر جہاں آرا اور سپہر آرا میدان دلربائی میں یکہ تاز ہیں۔ گیتی آرا گلہائے چمن کی نزاکت پر عش عش کرتی ہیں۔ بی عباسی پھول توڑ توڑ کے جھولیاں بھرتی ہیں اتنے میں سپہر آرا نے شوخی کے ساتھ گلاب کا پھول دور سے گیتی آرا کی طرف پھینکا۔ گیتی آرا نے اُچھالا تو سپہر آرا کی زلف چلیپا کو چھوتا ہوا ایک روش میں گرا۔ حسن آرا نے بھی پھول توڑے تو عباسی نے کہا۔ اے حضور لونڈی تو حاضر ہے حکم کی دیر ہے جھوٹوں پھول توڑ دوں۔ حضور نہ توڑیں۔ سلام اللہ کی قسم حضور خدا ناکردہ جو کہیں ذرا کانٹا چُبھا تو نصیب اعدا بے چین ہو جائیے گا۔

حسن آرا بیگم نے کئی پھول توڑے اور جہاں آرا بیگم سے گیند کھیلنے لگیں۔ انھوں نے ایک پھول پھینکا۔ انھوں نے روکا۔ انھوں نے جواب دیا انھوں نے روکا۔ ان کے دستِ حنائی ان کی نازک کلائی۔ جس وقت گیند پھینکنے کے لیے ہاتھ اُٹھاتی تھیں ستم ڈھاتی تھیں۔ وہ کمر کا لچکنا اور گیسوئے عنبر بار کا بکھرنا اور پیارے پیارے ہاتھوں کی لوچ اور مسکرا مسکرا کر نشانہ بازی کرنا عجب لطف دکھاتا تھا۔

عباسی۔ ماشاء اللہ سے حضور کس صفائی اور قرینے کے ساتھ پھینکتی ہیں۔

سپہر آرا۔ بس عباسی اب بہت خوشامد کی نہ لو۔ کیا جہاں آرا بہن صفائی سے نہیں پھینکتیں۔ باجی ذری چھٹتی زیادہ ہیں۔ مگر ہم سے نہ جیت پائیں گی دیکھ لینا۔

اب سنیے کہ ایک رفیق نے شہزادۂ روشن گہر سپہر سروری کے فرخندہ اختر مرزا ہمایوں فر بہادر کو جا کر اطلاع دی کہ جہاں پناہ اس وقت باغ میں گلبدنوں کا غنچہ کھلا ہے۔

شہزادہ۔ ہیرا مالی کو بلواؤ۔ حکم دو اسی دم حاضر ہو۔

رفیق۔ بہت خوب پیر و مرشد۔ کوئی ہے محمود۔ محمود۔

محمود خدمتگار سلیقہ شعار حاضر ہوا۔ آداب بجا لایا۔ آقا کا حکم سُنا سات بار سلام کر کے ہیرا کے پاس آیا۔ ہیرا ہیرا! ہیرا نے جواب دیا۔ باہر گیا تو دیکھا کہ شہزادے کا آدمی ہے۔ کہو کیا خبر لائے ہو بھئی!

محمود۔ حضور نے یاد کیا ہے اور کہا ہے لاؤ جا کے۔

ہیرا محمود کے ساتھ گیا جھک کر سلام کیا اور دست بستہ کھڑا ہوا۔ کہا خداوند غلام حاضر ہے جو حکم ہو بجا لائے۔

شہزادہ۔ حکم یہی ہے کہ اس وقت اپنے باغ کی سیر کراؤ بس۔

ہیرا۔ خداوند اس وقت تو معاف کر دیں سب وہیں ہیں۔

رفیق۔ حضور کوئی شعر لکھ بھیجیں۔ بس یہی چھیڑ کافی ہے۔

شہزادہ۔ اچھا بھئی لاؤ قلم دوات کاغذ شعر ہی سہی۔

گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

رفیق نے اس کا غذ کو چوم لیا اور کہا سبحان اللہ سبحان اللہ خداوند بس طبیعت کا حاضر ہونا اس کے معنی ہیں۔ کیا برجستہ شعر لکھا ہے۔ قلم توڑ دیئے۔ شہزادے نے ایک شعر اور لکھا۔

چھلکایا تو نے اک عالم کو ساقی جام گلگوں سے   ہمیں بھی کوئی ساغر، ہم بھی ہیں امیدواروں میں

رفیق (بہت غل مچا کر) واہ وا واہ سبحان اللہ۔ اے سبحان اللہ۔

آواز اس قدر بلند ہوئی کہ نیچے سے خدمتگار مصاحب چوبدار رفقا نوکر چاکر دوڑ پڑے۔ کیوں۔ کیوں خیریت ہے۔ خیریت ہے۔

محمود اور ہیرا مسکرانے لگے۔ خدمتگار وغیرہ سب دنگ۔ ہیرا دونوں کاغذ لے کر چلا۔ شہزادہ بلند ارادہ نے سمجھا دیا کہ سپہر آرا کو چپکے سے دے دینا۔ ہیرا گیا۔ دیکھا تو عباسی اور اُسی بوڑھی کھپٹ مغلانی میں گنگھپ ہو رہی ہے۔ اس تکرار کا سبب سنیئے۔

صبح کے وقت عبّاسی حسن آرا کے لیے کسگرنی کے ہاں سے دو نازک نازک جھجریاں لائی۔ پوچھا کتنے کی ہیں۔ کہا حضور ایک آنے کی دو لائی ہوں۔ ایسی جھجریاں شہر بھر میں نہ ملیں گی۔ بڑی بیگم نے جو چھوٹی چھوٹی اور نازک نازک جھجریاں دیکھیں تو ایک اور دھری کو جو عباسی سے سن میں زیادہ تھی حکم دیا کہ ہمارے واسطے بھی خرید لاؤ۔ وہ جا کے ویسی ہی جھجریاں دو آنے کو لائی۔ عباسی نے شام کے وقت باغ میں فخریہ بیان کیا کہ میں کتنی سستی چیز لاتی ہوں کوئی دھری خدمتگار چوبدار دربان رونا بھلا لا تو دے۔ اس پر اس کھوسٹ مغلانی نے جس سے عباسی سے چشمک تھی، دبے دانتوں کہا ہاں تم تو آنے کی دو لائیں اور وہ دھری دو آنے کی دو لائی۔ کیوں نہ سستی چیز لاؤ۔ وہ ادھیڑ ہے اور تم ابھی کمسن جوان ہو۔ اتنا سننا تھا کہ عباسی پلٹ پڑی۔

عبّاسی۔ تم بھی تو کسی زمانے میں جوان تھیں۔ بازار کو لوٹ لاتی ہوگی۔ میرے منہ نہ لگنا کبھی۔ نہیں جہاں کی ہو وہیں پہنچا دوں گی۔

مغلانی۔ (ہاتھ پھیلا کر) ہوش کی دوا کر چھوکری بہت بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بنا موئی شفتل زمانے بھر کی آوارہ۔ اور سنو۔

عباسی۔ دیکھیئے حضور یہ لام کاف زبان سے نکالتی ہیں اور میں حضور کا لحاظ کرتی ہوں۔ جب دیکھو طعنے کے سوا بات نہیں کرتی۔

جہاں آرا۔ چلو اب قصہ مختصر کرو۔ بس چپ رہو۔

مغلانی۔ مُنہ پکڑ کے جھلس دیتی مُردار آوارہ کا۔ اور سُنو۔

عباسی۔ دیکھ کس کا مُنہ جھلس اپنے ہوتوں سوتوں کا۔

مغلانی۔ ہم اب نوکری چھوڑ دیں گے۔ ہم سے یہ باتیں نہ سُنی جائیں گی۔

عباسی۔ (ناک پر انگلی رکھ کر) اُوئی تم تو بیچاری ننھی ہو۔ ہمیں گردن مارنے کے قابل ہیں۔ سچ ہے اور کیا۔

سپہر آرا۔ اب جھونٹم جھونٹا کی نوبت آنے والی ہے اور سارا قصور مغلانی کا ہے یہی روز لڑا کرتی ہے عباسی سے۔

مغلانی۔ اے حضور سچ ہی ہزار نعمت پائی۔ جو میں ہی جھگڑالو ہوں تو بسم اللہ حضور لونڈی کو آزاد کریں۔ اب سے آئے گھر سے آگے کوئی بات نہ چیت آپ ہی آپ گالی گفتے پہ آمادہ ہو گئی۔

عباسی۔ کیا جانے کن شہدیوں پھڑونگوں میں رہی ہے۔

جہاں آرا۔ امی جان سُن لیں گی تو ہم سب کو ڈانٹیں گی۔ توبہ توبہ۔

عباسی۔ حضور ہی انصاف سے کہیں پہل کس کی طرف سے ہوئی؟

جہاں آرا۔ بی مغلانی نے پہل کی۔ اس کے کیا معنی کہ تم جوان ہو۔

بڑی بیگم صاحب جریب ٹیکتی ہوئی تشریف لائیں مگر اس وقت یہ سب چہل کر رہی تھیں کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ اتنے میں عباسی نے کہا بڑی حضور محل سے برآمد ہوئیں۔ حسن آرا نے دیکھا تو گردن نیچی کر لی۔ سپہر آرا اور جہاں آرا منہ پھیر کر مسکرانے لگیں۔ گیتی آرا چپ۔ ارے! کیا اسی وقت آئیں، غضب ہی ہو گیا۔

بڑی بیگم۔ یہ کیا شہد پن مچا تھا (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) ہا۔ بڑے شرم کی بات ہے۔

جہاں آرا اور سپہر آرا کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ حُسن آرا نے گردن جو نیچی کی تو اٹھانے کی قسم کھائی۔ گیتی آرا نے سون کھینچی، کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔ سب نے چپ پیر کا روزہ رکھ لیا۔

بڑی بیگم۔ مغلانی یہ کیا شور مچا تھا؟ ادھر آؤ۔ جلد بتاؤ۔

مغلانی۔ اے حضور بات مُنہ سے نکلی اور عباسی نے ٹیٹوا لیا۔

بڑی بیگم۔ کیوں عباسی یہ کیا کہتی ہیں۔ سچ سچ بتاؤ۔ خبردار!

عباسی۔ (دو گرم حضور (سسکی بھر کر) حضور۔

بڑی بیگم۔ اب ٹسوے پیچھے بہانا۔ پہلے ہماری بات کا جواب دو۔

عباسی۔ حضور جہاں آرا بیگم سے پوچھ لیں۔ ہمیں آوارہ کہا۔ بیسوا کہا۔ کوسا، گالیاں دیں۔ جو زبان میں آیا کہہ ڈالا۔ اور حضور آنکھوں ہی کی قسم کھاتی ہوں۔ آنکھوں سے پیارا اور کچھ نہیں ہے جو میں نے ایک بات کا بھی جواب دیا ہو۔ چپ سُنا کی۔

بڑی بیگم۔ جہاں آرا کیا بات ہوئی تھی۔ ہاں بتاؤ صاف صاف۔

جہاں آرا۔ امی جان۔ عباسی نے کہا کہ ہم دو چھریاں ایک آنے کی لائے اور دوسری چھری نے دو آنے لیے۔ اس پر مغلانی بولیں کہ ہاں ابھی جوان ہو اس سے ہر شے ارزاں خریدتی ہو۔ بس یہی ابتدا ہوئی۔

بڑی بیگم۔ ہونہہ! کیوں مغلانی۔ اس کے کیا معنی جوان ہے۔ اس سے جو سودا لاتی ہے بازار والے مُفت اُٹھا دیتے ہیں۔ بال سفید ہو گئے۔ مگر ابھی تک آوارہ پنے کی بُو مزاج سے نہیں گئی۔

حسن آرا۔ ان دونوں میں چشمک ہے۔ جب تک یہ دونوں رہیں گی آئے دن دال جوتی میں بٹے گی۔ دونوں بدمزاج ہیں۔

بڑی بیگم۔ مغلانی۔ تم کو ہم نے موقوف کیا۔ آج ہی نکل جاؤ۔

مغلانی نے سلام کیا اور کہا بہت خوب۔ بڑی بیگم صاحب محل میں تشریف لے گئیں۔ عباسی جہاں آرا کے قدموں پر گر پڑی اتنے میں موقع پا کر ہیرا نے دونوں رقعے سپہر آرا کو دیئے پڑھ کر یوں جواب لکھا۔

اے ہے تم تو کچھ ایسے جلد باز آدمی معلوم ہوتے ہو کہ توبہ ہی بھلی۔ شادی بیاہ بھی گُڑیا گُڈے کا کھیل ہے۔ سب معاملہ جو کس ہے۔ تمھاری طرف سے پیغام تو آتا نہیں۔

ہیرا نے شہزادے کو خط دیا۔

زنداں کو چلے مچل مچل کر

اب سنیئے کہ جب آزاد کو ذرا ذرا ہوش آیا تو کاسکوں نے زمین سے اٹھایا، چشمے کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے منہ دھلوایا۔
آزاد نے آنکھیں کھولیں تو ہر سمت کاسک ہی کاسک نظر آئے، مگر کچھ غشی اور کچھ فرط رنج و قلق سے حواس باختہ۔
کاسک۔ دیکھو آزاد پاشا ایسا نہ کرو کہ ہلکان ہو جاؤ۔ سیبیریا تک پہنچنے بھی نہ پاؤ اور جان جاتی رہے۔ شاید وزیر جنگ کا
دل پسیجے اور قید سے چھٹکارا پاؤ۔ سائیں کے سو کھیل۔
آزاد۔ (آہ سرد بھر کر) بس اب دل پسیج چکا۔ تمہارے وزیر جنگ سے خدا سمجھے۔ صرف بوسہ بازی کے جرم پر کہیں کا نہ رکھا، افسوس۔
کاسک۔ ہمارا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ تم کو چھوڑ دیں، مگر نمک حرامی وضع کے خلاف ہے، آزاد پاشا ذرا دل کو ڈھارس دو۔

آن پہنچے

اب سنیئے کہ خواجہ بدیع الزمان روسی فوج میں قید ہوئے اور آزاد کے مصنوعی باپ بنے تو ان کی توقیر و تعظیم ہونے لگی۔ ان کے ہمدرد ترکی قیدی ہردم خدمت گذاری کے لیے مستعد رہتے تھے۔ ایک روز روس کے ایک میجر نے ان کی انوکھی قطع اور نرالی وضع اور ماشے ماشے بھر کے ہاتھ پاؤں جو دیکھے تو جی چاہا کہ ان سے باتیں کریں۔ ایک ترکی کو جو فارسی دان تھا مترجم مقرر کر کے خواجہ بدیع الزمان صاحب سے باتیں ہونے لگیں۔

خوجی۔ حضور کی کمال مہربانی ہے کہ آزاد پاشا کے پدرِ بزرگوار سے ملے۔

میجر۔ اوہ۔ آپ آزاد پاشا کا بوڑھا باپ ہے۔ بڑا یہ کہیئے۔

خوجی۔ باپ تو کیا ہوں۔ مگر خیر جو کچھ کہ ہوں سو ہوں بالغرض آفت رسیدہ ہوں۔ مصیبت کا مارا خواجہ بدلیا۔

اثنائے گفتگو میں روسی افسر نے پوچھا۔ آپ بھی کسی لڑائی میں کبھی شریک ہوئے تھے؟ خوجی آگ ہو گئے۔ جھلا کر جواب دیا۔ واہ۔ فوج کے افسر اور ایسے کوڑھ مغز آج ہی دیکھنے میں آئے۔ ہمارا کینڈا ہی گواہی دیتا ہے جی کہ ہم فوج کے جوان ہیں۔ کینڈے سے نہیں پہچانتے۔ اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔

بارہا من گفتہ ام اے سروراں　　　　پہلوانم پہلوانم پہلواں!

اس کا ترجمہ کیا گیا تو روسی میجر نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو خلل دماغ ہے واہی تباہی بک رہا ہے۔

خوجی۔ دگلے والی پلٹن کے رسالدار تھے۔ اختری پلٹن کے کمیدان۔ ہم سے پوچھتے ہیں کوئی لڑائی دیکھی ہے یہ! دیکھی ہے؛ شریک ہونے کا ذکر ہی نہیں۔ جی حضرت یہاں وہ وہ لڑائیاں دیکھی ہیں کہ انسان کی بھوک پیاس بند ہو جائے۔

جہاں دیدۂ ہند خواجہ بدیع　　　　کہ عقلش چو بحرِ عرب شد وسیع

خواجہ بدیع سے اور پوچھیں کہ کیوں کبھی کبھی جنگ بھی دیکھی ہے بھنرار لاکھ کروڑ پدم سنکھ سمجھے۔ جنگ!!!

میجر۔ آپ لوگ گولی چلا سکتے ہیں! نشانہ کبھی لگایا ہے؟

خوجی۔ اجی حضرت اپ فصد کھلوایئے۔ گولی چلائی یا نہیں چلائی مگر سامنے ہو جائے تو توبہ ہی بھلی۔ ہم وہ گل چلے ہیں مشفق۔

بوتل کی کاگ زد میں توبہ کوسے اُڑی

ہم گل چلوں کے ہاتھ کی گولی رکی نہیں　　　　(دریا من خیرآبادی)

ایک مرتبہ ایک کتے سے اور ہم سے لاگ ڈانٹ ہو گئی۔ خدا کی قسم ہم سے گیارہ بارہ قدم کے فاصلے پر کتا کھڑا تھا۔ دم کے دا غتا ہوں تو پوں پوں کرتا ہوا کتا بھاگ کھڑا ہوا۔

میجر۔ اوہ۔ آپ بڑا گل چلا ہے۔ خوب گولی لگائی کہ کتا پوں پوں کرتا بھاگا۔

میجر نے ان کی گپ اور بے تکی باتیں سن کر حکم دیا کہ ایک دونالی بندوق لاؤ۔ تب تو خواجہ صاحب چکرائے۔ سمجھے کہ سات پیڑھیوں تک کسی نے بندوق چلائی نہ تھی۔ ہم کو یاد ہی نہیں آتا کہ بندوق کبھی عمر بھر چھوئی بھی ہو۔ اتنا تو جانتے ہیں کہ بندوق میں گ

ہوتا ہے اور قرابین میں گز نہیں ہوتا اور تپنچہ بندوق سے بڑا ہوتا ہے۔

راوی۔ پڑیں پتھر سمجھ پر ایسی تم سمجھے تو کیا سمجھے۔ واہ میاں کیدان۔

میجر۔ اُڑتی چڑیا پر نشانہ لگا سکتے ہو خطا نہ کرے گا نشانہ۔

خوجی۔ (اپنے دل میں) اجی یہاں بیٹھی چڑیا پر تو نشانہ پڑ ہی نہیں سکتا اُڑتی چڑیا کیسی (کڑک کر) اجی آسمان تک کے جانوروں کو بھون ڈالوں۔

میجر۔ اچھا بندوق آتی ہے دیکھیں آپ کی لیاقت۔

خوجی۔ تاک کر نشانہ لگاؤں تو درخت کی تپیاں گرادوں فورن

میجر۔ اس تقریر سے بھی سمجھ گیا۔ گاؤدی اور ناواقف آدمی ہے مگر گپ اُڑانے کا بادشاہ۔

بندوق سامنے رکھ دی اور کہا لیجئے بندوق حاضر ہے۔

خوجی۔ آسمان کی طرف نظر کرکے کمال دلجمعی کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ اور یہ شعر پڑھنے لگے ؎

نہ ایک دن ربطِ جسم و جاں ہے نہ پاس یہ دولت و حشم ہے
فنا فنا ہے فنا فنا ہے عدم عدم ہے عدم عدم ہے

میجر۔ ایں! بوکھلا گیا؟ اجی حضرت بندوق حاضر ہے نشانہ لگائیے۔

خوجی۔ زمین کو خوب زور سے ٹھوکر دے کر بآوازِ بلند ؎

نہ بھولوں گا شبِ وصلت میں بوسہ مانگنا اپنا لجا کر مسکرانا منہ چھپانا ان کا آنچل سے

میجر۔ اجی حضرت ہم آپ سے کہتے ہیں او گانے والے۔ ایں! واہ رے۔

میجر کے بیان کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ فارسی میں خوجی سنتے جاتے تھے مگر بندوق کے خوف کے سبب سے دیوانے بن گئے۔

واہ رے استاد۔

میجر نے بآوازِ بلند کہا۔ اب بندوق لیتے ہو یا اسی بندوق سے تم کو نشانہ بناؤں (مسکرا کر) بولو جھٹ پٹ۔

خوجی۔ (مترجم سے) بابائے ماشنو۔ من مثلِ زنبیلِ عمرو عیار رستم کہ ہمہ دانی اور گولی داغیدن استاد۔ جنگ کردم بے بدل۔

بڑی دیر تک دل لگی رہی۔ میجر خواجہ صاحب کے تمسخر سے اس قدر خوش ہوا کہ پہرے والوں کو حکم دیا کہ ان پر بہت سختی نہ کرنا۔
شب کو خواجہ بدیع سوچے کہ اب بھاگنے کی تدبیر ضرور سوچنی چاہیئے ورنہ جنگ ختم ہو جائے گی اور ہم ادھر کے رہیں گے نہ اُدھر کے۔
آخر آزاد کے قید ہو جانے سے ان کو سخت رنج تھا کہ تیر و سدیش برجان درویش ادھر اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ آدھی رات کے وقت
اٹھے اور دعا مانگنے لگے۔ یا خدا یا معبود۔ یا قہار یا جبار۔ آج رات کو خواجہ بدیع اس قیدِ فرنگ سے نجات پائے۔ ترکوں کا لشکر نعرہ لگائے
خواجہ بدیع غل مچائے کہ آن پہنچے آن پہنچے۔ خواجہ بدیع الزماں آن پہنچے اور خدا یا آزاد سے بھی ملاقات ہو۔ یہ دعا مانگ کر بہت روئے اور
کہا ؎

تو گفتی ہر آنکس کہ در رنج و تاب دعائے کند من کنم مستجاب

خوجی بے اختیار روئے۔ ہائے اب وہ دن کہاں نصیب ہوں گے کہ نواب کے دربار میں گپ اُڑا رہے ہوں! رفقا اور مصاحبین
ہم پر اور ہم اُن پر منہ آ رہے ہوں۔ وہ دل لگی وہ چہل و فقرہ بازی اب نصیب ہو چکی۔ ہائے افسوس کس مزے سے کٹی جاتی تھی اور کس
لطف سے گنڈیریاں چوس چوس کر کھاتے تھے۔

دو بجے گئے وقت خوجی نے افیم گھولی اور چُسکی لگائی۔ تہ برتہ جمائی۔ اتفاق سے ان کی نظر ایک چھوٹے سے ٹٹو پر پڑی۔ حضرت
خواجہ بدیع صاحب آگے بڑھے اور خدا خدا کر کے یابو کے قریب گئے۔ گردن پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ غازی مرد کہیں دغا نہ دینا۔ ماناکہ تم چھوٹے موٹے
ٹٹو ہو اور خواجہ بدیع کا بوجھ تم سے نہ اُٹھ سکے گا مگر کچھ پروا نہیں۔ ہمتِ مرداں مدد خدا۔ یابو کو کھولا اور ننگی پیٹھ پر سوار ہوئے۔ پھر اُترے،
رستم، پڑی بھی اُس کی لگام بنائی۔ سوار ہوئے اور آہستہ آہستہ پو قدمے جانے لگے۔ بدن کانپ رہا تھا۔ جب کوئی سو قدم کے فاصلے پر نکل گئے
تو جان میں جان آئی۔ جنگل میں دو چار بار خوب غل مچایا۔ فتح فتح فتح۔ دو کروڑ روسیوں میں سے خواجہ بدلیعا نلوہ نکل آیا۔ واہ رے بدیع
اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ لو بھئی ترکو! خواجہ بدلیعا آن پہنچے آن پہنچے خواجہ بدلیعا آن پہنچے۔ غل مچا کر سو رہے تو ایسی میٹھی نیند آئی کہ عمر بھر کبھی
نہیں آئی تھی۔ دو گھنٹے کے بعد اُٹھے فوراً یابو پہ قدمے اور چلے۔ تھوڑی ہی رات باقی رہی تھی کہ انھوں نے پہاڑ کے قریب دو فوجیں
آراستہ دیکھیں۔ یا الٰہی ترکی ان میں کون ہیں اور روسی کون ہیں۔ بہت غور کر کے دیکھا تو جانب شرق گئے۔ وہاں دیکھتے کیا ہیں کہ اس فوج
سے وہ لشکر بعید پر ہے فوراً یابو کو ایڑ لگائی اور فتح فتح کرتے ہوئے فوج کی طرف چلے۔ قریب جا کر غل مچایا ار آن پہنچے آن پہنچے خواجہ بدلیعا
آن پہنچے)

ہانک رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور دوسرے آدمی نے یابو سے اُتار لیا۔

خوجی۔ ایں! کون ہے بھئی۔ نہ میاں۔ دل لگی بازی کا وقت نہیں، آزاد ہیں، میں سمجھ گیا بھئی یہ کُھلی بازی رہنے دو۔ سن تو لو ہے ہے
نہیں جانتے میاں لاحول ولا قوۃ۔

راوی۔ ذرا آنکھیں تو کھولیے اب نشہ ہرن ہوا جاتا ہے۔

خوجی سارے میاں نہیں مانتے۔ آخر ش کہاں چلتے ہو۔

راوی۔ گھبرانے کی نہیں۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہوا جاتا ہے۔ ساری غنیمت رکھی رہے گی۔ دو کروڑ روسیوں میں سے نکل تو اب آئے ہیں
آپ۔ مگر خیر۔

ناچار پابہ ستہ دگرے دست بدست دگرے۔ لشکر میں آئے تو دیکھا کہ روسی ہی روسی نظر آتے ہیں، لگے سر پیٹنے۔ ارے ہائے غضب!

خوجی کی مصیبت

روسیوں نے خوب قہقہے لگائے۔ خوجی دل ہی دل میں کٹے جاتے تھے مگر قہر درویش بر جان درویش، روسیوں نے خوجی سے گفتگو شروع کی،

ایک روسی۔ تم کس ملک کے آدمی ہو حبش یا ہند یا چین یا برہما کے؟

دوسرا۔ (چپت جما کر) خوب جمی۔ چٹاخ سے پڑی۔ ایک اور دو نگا۔

خوجی کی چاند پر بے بہا کی پڑنے لگیں۔ اُدھر دیکھا اِدھر پڑی۔ تڑ۔ اُدھر دیکھا اِدھر پڑی۔ چٹاخ۔ بوکھلا گئے کہا اچھا گیدی۔ اس وقت تو بے بس ہوں اب کی پھندوں تو خواجہ بدیع الزماں نہیں اور قسم ہے اپنے قدموں کی کہ آج تک مردم آزاری کبھی نہیں کی اور سب کچھ کیا پتنگ لڑائے۔ بٹیر لڑائے۔ مرغ لڑائے۔ چانڈو پیا۔ افیم کھائی چرس کے دَم لگائے۔ مدک کے چھینٹے اڑائے۔ مگر مردم آزاری کس مردود نے کی ہو۔

خوجی۔ کیوں بابا زبان ملک فارسی می شنیدہ تو انی کرد۔ من بدیع کہ ایرانی الاصل ہستم جانتا یہ ہوں کہ در کسی محکمہ ہر آنچہ خواہد پسندیدہ خواہم بیم کہ حسب حصول مدعا کنم۔ فدوی خواجہ بدلیا۔

خوجی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے روس کی فوج کے چند رقیق القلب آدمیوں نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو رحم کھا کر کہا بس اب اس کو دق نہ کرو۔ پہلے دریافت تو ہو لے کہ یہ ہے کون شخص؟ ایک بولا یہ ترکی ہے۔ وضع کسی قدر بدل ڈالی ہے دوسرے نے کہا یہ حبش کا مسلمان ہے تیسرے نے رائے دی کہ یہ گوئندہ[1] ہے اس آخری رائے سے عموماً سب نے اتفاق کر لیا کئی آدمیوں نے خوجی کی تلاشی لی۔ اب خوجی اور تو سب اسباب دکھاتے ہیں مگر افیم کی ڈبیا نہیں کھولنے دیتے وہ اصرار کرتے یہ انکار کرتے۔

روسی۔ اس میں کون چیز ہے جو تم اس کو کھولنے نہیں دیتے۔ ہم منرور بالضرور دیکھیں گے اسی میں کچھ ضرور ہے۔

خوجی۔ (جھلا کر) او گیدی ماروں گا بندوق دھواں اُس پار ہو جائے گا۔

خوجی نے بڑی کوشش کی کہ اظہار ما فی الضمیر کریں مگر ان کی زبان کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ آخر کار ما وراء النہر کا ایک باشندہ بلوایا گیا۔ اس نے خوجی کی باتوں کا ترجمہ کیا اور روسیوں کو سمجھایا۔ خوجی نے کہا پوچھو ہم کو کس علت میں گرفتار کر لائے ہو؟ ہم سے کون قصور سرزد ہوا؟ روسیوں نے جواب دیا کہ تم ترکی ہو اور ترکی فوج کا سا لباس پہنے ہو۔ اور ہم کو شک کی جگہ یقین ہے کہ تم گوئندے ضرور ہو۔ لہذا لازم آیا کہ تم کو قید کر لیں۔ خوجی نے کہا یہ خیال خام ہے۔ اول تو میں ترکی نہیں ہندی ہوں۔ دوسرے پست قد اس قدر ہوں کہ فوج میں بھرتی ہونے کے قابل نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ مسافر پردیسی ہوں اگر گوئندہ ہوتا تو اس وقت بیان کیا کرنے آتا۔ فوج آمنے سامنے ہے آپ کا حال ترک اور ترکوں کا حال آپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ پھر گوئندے اور مخبر کی کیا حاجت تھی۔ اور یوں تو آپ کو اختیار ہے قید کیجیئے چاہے رہائی دیجیئے۔ اب تو آ پھنسے تمھارے پھندے میں اختیار ہے جو چاہو کرو۔

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

---

[1] جاسوس۔

ماوراءالنہر کا باشندہ بڑی دقت سے خوجی کا مطلب سمجھا۔ خواجہ صاحب تو خاص ایران کی ٹھیٹھ گفتگو کرتے تھے نہ پھر بھلا اہل عجم کے سوا اور کون سمجھتا۔ اُن کی فارسی پر ان کو بڑی ہنسی آئی۔ خصوصاً اس فقرے پر: "مرا قید کردن و برمن لکد کوب نمودن و باز بریں امور خندیدن و فہمیدن کہ کارہائے بزرگ لکد کوب و زد و کوب است کہ سرما و مغز ما وا ماندہ است طریقہ خوب نیست بلکہ بہاں تک زشت و پوچ طریق است بتیوا و توجرد۔ ربیان کرد تم پس اجرپاؤ تم"۔ روسیوں نے ان کو پنجرے میں بند کر دیا اور ارد گرد چار آدمی تعینات ہوئے کہ کھولنے نہ پائیں۔ خواجہ بدیع بیچارے بیکسی کی حالت میں سخت متوحش تھے۔ ایک بار نعرہ بلند کیا کہ ہائے افسوس، دوسری بار کہا، آزاد پاشا خواجہ بدیع نے حق نمک ادا کر دیا۔ اب خواجہ صاحب بھی قید بھگت رہے ہیں مگر صرف مٹھائی کے لیے۔

بیلا اور چنبیلی کی کہانی

عروس منزل میں حسن آرا بیگم اور ان کی گلبدن اور غنچہ دہن بہنیں گیند کھیل کے باغ کے چبوترے پر بیٹھیں۔ جہاں آرا اور گیتی آرا کھیلتے کھیلتے کسی قدر تھک گئی تھیں۔ حسن آرا اور سپہر آرا کے ابھی تک وہی خم دم تھے۔

اتنے میں سپہر آرا بیگم نے باصرار کہا بی مغلانی کوئی کہانی کہو۔ مغلانی نے پوچھا کس کی کہانی کہوں بگل باصنوبر چہ کرد۔ لیلیٰ مجنوں کی چڑیاں کی بندی چھڑا دو۔ بڑھئی لے بڑھئی تیرا نام کیا ہے۔ بی آتی کہانیوں میں کون پسند ہے۔ سپہر آرا نے منہ بنایا۔ اب ہمیں کیا معلوم کہ کون سی کہانی کیسی ہے۔ پر جگ بیتی نہ کہو اپنی بیتی کہو۔ اس پر مغلانی مسکرائیں اور سپہر آرا کے کان میں خدا جانے کیا کہا کہ وہ جھینپ کر مغلانی کو صلواتیں سنانے لگیں سر پیٹنے لگا۔ مگر چپل میں بند نہیں ہو خبردار جو آج سے پھر کبھی ایسی بات کہی۔ مغلانی نے یہ کہانی شروع کی:۔

ایک ملک کے بیچ میں دو عاشق و معشوق تھے۔ بیلا اور چنبیلی۔ بیلا اس قدر مقبول صورت جوان گبھرو تھا کہ جو عورت دیکھتی تھی اس کی نگاہ کی گھائل ہو جاتی تھی، اور چنبیلی کی سی پری کسی نے آنکھوں سے نہیں دیکھی تھی۔ ایک دن بیلا گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا کھانے کو نکلا، تو جھروکے سے چنبیلی نے اس کی صورت دیکھی۔ بس ہزار جان سے عاشق ہو گئی۔ دیکھتے ہی سر پر ایک گل عباسی کا پھول مار ارادی اگل عباسی کے پھول پر حسن آرا اور جہاں آرا کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور پر ہی او پر پیغام آنے لگے۔ بیلا نے چنبیلی کے پاس پیغام بھیجا اور چنبیلی نے بیلا کے پاس۔ اب سپہر آرا بیگم شرمائیں ہم اور کچھ نہ کہیں گے۔ بس سپہر آرا جھلائیں۔ اٹھ پٹک کر کہا۔ اللہ تم سے سمجھے بڑی بیہودہ مغلانی۔ مغلانی بولی۔ ایک دن چنبیلی اپنی بہنوں کے ساتھ گیند کھیلتی تھی چنبیلی اور کیتکی اور جوہی اور نرگس۔ حسن آرا نے تالیاں بجا کر کہا۔ ہم سمجھ گئے چنبیلی سپہر آرا کیتکی ہیں جوہی جہاں آرا بہن نرگس گیتی آرا بہن، اور بیلا؟

بیلا کون ہے مغلانی۔ اخاہ۔ بس اب سب کہانی معلوم ہو گئی۔ بیلا ہمایوں فر۔ سپہر آرا کسی قدر شرمائیں۔ تنک کر بولی پھر چنبیلی تم ہو۔ وہ بیلا تم چنبیلی۔ حسن آرا نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کی چنبیلی اس کو مبارک رہے۔ مغلانی بہت ہنسی اور پوپلے منہ سے بولی تو حضور چاروں بہنیں گیند کھیل رہی تھیں۔ چاروں کی چار کمسن، چودہ چودہ پندرہ پندرہ سولہ سولہ برس کی اور چاروں کی چاروں تیز اور ایک سے ایک حسین۔ چنبیلی کا دوپٹہ پلی لوٹن رنگ کا تھا۔ اس رنگ کے نام پر چاروں بہنوں کے کان کھڑے ہوئے۔ مغلانی سے پوچھا لوٹن کون رنگ ہے، کہا حضور یہ رنگ اس زمانے میں ایجاد ہوا تھا۔ شربتی رنگ کے شکل ہوتا تھا اور اس طرح کی خوشبو آتی تھی کہ آدمی مست ہو جاتا تھا اور جو بلی سونگھتی تو لوٹنے لگتی۔

اب سنئے کہ سپہر آرا اپنے دوپٹے کو جب رنگوانے چلیں تو حکم دیا کہ اس میں خوشبو ضرور رہو۔

بڑی مغلانی نے جو دیکھا کہ اس کہانی کو سب نے پسند کیا تو کچا چٹھا بیان کیا حضور بس رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ چنبیلی نے بیلا کو صاف صاف لکھ بھیجا کہ میاں کیا جھوٹی باتیں بناتے ہو سب ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے۔ پیغام تو تمہاری طرف سے آتا ہی نہیں دانتوں تلے انگلی دبا کر اے ہے بے خبر تو ہوش اڑ گئے۔ نئی بات سننے میں آئی آج تک دلہن نے کبھی کسی کو لکھا تھا بھلا کہ تم پیغام بھیجو تو شادی ہو۔ مگر چنبیلی کا عشق اوسکے عشق سے بڑھا ہوا تھا وہ کہہ گذریں۔

سپہر آرا دنگ ہو گئی۔ یا الٰہی اس سے کس نے کہہ دیا۔ چپکے سے ہمایوں فر کے نام خط لکھا تھا مغلانی سے کس نے کہہ دیا۔ حسن آرا نے گردن نیچی کر لی۔

گیتی آرا ہنسنے لگیں۔ جہاں آرا بیگم نے سپہر آرا کی طرف دیکھ کر کہا۔ واہ بہن واہ شاباش ہے ایسا ہی چاہیئے ابھی اتی جان سن لیں تو تو بہ ہی بھلی۔ خدا جانے کیا کا کیا کر ڈالیں۔ بس خیر اسی میں ہے کہ ان تک خبر نہ پہنچنے پائے۔ بی مغلانی کہیں ان کے سامنے نہ بک دینا ایسا نہ کرنا کہ وہ بھی بگڑ کھڑی ہوں اور بد دماغ ہو جائیں۔

مکالمۂ جان پرور

ایک روز دو گھڑی دن رہے بڑی بیگم صاحب کے پائیں باغ میں چاروں پریاں بناؤ چناؤ کرکے بولیوں ٹھولیوں چہل دل لگی سے دل بہلا رہی تھیں۔ چاروں پر نور کا عالم تھا اور عباسی مہری کے حسن خداداد اور اٹھتی جوانی کی اُمنگ نے اس رباعی کو مخمس کر دیا تھا۔ حسن آرا کی وضع سادی تھی مگر یہ سادگی بھی ہزار بناؤ سے گوئے سبقت لے گئی تھی۔

سپہر آرا کا دوپٹہ ہوا کے جھونکوں سے اڑا جاتا تھا تو لال لال موباف اور گوری گوری گردن صاف و شفاف جوبن صاف نظر آتا تھا۔ جہاں آرا بیگم موتیے کے عطر میں بسی تھیں۔ تمام باغ مہک رہا تھا۔ گیتی آرا کا سیاہ ریشمی دوپٹہ گورے گورے مکھڑے کی آتش حسن کو اور بھی مشتعل کرتا تھا۔

بی عباسی ململ کا دوپٹہ اوڑھے تھیں اور فالسئی اطلس کا لہنگا، چوڑی چوڑی پڑا تے دار گوٹ۔ کانوں میں بجلیاں اور انتیاں۔ باغ کے چبوترے پر فرش بچھا تھا۔ ادھر اُدھر روشوں میں کرسیاں پڑی تھیں۔ کیاریاں خوب سینچی گئی تھیں۔ اب چاروں پانچوں کا مکالمۂ جان پرور سنیئے۔ ایک سے ایک طرار ایک سے ایک مزیدار۔

حسن آرا۔ گیتی آرا بہن۔ یہ گرمی کے دن اور کالا ریشمی دوپٹا۔

گیتی آرا۔ پھر ہلکا پھلکا ہے کہ نہیں۔ خاص انھیں دنوں کے لیے تو ہے۔

حسن آرا۔ اب کہنے سے تو بُرا مانیئے گا۔ جہاں آرا بہن ٹھہریں تو آج دولہا بھائی آنے والے ہیں۔ یہ آپ نے ریشمی دوپٹہ کیا سمجھ کے پھڑکایا۔ ہمیں خفقان ہوتا ہے۔ سفید دوپٹہ اوڑھیئے۔

گیتی آرا۔ یوں تو اوڑھ بھی لیتے مگر اب نہ اتاروں گی۔ جائیے آپ کی بلا سے۔

عباسی۔ آج چبوترے پہ اچھی طرح چھڑکاؤ نہیں ہوا۔ یہ موا سقا آدھی مشک لاتا ہے اور ہیرا بھی نہیں ٹوکتا۔ موا اُبو ئیک۔

ہیرا۔ ابھی تر بتر کر دیا ہے۔ کوئی دس مشکیں تو چبوترے ہی پر ڈالی ہونگی۔ ذری بیٹھ کر دیکھیئے۔

حسن آرا نے ایک پھول توڑا تو جہاں آرا بولیں۔ بہن دونوں وقت ملتے پھول نہیں توڑتے۔ حسن آرا نے قہقہہ لگا کر کہا بھلا یہ دونوں وقت ملتے کیا ہوتا ہے۔ سب وقت اللہ کے بنائے ہیں۔ ہم ہار بنائیں گے۔ جہاں آرا نے کہا اے تو وہ نگوڑا مالی پھر کاہے کو نوکر رکھا ہے۔ اس کو برطرف کر دو۔ تم دونوں بہنیں یا غبانی کیا کرو۔ چلو چھٹی ہوئی۔

سپہر آرا نے عباسی کے کان میں کہا۔ اب تم شادی کر لو۔ نہیں بہت پچھتاؤ گی۔

عباسی۔ حضور جان بخشی ہو تو عرض کروں۔ آپ اپنے راجہ نل کا دھیان کریں۔ وہ جو کوٹھوں کوٹھوں پیام بھیجتے ہیں (مسکرا کر) بندگی!

سپہر آرا۔ تمھاری شامتیں آئی ہیں اب پٹو گی کسی روز۔ اے واہ!

عباسی۔ اے بیوی میں صدقے گئی۔ میں بھی بن بیاہی کنواری۔ آپ بھی بن بیاہی کنواری شادی دونوں کی ہو گی اور حضور کا جایوں فر کے ساتھ نکاح ضرور ہوگا۔

سپہر آرا۔ اے تو یہ تمھیں کیونکر معلوم ہو گیا کہ خواہی نخواہی شادی ہووے ہی گی اور جو نہ ہوئی ہم نے نہ منظور کیا تو پھر کیسی ہو؟

اسی - ہمارا دل گواہی دیتا ہے۔ حضور کا اُن پہ دل آیا ہے اور وہ حضور پر ایسے شیدا ہیں کہ تڑپ رہے ہیں۔ میرا اللہ گواہ ہے۔
ہر آرا۔ تم نے کوئی تجویز کیا۔ تم کیوں نہیں شادی کر لیتیں بولو عباسی۔
اسی۔ (کچھ سوچ کر) اے حضور میری بھلی چلائی۔ کوئی پڑھا لکھا سفید پوش اور خبصورت (خوبصورت) جوان ہو تو نکاح پڑھوا لوں۔
ریوں تو بندی کو بن بیاہی رہنا اچھا۔ بس بات ساری اتنی (اتنی) ہے حضور۔
ہر آرا۔ میرزا ہمایوں فر کے گھر نہ پڑ جاؤ۔ شہزادے ہیں خوبصورت ہیں۔
باسی۔ (ہنس کر) واہ۔ اے وہ بھی جم جم جئیں۔ اللہ کرے ہم آپ کا ان کا جوڑا دیکھیں۔ چاند سورج کی جوڑی۔ آمین!
اتنے میں حسن آرا اور سپہر آرا اور جہان آرا تینوں بہنیں رنگترے کے درخت کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ تینوں کے سر کھلے
ئے دوپٹے کھسکے ہوئے تینوں بے حجاب بر افگندہ نقاب۔ تینوں نشۂ بادہ سرور سے سرخوش و تردماغ۔ تینوں شادماں
زحاں۔ تینوں باغ باغ۔
باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عباسی نے کہا۔ اوئی یہ کون ہے۔ حسن آرا اور جہان آرا نے دیکھا تو دھک سے رہ گئیں۔ تینوں بہنیں نگترے
، درختوں سے ہو کر کر وندے کے نیچے چھپ کر جا بیٹھیں۔ مگر گیتی آرا ابھی تک چبوترے پر لیٹی ہی ہیں اور لیٹی بھی تو بالکل خوش غلاف۔
وپٹا الگ پڑا ہے۔ ایک پائنچا کسی قدر چڑھا ہے دوسرا سمٹا سمٹایا ہے۔ ایک مہری پنکھا جھل رہی ہے۔ عباسی نے آواز دی۔
ے گیتی آرا بیگم حضور! ادھر چلی آئیے ذری دیکھئے تو سہی۔ پہلے مہری کی نظر پڑی۔ پھر گیتی آرا کی۔ بڑی پھرتی کے ساتھ اٹھیں۔
رے توبہ کس حالت میں دیکھ لیا۔ دوپٹہ اٹھایا اور اوڑھنا چاہا۔ مگر ہوا کے سبب سے دوپٹے کا کونا ایسا اڑا جاتا تھا کہ توبہ
ں بھلی۔ بدن کو چرائے جسم کو چھپائے ہوئے کھپریل کی اوٹ میں کھڑی ہو گئیں۔ عباسی نے دیوار کے پاس جا کر کہا۔ واہ واہ۔ آپی
ل گئی نکالی ہے کیا غضب شملہ ہے۔ اس کے معنی کیا۔ ہاتھ دیتے ہی پہنچا پکڑ لیا۔ گیتی آرا نے پکارا۔ عباسی۔ اے عباسی۔ مہری نے عباسی
و آواز دی۔ گیتی آرا نے پوچھا یہ ہیں کون۔ کوئی بڑے رئیس زادے معلوم ہوتے ہیں۔ ہے ہے دھک سے رہ گئی۔ اب مجھے کیا معلوم
ھا کہ نشست لگائے بیٹھے ہیں توبہ توبہ۔ یہ سب کہاں ہیں۔
اب سنئیے کہ شہزادہ ہمایوں فر بہادر ہمیشہ اسی ٹوہ میں رہتے تھے کہ سپہر آرا بیگم کیا کرتی ہیں۔ جب موقع ملا کسی نہ کسی طرح آنکھیں
ینک لیں۔
سپہر آرا نے چاہا کہ آنکھ بھر کر اس جوان رعنا پر نظر ڈالیں مگر حیا مانع ہوئی۔ شہزادے کو دعوےٰ تھا کہ سپہر آرا ہزاروں اور لاکھوں
یں ہم پر نظر ڈالے۔ عشق خام نہیں ہے کہ حیا اور شرم کا خیال دل میں آئے۔ یا کسی کے کہنے سننے سے جھینپ جائے۔ مگر سپہر آرا ہجولیوں
کے طعنے سے خائف ہو کر دیکھ نہ سکیں۔ شہزادے سمجھے کہ کسی نے ہماری طرف سے اُن کے کان بھر دیئے ہیں ہائے۔ بڑا غضب
کر دیا۔
سپہر آرا اور حسن آرا اور جہان آرا تو جھینپ کر آڑ میں چلی گئی تھیں مگر گیتی آرا اس قدر خفیف ہوئیں کہ توبہ ہی بھلی۔

کلپٹومینیا

شہزادۂ فرید دل قدر پرنس ہمایوں فر بہادر کے دل سے لگی تھی کہ سپہر آرا بیگم کو عقد نکاح میں لائیں۔ دل کھول کر لطف زندگی اٹھائیں۔ ایک روز گھڑی بھر دن رہے شہزادے بصد شان شہریاری تاجداری ہوا کھاتے جاتے تھے۔ دورباش و ادب کی آواز بلند تھی۔ رفقا بھی خوش خرام گھوڑوں پر سوار جلودار تھے۔ جس طرف سے گذرے رعایا دو رویہ استادہ ہو ہو کر آداب بجا لائی۔ خسرفا نے سر و قد تعظیم کی امرا نے ادب کے ساتھ گردن جھکائی۔ حسن اتفاق سے سپہر آرا کی اسی حالت میں ان پر نظر پڑی۔ اتنے میں گیتی آرا کی نظر بھی اس شہزادہ یوسف جمال پر پڑی تو چھوٹی بہن سے یوں ہمکلام ہوئی۔

گیتی آرا۔ کچھ دیکھا وہ کون سامنے جاتے ہیں؟ سپہر آرا بہن کا کنول کھل گیا۔

سپہر آرا۔ نہ باجی۔ بڑی ہو کے ہم سے ہنستی ہو اے واہ واہ بہن واہ۔

گیتی آرا۔ کچھ محرم کی پیدائش تو ہے نہیں ہماری۔ دو گھڑی ہنسنے بولنے میں کیا عیب۔

سپہر آرا۔ اچھا بھلا جب جانیں کہ یہاں سے پکار دو۔ ہمایوں فر۔

گیتی آرا۔ اے چپ۔ ہائیں ہائیں۔ توبہ۔ توبہ۔ اُف رے تیرا جگر۔

سپہر آرا۔ تو کیا کوئی سنتا ہے۔ کجا یہ مقام کجا وہ مقام اتنا فاصلہ ہے۔ بھلا یہاں کی آواز وہاں جا سکتی ہے۔ اے توبہ!

عباسی۔ یہ تقریر سن رہی تھی۔ بولی اے بیوی میں صدقے گئی۔ اتنا تو سوچیئے کہ جاتے تو اس طرف ہیں مگر ٹکٹکی ادھر لگائے ہیں لیکن دیکھیئے ریاست اور امارت اور سلیقے کے یہ معنی ہیں کہ مصاحبوں کی نظر ادھر ہی ہے۔ مجال کیا کہ کوئی ادھر ذرا دیکھ تو لے۔ کچھ گنوار تھوڑا ہی ہیں۔ نہیں ایک مُوا وہ ہندڈا[1] ہے ہمارے محلے میں رہتا ہے اللہ جانتا ہے خدمتگار اور باری ایسے منہ چڑھے ہیں کہ بس یہ بدتمیز لوگ کیا جانیں۔

مرزا ہمایوں فر بہادر کی سواری شل بادبہاری نکل گئی۔ عباسی نے کہا حضور دیکھئے گرمی یہ کچھ پڑتی ہے اور کاشانی مخمل کے کپڑے پہنے ہیں تو وجہ کیا عادت ہو گئی ہے نہ ساری باتیں عادت پر ہیں ہمیں کوئی دُلائی اڑھا دے تو اللہ جانتا ہے پھکنے لگیں۔

یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ سپہر آرا آہ سرد بھرنے لگیں۔ عباسی نے اشارے سے گیتی آرا کو دکھایا اور کہا حضور! اب یہ خدانخواستہ قیامت کا سامنا ہے۔ آمنے سامنے مکان۔ صبح و شام ہوا کھانے کو نکلا ہی چاہیں۔ مہتابی کوٹھے پر دو گھڑی دل بہلانے ضرور ہی آئیں گے۔ اور آپ جب دیکھیں گی تو ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگیں گی۔ سپہر آرا بولیں، عباسی! سچ کہنا عباسی شہر بھر میں ایسا خوبصورت کوئی جوان ہے۔ مگر خدا جانے ان کے گھر والے ان کو کیا صلاح دیتے ہیں۔ عباسی نے کہا۔ اگر حضور ذری چھٹی دیں تو لونڈی ان سے ملے اور جو کچھ کہنا ہے دل کھول کے کہے۔ سپہر آرا نے پوچھا۔ بھلا وہاں تک تمھاری رسائی کیوں کر ہو گی۔ زنانے میں تم ان سے بات نہ کر سکو گی۔ مردانے میں تمھارا گذر کہاں۔ پھر ملو گی کیوں کر۔ عباسی مسکرا کر بولی اے حضور جب بات ہے کہ حضور کے سامنے ان کے کوٹھے پر ان سے باتیں کر رہی ہوں اور حضور مہتابی پر سے دیکھیں کہ عباسی باتیں کرتی ہے مگر بات اتنی ہے کہ

---

[1] ہندو۔

اگر جو کہیں حسن آرا بیگم یا گیتی آرا بیگم یا جہاں آرا بیگم دیکھ لیں گی تو کیا جانے کیا بات کا بتنگڑ ہو۔ زمانہ بڑا نازک ہے اور اپنی عزت کو ہر کوئی ڈرتا ہے۔ سپہر آرا نے کہا۔ کیا ہمایوں فر ایسے شہدے ہیں کہ مہریوں پر ریجھ جائیں گے۔

عباسی۔ میں صدقے حضور یہ حسن اور جوانی کسی کی ماں کی نہیں۔

سپہر آرا۔ واہ شہزادے ایسے نہیں ہوا کرتے۔ شہزادوں کا دل جب آئے گا شہزادی پر۔ مہری پر بادشاہ ریجھیں واہ۔

عباسی۔ حضور یہ نہ کہیئے۔ یہ سب حسن اور جوانی پر ہے بس اور کچھ نہیں۔

سپہر آرا۔ اچھا تم آج ہی جاؤ۔ مگر جو ہمارے سامنے اُن سے باتیں نہ ہوئیں تو ہم گھر سے نکلوا دیں گے۔

عباسی۔ اے لو۔ دیکھا نہ۔ وہ تو میں سمجھتی ہی تھی۔ بس بیوی ایسے پیغام سے درگذری کہ ان کے گھر کے آدمی بھوا سمجھیں۔ آپ کے ہاں کا کوئی دیکھ لے تو بڑی سرکار سے جوڑ دے۔

اُس دن تو شام ہو گئی۔ دوسرے روز بی عباسی خوب بن ٹھن کے چلیں۔ عطر میں بسی ہوئی۔ کرتی آستینوں دار پھنسی ہوئی۔ جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ بگڑے دل آوازے کستے تھے ایک بولا خدا کرے پاؤں پھسل جائے تو عباسی نے تنک کر کہا۔ پاؤں پھسلے تیرا۔ دیکھو موئے کی باتیں۔ یہ کلمہ بد زبان سے نکالتا ہے۔ اِدھر اُدھر دکانداروں نے قہقہہ لگایا۔ عباسی چمکتی ہوئی آگے بڑھی تو ایک خوبرو گبھرو سے آنکھیں چار ہوئیں اور یوں میٹھی میٹھی باتیں ہونے لگیں۔

گبھرو۔ بی عباسی سلام ہے۔ پہچانا؟ اب کاہے کو پہچانوں گی صاحب۔

عباسی۔ (مسکرا کر) ایرے غیرے چھیلیاں بہت دیکھے ہیں۔ تم کون ہو؟

گبھرو۔ کون ہیں؟ عاشق ہیں جان جاتی ہے اور کون ہیں۔

عباسی۔ واہ! جان جاتی ہے۔ کبھی جھوٹوں بات نہ پوچھی۔ ہونہہ۔

گبھرو۔ اب بتاؤ کب تک ترساؤ گی۔ اگر منظور کرتیں تو اب تک کب کی شادی ہو گئی ہوتی۔ مگر بڑی بے رحم ہو عباسی!

عباسی۔ اے ہے تم نے نہیں سُنا۔ ہم نے قسم کھا لی کہ اب جو نکاح پڑھوائیں گے تو کسی پڑھے لکھے کے ساتھ دیکھ لینا۔

اس گبھرو نے کہا۔ ہم تو شادی کرنے کو معجود (موجود) ہیں۔ مگر ہاں پڑھے لکھے نہیں۔ اب اس وقت جاتی کہاں ہو۔ عباسی نے کہا مرزا ہمایوں فر بہادر کے ہاں۔

الغرض عباسی اُلٹے پاؤں پھری اور ہمایوں فر کے گھر کے بجائے اپنے گھر پہنچی تو درست دیکھا کہ مرزا ہمایوں فر کے دروازے پر کئی بگھیاں کھڑی ہیں اور آدمی بھی اِدھر اُدھر بہت سے جمع ہیں۔ ماتھا ٹھنکا۔ دوڑتی ہوئی محلسرا میں گئی۔

محلدار۔ اے کچھ سُنا عباسی۔ شہزادے کے ہاں کا حال سُنا کچھ۔

عباسی۔ یہ بھیڑ کیسی ہے نصیب اعدا طبیعت تو کچھ علیل نہیں ہے۔

محلدار۔ اس سے بدتر ہے۔ بڑی بُری بات ہو گئی اے توبہ۔

عباسی۔ کیا چوری تو نہیں ہوئی؟ آخر ش یہ ہوا کیا ہے۔ بتاؤ تو۔

محلدار۔ اللہ بُری صحبت سے ہر بھلے مانس کو بچائے اور بری عادت سے بھی امیروں کو دور رکھے۔ یا اللہ الٰہی کسی پر نہ گذرے۔

عباسی۔ یہ سب کہاں ہیں۔ بڑی بیگم کے پاس گئے ہیں کیا؟

محلدار۔ سب کوٹھے پر ہیں۔ چوری کا جُرم ہے کبھی آج تک نہ سُنا ہوگا۔ ہے ہے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

عباسی (متحیر ہوکر) کس نے؟ مرزا ہمایوں فر بہادر نے؟
محلدار نے کہا۔ ابھی ابھی ایک رونا خبر لایا کہ شہزادے کے یہاں (ہاں) صاحب لوگ آئے ہیں۔ انھوں نے کسی سوداگر کے ہاں ایک آئینہ چرایا تھا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آئینہ کی چوری کیوں کر کی۔ بڑی سرکار نے سنا تو بڑا رنج کیا۔ ایک چوبدار کو بھیجا کہ جا کر خبر لائے اُس نے آن کر کہا حضور خبر تو سچی ہے گر آئینے کی چوری نہیں کی۔ ایک آرسی چرالائے تھے۔ یہ سنتے ہی عباسی تڑ سے زینے پر ہو رہی اور دن سے کوٹھے پر موجود دیکھا سپہر آرا بیگم بدحواسی کے ساتھ ایک مسہری پر لیٹی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی ہیں۔ گریہ وزاری کر رہی ہیں۔ عباسی کو دیکھ کر اور بھی زار زار رونا شروع کیا۔ عباسی نے کہا۔ اُف وہ۔ مجھے تو اس وقت بڑا تعجب ہوا۔ موئی آرسی کی اصل و حقیقت ہی کیا ہے۔ بھلا ان سے یہ حرکت سرزد ہوئی۔ اے تو یہ کیا محال ہے۔ یہ کسی دشمن نے خبر اُڑائی ہے۔ جنازہ نکلے اُس مُوڈی کاٹے کا، اور ایسی جگہ گردن ماری جائے جہاں پانی نہ ملے۔ جس نے ہمارے شہزادے کو ناحق مطعون کیا۔ ایسی ایسی کروڑوں آرسیاں ان پر سے ملکن (بلکہ) ان کے غلاموں پر سے صدقے کیں۔

اتنے میں عباسی نے دیکھا حسن آرا بیگم انگلی کے اشارے سے عباسی کو بلاتی ہیں۔ سپہر آرا نے کہا میں اس وقت پیاس معلوم ہوتی ہے۔ برف ڈال کر خوب ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پلاؤ۔ موقع وقت غنیمت جان کر عباسی نے تعمیل حکم کے لیے قدم بڑھایا۔ آڑ میں جا کر حسن آرا سے کہا حسن آرا نے کہا۔ عباسی یہ کیا ستم ہوگیا ایں! اے تو یہ ہمایوں فر جن کے پاس لاکھوں روپیہ ہے اور ایک آرسی چرائیں۔ ہے ہے آگ لگ گئی زمانے کو۔ آسمان کیوں کر قائم ہے۔ عباسی نے کہا۔ حضور چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ہم نہ مانیں گے آرسی تو اُن کے ہاں کے نوکروں کے نوکر اور ان کے نوکر ہاتھ سے نہ چھوویں نا کہ چوری! اے کیا مجال ہے بیوی یہ کسی دشمن نے خبر اُڑا دی ہے موئے موڈی کاٹوں کو کچھ کرنا دھرنا تو ہے نہیں۔ بیٹھے بیٹھے ایک اُشتر کلا چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں آرا نے کہا اچھا جھوٹ ہے تو یہ اتنے صاحب لوگ کیوں آئے ہیں۔ رونا کیا خبر لایا۔ چوبدار کیا خبر لایا۔ ہم نے کوئی دقیقہ باقی تھوڑا ہی رکھا۔ اب کسی اور کو بھیجو۔ گیتی آرا بولی ہمارے نزدیک بڑے میاں کو بھیجو۔ رئیسوں امیروں کی صحبت میں رہتے ہیں کچھ ایسے ویسے تھوڑا ہی ہیں۔ اس پر سب نے اتفاق رائے ظاہر کیا۔ سپہر آرا اپنے کمرے میں گئیں۔ پیر مرد کو بلوایا۔ حکم دیا کہ جا کے مفصل حال دریافت کر لاؤ۔ پیر مرد نے آن کر یوں بیان کیا۔ حضور جو کچھ سنا تھا وہ ٹھیک نکلا۔ سوداگر کی دکان پر جانا اور وہاں سے ایک بیش انگوٹھی چرانا اور پکڑے جانا سب صحیح ہے۔

اس پر جہاں آرا نے کہا۔ کیا انگوٹھی؟ پہلے سنا آئینہ پھر سنا آرسی۔ اب تم خبر لائے ہو کہ انگوٹھی چرائی۔ مگر مول کے دام نہیں دیئے یا یہ کہ چوری ہی کی۔ پیر مرد بولا۔ چوری کی حضور چوری کی اور انگوٹھی بڑی قیمتی ہے۔ ہوا یہ کہ وہ فٹن پر سوار ہو کر سوداگر کے ہاں گئے شہزادے بھی ساتھ تھے۔

سپہر آرا۔ کون شہزادے ساتھ تھے اور گئے کون فٹن پر؟

پیر مرد۔ ہمایوں قدر بہادر اور ان کے سالے ہمایوں فر دونوں گئے۔

جہاں آرا۔ ایں! اور یہ چوری کس نے کی۔ کیا اُول جلول بکتے ہو۔

پیر مرد۔ (جھلا کر) میں تو اول جلول نہیں بکتا ہوں حضور نہ سمجھیں تو میں کیا کروں یہ تو مربح مشہور ہے سارا شہر جانتا ہے کہ مرزا ہمایوں فر کے بہنوئی نے سوداگر کے ہاں سے انگوٹھی چرائی۔

سپہر آرا۔ (ہنس کر) اف شکر ہے۔ ہمایوں فر نے تو نہیں چرائی۔

پیر مرد۔ اے لاحول۔ دو کروڑ کی چیز ہو تو چھوٹی نہیں۔ بادشاہ کی اولاد ہیں کہ باتیں ہاں تو ٹش پر سالے بہنوئی گئے۔ پہلے پیری اینڈ کمپنی کے ہاں اُترے۔ ان کے بہنوئی نے اِدھر اُدھر کمروں کی سیر کی اور ہمایوں فر پاس کی ایک کوٹھی میں سودا خریدنے لگے۔ یہاں ان کے بہنوئی نے سات سو کا اسباب خریدا اور ساتوں سو نقد دے دیئے مگر دیکھتے دیکھتے ایک انگوٹھی پہن لی۔ سو روپیہ یا سوا سو روپیہ کی ہوگی۔

جہاں آرا۔ اے بس۔ پھر تم کیا کہتے تھے؛ بڑی قیمتی ہے۔ واہ

حسن آرا۔ سَو سوا سو کی انگوٹھی! بھلا کوئی بات بھی ہے۔ سو روپیہ کی بھی کوئی حقیقت ہے۔ سب بات جھوٹی ہے۔

پیر مرد۔ اب جو سنا جو اصل بات ہے وہ کہتا ہوں۔ پس آدمی نے دیکھ لیا چار یا پانچ روپیہ مہینے کی اوقات ان کی شان اور عظمت دیکھ کر کچھ کہہ نہ سکا۔ مگر چپکے سے جا کر صاحب سے کہہ دیا صاحب آئے۔ آدمی سے کہا اگر تم جھوٹ بولے تو ہم جہنم بھیج دے گا۔ ان کے پاس آن کر پوچھا۔ ہمارے جانے کے بعد جب ہم اس کمرے میں بیٹھا جا کے تب آپ نے کوئی شے خریدی جو خریدی ہو ہم کو اطلاع ہونا چاہیئے۔ کہا ہم نے اور کچھ نہیں خریدا۔ صاحب نے پھر پوچھا۔ پھر انکار کیا۔ تیسرے مرتبہ پھر دریافت کیا۔ پھر انکار کیا۔ تب تو صاحب آگ ہو گئے۔ کہا یہ انگوٹھی کہاں خریدی تھی؟ اتنے میں مرزا ہمایوں فر آ گئے۔ الغرض مرزا ہمایوں فر بہادر شیر غریں کی طرح آئے تو سوداگر خاموش ہو رہا۔ مگر دوسرے دن اس نے نالش کر دی۔ شہر بھر میں غُلّا مچا ہوا ہے کہ شہزادے پر سرقے کا جُرم قائم ہوا۔ اب ہمایوں فر کے بہنوئی کا کوئی نام ہی نہیں لیتا۔ تمام زمانے میں مشہور ہو گیا کہ ہمایوں فر نے چوری کی جو سنتا تھا کانپ اٹھتا تھا۔ ارے! ہائے افسوس یہ کیا غضب ہوا۔ نالش کے روز مجسٹریٹ کے ہاں طرفین پہنچے مگر واہ رے ٹامس صاحب بیرسٹر وہ تقریر کی کہ سب بند ہو گئے کہا یہ چوری نہیں تھی۔ یہ ایک عارضہ ہے۔ کلپٹو مینیا یہ ایک قسم کا جنون ہے جس سے انسان کا چوری کرنے کی طرف جی للچاتا ہے اور وہ لاکھ امیر ہی کیوں نہ ہو چوری کر بیٹھتا ہے۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ ایسا شہزادۂ بلند اختر اور میرزا ہمایوں فر بہادر کا بہنوئی اور سوا سو روپیہ کی انگوٹھی چرائے۔ سات سو کا مال تو نقد دام اسی وقت خرید چکا تھا۔ الغرض وہ بیچارے رہا ہو گئے۔

شادی کی چھیڑ چھاڑ

ایک خدمتگار نے ادب کے ساتھ شہزادے کے کان میں کچھ کہا اور مرزا ہمایوں فر نے حکم دیا کہ تخلیہ ہو۔ مصاحبین اور رفیق دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ دروازے سب بند کر دیے گئے۔ ایک عورت آئی اور شہزادے سے باتیں ہونے لگیں۔

شہزادہ ۔ اب کب تک ترسایا کرو گی؟ آخر ترسانے کی کچھ انتہا بھی ہے۔ تم کس روز کام آؤ گی اور کس مرض کی دوا ہو؟

عورت ۔ (مسکرا کر) حضور تو غضب کرتے ہیں۔ اب فرمایئے ڈھیل کس کی ہے۔ حضور کسی مشاطہ کو کیوں نہیں بلاتے؟ مشاطہ کو بلوا کر پیغام بھیجئے وہاں سب معاملہ چوکس ہے ڈھیل صرف حضور ہی کی ہے۔

دوسرے روز ہمایوں فر بہادر نے ایک مشاطہ بلوائی۔ نازک بدن اور سیم تن عورت آن کر جھک کے سلام کیا۔ ہمایوں فر نے کہا۔ کچھ ہمارے بھی کام آؤ گی۔ مسکرا کر بولی۔ حضور ہمارے مالک ہیں۔ ہمایوں فر نے راز دل بتایا۔ اس نے کہا خداوند محلسرا سے ہو لوں۔ وہاں تذکرہ کروں تو اسی دم جاؤں یہ کہہ کر ہمایوں فر کی والدہ شریفہ کے پاس گئی۔ ادھر اُدھر کی باتیں کر کے یہ ذکر چھیڑا۔ حضور کے پڑوس میں ایک لڑکی ہے۔ حضور بس دیکھنے سے تعلق ہے۔ چاند سی صورت پائی ہے۔ کیسی گوری چٹی کہ میں کیا عرض کروں اور حسب نسب تو حضور مجھ سے زیادہ جانتی ہوں گی۔ شہزادے کی اس نے کہا ہم نے ایک باری اور بھی چاہا تھا کہ پیغام بھیجیں مگر کچھ سبب ایسے ہوئے کہ نہ بھیج سکے۔ تم جاؤ کہو سنو۔ مشاطہ فوراً اٹھی بڑی بیگم کے ہاں آئی۔ ڈیوڑھی پر عباسی نے مسکرا کر کہا ہم سمجھ گئے۔ کل ہم سے بات چیت ہو چکی ہے۔ مشاطہ اندر آئی۔ بڑی بیگم صاحب کی خدمت میں آداب بجا لائی۔ عباسی دوڑی ہوئی کوٹھے پر گئی اور ہنس کر کہا، لیجئے حضور مشاطہ آئی ہے۔

اب سنئے سپہر آرا بیگم کو محلدار نے اطلاع دی کہ شہزادے بہادر کے یہاں سے مشاطہ آئی ہے یہ مژدہ سنتے ہی سپہر آرا بیگم چھپ کر اوپر گئیں۔ سپہر آرا کو معلوم نہ تھا کہ عباسی نے اوپر سب سے کہہ دیا ہے۔ جاتے ہی دوسرا دوپٹہ فوراً بدلا۔ اور عطر سے اس کو ایسا بسایا کہ محلسرا تک مہک گئی۔ ادھر سپہر آرا نے دوپٹہ بدلا اُدھر گیتی آرا اور عباسی نے قہقہہ لگایا۔ سپہر آرا نے پوچھا۔ کیوں خیر شد۔ یہ بے محل ہنسی کیسی؟

گیتی آرا ۔ اے بہن یہ بے محل عطر ملنا کیسا اور دوپٹہ بدلنا کیسا؟

سپہر آرا ۔ یونہی بدلا کیوں کیا۔ ہنسی کی کیا بات ہے بھلا۔

گیتی آرا ۔ اے تو ہم نے بھی یونہی قہقہہ لگایا۔ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ مشاطہ آئی ہے پیغام لائی سنور کے نکھر کے نکلو۔ اتنا کہنا تھا کہ سپہر آرا سخت خفیف ہوئیں گردن جھکا کر بولیں۔ اے واہ ہم کو کیا معلوم کہ مشاطہ آئی یا کون موئی آئی ہے اس وقت گرمی معلوم ہوئی تو دوپٹہ بدل ڈالا۔ ذرا ملگجا پن تھا یہ بھی گناہ ہوا۔ خیر حسن آرا نے کہا۔ بہن اب بہت اڑو نہ ہم سے یہ اس وقت گھبرا کر آنا اور تڑ سے دوپٹہ پھینکنا کیا معنی؟ واقعہ بے اختیار ہنسی آتی ہے۔

عباسی ۔ حضور مبارک ہو مشاطہ تو بڑی نکیلی آئی۔

حسن آرا ۔ چشم بد دور کیوں نہیں وہ خود بھی تو بانکے ترچھے ہیں۔

سپہر آرا کمرے میں جا کر مارے خفت کے لیٹ رہیں۔
مشاطہ (بڑی بیگم سے) حضور ایک عرض ہے۔
بیگم۔ کہو تو، آج بہت دن کے بعد آئی ہو۔
مشاطہ۔ ہاں حضور باہر چلی گئی تھی۔ ابھی کوئی دو دن ہوئے کہ شہر میں پہنچی حضور آپ کے پڑوس میں جو شہزادے ہمایوں فر ہیں ان کی والدہ نے مجھ کو بلوایا تھا۔ سپہر آرا بیگم کو ان کے ہاں کی عورتوں میں سے کسی نے کیا معلوم کہاں دیکھ لیا تھا۔ بیگم صاحب کی مرضی نہ تھی کہ بیگانی جگہ شادی ہو (مسکرا کر) شہزادے کہتے ہیں کہ ہم پڑھی لکھی کے سوا اور کسی سے شادی نہ کریں گے۔
بیگم۔ ہوں اچھا پھر؟
مشاطہ۔ حضور ــــــــــــــ بس حضور۔
بیگم نے کہا ہاں ہاں میں سمجھی اچھا تم کل کسی وقت آجاؤ۔ مشاطہ نے جھک کر آداب عرض کیا۔ عباسی کے ساتھ حسن آرا کے پاس آئی۔
مشاطہ۔ حضور آداب عرض ہے۔
حسن آرا۔ کہاں آئی تھیں؟ تم کو بہت دن بعد دیکھا۔
مشاطہ۔ حضور نظیر بیگم کے ہاں آئی تھی وہاں لونڈی کو آج بلوایا مجھے خیال آیا کہ چلوں سلام کر آؤں۔ اور مرزا ہمایوں فر کے ہاں سے بھی آدمی آیا تھا۔
عباسی۔ (مسکرا کر) اے یہ ہماری سرکار چھپ کہاں رہیں۔ اے حضور ذری ادھر تو تشریف لائیے۔ واہ۔
جہاں آرا۔ چھپ کر اندر سور ہیں جا کر۔
عباسی۔ (کمرے میں جا کر) اے حضور اٹھیے جیسے سچ ہی تو گئی ہیں ذری دیکھیے تو کون آیا ہے۔
سپہر آرا۔ (انگڑائی لے کر) سونے دو جی۔
حسن آرا۔ اے بہن اٹھو۔
مشاطہ۔ حضور آداب عرض کرتی ہوں۔
سپہر آرا۔ کون ہے؟ یہ کون بولا؟
عباسی۔ اے ہے ایسی انجان بن گئیں حضور چل کے دیکھ لیجیے۔
گیتی آرا۔ (کمرے میں آن کر) چلو چلو۔
سپہر آرا۔ ہم کو یہ باتیں بھلی نہیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دل گی ہے رہنے دو باجی۔
گیتی آرا۔ اب چلتی ہو یا میں اٹھا لے چلوں۔
سپہر آرا۔ باجی جان دیکھئے۔ خواہی نخواہی ہم کو چھیڑتی ہیں۔ ہمارے سر میں درد ہے۔
حسن آرا۔ اچھا یہاں تک تو آؤ۔
سپہر آرا بڑے اصرار کے بعد تشریف لائیں مشاطہ نے جھک کر سلام کیا تو سب نے قہقہہ لگایا اور سپہر آرا بہت خفیف ہوئیں کہا ہم کو نہ چھیڑیئے اب بہن ہم جا کے اماں جان سے کہہ دیں گے۔
سپہر آرا بیگم کمال محظوظ تھیں کہ مرزا ہمایوں فر بہادر کے ہاں سے مشاطہ آئی۔ بات بات پر باچھیں کھلی جاتی تھیں کہ اب کیا پوچھنا ہے دل کی تمنا بر آئی۔

شادی کی تیاریاں

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ

صبح کو چاروں بلند و بالا طاؤس کرشمہ رنگین ادا نازنیں خواب ناز سے بیدار ہوئیں چاروں نے وضو کر کے نماز صبح ادا کی۔ سپہر آرا نظامی گنجوی کی مناجات پڑھنے لگیں۔ جہاں آرا اور حسن آرا بڑی بیگم کے پاس جا کر آداب بجا لائیں۔ گیتی آرا نے حکم دیا کہ کمرے آراستہ کیے جائیں۔

اتنے میں بڑی بیگم صاحب نے لوزیات اور فواکہ بھیجے چاروں گلعذاروں نے ناشتہ کیا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیا اور طوطی زبان گویا گویا کیا۔

سپہر آرا۔ اس وقت ہمارا جی آپ ہی آپ کچھ ایسا خوش ہو رہا ہے کہ کہہ نہیں سکتے۔ سچ کہتے ہیں باجی دل ہی جانتا ہے ہمارا۔

جہاں آرا۔ ہمیں وجہ معلوم ہے، اللہ جانتا ہے ہم اس کا سبب سمجھ گئے۔

سپہر آرا۔ اللہ جانتا ہے۔ اللہ جانتا ہے۔ کیا ہم سے زیادہ جانتا ہے، واہ۔

حسن آرا۔ (جھڑک کر) ایں! سپہر آرا خدا خدا کرو، یہ کفر کا کلمہ ہے۔

اس گفتگو کے بعد چہل ہونے لگی۔ عباسی نے کہا کسی کی برات آتی ہے۔ جہاں آرا بولیں آتی نہیں جاتی ہے۔ عباسی مسکرائی اللہ کرے سبھ گھڑی ہمارے دروازے پر بھی شہنائی بجے۔ انشاء اللہ صبح ہی شام بجا چاہتی ہے۔ سپہر آرا بیگم سے الگ انعام لوں گی۔ بھرپور ہاں ایک نہ مانوں گی۔ میں نے دل و جان سے محنت اور کوشش کی ہے اور انعام کے یہی موقع ہیں۔

سپہر آرا۔ سوت نہ کپاس کوری سے ٹھم لٹھا۔ کچھ بات نہ چیت مفت کی بک بک۔

عباسی۔ کون واہ اللہ جانتا ہے آج شام تک رقعہ آیا داخل ہے۔

حسن آرا۔ کئی دن سے شہزادے کو کوٹھے پر نہیں دیکھا سنا نصیب اعدا کچھ علیل ہو گئے تھے۔ ذری خبر تو لاؤ عباسی کیسے ہیں۔

اتنے میں دربان نے آواز دی۔ مہری سواریاں آئی ہیں۔

بڑی بیگم صاحب نے محلدار سے دریافت کیا کون ہے وہ دوڑی آئی۔

دونوں خواستہ اور آراستہ بیگمیں ناز و ادا کے ساتھ فنسوں سے اتریں۔ دونوں پری رخسار گلعذار محلسرا میں آئیں۔ ایک مغلانی نے جا کر باغ میں عرض کیا۔ حضور کہیں سے سواریاں آئی ہیں حسن آرا بولیں۔ نظیر بیگم اور جانی بیگم ہوں گی۔ عباسی جاؤ یہیں بلا لاؤ۔ عباسی فوراً جھپٹی۔ دیکھا شہ نشین میں نظیر بیگم اور جانی بیگم بڑی بیگم کے پاس بیٹھی ہیں۔ عباسی نے جھک کر سلام کیا۔ جانی بیگم نے کہا حسن آرا کہاں ہیں۔ کہا حضور کو بلاتی ہیں باغ میں ہیں۔ کہا اے ہے یہ دماغ اللہ اللہ۔ بلاتی ہیں! یہاں تک آتیں تو کیا پاؤں کی مہندی گھس جاتی؟ ماشاء اللہ سے بڑی نازک ہو گئی ہیں۔ ہم کسی کے نوکر نہیں ہیں، آئیں تو اچھا ورنہ فنس منگوا دو۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ عباسی الٹے پاؤں گئی حسن آرا سے کہا۔ حسن آرا فوراً کھڑی ہوئیں اور تیزی کے ساتھ قدم بڑھا کر محلسرا میں آئیں نظیر بیگم اور جانی بیگم دونوں ملیں۔

جانی بیگم منہ پُھلائے بیٹھی رہیں۔ نظیر بیگم سے مسکرا کر باتیں ہونے لگیں۔
حسن آرا۔ بہت دن بعد دیکھا۔ مزاج اچھا رہا بہن۔ دُبلی کیوں ہو اس قدر۔
نظیر بیگم۔ ماندی تھی۔ ابھی پرسوں تک پنڈا اچپکا رہتا تھا۔ بارے خدا خدا کر کے اب کہیں نجات پائی۔ بڑی بیماری اُٹھائی جُز مر ہو گئی۔
حسن آرا۔ خاتون جنت کی قسم جو ہم نے سنا بھی ہو۔ ہمیں اطلاع نہیں ہوئی۔
نظیر بیگم۔ ہم یہاں تو تھے ہی نہیں۔ ابا جان گاؤں پرلے گئے تھے۔ پرسوں آئے۔
حسن آرا۔ جانی بیگم ہم سے کچھ خفا سی معلوم ہوتی ہیں، خدا خیر کرے۔
جانی بیگم۔ بس بس ذری میری زبان نہ کھلوانا اور سنیئے اُلٹا چور کتوال (کوتوال) کو ڈانٹے یہاں تک آتے آتے منہ ہی گھس جاتی یا مینہ برس رہا تھا؟
حسن آرا۔ اچھا اب معاف کیجئے غصے کو تھوک دیجیے چلو چلو اٹھو۔

حسن آرا بیگم دونوں رشک قمر حور شکر مہمانوں کو لے کر باغ میں گئیں۔ سپہر آرا اور جہان آرا اور گیتی آرا سے دونوں ملیں۔ اس بنگلہ خس پوش میں بیٹھیں۔ جانی بیگم کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ شوخ و طرار نظیر بیگم بھولی اور ناکردہ کار۔ نام خدا چودھواں سال تھا۔

جانی بیگم نے عباسی پر نظر ڈالی اور خوب غور سے دیکھ کر کہا۔ تمھاری چھوکری تو بڑی کھیلی ہے۔ اللہ اللہ کیا سج دھج ہے۔ مگر ایک ہی چھٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ عباسی نے شوخی کے ساتھ جھک کر سلام کیا اور کہا حضور نے میری قدر دانی کی ہے میں اسی قابل تھی۔

اتنے میں وہی مشاطہ آئی، دیکھا کہ غنچہ کھلا ہوا ہے ایک ایک جادو جمال ایک سے ایک زہرہ تمثال کوئی قاقم اندام کوئی زیبا کلام۔ ایک سرو صنوبر خرام۔ دوسری غنچہ گلفام۔

جانی بیگم نے شوخی کے ساتھ چٹکی لی اور کہا سپہر آرا جس دن سسرال جاؤ گی اُس دن وہاں جا کر تمھیں بندق کیا ہو تو نام بدل ڈالوں۔ مگر میں تاڑ گئی کہ کہاں سے پیغام آیا ہے کہو تو بتا دوں۔ سپہر آرا نے آہستہ سے کہا اچھا بھلا بتاؤ۔ جانی بیگم تیز طبیعت تھیں۔ کان میں آہستہ سے ہمایوں فر کا نام لیا اس پر فوراً جھینپ گئی۔ مگر مسکرا کر صاف انکار کیا نہیں نہیں کیوں گالیاں دیتی ہو۔

جانی بیگم۔ اے چل جھوٹی۔ ایسی ایسی چھوکریاں ناخون (ناخن) پر لکھی ہوتی ہیں اچھا آؤ اشرفی اشرفی بدتے ہیں آؤ (مغنی خانم کو پکار کر) اے بی سیدانی۔ ذرا ادھر آئیے گا۔

جانی بیگم نے کہا اب یہ بتاؤ کہ پیغام تو لائی ہو مگر اس کا بھی ذمہ کرتی ہو کہ شہزادے کے پاس کوئی ہے تو نہیں؟ امیر رئیس آدمی ہیں۔ بادشاہ کی اولاد۔ اللہ کا دیا روپیہ پیسا جواہرات (جواہرات) سب کچھ ہے۔ اور اس شہر کی ہوا آج کل خیر سے بگڑی ہوئی ہے۔

مشاطہ مسکرا کر بولی حضور اس کا حال اللہ جانے مگر ہمارے نگیچ[1] تو ایسی باتوں میں وہ ہیں نہیں اور یوں جوانی کا عالم ہے اللہ جانے۔

اتنے میں حسن آرا آئیں۔ مسکرا کر کہا۔ لو اب سب ٹھیک ہے۔ کسی بات کی کسر نہیں رہی۔ ہم تو آج ہی ڈومنیوں کو بلواتے ہیں۔ عباسی۔ عباسی۔ اے عباسی!
عباسی۔ (دوڑ کر) حاضر ہوئی۔ حکم۔ میں اُدھر باتیں کر رہی تھی۔
حسن آرا۔ بیاہانی کی ڈومنیوں کو بلواؤ۔

---

[1] نگیچ۔ نزدیک۔

جہان آرا۔ سپہر آرا سپہر آرا (شانہ ہلا کر) سپہر آرا۔ اچھا دماغ ہی نہیں ملتے۔ اے واہ ہے۔ ابھی سے یہ حال ہے سپہر آرا۔
سپہر آرا (بھولے پن کے ساتھ جھڑک کر) نہ باجی۔ ہم خدا جانے کیا سوچتے تھے۔ تم کو یہی باتیں ہر وقت سوجھتی ہیں۔

اس فقرہ پر فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اللہ اللہ ابھی سے سوچنے لگیں اور لطف یہ کہ کیا جانے کیا سوچتے تھے۔ سوچ کاہے کا ہے۔ ہمایوں فر کو ایک چھوڑ سو بار دیکھ چکی ہو۔ سامنے مکان ہے پھر سوچ کاہے کا ہے ماشاء اللہ چہرے مہرے سے درست ہیں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب پھر سوچ کیا۔

مشاطہ رخصت ہو کر مرزا ہمایوں فر کے پاس گئی۔ خدمتگار سے کہا حضور کو چپکے سے اطلاع دو کہ حسینی خانم حاضر ہے مگر کسی کے سامنے نہ کہنا۔ کان میں کہہ دینا۔ خدمتگار نے دیکھا کہ شہزادے کے پاس کئی آدمی بیٹھے ہیں۔ حسینی خانم کا پیغام کان میں کہنا خلاف ادب سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب بھیڑ چھٹی تو خدمتگار نے آہستہ سے عرض کیا۔ پیر و مرشد حسینی خانم حاضر ہیں۔ ہمایوں فر سمجھ گئے مگر وہاں دربار میں سب کے سامنے بلانا خلاف وضع سمجھے۔ جب تخلیہ ہُوا۔ حکم ہوا کہ حسینی خانم کو بلاؤ لیکن کوئی اور نہ آنے پائے۔ حسینی خانم آئیں۔

حسینی خانم۔ (آداب عرض کر کے) لیجیئے حضور فتح ہے۔ میرے نام فتح لکھی گئی۔ اس خوبصورتی سے لونڈی نے بند و بست کیا ہے کہ حضور کی قدر دانی چاہیئے۔

ہمایوں فر۔ حسینی خانم مالا مال کر دوں گا۔ اس قدر دوں گا کہ خوش ہو جاؤ گی۔ بڑی بیگم سے کیا گفتگو رہی ان کی کیا رائے ہے؟

حسینی خانم۔ ان کی رائے بس یہی ہے کہ چٹ مری منگنی اور پٹ مرا بیاہ۔ جھٹ پٹ شادی ہو جائے۔ حضور اب یہ شادی کسی کے روکے رُک نہیں سکتی۔ ہوئی داخل سمجھیئے۔

ہمایوں فر۔ تمہارے منہ میں گھی شکر۔ ہاں خوب یاد آیا۔ کوئی اناؔ[1] تو بتلا دو۔ ہماری بہن آئی ہیں۔ انھیں دو دن سے بخار آتا ہے۔ کوئی اچھی انا ہو۔ دس بارہ روپیہ تک ماہواری دیں گے۔ مگر پورے دودھ کی ہو۔

حسینی خانم۔ حضور میرے پڑوس میں ایک انا رہتی ہے۔ کوئی سترہ برس کا سن ہے۔ شریف بھی ہیں۔

ہمایوں فر۔ کیا خوب یہ سن بتانے کی کیا ضرورت تھی واہ۔ ہاں وہ حال تو کہو حسن آرا بھی تھیں وہاں۔

حسینی خانم نے کہا حضور بس کچھ نہ پوچھیئے کیا عرض کروں۔ وہاں تو غنچہ کھلا تھا۔ سب کمسن، اُٹھتا جوبن، نازک بدن اور طرار۔ بہت سی ہیں حضور۔ سپہر آرا بیگم کو سب کی سب مل کے چھیڑنے لگیں۔ وہ جھلا کے رہ جاتی تھیں۔ کبھی مسکراتی تھیں کبھی کہتی تھیں باجی جان ہمیں یہ چھیڑ خانی گوارا نہیں ہے۔ ہمیں چھیڑا نہ کیجیئے۔ کبھی رُوَا نسا[2] منہ بنا لیتی تھیں کبھی اپنے آپ کو کوستی تھیں اللہ کرے یہ ہو اللہ کرے وہ ہو مگر چہرے سے برستا تھا کہ کھلی جاتی تھیں۔ حضور یہ لگی بُری ہوتی ہے جہاں کسو پر (کسی پر) دل آ گیا پھر قابو میں رہنا محال ہے۔

اتنے میں ایک شخص نے کہا حضور کچھ عرض کرنا ہے۔ ذری سب صاحب دوسرے کمرے میں تشریف رکھیں تو عرض کروں۔ تخلیہ ہوا تو اس نے کان میں کہا (حضور عباسی مہری آئی ہے) حکم دیا حاضر کرو۔ مگر دوسرے زینے کی طرف سے لاؤ۔ عباسی مہری آئیں۔

ہمایوں فر نے دیکھا تو بنی ٹھنی۔ غضب کا جوبن بلا کا نکھار۔

---

[1] بچوں کی کھلائی۔ دودھ پلانے والی۔ [2] رونسالا۔

ہمایوں فر۔ آج تو ایسا بناؤ چناؤ کر کے آئی ہو کہ بس کچھ پوچھو نہ۔
عباسی۔ حضور (مسکرا کر) حضور۔ لونڈی ہوں۔
ہمایوں فر۔ خدا گواہ ہے عباسی تم سیکڑوں ہزاروں میں چھٹی ہوئی ہو۔
عباسی۔ واہ بندگی۔ اچھی تعریف کی چھٹی ہوئی کی ایک ہی کہی۔
ہمایوں فر۔ حسینی خانم تو آتی تھیں۔ کہو وہاں کا حال تو کچھ بیان کرو۔ کیا کیا تذکرہ رہتا ہے کیا سامان ہو رہا ہے؟

عباسی نے کہا حضور وہاں تو آج ہی سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کل حسن آرا بیگم نے بیا بانی کی ڈومنیاں بلوائی ہیں۔ عباسی اور حیدری دونوں گلے باز ہیں۔ رات بھر دھما چوکڑی رہے گی۔ رات جگا ہوگا۔

سپہر آرا بیگم کو سب بہنیں چھیڑتی ہیں۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہیں پھر خوشی کی تو بات ہی ہے۔ آج بھی تو مشاطہ آئی تھی مشک گنج والی۔ حسن آرا بیگم سے کچھ باتیں رساں رساں ہوتی تھیں۔ اور بڑی سرکار سے تو کوئی گھنٹے سوا گھنٹے تک سرگوشی ہوا کی۔ آج حضور بھی ناچ دیکھیں۔ ہاں خوب یاد آیا مشاطہ سے کہتی تھیں کہ شہزادے کے پاس کوئی گھر تو نہیں پڑی ہے۔ اُف! مجھے بڑی ہنسی آئی کہ لو ابھی سے ٹوہ لیتی ہیں۔

ہمایوں فر نے کہا پھر مشاطہ نے کیا کہا۔ ان سے کہو سارے شہر میں تحقیقات کریں۔ کوئی چھپی بات تھوڑا ہی ہے۔ یہاں اس قسم کا چلن ہی نہیں اپنا۔

عباسی دوپٹا سنبھال کر لوبی۔ لے اب رخصت حضور۔
ہمایوں فر نے کہا نہیں نہیں، واہ چلیں کہاں۔ ٹھہرو صاحب!
عباسی نے کہا حضور سبب یہ ہے کہ جوان ہیں بھی اور آپ ابھی۔ کوئی کسی کے دل میں تو بیٹھا ہی نہیں۔
اب سنیئے کہ بڑی بیگم صاحب نے حسن آرا کو بلوا کر کہا۔ ہماری طرف سے بہار النسا اور روح افزا کو خط لکھو۔
خط لکھ کر حسن آرا نے مغلانی کو دیا اور کہا۔ باہر بھجوا دو اور کسی چوبدار کو دو۔ ابھی ابھی ریل کے اسٹیشن پر جا کے ڈاک میں ڈال آئے۔

مغلانی نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ حسن آرا باغ میں گئیں تو دیکھا کہ جانی بیگم اور سپہر آرا میں خوب نوک جھوک ہو رہی ہے۔ جانی بیگم چھیڑتی جاتی ہیں اور سپہر آرا ان کو بناتی ہیں۔

نامۂ آزاد

عاشق بے برگ ونوا آزاد پاشا کا حسن شستہ ان کی جان کا دشمن ہوگیا۔ کئی ہفتے تک قید رہے۔
ایک روز آزاد پاشا نے قسطنطنیہ وغیرہ مقامات کی سیر و سیاحت کا حال حسن آرا کو خط میں لکھا؛ وہو ہذا۔

تو اے نسیم سحر گہ زجانب آزاد — بروبخدمت آں گلعذار حور نژاد

ہاں جان آزاد! یوں تو خدا کی خدائی میں ایک سے ایک خوشنما اور دلکشا فرحت بخش اور پُرفضا مقام ہے لیکن قسطنطنیہ سا شہر دید کی آنکھوں نے کبھی دیکھا نہ شنید کے کانوں نے کبھی سُنا۔ ساحل بحر پانچ کوس رہ گیا تھا کہ قسطنطنیہ کے ایوان سپہر مرتبت لطف تماشا دکھانے لگے۔ نقش ونگار پر بہار۔ گنبد طلائی عظمت بار۔ تشنگانِ حجاز کو آب زلال اور عشاق زار کو وصل معشوقہ مہ جمال سے وہ خوشی حاصل نہیں ہوتی جو مجھے اس تقدس بنیاد اور مینو سواد شہر کے دیکھنے سے حاصل ہوئی۔ بعد مدت منہ مانگی مراد پائی سعادت نے اپنی صورت زیبا دکھائی۔ دلی آرزو برآئی زہے نصیب۔

صد شکر کہ آفتاب مقصود — از بُرج اُمید چہرہ بنمود

قسطنطنیہ سا خوشنما اور لطف پرور شہر ساری خدائی میں نہیں ہے یہ شہر ساحل بحر مارمورا پر واقع ہے اور کہسار رفیع اس کے سامنے اور بھی لطف مزید دکھاتے ہیں۔ تین حصے مکانات شہر کے سمندر سے صاف نظر آتے ہیں اور عجیب کیفیت دکھاتے ہیں۔ مغرب کی سمت ایک بڑی عمیق کھائی ہے اور دیوار (شہر پناہ) نہایت مستحکم اور مرتفع چار میل تک گئی ہے۔ یہ دیوار کوہ رفعت شاہ تھیوڈوسیس نے بنوائی تھی جا بجا مینار اور ان کے چمکتے دمکتے سر طوق اور آبنوس کے عظیم الشان پھاٹک ہیں۔ شہر خود پہاڑی پر واقع ہے۔

دُور سے عموماً اور ساحل بحر سے خصوصاً نیلگوں پتھروں کی اونچی اونچی مسجدیں اور ان کے متعدد مینار اور مختلف ایوان کے مکانات قابل دید ہیں۔ باغ اس شہر میں اس کثرت سے ہیں کہ کوئی محلہ ایسا نہیں کہ جس میں دس بارہ باغ نہ ہوں۔ چمن طرازی اور خیاباں پردازی اس شہر کے کامل فن باغبانوں پر ختم ہے۔ ایسی چمن بندی کبھی کاہے کو دیکھنے میں آئی تھی۔ اکثر اشجار پُر بہار اس قدر بلند ہیں کہ گویا آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ ساحل بحر پر کھڑے ہو کر ادھر سمندر ادھر شہر کی کیفیت ایسی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ بیان سے باہر۔ اکثر درخت سدا بہار ہیں۔ خزاں بتیا توڑ بھاگتی ہے۔ عروسانِ چمن نے بہار کو اپنے بس میں کر لیا ہے۔ ساحل بحر پر ہر قسم کے جہاز ہر ملک کے آدمی ہر سلطنت کے نشان دیکھ لیجیے۔

تمام یورپ میں ایسے سرو نہیں جیسے اس شہر کے باغوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ کیلے بھی باغوں کی آخری روشوں میں لطف دکھاتے ہیں۔ انجیر اور شہتوت اور کھجور اور تاڑ اس دار السلطنت کے گرداگرد مختلف مقامات پر بوئے گئے ہیں۔ جنوب کی سمت پہاڑوں کی قطار ہے جن کی چوٹی ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ گو قدرت اس خطۂ خوش سواد کو رشکِ گلزار ارم بنایا ہے، لیکن ہنر نے اس کو کما حقہٗ ترقی نہیں دی ورنہ اس ملک کا ایک ایک گاؤں بہشت بریں پر خندہ زن ہوتا اور اس شہر مینو چہر کو اور شہروں کے مقابل میں ملکہ کہتے۔

بازار عموماً تنگ ہیں مگر صاف۔ قبرستان کی اس قدر افراط ہے کہ ہر مقام پر دو چار تکیے موجود ہیں۔ بازاروں میں گاڑیوں اور گھوڑوں کی آمد و رفت کم ہے جیسے بڑوں شہروں کا قاعدہ ہے کہ خاص خاص بازاروں اور نخاس اور چوک میں شور و غل مچا کرتا ہے۔ ویسا یہاں نہیں۔

فٹن اور پالکی گاڑی اور اودھے کی یہاں صورت بھی دیکھنے میں نہیں آتی۔ ایک قسم کی رنگی ہوئی گاڑی ہوتی ہے جس کو ارابا کہتے ہیں۔ اس میں بھینسے جوتے جاتے ہیں۔ ان گاڑیوں میں اکثر خاتونیں اور معزز عورتیں ہوا کھانے نکلتی ہیں جس طرح ہندوستان میں بیل گاڑی قدم قدم چلتی ہے اسی طرح ارابا بھی جاتا ہے۔ یہاں کے کتے سرخی مائل رنگ کے ہوتے ہیں مگر بدقطع چھوٹے چھوٹے کان۔ بازاروں میں پڑے رہتے ہیں اور جب تک چھڑی سے کوئی اٹھاتا نہیں تب تک نہیں اٹھتے۔ شب کو دس بجے کے بعد شہر میں سناٹا ہو جاتا ہے۔ آتش زنی کے وقت پہرے دار غل مچاتے ہیں (ہان جن دار) یعنی آگ لگی آگ لگی۔ حکم سلطانی ہے کہ اگر عرصہ دراز تک گل نہ ہو تو وزرا خود جائیں اور بند و بست کریں اور ایک پاشا نے حکم دیدیا ہے کہ اگر ہم غافل سو رہے ہوں تو بھی آتش زنی کے وقت ہم کو جگا دو۔ اگر ہم نہ جاگیں تو پلنگ الٹ دو۔ کئی بار خود حضرت سلطان المعظم بنفس نفیس آگ فرو کرنے کے لیے تشریف لائے۔

اس شہر میں تخمیناً کوئی لاکھ آدمیوں کی آبادی ہوگی۔ مگر مردم شماری کا قاعدہ اچھی طرح جاری نہیں ہے۔ پندرہ ہزار کلٹ گیہوں روز صرف میں آتا ہے یہ وزن قریب ۰۰۰۰ ۴۲ سیر کے ہوا۔ ترکوں کے علاوہ یونانی یہودی ارمن اور فرنیک آباد ہیں۔ ان سب کی وضع و قطع اور لباس اور پوشاک بالکل مختلف حصوں میں بود و باش کرتے ہیں ۱۸۴۸ء میں قسطنطنیہ کی آبادی کا حال ایک کتاب میں یوں درج ہے: یونانی ساٹھ ہزار۔ اہل مالٹا ۱۹۸۳۔ اہل اسٹریا ساڑھے چار ہزار۔ فرانسیسی ۸۵۵۔ روسی ۶۷۸۔ فارسی ۶۵۷۔ نبکٹن ۱۱۱۔ انگریز ۲۱۰۔ بلجیین ۱۸۲۰۔ پرشین ۱۴۴۔ سپانیارڈ ۴۵۔ ڈین ۴۷۔ درج ۳۷۔ امریکن ۲۴۔ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو غیر ملکوں اور مذہب کے ہیں۔

ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی۔ مسلمانوں کے بوٹ زرد ہوتے ہیں۔ اہل آرمینیا کے سرخ۔ یونانیوں کے سیاہ اور یہودیوں کے نیلے۔ دیکھتے ہی معلوم ہو جائے کہ کس قوم اور ملک کے ہیں۔ معزز شریف ترکوں کی خاتونیں برقع پوش باہر نکلتی ہیں۔ ان کی حیا پردری اور عفت کی قسم کھانی چاہیئے۔ انتہا کی عفیفہ ہوتی ہیں۔ حیا آنکھوں میں جیسے بو گل میں۔ یہودنیں ذرا زیادہ آزاد ہیں مگر حسین و مہ جبین بعض بعض مطلق العنان بھی ہیں۔ کوہ قاف کی پریاں۔ بس پیار ہی کرنے کے قابل ہیں مگر

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اس کا مطلب حضور کے سمجھنے کے لائق ہے داد دیجیئے تسلیم!

اکثر ترک کوہ قاف کی نوخیز اور نسرین عورتوں کے ساتھ شادی کر لیتے ہیں۔ مگر ان پر جبر نہیں کیا جاتا۔ اگر ان کی مرضی ہو تو مسلمان کے ساتھ شادی کریں ورنہ اس کو اختیار ہے۔ اگر ان کے شوہر نے بے اعتنائی کی تو وہ بذریعہ عدالت اپنے کو زوجیت سے خارج کر سکتی ہیں۔ یہاں کے خاص باشندوں یعنی مسلمان ترکوں کی عورتیں بھی حسین ہوتی ہیں اور نک سک چہرے مہرے سے درست ان کی وضع مجھے پسند ہے۔ کوہ قاف کی پریاں ستم ڈھاتی ہیں۔ غضب بپا کرتی ہیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ حوران بہشت کو پر کاٹ کے چھوڑ دیا ہے۔

یہاں کی شاہی مسجدیں جو سلاطینِ روم نے بنوائی تھیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ سلطانی مساجد چودہ ہیں۔ عام مسجدیں دو سو۔ معابد تین سو۔ استی بازار جن کو بیسطین کہتے ہیں۔ ایک بات مجھے قسطنطنیہ میں بہت پسند آئی۔ یہاں باغوں کی طرح فوارے اور آبشار اور چشمے بھی کثرت سے ہیں اور فوارے ایسے خوشنما کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

قسطنطنیہ میں تخمیناً ایک لاکھ مکان ہوں گے۔ لکڑی کے مکان زیادہ ہیں۔ پتھروں کی حویلیاں ترکوں کو چنداں پسند نہیں ہیں۔ ترک کہتے ہیں کہ ہم کو خدا نے خاک سے پیدا کیا۔ پتھر کے مکان میں رہنا سرکشی کرنا ہے۔ علاوہ بریں مسجدیں جن کو ہم خانۂ خدا کہتے ہیں پتھر کی بنی ہیں۔ اگر ہمارے مکان بھی پتھر کے بنے ہوں تو فرق کیا ہے؟ میرے نزدیک پتھر کے مکان اس آب و ہوا کے لیے موزون بھی نہیں ہیں۔ لکڑی کی دیواریں یہاں کی آب و ہوا کے لائق اچھی ہیں۔ ہر مکان کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک محلسرا۔ دوسرا مردوں کے رہنے کا۔

ایک دن میں یہاں کے پُرفضا باغ میں جو ناص شہر سے آدھ کوس کے فاصلے پر ہے اپنے دوستوں کے ساتھ گیا ایک ترک دوسرا فرانسیسی۔ مجھے دعوےٰ ہے کہ اگر مدتوں ایک مرتبہ اس باغ بے نظیر میں آئے تو دق سے مخلصی نجات پائے۔ اس وقت مجھے خدا جانے کون یاد آیا جس کی یاد نے مجھے آٹھ آٹھ آنسو رلایا۔

بے گلعذار جا کے گلستاں میں کیا کیا
ہاں یہ کیا کہ داغِ کہن کو نیا کیا

حُسن آرا میں نے ٹھان لی ہے کہ اگر قید فرنگ سے رہائی پائی اور تمھارے ساتھ نکاح کی نوبت آئی تو ایسے ہی مینو سواد باغوں میں زندگی کے لطف اُڑائیں گے انشاءاللہ۔ سپہر آرا بیگم کے دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اب کہیں شادی کی فکر کرو۔ بے سمجھے بوجھے دل لگانا عقلا کا شعار نہیں۔ سپہر آرا کے لائق ہونا چاہیئے۔ رئیس زادہ ہو۔ تربیت یافتہ ہو۔ چال چلن اچھا ہو۔ خوبرو ہو۔ کوئی عیب نہ ہو اور مشہور آدمی ہو۔ سپہر آرا بیچاری کو بھی میری جدائی شاق گذرتی ہوگی۔

بارگاہ سلطانی کی عظمت حیطۂ تحریر سے خارج ہے۔ ایسے ایسے عالیشان ایوان رفیع اور گران بہا عمارات دیکھنے میں آئیں کہ ہندوستان کے مکانوں کو بھول گیا ہاں تاج محل کی ٹکر کی ایک عمارت نہیں۔ بارگاہ سلطانی کیا شہر کے اندر ایک اور شہر ہے۔ بارہ پھاٹک ہیں۔ کوئی آٹھ ہزار آدمی اس میں رہتے ہیں۔ دو سمت سمندر لہریں مارتا ہے اور ایک طرف شہر ہے۔ قسطنطنیہ کی آب و ہوا میرے مزاج کو راس آئی ہے۔ اپریل سے ستمبر تک ہوا پُروائی چلتی ہے اور موسم زمستان میں جنوبی ہوا۔ اردگرد پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی کمال لطف ظاہر کرتی ہیں۔ لیموں اور نارنج کے درخت میدانوں میں بوئے جائیں تو مرجھا کے کانٹا ہو جائیں۔ وجہ یہ کہ آب و ہوا اس درجہ معتدل ہے کہ یہ درخت سرسبز نہیں ہونے پاتے۔ یہ گرمی چاہتے ہیں لہٰذا کسی قدر سائے میں بوئے جاتے ہیں۔ بارش کم ہوتی ہے۔ ادھر گھٹا چھائی مینہ برسا ادھر کھل گیا۔

یہاں تخمینہ کیا گیا ہے کہ قسطنطنیہ میں ہم ۶ دن تو پانی برستا ہے۔ پانچ روز برف پڑتی ہے۔ ۱۵ روز آندھی آتی ہے۔ ۲ روز بدلی رہتی ہے ۴۰ دن ہوا بدلتی رہتی ہے اور ۲۲۰ دن مطلع بالکل صاف رہتا ہے اس کا نام پہلے بائی زینٹیم تھا۔ بعد کے نام سے ۳۲۴ء میں ایک شہنشاہ نے اس کو (نیو روم) کا خطاب دیا۔ ترک اس کو استنبول کہتے ہیں۔ اس کا بانی شاہ کانسٹن ٹائین تھا۔ اسی کے نام سے یہ شہر کانسٹن ٹینو پل مشہور ہوا اور عرب اور فارس میں قسطنطنیہ کہنے لگے یورپ اور ایشیا اور افریقہ سب کے وسط میں ہے ایشیا اور کوئی شہر نہیں جس کو اس قدر فائدہ حاصل ہو۔ یہ دو سمندروں کے درمیان میں واقع ہے۔

پیاری حسن آرا افسوس ہے کہ تم جہاز کے حالات سے واقف نہیں ہو، ورنہ کچھ باتیں ضرور لکھتا۔ جو کچھ میں لکھنا چاہتا ہوں وہ تمھاری سمجھ میں نہ آئے گا، لہٰذا اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ جہاز پر بجز پانی اور آسمان کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ جہاز کی آندھی سے بڑھ کر خوفناک اور کوئی چیز نہیں ہے۔ انتہا یہ کہ ملاحوں اور ناخداؤں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں جو تمام عمر سمندر ہی میں رہتے ہیں۔ جس وقت ہمارا جہاز جنی ڈبلیس چکر کھا کر ڈوبا۔ ہے ہے بس میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا حال تھا توبہ توبہ۔

شہر کے متصل ایک مقام ہے دیپرا، یہاں وزرائے ممالک غیر رہا کرتے ہیں اس مقام پر تمام یورپ کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور تمام یورپ کی پوشاک نظر آتی ہے۔ افسوس کہ تجارت کی طرف ترکوں کا میلان طبیعت نہیں ورنہ یہ ملک سونے کی کان کو مات کرتا۔ ادنیٰ ادنیٰ آدمی بات بات پر موتی رول دیتا۔ ریشم۔ لکڑی۔ افیون۔ موم اور گوند یہ چیزیں اور ملکوں کے سوداگر یہاں سے لے جاتے ہیں۔ یہاں کا عطر سبحان اللہ سبحان اللہ ہندوستان کے عطر کی اصل وحقیقت کیا ہے، شب عروسی کو انشاء اللہ وہی عطر ہوگا۔ ذرا مسکرا تو دو۔

وہ لب پہ آئی ہنسی   دیکھو مسکراتی ہو

ایسا عطر کبھی کا ہے کو سونگھنے میں آیا تھا۔ یہاں یہ عطر عموماً رومال میں ملا جاتا ہے۔ دس بارہ قطرے محلے کے محلے کو معنبر کردیں۔ دھوبی کے ہاں سے دُھل کے آئے اور وہی خوشبو باقی رہے۔ لوہے اور کوئلے اور ٹین کی یہاں قلت ہے۔

انگلستان اور روم میں جو تجارت ہوتی ہے اس سے ترکوں کو سروکار نہیں یونانی اور ارمن سوداگر اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ تجارت سے ترکوں کو ایک قسم کی نفرت ہے اور کلی نفرت۔ یہاں کے اخباروں کو جب ہم ہندوستان کے اخباروں سے مقابلہ کرتے ہیں تو زمین و آسمان کا فرق پاتے ہیں۔ وہ آزادی یہاں کہاں۔ اخبار نویس ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں کوئی لفظ گورنمنٹ کے اس قدر خلاف نہ لکھیں کہ پاشا اُن کے تباہ کرنے کی فکر کریں۔ اگر کسی نے کوئی کلمہ ذرا بھی آزادی کے ساتھ لکھا تو حکام نے اس کو خاک میں ملا دیا اور بالکل برباد کر دیا۔

لڑائی برابر کی ہو رہی ہے۔ ایشیا میں جو روسی فوج بڑھ آئی تھی وہ ہٹا دی گئی۔ یورپ میں برابر کی جنگ ہو رہی ہے۔ خدا مالک ہے روسی بھی کچھ کم لڑنے والے نہیں ہیں اور ترکوں کی شجاعت تو ضرب المثل ہے۔ لوہے سے لوہا لڑتا ہے۔ دیکھیے کیا انجام ہو مگر۔ بیدل نیم ہنوز بہ بینم چہ میشود۔

آزاد پاشا نے خط رکھ دیا اور چمنوں میں ہوا کھانے لگے۔ حسن آرا کو یاد کر کے آنکھیں پُر نم ہو گئیں۔

میدان مصاف[1]

آزاد پاشا گرفتار ہونے کے بعد دریائے ڈینیوب کے قریب کئی لڑائیاں ہوئیں مگر خاص معرکے کی جنگ اُس قلعۂ معلی کے متصل ہوئی جس میں توپ اژدرد ہان شررافشاں کی پیشانی پر یہ مصرع کندہ تھا؛

بترس اے مدعی از من کہ آتش در دہن دارم

اس جنگ عظیم میں عساکر سلطانی اور افواج روس کے کئی ہزار مردان کاری کام آئے۔ دونوں سمت اے مردان بکوشید کا نعرہ بلند تھا۔ بھاگنے کا کوچہ بند تھا جان بکف دونوں آمادہ پیکار تھے، سرگرم گیر و دار تھے۔ ترکی کہتے تھے کہ سپاہی کے لیے تلوار کے مُنہ مرنا معراج ہے۔ روسی للکارتے تھے کہ خدا نے چاہا تو اس ملک میں صبح شام ہمارا ہی راج ہے۔ ترکوں کے ایک سپہ سالار آزمودہ کار نے سپاہ کا دل بڑھانے کے لیے کہا۔ ہاں غازیانِ جان نثار بڑھے ہوئے قدم پیچھے نہ ہٹنے پائیں۔ وہ حکیما نہ چال کہ غنیم منہ کی کھائیں۔ زندگی دو روزہ ہے۔ کوئی رہا نہ کوئی رہ جائے گا۔

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا ‏ ‏ مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

اِس تلقین سے ترکوں کے دل بڑھے۔ بڑھ بڑھ کر ہاتھ لگائے یا چرکا دیا یا خود چرکے کھائے۔ اِدھر شمشیر آبدار برق لمان کی طرح چمکی ادھر فوج عدو میں زلزلہ آگیا۔ ہر بن مو سے شور الاماں بلند تھا۔

اعدا میں غل تھا تیغ نہیں یہ ہلال ہے
اس کو عروج اور ہمارا زوال ہے

قلعہ عالی مرتبت سے ایک میل کے فاصلے پر پھر چھڑ گئی۔ اِدھر بھی سپاہ کی کثرت۔ ادھر بھی جوانمردوں کی جماعت۔ یہ تُلے ہوئے کہ قتل ہونگے اور قتل کرینگے جان سے ماریں گے اور مریں گے۔ ترکوں کی تلواروں نے وہ رنگ باندھا کہ روسیوں کی سیف دو پیکر تک سمٹ کے رہ گئی اور روسیوں نے ایسے ایسے گولے اُتارے کہ ترکوں تک نے داد دی۔ دونوں میں کوئی انیس تھا۔ کوئی بیس۔ بس فرق تھا تو اسی قدر۔

"قلعہ معلی کے متصل جو جنگ ہوئی اس میں اپیلطن پاشا نے کمال سپہ گری دکھلائی۔ ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ یہ اپیلطن کون تھے؟ یہ لفٹننٹ اپیلٹن سے مراد ہے۔ ترک ان کو اپیلطن پاشا کہتے تھے۔ علیقو پاشا اور اپیلٹن پاشا دونوں نے روسیوں کے چھکے چھڑا دیئے اب سنیئے کہ یہ جنگ ایک چشمہ سار کے قریب ہوئی تھی۔ ترکوں کو اس قدر فائدہ حاصل تھا کہ روسی فوج کی نسبت ذرا بلند مقام پر تھے۔ علیقو پاشا کی حکمت عملی سے روسیوں کی رسد بند ہو گئی۔ دو طرف سے فوج ترک نے ان کو گھیر لیا۔ ایک سمت ندیا تھا اور ایک سمت جنگل۔

ایک روسی کالم نے جس میں سوار کثرت سے تھے اور محاصرہ کی توپ اژدر صولت بھی کافی تھیں۔ ترکوں کے ایک چھوٹے سے قلعے کو خالی کرالیا۔ اور چند آدمی اس کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر مثل سیل بلاخیز آگے بڑھے تو سات میل کے فاصلہ پر ایک جگہ

---

[1] جنگ۔

یوں کے پچاس سواروں سے مقابلہ ہوا۔ وہ معدودے چندان کی ہزاروں کی جماعت۔ کچھ گرفتار ہوئے کچھ زخمی اور کچھ بھاگ گئے جو
وار بلوہ بچ رہے تھے انھوں نے فوراً قریب کے کالم کو اطلاع دی۔ اور ایک پہر بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ فوج ظفر موج روم ایلی کی
ولت لوا صدیق پاشا میدان میں نظر آئی مگر جب روسیوں کو معلوم ہوا کہ غنیم میدان میں آیا۔ ترکی سواروں کے ہری چھم گھوڑے
ھکھیلیوں پر تھے۔ آدھ کوس کے فاصلے پر فوج نے دم لیا۔ روسیوں کے علم و یقین سے خارج تھا کہ ترک اس کر و فر کے ساتھ
تے ہیں سمجھے تھے کہ تھوڑے سے سوار بھیجے ہوں گے جنھیں ہم چٹکیوں میں نیچا دکھا دیں گے۔ مگر جب عساکر سلطانی کی عظمت و
بروت اور جماعت پر نظر ڈالی تو آنکھیں کھل گئیں اور مشورہ ہونے لگا کہ اب کیا کریں اور یہ خبر ہی نہ تھی کہ ترکوں کی شمشیر تیز ان کے
دن کی پیاسی ہے۔ سر پر قضا کھیل رہی ہے۔ اجل نے فوج روس میں خیمہ نصب کر دیا ہے۔

توپوں پر بتی پڑی اور دونوں طرف سے گولہ اندازوں نے گولے اتارنا شروع کیے۔ اتفاق سے ترکوں کی ایک توپ جس پر
ن کو ناز تھا بیکار ہو گئی۔ دیکھا تو کسی نے کیل ٹھونک دی تھی۔ تاڑ گئے کہ روسیوں نے کسی کو اپنی طرف پھانس لیا ہے رشوت دینے
در توڑ پھوڑ میں روسی برق ہیں۔ یہ انھیں کی کارستانی ہے۔ کیل نکالی اور توپ کو بھی کام میں لائے۔ مگر حیرت تھی کہ راتوں رات
س نے کیل لگا دی۔ یہ کس موذی کی شرارت ہے۔ آخر کار ترکوں نے نیچا دکھایا اور دوسرے روز۔

سحرگہ زورق کش آفتاب　　　زساحل بر افگندہ زورق بر آب

اس مقام سے کوچ کر کے آگے بڑھے۔ اس مصاف میں روسیوں کے سات سو سوار اور گیارہ افسر کام آئے اور چار توپیں
ھین لی گئیں۔ کوچ کر کے دوسرے دن یہ فوج اس لشکر سے جا ملی جس میں علیقو پاشا اور اپیلطن پاشا تھے۔

ایک گھنٹے سے گولہ چلنا موقوف ہوا تھا مگر از سر نو دونوں فوجیں تیاریاں کر رہی تھیں اور دونوں کی کمکی فوج آ گئی تھی۔
اتنے میں ایک شخص نے لشکریوں سے پوچھا کہ اس فوج کا افسر اعلیٰ کون ہے۔ یہ شخص پیر مرد تھا۔ کشیدہ قامت کشادہ پیشانی صبیح جبیں۔
یرانی الاصل۔ ایک مدت سے یلغار ستاق میں بود و باش اختیار کی تھی۔ لشکریوں نے پوچھا۔ کیوں تم کو افسر سے کیا واسطہ؟ کیا ہم کسی کا پیغام لائے ہیں۔

محمد صدیق پاشا سے ذکر کیا گیا۔ حکم ہوا کہ اس کے لباس کو بخوبی دیکھ بھال لو۔ کوئی آلۂ حرب اس کے پاس نہ ہو۔ کاسکوں نے کپڑے ٹٹول
دیکھے۔ حکم دیا کہ جاؤ۔ یہ پیر مرد جھک کر آداب بجا لایا اور عرض کیا۔ حضور سے تخلیے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ ایک شخص نے حضور کے نام عرضی بھیجی ہے۔
مگر قسمیں دی ہیں تاکید کی ہے کہ حضور اس راز سربستہ کو افشا نہ کریں۔ کوئی کانوں کان یہ خبر نہ سننے پائے لہذا عرض پرداز ہوں کہ حضور سب سے علاحدہ
اس خط کو پڑھ لیں۔ یہاں تک کہ خدمتگار بھی کمرے میں نہ ہو۔ صدیق پاشا نے خط لیا۔ کھولا پڑھا۔ علیقو پاشا اور اپیلطن پاشا کو بلوایا اور مسکرا کر کہا
ر اس خط کو کوئی پہچانتا ہے یہ کس کا لکھا ہوا ہے۔ دونوں پاشاؤں نے بغور دیکھا۔ علیقو پاشا نے کہا میں نے یہ خط کبھی پیشتر نہیں دیکھا
تھا۔ مگر اپیلطن پہچان گئے۔ خط کا مضمون یہ تھا:-

"مجھے معلوم نہیں کہ یہ خط جس میں میں نے اپنا حال زار لکھا ہے کس کے ہاتھ میں جائے گا۔ مگر میں اس وجہ مجبور اور پریشان ہوں کہ بے سمجھے سوچے لکھ مارا۔ ماشاءاللہ

لیے جاتا ہے نامۂ بیکس　　　بال بیکا نہ ہو کبوتر کا

مجھے مس کلیرسا کے عتاب نے کہیں کا نہ رکھا۔ ہائے میں سمجھا تھا کہ لب لعل شکر خا کا بوسۂ دلربا قند نبات سے زیادہ شیریں ہوگا۔ مگر برعکس
س کے تلخ کامی نصیب ہوئی۔ حکم ہوا کہ سیبیریا کے برفستان میں جلا وطن کیا جائے اور قید با مشقت کی سزا دی جائے مگر دریائے ڈینیوب عبور کرتے
کرتے ہی ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا۔ اب میں ایک زاہد فریب طاؤس زیب لیڈی کا قیدی ہوں۔ وہ چند روز میں میرے ساتھ شادی کرے گی
اور تمام عمر مجھے یہاں سے نکلنے نہ دے گی۔

اشکِ غم

سپہر آرا نے کیسی کون خبر بد سُنی کہ آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ یا الٰہی اور یہ بھولیاں ان کی بہنیں ہیں۔ اپنے اپنے طرز پر سب نے غمزدہ ستم رسیدہ کو سمجھایا اور دلاسا دینا شروع کیا۔

جہاں آرا۔ بہن لے منہ دھو ڈالو۔ اُف کب سے رو رہی ہو۔ مار کے ہلکان ہو گئیں میری بہن۔ ناحق آنکھیں کھوتی ہو۔ ماندی ہو جاؤ گی۔ ذرا تو صبر کرو بہن۔ صبر صبر۔

گیتی آرا۔ سپہر آرا۔ اے یہ کیا منحوسیت ہے، ابھی سے روتی ہو، آدمی گئے ہیں ان کو تو آنے دو۔ اللہ کی کریمی سے کیا دور ہے۔ مردے جی اُٹھتے ہیں یہ کون بات ہے۔

سپہر آرا۔ (رو کر) تو باجی وہ زمانے اور تھے۔ اب زندے ہی مردے سے بدتر ہیں۔ مردہ بھلا مر کے کیا اُٹھے گا اُف اُف۔

حسن آرا۔ سپہر آرا! ابھی خبر معتبر نہیں ہے۔ آدمی کو آنے دو اور دل کو ذرا ادھر اُدھر بہلاؤ۔ پھر باغ میں چلیں۔ چلو بہن وہاں دل بہلاؤ ذری۔

یہ تو معلوم ہوا کہ سپہر آرا بیگم مصروف گریہ وزاری ہیں اور ان کی بہنیں ان کو سمجھا رہی ہیں۔ مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ سپہر آرا کے اس غم والم کا سبب خاص کیا تھا۔ اس قدر معلوم ہے کہ جعفری بیگم کی زبانی کوئی ایسی بات سنی جس نے سپہر آرا کو خون رُلایا۔

ناظرین اب سپہر آرا بیچاری کے گریۂ حسرت آلود کا حال سنیئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ دفعۃً مرزا ہمایوں فر کے مکان سے رونے کی آواز آئی تو سب کے سب گھبرا اُٹھے۔ شادی کے گھر میں رونا دھونا کیسا۔

سپہر آرا اور ان کی بہنوں کے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے۔ فوراً ایک خادمہ کو بھیجا وہ جواب لائی کہ بجرے پر کچھ لوگ سوار تھے، سو وہ اُلٹ گیا۔ اب کیا جانے کون کون تھا! ہمایوں فر کی بہن اور بھاوج اور سب عورتیں رو رہی ہیں۔ سانڈنی سوار دوڑایا گیا ہے کہ جلد خبر لائے۔ کلیجہ تھام تھام کر رہ گئیں۔ پھر مغلانی کو بھیجا تو وہ بھی جواب شافی نہ لائیں۔

اتنے میں کیا دیکھتی ہیں کہ ایک سانڈنی سوار بڑی تیزی کے ساتھ ہمایوں فر کے محل سرا میں جاتا ہے فوراً مغلانی کو حکم دیا کہ چوبدار کو دوڑا دو۔ کھوج کے خبر لائے۔

چوبدار معاً روانہ ہوا۔ ڈیوڑھی پر گیا تو وہاں پٹس پڑی ہوئی۔ کہرام مچا ہوا۔ اندر سے باہر تک سب ماتم کر رہے ہیں۔ ہر سمت شور و شین کی آواز بلند ہے۔

چوبدار نے کئی آدمیوں سے پوچھا خیر تو ہے۔ مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ سب اپنی اپنی تباہی میں تھے جواب کون دیتا۔

آواز اس قدر بلند ہوئی کہ بڑی بیگم کے ایوان فلک توامان تک پہنچی۔

سپہر آرا وہیں بیٹھے بیٹھے گر پڑی اور غش آگیا۔

آزاد اور شہزادی

آزاد ایک دن سوچے کر آؤ خط ختم کر ڈالیں۔ بلغارستان کا حال لکھیں یا مانٹی نیگرو کا بیان؟ ان کو دریائے ڈینیوب یاد آیا، قلم اُٹھایا۔ پھر لکھنا شروع کیا، ان کو یقین واثق تھا کہ یہ خط حسن آرا بیگم کے پاس پہنچ ہی جائے گا۔ جو خط پیشتر لکھا اس میں دریائے ڈینیوب کا حال بھی شامل کر دیا۔

تذکرۂ دریائے ڈینیوب:۔

اس دریا کو ٹرکی سے وہی نسبت ہے جو ہندوستان سے دریائے گنگ کو نسبت ہے۔ جس طرح دریائے گنگ اپنی سالانہ طغیانی سے اردگرد کے مقامات کو سرسبز و شاداب کرتا ہے، اسی طرح یہ دریائے زخار بھی ان شہروں اور مزارع کو سیراب کر دیتا ہے جو اس کے کنارے پر واقع ہیں۔ زبان پاستان میں اس دریا کو اسطر کہتے ہیں۔ اس دریا کو اہل یورپ سلطان البحر کہتے ہیں کیونکہ ترقی تجارت اور امور پولیٹیکل اور کثرت آب وغیرہ باتوں کے لحاظ سے کوئی دریائے یورپ اس کا نقطہ مقابل نہیں ہے۔ اس کا مخرج دیکھ کر جو شخص خدا کی قدرت کاملہ کا اعتراف نہ کرے وہ کافر ہے اتنا بڑا ذخار دریا ادساایک شہزادے کے محل کے احاطہ سے نکلا ہے ع

یہ شانِ کردگار یہ قدرت خدا کی ہے

یہ دریا دفعتہً سمندر میں نہیں گرتا ہے۔ بلکہ کئی مقام پر کئی دہانوں سے گرتا ہے۔ ڈینیوب کا طول چودہ سو میل ہے۔ ۱۹۱۸ء سے اس دریا میں بوٹوں کے ذریعے سے تجارت ہوتی ہے۔ پیشتر عجیب قطع کے صندوق دریا میں ڈالے جاتے تھے۔ ایک قسم کا ایک صندوق میں نے یہاں کے ایک تالاب میں دیکھا تھا، پہلے بوٹ کے عوض اس قسم کے صندوق کچھ عرصے تک کام میں آتے تھے اور جب وہ خراب ہو جاتے تھے تو لکڑی کے عوض جلائے جاتے تھے۔

اتنے میں وہ نازنین قیامت خرام دولینڈ کی شہزادی جس کی قید میں آزاد گرفتار تھے، اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گزری۔ آزاد نے جھک کر آداب عرض کیا۔ شہزادی نے مسکرا کر پوچھا۔ مزاج شریف؟ کہا۔ زندہ درگور ہیں! شہزادی نے کہا اب صرف ایک بات کہنی باقی ہے اور اسی ایک بات پر تمھاری ناکامی اور کامیابی منحصر ہے اگر عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنا چاہو تو خیر۔ ورنہ تمھیں اختیار ہے۔

آزاد۔ میں تو غم کھانے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔

غم کھاتا ہوں لیکن مری نیت نہیں بھرتی ‏‏ ‏‏ کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

بے سمجھے بوجھے کیونکر کہوں کہ منظور ہے یا منظور ہے۔ حضور فرمائیں تو بعد غور عرض کروں۔ مگر خیال رہے کہ غریب الوطن ہوں۔

شہزادی۔ بہت پچھتاؤ گے۔

آزاد۔ ایک دفعہ اور سُن چکے ہیں۔

شہزادی۔ صحیح کہتی ہوں بڑی مصیبت میں پڑو گے۔

آزاد۔ خیر سمجھا جائے گا۔ ہرچہ بادا باد ماکشتی درآب انداختیم۔

شہزادی۔ آج کل جنون کا زور معلوم ہوتا ہے۔ عربن ان کو سمجھاؤ۔
عربن۔ سمجھاتے سمجھاتے عاجز ہو گئی۔ اب کس کو سمجھاؤں۔ ان کے سمجھانے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو بلوائیے۔
شہزادی۔ افسوس ہے۔ پڑھا لکھا آدمی اور ایسا وحشی۔
آزاد۔ ہائے درد دل کس سے کہوں حسن آرا۔ وائے حسن آرا۔

آزاد کا دل اس وقت بھر آیا اور حسن آرا کو یاد کر کے خوب روئے۔

شہزادی تاڑ گئی کہ کسی نو عروس نازنین کا عاشق زار ہے۔ پہلے تو غصہ آیا اور غایت غیظ و غضب میں چاہا کہ اسی وقت سزائے سخت دے مگر دل کو سمجھایا۔

سوچی کہ دلا شتاب کیا ہے! پھر سمجھیں گے اضطراب کیا ہے

آزاد پاشا ایک درخت کے تلے بیٹھ کر ادھر اُدھر کے اشعار پڑھنے لگے۔

شہزادی نے عربن سے کہا۔ اتنے دن سے یہ شخص یہاں ہے مگر آج تک اس کا حال معلوم نہ ہوا۔ اس سے پیچ کے طور پر دریافت تو کرو کہ اس کے درد کا کچھ چارہ ہے کہ نہیں؟

درماں ہے کہ درد لا دوا ہے

عربن۔ کسی پر ان کا دل ضرور آیا۔
شہزادی۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے تو جا کے قتل کر ڈالوں۔
عربن۔ کئی خط میرے سامنے لکھ چکے ہیں۔
شہزادی۔ وہ خط آج رات کو چُرا کر ہمارے پاس لے آؤ۔
عربن۔ بہت اچھا۔
راوی۔ افسوس ہے کہ آزاد پاشا صید مصائب ہوں گے مگر خدا ارحم الراحمین ہے۔

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم

آزاد پاشا کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ یہاں کچھ اور ہی ہنڈیا پک رہی ہے۔

عربن نے آزاد کو پھر سمجھانا شروع کیا۔ اے جوانِ رعنا! افسوس ہے کہ تیری زندگانی کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اب تو چند ہی روز کا مہمان ہے۔ آزاد نے کہا ؎

بر امید وعدۂ وصل تو اے جانِ جہاں
شوق اگر ماند چنیں مشکل کہ نتواں زیستن

عربن کو بے اختیار ہنسی آئی۔ کہا بس تو جان دے گا۔

پولینڈ کی شہزادی نے جب آزاد کی یہ گریہ وزاری اور بیقراری دیکھی تو عربن سے بلا کر کہا۔ تم آخری مرتبہ اس قدر دریافت کر لو کہ ہمارے حکم کی تعمیل کریں گے یا نہیں اور یہ بھی اطلاع دو کہ اگر تعمیل حکم نہ کی تو مبتلائے بلا ہوں گے۔
عربن نے کہا۔ بیوی جانے کو تو جاتی ہوں۔ مگر خیر نہیں نظر آتی وہ بڑا سنگدل آدمی ہے۔ کسی کا کہنا نہ مانے گا۔ کوئی لاکھ

سمجھائے وہ اپنی ہی سی کرے گا۔ یہ کہہ کر عزبن آزاد کے پاس آئی اور یوں ہمکلام ہوئی۔
عزبن۔ حضور نے بھیجا ہے۔ ذرا آدمی بنو تو کہوں سنتے بھی ہو کچھ!
آزاد۔ کان ہیں مگر قوتِ سامعہ نہیں۔ آنکھ ہے مگر قوتِ باصرہ نہیں۔
عزبن۔ ہائے ہائے کیسا جوان خوبصورت خوش وضع تربیت یافتہ ہے اور کس مصیبت میں گرفتار ہوا۔
آزاد۔ چاہے جو ہو۔ اب تو جو ہوا وہ ہوا۔

ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

عزبن۔ آخری سوال یہ ہے کہ کہنا مانو گے یا نہیں۔ اگر مانو گے تو خیر ورنہ بھگتو گے۔
آزاد۔ بلا سے۔

شہزادہ ہمایوں فر کا ماتم

الٰہی یہ کیسا انقلاب ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ شہزادہ سنجر صولت سکندر پرنس ہمایوں فر بہادر کے یہاں دن عید اور رات شبرات تھی اور آج کہرام مچا ہوا ہے۔ کل دلبر سبحان مبارک باشد کی صدا آتی تھی آج بین ہو رہا ہے۔ کل ہمایوں فر جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے کہ دولھا بنیں گے۔ آج ان کی بیچاری والدہ ضعیفہ سوگ نشین ہیں۔ کل ان کی بہنیں مارے خوشی کے ہنسی ضبط نہیں کر سکتی تھیں۔ آج ہچکی نہیں تھمتی۔ کل فرط طرب سے اتراتے تھے کہ گوہر مقصود ہاتھ آیا۔ آج خدا جانے کس بحر مصیبت میں غوطے کھاتے ہیں۔ ہمایوں فر کی والدہ ضعیفہ وستم رسیدہ رو رو کر کہتی تھی ہائے میں دکھیا اسی دن کے لیے اب تک جیتی رہی کہ اپنے بچے کی میت دیکھوں۔ ہے ہے ابھی تو اچھی طرح مسیں بھی نہیں بھیگنے پائی تھیں کہ تمام بدن سر سے پاؤں تک دریا میں بھیگ گیا۔

اتنے میں سواریاں آنے لگیں ہے ہے یہ کیا ہوا۔ شادی کے گھر میں یہ ماتم کیسا۔ ہمایوں فر کی مادر ضعیفہ نے کلیجہ تھام کر کہا۔ ہائے یہ رانڈ بیوہ کا بچہ بن باپ کا بچہ اپنی بوڑھی ماں کو چھوڑ چلا۔ بیٹا مجھے کس کے سپرد کیا؟ اس فقرے پر گھر بھر نے بہ آواز بلند کہا ہائے!!!

دو شہزادے اور کئی نواب زادے آئے جن کو اندر آنا تھا وہ محلسرا میں چلے گئے۔ باقی باہر بیٹھے مصروف گریہ وزاری تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں صاحب ضلع اور ان کے اسسٹنٹ اور صاحب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دو میجر ایک کرنل اور پروفیسر صاحب مرزا ہمایوں فر کی کوٹھی میں داخل ہوئے اور دم کے دم میں کوئی بائیس تئیس ہزار آدمی جمع ہو گیا۔ ایک پر ایک گرا پڑتا۔ سب کی زبان پر لفظ الاماں تھی خلق تمام نوحہ خواں تھی جس کو دیکھو دیدہ مطرود سینہ مجروح آنکھوں سے آنسوؤں کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اس ضعیفہ نیم جان کو روتے روتے غش آ گیا۔ ایک خادمہ نے کیوڑا چھڑکا پانی پلایا عطر لائی۔ لخلخہ سونگھایا۔ جب ہوش آیا تو کہا بیٹا ہم اشکوں سے منہ دھوتے ہیں اور تم آرام کے ساتھ سوتے ہو۔ ہم بے آرام جان کھوتے ہیں تم آنکھیں بند کیے ہوئے سو رہے ہو اور اتنا نہیں ہوتا کہ اماں کو دلاسا دو۔ ہم بکا اور بین کرتے ہیں تم پوچھتے تک نہیں۔ ہائے میں خستہ تن کیا کروں، یا اللہ میں کیا کروں ہائے میں کس کے آسرے پر جیوں۔ خاتون جنت کی قسم تو میری مٹی تباہ کر چلا۔ ہائے بیٹا تو تو دولھا بنا تھا۔ سوچے تھے کہ شہنائی آگے آگے بجتی ہوگی دعوتیں ہونگی، جلسے ہونگے ناچ اور رنگ ہوگا۔ وہ سب تو خواب ہو گیا۔ ستارے کی گردش نے ایسا رلایا ایسا رلایا کہ دین اور دنیا دونوں سے گذر گئے! اُف۔ اُف۔ اُف ہائے میں کیا کروں، میں واری میرے لال میں صدقے میرے بچے۔ میں قربان یا خدا کسی تدبیر سے میرا شیر دل بچہ اُٹھ کھڑا ہو چاہے میں مر جاؤں۔ ہائے اس وقت موت آئے تو کیسی جی جاؤں۔ از سر نو زندہ ہو جاؤں۔ ارے میرے بیٹے کل تو دولھا بنے گا۔ اُف دلھن کی طرح منہ گھونگھٹ میں ہے۔

ادھر تو یہ شور و شیون اور فغان و محن تھا۔ مگر حسن آرا بیچاری سے لوگوں نے یہ راز سربستہ بالکل مخفی رکھا بلکہ حسن آرا اور کیتی آرا ایک کو نہ معلوم ہوا۔ صرف بڑی بیگم اور عباسی اور جہاں آرا راز دان تھیں۔ بڑی بیگم نے جیسے ہی یہ خبر پائی آنسو آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ مگر جہاں آرا تاڑ گئی کہ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔ فوراً اُٹھ کر محلسرا میں گئی تو بڑی بیگم کو دیکھا مضطرب و پریشان۔ کہا امی جان صاف صاف بتاؤ۔

بڑی بیگم۔ کیا بتاؤں ہمایوں فر چل بسے مگر چپ چپ کیسے!

جہاں آرا۔ (متحیر ہوکر بہ آواز بلند) ہائیں!

بڑی بیگم۔ چُپ چُپ۔ سپہر آرا نہ سننے پائے۔ میں نے گاڑی تیار ہونے کا حکم دیا ہے چلو باغ کو چلیں وہاں دو گھڑی اُن کا دل بہلے گا۔ یہاں تو یہ خبر ضرور سُنیں گی۔ تم کچھ ذرا بھی ذکر نہ کرنا۔

جہاں آرا۔ (گھبرا کر) امّی جان! ہائے یہ کیا ہوا؟

بڑی بیگم۔ واسطے خدا کے بیٹی چپ رہو بڑا بُرا وقت جاتا ہے۔

بڑی بیگم نے فوراً سب لڑکیوں کو بلایا اور کہا باہر پردہ ہے، سواری تیار ہے چلو باغ کی سیر کریں۔ آج جی بہت گھبراتا ہے۔

سپہر آرا خوش ہو گئی۔ کہا امّاں جان میرے دل کی بات کہی۔ اُہو ہو۔ میں ذری دوپٹہ تو بدل لوں۔

عباسی عطر تو لے چلو۔ سنگار دان لے چلو۔ موباف نکال لو۔

سپہر آرا دل میں خوش تھیں کہ باغ کی سیر کریں گے۔ مگر یہ خبر ہی نہ تھی کہ بڑی بیگم کس سبب سے باغ لیے جاتی ہیں۔ چاروں بہنیں ایک پالکی گاڑی پر سوار ہوئیں عباسی پیچھے۔ دو چوبدار ساتھ ہوئے۔ بڑی بیگم صاحب فنس پر سوار ہوئیں۔ مہریاں اِدھر اُدھر کونے دبائے چلنے لگیں۔ دو مغلانیاں ڈولیوں پر سوار ہو کر ہمراہ ہوئیں۔ چوبدار ساتھ تھے۔ راہ میں سپہر آرا اور حسن آرا اور گیتی آرا آپس میں مزے مزے کی باتیں کرتی تھیں۔ مگر عباسی اور جہاں آرا کے دل پر بجلیاں گرتی تھیں۔ بارے خدا خدا کر کے باغ میں سواریاں داخل ہوئیں اور بسم اللہ کہہ کر کہاروں نے فنس رکھی۔ اِدھر لڑکیاں اُدھر بڑی بیگم اُتریں۔ باغ میں پہلے ہی پردہ ہو گیا۔ بڑی بیگم صاحب ایک کمرے میں بیٹھیں۔

جہاں آرا نے کہا۔ ہم تھک گئے ہیں۔ بہن ذرا لیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر حسن آرا اور سپہر آرا اور گیتی آرا گلگشت چمن کرنے لگیں۔

سپہر آرا نے موقع پا کر عباسی سے کہا۔ ایک دن ہم اور ہمایوں فر اس باغ میں ٹہل رہے ہونگے۔ نکاح ہوا اور ہم ان کو باغ میں لے آئے۔ دس پانچ روز یہاں ہی رہیں گے۔ عباسی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ دل میں کہنے لگی۔ کدھر خیال ہے کون ہمایوں فر، کیسا نکاح؟ وہاں جنازے اور کفن کی تیاریاں ہو رہی ہیں یہ نکاح کی دُھن میں ہیں۔ ہائے افسوس!

جنازہ

حسن آرا بیگم اور گیتی آرا اور سپہر آرا باغ کے چبوترے پر پلنگڑیوں پہ بڑے آرام کے ساتھ لیٹیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے روح وجد کرتی تھی۔ حسن آرا نے اشعار پڑھنا شروع کیے؛

ابرست و بہارست و ہوا ہم مزہ دارد
برخیز کہ لغزیدن پا ہم مزہ دارد

سپہر آرا بولی۔ باجی اب سونے دو۔ اُدئی اللہ سونے دو۔

گیتی آرا۔ اے ہے۔ تو ایسی نیند بھی کس کام کی۔ اورستو۔ سونے دو۔

سپہر آرا۔ تو آپ رات بھر نہ سوئیں۔ آپ جگا کریں بس۔

حسن آرا۔ اے یہ آج جہاں آرا بہن اور عباسی کہاں چھپ رہیں؟

سپہر آرا۔ آپ کی طرح رات بھر جاگنے کا تو ٹھیکا لیا نہیں ہے کسی نے۔

حسن آرا۔ ہم شب زندہ دار ہیں۔ رات کو عبادتِ خدا میں مصروف ہوتے ہیں۔

سپہر آرا۔ بھئی اللہ سونے نہ دیں گی آج۔ ہم بھی امّی جان کے پاس جاتے ہیں۔

حسن آرا۔ ہم تو سونے نہ دیں گے۔ جس کا جی چاہے بیٹھے۔ جس کا جی چاہے جائے

یارب تو چناں کن کہ پریشاں نہ شوم — محتاج برادران و خویشاں نہ شوم
بے منت مخلوق مرا روزی دہ — تا از درِ تو بر درِ ایشاں نہ شوم

سپہر آرا نے کہا تمھیں قسم ہے جو صبح تک خاموش رہو۔ ہاں پڑھے جاؤ۔ حسن آرا مسکرائی اور کہا ہم گیتی آرا بہن کو سناتے ہیں۔

سپہر آرا جھلا کر اُٹھ کے چل دیں۔ چلیں تو بڑی بیگم کے پلنگ تک ہی پہنچنے پائیں تھیں کہ ہائے کی آواز آئی۔ حسن آرا اور گیتی آرا نے قریب جا کر دیکھا تو سپہر آرا بیہوش۔ بڑی بیگم کو اطلاع نہ دی فوراً پانی کے چھینٹے دیے۔

سپہر آرا بار بار سہمی جاتی تھی اور یاس و نومیدی کے کلمے زبان پر لاتی تھی۔ حسن آرا سمجھاتی تھی گیتی آرا ازراہِ مذاق بناتی تھی۔

گیتی آرا۔ واہ بس یہی کہتی تھیں کہ بھوت پریت کوئی شے نہیں ہے۔

حسن آرا۔ کیوں ہنسواتی ہو اپنے کو بہن۔

گیتی آرا۔ اوروں کو ہنستی ہیں اور خود یہ حال ہے۔

سپہر آرا نے آنکھیں بند کریں اور کہا باجی ہم کو سونے دو چھیڑو نہیں۔

حسن آرا۔ (گیتی آرا سے) باغ میں دو گھڑی چین نہ آیا۔

ہمصفیر اس باغ کی کیسی ہوا ناساز ہے
طائرِ رنگِ چمن تک مائلِ پرواز ہے

گیتی آرا۔ کیا جانے کیا سبب ہے کہ سہم اُٹھی۔

حسن آرا۔ اللہ جانے۔ کہیں ڈر گئی ہیں۔ اُف فوہ۔ توبہ توبہ۔

مغلانی۔ حضور ہاتھ پاؤں کیسے سرد ہیں جیسے مثالِ یخ۔

گیتی آرا۔ امی جان کو جگا دیں، اطلاع کر دیں یا چپکے ہو رہیں۔

حسن آرا۔ ہے ہے وہ سُن پائیں گی تو سپہر آرا کو اور بھی ڈراویں گی۔

مغلانی۔ مگر بیگم صاحب ان سے کہنا تو ضرور چاہیئے جگا دوں۔

حسن آرا اور گیتی آرا اور مغلانی کی صلاح سے بڑی بیگم کو اطلاع دی گئی کہ سپہر آرا باغ میں ڈر گئیں۔

بڑی بیگم۔ ارے! ہے کیسی خیریت ہے۔

حسن آرا۔ ہاں اماں جان۔ اس وقت آنکھ لگ گئی ہے ذری۔

مغلانی۔ حضور ہی کے پاس آتی تھیں مگر راہ میں ڈر گئیں۔

بڑی بیگم۔ اچھا کیا مصیبت ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے۔

مغلانی۔ حضور وہیں چل کے آپ بھی آرام کریں۔

اتنے میں جہاں آرا کی آنکھ کھل گئی تو چونک کر بولی۔ کیوں۔ کیوں۔ خیر تو ہے امی جان۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟

مغلانی۔ جی ہاں فضلِ الٰہی ہے

جہاں آرا۔ پھر یہ باتیں کیا ہو رہی ہیں آہستہ آہستہ؟

حسن آرا۔ سپہر آرا سہم گئیں۔ درخت کے پاس ڈر گئیں ذرا۔

جہاں آرا۔ ہے کہاں۔ ہائے ہائے یا میرے اللہ!

حسن آرا۔ آئے تھے اس لیے کہ دو گھڑی لطف ہوگا۔ یہاں رنج نصیب ہوا۔

بڑی بیگم۔ نصیب۔ قسمت (آہ سرد بھر کر) کہو نہ۔

حسن آرا۔ چلو امی جان، وہیں چلو۔

بڑی بیگم صاحب اُٹھ کر چبوترے کی طرف گئیں۔ جہاں آرا بیگم کانپتی ہوئی ساتھ ساتھ تھیں۔ بڑی بیگم نے جوان کو تھر تھراتے اور کانپتے دیکھا تو نہایت متانت کے ساتھ سمجھانے لگیں۔

بڑی بیگم۔ نا بیٹیا سہمے کو اور کوئی سہماتا ہے۔

حسن آرا۔ جہاں آرا بہن۔ ہائیں ہائیں دیکھیئے سنبھلیے۔

گیتی آرا۔ اے آہستہ گفتگو کرو بہن۔ آنکھ ابھی ابھی لگی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جگ پڑیں۔

اتنے میں سپہر آرا نے کروٹ بدلی۔

بڑی بیگم۔ (سپہر آرا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر) سپہر آرا!

حسن آرا۔ بہن بولو۔ اماں جان کیا پوچھتی ہیں!

جہاں آرا۔ میں بھی بیٹھ جاؤں یہاں پر۔ ڈر معلوم ہوتا ہے۔

سپہر آرا۔ اماں جان آج جان نکل گئی۔
حسن آرا۔ کچھ حال تو بیان کرو یہ ہوا کیا تھا بہن ؟
سپہر آرا۔ درخت کے پاس جب پہنچی۔ بس ایک۔
حسن آرا۔ کونسا درخت؟ یہ سامنے والا؟
سپہر آرا۔ نہیں مولسری کے درخت کے پاس۔ تو بس معلوم ہوا کہ کسی بھوت پریت نے کوئی روشن شے پھینکی اور اس کے بعد کوئی کالی کالی چیز ڈالی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی آواز آئی۔

سپہر آرا۔ کسی کا جنازہ جاتا ہے۔
حسن آرا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلیہِ رَاجِعُوْن۔

سپہر آرا کی بیتابی

کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

اب سنیئے کہ بڑی بیگم کے نزہت افزا اور دلکشا باغ کے متصل شاہ فصیح کا تکیہ تھا جس میں کئی بادشاہوں اور شہزادوں اور رئیسوں کے مقبرے تھے یہ جنازہ بھی اسی تکیہ میں گیا۔ اس کے ساتھ ہزاروں آدمی تھے۔ باغ کے ایک بُرج سے حسن آرا اور سپہر آرا اور گیتی آرا اور عباسی نے دیکھا کہ جنازہ بڑے کرّ و فر کے ساتھ اُٹھا ہے اور شہر کے رؤسا اور عمائد ہمراہ ہیں۔

سپہر آرا۔ باجی جان! کسی سے دریافت کریں کہ یہ کس بیچارے کا جنازہ ہے؟ خدا اس کو بخشے۔ خدا اس کی تربت کو عنبریں کرے۔

حسن آرا۔ اُوہ سارا شہر ساتھ ہے۔ اللہ یہ کون مرگیا! کس سے پوچھیں؟

عباسی۔ حضور جانے بھی دیں۔ رات کا وقت لاش نہ دیکھیں۔

حسن آرا۔ نہیں گلاب مالی سے کہو ابھی ابھی پوچھے اور جواب لائے۔

عباسی تھر تھر کانپنے لگی۔ گلاب نے باغبان کے کان میں کچھ کہا وہ باغ کا پھاٹک کھول کر باہر گیا۔ لوگوں سے دریافت کیا۔ آن کر عباسی کے کان میں کہا۔ عباسی اور گلاب میں سرگوشی ہوئی۔ اس کے بعد عباسی نے بُرج پر جا کر یوں کہا۔

عبّاسی۔ اے حضور خاندان نیشاپور کے کوئی رئیس تھے۔

سپہر آرا۔ سن کیا تھا؟ ہائے جوان کا مرنا قہر ہے۔ دشمن کو بھی اللہ بچائے۔

گیتی آرا۔ کچھ ٹھکانا ہے کہاں کہاں تک تانتا لگا ہوا ہے۔

سپہر آرا۔ خدا جانے جورو اور لڑکے بالے ہیں یا مجرّد ہے۔ جوان ہے یا بوڑھا؟

بڑی بیگم کے کان میں عباسی نے کچھ کہا تو وہ دو ہتڑ پیٹنے لگیں۔ کہا۔ حسن آرا ہماری بھتی کھائے جو اُلٹے پاؤں نہ چلی آئے۔ ہم کو ہیبت کرے جو ابھی نہ آئے۔

حسن آرا۔ خیر ہے امّاں جان۔ آخر یہاں کھڑے رہنے میں کیا ڈر ہے۔

بڑی بیگم۔ اچھا، تم کو اس سے کیا مطلب؟

سپہر آرا۔ امّاں جان کسی کا جنازہ جاتا ہے لاکھوں آدمی ساتھ ہیں۔

ایک۔ واہ رے مرے شہزادے۔ کس سبکساری کے ساتھ مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

بر سینہ و سر دست زناں میر فقند   پیش تابوت چو برناؤ چہ پیر

دوسرا۔ حضرت اس شہر میں بس ایک ہی رئیس تھا۔ افسوس جیسے ہی میں نے یہ خبر وحشت اثر سُنی۔ بس ؎

قافلۂ طاقت و اشک و فغاں   از بدن و چشم و دلِ ما برفت

تیسرا۔ یارو آفتاب برج امارت تہ خاک ہوا۔ ہائے ہائے ہائے ہائے۔

چوتھا۔ اجل سے خدا سمجھے، خدایا اس اجل کا گھر پھونکیو ۔

شررِ جوش است ترا پائے دل اے یاس مدہ بیرے — مگر ترا زمو دستم ندارد عشق تاثیرے

پانچواں۔ کیا رنج کرتا ہے بچہ! دنیا گذشتنی وگذاشتنی ہے ۔

بیا زاہد از من نصیحت شنو — رہ و رسم اہلِ حقیقت شنو
مکن خویشتن را عبث در شکنج — کہ دنیا و عقبیٰ نیرزد بہ رنج
نہ دانم بہ سجہ چہار دیدہ — کہ چوں ماہ بر مہر پیچیدہ
بہ سجہ چہ دانی کہ خاک شفاست — نہاں زیر ایں خاک زنار ماست
بیا ساقی آں شربت خمر نام — ہماں مردمِ دیدۂ شیخ جام
شرابی کہ گلبانگ منصور از دست — شرابی کہ خاموشی طور از دست
بمن دہ کہ خون دلم جوش زد — نگاہِ بتانیم با ہوش زد

میاں اس دنیا کی راحت اور اس کا رنج سب ہیچ ہے ۔

بڑی بیگم۔ اللہ کے واسطے چلی آؤ۔

جہان آرا۔ ائے آخر کیا ماجرا ہے بھئی! تمہیں دیتی جاتی ہیں اور کوئی سنتا ہی نہیں۔

حسن آرا۔ اچھا اچھا آئے ۔کہو صاحب بس۔

جہان آرا۔ اور گیتی آرا کہاں ہیں وہ وہاں کیوں رہ گئیں آؤ بہن وہاں کیا ہے!

سپہر آرا۔ مجھے سردی سی معلوم ہوتی ہے ۔

اتنے میں گیتی آرا بھی نیچے آئی۔ کہا۔ امّی جان! کوئی شہزادہ مر گیا ہے کیونکہ کئی آدمی شہزادے شہزادے کہہ کر روتے ہیں بڑی بیگم نے کہا کوئی مرے ہوں گے۔

عباسی۔ کوئی بوڑھا آدمی تھا۔

جہان آرا۔ ہاں ہاں وہ تو گلاب نے کہا ہے۔

سپہر آرا۔ ارے بوڑھا تھا تو پھر کیا غم ہے۔

بڑی بیگم (مسکرا کر) ہاں یہی بات ہے تو پھر جتنے بوڑھے مرد اور جتنی بوڑھی عورتیں ہوں سب کو مرنا چاہیئے۔

سپہر آرا۔ (شرما کر) ایسی باتیں نہ فرمائیے امّاں جان ۔

حسن آرا۔ بوڑھے اور جوان سب کو مرنا ہے ایک دن۔

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا — مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے

اُف فوہ ۔موت بھی کیا بُری شے ہے ۔

بڑی بیگم۔ اب ذرا سو رہیں۔

حسن آرا۔ ہم کو تو آج شب کو نیند نہ آئے گی۔ آپ آرام فرمائیں۔

قبرستان میں کہرام مچا ہوا تھا ہر صغیر و کبیر منا ذ پیر نوحہ کناں تھا سپہر آرا اور گیتی آرا کا جی بہت گھبرایا۔ جہان آرا اور بڑی بیگم

اور عباسی کو تو پہلے ہی سے معلوم تھا۔ ان دنوں نے کوشش بلیغ کی کہ سپہر آرا سے مخفی رکھیں۔ مگر جب کہ جنازہ باغ ہی کے قریب آیا اُن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

بڑی بیگم اور جہاں آرا اور عباسی نے یوں صلاح کی :-

بڑی بیگم۔ اچھا بلاؤ۔ کہو دہیں جا کے سو رہو سب اور جلد آؤ۔

عباسی نے وہاں جا کر کہا۔ چلیے بڑی سرکار کو سب بلاتی ہیں۔ اس پر سپہر آرا نے قہقہہ لگایا۔

سپہر آرا۔ اے واہ، بڑی سرکار کو سب بلاتی ہیں یا سب کو بڑی سرکار بلاتی ہیں۔

حسن آرا۔ اچھا کہہ دو کہ اگر ضروری کام ہو تو حاضر ہوں نہیں سونے دیں۔

ادھر عباسی بڑی بیگم کے پاس گئی اور وہاں سے واپس آئی۔ کہا۔ بڑی سرکار بہت خفا ہیں۔ اس وقت مارے غصے کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔ حسن آرا اُٹھی کہا چلو بھئی چلیں۔ چلنے ہی کو تھیں کہ قبرستان سے آواز آئی۔

" ہائے میرے ہمایوں فر داغ دے گئے۔ اس دغا کی تم سے امید نہ تھی "

حسن آرا۔ ایں! عباسی۔ یہ کس کا نام لیا؟

عباسی۔ حضور بہادر مرزا کہا۔ کوئی بہادر مرزا ہوں گے۔

حسن آرا۔ عباسی تمھیں دھوکا ہو گیا۔ اری یہ کس کا نام لیا؟

عباسی۔ حضور کے قدموں کی قسم بہادر مرزا کہا۔

حسن آرا۔ ذری گلاب سے کہو پوچھے جا کے۔

عباسی نے گلاب کو سکھا دیا۔ گلاب نے آن کر کہا۔ ہجور کوئی باہر کے رئیس تھے بہادر مرجا (بہادر مرزا) دہی مر گئے ہیں۔ بڈھے آدمی تھے بیچارے بہت سے لوگ ساتھ ہیں۔

عباسی۔ لونڈی نے پہلے ہی عرض کیا تھا۔

حسن آرا۔ ہاں بہن دھوکا ہُوا۔ ہائے پاؤں کے تلے سے مٹی نکل گئی۔

گیتی آرا۔ بہن ہم نے بھی کسی اور ہی کا نام سنا تھا۔ اللہ کرے وہ جُگ جُگ جئیں صاف اسی بیچارے کا نام لیا تھا مُوئے نے۔

عباسی۔ لیا ہوگا۔ ہم نے تو بہادر مرزا سُنا۔

عباسی اور حسن آرا اور گیتی آرا بڑی بیگم کے پاس آئیں۔

قبرستان

مریض وہ ہوں جو درماں سے بے نصیب آیا
اجل ہنسی مری بالیں پہ جب طبیب آیا

لاکھ جتن کیئے مرزا ہمایوں فر کی جان نہ جائے مگر خاک فائدہ نہ ہوا۔ جس وقت اس شہید خنجر ناز کی لاش دریا سے نکالی گئی، ارد گرد تماشائی ٹھٹ کے ٹھٹ جمع تھے اور کہرام مچا ہوا تھا۔

ڈاکٹروں پر ڈاکٹر آئے۔ اطباء یونانی و مصرانی سب جمع تھے مگر کسی سے کچھ نہ ہو سکا۔ اور ہوتا کیا کوئی اجل سے لڑ سکا ہے، نوبت بایں جا رسید کہ تابوت قبرستان پہنچا۔

اب سنیئے کہ بڑی بیگم صاحب نے بہزار خرابی لڑکیوں کو باغ میں اپنے پاس سلایا۔ مگر حسن آرا اور گیتی آرا کی آنکھ نہ لگی۔ پہلے حسن آرا اٹھیں۔ اُن کی آہٹ پا کر گیتی آرا بھی بیدار ہوئیں۔

حسن آرا۔ اس وقت کلیجہ دھڑکتا ہے۔
گیتی آرا۔ جب سے مردہ آیا ہے ہمارا دل بھی بے تابو ہے۔
حسن آرا۔ کیا جانئے کون بیچارہ تھا۔
گیتی آرا۔ کوئی اس کے گھر والوں کے دل سے پوچھے
حسن آرا۔ ہائے کیا جانئے ان پر کیا گذرتی ہو گی!

حسن آرا اور گیتی آرا بیتاب ہو کر کمرے کے باہر آئیں اور روشوں میں ٹہلنے لگیں تو قبرستان سے طرح طرح کی آوازیں سننے میں آئیں۔ ایک شخص نے آہ سرد کھینچ کر کہا۔ ہائے میرے شاہزادے ہمیں کس کے سپرد کر چلے۔ دوسرے نے سمجھایا بھائی صبر کرو، صبر کرو۔ الصبر مفتاح الفرج آیا ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال   صد سال مے تواں بہ تمنا گریستن

تیسرا بولا۔ ارے یار لاکھوں تمناؤں کا خون ہو گیا۔ ہائے وہ ناز پروردہ گلبدن صاحب اس سانحۂ دیدنی اور واقعۂ ناشنیدنی کا حال سننے گی تو اس کے قلب کا کیا حال ہو گا۔ ہے ہے لاکھوں تدبیریں کیں مگر ایک بھی کارگر نہ ہوئی۔

حسن آرا۔ بہن کوئی ہر دل عزیز شہزادہ تھا۔ دیکھو اتنے آدمی ماتم کر رہے ہیں۔ کیا غضب ہو گیا۔
گیتی آرا۔ ہمیں اس وقت در و دیوار اور ایک ایک پتی سے موت کی شکل نظر آتی ہے اُف۔ ہے ہے۔
حسن آرا۔ خدا ہی خیر کرے چلیے چل کے سو رہیں۔
گیتی آرا۔ قدم نہیں اٹھتا۔ ہائے قدم نہیں اٹھتا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ سپہر آرا بھی منلانی کو لے کر پہنچی۔

حسن آرا۔ اسے لو اور سنو آپ بھی آئیں ازبرائے خدا تم جاؤ۔

گیتی آرا۔ لے ہاں تم جاؤ ابھی ڈر گئی تھیں

سپہر آرا۔ اس بیچارے کی شادی ہوتی تھی یا نہیں۔ ہے ہے جو شادی ہوئی ہوگی تو ستم ہے۔

سپہر آرا کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ تھوڑی دیر میں تڑپ رہی ہوں گی چند آدمی باہم تقریر کرنے لگے کہ قبر اور مرقد حضور پر کیا عبارت کندہ ہو۔

ایک۔ تاریخ وصال ہو۔ چار مصرعہ کافی ہیں مگر ہجری سن ہو۔

دوسرا۔ ہوں تو پھر دس بارہ شعر سے کیا کم ہوں اور سب تاریخی ہوں۔

تیسرا۔ ہم جانتے ہیں یوں نہ ہو۔

مرقد ہمایوں فر منور شہزادہ جم جاہ فلک پائگاہ سکندر صولت رشک سنجر حضرت۔

اس کے بعد ہمایوں فر کا لفظ کہنے کو تھے کہ ایک شخص نے غل مچا کر کہا۔ خدا خیر کرے۔ ایک بھائی کا تابوت ابھی رکھا ہی ہے اور دوسرے کی حالت دگرگوں ہے۔

سپہر آرا۔ معلوم ہوتا ہے دو بھائی ہیں۔ دوسرے کی طبیعت بھی بگڑی ہوئی ہے۔

گیتی آرا۔ ان کی بوڑھی ماں کے دل پر کیا گذرتی ہوگی — ہائے —

سپہر آرا۔ جو شادی ہو گئی ہے تو خرابی ہے اور اگر شادی ہونے کو تھی تو خرابی ہے۔ وہ بےچاری بیوہ اپنے دل میں خدا جانے کیا سوچتی ہوگی۔

حسن آرا۔ سوچتی کیا ہوگی، سوچتی ہوگی کہ مر مٹے۔

حسن آرا اور گیتی آرا اور سپہر آرا تینوں بہنیں چلی آئیں اور سو رہیں مگر دل بےچین تھا اور طبیعت مضمحل۔ تھوڑی دیر میں نیند آئی اور آرام کرنے لگیں۔

نوشہ کا قتل ستم ہے

عین تیجے کے دن شہزادۂ ہمایوں فر بہادر خوشی خوشی محل معلیٰ میں داخل ہوئے اور آتے ہی اس زور سے اپنی مادر مہربان کے گلے لپٹے کہ فرطِ طرب سے اشک اضطراب فروش دامن کی خبر لائے۔ شہزادی بیگم سخت حیران کہ یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ میرا لال تو زمین کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ شہر بھر اپنے سامنے دفنا آیا۔ بہن مارے خوشی کے کھلکھلاتی تھی مگر مُردے کو زندہ دیکھ کر تھرّاتی تھی۔ مغلانیاں، پیش خدمتیں، مہریاں سب دنگ۔ چہرے زرد۔ رنگ فق۔ کسی نے دانتوں کے تلے انگلی دبائی۔ کوئی جھجک کر کونے میں جا چھپی۔ کسی نے کہا سایہ ہے۔ کوئی بولی موا بہروپیا درگور روپ بھر کے حضور کے بھیس میں آیا ہے اور ہمایوں فر کھڑے ہنس رہے ہیں، مگر سہمے ہوئے۔ اتنے میں باہر سے ان کے کئی رشتہ دار کئی نواب زادے یہ حیرت افزا خبر سُن کر دوڑ پڑے۔ دیکھا تو

صورت وہی، رنگ رو وہی ہے   لہجہ وہی، گفتگو وہی ہے

آخر کار مرزا ہمایوں فر نے ایک کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ بہن! خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے ہمیں سب سے زیادہ رنج یہ ہے کہ تم ہمیں بھول گئیں۔ یہی کہتی تھیں کہ بھائی کی ہمیں سب سے بڑھ کر محبت ہے۔ جاؤ بس دیکھ لیا۔ اس پر ہمایوں فر کی بہن نے جھپٹ کر پیشانی نورانی کا بوسہ لیا اور کہا۔ واسطے خدا کے بتاؤ یہ اسرار کیا ہے۔ یہ ہوا کیا تمہیں کچھ خبر ہے۔

مغلانی۔ رچٹ چٹ بلائیں لے کر) حضور نام بدل ہو گیا۔ اللہ جانتا ہے۔

شہزادہ۔ لاحول ولا قوۃ۔ آخر کہو تو یہ ماجرا کیا ہے۔ تم سب مجھے دیکھ دیکھ کر متحیر کیوں ہو۔ یہ میری سمجھ میں خود نہیں آتا۔

نواب (ہمایوں فر کے چچا زاد بھائی) واللہ (متحیر ہو کر) یا خدا خیر کیجیو!

بڑی بیگم۔ یہ کیا اسرار ہے لوگو! ارے میرے لال ہائے کوئی مجھے اس وقت دھوکا دے رہا ہے۔ ہے ہے خدا کرے خواب نہ دیکھتی ہوں۔ اُف۔

جب ہمایوں فر کو کل حالات معلوم ہوئے تو دل دھڑکنے لگا اور یوں ہمکلام ہوئے، مگر خود بھی کانپے جاتے تھے۔

ہمایوں فر۔ جناب باری کی قسم جو مجھے اس معاملے کی خبر بھی ہوئی ہو۔ ہمارے بجرے کے سامنے ایک بجرا اُلٹ گیا۔ اتنا تو ہم نے دیکھا کہ جو لوگ اس پر بیٹھے تھے وہ ڈوب گئے۔ پھر ہوا نے ایسا زور باندھا اور دریا کی اس قدر طغیانی ہوئی کہ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے دو سرے روز ہم اس فقیر کے ہاں رہے اب اس کو لے کر آئے ہیں۔

جب اس واقعہ ہوش ربا حیرت افزا کی خبر ہوئی تو تمام شہر کے آدمی جوق جوق اُمنڈ آئے اور ہر ناڈ پیر غریب و امیر سب نے یہی خواہش ظاہر کی کہ ہمایوں فر کو ایک نظر دیکھ لیں۔

اُسی وقت بزم طرب آراستہ ہوئی۔ ہمایوں فر کی مادر مہربان اور پیاری بہن اور اعزہ و اقربا جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ شہزادی بیگم بار بار بلائیں لیتی تھیں اور پیار کر کر کے روتی تھیں۔ تمام شب جلسہ رہا۔ شہر بھر کے آدمی جمع تھے۔ ہر در و دیوار مسرت بار تھی کہ شہزادے نے دوبارہ زندگی پائی۔ دلی آرزو بر آئی۔

صاحب مجسٹریٹ ضلع نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ جو بیچارہ معیبت کا مارا نوجوان غرق ہو گیا تھا ہوا وہ مرزا ہمایوں فر

کا مشکل تھا۔ معاً قبر کھدوائی گئی۔ دیکھا تو بعینہٖ مشابہ شہزادۂ ہمایوں فر۔ اس بیکس کی لاش دیکھ کر سخت غمگین ہوئے۔

ایک ہفتہ تک خوب جشن رہا۔ اندر بھی اور باہر بھی۔ وہاں ڈومنیوں نے یہاں ارباب نشاط نے خوب دھما چوکڑی مچائی۔ اس کے بعد شہزادی بیگم نے بڑی بیگم کے ہاں پیغام بھیجا کہ اب جس قدر جلد ہو سکے شادی ہو جائے۔ مجھے اب اپنی زندگی کا بالکل بھروسا نہیں ہے اور دلی آرزو ہے کہ میرے سامنے ہی ہمایوں فر کا نکاح ہو تاکہ بہو کو اپنی آنکھوں دیکھ لوں۔ بڑی بیگم نے منظور کر لیا اور ایک تاریخ سعید بعد از عید اس تقریب فرح کے لیے مقرر ہوئی۔ شہزادہ ہمایوں فر کی برات کے اہتمام میں شہزادی بیگم نے بڑا روپیہ صرف کیا۔ جب شاہانہ کر و فر سے برات چلی تو تمام شہر کے باشندے فرط مسرت سے جامے میں نہیں سماتے تھے۔

جس طرف برات اس کر و فر اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ جاتی تھی۔ تماشائی دعا مانگتے تھے۔ یا الٰہی جوڑی برقرار رہے۔ دولھا دلھن عیش سے زندگی بسر کریں۔ جوانی کے لطف اٹھائیں۔ ایک بولا جوڑی ہو تو ایسی۔ دولھا غنچہ دہن۔ دلھن گلبدن۔ دولھا صبیح چہرہ دلھن غیرت مہر۔ دوسرے نے کہا الحق جوانی ہے۔ خوبرو ہے۔ رشک یوسف، دلکش حور ہے۔ پاکدامن ہے۔ غیور ہے۔ اتنے میں میاں محمد عسکری بھی چوگوشیہ ٹوپی سر مبارک پر جمائے شرتی کا انگرکھا پھڑکاتے ہوئے آئے۔ ان سے اور ایک جوان رعنا سے باتیں ہونے لگیں۔

جوان۔ کیوں حضرت یہ کون بزرگوار ہیں جن کی شادی ہے؟

محمد عسکری۔ حضرت یہ شہزادے ہیں۔ شہزادہ مرزا ہمایوں فر بہادر۔

جوان۔ کیسے تنے ہوئے بیٹھے ہیں اور کیوں نہ ہو شہزادے ہیں۔ بھلا نسبت کہاں ہوئی ہے؟ وہ بھی کوئی شہزادی ہوں گی؟

محمد عسکری۔ جی ہاں۔ بڑی بیگم کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ ان کی پوتی کے ساتھ نسبت ہوئی ہے، وہ بھی مالدار ہیں۔

جوان۔ خدا کرے دلھن بھی پری ہو۔ ورنہ چاند کو گہن لگے گا۔

محمد عسکری۔ انتہا کی حسین و زہرہ جبین ہے۔ شوخ طرار۔ برق وش طناز۔ ایک روز میں نے بالکل سادگی کی حالت میں دیکھا تھا اسی وقت حمام کر کے سفید کپڑے پہن کر باہر آئی تھیں۔ واللہ بغیر زیور کے وہ جوبن تھا کہ بس کیا کہوں۔ ایسی پری کا پیکر عورت تو دیکھنے میں نہیں آئی۔

جوان۔ اس وقت طبیعت کمال مسرور ہوئی۔ حسین مرد کو اگر حسین بیوی نہ ملے تو ستم ہے۔

محمد عسکری۔ میں نے اس محبوب دلفریب کو دیکھا ہے۔ ہائے ہائے اک تیر سا اس وقت کلیجے کے پار ہو گیا۔

جوان۔ حضور کا اسم شریف؟ اسی شہر میں دولت خانہ ہے؟

محمد عسکری۔ خاکسار کو محمد عسکری کہتے ہیں۔ غریب خانہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہے مگر ننھیال یہاں ہی ہے۔

جوان۔ (دبے دانتوں) حضور کی شادی تو ہو گئی ہوگی۔ غالباً۔ ہے نا؟

محمد عسکری۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) جی نہیں بندہ پرور۔ اسی مہ جبین کے ناز کا کشتہ ہوں۔ اب تک عمداً اور قصداً شادی نہیں کی۔ مگر درد دل کی دوا نہ ملی۔ اور آج تو دل ٹوٹ ہی گیا۔ پارہ پارہ ہو گیا۔

مرزا ہمایوں فر کی مادر مہربان شہزادی بیگم اور ان کی دونوں مہ پارہ بہنیں اور صدہا شہزادیاں اور بیگمیں مخدرات عصمت سمات جھروکوں اور دریچوں سے برات کا جلوس خسروانہ اور احتشام شاہانہ دیکھتی تھیں۔ دفور طرب سے ماں بہنوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ شہزادی بیگم کے دل پر اس وقت ایک عجیب طرح کا اثر ہوتا تھا۔ جب نوشاہ کا گلگوں خوشخرام سجا سجایا اٹھکیلیاں

کرتا سامنے سے نکلا اور انھوں نے دیکھا کہ ان کا لختِ جگر نورِ بصر ہونہار لڑکا شان اور آن بان کے ساتھ سمندِ خنگی خرام کی زریں لگام لیے ہوئے متمکن ہے تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بحرِ مسرت اس درجہ جوش زن تھا۔ یہ نہ سمجھو کہ رونے کا باعث رنج و محن تھا۔

ہمایوں فر نے سہارِ دستِ چپ سے ہٹا کر اُوپر کی طرف دیکھا تو ہنہیں مسکرائیں اور ان کی بھاوج نے فرطِ ابتہاج سے دریچے کو کھول کر ہمایوں فر پر بے نقاب و بے تکلف نظر ڈالی۔ شہزادی بیگم نے کہا یا باری تعالیٰ میں گنہگار لونڈی کس زبان سے تیرا شکریہ ادا کروں، ہائے ابھی دو دن کی بات ہے کیا سامان تھا، اور اب تیری کریمی کی بدولت یہ کیا ہو رہا ہے!

یہ شہزادی تمام عمر میں کبھی اس قدر خوش نہیں ہوئی تھیں۔ سچ ہے۔

ماں باپ کی آسائش و راحت ہے پسر سے — تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے — ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے
آرام جگر قوت دل راحت جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے
یہ وہ ہے عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے — یہ وہ ہے نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پُر نُور مکاں رہتا ہے جس سے — وہ دُر ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے
کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

برات چکر کھاتی ہوئی چلی۔ بڑی دُور تک تانتا لگا ہوا تھا۔ صدہا رؤساء عمائد ہمراہ تھے۔ پیچھے پیچھے شہدے غل مچاتے تھے، ہاتھیوں سے خدمتگار روپیہ اور اشرفیاں لٹاتے تھے۔

ہمایوں فر کے ایک دوست نے ان کے صبا رفتار گھوڑے کے قریب جا کر کہا۔ واللہ اس وقت تو نوشہ ہی معلوم ہوتے ہو اور اس میں تعجب ہی کیا ہے شہزادے ہو کہ ایسے ویسے۔ دوسرے نے آہستہ سے کہا۔ صدہا سختیاں اٹھائیں مصیبتیں جھیلیں جب جا کے یہ دن دیکھا۔ اُف خداوندا۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک شخص نے بھیڑ کاٹ کر مرزا ہمایوں فر بہادر پر تلوار کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا تو پشتِ توسن سے شہزادہ الا اللہ کہہ کر زمین پر آئے اور ساری برات میں کہرام مچ گیا۔ صدہا آدمی دوڑ پڑے، ہائے کیا غضب ہو گیا۔

دُلہن لاش پر

غافل تجھے کیوں خواہشِ دُنیائے دنی ہے — پیوندِ زمیں ہر کوئی درویش و غنی ہے
جو تاقم و سنجاب پہنتے تھے ہمیشہ — سوتے ہیں تہِ خاک گلے میں کفنی ہے

محلسرا میں جانی بیگم اُنگلیاں مٹکا مٹکا کر اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر نظیر بیگم کو بنا رہی تھیں اور ہمجولیاں نو عمر نوخیز شہزادیاں نواب زادیاں ذوقِ طرب سے کھلکھلا رہی تھیں کہ یکایک باہر سے رونے کی آواز آئی اور غل اُٹھا۔ بیگمات اور مخدراتِ عصمت سمات اور پیش خدمتیں گھبرا گئیں۔ بڑی بیگم چونک پڑیں۔ حسن آرا اور روح افزا گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ بہار النسا اور جہاں آرا مثل پیکرِ تصویر خاموش۔ گیتی آرا نے آوازِ بلند سے کہا۔ ارے عباسی یہ کیا ہوا؟ دلہن نے حیرت کے ساتھ ڈیوڑھی کی طرف نظر کی مگر اچھی طرح گردن نہیں اُٹھائی کہ مبادا لوگ ہنسیں کہ دلہن کیسی شوخ ہے۔ دم بھر بھی سر جھکا کے نہیں بیٹھا جاتا۔

اِتنے میں نواب جعفر علی خاں روتے ہوئے باہر سے محلسرا میں آئے۔ بہن لُٹ گئے۔ ارے غضب ہو گیا۔ ہائے کیا بتاؤں کیا ہُوا۔ اوہ۔ بڑی بیگم سر پیٹنے لگیں۔ ارے لوگو یہ کیا از غیبی تباہی آئی۔ کیا ہوا کیا۔ ہائے ہائے کوئی نہیں بتاتا۔ ارے یہ کہرام کیسا مچا ہے۔ یہ کہہ کر بڑی بیگم کو تیور آیا اور دھڑ سے گر پڑیں۔ عباسی نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔ حضور میں نے تو بڑی ستم کی خبر سنی ہے۔ ہے ہے میرے شہزادے۔ میرے آقا۔ میرے سرتاج۔ میرے شہنشاہ۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ ہر فرد بشر مصروفِ بکاو بین تھا۔ الامان۔

حسن آرا کے چہرے کا رنگ فق۔ بے حس و حرکت۔ سکتے کا عالم۔ خاموش حیرت کا جوش۔

جہاں آرا کو ہجومِ اشک۔ دو منٹ میں دو رومال تر کر ڈالے اور آنسو جاری۔

گیتی آرا مثل ماہیِ بے آب تڑپتی تھی۔ زمین پر لوٹنے لگی۔

روح افزا نے اینٹ سر پر ماری اور سر سے خون جاری ہو گیا۔

بہار النسا نے آوازِ بلند روئی۔ ہائے ہمایوں فر کیا کیا۔ او دشمن یہ کیا دوست بن کے دشمنی کی۔ ہماری پیاری بہن کو کہیں کا نہ رکھا۔ ہائے ہمایوں فر۔ ابھی بیچارے نے دیکھا کیا تھا۔ ہے ہے ہچکی بندھ گئی۔ ارے میرے شہزادے دولہا بن کے آئے تھے۔ ارے یہ کیا ہوا لوگو۔

سپہر آرا سنتے ہی گر پڑی اور بیہوش۔ نظیر بیگم جانی بیگم خورشید بیگم اور دو تین عورتوں نے سنبھالا۔ مگر بیکار۔ کوئی پنکھا جھلتی ہے، کوئی لخلخہ سونگھاتی تھی، کسی نے کیوڑا چھڑکا، کوئی پانی لایا، بڑی بیگم دو ہتڑ مارتی تھیں، کئی عورتیں اور پیش خدمتیں ہاتھ پکڑے تھیں۔ نواب زادے سب کے پہلے خبر لائے تھے۔ انھوں نے باصرار کہا کہ دلہن کو لاش کے پاس ضرور لے چلو۔ مگر اکثر لوگوں نے اس تجویز کے خلاف رائے ظاہر کی۔

سپہر آرا۔ امّاں جان۔ ذری امّاں جان کو کوئی بلاؤ۔

عباسی۔ آئیں حضور آئیں (بڑی بیگم سے) ہوش آیا حضور کو بلاتی ہیں۔ سرکار ذری قدم بڑھائے چلیں۔ ہائے ہائے۔

بڑی بیگم۔ معاً سپہر آرا کے پاس گئیں۔

سپہر آرا۔ اماں جان! ہمیں پیارے شہزادے کی لاش دکھا دو۔
بڑی بیگم۔ (ضبط گریہ کرکے) بیٹا میں تمہیں سمجھاؤں کہ اس سن میں تم پر یہ مصیبت پڑی۔
سپہر آرا۔ نہیں اماں جان۔ خالی تابوت دیکھنے سے تشفی نہ ہوگی۔ ہم کو لاش دکھا دو۔ دیکھیں دولھا بن کے ہمایوں فر کیسے معلوم ہوتے تھے۔
یہ فقرہ کہہ کر سپہر آرا کے چہرے سے مُردنی کے آثار نظر آئے اور ان کے اعزا سخت گھبرائے۔ فوراً ڈاکٹر بلوائے۔ جس وقت ایک ڈاکٹر سرہانے اور ایک ڈاکٹر سامنے کرسی بچھا کر بیٹھا، سپہر آرا مسکرائی۔ کہا واہ۔ ہونہہ۔ اس مرض کا علاج کرنے آئے ہو تو پہلے اپنا علاج تو کرو۔ ارے نادانو! کہیں موت کا بھی علاج ہوا ہے!
ڈاکٹر۔ آپ اپنے دل کو مضبوط رکھیں۔ خدا کی یہی مرضی تھی۔
سپہر آرا۔ بجا ارشاد ہوا۔ مگر دل کہاں ہے؟ دل کا کہیں پتہ ہے؟ ارے نادان روح تک تحلیل ہوگئی اور تو میرے دل کی تشفی کرتا ہے۔
ڈاکٹروں نے خورشید علی خاں اور جعفر علی خاں اور رونق الدولہ وغیرہ سے کہا کہ شاید اس صدمے سے یہ جانبر نہ ہوں۔ ایک ڈاکٹر نے کہا مجھے سخت استعجاب ہوا کہ یہ مسکرا رہی ہیں۔ مگر نبض پر ہاتھ رکھتے ہی معاً سمجھ گیا کہ اس قدر رنج ہے کہ آنسو نہیں آتے۔ تپ دروں نے خشک سوخت کر دیئے اور یہ ضبط اچھا نہیں ان سے کہیئے کہ دل کھول کر رو دیں۔
خورشید علی خاں بہادر نے بڑی بیگم سے کہا کہ ڈاکٹروں کی یہ رائے ہے ان سے کہو کہ خوب روئیں۔ ورنہ اگر دو چار گھنٹے تک ضبط کی یہی کیفیت رہی تو خدا جانے کیا ہوگا۔
بڑی بیگم۔ بیٹی خوب کھل کے رو لو۔ خوب کھل کے رو لو ہمیں۔
سپہر آرا۔ اماں جان۔ روؤں کیوں۔ رونا نہیں آتا۔ مگر میری روح تحلیل ہوئی جاتی ہے۔ اب میرے بدن سے طاقت بالکل زائل ہوتی جاتی ہے۔ اور بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر میری اماں جان مجھے لاش ضرور دکھا دو۔ باجی جان کہاں ہیں؟ باجی کو بلاؤ۔ روح افزا بہن کو بلاؤ۔
حسن آرا آئیں مگر خاموش۔ رنج نہ غم۔ ماتم کیا نہ روئیں۔ آن کے بہن کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئیں، مگر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔
بہار النسا آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکی۔ تار بندھا ہوا تھا۔
سپہر آرا۔ باجی جان! چپ کیوں ہو۔ ہماری تشفی تک نہیں کرتیں۔ واہ۔
حسن آرا (تک تک دیدم دم نہ کشیدم۔ بالکل سکوت لب تک نہ ہلائے۔) مگر سر اٹھا کر سپہر آرا پر نظر ڈالی۔
سپہر آرا۔ باجی جان بولیے۔ آخر چپ کب تک۔ ہائے ہائے۔
روح افزا کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ بہن یہ پٹی کیسی بندھی ہے؟
روح افزا۔ (آبدیدہ ہو کر) یونہی۔
سپہر آرا۔ کہیں سر درد تو نہیں پھوڑا پھنسی یہ کیا۔
اماں جان! خدا کے لیے ہمیں لاش دکھا دو۔ ہم ہمایوں فر کی روح کے پاس پرسے کے لیے جائیں گے۔ کیوں اماں جان شہزادی بیگم کی کیا حالت ہوگی وہ بیچاری زندہ ہوگی یا نہیں اب تک۔
اتنے میں خورشید علی خاں بہادر نے آن کر چپکے سے کہا کہ شہزادی بیگم رو رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ خدا را دلہن کو لاش کے قریب لاؤ۔ ہمایوں فر کی روح تازہ ہوگی۔ بڑی بیگم نے کہا۔ سوچ لو۔ ایسا کبھی ہوا نہیں ہے۔
آخرکار یہ رائے قرار پائی کہ دلہن کو لے چلیں۔ سب نے یہی صلاح دی کہ دلہن لاشے پر ضرور جائے۔ شہزادی بیگم کی بھی رائے ہے

اور دلہن خود بھی اصرار کرتی ہے۔

بڑی بیگم۔ بیٹیا اب میں کیا کہوں۔ تمہاری کیا مرضی ہے بابا۔

سپہر آرا۔ اماں جان! ہمیں! ہمیں لاش دکھا دو۔ بس پھر ہم کوئی تکلیف نہ دیں گے۔

بڑی بیگم۔ اچھا۔ مگر اس قدر یاد رکھنا کہ جو مر گیا وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ ہائے۔

الغرض پالکی گاڑی تیار ہوئی اور سپہر آرا اور بہار النسا اور بڑی بیگم اور اُستانی سوار ہوئیں۔ شہر میں دھوم مچ گئی کہ دلہن دولہا کی لاش پر جاتی ہے۔ خلق خدا کا اژدحام عام تھا۔ شہزادی بیگم کو اطلاع دی گئی کہ دلہن آتی ہیں۔ گاڑی رُکی سپہر آرا اُتریں اور ادھر حاضرین نے سینہ کوبی شروع کر دی۔ سپہر آرا نے گاڑی سے اترتے ہی لاش کو چھاتی سے لگایا اور سرہانے بیٹھ کر بآواز بلند کہا۔ شہزادے بہادر آخری دیدار کو نہ ترساؤ۔ ذری آنکھ کھول کے مسکرا دو۔ بس دو دن ہنسا کے عمر بھر رُلاؤ گے (چھاتی پر دو ہتڑ مار کر) شہزادے بہادر ذری اس وقت اپنی دلہن کو تو آنکھ بھر کے دیکھ لو۔ بدن عطر میں ڈوبا ہوا ہے۔ چوٹی میں سیس پھول ہیں۔ مشاطہ نے چوٹی ایسی سنواری ہے کہ خاص تمہارے دیکھنے کے قابل ہے۔

ایک دفعہ سپہر آرا نے بآواز بلند و دردناک لاش کی طرف مخاطب ہو کر کہا (یہ ستم کے ناز ہم سے نہ سہے جائیں گے) ہم وہی ہیں جنھیں غط میں ہمیشہ جانِ ہمایوں فر لکھتے تھے۔ سہراب جان آنے پر بھی زبان نہیں کھولتے (شہزادی بیگم نے سپہر آرا کو چھاتی سے لگا کر کہا (اللہ کو یاد کرو) ہمایوں فر تمہارے بڑے دشمن نکلے۔ اگر مشعل لے کر بھی ڈھونڈھو گی تو اتنا بڑا دشمن نہ ملے گا۔ ہائے یہ اندھیر بھی کہیں ہوتا ہے کہ دلہن لاش پہ آئے۔ نکاح کے دن دولہا کی لاش زمین پر ہے۔ نکاح کے وقت وکیل اور گواہ تو رہے بالائے طاق، دوسرا مقدمہ چھڑ گیا۔ سپہر آرا کو پھر غش آیا۔ بڑی بیگم اور شہزادی نے لخلخہ منگوایا کوشش موفور کی گئی کہ غشی دُور ہو۔ جب آنکھ کھلی تو ماں کی طرف دیکھ کر کہا (اماں جان آپ نے اس وقت ہمارے ساتھ دشمنی کی) اللہ جانتا ہے بڑی دشمنی کی۔ اس ہوش سے وہ بیخبری اچھی۔ بیہوشی میں ہمیں کوئی ملال نہ تھا۔ اب ہوش آیا تو غم نے مجسم صورت دکھائی۔ خدا جانے کس بندہ خدا کی لاش نظر آئی۔

رہائی کی تدبیر

مرزا ہمایوں فر بیچارے کا حال تو یہاں چھوڑا، اب ذرا خوجی وہ لاحول ولاقوۃ خواجہ بدیع الزمان صاحب کا حال سنیے - یہ لڑھکتے پڑھکتے آزاد کے قید خانے تک پہنچے اور کوشش بلیغ کرکے دروازہ کھولا - اندر گئے - میاں آزاد سمجھے کہ پولینڈ کی شہزادی نے کسی کو بھیجا ہے کہ ایک بار پھر ہم کو سمجھائے اور راہ راست پر لائے مگر دل میں ٹھنی تھی کہ شادی پر ہرگز راضی نہ ہوں گا، چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔ خوجی قریب پہنچے مگر تاریکی کے سبب سے آزاد نظر نہ آئے تو جھلا کر کہا او گیدی بھونک دوں قرولی - آزاد نے یہ آواز سنتے ہی اٹھ کر خوجی کو گود میں اٹھا لیا - آزاد نے کہا یار آہستہ آہستہ گفتگو کرو کہیں ایسا نہ ہو کوئی آجائے - پہلے یہ بتاؤ یہاں تک کیونکر پہنچے؟

خوجی - ہم تو سب بتائیں گے - تم یہ بتاؤ کہ قید خانہ نصیب کیوں ہوا - چور نہیں ہو - ڈاکو نہیں ہو - جعلساز نہیں ہو - پھر یہ کیا ہوا - تم اور قید خانہ - اور یہ بھی ظاہر ہے کہ فوجی قیدی نہیں ہو پھر کیا؟

آزاد - کیا بتائیں بھائی - یہاں ایک پری رہتی ہے - دیکھو تو غش آجائے - بیہوش ہو جاؤ - اسی کے ہاتھوں ہم اس مصیبت میں مبتلا ہوئے -

خوجی - پھر خود کردہ را چہ علاج - ایسی پریزاد پر یکم ملے اور تم انکار کرو - شومی طالع - اس کو کوئی کیا کرے - افسوس خدا کی قسم تم کو لازم تھا کہ فوراً نکاح کر لیتے اور خوب لطف اٹھاتے - اگر دل بستگی ہوتی تو سبحان اللہ سبحان اللہ - ورنہ اس حالت میں بھاگنا بھی آسان ہوتا -

آزاد - یار حسن و جمال میں تو شک نہیں - واللہ وہ حسن خدا داد ہے کہ باید و شاید - آنکھ ناک کان گلو قد و قامت جو ہے مناسب و موزوں سانچے کا ڈھلا ہوا - مگر حسن آرا سے قول ہار چکے -

خوجی - واللہ نرے گاؤدی ہو - اسے میاں اب تو جان کے لالے پڑے ہیں - اب تو اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ جس طرح ممکن ہو اس پریزاد کو خوش کرو -

آزاد - ہو سٹری تو کیا ہوا مگر بات ٹھکانے کی کہتے ہو -

خوجی - کچھ سمجھے؟ آخر لونڈے ہی ہو نہ - ہم آئے کیا کرنے - ہم کو بھیجا کیوں ہے؟

آزاد - (خوش ہو کر) کیا شہزادی تک تمھاری رسائی ہو گئی - شاباش - پھر اب کیا پوچھنا ہے - مار لیا ہے -

خوجی - میں بیڑا اٹھا کے آیا ہوں کہ آزاد کو لاؤں گا -

خوجی نے آزاد کو خوب سمجھایا - بڑی دیر تک گفتگو کرکے کہا کہ اب آپ ٹھہریں، بندہ جاتا ہے، جا کر عرض کروں گا کہ خدا خدا کرکے اس بدکیش کو راہ پر لایا ہوں، اب آپ ذرا چلی چلیں تو وہ منظور کریں -

آزاد - اللہ اللہ یہ دعویٰ! اب آپ اپنے نزدیک ان کو یہاں سے بھی آئیں گے؟

شادی کا پیام

چھوٹا موٹا لوتا امیروں کا کھلونا ایک گلبدن غنچہ دہن شہزادی کے سامنے دست بستہ کھڑا ہے۔ شہزادی اس لونڈے کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ میاں خوجی نے جو اس مہ طلعت پری پیکر کو مسکراتے دیکھا تو سمجھے کہ حسب معمول یہ بھی ہم پر ریجھیں۔ اتنا سمجھنا تھا کہ شیطان نے دور سے انگلی دکھائی اور حضرت خواجہ بدیع الزمان اکڑ گئے۔ ان کے اکڑنے پر اس رشک قمر کو اور بھی ہنسی آئی۔ کھلکھلاتے دیکھا تو یقین کامل ہوگیا کہ ہزار جان سے عاشق زار ہے۔ شہزادی کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیوں ڈاؤگی۔ آزاد سنے گا تو بگڑ اٹھے گا۔

شہزادی نے ایک خوبرو خادمہ کو اشارہ کیا کہ ان کو یہاں حاضر کرو۔ خواجہ اینڈتے ہوئے چلے اور کندے تولتے ہوئے کرسی زندین کے قریب پہنچے جس پر وہ پری زاد بعد شان برنائی متمکن تھی۔ خواجہ صاحب جھک کر سات بار سلام بجا لائے اور پھر تن گئے۔ اب جامے میں پھولے نہیں سماتے۔

شہزادی نے ایک ادائے دلربا سے پیش خدمتوں کو قریب بلایا اور آہستہ سے کان میں کہا کہ اس موٹی تازی حبشن کو بلا لاؤ۔ خوجی سمجھے کہ ہمارے واسطے کچھ تحفے منگوائے ہیں۔ اتنے میں دیکھتے ہیں کہ ایک دیونی ڈنڈ پیل عورت کالی کلوٹی بدقطع حبشن اکڑتی ہوئی چلی آتی ہے۔ سر پر کسی جانور کے دُم کی ٹوپی اور کمر سے ٹخنوں تک ایک قسم کا جانگھیا اور ڈھیلا ڈھالا کرتا۔ ہاتھ میں ایک موٹا سوٹا دیکھتے ہی ان کے ہوش اڑ گئے۔ بوا زعفران یاد آئیں۔ اوہ۔ یہ تو بوا زعفران کی بھی نانی جان نکلیں۔

وہ عورت سکھائی پڑھائی تو تھی ہی۔ آتے ہی خوجی کی کرسی کے قریب کھڑی ہوگئی۔ خواجہ صاحب کو کمال ناگوار گذرا تھوڑی دیر کے بعد اس نے اُن کے شانے پر ہاتھ رکھا تو رُوح فنا ہوگئی۔ شانے کو جنبش دی تاکہ اس کا ہاتھ ہٹ جائے۔ مگر وہ ہاتھ ہٹنے والا کب تھا۔ اس زور سے ہاتھ جمایا کہ میخ گاڑ دی۔

شہزادی نے کہا یہ روم میں برسوں رہی ہے، تمھاری طرح ٹوٹی پھوٹی ننھی زبان بول لیتی ہے، اس سے کچھ گفتگو کرو۔ خوجی سے اس سے یوں مکالمہ ہوا:۔

"ہم مرد تم عورت۔ بڑی شوخ اور بے حیا ہو۔ ہٹاؤ ہاتھ!"

"تم مرد ہو۔ سچ کہو۔ مرد تو ایسے نہیں ہوا کرتے۔ تم عورت ہو۔"

"دیکھو میرے منہ نہ لگنا۔ خبردار۔ میں بہت بُرا آدمی ہوں۔"

"کیا بُرے آدمی ہو۔ اگر مرد ہو تو ہماری تمھاری شادی ہو جائے!"

شادی کا لفظ سنتے ہی خوجی کے ہوش اڑ گئے۔ سمجھے کہ بُرے پھنسے اور اس عرصہ میں اس دیونی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مروڑنا شروع کیا۔

جھلا جھلا کر کہتے تھے کہ ہائیں! ہائیں! ہائیں ہائیں۔ ہاتھ چھوڑ دے۔ دیکھ ٹوٹ جائے گا۔ میں جتائے دیتا ہوں۔ اگر ہاتھ پر ضرب آئی تو بے طور پیش آؤں گا۔ مجھ سے بڑھ کر برا کوئی نہیں ہے۔ جی ہاں ——— شہزادی اس قدر ہنسیں اس قدر ہنسیں کہ گورے گورے گال اور بھی سُرخ ہو گئے۔ پیش خدمتیں کھلکھلاتی جاتی تھیں۔ عرین نے خوب تالیاں بجائیں۔

ابر بہار ہچو پریزادمی رود

جسوقت سپہر آرا بے چاری اپنے پیارے شہزادے کی لاش سے جدا کی گئی، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پالکی گاڑی میں بیٹھ کر زار زار روئی۔

بڑی بیگم۔ بیٹی ہائے میری پیاری سپہر آرا۔ ہاں میں کیا کروں۔ اُف

سپہر آرا۔ اماں جان (آہ سرد بھر کر) کر دگی کیا۔ میں نے کیا کر لیا!

مغلانی۔ (رو کر) حضور صبر۔ صبر۔ صبر۔ ہائے اب ہوگا کیا۔ ہے ہے۔ خیر یہ تو دنیا کے کارخانے ہی ہیں۔ جن میں کسی کو دخل نہیں۔

اب آزاد کا حال سنیے۔ خوجی کی لجاجت اور منت و سماجت کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ پریزاد رشک شمشاد چھان چھان قیدخانہ کی طرف چلی۔

عربن۔ حضور کا جانا اچھا نہیں ہمیں بھیج دیجئے یا کسی اور کو۔

خوجی۔ ہے ہے۔ چغلخوروں۔ سے تو اور بھی ناک میں دم آگیا ہے۔

یہ کہہ کر خوجی اپنا منہ پیٹنے لگے اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر خوب تھپڑ لگائے یہاں تک کہ منہ لال کرلیا شہزادی اور عربن اور پیش خدمتیں زور زور سے قہقہے لگاتی تھیں۔ بڑی دیر تک دل لگی رہی۔ آخرکار خوجی سے کہا کہ اگر اس حبشن سے کشتی لڑو تو ہم تمھارے ساتھ آزاد کے پاس چلے چلیں۔

خوجی۔ چاہے وہ دے۔ اسے چاہے ہم کشتی نکالیں، اس سے کچھ مطلب نہیں۔ فرض کرو۔ اتفاق سے ہمارا پاؤں پھسل گیا اور ہم گرے تو بھی چلنا ہوگا۔

قیدخانے کے نیچے پر اس حور بہشتی نے قدم رکھا۔ بدن از سرتاپا عطر میں ڈوبا ہوا تھا۔ آزاد اس رائحہ روح پرور سے تاڑ گئے کہ وہی معشوقہ زہرہ تمثال مہوش یوسف جمال ہے۔ بے اختیار کہہ اٹھے ؎

از کجا می آئی اے سرمست خوبی مونماز
عطر آگین تا بدامن عنبر افشاں تا کمر

خوجی یہ شعر سن کر پھڑک گئے۔ وہیں سے آواز دی کہ آمدم آمدم من بدیع آوردم ہمراہ خویش زوجہ مستقل شما را نیز ہم آوردم۔ شہزادی نے ناز وادا کے ساتھ قدم اٹھایا اور تہ خانے میں پہنچ کر کہا پیارے آزاد! آزاد کا دل اس وقت ہاتھ سے جاتا رہا۔ فوراً جھپٹ کر گلے لگایا۔

شہزادی۔ آزاد! تم نے میرے خرمن عیش پر بجلی گرائی۔ میں نے جواہرات صرف کر کے تم کو عین خواب کی حالت میں فوج سے اٹھا منگوایا تھا اور مجھے پورا پورا یقین تھا کہ تم انکار نہ کرو گے۔ میں نے جس وقت تمھاری صورت زیبا دیکھی ہزار جان سے عاشق ہو گئی میں نے کمال حسرت و افسوس کے ساتھ تم کو قید کیا تھا۔ شکر ہے کہ اس بوٹنے کے سبب رنجش دور ہو گئی۔

لہ بوٹا = پستہ قد

ہونے کے لفظ پر خوجی بہت جھلائے اور پیشانی پر ہاتھ ٹھونک کر کہا کہ افسوس ہائے غضب۔ کہتا جاتا ہوں۔ قسمیں کھاتا جاتا ہوں کہ میرا بدن چور ہے مگر اُن کو یقین ہی نہیں آتا تو اس کو میں کیا کروں۔ مگر خیر۔

بدم گفتی وخرسندم عفاک اللہ نکو گفتی!
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

شہزادی نے آزاد کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا اب ایسا نہ ہو کہ پھر نکل جاؤ۔ قول مرداں جاں دارد۔ آہ سرد بھر کر جواب دیا کہ جانِ آزاد، قول جان کے ساتھ ہے۔ تمھاری محبت کا نقش ہمارے لوحِ دل پر اس طرح منقوش ہوا ہے کہ اس کا مٹنا ہمارے دل کی فنا پہ موقوف ہے۔

آزاد نے کہا کہ مجھے دو تین امور کا تذکرہ کرنا ہے۔ شادی تو منظور ہے مگر اتنا سوچ لیجئے کہ میں ہندوستان کی ایک حورِ بہشتی سے وعدہ کر آیا ہوں، کہ جب روم سے واپس آؤں گا تو شادی ہوگی۔ اسی زیبا اندام عروس چاردہ سالہ نے مجھے یہاں بھیجا۔

شہزادہ سنجر سطوت اور شادی کا پیغام

اب شہزادہ سنجر سطوت کا بیان ہے۔ یہ شہزادہ رفیع الشان، فریدوں جاہ خاقان کلاہ اسی شہر میں رہتے تھے جہاں حسن آرا بیگم کا دولت خانہ فیض کاشانہ تھا مگر یہ ایک تکیے پر رہتے تھے وہ دوسرے تکیے پر۔ ان سے اور ہمایوں فر سے بڑا تپاک تھا۔ دونوں ہمسن تھے اور ایک استاد سے دونوں نے جنوٹ سیکھی تھی۔ یہ ان کو بھائی کہتے تھے اور وہ اُن کو بھائی کہتے تھے۔ کچھ دن سے آمد و رفت کم ہو گئی تھی مگر محبت ویسی ہی تھی۔

شہزادہ سنجر سطوت مع ارکان عزت کے جلوس فرما تھے کہ ایک مرزا صاحب جو قدیم مجرائیوں سے تھے حاضر ہوئے۔

مرزا صاحب۔ آداب عرض کرتا ہوں حضور والا۔ کیوں آج خدا ناکردہ دشمنوں کا چہرہ اترا ہوا ہے؟

شہزادہ۔ تم تھے کہاں؟ بعد مدت کے دیکھا۔ میں فضل خدا سے اچھا ہوں۔

مرزا۔ کیا عرض کروں حضور میں باہر چلا گیا تھا۔ مگر وہاں ایسا پھنسا کہ حضور کی زیارت کو ترس گیا۔ آنکھیں حضور کو ڈھونڈھتی تھیں۔ مگر الحمدللہ کہ یہاں آن کر مژدہ واجب السجدہ سنکر باغ باغ ہو گیا۔

شہزادہ۔ بھئی وہ کیا مژدہ ہے جس سے تم ایسے مسرور ہوئے۔ کہیں خواب تو نہیں دیکھا۔

مرزا۔ اسے لیجئے حضور اور مجھ سے پوچھتے ہیں۔ خدا حضور کو سلامت رکھے۔ سُنا کہ ستارۂ ہند کا خطاب ملا۔ خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے کہ جامے میں پھولا نہیں سماتا۔

شہزادہ۔ (گردن نیچی کر کے) پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ ادنے سے ادنے آدمی پا جاتے ہیں۔

اتنے میں ایک رفیق نے آن کر کہا خداوند نعمت بڑا غضب ہو گیا۔ ہائے ستم۔ حضور آسمان ٹوٹ پڑا۔ بالکل سناٹا ہو گیا۔ تمام شہر میں ہلچل مچ گئی۔

شہزادہ۔ کیوں کیوں خیریت تو ہے؟ کیا کوئی واردات ہو گئی؟

رفیق۔ والدولت۔ حضور واردات سی واردات ہو گئی۔ کچھ عرض نہیں کیا جاتا۔ (رو کر) پیرومرشد۔ حضور سنیں گے تو رو دیں گے۔

شہزادہ۔ کیا کوئی مر گیا؟ عجب قطع کے آدمی ہو آخراب صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کہ کیا ہوا۔

رفیق۔ حضور آج مرزا ہمایوں فر کی بارات جاتی تھی۔ بس ایک ہی دفعہ ایک شخص نے نوشہ کے چھری بھونک دی اور شہزادے گھوڑے سے گر پڑے۔

شہزادہ۔ ارے! ہمایوں فر چل بسے۔ ہائے ہائے۔ بھئی ستم ہو گیا۔ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ میاں تم کو تحقیق ہے کہ گزر گئے؟

رفیق۔ حضور الیسا یقین ہے جیسا اس امر کا کہ غلام اس وقت زندہ ہے۔

شہزادہ۔ (جھلا کر) جھوٹے ہو جھک مارتے ہو۔ ہرگز نہیں مرے۔

رفیق۔ بجا ارشاد ہوا خداوند۔ یہ جھک مارتے ہیں۔ ہمایوں فر زندہ ہیں۔ کلمن سدریں چہ شک؟

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل
گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

راوی۔ اچھی بُنّے کی ہانک لگائی مگر ہم تو سنجر سطوت کے قائل ہیں۔ جھلا کے کیا جلد کہہ دیا کہ ہرگز نہیں مرے۔ جھک مارتے ہو سبحان اللہ اور رفیقوں نے اچھی ہاں میں ہاں ملائی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک اور رفیق آئے ضیغم الدین خان اُن کے والد ماجد شاہی میں چکلہ دار تھے۔ انھوں نے منہ بنا کر کہا۔ حضور نے تو سُنا ہی ہوگا۔ دیکھیے کیا اندھیر ہوا۔ اندھیر کیا غضب ہوگیا۔ سنجر سطوت کو اب یقین واثق ہوگیا کہ مرزا ہمایوں فر بیشک مقتول ہوئے سبب اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور غم والم کے اشعار اور رباعیاں زبان پر لائے۔

خان۔ حضور ابھی کوئی گرفتار نہیں ہوا تلاش ہو رہی ہے۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کون تھا اتنا بڑا پھرتیلا آدمی ہے۔

رفیق۔ خداوند غلام سمجھ گیا اس کی تہ کو غلام ہی پہنچا۔ سرمہ سلیمانی[1] اس کے پاس ہوگا خداوند اگر کوئی بدے تو ناک ناک بدتا ہوں۔

نور۔ حضور یہ ہے سٹری تو کیا ہوا۔ بات پکی کہی۔ پتے کی بات کہی۔

شہزادہ۔ بیشک۔ ورنہ بھلا ممکن تھا کہ لاکھ آدمی جمع ہو اور ایک آدمی تلوار چلائے اور نوشہ کو زخمی کر کے نلوہ نکل بھاگے۔ سرمہ سلیمانی اس کے پاس ضرور تھا۔ اللہ اللہ کیا تاثیر خدا نے بخشی ہے اور یا تو کوئی جن قابو میں ہے۔ دو ہی باتیں ہیں۔

رفقا۔ اعجاز۔ اعجاز۔ حضور کیا بات فرمائی ہے۔ واہ واہ۔

لالہ۔ حضور کوئی اگھوری بس میں کر لیا ہوگا۔

شہزادہ۔ کیا بکتا ہے واہی تباہی۔ اگھوری گھوری۔

رفیق۔ حضور یہ ہندو کیا پاگل ہے۔ بولے بھی تو کیا بولے واہ۔

ضیغم الدین خان نے کہا۔ حضور بڑی تمنا تھی کہ سپہر آرا کے ساتھ نکاح ہو۔ یہ ان پر عاشق تھے۔ وہ ان پر عاشق تھیں۔ دل و جان سے دونوں کو عشق تھا اور سنا کہ لڑکی بھی بلا کی حسین ہے۔

شہزادہ۔ اس بیچاری کا کیا حال ہوگا۔ واللہ مجھے اس ستم زدہ دُلہن کے ساتھ ہمدردی ہے۔ میرے امکان میں جو کچھ ہوگا اس میں مَیں دریغ نہ کروں گا۔ اور ابھی تو نہیں کوئی مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد شادی کا پیغام بھیجوں گا۔

رفقا۔ سبحان اللہ۔ حضور قسم خدا کی ولی ہیں۔ واللہ یہ ہمدردی! اللہ اللہ حضور ضرور پیغام بھیجیں اور ہمایوں فر سے بھی حضور کا یارانہ تھا۔ ان کی رُوح بھی دعائیں دے گی۔ یارانہ اسی دن کام آتا ہے۔

ضیغم الدین خان۔ اس میں کچھ عیب تو ہے نہیں۔ کیا معنی کہ ان کی شادی تو ہوئی تھی ہی نہیں۔ صرف برات جاتی تھی۔ شرع کی رُو سے حضور نکاح کر سکتے ہیں۔

نور۔ اس لڑکی پر بڑا احسان ہوگا سدہ جی جائے گی بیچاری۔

کلن صاحب۔ ہم تو جانتے ہیں کہ دس ہی پانچ روز میں پیغام بھیجا جائے۔ ہمارے محلہ میں ایک مشاطہ رہتی ہے۔ ادھیڑ سی ہے مگر چالاک اس کو بھیجیں گے۔

مرزا۔ ہاں حضور بہتر یہی ہے کہ عین غم اور رنج کے دنوں میں اظہار مطلب کیا جائے کہ ان کا غم غلط ہو اور ہمایوں فر کو حسین سے

---

[1] سرمہ سلیمانی کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر کوئی لگائے تو وہ سب کو دیکھ سکتا ہے۔ اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

مگر حضور سے بڑھ کر نہ تھے۔

ایک مصاحب نے صلاح دی کہ حضور کسی اخبار میں اپنا حال چھپوا دیں دو آنے فی سطر اخبار والے لیں گے۔ کسی زبردست منشی کو بلوائیں حضور۔

کلن۔ ابھی ہم بتاتے جائیں اور لکھتے وہ جائیں۔ شاعر کو بلوائیے۔

خدمتگار کو حکم دیا کہ داروغہ کو بلاؤ۔ داروغہ صاحب نے زمین بوس ہو کر تسلیمات عرض کی۔ حکم ہوا کہ کسی منشی کو حاضر کرو جو رنگین عبارت لکھتا ہو۔ انھوں نے دست بستہ عرض کی خداوند لالہ مول چند سامنے بیٹھے ہیں۔ ان سے حضور لکھوائیں، چمن تخلص کرتے ہیں۔

نور۔ خداوند۔ اُردو مسلمان ہی کی زبان ہے۔ ہندو لاکھ فاضل ہو جائے پھر ہندو زبان داں نہیں ہو سکتا۔ کسی مسلمان کو بلوائیے۔

کلن۔ ابھی نہ۔ ہندو چہ داند۔ اگر ہندو بھی اچھے اچھے شاعر ہوئے مگر آتش اور ناسخ اور مومن اور ذوق اور انیس اور دبیر کا مقابل کون ہوا۔ کوئی نہیں۔

شہزادہ۔ اور خواجہ صاحب کا کلام سبحان اللہ سبحان اللہ زبان ایسی پیاری پائی ہے کہ مصرعے قند و نبات کے ریزے ہیں۔ واہ واہ۔

یہ کس نے باغِ جہاں میں شگوفہ چھوڑا ہے　　　کہ آج تک گل و بلبل میں بول چال نہیں
زمانہ عاشق و معشوق سے نہیں خالی　　　گلوں کا قحط نہیں بلبلوں کا کال نہیں

رفقا۔ اہا ہا۔ بارک اللہ بارک اللہ۔ مگر حضور نے بھی تمام دیوان کا لب لباب یاد کر لیا ہے۔

شہزادے نے میاں انیس صاحب کی رباعی پڑھی۔

ہر آن تغیر ہے زمانے کے لیے　　　انسان کا دل ہے داغ اٹھانے کیلئے
بڈھا ہو کہ نوجوان غنی ہو کہ فقیر　　　سب آئے ہیں اس خاک میں جانے کیلئے

رفقا۔ اعجاز۔ اعجاز۔ کرامت۔ واہ حضور کیا رباعی پڑھی ہے۔

اب سنیے کہ نہایت غور اور فکر سے بڑی دیر تک شہزادہ سنجر سطوت　　　سوچتے رہے کہ سپہر آرا کی شادی کا پیغام کیونکر بھیجیں۔ خدمت گار سے کہا کہ جو کتاب سب سے پہلے تیرے ہاتھ آئے اٹھا لا۔ خدمت گار سکندر نامہ لایا۔ حضور نے اسی میں فال دیکھی تو یہ اشعار نکلے:۔

علم برکش اے آفتاب بلند　　　خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بنال اے دل رعد چوں کوس شاہ　　　بخند اے دم برق چوں صبح گاہ

شہزادہ قمر طلعت مرزا سنجر سطوت گو پڑھے لکھے امیر زادے تھے مگر ہفتے میں دو تین بار عقل سے چرخ[1] چل جاتی تھی۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے یہ سوجھی کہ عروس ماہ سیما اور اس کے ایوان دلکشا کو چل کے دیکھیں۔ مشاطہ کامل فن کو حکم دیا کہ سپہر آرا بیگم کے پاس جا کر ہماری طرف سے کہو کہ اگر مضائقہ نہ ہو تو ذرا جھروکے پر ٹھہریں۔ ہماری سواری ادھر سے نکلے گی۔ چار آنکھیں تو ہو جائیں۔ ہم ان کے رخ رنگیں پر نظر ڈالیں۔ وہ ہماری سواری کے ٹھاٹھ دیکھیں۔ طرفین سے جوش ہو۔ جوانی کی اُمنگیں تقاضائے شدید کریں کہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو۔

---

[1] چرخ چلنا = لڑک جھونک ہونا۔

مشاطہ اپنے دل میں سمجھ گئی کہ میاں کو شیطان نے دور سے انگلی دکھائی۔ عقل الوداع کہہ کر رفوچکر ہو گئی لیکن شہزادے تھے مسکرا کر خاموش ہو رہی۔ کل باتیں سن کر عرض کی خداوند نعمت لونڈی کو اصلا عذر نہیں ہے۔ مگر اس طرح پر عرض کرنا ان کے خلاف گذرے گا میں بات بنا کر کسی عمدہ پیرائے میں عرض کروں گی۔ حضور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ حضور کو صورت دکھائیں۔ دلہن کہیں ایسی بے شرم ہو سکتی ہے۔ ہاں جب میں کہوں گی تو حضور کی سواری دیکھنے ضرور آئیں گی۔

یہ کہہ کر مشاطہ روانہ ہوئی اور اپنی منہ بولی بہن سے جا کر صلاح لی۔

مشاطہ ۔ آج سنجر سطوت نے بلوایا تھا۔ بہن تو کچھ ہوے خبطے معلوم ہوتے ہیں مجھے ایک دوپٹہ دیا خاصہ بھاری دوپٹا اور پانچ روپیہ ملے اور اور کہا کہ تم بڑی بیگم کے گھر جاؤ۔ سپہر آرا سے ملو اور کہو حضور کی سواری ادھر سے نکلے گی۔ جھروکے سے ہم کو دیکھیں۔

نواب جان ۔ اے ہے۔ کہیں بہن نہ بنا بہن۔ بھلا کوئی بات بھی ہے۔ واہ منہ کے آگے ناک۔ سوجھے کیا خاک۔ لدی میں عقل ہے کیا؟

مشاطہ ۔ بہن میں چپ چاپ سنتی رہی۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ بس دوپٹا ہضم نہ ہونے کا۔ جا کے شام کو آئیں بائیں شائیں بتا دیں گے۔ ان کی سواری اُدھر سے نکلے گی۔ بس کسی خدمت گار سے کہہ دوں گی وہ انگلی اٹھا دے گا۔ بس دیکھیں یا نہ دیکھیں ہم کو اس سے کیا؟

نواب جان ۔ اے تم جا کے خوب بتاؤ۔ دل کھول کے روپیہ لوٹو۔ ان کے سر پہ تو جنون سوار ہے۔ کیا دور کی سوجھی ہے۔ سودائی پن کی باتیں۔

شام کو کوئی پانچ بجے کے وقت مشاطہ نے جا کر آداب عرض کیا اور کہا حضور کل باتیں پکی پوڑھی کر آئی ہوں۔ بس حضور کے سوار ہونے کی دیر ہے۔ سب معاملہ لیس ہے۔

سنجر سطوت ۔ جس وقت تم نے بیان کیا کچھ مسکرائی بھی تھیں۔ سچ کہنا بی جان۔ لب پر ہنسی آئی یا نہیں؟

مشاطہ ۔ حضور مسکرائیں تو ضرور مگر شرمائیں اور لجا گئیں۔ گورے گورے رخسارے اس وقت جوبن پر تھے کہ میں کیا عرض کروں

سنجر سطوت ۔ بھلا کسی ڈھب سے تصویر تو لا دو۔ رات دن اپنے ہی پاس رکھوں۔ مگر مانی و بہزاد کہاں جو کھینچیں۔

مشاطہ ۔ حضور اب لونڈی کسی دن جائے تو تصویر مانگ لائے۔ اب حضور سوار ہوں وقت جاتا ہے۔ پانچ بج گئے اور جانا دور ہے ناکے باہر مکان ہے۔ پھر جھٹپٹے وقت کیا خاک سوجھے گا۔

سنجر سطوت ۔ کیا کہا۔ اس وقت تم نے کیا کہا۔ خاک کا لفظ میں نے سُنا تھا۔

مشاطہ ۔ حضور خطا ہوئی۔ معاف فرمائیے۔ حضور مالک ہیں۔ میری زبان سے یہ بات نکل گئی۔

سنجر سطوت ۔ مالک ہم کو کبھی نہ کہنا۔ مالک دوزخ کے داروغہ کا نام ہے۔ اگر تم نے کوئی بات بے سمجھے بوجھے کہی تو خیر مضائقہ ندارد اور اگر دانستہ کہی تو بیشک تم شہزادوں کی صحبت کے قابل نہیں ہو۔ اچھا کوئی ہے۔ حکم دو ہاتھی تیار ہو۔ وہ جھول ڈالو جو عید کے دن خریدی تھی۔ چینی اطلس کی۔ اور گنگا جمنی ہودا۔ دس سوار ساتھ چلیں۔

سواری تیار ہوئی اور حضور برآمد ہوئے۔ خدام با ادب اور چوبداروں اور سپاہیوں نے جھک جھک کے سلام کیا۔ شہزادے نے کسی کو جواب نہ دیا۔ ہاتھی پر سوار ہوئے۔ سواری بل باد بہاری چلی۔

اب سنیے کہ شہزادہ سنجر سطوت کی سواری بڑے تزک و احتشام کے ساتھ بڑی بیگم کے ایوان فلک توامان کے قریب پہنچی۔ خواصی کے مصاحب نے آہستہ سے کہا۔ خداوند سنبھل بیٹھیے۔ بقعہ نور نظر آیا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ حضور کو دیکھتے ہی وہ ریجھ جائیں گی۔

شہزادہ بہادر نے غور سے دیکھا۔ جھروکا تو خاک نظر نہ آیا اور نظر کہاں آتا۔ مگر بارے ششیخت کے کہنے لگے۔ ہاں ہاں بیشک جھانک رہی ہیں۔ کیا جھگڑا ہے اور ہمارے کانوں میں اُن اشعار کی آواز آتی ہے جو سپہرآرا ہماری طرف مخاطب ہو کر ادا کرتی ہیں۔ سنیے گا۔ ؎

میاں چشم جادو یہ اتنا گھمنڈ　　خط و خال و گیسو پہ اتنا گھمنڈ
اجی سر اٹھا کر ادھر دیکھنا　　اسی چشم و ابرو پہ اتنا گھمنڈ
نسیم گل اس زلف میں ہو تو ہو　　نہ کر اپنی خوشبو پہ اتنا گھمنڈ

مرزا جی نے بڑی کوشش بلیغ سے ہنسی ضبط کی۔ مگر حضور شہزادۂ نامدار گردوں مدار کے خوش کرنے کے لیے کہا۔ خداوند حضور نے یہ اشعار آبدار خوب سن لیے۔ واللہ کان ہوں تو ایسے اور حضور ایسے کان شہزادوں کے سوا اور کس کو نصیب ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کی صفتیں کہیں ہم رعایا میں آسکتی ہیں۔

مرقد منوّر

اب سنیئے کہ قلعہ معلّٰی کے امام باڑے میں صندولی صندوق رکھا تھا۔ قبر کے قریب لائے۔ مزار مجو ہے تیار کر چکے تھے۔ چونے کی چنائی ختم ہو چکی تھی۔ دو آدمیوں نے قبر کو اندر سے صاف کیا۔ صندوق سے سہرا اور دو شالہ اتارا گیا۔ ہائے ابھی ابھی دولھا کے سر پر سہرا تھا۔ اب لاش کے صندوق پر نظر آتا ہے۔ دو آدمیوں نے لپٹ پکڑ کر لاش اتاری۔ بند کفن کھولا گیا۔ دائیں رخسار کے نیچے مٹی کا ڈھیلا رکھا گیا۔ داہنے شانے کو ایک شخص نے آہستہ سے ہلایا۔ قاری نے تلقین پڑھی۔ بعد ختم ایک شخص نے تختے لگائے۔ اس کے بعد اعزہ اقربا و احباب اور حاضرین قبر کے قریب آئے اور سب نے مٹی دی۔ مرزا ہمایوں فر کا چھوٹا بھائی قبر پر گر پڑا، اور اس طرح پر زار زار رویا کہ حاضرین کے دل بھر آئے۔

سب لوگ رخصت ہوئے۔ چند اعزہ شب کو وہیں رہے تاکہ مرزا سلیمان شوکت کو تشفی دیتے رہیں۔ تمام شب اندر باہر ماتم ہوا کیا خورشید لقا بیگم کا بہت برا حال تھا۔ روتے روتے آنکھیں خونِ کبوتر کی سی سُرخ ہو گئیں اور ہچکی بندھ گئی۔ جو سمجھاتا تھا اس کو سخت جواب دیتی تھیں۔ مہ لقا بیچاری سکتے کے عالم میں تھی: اگر کبھی کچھ کہا بھی تو یہ کہا کہ ہائے لوگو یہ کیا ہوا۔ بس اس کے سوا اور کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ شہزادی بیگم دیواروں اور کھمبوں سے سر ٹکراتی تھیں۔ سینے پر دوہتڑ لگاتی تھیں۔ رشتے کی بیگمات مخدرات زار زار روتی تھیں۔ دوسرے روز صبح کو ایک صاحب مرقد منور و مطہر پر گئے اور قبر کے قریب جا کر آہستہ سے پوچھا (شب کیسی گذری؟) تو یہ آواز آئی ؎

در آرزوئے بوس و کنارت مردم　　　در حسرت لعل آبدارت مردم
قصہ چہ کنم دراز کوتاہ کنم　　　باز آ باز آ کز انتظارت مردم

یہ آواز ان کے کان میں آئی تو کانپ اُٹھے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خدمتگار پیچھے کھڑا تھا۔ اس سے پوچھا تم نے کچھ سُنا؟ کانپ کر کہا حضور کوئی آواز سی قبر سے آئی۔ مجھے صرف ایک لفظ سمجھ میں آیا (مردم) اور الفاظ مارے خوف کے مجھے یاد نہیں ہیں۔ مرزا صاحب نے جنھوں نے خود قبر کے قریب جا کر (شب کیسی گذری) پوچھا تھا۔ فوراً ایک سادے کاغذ پر پنسل سے لکھ لیا۔

در آرزوئے بوس و کنارت مردم　　　در حسرت لعل آبدارت مردم

دوسرا شعر یاد نہ تھا۔ انھوں نے قلعے کی درگاہ کے مجاور کو بلایا اور کہا کہ ایک تعجب انگیز داستان سناتا ہوں۔ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ مگر ضرور سنیئے۔ میں نے آن کر حسب معمول و رواج پوچھا (شب کیسی گذری؟) تو وہاں سے آواز آئی ؎

در آرزوئے بوس و کنارت مردم　　　در حسرت لعل آبدارت مردم

اور میرے خدمتگار نے بھی سنا۔ ہم دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ یا الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ قبر سے یہ آواز کیسی آئی۔ اللہ جانے کیا بھید ہے۔ مجاور نے کہا۔ خداوند میں تو حضور کے پاس جانے ہی کو تھا۔ شب کا ذکر سُنیئے تو سخت تعجب ہو مگر مجھے اجازت نہیں کہ عرض کروں۔ شب کو تو قبر پر جلسہ ہو رہا تھا۔ وہ دھما چوکڑی مچی تھی کہ کچھ نہ پوچھیے۔ لیکن جب تک اپنے مرشد سے نہ پوچھوں گا

تب تک زبان سے نہ نکالوں گا۔ مگر اس قدر بتائے دیتا ہوں کہ حافظ شیراز کی یہ غزل گائی جاتی تھی۔ غزل کے بتانے میں ہرج نہیں ہے۔

رفتم بباغ تا کہ بچینم سحر گلے   آمد بگوش ناگہم آوازِ بلبلے
مسکین چوں من بعشق گلے گشتہ مبتلا   واندر چمن فگندہ بفریاد غلغلے
میگشتم اندراں چمن و باغ دمبدم   میکردم اندراں گل و بلبل تاملے

مرزا صاحب ضعیف الاعتقاد آدمی تھے اور مجاور نے اس لسانی اور چرب زبانی کے ساتھ بیان کیا کہ مرزا جی کو شک کی جگہ یقین ہو گیا۔

اتنے میں مجاور نے ایک اور آدمی کو بلوایا۔ اس نے بیان کیا، حضور والا کل شب کو عجیب بات دیکھنے میں آئی۔ مگر جس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں جیسے کوئی شخص منہ بند کر دیتا ہے اور کہنے نہیں دیتا۔ مرزا صاحب کو اور بھی یقین کامل ہوا کہ کچھ اسرار ضرور تھا۔ قبر کو دیکھ کر کہا۔ سچ کتنا ذرا بیکسی نہیں برستی۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ قبر کیا دولھا ہے۔ واہ ہمایوں فر (آہ سرد بھر کر) یہ کیا غضب ڈھایا بھائی ہائے ستم ہائے ستم۔

اب سنیئے کہ مرزا صاحب نے تمام شہر میں مشہور کر دیا کہ شہزادہ ہمایوں فر کے مرقد منور پر شب کو بڑی چہل پہل تھی۔ پریوں کا جھرمٹ تھا۔ راجہ اندر کے اکھاڑے کی پری چہرائیں ناچنے آئی تھیں۔ درگاہ کا مجاور جو معتبر اور مقدس ہے گواہی دیتا ہے۔ اس خبر کو ضعیف الاعتقادوں نے باور کر لیا۔

اس شب کو سپہر آرا نے تمام رات گریہ و زاری کی۔ جس آرا رات بھر تڑپا کی۔ بڑی بیگم قریب مرگ ہو گئیں۔ روح افزا اور بہار النسا، دیوانہ وار سر پیٹتی تھیں اور جہاں آرا اور گیتی آرا کا برا حال تھا۔ جانی بیگم سپہر آرا کے ہاتھ پکڑے تھیں اور نظیر بیگم حسرت اور حیرت سے سب کی طرف نظر ڈالتی تھیں کہ ہائے یہ کیا ہو رہا ہے اور یہ کیا ہوا۔

سوم کے روز ہزاروں آدمی جمع تھے۔ خلقت ٹوٹ پڑی۔ اس کے کئی سبب تھے۔ ایک یہ کہ شہزادہ کا سوم تھا۔ دوسرے مجاور کی تقریر یا ذرّیلہ محلّی والوں کی شہادت نے لوگوں کے دلوں پر عجیب رنگ اثر جمایا تھا۔ آٹھ بجے کے قبل اس قدر آدمی جمع ہوئے کہ گو مرزا ہمایوں فر کا محل کیوان نشان بدرجہ غایت رفیع الشان و عظمت توامان تھا، تاہم اس میں اس قدر گنجائش نہ تھی کہ سب شرکائے مجلس سوم بیٹھ سکتے۔ لہذا فوراً شامیانے اور خیمے نصب کیے گئے۔ جب سب رؤسا و امرا و عمائد شہزادے اور احباب اعزہ و اقربا جمع ہو گئے۔ قاریوں نے قرآن خوانی شروع کی۔ جو لوگ پڑھ سکتے تھے ان میں اکثر کے ہاتھ میں سیپارے تھے۔ بعد قرآن خوانی بارہ امام پڑھے گئے۔ بعد ازاں اعزہ نے دونے بیلے چنبیلی کے پھول اٹھائے۔ ایک پیالے میں صندل اور خوشبودار تیل تھا۔ اس میں دو دو چار چار پھول ڈالے۔ مرثیہ خوانوں نے مرثیے پڑھے۔ جناب فضیلت انتساب خدائے سخن میر انیس صاحب مبرور مغفور کے ایک شاگرد رشید نے یہ مرثیہ پڑھا جس سے کل شرکاء مجلس عزا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

یا رب چمن نظم کو گلزار ارم کر   اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
توفیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر   گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کی پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم سے نہ جائے

اور جس وقت حسرت ناک آواز سے ذاکر جناب سید الشہدا نے یہ بند پڑھا ٹپس پڑ گئی تبالیقین مجلس آل عبا سینہ کوبی کرنے لگے۔

چلاّئے محمد عسکری میں بسمل ہوا بھائی　　لے واے اُنی کیا یہ خبر مجھ کو سنائی
دل ہل گیا برچھی سی کلیجے میں در آئی　　یہ واقعہ سُن کر نہ بچے گی میری جائی
ممکن نہیں دنیا میں دوا زخم جگر کی
کیونکر کہوں زہرا سے خبر مرگ پسر کی

مجلس عزا میں ہنگامۂ محشر بپا تھا۔ ہر مومن پاک سر پیٹ رہا تھا۔ ہائے حسین کی آواز بلند تھی۔ ایک تو ذکر سید الشہدا علیہ التحیۃ والثناء کی طرز مرثیہ خوانی، دوسرے معجز بیانی فیصوازبانی تیسرے ذکر رقت و پریشانی چوتھے مومنین حق میں عشاق آئمہ ہدیٰ کے بحر غم والم کی روانی۔ اس سب نے مل کر کہرام مچا دیا۔ ہنود تک دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ اشکوں سے منہ دھوتے تھے۔ بیان صاحب سُن کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ دل شق ہوا جاتا تھا۔

کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے　　کب تھمتے ہیں جو اشک ہیں ڈھلنے والے
اللہ رے ترے سخن کی تاثیر انیس　　رو دیتے ہیں مثل شمع جلنے والے

مرثیہ خوانی کے بعد حصے تقسیم ہوئے۔ الائچی دانے اور بتاشے عورتیں گو ادینے آئی تھیں۔ محلسرا میں الگ کہرام مچا تھا۔ شہزادی بیگم کی بصارت کم ہو گئی تین ہی دن میں نور نظر کے غم نے نور بصر کم کر دیا۔ اس صدمۂ جانکاہ نے ساغر دل کو بادۂ محن سے بھر دیا۔ ہر دم انتہائی بیقراری اور چشم خونچکاں سے اشک جاری خورشید تھا بیگم کا گل رخسار اس سانحہ جگر دوز کے سبب سے زرد ہو گیا۔ مہ لقا بیگم کا رنگ چہرۂ زیبا مثل سحر فق تھا مرزا سلیمان شوکت کا دل دنیا سے بھر گیا۔ بھائی سے عشق تھا۔ جدائی ابدی اور مفارقت دائمی مطلق نہ سہ سکے۔ بھائی کے بغیر ایک دم خوش نہ رہ سکے پچاسوں اعزہ اور مصاحب اور احباب سمجھاتے تھے ہر دم انہیں کے پاس رہتے تھے۔ مگر اُن کا حال ہر آن دگرگوں ہی ہوجاتا تھا۔ تین ہی دن میں اس قدر نقیہ اور کمزور ہو گئے تھے کہ پہچان نہیں پڑتے تھے۔ ڈاکٹروں کی رائے سے ایک عرق دیا جاتا تھا۔ مگر اس سے کیا ہوتا۔ کبھی کوٹھی پر نظر ڈالی اور بھائی یاد آئے۔ کبھی گھوڑوں کو دیکھا اور سر پیٹنے لگے۔ ہر دم کوئی نہ کوئی شے ایسی نظر سے گذرتی تھی کہ بے اختیار رو دیتے تھے۔ لوگوں کی صلاح ہوئی کہ ان کے لیے سفر اور نقل مکان ضروری ہے۔ اس کوٹھی میں رہنا خلاف مصلحت ہے۔ کیونکہ ہمایوں فر کے بیٹھنے کا کمرہ اور حمام اور باغ اور ڈرائنگ روم اور مختلف کمرے اور اشیا اور سواریاں دیکھ دیکھ کر بھائی یاد آئیں گے اور یہ اپنا بُرا حال کریں گے۔

اب سنیئے کہ نواب انور علی خاں بہادر محمد عسکری کے دوست مرزا سلیمان شوکت کو تشفی دے کر رخصت ہوئے تو سیدھے محمد عسکری کے پاس گئے اور یوں ہمکلام ہوئے:۔

نواب۔ بھئی اس امر خاص میں ضرور بالضرور فکر کرنا استاد۔

محمد عسکری۔ ضرور ایسی بات ہے بھلا۔ نہ فکر کرنا کیا معنی!

آزاد پلونا پہنچ گئے

شجاعت کے نہنگ بحر آشام سپہ سالار عالی مقام آزاد خوش نہاد نے نور کے تڑکے کوچ کیا۔ شب کو جاسوسوں کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ وہاں سے چند میل کے فاصلے پر روسیوں کی جماعت کثیر نے فوج ترک کو جو غنیم کے مقابلے میں کم تھی شکست دی۔ بعد فتح وہ مقام چھوڑ دیا۔ اس پر قبضہ نہ کیا اور ترکوں کی فوج کا تعاقب ہوا۔ پلونا کی نسبت یہ مشہور ہوا کہ ترکی سپہ سالار تین جانب سے محصور ہے مگر چوتھی جانب ایک جنگل ہے۔ پاشا نے بکمال جوانمردی جنگل کی طرف سے باغیوں کو نکال دیا ہے۔ اگر جنگل کی طرف سے فوج پہنچے تو سبحان اللہ ورنہ ایک لاکھ آدمی گرفتار ہو جائے گا۔ یہ خبر سن کر آزاد کا چہرہ فرط غم سے سرخ ہو گیا اور شیر نر کی طرح ڈکار کر بولے، کیا پروا ہے، جب تک تن سر پر اور قالب خاکی میں جان باقی ہے ہم پلونا جانے کی کوشش بلیغ کریں گے۔

آزاد نہایت غیظ و غضب میں آئے۔ فوراً اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ آنکھ سے غصہ برستا تھا اور چہرہ انگارے کی طرح لال بھبوکا ہو گیا تھا۔ کل افسر اور سپاہ ان کی کیفیت دیکھ کر خاموش تھے۔ اس وقت اگر شیر بھی آتا تو آزاد ایک ہی ہاتھ میں کام تمام کر دیتے۔

آزاد پاشا اور اپیلٹن میں گفتگو ہونے لگی۔

اپیلٹن۔ جنرل ہیوم نے تمھاری بہت تعریف کی ہے۔

آزاد۔ سب سے بڑی تعریف اس دن ہو گی جب ہم پلونا سے فتح یاب ہو کر آئیں گے۔ خدا نے چاہا تو ایک دن ایسا بھی ہوگا۔

اپیلٹن۔ حسن آرا بیگم سے کیوں خط و کتابت ترک کر دی۔ ہم لوگوں میں یہ قاعدہ نہیں ہے۔ ہمارے خطوط برابر آتے جاتے ہیں۔ ابھی وینشیا کا خط ہم نے پایا۔

آزاد۔ خیر یہ گفتگو تو ہوا ہی کرے گی۔ اب یہ فرمائیے کہ راہ میں کتنے دریا ملیں گے۔ تین دریا نقشے کی رو سے ظاہر ہوتے ہیں اور ایک پہاڑ۔ شاید دریا اور ملیں۔ مگر بڑے بڑے دریا تین ہی ہیں۔ ڈینیوب کو جو ہم نے دیکھا تو بڑا لطف حاصل ہوا اس کی موج زنی نے ہمیں ایسا محظوظ کیا کہ بیان سے باہر ہے۔

آزاد اور اپیلٹن پاشا دونوں نے گھوڑے روک لیے۔ معلوم ہوا کہ ایک میل کے فاصلے پر سواروں کا پرا جما ہے مگر یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ روسی ہیں یا ترک۔

آزاد۔ بس اب ہمارے ہوش ٹھیک نہیں۔ بڑا افسوس ہوا۔

اپیلٹن۔ ہمارے نزدیک فوج کو روک کر تھوڑی دیر کے بعد واپس چلو۔

آزاد۔ ہائے پلونا۔ وائے پلونا۔ یار اس وقت ستم ہو گیا۔

اپیلٹن۔ اب ہمارے آپ کے امکان سے خارج ہے۔

آزاد۔ اُف۔ ہائے افسوس۔ وائے افسوس۔

اپیلٹن۔ اب دوسرے راستے سے کوشش کرو مگر ہم جانتے ہیں کہ چوطرفہ سے فوج نے محصور کر لیا ہے اور اب کسی طرف سے راہ باقی نہیں ہے۔

روسی فوج نے حس و حرکت نہ کی۔ آزاد اور اسپلیشن پاشا اپنے لشکر کو لے کر وہاں سے بعجلت تمام روانہ ہوئے اور دوسری طرف سے پلونا کے جانے کا قصد کیا۔ شام تک بخیر و عافیت سفر کیا مگر دو گھڑی رات جا کر اس قدر برفباری ہوئی کہ الامان الامان۔ ایک قدم بھی چلنا دشوار ہو گیا۔

رخ آسمان گشتہ کافور بار　　　زمین شد ز یخ بستہ الماس دار

اتنے میں چلتے چلتے ایک ترکی راوٹ پوسٹ، ملا تو جان میں جان آئی۔ ان لوگوں نے بیان کیا کہ پلونا کی طرف سے جو خبر آتی ہے اس سے مایوسی ہی ہوتی جاتی ہے۔ ہمیں یقین نہیں کہ ہم کامیاب ہوں۔ روسیوں کا ڈیڑھ لاکھ آدمی پلونا کے چاروں طرف جمع ہے مگر ابھی تک صرف تین طرف سے بخوبی محاصرہ ہے اگرچہ تھے راستے سے آپ جا سکیں تو سبحان اللہ ورنہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ یہ خبر سن کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ پوچھا روسیوں کا جنرل گرگو کس سمت کو ہے اور کیا کرتا ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ جنرل گرگو نے ایک بہت بڑی جنگ میں کامیابی حاصل کی۔

معلوم ہوا کہ روسیوں نے اس مقام پر ترکوں کو شکست دی تھی۔ آزاد اور اسپلیشن کی رائے ہوئی کہ تھوڑی دیر کے لیے اس مقام پر ٹھہر کر غور کریں کہ کس راہ سے جائیں۔ باہم مشورہ ہونے لگا۔ آخر کار کل افسروں نے رائے دی کہ دو چار گوئندے بھیجے جائیں تا کہ وہ جلدی خبر لائیں۔ حکم ہوا کہ دو ہزار سوار طلایہ کے لیے مقرر ہوں اور باقی سب کمر کھول ڈالیں۔

گوئندوں نے اطلاع دی کہ اٹھارہ ہزار روسی ایک سمت گھیرے ہیں اور پچپن ہزار روسی دوسری جانب سے اور دس بارہ ہزار کے قریب تیسری طرف سے۔ اور تیاریاں ہو رہی ہیں کہ جنگل کی سمت بھی محاصرہ کریں۔ مگر ایک دریا حائل ہے اور اس دریا کے کناروں پر جو مقامات عبور کرنے کے ہیں وہاں ترکوں کا قبضہ ہے۔ یہ ترکی سوار ایسے ایسے خوش رو اور قوی ہیکل جوان ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جو ہے خوبصورت سیم تن، غیرت رستم، رشک روئیں تن۔ خدا ان جوانوں کو بچائے۔ خدا کرے باری تعالیٰ کو اُن پر رحم آئے۔ جاسوسوں نے بیان کیا کہ راتوں رات ہماری فوج چلے اور دن کو پڑاؤ کرے تو بہتر ہے گو دن کو سفر کرنا چنداں مشکل نہیں مگر شب ہی کے وقت مصلحت ہے۔ آزاد نے کہا۔ اچھا یوں ہی سہی۔

آزاد۔ حال میں کوئی جنگ ایسی بھی ہوئی جس میں ہم نے فتح پائی ہو یا ہر جنگ میں غنیم ہی نے فتح پائی۔ اور ہم نے شکست۔

جاسوس۔ ایک لڑائی میں ہم کامیاب ہوئے مرتضیٰ پاشا کی سرگرمی میں دو ہزار سوار بھیجے گئے تھے۔ اس سپاہ میں سرکیشیا کے لوگ تھے۔ یہ لوگ کاسکوں کے مدِ مقابل ہیں۔ موضع موبنین سے گذر کے انھوں نے ایسی دانائی اور چالاکی اور حکمت عملی کی کہ تو پخانۂ روس کے عقب میں آ گئے اور روسیوں کو خبر بھی نہ ہوئی پیچھے سے باڑھ پڑی تو روسی چکرائے۔ پھر کیا ہو سکتا تھا بھاگتے ہی بن پڑی بلکہ بھاگتے بھی راہ نہ ملی لیکن دو گھنٹے کامل مقابلہ رہا اس کے بعد روسی تاب مقاومت نہ لائے۔ وہ شب اور دوسرے دن شام تک یہ فوج اسی مقام پر رہی۔ شبا شب کوچ کیا تو پلونا سے تین کوس کے فاصلے پر دم لیا اور اسی مقام پر خیمہ انداز ہوئے۔ دو جاسوس بھیجے گئے کہ سپہ سالار پلونا کو اس مژدۂ طرب انگیز سے مسرور کریں کہ کمک کے لیے فوج قریب آ گئی۔

آزاد پاشا کی کارگذاری

گرابندہ شد ہر دو لشکر بخون ‏ ‏ علم برکشیدند چوں بے ستوں
ددآمد ز در یا بغریدن ابر ‏ ‏ زہر بیشہ سر بر دل زود بر
نفیر دبیران بر آمد ادج ‏ ‏ زہر گوشہ میرفت خوں موج موج

ادھر عامل روز نے سپاہ ماہ و انجم کو شکست فاش دی اور اشعۂ زرنگار رمہ سے تاریکی شب کافور ہوئی، اُدھر ضیغم نیستان شجاعت شیر دل شیر مرد آزاد پاشا سمند دغا پسند و ضرغام تسکار پہ سوار ہوتے اور خدا کا نام زبان پر لا کر فوج کے ہمراہ پلونا کی طرف چلے۔ اہل پلونا کے پاس شبا شب آدمی بھیجا گیا تھا۔ یہ مژدہ روح افزا سنتے ہی پلونا والوں کی جان میں جان آئی، منہ مانگی مراد پائی۔ سپہ سالار آزمودہ کار نے کئی ہزار سوار جرار روانہ کیے کہ روس کی سپاہ آزاد کو روک نہ سکے۔ دو میل آزاد پاشا کا لشکر گیا ہوگا کہ جاسوں نے ایک خبر وحشت اثر سنائی۔ ہراولوں نے بھی اس کی تصدیق کی کہ غنیم کئی اتواپ اثر در دہاں اور پچیس ہزار آدمی سوار و پیادہ لے کر پلونا اور فوج آزاد کے درمیان مستعد دار و گیر ہے، پلونا کی آمد و رفت بالکل مسدود، رسد کا ٹھکانا نہیں۔ یا خدا یہ بڑی بُری ہوئی۔ فوج اسی میدان میں ٹھہر دی۔ اسپلین پاشا نے صلاح دی کہ اس درویش کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ پلونا کی سمت جا کر خبر لائے۔ اغلب ہے کہ روسی اس سے نہ بولیں۔

آزاد پاشا نے درویش کو بلوایا اور بکمال منت و سماجت یوں تقریر کی۔ شاہ جی صاحب آپ خوب جانتے ہیں کہ پولینڈ کی شہزادی پر میں دل و جان سے عاشق ہوں اور وہ بھی میری عاشق زار ہیں۔ تم اُن کے فرستادہ ہو۔ ایسے میاں جی کو میں ہمیشہ گزند اور خوف و خطر سے محفوظ رکھنے کی کوشش موفور کروں گا۔ لیکن یہ وقت بہت نازک ہے۔ پلونا کا معرکہ قابل یادگار رہے گا اور اسی پر جنگ کا خاتمہ اور لڑائی کا نچوڑ ہے۔ ہماری فوج اور پلونا کے درمیان پچیس ہزار روسی حائل ہیں۔ نہ ہم میں سے کوئی اس طرف جا سکتا ہے نہ پلونا والے اپنی خبر بھیج سکتے ہیں۔ شب کو انھوں نے بڑی مسرت دلی سے سُنا تھا کہ کمکی فوج آتی ہے اور اس بیرونی مدد سے وہ کمال محفوظ ہوئے ہونگے۔ لیکن غنیم کے مخبروں نے ہماری خوشی مبدل بہ رنج کر دی۔ اب ہماری سپاہ قلعہ محصور کی فوج کے متعلق کام نہیں آ سکتی۔ اُفتاد۔ اس کو کوئی کیا کرے۔ آپ اس قدر مدد دیجیئے کہ پلونا تک کسی طرح گھس پیٹھ کے جائیے اور اہل پلونا کو ہمارا مرسلہ دیجیے۔ آپ کو کوئی پہچانے گا نہیں، سب یہی سمجھیں گے کہ روسی ہے اور روسی زبان بھی آپ بول سکتے ہیں۔

درویش نے بسہولت تمام کہا۔ آزاد! میں پولینڈ کی شہزادی کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ میرے والد نے ان کو علم موسیقی کی تعلیم دی ہے۔ کروڑ روپیہ بھی کوئی دیتا تو میں عبادت اور یاد الٰہی چھوڑ کر وطن سے نہ آتا۔ مگر بہن کی محبت اس کی بیقراری اور گریہ زاری نے مجھے مجبور کر دیا۔ میرا سن بیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ صرف ایک روسی خدمتگار لے کر میں نے یہ سفر اختیار کیا ہے۔ خیر وطن خاص کہیں ہے اور بود و باس کہیں ہے میری بیوی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر جاتے ہو تو اتنا یاد رکھنا کہ واپس آنا اجلد پن میں جان نہ گنوانا۔ اب جو اجازت دو۔

آزاد نے کہا۔ آپ نے واقعی اس سن میں کہ ابھی سبزہ آغاز بھی نہیں ہوا کمال کیا کہ اس قدر فاصلہ دور دراز آپ نے کھیل

مشقت اس سفر میں طے کیا کہ یہ سب باتیں کیونکر حاصل کریں۔ یہ خدا کی دین ہے۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں۔ لیکن اب اس وقت ہم سب کی عزت و آبرو تمہارے ہاتھ ہے۔

درویش بسم اللہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔ بڑھا جاتا ہے۔ خدمت گار کو ساتھ لیا۔ افسران اور فوج سے مصافحہ کیا اور روانہ ہوا۔

آزاد اور افسران فوج خوش تھے کہ اس درویش کے ذریعے سے پلونا والوں کو کل حالات معلوم ہو جائیں گے مگر تشویش تھی کہ ان پچیس ہزار آدمیوں کو یہاں سے کون ہٹائے گا اور کیونکر پلونا تک گذر ہوگا۔

یہ مشورہ ہو ہی رہا تھا کہ درویش کا خدمتگار چار گھڑی کے بعد سامنے نظر آیا۔ سب کو حیرت ہوئی۔ جب خدمتگار سے دریافت کیا گیا تو وہ مسکرایا اور مسکرا کر بولا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ درویش کہاں گئے۔ مگر یہ خط انھوں نے مجھ کو دیا ہے۔

آزاد نے خط لیا اور پڑھا تو دھک سے رہ گئے۔ عبارت سننے کے قابل ہے۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے ۔۔۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

اجی حضرت تسلیم! سچ کہیئے گا منہ کی کھائی یا نہیں۔ انصاف شرط ہے۔ واہ مجھے بڑی ہنسی آتی ہے۔ ایک ذرا سے بھرے میں کیا چٹھا کہہ سنایا۔ پولینڈ کی نازک نگاہ شہزادی کے عشق صادق کا حال مس کلیرسا کی دربائی اور اعانت کا ذکر، میڈا کی چالبازی اور ہمدردی اور حسن گلوسوز کا بیان۔ ایک بات بھی اٹھا نہ رکھی۔ ارے نادان! میں درویش نہیں ہوں میں بھی ایک مس ہوں۔ جھینپے تو نہ ہوگے۔ مگر میں کلیرسا اور پولینڈ کی شہزادی کی طرح اپنے پیارے وطن کی دشمن نہیں ہوں۔ کلیرسا کو ملے تو خون پی لوں اور اگر بس چلے تو پولینڈ کی شہزادی کے تکّے تکّے اڑاؤں اور بوٹیاں چیلوں اور کوّوں کے حوالہ کردوں۔ مگر واہ میرے طالع فرخ کہ کل امور تیری زبان سے صاف صاف سُن لیے۔ خدا کی شان ہے مگر یہ ہتھکنڈے چھوڑ دو ورنہ بری ہوگی۔

جو جو اسرار تھے نہانی ۔۔۔ سب تجھ سے سُنے تری زبانی

یاد رکھنا روس کی لیڈیاں اپنے وطن کے نام پر جان قربان کرنے کو ہمیشہ آمادہ رہتی ہیں۔ روس کی لیڈیاں کلیرسا کی سی نہیں ہوتیں۔ اس چھوکری نے وہ نام پیدا کیا تھا کہ روس کی کل لیڈیاں عش عش کرتی تھیں مگر نباہ نہ سکی۔ ہائے افسوس۔ کلیرسا او آزاد سے پاشا کو مُڑے حیرت ہے۔ خیر۔ اب خوب یاد رکھو کہ مس کلیرسا اور پولینڈ کی شہزادی دونوں تمام عمر گرفتار مصیبت رہیں گی۔

اس قدر پڑھ کر آزاد اشکبار ہو گئے۔ خدمتگار یعنی حامل خط کی طرف دیکھ کر کہا اللہ اللہ یہ دغابازی۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ بڑا پکا دیا بڑا دھوکا کھایا۔ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ کس لطف کے ساتھ کل حال پوچھ لیا اور میری آنکھوں پر کیسا غضب کا پردہ ڈالا۔ اب کلیرسا اور میڈا کو کون بچائے گا اور پولینڈ کی شہزادی کو کون مدد دے گا۔ یا خدا مدد دے یا خدا مدد دے۔

اپیلین پاشا اور کئی افسر منتظر تھے کہ آزاد اس خط کا مطلب بیان کریں مگر اُن کو گریاں و پریشان دیکھ کر سخت متحیر ہوئے۔ پوچھا خیریت ہے۔ انھوں نے کہا خیریت منزلوں دُور ہے۔ خیریت کہاں بڑی مصیبت پڑ گئی۔ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ یہ کہہ کر خط کا بقیہ حصّہ پڑھا۔ وہو ہذا۔

سنو آزاد پاشا! پلونا تک تمہارا گذرنا محال ہے۔ اس خیال خام سے درگذرو۔ افواج ظفر امواج روس مور و ملخ سے زیادہ ہے اب اگر اپنی جان کو عزیز رکھتے ہو تو گھر کی راہ لو ورنہ یہ دشت بلاخیز ہے اور تم ہو۔ لاش کا بھی پتہ نہ ملے گا۔ ہاتھیوں سے گنّے کھانا عقل و مصلحت دونوں کے خلاف ہے۔ اگر شیطان نے یہ پٹی پڑھا دی ہے کہ پلونا میں داخل ہو جائیں گے۔ تو یاد رکھو بہت پچھتاؤ گے۔

کیا سمجھتے ہو کہ اُمید یہ بر آئے گی
آج یا کل کبھی حسرت یہ نکل جائے گی

کیا مجال، کیا تاب کیا طاقت۔ دیکھ ہی لوگے۔

کانٹوں میں اگر نہ ہو اُلجھنا تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

اب میں آپ سے رخصت ہوتی ہوں اور مس کلیرسا سے عوض لیتی ہوں۔ جو شہزادی آپ کی چاہتی بیوی بنی ہیں وہ اسی مہینے میں سیبیریا کے برفستان کی ہوا کھائیں گی اور تمام عمر پچھتائیں گی۔

(مس صوفیا)

آزاد پاشا نے یہ خط سب کو سنایا تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ارے بڑا چکما ہوا، بڑا دھوکا دیا، اب روس کی فوج اور بھی مستعد ہو جائے گی کُل حالات اور اُمور کی اطلاع پائے گی۔

اب سنیئے کہ مس صوفیا نے اپنے لشکر میں جا کر آزاد کلیرسا پولینڈ کی شہزادی اور میڈ اسب کا پوست کندہ حال بتا دیا۔ فوراً آمادہ کیا کہ وزیر جنگ کو ان حالات سے اطلاع دیجیئے۔ تاکہ اگر مناسب سمجھیں تو ان سب کو سزا دیں۔

ادھر آزاد پاشا اور افسران فوجی باہم مشورہ کرنے لگے کہ اب تاخیر کا موقع باقی نہیں ہے۔ فوراً حملہ کر دو۔ آزاد پاشا کے ساتھ ۲۴ توپیں تھیں پندرہ ہزار سوار تین سو پیادے اور صرف دو دن کی رسد۔ سب کی رائے یہی قرار پائی کہ حملہ آور ہونا بہتر ہے۔ لہذا فوج آراستہ ہو کر بڑھی۔

روسیوں نے ترکی فوج کی حس و حرکت کا حال سنا تو فوراً بند و بست کیا۔ منجملہ پچیس ہزار آدمیوں کے دس ہزار کو مقابلہ کے لیے بھیجا اور پانچ ہزار کو فوج ریزرو مقرر کیا اور دس ہزار اسی مقام پر ڈٹی رہی۔ میدان میں ادھر رومی اُدھر روسی فوج صف باندھ کر کھڑی ہوئی۔ اب کوئی چار پانچ گھڑی دن باقی تھا۔

پہلے ترکوں نے گولہ چلایا۔ ان کے ہمراہ ایک بڑا نامی گرامی گولہ انداز تھا اس قادر انداز نے تاک تاک کر ایسے گولے اتارے کہ روس کے کئی افسروں کے سر بھٹے کی طرح اڑ گئے۔ آدھ ہی گھنٹے میں چونتیس افسر کام آئے اور ترکوں کا صرف ایک سب لفٹنٹ کام آیا۔ اپلیٹن کی رائے تھی کہ ایک عمارت کی آڑ سے گولے مارے جائیں۔ مگر آزاد پاشا نے صلاح دی کہ میدان کی لڑائی ہو۔

ادھر فوج بسرکردگی آزاد پاشا روانہ ہوئی۔ ادھر روسیوں نے بندوقیں چھتیا کر باڑھ پر باڑھ ماری اور دونوں طرف سے گولی چلنے لگی تو دھوئیں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کے نیچے ایک اور آسمان بن گیا۔ طرفین کی فوج خوب دل کھول کر لڑی مگر چونکہ ترک کسی قدر بلندی پر تھے لہذا روس کی سپاہ زیادہ کام آئی۔ اُدھر آزاد پاشا دریا کے کنارے پہنچ گئے اور بائیں جانب سے باڑھ ماری تو روسیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آزاد پاشا نے اس مقام پر ایسی جوانمردی کی کہ تاریخ پلونا میں یادگار رہے گی۔ فوراً گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا اور ستر سوار لے کر اس پار آ گئے۔ اس اثنا میں روسیوں نے گولیاں چلائیں مگر بیکار۔ اب مجبور ہو کر ریزرو فوج سے پانچ ہزار آدمی بلوانے پڑے۔ اب کیا تھا ادھر اپلیٹن پاشا کے سوار ادھر آزاد کی فوج نصرت موج جب تک ریزرو فوج آئے تب تک قلع قمع کر دیا۔ آزاد پاشا سوچے کہ یہ لوگ اب جان پر کھیل جائیں گے۔ لہذا ان کو گولی مارنے کا موقع نہ دو۔ ان کے ماتحت افسروں نے منع کیا اور کہا آپ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ گولہ بارود اُن کے پاس بہت کم ہے۔ اگر تلوار کی لڑائی ہوئی ہو تو جان پر کھیل جانا کون بڑی بات ہے۔ مگر آزاد نے ایک نہ سُنی فوراً تلوار میان سے نکال اور جھپٹ پڑے۔ اس وقت اتنی تلواریں چمکتی تھیں کہ نظر جھپکی جاتی تھی۔ دھوپ کا رنگ ان کی چمک دمک

کے مقابل میں ماند پڑ گیا تھا۔

رن کی زمین سُرخ تھی اور زرد آسمان

یہ مصرع صادق آتا تھا۔

ایک ایک آدمی ایک ایک سے گتھ گیا۔ آزاد پاشا پیترے بدل بدل کر تلے ہوئے ہاتھ لگاتے تھے۔ اور سر چٹکیوں میں اُڑے جاتے تھے۔ ایک ایک نے سو سو کے سر اُڑائے گویا ایک بار تھا کہ اس سے سبکدوش کر دیا۔ یہ مصرع یہاں پر صادق آتا تھا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

سر یوں برس رہے تھے کہ جیسے جھڑی لگے

ان کی تلوار پیغام اجل تھی جس طرف چمکی آنکھوں میں چکا چوند آگیا جس طرف گئی پرے کے پرے صاف کر دیئے۔

سن اس کا گھٹا جو دلیرانہ بڑھا تھا منہ کی وہی کھاتا تھا جو منہ اس کے چڑھا تھا

کئی روسی جوانوں کو آزاد نے نیچا دکھایا۔ بیس پچیس سواروں کو ایک ایک ہاتھ میں مقتول کیا۔ کئی افسروں کو تلوار کے گھاٹ اتارا کئی مرتبہ کاری کر آب خنجر ملا یا جس طرف ان کی شمشیر محرابی لنگردار چمکی ایک کے دو، دو کے چار کیے۔ مگر ایک روسی پہلوان جھلا کے آگے بڑھا اور طالب پیکار ہوا۔ آزاد شیر نر کی طرح آگے بڑھا اور تلوار چلنے لگی۔ یہ کیفیت قابل دید تھی۔ اس وقت آزاد نے ایسے ایسے فنون سپہ گری دکھائے وہ حملے دلیرانہ کیے کہ باید و شاید۔

دس منٹ تک مقابلہ مساوی رہا۔ اس کے بعد آزاد فرخ نہاد نے چالاکی کا ہاتھ مارا، خون کے فراٹے بہنے لگے۔ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ انھوں نے ایک ہاتھ کٹی اور اس کا دست راست کھٹ سے کٹ کے گر پڑا اور ادھر ترکی کی فوج میں نعرۂ خوشی بلند ہوا۔ کچھ دیر میں میدان صاف ہو گیا اور آزاد پاشا کے نام فتح لکھی گئی۔ میدان میں فوج کے مقتول ایک سمت ہمیشہ کے لیے میٹھی نیند سو رہے تھے۔ اور دوسری جانب مجروحین کی فریاد اور نالہ و زاری کرب سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ رن کی زمین میں باوصف کثرت فوج سناٹا پڑا تھا۔

رن کی زمین میں آزاد پاشا اپنے کمیت طوطی پر کاوے ادھر اُدھر کڑکڑانے لگے۔ فوج کے جوانان روئیں تن خوشی کے شادیانے بجانے لگے۔ آزاد پاشا نے قرب و جوار کے گاؤں میں دریافت کیا کہ کوئی عمارت بلند و وسیع بھی یہاں ہے یا نہیں تو معلوم ہوا کہ روسیوں نے کل بڑے بڑے مکانوں کو مسمار کر دیا۔ انھوں نے دو جاسوس روانہ کیے کہ اہل پلونا کی خبر لائیں اور ان کو اطلاع دیں کہ اس جنگ میں کامل فتح پائی اور غنیم کو شکست فاش دی۔ میدان میں ہزاروں لاشیں پڑی تھیں ایک ایک پر دو دو۔ تلوار کی لڑائی نے چٹکیوں میں جنگ کا فیصلہ کر دیا۔

ایک مقام پر دو زخمی پڑے سسک رہے تھے۔ ایک روسی دوسرا ترک۔ روسی نے گولی کے تین زخم کھائے تھے اور تلوار کی ضرب سے بایاں ہاتھ جھول گیا تھا۔ ٹانگیں دونوں بیکار ہو گئی تھیں۔ ترک بھی بہت تڑپ رہا تھا۔ ایک گولی توڑ کے نکل گئی تھی اور تلوار نے ایک ہاتھ اُڑا دیا تھا۔ تلوار اب تک داہنے ہاتھ میں تھی۔ وجہ یہ کہ اس شخص کے پاس اصفہان کے قریب ایک گاؤں کی شمشیر خارا شگاف تھی۔ نہایت جوہردار اور محرابی مگر عام تلواروں سے زیادہ طول تھا۔ اس لنگر کے سبب سے تلوار جب تک تول نہیں لی جاتی تھی چلانا مشکل تھا۔ کلائی پر بڑا زور پڑتا تھا۔ ایک بار اس زور سے اس نے تلوار چلائی کہ ایک ہی ضرب میں دو روسیوں کو کاٹ کر ایک درخت کے تنے پر رُکی۔ اتنے میں اس پر کئی تلواریں پڑیں اور بیدم ہو کر گرا تو تیورا گیا۔ مگر تلوار پنجے سے نہیں چھٹی۔ اس شخص نے گیارہ آدمیوں کو اس تیغ خوش غلاف سے قتل کیا تھا۔ جب گرا تو تلوار کا قبضہ ہاتھ میں دھنس گیا۔ ان دونوں میں تھوڑا ہی فاصلہ تھا۔ ایک دوسرے کو

دیکھ دیکھ کر دانت پیستا تھا۔ مگر دونوں شخص بے بس۔

روسی نے کہا۔ یا خدا اتنی فرصت دے کہ اس بدبخت کو جو مجھے دیکھ دیکھ کر دانت پیستا ہے قتل کر ڈالوں۔ گو ہاتھ اور پاؤں دونوں بیکار ہو گئے ہیں لیکن اور کچھ نہیں تو دانتوں سے بوٹیاں ہی نوچوں۔ اور ترک کہتا تھا کہ ٹھہر جا۔ ٹھہر جا۔ ذرا خون رک لے تو اسی شمشیر برّاں سے گلا کاٹوں گا اور جہنم واصل کروں گا۔ انشاء اللہ۔

اتنے میں آزاد پاشا نے حکم دیا کہ کل ڈاکٹر اور کمپونڈر بہت عجلت اور مستعدی کے ساتھ مجروحین کی فکر کریں۔ جب اس ترک کے قریب آئے تو اس نے آہستہ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب مہربانی کر کے اس روسی کا علاج بھی کرنا۔ کیونکہ بیچارا سسک رہا ہے۔

یہ گفتگو ہو تی ہی تھی کہ ایک مسافر نے جو اس طرف سے گذرا بیان کیا کہ صوفیا کے راستے میں ترکوں سے بڑی جنگ ہوئی۔ جس میں روسیوں نے پلونا کے قریب فتح پائی اور اس کا حال یوں بیان کیا۔

قلعہ پلونا گو کہ محصور کر لیا گیا ہے مگر تاہم محفوظ و مامون رہا۔ رشید پاشا کی جرأت و دلیری میں کوئی شک نہیں ہوتا مگر چونکہ عساکر معاندِ جنودِ مخالف پاشا کو ہر طرف سے گھیرے تھے لہذا اُنھوں نے اپنی دلیری و بہادری و فطانت و چالاکی سے اپنی صف لشکر کو دائرہ حفاظت سے نہ خارج ہونے دیا۔ جو صف کہ صوفیا کے راستہ پر واقع تھی وہ قبل اختتام ماہ اکتوبر میں ۱۵ میل تک پھیل گئی۔ ۱۹۔ ماہ اکتوبر کو جبکہ فوج رومانیا اپنے حملہ میں ناکامیاب رہی اس وقت تین گولے پے در پے ان پر نازل ہوئے اور ایک منٹ میں ہر ایک گولے سے تخمیناً تیس ہزار گولیاں برآمد ہوئیں۔ یہ امر یقینی تھا کہ اب قلعہ میں مدد نہ پہنچ سکے گی اور اس پر قابض و متصرف ہونا ایک امر محال اور غیر ممکن تھا۔ یہ مصیبت منجملہ ان مصائب و مشکلات کے تھی جو مقام پلونا میں واقع ہوئی تھیں۔ اور جس سے روسیوں کو اس امر کی امید واثق ہو گئی تھی کہ ان کا حملہ دیوار قلعہ کے حق میں ایک طوفان اور بلا نازل کرے گا۔

کمانڈر فوج ترکی نے جب یہ تہلکہ اور آفت دیکھی تو بغرض افتتاح طریق و کشادگی راہ اس صف پر حملہ کیا جو صوفیا کی راہ پر واقع تھی۔ مگر فوج ترکی کی بوجہ خستگی اور نادانی کے نجات نہ پا سکی اور فوج روس ان پر غالب و کامیاب ہوئی اور پلونا کے قریب آ گئی اور رشید پاشا نے مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں اپنی گڑھی میں پناہ لی۔ یہ ضرور ہے کہ اگر رشید پاشا حسب خواہش حصار سے باہر آ جاتے تو تصفیہ مجادلہ شاید مختلف مقامات سے مرکب ہو جاتا اور یہ امر شاید اس وجہ سے تھا کہ جب پاشا موصوف کی فوج مایوسی سے بیدل ہو گئی تب پاشا کے دل سے کل خیالات حفاظت مقام پلونا کے جاتے رہے لہذا مجبور ہو کر صف دشمن پر بہ اُمید بہبود حملہ کیا۔ غرضیکہ بعد فتحیابی روسی بہت خوش و خنداں ہوئے اور اپنی فوج کی صف بندی پلونا کے قریب کر دی اور ایک خندق اس کے گرد تیار کر کے غنیم کے منتظر رہے۔

شروع نومبر میں بوجہ بے ترتیبی اور بدنظمی کے فوج ترک کو بھاگنے کا عمدہ موقع کافی طور پر ہاتھ آ گیا تھا۔ مقام رومانیا میں پانچواں اور اکیسواں دستہ مقام بلبیا میں سنبھل گیا۔ بعد ازاں ایک دستہ بسر کردگی جانسن آیا۔ جس نے ۹ نومبر کو ایک پہاڑی پر قائم ہو کر اپنی فوج کی صف بندی کی۔ جس مقام پر کمانڈر موصوف مقیم تھا وہاں پر اس کی فوج شمال مغربی جانب قائم ہوئی تھی اور توپخانہ اس پل کے مقابلے پر واقع تھا جو پرشیا کے سامنے ہے اور دریا کے دوسری جانب ایک صف صوفیا کے راستے سے گذر کر شمالی و مشرقی جانب قائم تھی اور جو ملک اڑلیسہ کے مغرب جانب واقع ہے اس پر رومانیہ کا چوتھا دستہ قابض و متصرف تھا اور شمالی اور مشرقی اضلاع پر دوسرا دستہ قابض تھا۔ صف مذکور ۲۰ میل کے فاصلے تک تھی اور فوج میں تخمیناً بارہ ہزار آدمی تھے۔ اور اس وقت میں رشید پاشا بہت گھبرائے تھے اور کرتے دھرتے نہیں بن پڑتی تھی اور ایام گرما بھی آ گئے مگر کوئی صورت نجات کی نہ ہوئی۔

اتنے میں ایک دودھ والی دودھ بیچتی ہوئی آئی۔ اس نے کہا میں خاص پلونا سے آتی ہوں۔ وہاں کا حال کچھ نہ پوچھو۔ سپہ سالار

رات دن نقشہ دیکھا کرتے ہیں۔ دن اور رات میں بہت کم سوتے ہیں۔ ہر دم وہر لحظہ یہی فکر رہتی ہے کہ کسی تدبیر سے نکل بھاگیں گو اس صورت میں بھی یہ خرابی واقع ہو گی کہ پلونا سا مقام روسیوں کے قبضے میں آ جائے گا۔ آپ لوگ تو اس طرف کارروائی کر رہے ہیں مگر آپ کو یہ خبر ہی نہیں کہ پلونا کے شمال کی جانب کیسی جنگ ہو رہی ہے خون کے دریا بہہ گئے۔ تین دن برابر لڑائی رہی۔ بڑے معرکے کی جنگ تھی۔ یہ کہہ کر عسکری پاشا کا خط ایک کرنل کو دیا اور کہا پلونا کے سپہ سالار نے مجھے بلا کر یہ خط دیا تھا اور کہا تھا کہ جس طرح ممکن ہو فوراً احمد پاشا کی فوج میں پہنچاؤ۔ اگر اس کا جواب دیجیے گا تو میں لے جاؤں گی خط یہ تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم ہ

خیر خواہان سلطنت رفیعہ روم کو مژدہ تازہ اور نوید بے اندازہ کہ قلعہ پلونا کے شمال میں تین روز تک معرکہ دار و گیر اور میدان رستخیز گرم رہا۔ مومنوں کی فوج جرار اور افسران کرار نے خوب داد شجاعت دی۔ گولی اور تلوار دونوں کی لڑائی میں پالا ہمارے ہی ہاتھ رہا۔ جب تلوار چمکی دھوپ تھرا گئی۔ جدھر گئی اُدھر۔

اللہ کے غضب کی نشانی دکھا گئی — دریائے قہر حق کی روانی دکھا گئی

جل جل گئے وہ شعلہ نشانی دکھا گئی — کٹ کٹ گئے وہ سیف زبانی دکھا گئی

لب صورتِ شگافِ قلم بند کر دیے

فقروں کے ذوالفقار نے دم بند کر دیے

فوج عدو میں غل مچ گیا کہ تلوار نہیں موت کی ماں جائی بہن ہے۔ چلی اور جان تن سے نکل گئی۔ قریب آئی اور روح نے پرواز کیا۔

چمکی وہ یوں کہ گر گئی سب کی نظر سے برق — روکیں کسے رُکی ہے کسی کی سپر سے برق

بجلی کہیں کسی کے روکے رُکی ہے۔ تین دن تک یہی مصیبت رہی۔ گولوں کا مینہ برس رہا تھا۔ گولیوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ تیسرے روز فوج عدو ہٹ گئی اور میدان ہمارے ہاتھ رہا مگر پلونا میں داخل ہونا محال ہے اگر فوج کمکی آئی تو نعم المراد۔ ورنہ ہم لوگ جان پر کھیل جائیں گے اور پلونا میں داخل ہونے کی کوشش بلیغ کریں گے۔

آزاد۔ شکر ہے کسی طرف سے فتح کی خبر تو آئی۔ الحمد للہ،

کرنل۔ مگر زیادہ خوشی تب ہوتی جب یہ خبر سنتے کہ عسکری پاشا اپنی سپاہ لے کر پلونا میں داخل ہو گئے۔

اب سنیئے کہ پلونا کی راہ سے ایک مسافر آتا تھا جس کو سواروں نے گرفتار کر لیا۔ اور آزاد پاشا کے پاس لائے۔

آزاد۔ اس بیچارے کو کیوں پھانس لائے۔ اب کوئی تمہارے ڈر سے سفر نہ کرے اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ جاسوس ہے۔ چھوڑ بھی دو۔

سوار۔ خداوند یہ سب جاسوس ہیں اور یہ عورت جو دودھ بیچنے آئی تھی یہ بھی سکھائی پڑھائی تھی۔ ان کا ہرگز اعتبار نہ کیجیے۔ قابل اعتبار نہیں ہیں۔

آزاد۔ اللہ اکبر یہ دغا بازی۔ ایک درویش بن کے آئے۔ کل حال دریافت کر لے گئے۔ دوسری دودھ والی بنی اب یہ مسافر بن کے آئے ہیں۔

سوار۔ اس کے دونوں کان کاٹ لیے جائیں تو خوب ہو۔ اکثر ملکوں میں یہ قاعدہ ہے کہ ڈاکوؤں کے کان کاٹ لیتے ہیں۔ تاکہ جہاں کہیں جائے فوراً لوگ پہچان لیں کہ ڈاکو ہے۔

آزاد- چہ خوش- تو وہ ڈاکوؤں کے بھی کان کاٹتے ہیں۔

اس مسافر کی تحقیقات کی گئی اور سوالات ہونے لگے۔

ایلیٹن پاشا نے سوالات کیے تو مسافر گڑبڑا گیا، بغلیں جھانکنے لگا۔ انھوں نے ہر سوال کے جواب میں اس کو جھپا دیا اور آخرکار کامل ثبوت بہم پہنچایا کہ یہ شخص جاسوس ہے۔ وہ ذات شریف گرفتار کیے گئے اور سخت ذلیل ہوئے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے آدھ کوس کے فاصلے پر لشکر عظیم مثل طوفان آب موجزن ہے۔ دوربینوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ترکی فوج مدد کے لیے آتی ہے۔ کل اہل لشکر نے نعرۂ خوشی بلند کیا اور اکثروں نے ٹوپیاں اچھال دیں۔ دم کے دم میں سپاہ آن پہنچی۔ یہ لشکر بسرکردگی ریاض پاشا حسب الحکم سلطانی روانہ کیا گیا تھا۔ اس میں سترہ ہزار سوار اور دس ہزار پیادے اور چالیس توپیں تھیں۔ مگر جوان سب نوخیز اور کرارے اور شہزور افسر سب جری اور تجربہ کار۔ افسر اعلیٰ یعنی ریاض پاشا جنگ کریمیہ میں شریک ہو چکے تھے۔ فرانس اور جرمن کی لڑائی دیکھے ہوئے تھے اور معاملات حرب خوب سمجھتے تھے۔ آزاد پاشا ریاض پاشا اور سب افسروں نے باہم مصافحہ کیا۔

سانحۂ جگردوز

بمبئی کی پری چہرہ بیگم جو حسن آرا کی بہنوں میں تھیں ہر ہفت آرائش سے مزین ہو کر بناؤ چناؤ کے ساتھ نازک پلنگڑی پر متمکن ہوئیں اور شبو مہری سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ یہ وہی بیگم صاحب ہیں جن کے ہاں آزاد فرخ نہاد فروکش تھے۔

بیگم صاحب نے شبو سے کہا۔ پرسوں سپہر آرا بیگم کی شادی تھی۔ مرزا ہمایوں فر بہادر کی تصویر ہمارے پاس بھی بھیجی ہے۔ وہ صندوق تو اٹھا لاؤ جس پر سنہرا غلاف ہے۔ شبو جان چستی و چالاکی کے ساتھ گئیں اور صندوق لائیں۔

بیگم۔ اے ہے۔ کسی کور تو ندھی آتی ہے۔ تم کو دنوندھی آتی ہے۔ صندوق کا پتہ دیا کچھ لائیں کچھ۔ واہ اے وہ صندوقچی لاؤ جس پر سنہرا غلاف ہے۔

شبو جاکے وہی صندوقچی اٹھا لائی جس میں تصویریں تھیں۔ بیگم صاحب نے کھولی اور کہا دیکھو ہمایوں فر کی یہ تصویر ہے۔ کیا جوان ہے۔

شبو۔ ماشاء اللہ سے کلے ٹھلے کے گبھرو ہیں۔ اے یہ تو ہمارے شہر کے شہزادے ہیں۔ وہ میں کیا جانتی نہیں ہوں۔ دو دن سے بمبئی میں رہی تو کیا ہوا۔ کیا ان کو دیکھا نہیں ہے۔ خورشید لقا بیگم کے بھائی ہیں۔

بیگم۔ ہاں۔ مہ لقا چھوٹی بہن ہے اور خورشید لقا بڑی بہن کا نام ہے۔

شبو۔ میں خورشید لقا بیگم کے ہاں نوکر رہ چکی ہوں۔ میں تو نہیں نوکر تھی اماں نوکر تھیں۔ مگر ان کے میاں کا ایسا اچھا مزاج تھا کہ میں کیا عرض کروں۔ ذرا کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ بڑے سیدھے بیچارے اور لوگوں کی طرح نہیں تھے۔ بعض مردوئے بڑے ایک ہوتے ہیں۔ ایک دن لکھنؤ میں لالہ ہر بخش کی دکان پر سے میں چکنی ڈلی خریدنے کے لیے آئی تھی تو ایک شخص یہ شعر گانے لگا ؎

حجاب آئے انھیں کیونکر نہ شبنم کے دوپٹے میں
کسی کی آنکھ پڑتی تھی نہ حیدر رہا بجا پہلے

میں مسکرا دی تو دکان پر بڑا قہقہہ پڑا۔

بیگم۔ اوئی تم سے مسکرایا کیوں کر گیا۔ بڑی ڈھیٹ ہو۔

شبو۔ اے تو وہاں کوئی غیر تھوڑا ہی تھا لالہ روز کا آنے والا۔ دوسرے تیسرے سرکار میں آتا تھا اور منے میاں سے ہمارے بھائی سے جان پہچان۔ ایک اور لالہ بیٹھے تھے۔ ان کا سن کوئی اسی برس کا تھا۔

بیگم۔ اب کی چاند ہو تو ہم بھی جائیں۔ مہینے دو مہینے چہل پہل ہنسی دل لگی رہے گی۔ کئی برس یہاں رہے اب جی نہیں لگتا۔

شبو۔ ہمارے سرکار کا بھی تو قصد ہے۔ کل تو باتیں کرتے تھے کہ ضرور ضرور جائیں گے۔ اور دو چار مہینے رہیں گے ایک دو دن نہیں۔

بیگم۔ دو مہینے کے لیے جاتے ہیں۔ رہتے تو اسی تقریب بھر مگر صاحب نے کہا کہ یہاں نمائش گاہ ہوگی۔ آپ کو بندوبست کرنا پڑے

گا۔ اب صاحب کا کہنا کیوں کر نہ مانیں اور سب سے بڑے صاحب ٹھہرے۔

شبّو۔ ہاں پھر یہ تو ہے ہی۔ مگر حضور جو لطف اب ہوتا وہ کہاں ہوگا۔ اور یوں تو جب جائیں تب لطف ہے۔ حسن آرا بیگم کا مجاز چھوٹی بہن سے اچھا ہے وہ ذری ذری تیز ہیں۔

بیگم۔ دونوں کا مزاج اچھا ہے حسن آرا بیگم ذرا نستعلیق ہیں اور سپہر آرا کے مزاج میں تیزی ہے بس اتنا فرق ہے۔ مگر دونوں بہنیں پڑھی لکھی بخواندہ۔ شہر میں ان کی ایک تو ہوگی نہیں۔

شبّو۔ اس میں کیا شک ہے حضور۔ تو اب چاند کو کتنے دن ہیں۔ آج کونسی[1] ہے۔ ہوگی کوئی ساتویں؟

بیگم۔ آج پانچویں ہے۔ جمعرات کو چاند ہُوا تھا نا اور یہیں سے نمائش گاہ شروع ہوگی۔ کوئی چار دن رہے گی۔ بڑی بڑی دور سے صاحب لوگ آئیں گے اور بڑی دھوم ہوگی۔

یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ زمین باہر سے خط لائی۔ بیگم صاحب نے کہا کیا ڈاک پر آئے ہیں؟ زمین بولی ہاں حضور۔ پوچھا، پڑھے نہیں۔ کہا پڑھے کون؟ سرکار تو چھوٹے میاں کے ہاں چلے گئے۔ شطرنج بچھی ہے اور سب کے سب جمع ہیں۔ محلہ بھر۔ بیگم صاحب نے تنک کر کہا۔ جا کے ابھی ابھی بلا لاؤ۔ کہو اس شطرنج کو آگ لگے۔ جب دیکھو شطرنج ہی کا شغل رہتا ہے۔ کھانا پینا اس کی بدولت چھوٹ گیا۔ موئی بڑی لت ہے کہ توبہ توبہ۔ جا کے کہو ابھی ابھی بلایا ہے سب کے سامنے کہنا کہ بیگم صاحب خفا ہو رہی ہیں کہتی ہیں کہ خط تو پڑھ جاؤ۔ زمین چھوٹے میاں کے ہاں گئی اور کل حاضرین کے روبرو کہا حضور بیگم صاحب اس وقت بہت خفا ہیں۔ ابھی اسی دم بلایا ہے۔ شطرنج کو چھوڑیئے کئی خط آئے ہیں چل کے پڑھ دیجئے۔

مرزا صاحب کے احباب نے قہقہہ لگایا۔ ایک نے کہا جائیے جائیے بسم اللہ۔ اب ایسا نہ ہو کہ بیگم صاحب خود چلی آئیں۔ دوسرا بولا۔ کیا نادری حکم ہے۔ تیسرے نے کہا گئے اندر بٹے۔ بے پٹے اب نہیں آتے۔

مرزا صاحب چلے گئے مگر وعدہ کر گئے کہ بازی بدستور قائم رہے میں ابھی آتا ہوں گھر میں گئے تو دیکھا بیگم صاحب ناک بھوں چڑھائے ہوئے بیٹھی ہیں۔

مرزا صاحب۔ اوہ۔ اس وقت تو بہت بگڑی ہوئی بیٹھی ہیں۔ خدا خیر کرے۔

بیگم۔ یہ دل لگیاں ہم کو نہیں بھاتیں۔ شطرنج نہ ہوئی وہ ہوگئی۔ خط آئے اُن کا پڑھنا تک محال ہے۔ ڈاکیے کو حکم دیا کہ جاؤ ڈیوڑھی پر خط بھجوا دو۔ واہ واہ اب تک یہاں جاؤ تھا اب چھوٹے میاں کے پہنچے۔

مرزا صاحب۔ خط لاؤ دیکھیں کس کس کا خط آیا ہے، اخاہ۔ اکٹھے اتنے خط کچھ ٹھکانا ہے۔ ایک دو نہیں۔ دس بارہ۔ سب سے پہلے حسن آرا کا خط نظر سے گذرا۔ لفافہ دیکھتے ہی کہا حسن آرا کا خط ہے۔ کھولا پڑھا اور بیگم صاحب کو سنایا۔

بیگم۔ (خط سن کر) بندگی۔ دیکھا وہی بات ہوئی نہ۔ سب کی شکایت رہی۔

مرزا صاحب۔ تو اس میں ہمارا کون قصور ہے؟ ہم اس کو کیا کریں۔ بتاؤ۔ صاحب گورنر نے روک لیا۔ اتنے بڑے حاکم کا کہا کوئی ٹالتا ہے۔ ہمارا کیا قصور ہے۔

بیگم۔ ہاں! سچ ہے اور جو ابھی تمہاری بہن کے ہاں شادی ہوتی تو ہم دیکھتے کیونکر نہ جاتے۔ تم کو سسرال والوں کی ذرا اُلفت نہیں

مرزا صاحب۔ ایں! سبحان اللہ۔ ہم تو اپنے خاندان میں بدنام ہیں کہ یہ سسرال والوں کے ہاتھ بک گئے۔ چہ خوش۔ اُدھر وہ

---

[1] کونسی۔

ملنے دیں اِدھر تم ملنے دو۔ بیچ میں ہم اُلّو نہیں۔ ماشاءاللہ۔

بیگم۔ اچھا اس خط کا جواب تو بھیج دو۔ ذرا نرمی سے لکھنا۔

مرزا صاحب نے کہا اب اس وقت تو ہم جاتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے بازی چھوڑ کے دوڑ آیا ہوں۔ اب کل لکھوں گا۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب تشریف لے گئے تو شام کو گھر آئے۔ بیگم صاحب نے گلوریاں بنا کر کھلائیں۔ تختوں پر فرش مکلف بچھا تھا۔ میاں بیوی بیٹھے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے کہ خدمتگار نے باہر سے مہری کو آواز دی اور کہا تار آیا ہے لے جاؤ۔ مرزا صاحب نے کہا یا خدا ایک تار ابھی دس ہی دن ہوئے آچکا ایک اب آج یہ کیا آیا ہے۔ مہری تار لائی۔ انھوں نے کھولا اور پڑھا تو (ارے!) کہہ کر رونے لگے۔ بیگم صاحب نے کہا ہے ہے۔ یا میرے اللہ خیر کیجیو۔ ارے کیا ہوا کیا (رو رو کر) کچھ کہو تو۔ مرزا صاحب کا رنگ فق ہوگیا۔ چہرے پر زردی چھا گئی۔ آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے۔ بیگم صاحب نے سر پیٹنا شروع کیا۔ سمجھ گئیں کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ گریہ وزاری بے وجہ نہیں۔ معاً شک ہوا کہ بڑی بیگم کے ہاں سے تار آیا ہے اور بے خبر سنے ہوئے زار زار رونے لگیں۔

آخر کار مرزا صاحب نے ہمایوں فر کے سانحہ کا حال بتایا تو بیگم صاحب آٹھ آٹھ آنسو روئیں۔

واقعاتِ جنگ

دونوں لشکر پرے جمائے کھڑے تھے۔ اِدھر ترکوں کی توپیں برق بار، اُدھر روسیوں کی بندوقیں دوزخ شرار۔ ادھر توپ خانہ سلطانی سے صدائے کوس بلند ہوئی اُدھر روسیوں کی روانی بحر جوش سہ چند ہوئی۔

میدان رزم میں آزاد اس طرح اٹکھیلیاں کرتے تھے جیسے شیر کچھار میں۔

آزاد۔ یہ فوج روسیہ جو سامنے صف بندی کرکے برسرپیکار ہے تو سہی کہ اس کے ایک ایک سپاہی اور سوار کی لاش کو اسی کھیت صرصرتگ کی ٹاپ سے نہ روندا ہو۔ یا خدا مدد دے۔ انشاء اللہ (گھوڑے کی طرف مخاطب ہوکر) کیوں غازی مرد۔

راوی۔ گھوڑے نے اتفاق سے ہنہنانا شروع کیا۔

آزاد۔ شاباش ہے شاباش کیوں نہ ہو غازی مرد۔

اب سنئے کہ پلونا اس قدر محکم اور مضبوط حصار ہو گیا کہ ایک سوئی کے برابر بھی دیواروں میں سوراخ کا نام نہ تھا پہلے تو یہ قلعہ کچھ مشہور نہ تھا مگر سپہ سالار افواج ترک نے اپنی لیاقت فن انجنیئری سے اس کو غیرت روئیں دژ بنا دیا۔ جابجا کیوں میں چھوٹے چھوٹے گردے چڑھے تھے۔ دراتواپ اژدر مہابت جوار گرد تھیں اُن میں سے اس قلعہ معلیٰ کی شان اور بھی بڑھ گئی تھی۔ روس کی فوج پلونا اور سپاہ آزاد پاشا کے درمیان میں مور و ملخ سے بھی زیادہ تھی۔ شب کا وقت، زن مہتاب میں روشن، گولوں کی آواز زنادن سا۔ ایک سمت ترکوں کی توپیں اژدر ہائے دہان کو مات کرتی تھیں۔ دوسری جانب روسیوں کا توپ خانہ آتش فشاں تھا۔ آزاد پاشا اشہب خشتی خرام و تیزگام پر سوار ہو کر فوج کے اردگرد دورہ کرتے اور مردان کاری کو ترغیب و تشویق دیتے تھے۔ ہاں بھائیو بڑھے ہوئے۔ ہاں غازیانِ دین جمے ہوئے۔ غنیم روسیہ سے دب نہ جانا۔ بڑھ بڑھ کے شمشیر شجاعت کے جوہر دکھانا۔ مجاہدین کو قاعدین پر ہر آئینہ فوق ہے۔ ہاں سواران صف شکن روئیں تن گھوڑوں کی باگیں لیے ہوئے تھم تھم کے اور جم جم کے گولہ اندازوں نے اپنے اپنے ہنر دکھائے کمال کیا۔ تاک تاک کے گولے اُتارے۔ گولہ گرا پھٹا اور پچاسوں کو لے ڈالا۔ کسی ٹکڑے نے دو کو لیا اور کسی نے دس کی جان لی۔

اس معرکۂ دار و گیر میں اسپلین پاشا زخمی ہوئے۔ ان کا دیلا گھوڑا آزاد پاشا کے قریب تھا کہ ایک گولی دونوں گھوڑوں کے بیچ سے سن سے نکل گئی۔ پھر دو گولیاں بیاپیے آئیں جن میں سے ایک گولی اسپلین پاشا کے بازو کی ہڈی توڑ کر سرد ہو گئی۔ ایک افسر اعلیٰ جو فنون جنگ کے علاوہ فن انجنیئری میں بھی طاق تھا اس جنگ عظیم میں کام آیا۔ اس کی وفات کا آزاد کو سخت رنج ہوا کیونکہ آزاد پاشا فن انجنیئری سے بالکل ناواقف تھے اور اس انجنیئر کی مدد کو بہت قیمتی سمجھتے تھے۔ روسیوں کی طرف بھی یہی حال تھا۔

اہل پلونا کی یہ خواہش تھی کہ یہ جنگ حصار فلک نشان سے اس قدر فاصلے پر ہوتی جہاں آرم اسٹرانگ کی برق آہنگ توپیں اور سنہری مارٹینی رفل کام آتے تو روسی بھاگتے راہ نہ پاتے۔ اپنے کشتوں اور مجروحوں کو روندتے جاتے۔ ادھر آزاد کا لشکر فیروزی اثر یورش کرتا ادھر اہل پلونا گولوں کا مینہ برساتے۔ گو سپہ سالار عساکر روم نے کوشش بلیغ کی کہ ایک کالم کو قلعے سے باہر بھیجے تاکہ روسی فوج دو طرف سے گھر جائے۔ مگر سعی مشکور نہ ہوئی۔ غنیم نے کہسار کے ہر مقام پر راستے بند کر دیئے تھے۔ جب

ترکوں نے دیکھا کہ فوج عدو بھی بے شمار ہے اور مستعدی اور بسالت کے ساتھ برسرِ پیکار ہے تو ٹھان لی کہ فوراً حملہ آور ہوں اور شمشیر سے دست بدست لڑیں۔

حکم ہوا کہ کوہی توپیں آگے بڑھیں اور بڑی سرگرمی سے گولے چلاتے جائیں۔ اس وقت میدان رستخیز اور معرکہ ستیز کی کیفیت قابل دید تھی۔ طرفین کی سپاہ کے نزدیک جنگ نہ تھی عید تھی۔ دونوں کے حوصلے بڑھے ہوئے۔ ولولہ جوش و خروش کی انتہا ہی نہ تھی۔

دو لشکر نہ گویم دو دریائے خون — بہ بسیاری از آب دریا فزون
بعرض دو میداں بداں تنگ جائے — فشردند چوں کوہ پولاد پائے
سپہ از دو جانب صف آراستہ — زمین آسماں وار برخاستہ

نہ پوئندہ را برزمین پائے بود
نہ پرندہ را بر ہوا جائے بود

گولہ ہائے جگر دوز سے میدان کارزار گونج رہا تھا۔ پیادوں سے لے کر افسروں تک سب کو یہی حوصلہ تھا کہ چاہے جان جائے مقدم پیچھے نہ ہٹے۔ دونوں لشکر خوب لڑے۔

آزاد۔ (افسروں سے) اب شمشیر زنی کا وقت آن پہنچا۔

افسر۔ اک ذرا اور تامل کیجئے انشاء اللہ مار لیا ہے۔

دوسرا۔ میدان ہمارے ہاتھ ہے۔ لوائے سلطانی کے پھریرے اُڑ رہے ہیں۔

آزاد کی تلوار کے چمکتے ہی ہزاروں تلواریں نیام سے نکل پڑیں۔ آزاد پاشا نے کہا۔ بسم اللہ حملہ آور ہو۔ سپاہیوں اور لشکریوں نے نعرہ بلند کیا۔ اور کہا بسم اللہ ہم بھی جان بکف حاضر ہیں۔

اہالیان روم کی سیف سرافگن سے فاقتلوا فاقتلوا کی صدا بلند تھی۔ تو روسیوں کی حسام جوہر دار سے بزن بزن کی آواز آتی تھی اور چمک دمک کے مقابل میں چاندنی شرماتی تھی۔ ادھر اس نے جھلکی دکھائی اور عدو کی گردن زمین پر نظر آئی۔ ادھر وہ چمکی تو سر سے تا بہ کمر آئی۔ ان کی تلواریں مغفر[1] شگاف و الماس بار۔ ان کی سروہیاں گلو نواز جگر دوز۔ یہ زبان آور۔ وہ برق پیکر۔ یہ ہلال سپہر فتح و ظفر۔ وہ برق خرمن سر و مغفر۔

آزاد پاشا اس ڈانٹ ڈپٹ سے پینترے بدل بدل کر اور ہاتھ تول تول کر ضرب لگاتے تھے کہ فوج عدو کے تن سے سروں کی جھڑی لگاتے تھے۔

جب روسیوں نے دیکھا کہ میدان ہاتھ سے جاتا ہے تو جان پر کھیل گئے۔ ایک نامہ نگار جو دور سے ساری کیفیت دیکھ رہا تھا یوں لکھتا ہے "میں قلعۂ فلک شکوہ سے جنگ کی کل کیفیت مشاہدہ کر رہا تھا۔ الامان الامان میں ایک معمر آدمی ہوں اور پنشن یافتہ چونتیس برس تک فوجی افسر رہا تھا اور پھر دس برس تک فوج میں کام کیا۔ واٹرلو کی لڑائی اور روس سیہ کی جنگ اور محاربہ پروشیا و فرانس میں شریک تھا۔ جرمنی۔ روس۔ فرانس۔ انگلستان۔ امریکا۔ روم کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کے قواعد جنگ سے ہم واقف نہ ہوں۔ تلوار کی لڑائیاں سدہا بار دیکھیں اور ہزارہا مرتبہ اس قسم کی جنگ میں خود بھی شریک ہوا تھا مگر میں نے آج تک ایسی گھمسان کی لڑائی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ گو شب کا وقت تھا۔ مگر چاندنی بہت صاف چھٹکی تھی اور میں دوربین سے کل حالات دیکھ رہا تھا۔ آزاد نامے ایک سپہ سالار روم نے جس کا نام مجھے پیچھے معلوم ہوا کہ

[1] مغفر۔ خود۔ لوہے کی ٹوپی جو میدان جنگ میں استعمال کی جاتی تھی۔

کارنمایاں کیا باید و شاید۔

بلبل سے کبھی وصف گل تر نہیں ممکن — آئینہ سے اوصاف سکندر نہیں ممکن
ذرّے سے ثنائے شہ خاور نہیں ممکن — جبریلؑ سے تعریف پیمبرؐ نہیں ممکن

روسیوں اور ترکوں میں اس قدر فرق تھا کہ ترک تھک گئے تھے۔ بالکل شل۔ مگر با ایں ہمہ ان کا ہاتھ نہیں رکتا تھا اور روسی بھی جان بکف لڑتے تھے لیکن شل نہ تھے۔ ترک چاہتے تھے کہ روسیوں کو اس مقام سے ہٹا دیں اور روسی صرف اپنے کو بچاتے تھے۔ پس یہی فرق تھا۔ روسیوں کا سپہ سالار اعلیٰ پہلے ہی کام آگیا تھا۔ ایک گولے کے ٹکڑے نے ان کے گھوڑے کو زخمی کیا تو گھوڑا بیکسی کے ساتھ گھٹنوں کو ٹیک کر بیٹھ گیا۔ یہ ہنوز سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور گولہ پھٹا جس کے ایک ٹکڑے نے ان کے سر کو نشانہ بنایا اور استخوان توڑ کر باہر نکل گیا۔ جنرل کے گرتے ہی فوج ترک میں نعرۂ خوشی بلند ہوا اور روسیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اب دست بدست لڑائی میں اور بہت سے افسر مقتول ہوئے۔

آخر کار روسیوں کو بھاگنے کے سوا کچھ نہ بن پڑی۔ ادھر ترکوں نے تلواروں کو میان میں رکھا اور پشت توسن پر سوار ہو کر تعاقب کیا تو کئی ہزار کئی سو روسی گرفتار کر لیے۔ فوج میں نعرہ خوشی بار بار مارا جاتا تھا۔ آزاد پاشا کی مسرت دلی کا حال ناگفتہ بہ۔ باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ حسن آرا کی یاد آتی تھی۔ فرط نشاط سے سینہ باغ باغ تھا۔ عرش بریں پر دماغ تھا۔ اب ان کو یقین ہو گیا کہ فائز بمرام ہونگے اور اقصائے روم سے تا ہندوستان نیک نام ہونگے۔

جس وقت پلونا میں فوج داخل ہوئی، اس وقت کی مسرت شادمانی ناگفتہ بہ۔ بوڑھے اور جوانوں سب کی یہ کیفیت تھی کہ جامے میں پھولے نہ سماتے تھے۔ غنچۂ دل کھلا جاتا تھا۔ کس و ناکس سب قہقہے اڑاتے تھے۔ سپہ سالار نے آزاد کو گود میں اٹھا لیا۔

آزاد۔ اب یہاں تک تو آ گئے — آیندہ فہمیدہ خواہد شد۔

جنرل۔ (بغل گیر ہو کر) شاباش آزاد پاشا شاباش۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مصاف پلونا

روس کے لشکر جرار نے رفتہ رفتہ ہرطرف سے قلعہ پلونا کو محصور کرلیا۔ اور پورپین ٹرکی کے قریب کل فوج جو اس طرف خیمہ زن تھی، مثل سیلاب اُمندآ ئی اور کئی کام یکے بعد دیگرے صفیں آراستہ کرکے آمادۂ جنگ ہوئے ترکوں کی اور کسی وقت اس سے زیادہ نازک حالت نہ تھی۔ غنیم جوق جوق جمع گوچہ گریز بند۔ ہرسمت سے قلعہ محصور اور خطرہ کہ سامان رسد ندارد بالکل سناٹا اور گولہ بارود بھی کافی نہیں۔ روسی برق دم۔ فوج نئی۔ نوجوان بھرتی۔ افسر اعلیٰ سے اعلیٰ ہر ایک آزمودہ کار سپاہی جرار سامان لیس۔ کھلا ہوا میدان اونچا مقام شہنشاہ روس تار پر تار بھیجتے تھے کہ جس قدر فوج ہو سب پلونا کی طرف روانہ کی جائے۔ آزاد کی رائے تھی کہ اگر قلعے سے نکلنے کا قصد ہو تو اس زور شور اور جوش وخروش سے حملہ کیا جائے کہ محاصرہ توڑ کر نکل جائیں اور کل فوج ایک دم سے اس قلعہ کو چھوڑ کر نکلے تاکہ زیادہ حصہ فوج محفوظ رہے۔ بعض کی رائے تھی کہ دو تین جانب سے حملہ کیا جائے جس طرف روسی کم طاقت پائے جائیں۔ اُسی طرف کل فوج حملہ کردے۔ مگر آزاد پاشا نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ اگر دو یا تین جانب سے حملہ ہوا تو روسی فائدے میں رہیں گے۔ روسی فوج ہماری سپاہ سے دو چند ہے اور جس قدر عرصے تک وہ لڑ سکتے ہیں اُس کے نصف عرصے تک ہم بھی میدان میں قدم نہیں جما سکتے۔

آزاد۔ اب آج کی کارگذاری پر کل جنگ روم و روس منحصر ہے۔

کرنل۔ اور آج کا حال ظاہر ہے۔ ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔

اسپلین۔ خدا خدا کرکے ہم تو اب ذرا ذرا اچھے ہیں۔

آزاد۔ آپ اس کالم کی کمان لیں جس کے افسر نے گولی کھائی ہے۔

اس تقریر کے بعد آزاد نے بآواز بلند ایک اسپیچ دی۔ وہو ہذا۔

ایہا السامعین یہ بات مثل مہر نیمروز روشن ہے کہ اس مصاف عظیم میں سلطنت رفیعہ و جلیلہ عثمانیہ ہمہ تن مصروف ہے اور روم کے ہر فرد بشر کے دل سے لگی ہے کہ جس طرح ممکن ہو فوج روسیہ پر غلبہ پائے۔ غازیان دین اور حامیان ترک دامے درمے قدمے سخنے تلے بیٹھے ہیں کہ ترکوں کا ہاتھ بٹائیں اور دل و جان سے مدد دیں۔ عورتیں تک زیور اور اسباب بیچ کر مدد کرتی ہیں۔ روسیوں کی حالت پر غور کرو۔ مس کلیرسا نامی ایک لیڈی عین میدان جنگ میں آئی اور سپہ سالاروں کی طرح لڑی۔ پس ہم لوگ مرد ہو کر اگر قدم پیچھے ہٹائیں تو مقام حیف ہے۔ پس یہ سمجھ لو کہ تلوار کے سایہ میں باغ جناں ہے۔ اگر جان گئی تو روضۂ رضوان میں قیام ہوگا اور اگر بچ گئے تو رہتی دنیا تک نام رہے گا اور ملک سرخرو رہے گا۔ قاعدین پر مجاہدین کو شرف ہے۔

The beat heraldy the pump of Power. and all that beauty all that wealth eva gave Await a like the inevitable hour.
The pathe of glory lead but to the grave.

اگر زندہ رہے اور اپنے ملک کے کام نہ آئے تو ایسی زندگی پر تین حرف اس میں تو شک نہیں کہ روسی اب غالب ہوتے جاتے

ہیں۔ لیکن اپنی طرف سے ہم کو سعی بلیغ کرنی چاہیئے۔ آئندہ یا قسمت یا نصیب یا بخت۔

من طریق سعی ے آرم بجا   لیس للانسان الا ما سعٰی

رزم کے نہنگ بحر آشام آزاد و فرخ نہاد کی ہر سمت دھوم تھی۔ ہر طرف سے نعرۂ خوشی بلند تھا۔ لطف جنگ لطف شادی سے دوچند تھا۔ سپہ سالار فوج روم پیٹھ ٹھوکتے جاتے تھے اور افسران نامی گرامی ان کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔

آزاد۔ یہ کیا سبب ہے کہ دفعتاً گولہ اندازی غنیم نے موقوف کر دی، خدا جانے کس فکر میں ہے۔ آج کی تاریخ ۱۹ ردسمبر) یادگار رہے گی۔

کرنل۔ ایسے معرکۂ جنگ کریمیا کے بعد شاذ ہی ہوئے ہونگے۔

آزاد۔ میدان تو غنیم ہی کے ہاتھ رہے گا۔ مگر کوئی فرد بشر دنیا میں ایسا نہیں جو ہمارے سپاہیوں کی نسبت کلمۂ توہین زبان پر لائے۔

یہ سب باتیں ہو رہی تھیں مگر کسی جنرل کو یہ خبر نہ تھی کہ چند ہی روز کے بعد سپہ سالار پلونا اور آزاد پاشا کی جوانمردی اور بسالت ساری خدائی میں ضرب المثل ہو گی اور اخباروں کے کالم ان کی توصیف و تعریف سے مملو اور رطب اللسان ہوں گے۔ چنانچہ اس جنگ کے بعد ہندوستان کے ایک مشہور اخبار میں یہ عبارت درج تھی،

پلونا میں ترکوں کی نہایت آراستہ سپاہ تھی۔ آزاد پاشا کا نام تمام جہان میں ہمیشہ روشن رہے گا اور سارے عالم کے سپہ سالاران افواج میں بہت معزز اور بڑے درجے کے سپہ سالار شمار ہوں گے۔ انھوں نے اپنی فوج قلیل سے روسیوں کی فوج کثیر پر حملہ کیا اور اُن کی جانب نکل جانے کا ارادہ کیا اور ترکوں کی فوج کو فاقہ کشی سے نہایت مجبور ہوگئی تھی اگر اس نے ایک خونخوار حملہ روسیوں پر کیا اور گارد کے سپاہیوں کو اُن مورچوں میں قریب نیست و نابود کر دیا اور ان مورچوں کو فتح کر لیا، مگر یہ فتح عارضی تھی۔ روسیوں کی ایک باڑی ترکوں کے ہاتھ آگئی، اسی سے انھوں نے روسیوں پر گولوں کا مینہ برسایا۔ روسیوں نے زیادہ فوج سے حملہ کیا تو پھر سخت جنگ ہوئی اور کئی گھنٹے تک معرکۂ رزم گرم رہا اور بڑا کشت و خون ہوا۔

آزاد پاشا نے روسیوں کے مورچوں پر یورش کی مورچوں کو فتح کیا اور چند توپیں بھی چھین لیں۔

روسیوں کو تین روز قبل معلوم ہو گیا کہ آزاد پاشا کے پاس رسد بالکل نہیں رہی۔ وہ قلعہ سے نکل کر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یکشنبہ کی شام کو روسیوں کو خبر پہنچی کہ آزاد پاشا اپنی فوج دریائے دودھ پر جمع کرتے ہیں اور رات کو جنرل اسکوبلوف نے اس خبر کی تصدیق کی فکر کی۔ چنانچہ صحیح حقیقت دریافت ہوئی کہ ترکوں نے خاموشی سے کرشنا کے تمام دمدموں اور مورچوں کو کوہ گرین ہل پر چھوڑ دیا اور کل سات بجے صبح کو قدیم اور جدید پل دودھ سے ہو کر جس کو انھوں نے تیار کر لیا تھا اور جو مورچہ روسیوں کی شمالی جانب تھے ان پر حملہ کیا اور شہنشاہی گارد کے سپاہیان کریمیا کو تہ تیغ کر دیا۔

یہ حملہ ترکوں کا بڑے جوش و خروش سے ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا روسیوں پر برق یکایک گر پڑی۔ ترکوں نے اپنے اس حملہ میں کامیابی حاصل کی اور ایک کامل توپ خانہ پر قبضہ کر لیا اور یہاں ترک محاصرہ کی دوسری لین اور سو توپوں کے فیر کے نیچے تھے اور گرینیڈ دلانے ان توپوں کے پھیر لینے کا مصمم ارادہ کر لیا جو اُن کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ بعد اس کے سنگینوں کی لڑائی شروع ہوئی جو پاؤ گھنٹے تک جاری رہی اور جس میں بہت سے آدمی مجروح اور مقتول ہوئے بعد گویا ترکوں کو شکست ہوئی اور وہ پیچھے ہٹ کر دریائے دودھ کی جانب چلے گئے اور روسیوں کی فوج پیدل اور توپ خانوں نے ان کا تعاقب کیا ترکوں نے دریا کے کنارے ایک جائے پناہ قرار دے کر روسیوں کی توپوں کا جواب دیا۔ اور ساڑھے بارہ بجے تک لڑائی رہی۔ اس کے بعد دونوں طرف سے لڑائی ملتوی ہو گئی۔

اب سُنیئے کہ آزاد پاشا فرس خوش عنان پر سوار ہو کر اس قصد سے چلے کہ کسی نہ کسی راستے سے نکل بھاگیں اور اگر ممکن ہو تو کل فوج کو بھگالے جائیں۔ اس وقت ان کی سپاہ قابلِ دید تھی۔

سپہ سالاروں نے ان کو روکا۔ کہا روسیوں کا لشکر قلعہ کو گھیرے چاروں طرف سے محاصرہ کیے ہوئے ہے اور اب باڑھ پر باڑھ پڑ رہی ہے۔ دس پندرہ ہزار کیا معنی اگر ایک لاکھ آدمی اس وقت باہر نکلنا چاہے تو بھی یقین نہیں کہ ایک آدمی تک بچ سکے۔ آگ برس رہی ہے۔

یہ باتیں ہوتی ہی رہی تھیں کہ ایک گولا آن کر پھٹا۔ اور جس مقام پر یہ لوگ مشورہ کر رہے تھے وہیں پھٹا تو بہتر ٹکڑے۔ آزاد پاشا بھی زخمی ہوئے مگر گھوڑے سے نہ اُترے۔

کرنل۔ آہ آہ۔ گھوڑے سے اُتر پڑو بھائی۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔

کپتان۔ ڈاکٹر حاضر ہیں۔ مگر یہ گھوڑے سے تو اُتریں۔

آزاد۔ اب تو آزاد گھوڑے کو نہ چھوڑے گا۔

یا ہاتھ توڑے جائیں گے یا کھولیں گے نقاب
سلطانِ عشق کی یہی فتح و شکست ہے

کرنل۔ ہم لوگ تو یوں بھی آپ کو صلاح نہ دیتے کہ اس آگ میں پھاند پڑیئے اور اب تو اور بھی صلاح نہ دیں گے، یہ مقتضائے مصلحت نہیں۔

مانا کہ اب غلبہ روسیوں ہی کا نظر آتا ہے، مگر عقل سے اب بھی ہاتھ نہ دھونا چاہیئے۔ خدا حافظ و ناصر ہے۔

جنگ کی گرم بازاری تھی۔ گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ تھی۔ سروں کی جھڑی لگی تھی۔ میدان صاف نمونۂ قیامت کبریٰ تھا بلکہ ہنگامۂ رستخیز اور معرکۂ ستیز قیامت کو بھی شرماتا تھا۔ خبر آئی کہ جنرل گوگر بڑا اٹھا کر آئے ہیں کہ کل فوج پلٹنا کر اسی قلعہ میں ذبح کروں گا۔ آزاد اس فقرے پر سخت خشمگین ہوئے اور مارے غصّے کے بدن تھرتھر کانپتا تھا۔

روسیوں نے کوشش موفور کی کہ جس طرح ممکن ہو قلعہ کے اندر داخل ہو جائیں۔ تین گھنٹے تک پچیس ہزار آدمی دیوار کے ایک حصے پر گولے برسایا کیے۔ تین گھنٹے کے بعد دیوار شق ہو گئی۔ دیوار کا شق ہونا تھا کہ سپہ سالار کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور مشورہ ہونے لگا کہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ چلیں۔

سپہ سالار۔ اب ہمارا قدم نہیں ٹھہر سکتا۔ ہمارے نزدیک بھاگ چلنا مناسب ہے۔ ایک دم سے کل فوج دراتی ہوئی نکل پڑے ہرچہ بادا باد۔

آزاد۔ ابھی نہیں ذرا تامل کیجیئے۔ جلدی کیا۔

کرنل۔ اب تامل سے کیا ہوگا یا تو گرفتار ہو جاؤ یا نکل چلو۔ اگر نکل گئے تو فہوالمراد۔ ورنہ اسیر ہو جائیں گے۔ پس مزید برآں نیست۔

آزاد نے دیوار کے اس حصے کی طرف کئی توپیں لگا دیں۔ اور گولہ اندازوں کو حکم دیا کہ گولے اتارنے شروع کرو۔ روسیوں کے چھکے چھوٹ گئے وہ سمجھتے تھے کہ دیوار کے پھٹنے سے ترکی سپاہ مایوس ہو کر صلح کا پیغام دے گی اور لاکھوں ترک گرفتار ہو جائیں گے مگر قضیہ بالعکس نظر آیا۔

اب سنیئے کہ گو اب روسی کسی قدر خود مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن سپہ سالار ترک نے قطعی حکم دے دیا کہ سب فوج بھاگنے کے لیے تیار رہے۔ اسی دم روس کے جاسوسوں نے اپنے لشکر میں یہ خبر پہنچائی کہ سپہ سالار فوج نے آخری حکم دیدیا ہے کہ فوج اور قلعہ روسیوں کے حوالے کر دیا جائے اور ٹھان لی ہے کہ پناہ مانگیں۔ روسیوں نے خوشی کے شادیانے بجائے اور حوصلے بڑھ گئے۔ فوج پیادہ آہستہ آہستہ پل کی جانب بڑھی اور پل پر پہنچ کر چند آدمی بطرق سفیر ترکوں کے پاس بھیجے اور منجانب سپہ سالار ایک خط پیش کیا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ اب تمھاری قضا تمھارے سر پر کھیل رہی ہے۔ کو چہ گریز سب بند ہیں۔ اگر فوج باہر آئی تو گویا اجل کے پنجے میں پھنس گئی اور اگر اندر ہی رہی اور قلعہ ہی سے لڑائی تو تا کجے فاقہ کر کر کے مر جائیں گے اور خاک فائدہ نہ ہوگا۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ ہتھیار رکھ دو اور اطاعت روس قبول کر لو۔ اس کے بعد ایک روسی کرنل ستر آدمیوں کو لے کر پلونا میں آیا اور سپہ سالار سے گفتگو کرنے لگا۔ کہا کہ اب بہتر یہی ہے کہ جہالت سے کام نہ لو۔ آخر کار صلح کی یہ شرطیں روسیوں نے قرار دیں۔

اولاً: کل فوج ہتھیار رکھ دے اور روسی سپاہی وہ ہتھیار اٹھا لے جائیں تاکہ پوری پوری طمانیت ہو کہ آیندہ ترکوں کی جانب سے کوئی شخص فساد نہ کرے گا۔

ثانیاً۔ پلونا خالی کر دیا جائے اور فوج وافسران روس باستثنائے چند اشخاص باغی کے زیر حراست سپاہ روس رہیں۔

ثالثاً۔ باغی آدمی جن کی تعداد دس سے زیادہ نہیں روس کے حوالے کیے جائیں تاکہ ان کی نسبت تحقیقات ہو کر ان کو سزائے مناسب دی جائے۔

رابعاً۔ آزاد پاشا فوراً روسیوں کے حوالے کیے جائیں۔

اس پر سپہ سالار نے کہا کہ شرط سوم محض مہمل اور لچر ہے۔ باغی تو کل فوج ترک ہے اور کوئی بھی نہیں اگر ترکی افسر ہم سے خلاف ہو کر روسیوں کا جنبہ کریں تو وہ ہمارے نزدیک باغی قرار پا سکتے ہیں قس علیٰ ہذا اگر روس کی فوج روسیوں سے بگڑ جائے تو روسی اس فوج کو باغی کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے ترک روسیوں کے نزدیک باغی نہیں ہو سکتے۔ ہم غنیم ہیں۔ غنیم اور باغی میں فرق ہے۔ علاوہ بریں یہ ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا کہ آزاد پاشا سے جوانمرد اور شیر دل افسر کو ہم روسیوں کے حوالہ کر دیں اور روسی ان کو سیبیریا کے برفستان میں چھوڑیں۔ ہاں پلونا خالی کر دیا جائے گا اور ہتھیار فوراً رکھ دیے جائیں گے۔

روسی۔ یہ شرطیں ہم قبول نہیں کرتے۔ مابخیر و شما بہ سلامت۔

ترک۔ اب ہم ہتھیار بھی نہ رکھیں گے۔ یا قسمت یا نصیب یا بخت۔

روسی روانہ ہوا اور میدان جنگ پھر بدستور قائم۔ تھوڑی دیر میں جب ترکوں نے دیکھا کہ میدان اب ہاتھ سے جاتا ہے تو بکمال جوانمردی و شجاعت عزم بالجزم کر لیا کہ کسی راستے سے نکل چلیں۔ آزاد پاشا نے اس رائے سے اتفاق کر لیا۔

فوج کے نکلتے ہی روسی لشکر ٹوٹ پڑا۔ اس وقت کی لڑائی کا حال کہنا آسان نہیں ہے۔ ادھر روم کے یلان تامدار ادھر روس کے جوانان آزمودہ کار۔ یہ رو‌ئیں تن وہ صف شکن۔

اس طرح سے لڑائی ہوتی تھی کہ الامان الامان۔ یوں تو طرفین کے جوانان ہیلتن جان پر کھیل گئے مگر آزاد پاشا کی شمشیر خارا شگاف و الماس بار ستم ڈھاتی تھی سروں پر سر گراتی تھی۔ غنیم کو دم کے دم میں نیچا دکھاتی تھی۔

آزاد کا زخم ڈاکٹروں نے دیکھا اور ان کو صلاح دی کہ آرام کریں۔ اس پر آزاد نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ اب آرام گور میں ہوگا۔ آرام کہاں۔

سچ ہے تو یہ ہے اور خیال ہے تو یہ ہے کہ حوریں پرسا دینے آئیں گی اور وہ چشم پُرنم سے خون کے دریا بہائیں گی۔ ڈاکٹروں نے لاکھ سمجھایا مگر آزاد بھلا کب ماننے والے تھے اور مانتے کیوں کہ غنیم کا لشکر جرار سر پر کھڑا تھا۔ اب قلعے میں داخل ہوا اور اب داخل ہوا۔

ڈاکٹروں نے پٹی باندھی اور عجلت میں جو کچھ کارروائی کر سکتے تھے۔ وہ کی گئی آزاد پاشا کو بہت اچھی سوجھی تھی۔ اگر زخم کو دیکھ سکتے اور زخم کا خیال کرتے تو کارروائی نہ ہو سکتی۔

آزاد پکارتے جاتے تھے کہ ہاں شیرو خبردار! قدم آگے ہی پڑے پیچھے نہ ہٹے۔ در فردوس اس وقت غازیان دین کے لیے وا ہیں۔ حوران بہشتی جام شراب لیے منتظر کھڑی ہیں۔ ہاں غلامان ساقی کوثر بڑھے ہوئے۔ گو خود اور زرہ اکثروں نے زیب بردسر کیا تھا مگر قضا سے کوئی کہاں بھاگ سکتا تھا۔

اب سنیئے کہ روسیوں نے ایک سمت کی فوج تھوڑے فاصلے پر ہٹا کر چاہا کہ ترکی سپاہ اس راستے سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے تو دھوکا دیکر گرفتار کریں کیونکہ سپاہ روس تھوڑے فاصلے پر کمین گاہ میں غنیم کے یورش کی منتظر تھی۔

کرنل۔ ہمارے نزدیک اس راہ سے نکل جانے کی کوشش لازم ہے۔

آزاد۔ ہرگز نہیں خوب غور کیجیے فضول بات ہے۔

سپہ سالار۔ بیشک اس طرف سے نکل سکتے ہیں۔

آزاد نے اس امر پر بڑی بحث کی اور کہا کہ ایسے نازک وقت میں جبکہ ہماری فوج چوطرفہ سے محصور ہے روسی بلا وجہ اپنے حصہ لشکر کو جو ایک کونا گھیرے ہوئے تھا کیوں ہٹا دیتے۔ اس سے پُر ظاہر ہے کہ وہ کمینگاہ میں فوج لے گئے ہیں لہذا بے سمجھے بوجھے دلیری کرنا دلیل حماقت ہے۔ نشان بالغ خردی نہیں۔ اس پر بہت عرصے تک مشورہ رہا۔

کرنل۔ اچھا پچاس ساٹھ آدمی جان پر کھیل جائیں تو نتیجہ نکلے۔ فوراً دریافت ہو جائے کہ کمین گاہ میں ہیں یا عمداً کسی سبب سے ہٹ گئے ہیں۔

آزاد۔ ہم سب سے پہلے جانے کو آمادہ ہیں۔

اسپلیٹن۔ اگر آزاد جائیں گے تو ہم بھی جائیں گے۔

آزاد اور اسپلیٹن اور کئی سواروں نے اس موقع پر بیڑا اٹھا لیا کہ دڑاتے ہوئے چلے جائیں گے اور خبر لائیں گے۔

اب سنیئے کہ درویشان بلغارستان کا بھیس بدل کر آزاد پاشا چلے۔ اسپلیٹن کو اپنے ہمراہ لیا ان کو مرید بنایا خود مرشد بنے بلغارستان کے جنوب میں ایک گروہ درویشوں کا ہے یہ لوگ نہ عیسائی ہیں نہ مسلمان۔ ان کو روسی بھی مانتے ہیں اور ترکی بھی ان کے خلاف نہیں۔ یہ لوگ مسلک صلح کل کے سالک ہیں۔ اس قطعے سے حضرت آزاد پاشا چلے اور اسپلیٹن کو ساتھ لیا۔

آزاد۔ عربی کے اشعار گاتے چلو۔

اسپلیٹن۔ اب چپ چاپ چلے چلو ایسا نہ ہو کہ زیادہ بننے میں کھل جائے ہر پہلو پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ ایک پہلو پر نظر ڈالی اور خاموش ہو رہے۔ اس میں دھر لیے جاؤ گے۔

ادھر کا حال سنیئے کہ عثمان پاشا نے تدبیر کی کہ تین طرف سے خفیف سا حملہ کیا۔ ایک طرف رومانیا کی فوج کی طرف مقام اوپنس پر جو شمال و جنوب کے کونے میں تھا حملہ کیا اور دوسری جانب جنرل کرگو کے کالم پر اور خود بہت زبردست سپاہی لے کر مقام سترولول پر

حملہ آور ہونے کے لیے مستعد ہوئے۔ اس مورچے سے ان دو سڑکوں کی کمان ہو سکتی ہے جو صوفیہ اور ودن میں آکر ملی ہیں۔
اس جنگ کا خاتمہ محال تھا۔ دیر تک گرماگرمی سے جنگ ہوتی رہی اور عرصے تک دونوں فریق برابر رہے۔ معلوم نہیں تھا کہ کس کی فتح ہوگی۔ پہلے ہی دھاوا کر دیا۔ یہ مورچہ دس بجے سے شروع ہوا۔ اس وقت بہ نسبت ترکوں کے روسیوں کے سپاہی بہت کام آ چکے تھے۔ ترک اس خوبصورتی سے لڑتے تھے کہ غنیم زک پر زک پاتا تھا۔ ترکوں کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا اور عطوفت پاشا انواع و اقسام کی باتوں اور ترغیب دلانے والی نصیحتوں سے اور بھی ان کا دل بڑھاتے تھے اور ترکی نعرے پر نعرے بلند کرتے تھے۔
روسیوں نے ترکوں کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ اور گو اُن کے آدمی بہت کام آئے مگر مجبور ہو کر ترکوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس پر ترکوں کے دل چھوٹے پڑ گئے اور دوسری بار پھر حملہ کیا۔ اس حملہ میں بھی کئی ہزار روسی کام آئے۔ ترکوں کا اب کی پھر کم نقصان ہوا۔ مگر روسیوں نے اس جرأت کے ساتھ مورچہ پکڑا کہ گو آدمیوں پر آدمی گرتے جاتے تھے مگر ترکوں کو آگے نہ بڑھنے دیا اور مجبور ہو کر ان کو پھر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اب انھوں نے عزم بالجزم کر لیا کہ تیسرے حملہ میں قدم پیچھے نہ ہٹائیں روسیوں کو سخت مشکل پڑی۔ اگر ان آدمیوں میں سے کسی کو بلائیں تو ادھر ضعف ہو جائے گا۔ اور بغیر مدد کے اب کام چلنا محال ہے۔ لہٰذا سپہ سالار افواج روس سے مشورہ کیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ دس ہزار آدمی اس فوج کی کمک کو جائے مگر یہ معدودے چند اس قابل نہ تھے کہ کافی مدد دے سکتے۔ ترکوں نے اتنی مرتبہ حملہ کر کے ناکامی حاصل کی تو بہت گھبرائے۔ مگر عطوفت پاشا نے ان کو دلاسا دیا۔
اب آزاد کا حال سنیئے کہ یہ درویشانہ بھیس میں اپلیٹن پاشا کو ہمراہ لیے ہوئے چلے جاتے تھے کہ ایک رسالہ روس نے ان کو روکا۔
پوچھا تم کون ہو اور کہاں جاتے ہو؟
آزاد۔ درویش۔ بلغارستان کے شمال میں ایک مقام ہے روپول۔ ہم وہاں کے باشندے ہیں۔
روسی۔ اور ہم کو شک گذرتا ہے کہ تم جاسوس ہو!
آزاد۔ شک گذرتا ہے تو ہم کو گرفتار کرو۔
روسی۔ اور نہیں کیا چھوڑ بھی دیں گے؟
آزاد۔ ﷲ کی ہ

اے بتو ظلم تمھارے نہیں کیا کیا دیکھے سچ ہے اللہ جو دکھلائے وہ بندہ دیکھے
یار ہنستا ہے مری آہ شرر افشاں پر گھر کسی کا جلے اور کوئی تماشا دیکھے

آزاد پاشا نے اپنی گفتگو اور بے پروائی سے ثابت کر دیا کہ ترکوں سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ روسیوں کو یقین ہو گیا کہ آزاد درویش ہیں۔ روسیوں کے دشمن نہ ترکوں کے دوست۔ لہٰذا ان کو رہا کر دیا۔ اور ان کے ساتھ اپلیٹن پاشا بھی رہا ہو گئے۔ آزاد کو اس فوج کا حال مطلق نہ معلوم ہوا جو قلعے کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ ہر چند انھوں نے بڑی کوشش کی کہ اس فوج کا حال دریافت کریں مگر بے سود۔ آخر کار مجبور ہو کر ان کو واپس آنا پڑا۔ قلعے میں سب کو پورا پورا یقین تھا کہ آزاد پاشا زندہ نہ بچیں گے۔ روسی ان کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالیں گے یا سیبریا کے برفستان کو بھیج دیں گے۔ جب اس قدر عرصے کے بعد آزاد پاشا اپلیٹن پاشا کو ہمراہ لے کر قلعے میں مع الخیر داخل ہوئے تو ترکوں نے سخت استعجاب کیا۔ حیرت ہوئی کہ ایسے نازک وقت میں ترکوں کے جاسوس کو روسیوں نے کیونکر رہا کر دیا۔ آزاد پاشا نے افسوس کے ساتھ بیان کیا کہ جس کام کے لیے گئے تھے وہ پورا نہ ہوا۔ آرزو نہ بر آئی۔ دل کی دل ہی میں رہی۔ سپہ سالار نے حسرت کے ساتھ کہا کہ اب رسد بالکل نہیں۔ فاقہ سر پر سوار ہے۔ دانے دانے کو ترستے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے لڑائی موقوف رہی تو آزاد پاشا کو ایک شخص نے کئی اخبار دیے

آزاد نے پڑھے۔

"اگرچہ روسیوں نے ترک کو ظالم قرار دیا ہے اور ان کی تعدی اور زیادتی کا بڑا شور و غل مچایا ہے اور ان پر اس کا اتہام لگایا کہ وہ عیسائی رعایا کے ساتھ بہت سخت گیری کرتے ہیں اور حاکم کو جو اپنے محکوم کی خبر گیری اور خیر اندیشی چاہیے اس سے سراپا پہلو تہی کرتے ہیں اور اپنے فرض کے ادا کرنے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں مگر حالات ماضیہ اور واقعات زمانہ اور حال اُس کے خلاف پر شاہد عادل ہیں۔ ایک مدت سے اس بارہ میں خوب خوب مباحثے ہو چکے ہیں جس سے ترک کا علم اور انصاف پسند اور رحمدل ہونا کامل طور پر ثابت ہو چکا ہے مباحثات زمانہ ماضیہ کا ذکر کرنا محض بے سود ہے۔ مگر میں اب وہ تین باتیں جو بالفعل اخباروں میں نظر سے گزریں اُن کو تمثیلاً لکھتا ہوں۔"

ایک دوست نے ان کو ذیل کا فقرہ سنایا:-

"اخبار لنڈن ٹائمز میں لکھا ہے کہ ایک اخبار قسطنطنیہ کا آرمینا نامی اس لیے بند کر دیا گیا کہ اس میں برخلاف عیسائیوں کے آرٹیکل لکھے تھے اس خبر سے معلوم ہوا کہ ترک جنبہ داری کے عیب سے بالکل پاک ہیں اور عیسائیوں کی رفاہ اور خیر اندیشی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے۔ اخبار کے واسطے اس سے بڑھ کر اور کوئی سزا نہیں کہ بند کر دیا جائے۔ اس میں اخبار کی بڑی ہتک اور بے آبروئی ہے۔ بڑے غضب کی بات ہے کہ حاکم اپنے محکوم پر اس قدر شفقت کرے اور اس کے ساتھ بکمال نرمی اور رعایت پیش آئے اور رعایا اس درجہ ناحق شناس اور احسان فراموش ہو اور اپنے مُربی اور محسن کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئے۔

گورنمنٹ ترک میں جس قدر یہود کو آرام حاصل ہے سوائے گورنمنٹ انگلستان کے اور کسی سلطنت میں ان کو آسائش حاصل نہیں۔ اگر ترک میں تعصب مذہبی ہوتا تو یہود کو ان کی سلطنت میں اس قدر آرام کیوں کر حاصل ہوتا۔ جو لوگ دین اسلام سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ دین اسلام اور مذہب عیسوی میں بہ نسبت مذہب اسلام اور ملت موسوی کے فرق بہت کم ہے۔ قرآن مجید میں یہود کے حق میں بہت سے کلمات سخت موجود ہیں اور عیسائیوں کی نسبت بہت سے فقرات مدحیہ ثبت ہیں۔ اہل اسلام اور عیسائیوں میں بہت کچھ ارتباط و اتحاد رہا ہے مگر اسلام اور یہود میں ایسا اختلاط کمتر پایا جاتا ہے۔ با ایں ہمہ یہودیوں کو ترک کی عملداری میں بخوبی آرام و آسایش حاصل ہے، حتیٰ کہ ایک بہت بڑے پیشوائے یہود متوطن آرمینیا سلطان کے حضور میں بعد ابتدائے جنگ کے گئے تھے اور ان کی سرسبزی کے واسطے بہت دعائیں کی تھیں جس صورت میں یہود کو ترک کی عملداری میں اس قدر آرام ہو پھر کیوں کر خیال کیا جا سکتا ہے۔ کہ عیسائی رعایا سے ترک کو جو بہ نسبت یہود کے بہت زیادہ اتحاد رکھتے تھے ان کی سلطنت میں تکلیف پہنچی ہو۔"

۱۰ دسمبر ۱۸۷۷ء کو جنگ عظیم ہوئی اور ایک ایک منٹ میں ہزاروں کا خون بہنے لگا۔ ترکوں کے پاس جس قدر مصالحہ تھا سب اس جنگ کے نذر کیا۔ تین طرف سے محاصرہ توڑ کر نکلنے کی کوشش کی دور تک توپوں اور گولوں کی آواز جاتی تھی ایک طرف سے سپہ سالار گئے دوسری جانب ایک اور پاشا تیسری سمت آزاد فرخ نہاد۔ وہ دونوں تو بعد جنگ گرفتار ہو گئے مگر آزاد پاشا نے چھ گھنٹہ تک دس ہزار آدمیوں سے اٹھہتر ہزار آدمیوں کا مقابلہ کیا اور اس جوانمردی اور لیاقت کے ساتھ کہ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

جب دست بدست لڑائی ختم ہوئی تو آزاد نے اور بھی جوہر دکھائے اور دو ہزار آدمی لیکر صاف نکل آئے۔ یہاں سے آزاد پاشا مع فوج مارا مار روانہ ہوئے بعد دقت کمال و خرابی بصد خدا خدا کر کے قسطنطنیہ داخل ہوئے۔ حضرت سلطان المعظم نے ان کو یاد فرمایا۔ سلام ہوا تلوار دکھائی۔ حضور ظل سبحانی نے ان کی شمشیر گلو نواز کو چوم لیا اور دیر تک ان کی تعریف کیا کیے۔

دوسرے روز حکم ہوا کہ آزاد پاشا کو اعلیٰ درجہ کا تمغائے مجیدی عطا ہو اور حضور خلیفۃ الرحمانی نے اپنے دست مبارک سے ایک چرم پر پروانہ خوشنودی مزاج لکھ دیا۔ آزاد سے اقرار کیا کہ بدولت و اقبال تم کو بہت جلد عہدۂ وزارت عطا کریں گے۔ اس خبر سے

اور وندا کے کانوں سینہ میں نائرۂ حسد مشتعل ہوا اور اسی دن سے حضرت ظلِ سبحانی کو اُن کی طرف سے بددماغ کر دیا۔

جس گلی کوچے سڑک بازار کی طرف آزاد نکل جاتے تھے زن و مرد سب جھک جھک کے آداب بجا لاتے تھے۔ مختلف اخباروں میں مختلف روایتیں درج ہوئیں اور ہر پرچہ اُن کی توصیف سے مالا مال تھا۔

اب سنئے کہ جس روز آزاد پاشا داخلِ قسطنطنیہ ہوئے تو سب کے پہلے ہرمزجی بھائی کی کوٹھی پر آئے۔ یہاں گھوڑے سے اُتر رہے تھے کہ یہ آواز اُن کے کان میں آئی (کھلا گیدی جاتا کہاں ہے نکالوں قرولی) آزاد نے کہا (جانے دینا جانے دینا) آزاد کی آواز سن کر خوجی بے قرار ہوگئے کمرے سے باہر آئے اور آتے ہی قدموں پر ٹوپی رکھ کر کہا۔ خدا گواہ ہے اس وقت جو مانگتا وہ مل جاتا ابھی کہتا تھا کہ خدا کرے آزاد آجائیں۔ خدا نے منہ مانگی مراد دی۔

آزاد۔ مِیڈا کہاں ہیں؟

خوجی۔ آگئیں۔ اپنے گھر پر خوش و خرم ہیں۔

آزاد۔ الحمدللہ۔ الحمدللہ اور بھی کوئی ہے ساتھ؟

خوجی۔ ہاں مگر اس پر نظر نہ ڈالیے گا۔ اس جانب کے دَورے پڑتے ہیں۔

آزاد۔ واللہ یہ کیسے!

خوجی۔ ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے کہ آزاد بھاوج بھی تجویز کر لائے ؎

ہوا ہے یار جو سیرِ چمن میں ساتھ اپنے   کبھی گل کی طرف دیکھا ہے گاہے روئے خنداں کو

آزاد۔ او ہو ہو۔ مدت کے بعد برجستہ شعر آپ سے سُنا۔

خوجی۔ اب یہاں سے چلو بھائی!

آزاد۔ اس پری کے ساتھ شادی تو کرلو۔

خوجی۔ ابھی شادی جہاز پر ہو رہے گی۔

آزاد۔ ہرمزجی بھائی کو اطلاع دو اور بلاؤ۔

خواجہ بدیع دوڑ کر ہرمزجی کو لائے۔ ہرمزجی اور آزاد گلے ملے۔ فوراً آدمی بھیجا کہ مس مِیڈا اور مس کلیرسا کو اطلاع دی جائے۔ یہ مژدۂ روح افزا سنتے ہی دونوں پریاں اُچھل پڑیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر چلیں آزاد کو دیکھا تو اِدھر ان کی اُدھر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ مس کلیرسا سے مصافحہ کیا۔ مِیڈا کو دیکھ کر فرطِ طرب سے آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

مِیڈا۔ شکر خدا کا ہزار شکر خدا کا۔

کلیرسا۔ یہ کس کو امید تھی کہ آزاد صحیح و سالم آئیں گے۔

مِیڈا۔ خدا نے بڑا فضل کیا۔ یہاں تمھاری بڑی دھوم ہے۔ ہر صبح کو اخباروں میں تمھاری تعریف پڑھتی ہوں۔ بڑا نام پیدا کیا۔

ہرمزجی۔ جنگ کا حال تو مفصل بیان کیجیے۔

آزاد۔ ایک طومار ہے دفتر ہے گو تعلی کی لینا میری وضع کے خلاف ہے مگر صحیح عرض کرتا ہوں کہ اتنے افسروں میں آپ کے خادم کا نقطۂ مقابل ایک بھی نہ تھا۔ ہاں عطوفت پاشا اور اپلیٹن پاشا البتہ بڑے سپاہی ہیں اور سپہ سالار[1] نے بھی کار نمایاں کیا۔ جرأت

---

[1] مراد ہے عثمان پاشا سے۔

گرفتار ہو کر حضرت زار کے روبرو لوگ ان کو لے گئے اس وقت جتنے افسران فوجی زار کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے ان کی توقیر و تعظیم کی اور نعرہ بلند کیا۔ شاباش پاشا شاباش مرحبا مرحبا۔ ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

ہرمزجی۔ یہ شکست بھی بمنزلہ فتح ہے۔

آزاد۔ اس میں کیا فرق ہے مگر اب روسیوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔

ہرمزجی۔ اب کام تمام ہو گیا۔ صلح ہو جائے گی۔

مَیڈا۔ گو ترکوں نے شکست پائی مگر تم تو فتحیاب ہوئے۔

ہرمزجی۔ انھوں نے ایک چاندسی بیوی پائی ایک چاندسی بیوی۔ ہندوستان میں ان کی چاندی ہے۔ چین ہی چین لکھا ہے۔

آزاد۔ دل لگی نہیں ہے ریاض[1] کیا ہے جان لڑائی ہے۔

خوجی۔ ہونہہ۔ ہرمزجی کو ابھی بسنت کی خبر ہی نہیں ہے۔

ہرمزجی۔ پھر آج تو جلسہ ہو

شراب سُرخ کا ساغر چلے ساقی لب جُو پر ❊ چمن سرسبز ہے باران رحمت کے تفضل سے

مَیڈا۔ آج ہم تمھارے ساتھ ناچیں گے۔

آزاد۔ معقول۔ رقص کی تعلیم میں نے نہیں پائی ہے۔

کلیرسا۔ ہم تو سکھا دیں گے۔

خوجی۔ این چہ گفتگو کردہ شدہ اینکہ رمش میم سین زیر سین و کاف لام رے بے سین الف ہست از شما چرا سخن ہائے التفات می نماید بگوید و تو روبرو۔

آزاد۔ لو بھئی اب تو خوب فارسی بولنے لگے۔

خوجی۔ بولتے آپ ہونگے اور (اب ترچہ معنی دارد) ابھی کب نہیں بولتے تھے۔

آزاد۔ تو مس کلیرسا آپ کے پسند آگئیں؟

خوجی۔ واللہ اس قابل ہے کہ ہر صبح کو اس کا سجدہ کرے۔ زلف دوتا بیار رشل مارست و سیاہ است و بلا ہست۔

خدا محفوظ رکھے دل کو اس افعی کاکل سے ❊ نہیں ممکن سلامت چھوٹنا موذی کے چنگل سے

آزاد۔ یار ہم سے تم سے اب نہ بنے گی۔ بس بگڑ جائے گی۔ اگر تم ڈورے ڈالو گے تو ہماری دال نہ گلے گی۔

مس مَیڈا اس درجہ محظوظ و مسرور تھیں کہ جامے میں پھولے نہیں سماتی تھیں باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ باتیں ہوتے اس کمرے سے دوسرے کمرے میں گئیں اور وہاں آزاد کو بلایا۔ آزاد نے جاتے ہی لب لعل شکرخا کا بوسہ لیا اور مس مَیڈا نے اس بوسے کا جواب دیا۔ اس کے بعد پھر دیر تک بوس وکنار رہا۔ خوجی ادھر مس کلیرسا سے محبت اور الفت کی باتیں کرتے تھے۔

خوجی۔ ہمارا قاعدہ ہے کہ خوبصورت عورت دیکھی اور ریجھ گئے۔

مس کلیرسا۔ یہ قاعدہ ایک دن جوتے کھلوائیگا۔

خوجی۔ بہت کھائے بس اب زنگ جم گیا۔

---

[1] ریاض کرنا = مشقت کرنا۔ محنت کرنا۔

مس کلیرسا۔ تم خدمتگار ہو کے ہم سے مقابلہ کرتے ہو۔

خوجی۔ جانِ من! غلام خدمتگار نہیں۔ آزاد مجھ ہی بدبخت کا لڑکا ہے۔ میرا نام اس لڑکے نے روشن کیا۔

تین دن تک آزاد پاشا قسطنطنیہ میں رہے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ طور بے طور ہو گیا اور سلطان المعظم کا ان کے ساتھ بکمال اعزاز اور ملاطفت پیش آنا کل ارکین کے دلوں کا نشتر ہو گیا تمام وکمال پاشاؤں نے بمقتضائے رشک وحسد ان کی طرف سے حضرت ظل سبحانی کے سامعہ مبارک کچھ ایسی باتوں سے بھر دیئے کریا تو حضرت ظل سبحانی کے آزاد کی نسبت وہ خیالات تھے کہ خود ان کو طلب کیا تھا اور جب انھوں نے حسب معمول تلوار دکھائی تھی تو حضرت ظل سبحانی نے ان کی شمشیر گلو نواز کو بوسہ دیا تھا اور دیر تک بہ نفس نفیس ان کی تعریف اور مدح کے کلمات سے بحکم کمال خوشنودی مزاج عالی رطب اللسان رہے تھے اور یوں حکم عالی نافذ ہوا تھا کہ آزاد پاشا کو اعلیٰ درجہ کا تمغائے مجیدی عطا کیا جائے اور خود حضرت خلیفۃ الرحمانی نے اپنے دست مبارک سے ایک چرمی کاغذ پر سجل خوشنودی مزاج عالی ان کو لکھ کر مرحمت فرمایا تھا اور مزید براں بالمواجہ یوں ارشاد ہوا تھا کہ انشاء اللہ تعالیٰ مابدولت واقبال تم کو بہت جلد منصب جلیلہ وزارت عطا فرمائیں گے اور یا بالکل قضیہ بالعکس ہو گیا بمقتضائے کمال حزم و احتیاط اُنھوں نے قسطنطنیہ کے کوچ و مقام کے ہر نیک و بد پہلو کی نسبت نہایت درجہ مدبرانہ فکر و تامل کر کے یہی مناسب جانا کہ اب اعادہ وطن ہی اولیٰ ہے اس لیے کہ لاکھ کچھ ہو پھر میں اس ملک اور اس ملک والوں کا بیگانہ ہوں اور اگر جس قدر مدت اس ملک میں میرے قیام کو گذری ہے اس کی دوچند مدت بھی اور قیام کروں تو بھی غیر ملک کا آدمی سمجھا جاؤں گا اور قطع نظر اس کے جس قدر اعزاز و اکرام اور توقیر و وقار حضرت ظل سبحانی نے ترکوں کے مقابلہ میں مجھے عطا فرمایا اگر میں بے انصاف اور معجب نہ بنوں تو یہ بھی مافوق میرے مرتبہ کے ہے اب ایسا نہ ہو کہ حاسدوں کی آتش حسد کے بجھانے کی کوشش میں موجود اور محفوظ متاع اعزاز و اکرام میں کوئی شعلہ آ لگے تو پھر سوائے ندامت اور افسوس کے کوئی نتیجہ نہ ہو اور برسوں کی جانفشانی اور جانبازی کے بعد جو اعزاز حاصل ہوا ہے اس میں بھی خدانخواستہ کوئی امر خلاف پیش آ جائے تو حاسدوں کی عید ہو جائے اور دوستوں کے لیے ردح کا تحفہ بجز افسردگی و پژمردگی کے میں کچھ بھی نہ لے جا سکوں۔

بالجملہ ان سب امور کا خیال کر کے ہر مزجی کی صلاح سے آزاد پاشا نے عزم سفر ہندوستان مصمم کر لیا اور چونکہ آزاد پاشا کو محبت روم کی دلی اور سچی تھی باایں ہمہ اندیشہ ناکی بھی چلتے چلتے کئی بار چاہا کہ کسی طرح ایک مرتبہ پھر باریابی دربار سلطان المعظم سے شرف اندوز ہوں۔ مگر رخنہ اندازوں کی رخنہ اندازی کی وجہ سے اپنے اس ارادہ میں ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۱۲ر دسمبر ۱۸۸۳ء کو مع خواجہ بدلیعا اور مس ئیڈا اور مس کلیرسا جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہندوستان ہوئے۔

آزاد پاشا وطن روانہ ہوئے

نُور کے تڑکے جہاز روانہ ہُوا۔ آزاد پاشا اور ان کے ہمراہیوں نے اپنے احباب اولوالالباب کو جو ساحل بحر سے ان مسافران راہ دُور و دراز کو دیکھ رہے تھے اشاروں سے سلام کیا اور جہاز کا لنگر کھولا گیا۔ جب تک جہاز والوں کو ساحل اور ساحل والوں کو جہاز نظر آیا حسرت اور حیرت سے دیکھا کیے اور جب جہاز نظر سے اوجھل ہُوا تو لوگوں نے دعا مانگی کہ بار خدایا جہاز آسانی اور لطف کے ساتھ داخل منزلِ مقصود ہو۔ مس میڈا کے دل کا عجب حال تھا۔ گورے گورے گالوں کی رنگت متغیر ہوئی جاتی تھی۔ کبھی باپ بھائی کبھی ماں بہن یاد آتی تھی۔ مس کلیرسا کے عارض گلرنگ پر قطرہ ہائے اشک اس طرح جھلکتے تھے جیسے برگ گل پر شبنم۔ ساحل بحر کی طرف بصد حسرت نظر ڈالتی اور باوصف کوشش ضبط آنسو ٹپ ٹپ نکل پڑے۔ خواجہ بدیع الزمان کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ مبارک باد کی غزلیں یاد آتی تھیں۔ مگر کلیرسا اور میڈا کے خیال ادب سے ٹال جاتے تھے۔ دل ہی دل میں مزے اڑاتے تھے بغلیں بجاتے تھے آزاد پاشا کو اس درجہ خوشی کہ جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ ہر سمت حسن آرا ہی نظر آتی تھی۔ ہر گوشے سے مسرت و شادمانی فتح و کامرانی ہی جلوہ دکھاتی تھی۔

اسی اثنا میں ایک ہندی نے آزاد پاشا کو سلام کیا اور اُردو میں ہمکلام ہُوا۔ پوچھا آزاد پاشا حضور ہی کا اسم مبارک ہے؟ خوجی نے گردن ہلا کر کہا ہاں یہی ہمارے آزاد ہیں جنھوں نے جنگ کے میدان میں سب کو نیچا دکھایا۔

نیام ہے تیغ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستین کا

آزاد نے مصافحہ کر کے ان سے دریافت کیا کہ آپ کا اسم شریف، دولت خانہ کہاں ہے۔ فرمایا خاکسار کو محمد مہدی کہتے ہیں اور غریب خانہ ایک بستی ہے بجنور۔ لکھنو کے پاس بس مضافات لکھنؤ سمجھیے وہیں غریب خانہ ہے۔ آپ کی تعریف اکثر اخباروں میں نظر سے گذری جی خوش ہو گیا۔ بندہ پرسوں استنبول میں ایک ضروری کام کے لیے داخل ہُوا تھا اور آج روانہ ہوا۔ قیام اکثر بمبئی میں رہتا ہے۔ بیس سال میں ایک مرتبہ وطن ضرور جاتا ہوں اور دو تین مہینے رہ کر پھر واپس آتا ہوں۔ آزاد بولے کہا حضرت میری نسبت جو کلماتِ توصیف، آپ نے بیان کیے ان کا تہ دل سے مشکور ہوں مگر ان کو میں حضور کی ذاتی لیاقت اور حسن عقیدت پر محمول کرتا ہوں۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ کہیے وطن میں تو خیریت ہے۔

محمد مہدی نے کہا۔ جی ہاں فضل الٰہی ہے، مگر ایک حادثۂ نادیدنی اور سانحۂ ناشنیدنی سے ستم بپا ہو گیا۔

یہ کہہ کر محمد مہدی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آزاد اور خوجی کو حیرت ہوئی کہ یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ آہستہ سے دریافت کیا خیریت تو ہے۔ اس وقت خلجان پیدا ہو گیا۔ خدا ہی خیر کرے۔ مہدی نے بادلِ سرد و آہِ پُر درد یوں بیان کیا۔ آپ نے مرزا ہمایوں فر بہادر کا نام سنا ہوگا۔ مشہور و معروف شہزادے تھے۔

آزاد۔ ہاں ہاں۔ شہزادے فر! شہزادہ ہمایوں فر بہادر——!

خوجی۔ مجھ سے سنیئے خورشید لقا بیگم کے حقیقی بھائی ——! ہمارے ملک کے شہزادوں میں بس وہی تو ایک ہیں۔ اور ہے کون۔ ہاں پھر ان کو کیا ہُوا وہ تو ہمارے آقا اور مربی ہیں۔ ہنس مکھ، خنداں پیشانی، خوبرو۔ ذی مروت، عالم خوش بیان۔ شہزادوں

میں فرد ہیں۔

محمد مہدی۔ اُن کی نسبت ایک نواب زادی سے قرار پائی جس نے سُنا خوش ہوا کہ دولہا دولہن چندے آفتاب چندے مہتاب۔ خدا نے اپنے ہاتھ سے جوڑی بنائی ہے۔ اب سنیئے کہ شادی کے روز وہ دھوم دھام اور وہ اژدہام تھا کہ بیان سے خارج ہے مگر عین گھڑیال میں غلہ لگا۔ نوشہ سمند صرصر تک پر سوار ہو کر جاتا تھا کہ عین برات میں ایک شقی نے تلا ہوا ہاتھ دیا اور سرتن سے جُدا ہو گیا کھٹ سے الگ۔

آزاد۔ ارے! آہ آہ!! ہے ہے توبہ توبہ!!! معاذ اللہ۔

خوجی۔ (سر پیٹ کر) افسوس صد افسوس۔ ہائے ستم وائے ستم۔

آزاد۔ اس وقت بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُوہ ایسا سانحہ جگردوز پہلے کبھی نہیں سُنا تھا۔

محمد مہدی۔ ابھی آپ نے سُنا کیا ہے۔ اے جناب دولہن لاشے پر آئی۔ مہندی لگی ہوئی۔ سر تا پا نور رشک پری مجوبہ اُف ہائے ہائے ستم ہو گیا۔

آزاد۔ للہ اب تذکرہ نہ کیجیے۔ کیوں صاحب اس وقت اس بیچاری کا کیا حال ہوگا۔ ہائیں نام آپ کو معلوم ہے؟ — بیگم صاحب کا کیا نام ہے لڑکی کس کی بیٹی ہے کس محلے میں مکان ہے؟

محمد مہدی۔ دولہن کا نام تو یاد نہیں مگر اس قدر جانتا ہوں کہ بڑی بیگم کی صاحبزادی ہیں۔ شہر سے دو کوس پر مکان ہے۔

آزاد۔ (کان کھڑے کر کے) کیا! کس کی!! کس کی صاحبزادی ہیں؟

محمد مہدی۔ شہر سے دو کوس کے فاصلے پر ایک بیگم صاحب رہتی ہیں۔ بڑی بیگم ان کا نام ہے اور دو لڑکیاں ہیں، ہیں تو پوتیاں مگر لڑکیاں ہی مشہور ہیں۔

آزاد اور خوجی دونوں کو شک کے عوض یقین تھا کہ حسن آرا بیگم اپنے قول سے پھر گئیں۔ آزاد اپنے دل کو ڈھارس دیتے تھے مگر بے سود۔

خوجی۔ اس قدر تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا جانے کس کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلے دریافت تو کر لیجیے مفصل حال تو سن لیجیے۔

آزاد۔ اب کچھ باقی بھی رہ گیا ہے۔ بڑی بیگم کا نام آہی گیا۔ حسن آرا بیگم اور سپہر آرا بیگم کا نام نہیں آیا وہ بھی سن لیجیے گا۔

خوجی۔ بھائی جان! چاہے کوئی مار ڈالے ہمیں یقین نہ آئے گا کہ حسن آرا بیگم تمہارے خلاف ہو جائیں اور اپنے قول سے پھر جائیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ تمہارے دل میں ایسا خیال پیدا کیونکر ہوا۔

آزاد۔ ہے تو ایسا ہی مگر عورت پھر عورت ہی ہے۔ کچھ اعتبار نہیں۔

خوجی۔ بجا ارشاد ہوا۔ مطلب یہ کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ درست، اور ہم نے جو ایک بار یہی کہا تو حضور ہم سے کیسے بگڑے تھے اور کیا کیا باتیں سنائی تھیں۔ یاد ہیں یا بھول گئے، بتاؤ؟

سپہر آرا کی رفع پریشانی

بار خدایا کیا اسرار ہے کہ عین فصل خزاں میں جوش بہار ہے قالب بے جان میں از سر نو جان آئی۔ مُردے نے صورت دکھائی۔ یہ یقین نہیں آتا اور کیونکر یقین کیجئے حیرت سی حیرت ہے۔ مرزا ہمایوں فر بہادر نے زخم کاری کھایا۔ جنازہ اُٹھا۔ مقبرہ بنا۔ اب ان کا زندہ ہونا یعنی چہ۔ ساری خدائی میں مشعل آفتاب لے کر ڈھونڈھیے تو ایسا کوئی انسان نہ پائیے گا جس نے مردے کو قبر سے نکلتے دیکھا ہو۔ یہ نیچر کے خلاف ہے۔ حسب عقل و حسب عادت دونوں طرح محال۔ گو بعض ضعیف الاعتقاد آدمی یہ سمجھیں کہ فقیروں کی دعا سے مردہ بھی اُٹھا سمجھا کریں ہم کب مانتے ہیں۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔

اب سُنیے کہ عروس دلفگار سپہر آرا روز و شب شہزادے کی یاد میں سر دُھنتی تھی۔ جو فرقِ جنون سے تنکے چُنتی تھی۔ تمام عالم اس کی آنکھوں میں تیرہ و تار تھا۔ تیر غم کلیجے کے پار تھا۔ دن کو نالہ و زاری۔ رات کو اختر شماری۔ ہر دم بیقراری رہتی۔ ہمجولیاں لاکھ لاکھ سمجھاتی تھیں کہ اب تو جو ہُوا سو ہُوا جہاں تک ممکن ہو دل کو ڈھارس دو بہناؤ۔

حسن آرا۔ بہن یہ تو سوچو کہ دنیا میں وہ کون عورت ہے کہ جس نے کبھی غم کی صورت نہیں دیکھی جس کا کوئی عزیز کبھی مرا نہ ہو۔

سپہر آرا۔ باجی جان اب ہم کو زیادہ نہ چھیڑو۔

حسن آرا۔ (اشکبار ہو کر) یا خدا ہمیں اس مصیبت سے رہائی دے۔ اب ہم یہ غم کسی طرح نہیں سہہ سکتے۔

سپہر۔ باجی دل اب کہاں ہے اب تو دل کی عوض غم ہے۔

وارم دلی اما چہ دل صد گونہ حرمان در بغل
چشمے و خون در آستین اشکے و طوفاں در بغل

مغلانی۔ حضور سارا شہر روتا ہے۔ چھوٹے بڑے سب زار زار روتے ہیں۔ اور جس وقت دولہا کی شکل یاد آتی ہے۔ دل ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ استانی جی ڈولی سے ڈیوڑھی میں اُتریں، اندر آئیں، بڑی بیگم صاحب سے ملیں۔

بڑی۔ استانی جی اب کوئی تدبیر بتاؤ۔ سپہر آرا کا دل کیونکر بہلے مجھے یقین نہیں کہ اس کی جان بچے۔ اگر یہی لیل و نہار قائم ہے تو دیکھ لینا بیچاری جلد مر جائے گی۔

استانی۔ اللہ نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔ میں نے وہ بات سُنی کہ آپ بھی خوش ہو جائیں۔

بڑی۔ (آہ سرد بھر کر) اُستانی جی ہمیں اُمید نہیں کہ ایسی کوئی خبر سنیں۔ اُس بیچارے کا زندہ ہونا محال اور بغیر اس کے لڑکی تباہی زدی کا بچنا محال۔

اُستانی۔ آپ سُن تو لیں پہلے میں کیا فائل تھی۔ میں کئی فقیروں اور کئی مجذوبوں سے پوچھ چکی ہوں اور سب کی رائے ہے کہ اگر سپہر آرا مرقد منورہ پر جائیں تو ہمایوں فر بہادر ضرور زندہ ہو جائیں۔ اب میں ایک نہ مانوں گی۔ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ایک

بار کوشش تو کرو۔

بڑی ۔ حسن آرا اور خورشید دولھا کو سمجھاؤ۔

اُستانی ۔ مہری عباسی ذرا جا کے حُسن آرا بیگم کو بلا لاؤ۔

مہری ۔ بہت خوب حضور کہوں گی اُستانی جی نے بلایا ہے ۔

عباسی جا کے حُسن آرا بیگم کو بلا لائی ۔ حسن آرا بیگم استانی جی کو بندگی کر کے ادب کے ساتھ بیٹھیں ۔ انھوں نے کہا بیٹا تم خوب جانتی ہو کہ میں سست اعتقاد نہیں ہوں پہلے میری بھی رائے نہ تھی کہ سپہر آرا بیگم ہمایوں فر کی قبر پر جائیں ۔ میں بھی سوچتی تھی کہ یہ سب باتیں ہیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو فی صدی ستر آدمی زندہ ہو جاتے مگر مجھ سے دو چار ایسے لوگوں نے کہا ہے کہ اب مجھے یقین آیا اور میں ایک نہ مانوں گی ۔ اس بارہ میں ہرگز ہرگز دخل نہ دو ، اور خورشید دولھا کو میں سمجھالوں گی ۔ میرا ذمہ ہے ۔

اُستانی جی نے نواب صاحب کو بلوایا اور بڑی بیگم کے سامنے ان کو سمجھایا ۔ اُنھوں نے کہا اگر اس تدبیر سے نقش مراد کرسی نشین اور تیر دعا بہدف اجابت قرین ہو تو فھو المراد چشم ما روشن دل ما شاد مگر قیاس اس کا مقتضی ۔ آیندہ اختیار بدست مختار ۔ اور ہاں خوب یاد آیا یہاں سے تو سپہر آرا اس آرزو میں جائیں گی اور وہاں سے ناکام و نامراد آئیں گی تو ان کی زندگی کا خدا حافظ ہے ۔

اُستانی ۔ اوّل تو یہ آپ نے بے سمجھے اور بلا ثبوت کہہ دیا کہ (ناکام و نامراد آئیں گی) اب میں کہتی ہوں کہ ہرگز ہرگز ناکام و نامراد نہ آئیں گی ۔

اُستانی جی اُٹھ کر سپہر آرا کے پاس آئیں ۔ سپہر آرا نے حسرت سے ان کی طرف دیکھا اور گردن نیچی کر کے رونے لگی ۔ اُستانی جی نے پیشانی نورانی کا بوسہ لیا اور کہا بیٹی خدا بہت جلد تمھاری مصیبت کو دور کرے گا ، بیٹا ہمارا کہنا مانو تو پھر دیکھو لطف یہ سب رنج و غم دور ہو جائے ، چٹکیوں میں سب درد دُکھ جاتا رہے مگر جب مانو بھی ۔

اُستانی جی نے تھوڑی دیر تک سپہر آرا سے تخلیے میں ایسی باتیں کیں جس سے سپہر آرا بیگم کو کسی قدر تشفی ہوئی ۔ استانی جی نے کہا بیٹا وہ تدبیر سوچی کہ تمھارے دل کی تمنا بر آئے ۔ اگر خدا نے چاہا تو میں سرخرو ہوں گی ۔

آخر اُستانی جی سپہر آرا کو لے کر ہمایوں فر کے مرقد کی طرف چلیں ۔ سپہر آرا کے اِدھر اُدھر ان کی دونوں بہنیں تھیں پیچھے پیچھے مغلانیاں اور مہری اور ایک طرف اُستانی جی جریب ٹیکتی جاتی تھیں ۔ جب مرقد مطہر کے قریب پہنچیں تو سپہر آرا کے دل کا عجب حال ہُوا ۔ جس کا بیان حیطۂ تحریر سے خارج ہے ۔ دفعتہً سپہر آرا کی نظر قبر پر پڑی تو دیکھا کہ وصلی خوش خط منشی شمس الدین صاحب اعجاز رقم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وسط میں رکھی ہوئی ہے ۔ تشتری رکھ کر وصلی کو اٹھایا ، پڑھا تو بشاش ہو گئی ۔

سپہر ۔ استانی جی یہ تو فال نیک ہے ۔ وصلی مژدۂ وصل دیتی ہے یا خبر وصال اگر وصال ہو تو فھو المراد اور اگر وصل ہو تو دل ما شاد ۔

اُستانی نے وصلی لے کر چوم لی اور کہا فتح ہے ۔ ادھر ان کی زبان سے فتح فتح کی آواز نکلی اُدھر مغلانیوں نے (آمین آمین) کی صدا بلند کی ۔ حسن آرا اور روح افزا نے وصلی کو بغور دیکھا ۔ ادھر سپہر آرا نے قبر کی طرف خطاب کر کے یہ اشعار پڑھے :۔

اے رہ نورد عالم بالا چگونۂ — ما بے تو در غمیم تو بے ما چگونۂ

از سایہ در غم سیہ پوش شد ہما — اے خفتہ در نشیمن عنقا چگونۂ

ما بیخودان بہ حلقۂ ماتم نشستہ ایم — از خویشتن بگو ئے کہ تنہا چگونۂ

بے مطرب و ندیم و کنیزان ماہ رُوے — بے باغ و قلعہ و لب دریا چگونۂ

اتنے میں قبر کے کونے سے ایک پیر مرد نود سالہ نمودار ہوا۔ ریش مبارک بگلے کے پر کی سی سفید۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ گالوں پر جھریاں۔ آنکھیں گڑھے میں دھنسی ہوئیں۔ مگر با اینہمہ پیرانہ سالی نور اور تقدس چہرے سے نمودار تھا سپہر آرا اور حسن آرا اور روح افزا اور مغلانیاں اور مہریاں سب کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا حسن آرا کو حیرت تھی کہ یا اللہ یہ قبر کے کونے سے کیونکر نکلا اور باقی سب کو شک کی جگہ یقین تھا کہ کوئی فرشتہ ہے۔ مگر استانی جی کے چہرے سے حیرت یا گھبراہٹ نہیں معلوم ہوتی تھی۔

سپہر۔ اے پیر مرد ملکوتی صفات برگزیدۂ کائنات۔ پورا یقین ہے کہ آپ فرشتے ہیں۔ صرف دو سوالوں کا جواب چاہتی ہوں اور بس۔

۱۔ میری ایسی مصیبت زدہ بھی کبھی دیکھی ہے؟

دوشیزۂ کہ بیوہ کنندش بدخترے

۲۔ اب اس زخم کے لیے کوئی مرہم کارگر ہے یا نہیں؟

پیر مرد۔ دنیا میں کوئی درد لا دوا نہیں ہے۔ اے دخت گلفام دلارام گو تیری مصیبت اور شاہزادے کے قتل کا سانحہ بھی ایسا سخت اور جانگداز ہے کہ سنگ دلوں تک کے دل موم ہو جائیں۔ شقی القلب آدمی بھی اس حادثہ روح فرسا کا حال سن کر ساون بھادوں کی طرح اشکوں کے تار باندھ دیں مگر دنیا میں اس سے بڑھ کر سانحے ہوئے ہیں۔

یہ کہہ کر اس پیر مرد نے استانی جی سے مصافحہ کیا اور سپہر آرا کا ہاتھ لیکر اس پیرزن خوش سیرت کے سپرد کیا اور رخصت ہوا۔

استانی۔ بٹیا ذری آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے بند کرلو۔

حسن آرا۔ استانی جی یہ کون تھے، فرشتے ہیں نہ؟

روح افزا۔ چاہے تم کو یقین نہ آئے مگر ہم تو ان کو فرشتے سے بڑھ کر سمجھتے ہیں چہرۂ نورانی۔ باتیں حقانی۔

سپہر۔ وہ فرشتے ہوں یا انسان، مگر میرے لیے تو ان کی تقریر نے مرہم زخم جگر کا کام کیا۔ افسوس ہے کہ اس قدر جلد چلے گئے۔

مغلانی۔ کیسی تول تول کے باتیں کرتے تھے کہ واہ جی واہ۔

مہری۔ جلال تو جلال اور رعب کیا ہے۔

سپہر آرا نے پھول ہاتھ میں لیے اور قبر کو کئی بار بوسہ دے کر کہا۔ باجی جان میں اس کو متبرک سمجھ کر بوسہ نہیں دیتی ہوں یہ تو پتھر ہے۔ مگر میں نے اس سبب سے چوم لیا کہ رنج و غم کا بھاری پتھر مجھ سے نہ اٹھ سکا اور پھر یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے پیارے شہزادے بہادر کی قبر ہے میں اس کو پھولوں سے بساؤں گی اور عطر و گلاب کے ترابے کے ترابے اس پر لنڈھاؤں گی۔ اور خوب رؤوں گی۔

سپہر آرا نے اس کے بعد کہا۔ استانی جی چو طرفہ سناٹا ہی سناٹا نظر آتا ہے۔ عالم ہُو ہے۔ اُداسی سی اُداسی چھائی ہے۔ اس کے بعد کہا آج ہم کھانا بھی یہیں کھائیں گے۔ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ تھوڑی دیر اور شہزادے کی قبر کو دیکھ لیں۔ گو وہ بیچارہ تہ خاک ہے۔ مگر اس کی خاک سے بھی ویسی ہی اُلفت ہے جیسی اس سے تھی۔ استانی جی نے حکم دیا کہ ایک آدمی فوراً گھر پر بھیجا جائے ہم سب کے واسطے کھانا لائے۔ حکم پاتے ہی ایک آدمی روانہ ہوا۔ اور ادھر استانی جی سپہر آرا کے دل کو تسلی دینے لگیں۔

اُستانی۔ دیکھ لینا بٹیا شہزادہ ضرور اُٹھ کھڑا ہوگا۔

سپہر۔ اُستانی جی ایسا آج تک کبھی ہُوا ہے نہ ہوگا۔

استانی - جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش تم نے ابھی دیکھا کیا ہے - میرا ذمہ آج کے ساتویں دن تم اور وہ ایک جگہ نہ بیٹھے ہو تو سہی
جس بات کو تم جانتی ہی نہیں ہو اس میں دخل کیوں دیتی ہو -

سپہر - آخر آپ کا منشا کیا ہے کچھ معلوم تو ہو - کیا آپ کے نزدیک یہ قبر اسی طرح بنی رہے گی اور ہمایوں فرزندہ
ہو جائیں گے ؛

استانی - زندہ ہو جائیں گے کیا معنی ؛ ان کو مُردہ کون کہتا ہے ؛ اے وہ مرے ہی کب وہ زندہ ہیں ،

استانی جی جب سپہر آرا بیگم کو لے کر گھر پر واپس آئیں تو بڑی بیگم نے دیکھا کہ لڑکی اب اس قدر ملول نہیں جس قدر
پیشتر تھی - جناب باری کا شکریہ ادا کیا -

دُولہا دُلہن

چند روز بعد اُستانی جی کے ساتھ سپہر آرا پھر ہمایوں فر کے مرقد پر گئیں جس وقت سپہر آرا بیگم اپنے پیارے ہاتھ میں تشتری لے کر قبر کی طرف اٹھلاتی ہوئی گئیں، ان کے دل کا عجب حال تھا۔ کبھی سوچتی تھیں کہ یا خدا میں اس وقت شہزادۂ ہمایوں قدر کی قبر کے پاس کھڑی ہوں۔ وہ شہزادہ جس کو میں دل و جان سے عزیز رکھتی تھی جو میری روح سے زیادہ مجھے عزیز تھا جس کو میں پیار کرتی تھی جس نے مدتوں کی کوشش کے بعد وہ سعید دن پایا کہ دولہا بنے ہوئے اشہب صبا رفتار پر سوار دُلہن کے ہاں آتا تھا مگر خلعت کے عوض کفن پہنایا۔ دُلہن تاج کے عوض سر کھولے ہوئے مرقد منور پر آئی۔ کہاں بناؤ چناؤ کے ساتھ دُلہن بنی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کہاں اس کی نعش بے کفن پر آئی۔

اُستانی۔ بیٹیا جو وعدہ میں نے کیا اس کو پورا کروں گی۔

سپہر۔ استانی جی میں سچ کہتی ہوں مجھے یاد نہیں آتا۔

اُستانی۔ اب صاف صاف کیوں یاد آئے یا نہ آئے بات نہ کاٹنا۔ آج کے دوسرے روز۔ توبہ۔ کل سے مطلب ہے۔ کل ہمایوں فر تمہاری بغل میں نہ بیٹھے ہوں تو سہی۔

سپہر۔ تمہارے مُنہ میں گھی شکر۔ خدا چنیں کند۔

حُسن۔ کل بھی کچھ دُور نہیں ہے جب اتنے دن تک صبر کیا تو کل کون دُور ہے کل بھی آیا ہی داخل ہے۔

سپہر۔ باجی جان۔ کس موئی نگوڑی کو ذرا بھی یاد آتا ہو اور جو کل بھی کچھ نہ ہو تو دل کے پُرزے پُرزے اور جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ انتظار کا بھی آخر ٹھکانا ہے۔

حُسن۔ کیوں اُستانی جی دیکھا میں کیا کہتی تھی آپ سے۔

سپہر۔ پھر مجھ سے کوفت نہ کھایا جائے گا۔ اب کی علیل ہوئی تو مرض کی جڑ ہی گھر کر جائے گی۔ جالینوس بھی آئے تو جی چھوٹ جائے۔ اور اس جھنجھٹ سے تو یہی بہتر ہے کہ موت آ جائے۔

ایک بوڑھی مغلانی نے اُن کے تسلی دی کہا۔ اللہ نے چاہا تو استانی جی کی بات صحیح نکلے گی۔ نمک کی قسم کھا کے کہتی ہوں، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ شہزادۂ بہادر حضور کو صورت ضرور دکھائیں گے اور ہنسی خوشی شادی ہوگی۔ سپہر آرا نے مغلانی کی طرف دیکھ کر یوں جواب دیا۔ اے بُوا کدھر تمہارا خیال ہے سستی اعتقادی بھی تو کتنی ہے بھلا آج تک کسی نے یہ بھی سُنا ہے کہ مُردہ قبر توڑ کے نکل آئے۔ توبہ۔ توبہ۔ ایسے بھرّوں میں نہ آنے کی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ قبر کے پاس سے قہقہے کی آواز آئی۔ جن آرا کے کان کھڑے ہوئے۔ روح افزا اور بدرالنساء جھجکیں۔ استانی جی غور سے دیکھنے لگیں۔ مغلانیاں متحیر کہ قہقہہ کس نے لگایا۔ سپہر آرا نے مسکرا کر کہا یہ سنّاٹا کیسا پڑ گیا قبر سے آواز قہقہہ آئی یہی حیرت ہے۔

قبر کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ کیوں بندہ پرور خود تو ہنسیے اور ہمیں رلائیے ہنس ہنس کر رُلانا حضور ہی کا کام ہے

اس خندہ زنی کا جواب اب کیا دوں۔

اُستانی جی نے سپہر آرا کو سیکڑوں واسطے دلائے۔ از برائے خدا تم ان باتوں کا کل تک ذرا بھی خیال نہ کرو۔ آج کا دن تو کسی شمار قطار میں نہیں ہے۔ کل شب کو تم یہاں آؤ اگر ہمایوں فر دولہا بنے خلعت پہنے جیغہ پُر پیچ زیب سر کیے تم سے نہ ملیں تو ہماری صورت سے نفرت کرنا اور کبھی ہماری بات کا ذرا بھی یقین نہ کرنا۔ دس بجے کے وقت استانی جی ان سب کو لے کر روانہ ہوئیں۔ گھر میں آئیں تو بڑی بیگم نے کہا۔ آج سویرے اِدھر تمہاری گاڑی روانہ ہوئی ادھر مہری نے آن کر کہا حضور ایک شاہ جی آئے ہیں۔ داروغہ صاحب فرماتے ہیں کہ بڑے باکمال پہنچے ہوئے فقیر ہیں وہ تو ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے اللہ کی عنایت سے زندہ ہیں۔

اُستانی جی نے کہا، آمین! اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ سپہر آرا نے غور سے سُنا گو حسن آرا کی صحبت میں فقرا وغیرہ کا اعتقاد جاتا رہا تھا مگر اہل الغرض مجنوں مثل مشہور ہے۔ غم والم نے ان کو اس درجہ سراسیمہ کر دیا تھا کہ شہزادے کی نسبت جو کوئی مژدہ سنتا فوراً باور کر لیتیں۔ لیکن ظاہر میں آہ سرد بھر کر خاموش ہو رہتی تھیں۔ بڑی بیگم نے فقیر کی اس قدر تعریف کی کہ استانی جی نے نہایت مشتاق ہو کر اصرار کیا کہ شاہ جی پھر بلوائے جائیں۔ ان سے کہا جائے پھر تکلیف کر کے تشریف لائیے۔ بڑی بیگم نے کہا اُن کو تو میں نے خود ٹکایا ہے، باہر ٹکے ہیں۔ استانی جی کے اصرار اور خواہش کے بموجب بڑی بیگم صاحب نے مہری کو حکم دیا کہ شاہ جی صاحب سے کہو کہ اگر تکلیف نہ ہو تو از راہِ عنایت پردے تک تشریف لائیں۔ مہری نے ادب کے ساتھ عرض کیا حضور اگر تکلیف نہ ہو تو ذرا ڈیوڑھی تک چلے چلیئے۔ بڑی بیگم صاحب نے فرمایا ہے کہ شاہ صاحب سے جا کے کہو کہ صاحبزادی آگئی ہیں وہ بھی اپنے کانوں سے سن لیں۔ شاہ صاحب نے کھڑاؤں پہنے تہبند باندھا اور ڈیوڑھی پر آئے۔ اُستانی جی اور بڑی بیگم اور سپہر آرا اور ان کی بہنیں اور پیش خدمتیں سب پردے کے اس طرف کھڑی تھیں۔

اُستانی۔ شاہ صاحب آپ کو اس وقت بڑی تکلیف ہوئی، مگر ہم کیا کریں ہم ایسی ہی مصیبت میں گرفتار ہیں اللہ کسی کو یہ مصیبت نہ دکھائے۔ یا خدا ساتویں دشمن کو بھی یہ دن نصیب نہ ہو۔ مگر اس میں انسان کا چارہ کیا ہے۔ وہاں ایک بڑے کامل فقیر نے دعویٰ کیا ہے کہ کل کچھ خوشخبری سننے میں آئے گی۔ واللہ اعلم۔

شاہ صاحب۔ مشیت ایزدی میں انسان کا کچھ بس نہیں ہے۔

بے رضائے تو یکے برگ نہ جنبد ز درخت

خدا کی مرضی۔ ہر چہ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

استانی۔ اب کچھ دعائے خیر ہمارے حق میں کیجیئے۔

روی مقصود کہ شاہان بدعا می طلبند　　　　سببش بندگی حضرت درویشان ست

شاہ۔ حقائق و معارف آگاہ شیخ سیف اللہ انار اللہ برہانہٗ نے خوب فرمایا ہے۔ سب ایک چیز ہے اور اضافت اسما ساقط ہے۔ التوحید اسقاط الاضافات نہ آسمان ہے نہ زمین ہے نہ مکان ہے۔ مکین ہے۔ نہ نور ہے نہ ظلمت۔ نہ اندوہ ہے نہ کلفت۔ نہ رنج ہے نہ راحت۔ نہ سیاہ ہے نہ سفید۔ نہ حرف ہے نہ امید۔ نہ گھر ہے نہ بازار۔ نہ یار ہے نہ اغیار۔ نہ دنیا ہے نہ آخرت۔ نہ ذلت ہے نہ مفاخرت۔ نہ دوزخ ہے نہ بہشت۔ نہ غلمان ہے نہ حُور۔ نہ طوبیٰ ہے نہ قصور۔ نہ زمہریر ہے نہ سلسبیل نہ کوثر نہ زنجبیل یہ سب وجود وہمی ہے وجود حقیقی نہیں ہے۔

این غم و شادی کہ اندر حیطہ ایست | پیش این شادی و غم جز نقش نیست
صورت غمگین و نقش از بہر تست | تا ازاں صورت شود معنی درست

نقش ہائے کاں دریں حمام ہاست
از بُرون جامہ کن چوں جام ہاست

خدا کی کنہ حقیقت میں دخل دینا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ انسان کی یہ تاب وطاقت کیا مجال۔ خدا گو قہار ہے مگر غفار بھی ہے۔ ایسی کنواری دوشیزہ معصومہ پر خدا کا قہر نہیں ہو سکتا۔ دل گواہی دیتا ہے کہ مرزا ہمایوں فر زندہ ہیں اور کل شب کو ضرور نظر آئیں گے۔ بادی النظر میں یہ بات محال مطلق معلوم ہوتی ہے۔

استانی۔ آپ ابھی تو یہیں رہیں گے نا شاہ صاحب۔

شاہ۔ میں اس وقت یہاں سے رخصت ہوں گا۔ جب دولہا کے ہاتھ میں دُلہن کا ہاتھ ہوگا۔ ہائے اس دوشیزۂ معصومہ کا سہاگ کے عوض سوگ نصیب ہوا۔ مگر یہ سوگ نشین نہیں یہ دُلہن ہے۔ آگ کو خدا نے گلزار کر دیا۔ کبھی کسی نے سُنا ہے کہ آگ باغ ہو جائے مگر خدا کی قدرت۔

شاہ صاحب نے اس طرز کی باتیں کیں کہ ان کے تقدس اور ان کی بزرگی کا نقش بڑی بیگم کی لوح دل پر بخوبی مرتسم ہوگیا۔ حسن آرا کی طرف دیکھ کر کہا اگر کوئی شاہ صاحب کی بات کو یا مد نہ کرے گا تو میری نظروں سے گر جائے گا۔ اور میں پھر کبھی اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہ ہوں گی۔ حسن آرا آپ جانئے طبیعت دار معاً سمجھ گئی کہ اسی طرف اشارہ کیا مگر اماں جان مجھے ان کی باتوں سے خود یقین اور کامل یقین ہو گیا ہے کہ شاہ صاحب خدا رسیدہ ہیں۔ شاید انھیں کی دعائے خیر سے ہماری مصیبت رفع ہو جائے۔

اُستانی جی نے شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا حضور خوب جانتے ہیں کہ عیش و عشرت کا زمانہ دم کے دم میں ختم ہو جاتا ہے اگر ایک ہفتے تک برابر ڈومنیوں کا ناچ رہے اور رات دن دھما چوکڑی مچے تو بھی وقت نہ معلوم ہو۔ مگر رنج کی ایک گھڑی پہاڑ ہو جاتی ہے۔ صاحبزادی کو ان باتوں کا کم یقین آتا ہے اور کیوں کر آئے۔ دل تو صید الم ہے۔ جب شہباز کے پنجے سے طائر دل رہائی پائے تب تو باور آئے۔ حضور ان کو کچھ کمال دکھائیں تا کہ یہ آپ کا دم بھرنے لگیں اور کل تک خوش رہیں۔

شاہ صاحب نے کہا یہ کون بڑی بات ہے، تھوڑے سے ماش منگوائیے۔ ماش آئے۔ کچھ پڑھ کر شاہ صاحب نے سب کے سامنے ایک چلو پانی لے کر ماش پر چھڑکا اور پھر کچھ پڑھ کر زور سے ماش زمین پر پھینکے اور کہا آپ سب ہٹ جائیں اس مقام کی زمین بہت جلد شق ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک گھنٹے میں زمین شق ہوئی اور ڈھیلے سوا گز کے قریب اونچے ہو کر ادھر اُدھر گرے۔

بڑی بیگم۔ اب اس سے بڑھ کر کمال اور کیا ہوگا بھلا۔

سپہر۔ اماں جان۔ اب میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ان کی دعائے خیر سے نقش مراد کر سکیں اور تیر دعا بہدف اجابت قرین ہوگا۔ اس زور سے زمین کا شق ہونا انوکھی بات ہے جیسے زلزلہ سا آگیا۔ یہ کیا بات تھی باجی جان!

مغلانی۔ حضور میں سمجھی بھونچال آگیا۔ اس قدر کی زمین ہلی۔

بہار۔ فقیر ہیں نہیں تو دنیا کیونکر قائم ہے۔ اتنا تو سمجھو۔

رُوح۔ جس وقت مٹی اُڑی میں دھک سے رہ گئی۔ اللہ اللہ کیوں حسن آرا تم نے کیفیت دیکھی تھی؟

حُسن۔ جی ہاں مجھے خود حیرت ہے کہ یہ کیا اسرار ہے خداوندا۔

سپہر۔ اب تو درویشوں کے کمال کی قائل ہوں۔ باجی جان۔

اب سنیئے کہ بڑی بیگم نے اپنے کل اعزا اقربا کو بلوایا اور یہ مژدۂ روح افزا سنایا کہ ایک درویش معارف آگاہ کی برکت دعائے سحری و نیم شبی سے شہزادہ زندہ ہو جائے گا۔

تمام شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی اور جمعرات کو چار گھڑی دن رہے سے میلا جما۔ قلعہ معلّٰی کے اندر صحن دلکش میں وہ بھیڑ بھڑکا کہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ ایک طرف تنبولیوں کی دکانیں آراستہ۔ تنبولنیں کمسن نوخاستہ پیارے پیارے ہاتھوں سے عطر بار شکیہ گلوریاں بنا رہی ہیں۔ عاشق تنوں کو بھا رہی ہیں۔ چونا صبح کی جلا سے زیادہ سفید۔ چکنی ڈلی خال عارض خوباں فرخار پر طعنہ زن، جس سبز بخت نے ایک بیڑہ کھایا سرخرو ہو گیا۔

ایک سمت حلوائی ہی حلوائی حلوائیوں کی میٹھی میٹھی بول چال اور وہ شیریں ادائی الٰہی دکان ہے یا شکرستان! بہنگام توصیف زبان طوطی شکر خا نہ بن جائے۔ یوسف مصری دیکھے تو عشق ہو جائے۔ شیریں دہن شیریں کار۔ شکر لب شکر بار۔

مالنیں آٹھ دس بہت کم سن   پیاری پیاری ادا غضب کے دن
گفتگو کتنی شستہ و رفتہ   مگر ایک ایک دُرِ ناسفتہ

گوندھتی ہے کھڑی ہوئی کوئی ہار
گیند بازی میں ہے کوئی سرشار

اور مزار منوّر کا تو عالم ہی اور تھا۔ جھاڑ اور کنول سے ہر در و دیوار پر غضب کا جوبن تھا۔ مزار کے دروازہ پر دُلہن کا گمان ہوتا تھا۔

نور کے تڑکے سے چھڑکاؤ کا بندوبست ہوا تھا۔ نہریں کیوڑے اور گلاب سے چھلک رہی تھیں۔ روشیں جھلک رہی تھیں۔ جا بجا فوارے لطفِ خدا داد دکھا رہے تھے۔ نونہالان چمن اپنے اپنے جوبن پر اترا رہے تھے۔

اتنے میں خبر ہوئی کہ سپہر آرا بیگم عنقریب گھر سے روانہ ہونے والی ہیں۔ یورپین جنٹلمین اور لیڈیاں بھی سیر دیکھنے آئی تھیں ایک نواب صاحب نے جو منتظم تھے ان کے واسطے شامیانہ نصب کرا دیا۔ ایک میم صاحب نے منتظم سے ہمکلام ہو کر چند سوال کیے:۔

میم۔ ول کیا آپ لوگ سمجھتا کہ اس میں (قبر) سے مردہ جینا ایسا تہ ہونے سکتا کبھی دیکھا ہے کہ مر کے جیئے۔

منتظم۔ حضور خدا کی قدرت اور صاحب لوگوں کا اقبال۔

اس پر کل لیڈیوں اور جنٹلمینوں نے قہقہہ لگایا۔

اِدھر یہ باتیں ہوتی تھیں اب ادھر کا حال سنیئے سپہر آرا کمرے میں گئیں اور وہاں دُلہنوں کی طرح نکھرنا شروع کیا۔ وہ جوبن تھا کہ زہاد بھی ڈورے ڈالے۔ ناز و ادا کے ساتھ پائنچے اُٹھاتی ہوئی کمرے سے اُتری تو بڑی بیگم صاحب نے فرمایا۔ لو بیٹی اللہ نے دلی آرزو پوری کی داد پائی۔ اب خدا نے چاہا تو فتح ہے۔ بس اب ہمیں ذرا شک نہیں رہا۔ سپہر آرا بڑی بیگم کے قریب گئی انھوں نے چھاتی سے لگایا۔ سپہر آرا نے کہا اماں جان بس اب یا اِدھر یا اُدھر۔ یا شہزادے کو لے کے ہنسی خوشی آؤں گی یا اسی کی قبر کے پاس دفنائی جاؤں گی۔

بیگم۔ ہاں ہاں صدقے بیٹی اس وقت بدشگونی کی باتیں نہ کرو۔

سپہر۔ اماں جان دودھ تو بخش دو۔ سانپوں کے سو کھیل اللہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ شاید اللہ کو کچھ اچھا ہی کرنا ہو۔ آج ایک دفعہ اور نصیبا آزما لیں۔ اماں جان یہ آخری دیدار ہے (آبدیدہ ہوکر) باجی جان چلتی ہیں۔ بہار النسا بہن کہا سنا معاف۔ خدا کے لیے میرا ماتم نہ کرنا۔ میری تصویر آبنوس کے صندوقچے میں ہے وہ دیکھ لیا کرنا۔ جب تم سب مل کر بیٹھو تو میری تصویر بھی سامنے رکھ لیا کرنا۔

دونوں بہنیں خوب زور سے گلے ملیں اور دونوں آٹھ آٹھ آنسو روئیں۔ اس کے بعد روح افزا اور بہار النسا اور جہاں آرا اور گیتی آرا اور کل پیش خدمتیں اور مغلانیوں وغیرہ سے علیحدہ علیحدہ ملی۔ اتنے میں استانی جی نے کہا اب سوار ہونا چاہیئے۔ سپہر آرا نے چلتے وقت کہا از برائے خدا ہمارے کمرے میں کنول ضرور جلایا کرنا۔ اس پر پھر کہرام مچا اور استانی جی نے سپہر آرا کو سوار کر دیا۔ ایک بگھی پر استانی جی اور سپہر آرا اور حسن آرا اور روح افزا۔ دوسری پر جہاں آرا اور گیتی آرا اور دو اور بیگمات عصمت سمات تیسری پر بڑی بیگم اور بہار النسا اور خورشید لقا۔ چوتھی پر شہزادی بیگم اور مہ لقا بیگم اور دو کمسن بیگمیں۔ پیچھے مغلانیاں وغیرہ۔ الغرض سولہ بگھیاں یہاں سے روانہ ہوئیں۔

جب سپہر آرا قبر کے قریب آئی اور دیکھا کہ تربت عنبریں جگمگا رہی ہے تو آنکھوں کو نور موفور حاصل ہوا۔ تماشائیوں نے نعرے پر نعرے بلند کیے۔ اس قدر شور و غل مچایا کہ آسمان سر پر اٹھایا۔ سپہر آرا نے قبر کے پاس گھوڑا روک کر کہا۔ اب کیا حکم ہوتا ہے۔ خود جاگو گے یا ہم کو بھی یہیں سلاؤ گے؟ ہم ہر طرح راضی ہیں۔

اتنے میں استانی جی اور بڑی بیگم اور ان کی صاحبزادیاں اور شہزادی بیگم اور کل بیگمات آئیں۔ چاروں طرف مہریاں پردہ کیے ہوئے تھیں۔ قبر سے دور تک آدمی ہٹا دیے گئے اور تین سمت قنات گھیری گئی۔ فرش بچھا۔ شاہ صاحب بلوائے گئے۔ اس وقت تماشائیوں کے اشتیاق اور جوش اور ولولے کی انتہا نہ تھی۔ الانتظار اشد من الموت کا نقشہ تھا۔ ہر کہ و مہ دست بدعا تھا کہ بار خدایا قبر شق ہو جائے اور شہزادہ سلیمان منزلت سکندر مرتبت صورت دکھائے۔ شاہ صاحب تشریف لائے اور یہ شعر آبدار بآواز بلند پڑھا۔

ہے ترے حکم اے الہ العالمین ایک پتا ہل نہیں سکتا کہیں

یہ کہہ کر شاہ صاحب گر پڑے۔ دو ایک آدمی اُن کو اُٹھانے کو گئے مگر مریدوں نے منع کیا اور کہا خبردار ان کے قریب نہ آنا۔ شاہ صاحب اللہ اکبر کہہ کر اُٹھ بیٹھے اور بہت زور سے قہقہہ لگا کر فرمایا لو مبارک فتح ہے فتح ہے۔

جب خاتون ماہ لقا سپہر آرا بیگم گلگوں فراخ نعل پر سوار ہو کر مرقد منور کے ارد گرد اٹھلاتی تھیں۔ سامنے ایک روشنی نمودار ہوئی۔ اس طرح کا نور کہ سب کی نظر جھپک گئی۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ تماشائی دو رویہ کھڑے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ دیکھا کہ ایک بیش قیمت اور صبا رفتار ضیغم شکار شبدیز عربی اٹکھیلیاں کرتا چلا آتا ہے۔ نعرۂ خوشی بلند ہوا۔ اور گلگوں سبک خیز قریب آیا کہ لوگوں نے مرحبا مرحبا کا غل مچایا۔ تمام قلعہ معلی گونج اُٹھا۔ کسی نے کہا ہمارے ملک کا شہزادہ جاتا ہے؟ کوئی بولا آمنت مرحبا۔ سپہر آرا بیگم انگشت حیرت بدنداں کہ خداوندا یہ کیا ماجرا ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا دلہن کو لاؤ۔ اِدھر سپہر آرا اُدھر ماہ انور گھوڑے سے اُترے اور جوش مستی میں دونوں بے حجاب گلے ملے۔

اس وقت ہر طرف سے یہی صدا آتی تھی کہ جوڑی برقرار یا خدا یہ چاند سورج کی جوڑی اس وقت تک قائم رہے۔ جب تک شمس و قمر جلوہ گر ہیں۔ جب لوگوں نے شہزادہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو سخت استعجاب ہوا۔ شاہ صاحب کی بڑی شہرت ہوئی۔ انھوں نے حکم دیا کہ دو گھنٹے کامل تک شاہزادہ اور سپہر آرا باہم ہمکلام ہوں۔ تیسرا آدمی ان سے نہ ملنے پائے۔ چنانچہ قلعہ معلی

کی ایک عمارت میں جو پہلے ہی سے آراستہ کردی گئی تھی دونوں عاشق ومعشوق بیٹھے دو خواصیں خدمت کے لیے ہمراہ تھیں۔ آپس کی گفتگو سننے کے قابل ہے۔

سپہر۔ واہ بندہ پرور واہ۔

جائیے بس خوب اُلفت آزمائی آپ کی

شہزادہ۔ معقول۔ اُلٹی آپ شاکی ہوں۔ خدا جانے کس کس سے شادی کا وعدہ کیا تھا آپ نے جو خمیازہ اس کا ہم کو اٹھانا پڑا ہے۔

سپہر۔ اللہ نے تمہاری صورت دکھائی۔ ہم تو یہی سمجھے تھے کہ کوئی دم میں خود بھی چل بسیں گے مگر زندگی تھی بچ گئے۔

شہزادہ۔ خدا کو اچھا ہی کرنا منظور تھا۔

سپہر آرا بیگم نے شہزادہ جمشید مرتبت کے گلے میں پیارے پیارے ہاتھ ڈال کر کہا تمہیں خدا کا واسطہ سچ سچ بتا دو یہ کیا اسرار ہے اور تو اور ابا جی جان کو سخت تعجب ہوگا اور سچ کہوں کل تک بلکہ آج شام تک میرا دل بھی نہیں قبول کرتا تھا کہ ایسا ہوگا اور کیوں کر قبول کرتا۔ کوئی بات بھی ہے۔ آج تک ایسا کبھی بھی ہوا تھا۔ کبھی نہیں۔ دیکھا نہ سُنا۔ مگر جتنا خدا نے رُلایا تھا۔ اس سے زیادہ ہنسایا بھی۔ اس کی کریمی کے قربان بڑا مسبب الاسباب ہے۔

شہزادہ۔ ابھی اس ہنسی کا کیا بھروسا ہے ایسا نہ ہو پھر رُلائے۔

سپہر (سہم کر) ہے ہے۔ برائے خدا کبھی ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالنا۔ امّاں جان تو ذری سی بات میں شک کرتی ہی تھیں۔ اب میں ان سے بھی زیادہ شکّی ہوگئی۔

شہزادہ۔ (مسکرا کر) جانِ جاں خدا کو اچھا ہی کرنا منظور تھا۔ جو محبّت ہم میں تم میں اب ہوگی وہ پہلے نہ ہوتی۔ گو تم مجھ پر ہزار جان سے عاشق ہو اور میں تم پر مرتا ہوں مگر اب تو جان گنوا کے تم کو پایا اور تمہاری آس بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ تمہارے نزدیک اس پیر مرد شاہ جی نے مردہ زندہ کر دیا۔ خدا نے چاہا تو ہم اور تم اس طرح زندگی بسر کریں کہ آج تک کسی میاں بیوی کو ابتدائے آفرینش سے نصیب نہ ہوئی ہو۔

سپہر۔ ہمارا کہنا مانو تو باغ میں چل کے رہیں۔

شہزادہ (مسکرا کر) ہمارا کہنا مانو! کی ایک ہی کہی۔

سپہر۔ اللہ جانتا ہے میں تمہاری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتی ہوں۔ جو کہو دل وجان سے منظور۔

شہزادہ۔ اُف۔ سپہر آرا تمہیں امید تھی کہ مجھ کو اس حالت میں دیکھو گی۔ اور مجھ سے تم سے مذاق ہوگا۔ اور ہم تم زانو بزانو بیٹھے ہوں گے مگر خدا کی شان۔

سپہر۔ اللہ جانتا ہے ہمیں تو یقین واثق ہو گیا تھا کہ اب حشر میں تمہاری صورت دیکھیں گے۔

مرزا ہمایوں فر سے شہر بھر خوش تھا۔ ان کو کل رعایا بادشاہ سمجھتی تھی۔ ان کی سخاوت، ان کی فیاضی، ان کی رحمدلی کا نقش سب کے لوحِ دل پر منقوش تھا۔ گھر گھر رت جگا۔ پچھلے کو مرزا ہمایوں فر بہادر سپہر آرا کو ساتھ لے کر فنس پر سوار ہوئے اور اپنے گھر گئے خورشید لقا بیگم اور مہ لقا بیگم اور شہزادی بیگم دونوں نے بلائیں لیں۔ شاہ صاحب کے حکم کے بموجب اس شب کو سپہر آرا اور ہمایوں فر الگ تھلگ رہے۔ صبح کو نکاح ہوا۔ شاہ صاحب نے کہہ دیا کہ خبردار خبردار شرعی رسوم کے علاوہ اور کوئی رسم ادا نہ کی جائے۔ لہٰذا ان کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ صبح کو چُپ چپاتے نکاح ہوگیا۔ نکاح کے وقت حسن آرا اور بہار النسا اور روح افزا نے کئی بار دُولہا کو چھیڑا اور ہمایوں فر

بھی دل لگی سے باز نہیں آتے۔ نکاح کے بعد حسن آرا اور شہزادے میں میٹھی میٹھی باتیں ہوا کیں۔

شہزادہ۔ بعد مدت آج آرزو بر آئی۔ برسوں کوٹھے پر دھوپ کھائی۔ مصیبت اٹھائی تب جا کے آج شاہد تمنا سے ہم آغوش ہوا۔ ابتدا

تو وہی تھی جب میں عاشق الصابن کر آیا تھا۔ وہ دن بھی تمام عمر یاد رہے گا۔

حُسن۔ جس وقت مِری تمھاری تصویر لائی ہم نے دانت تلے انگلی دبائی۔ پاؤں کے تلے سے مٹی نکل گئی۔ سپہر آرا بہت گھبرائیں اور

کہا باجی یہ تو بڑی بے ڈھب ہوئی۔ اب کیا کریں۔

شہزادہ۔ میری خوش نصیبی تھی کہ اُن سے تو خیر مگر شکر ہے کہ آپ سے بھی مل چکا ہوں۔ اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہوگی کہ ایسی خوبصورت

شریف زادی کو بن بیاہے گلے لگاؤں۔

حُسن۔ (گردن نیچی کر کے) کیا مُوا چھوٹے ہو کہ نہیں۔

شہزادہ۔ اچھا۔ اگر یہ ہے تو اب پھر ایک بار سہی۔

حُسن۔ (شرما کر) اب یہ کافی ہیں۔

اس فقرے پر روح افزا نے ہنس کر کہا سواہ ابھی باتیں ہو رہی ہیں۔ سالی بہنوئی تو میں دیکھتی ہوں بہت بے تکلف ہیں۔ سپہر آرا اس وقت

کیسی گردن جھکائے ہوئے بیٹھی ہیں گویا کچھ جانتی ہی نہیں ایسی سیدھی بنی جاتی ہیں۔

شہزادہ۔ ان کو اس وقت بولنے کا منصب نہیں ہے۔ ہم تو ان سے (حسن آرا کی طرف مخاطب ہو کر) باتیں کرتے ہیں۔ ہاں حضور تو

آپ نے کیا فرمایا چھوٹا بہنوئی جو سالی سے گلے ملے تو ہرج نہیں ہے۔ پھر بسم اللہ تب تک تو سالی بہنوئی کا کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ اب ہم

آپ کے خورد ہیں اور سالی تو آدھی جورو ہوتی ہے۔

حُسن۔ وہ کوئی اور ہوتی ہوں گی تو کوئی ایسی جورو ڈھونڈھی ہوتی جس کی بہنیں شوخ اور چربانک اور بیباک ہوں۔

شہزادہ۔ حضور کی شوخی کیا کم ہے۔ ہم تو آپ کو بھی شوخ طبع سمجھتے ہیں۔ رگ رگ میں شوخی بھری ہے۔

حُسن۔ خیر میری رگ رگ میں شوخی ہو یا نہ ہو۔ مگر تمھاری رگ رگ میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک دفعہ کیا دیکھتی ہوں کہ پتنگ

آ کے مہتابی پر گرا پڑھتی ہوں تو ایک شعر ؎

از عاشقان صادقت اے دلستان منم
اول کسیکہ بر تو فدا شد ز جان منم

سمجھ گئی ہو نہ ہو پڑوس کا شیطان ہوگا۔

شہزادہ۔ اب مجھ سے بھی گستاخی ہوگی دیکھیے میں نے عرض کر دیا۔ اب مانیے یا نہ مانیے آپ کو اختیار ہے پھر شکایت نہ کیجیے گا۔

ہاں۔ ہمایوں فر نے حسن آرا سے کہا۔ قسم خدا کی میری جان جاتی تھی۔ جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اس طرح کوٹھا مجھے کھینچتا

تھا۔ جب دیکھو کوٹھے ہی پر۔ دھوپ میں کوٹھے پر۔ گرمی میں کوٹھے پر۔ سردی میں کوٹھے پر۔ مینہ برسے تو بھی کوٹھے پر سے جانے کو

جی نہ چاہے۔ شب کو شبنم ہی میں سو رہے مگر مہتابی کا سامنا نہ چھوڑا اور جو کسی دن قسمت نے یاوری کی اور تم دونوں پریوں میں سے

کوئی نظر آ گئی تو گویا کروڑوں روپیہ مل گیا۔ ایک دن سپہر آرا ہمارے رجھانے کے لیے اس بناؤ چناؤ کے ساتھ مہتابی پر آئیں کہ

جان نکل گئی۔ جی چاہا اُڑ کے پہنچوں۔ مگر سٹپٹا کے رہ گیا اور حضور کی بھی ہم پر نظر پڑتی تھی چاہے اب نہ کہیے۔

حُسن۔ اُونہہ اُونہہ! ایسے ہی تو آپ بڑے حسین ہیں چشم بد دُور۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ ذری آئینے میں صورت تو دیکھوں۔

واہ کیا قطع شریف ہے۔

شہزادہ۔ اگر بُرے ہیں تو ہمیں کیوں بیاہی آپ نے؟

حسن۔ تمھاری خوش نصیبی۔ تم اور ایسی چاندسی بیوی پاؤ۔ اور دیکھنا خدمت نہ کرو تو سہی تمھاری قسمت کھل گئی۔ آپ اسیا تیں بنائیں۔ شانِ خدا۔

روح۔ ہاں سپہر آرا کے تو تلووں کو نہیں پہنچتے۔

حسن۔ اس میں کیا شک ہے بہن سپہر آرا لاکھوں میں لاجواب ہے۔ اگر ایسی تھی نہیں تو یہ تکلیفیں کیوں اٹھائیں۔ شرماتے نہیں ہو اور اوپر سے باتیں بناتے ہو۔

شہزادہ۔ ہمارے بھائیوں اور ہماری بہنوں سے پوچھو تو وہ البتہ ہماری دلہن کا مقابلہ کریں۔

گیتی آرا۔ (قہقہہ لگا کر) اے ہے تو عورت ہی پیدا ہوئے ہوتے مردوے کیوں ہوئے۔ داڑھی مونچھ لگا کر چلے ہیں دلہن سے مقابلہ کرنے۔ واہ بندہ پرور واہ۔ اللہ جانتا ہے کہیں اور کہو گے تو ہنسے جاؤ گے اور پھر چلے ہیں دُلہن سے مقابلہ کرنے۔ کاہے ہیں دُلہن سے مقابلہ کرو گے۔

شہزادہ۔ اب جواب تو میں اس کا ضرور دیتا مگر تمھاری بہن چٹکیاں لے رہی ہیں۔

روح۔ جھوٹے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ اس بیچاری کا تو ہاتھ الگ ہے۔ یہ تہمتیں تراشتے ہو۔ کیوں صاحب اس جھوٹ کے صدقے اس تہمت کے قربان۔

شہزادہ۔ تم سب تو اپنی بہن کی سی کہا چاہو۔ ہماری طرف کا کوئی ہوتا تو ہمارا جنبہ کرتا۔ اچھا تم دُلہن ہی سے پوچھ لو۔

روح۔ سپہر آرا لاتمھیں ہمارے سر کی قسم سچ سچ بتانا تم نے چٹکی لی تھی یا نہیں بولو صاف صاف اس میں چوری کاہے کی ہے۔ نہ بتاؤ گی تو ہمیں رنج ہوگا یہاں کوئی بڑی بوڑھی تھوڑا ہی ہے۔ بولو تمھیں اللہ کی قسم جو نہ بتاؤ۔

شہزادہ۔ واہ بتا چکیں۔ اے لو پھر چٹکی لی۔

سپہر آرا نے روح افزا کے کان میں کہا مجھ سے چاہے جس کی قسم لو۔ میں نے چٹکی وٹکی تو نہیں لی۔ مگر یہ اس شیطان دُور سے ان کو صورت دکھاتا ہو تو میں نہیں جانتی۔

روح افزا بولی۔ اہا جبھی چونک چونک اٹھتے ہیں۔ میں بھی کہتی تھی یا خدا کیا سبب ہے۔ یہ آج معلوم ہوا۔ لو صاحب اب تو ہماری بہن نے بھی آپ کو جھوٹا بنایا۔ اب تو ذرا شرماؤ۔ مگر چھچھوری منہ پر لوئی تو کیا کرے گا کوئی۔ بے حیا کے بیسوں بسوے۔ شہزادہ نے کہا یوں تو یہاں جتنی ہیں سب شوخ و شنگ پری چہرہ، دلربا شیریں ادا حاضر جواب، تیز طبیعت زبان دراز ہیں۔ مگر روح افزا بیگم سب سے بڑھ کے معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی باتیں بڑی گرما گرم ہیں۔ اُف ری شوخی سیماب کو شاید قرار نہیں۔ اور بے ادبی معاف ایک ایک بوٹی پھڑکتی ہے۔

تخت کی رات

یوں تو عروس ماہ سیما سپہر آرا کا جوبن سادگی میں بھی عطیۂ خدا داد دکھاتا تھا۔ مگر آج جوبن خود اس کے جوبن کی بلائیں لیتا ہے اور کیوں نہ ہو تخت[1] کی رات ہے۔ کون رات جو رشک لیلۃ القدر ہے اور غیرت لیلۃ البدر ہے۔

ہاتھوں کی مہندی رنگین ادا معشوقوں کو خون رلاتی اور دست نازک کی نزاکت دیکھ کر ناز کی شرما جاتی۔ حنائی انگلیوں میں ہیرے بھری انگوٹھیاں اور گوری گوری کلائی میں کالی کالی چوڑیاں اور جڑاؤ کڑے شیر دہان۔ پیارے پیارے کانوں میں بجلیاں اور اتیاں نیلم زبرجد میں چمپکے کی جھلک جیسے اندھیری رات میں کرمک شب تاب کی چمک۔

سپہر آرا نے کہا ہم کچھ غرور کی راہ سے نہیں کہتے۔ اللہ جانتا ہے آج ہمیں اپنی صورت روز سے کہیں اچھی نظر آتی ہے یا شاید آنکھیں دھوکا دیتی ہوں۔ خواص بولی، چاند میں داغ ہے حضور میں داغ نہیں۔

سپہر۔ آج وہ بھی بہت نکھر کے آئیں گے ہے کہ نہیں؟

خواص۔ ہاں حضور اور وہ تو روز ہی نکھرے رہتے ہیں۔

سپہر۔ ماشاء اللہ خوش رو اور کلے ٹھلے کے گبھرو ہیں۔

خواص۔ ہاں اس میں کیا شک ہے جو عورت دیکھتی ہے گھنٹوں دیکھا کرتی ہے۔ اوّل تو شہزادے۔ شہزادگی کا رعب کہاں جائے، دوسرے قبول صورت۔ تیسرے ابھی سبزہ آغاز بھی نہیں۔ مسیں بھی اچھی طرح نہیں بھیگی ہیں اور ہاتھ پاؤں ماشاء اللہ سے اچھے ہیں۔ پھر آرام کتنا ہے کسی بات کی خدا کے فضل سے کمی نہیں۔ فکر پاس پھٹکنے نہیں پاتی اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

جب مشاطگان کامل فن سلیقہ شعار دلہن کو سنوار چکیں اور سپہر آرا بیگم چھم چھم کرتی ناز و ادا سے قدم دھرتی ہوئیں اس کمرے میں تشریف لائیں۔ جہاں ان کی سسرال کی مخدرات[2] بیٹھی تھیں خورشیدی بیگم اور نواب بیگم نے بھاوج کو از سر تا پا دیکھا تو خوش ہوئیں کہ بھائی نے اچھی بیوی پائی۔

الغرض دلہن کو کمرے میں پلنگ پر بٹھایا گیا۔ دولہا کی عزیز مسن[3] عورتیں ہمراہ گئی تھیں۔ دولہا کو کمسن عورتوں نے بہت چھیڑا۔ ان میں دو چار دولہا کی عزیز تھیں دو چار غیر تھیں۔ دولہا سے ان کمسنوں نے کہہ دیا تھا کہ ذری خبردار رہیئے گا۔ تاک جھانک ضرور ہوگی۔ انھوں نے کہا خیر کیا مضائقہ ہے۔ شوق سے خوب دل کھول کر تاک جھانک کیجیے۔ دلہن کی ایک بھولی عروس کی والدہ سے اصرار کر کے ہمراہ عروس آئی تھی۔ اس سے دولہا کی عزیزوں نے وہاں پھر چہل[4] کی وہ اکیلی پڑ گئی۔ گو وہ طبیعت کی تیز تھی مگر ان سب سے عہدہ برا ہونا مشکل ہو گیا۔ ہاں اگر جانی بیگم یا نازک ادا بیگم ساتھ جاتیں تو ہزار میں نبدنہ ہوتیں۔ جب دلہن کو مسن عورتوں نے پلنگ پر بٹھایا تو دولہا کو بلوایا اور دلہن نے پانی پینے کو مانگا اور دولہا نے پانی مانگا۔ مسکرا کر کہا۔ خدا کرے شل پانی کے تم سے برتاؤ کروں۔ دلہن کو اس پر ہنسی آئی مگر ہنسنے کا وہ کون موقع تھا؟

---

[1] شادی۔

[2] مخدرات = خواتین۔ [3] مسن = عمر رسیدہ۔ کہن سال معمر۔ [4] چہل = دل لگی۔ ہنسی۔ مذاق۔

شہزادہ - اب یہ حیا کیسی اور یہ حجاب کیسا اور خوف کس کا۔
سپہر - (لجاکر) کچھ خیر ہے ۔سیدھی سیدھی باتیں کرو۔ میری جان کے دشمن ہوئے تھے وہ تو کیوں ان شاہ صاحب کا خدا بھلا کرے اللہ کرے جو آرزو اُن کے دل میں ہو وہ پوری ہو جائے بڑے گاڑھے وقت آڑے آئے ورنہ اب تک خدا جانے ہمارا کیا حال ہوتا۔
شہزادہ - جانِ من - خدا را اس قسم کی گفتگو نہ کرنا - ورنہ میرے اور تمھارے دونوں کے لیے بُرا اور دونوں کے حق میں مضر ہے اتنا یاد رکھنا۔
سپہر - اچھا مانا۔ مگر کل سے باغ میں چل کے رہو۔
شہزادہ - اس میں کچھ قباحت نہیں۔ جو کہو حاضر ہوں اور خصوصاً اس وقت کہیں، اس وقت کی خصوصیت کیوں کی بولو؟
سپہر - (شرماکر) اللہ جانے میں ایسی باتیں نہیں سمجھتی۔
شہزادہ - اور مہتابی پر سے گھورا کرتی تھیں۔ کیوں صاحب۔
سپہر - (شہزادے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) اچھا پھر کیوں شادی کی جانتے تو تھے کہ مہتابی پر سے گھورا کرتی ہے کسی نے زبردستی کی ہے۔
شہزادہ - ہاں ہمارے دل نے اوہ مجھے وہ خوب یاد ہے جب عاشق النسا بیگم بن کر میں تمھارے ہاں گیا تھا اور گلے ملا تھا۔
سپہر - بھلا یہ کون بھل مانسی تھی جی کیوں صاحب آخر بتاؤ یہ کون بھل مانسی تھی دیکھ تو شرماتے نہیں اوپر سے ہنستے ہو۔ واہ واہ ماشاءاللہ۔
شہزادہ - اور پتنگ یاد ہے جس پر ایک شعر لکھا تھا۔
سپہر - بھولے کوئی اور ہو گے مگر اللہ جانتا ہے تم نے بڑی بڑی شرارتیں کی تھیں۔
بعد مدت کے یہ نوبت آئی۔ شب وصل نے صورت دکھائی۔ دولھا دُلہن سے ملا۔ شادمانی و کامرانی کا وقت ہے۔ ایک تو دولھا جوان گلبدن، دوسرے عروس نوخیز شاخ سمن ؎

اور سامان وہ قیامت کا — وہ نکھار اس پری کا آفت کا
وہ مسہری پہ سیج پھولوں کی — وہ شب عیش دل ملولوں کی
وہ لبوں سے بہم لب مے نوش — گرم اُس منہ سے بالۂ آغوش

شہزادۂ رشکِ سنجر سکندر فرشاہد آرزو سے ہم آغوش ہوئے اور عروس حور پیکر کی دل کی کلی کھلی تو میٹھی میٹھی باتیں ہونے لگیں۔
سپہر - جس وقت میں گھوڑے پر سوار ہو کر کسی کے مزار پر گئی ہوں اوہ عجب حال دل تھا۔ میں کچھ بیان نہیں کر سکتی۔
شہزادہ - اُف اُف۔ اُف۔ از برائے خدا آج کی شب تو ان باتوں کا ذکر تک نہ کرو۔ یہ کیا ستم ڈھاتی ہو۔ خدا کا واسطہ خاموش رہو۔
پچھلے کے وقت دونوں کی آنکھ لگ گئی۔

بر بستر لالہ مست خفتند — از نکہت گل فسانہ گفتند

یہ شب بھی یادگار تھی۔ روز عید سے زیادہ مسرت بار تھی۔

ہمایوں فر کی نسبت شک

اب سُنیئے مرزا ہمایوں فر بہادر کے دوبارہ زندہ ہوجانے کی خبر گھر گھر مشہور ہوئی۔ انگریزی اخباروں کے نامہ نگاروں نے تار کے ذریعے سے ایڈیٹروں کو اطلاع دی۔ اُردو اخباروں میں مختلف طرز کے بیان چھپے۔ ایک اخبار نے اس کل معاملے کو خدا کی قدرت پر چھوڑا، اور لکھا کہ ہمارے ملک کے شہزادہ گردوں بلا رہم اقتدار حضور پرنس ہمایوں فر بہادر کا دوبارہ زندہ ہونا اصلا مقام حیرت نہیں خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ پس جو لوگ حیرت کرتے ہیں وہ بر سر غلط ہیں۔ انھوں نے خدا کی قدرت ابھی تک نہیں پہچانی۔ ہم نے مرزا ہمایوں فر بہادر کو اس مرتبہ نہیں دیکھا مگر ہزاروں آدمیوں نے شہادتیں دیں کہ وہی ہیں، یہاں تک کہ ان کی ماں نے ان کو پہچانا۔ ان کی بہنوں نے پہچانا۔ ان کے احباب نے پہچانا اور حسب پابندیٔ قواعد و اصول شرع متین نکاح بھی ہوگیا۔

مرزا ہمایوں فر کا دوبارہ زندہ ہوجانا نئے فیشن کے نوجوانوں خصوصاً نیچریہ لوگوں کو حیرت میں ڈالتا ہے لیکن وہ لوگ اس قدر متعصب ہیں کہ اس امر اہم کو خلاف نیچر سمجھ کر کہتے ہیں کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ بچشم خود کل امور دیکھ رہے ہیں مگر تعصب سے خدا سمجھے۔

انگریزی اخباروں نے بھی ایسی ہی رائے ظاہر کی۔ حاکم ضلع نے انسپکٹر پولیس اور صاحب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو بلایا اور تخلیے میں ان سے یوں گفتگو کی۔

کلکٹر ۔ مرزا ہمایوں فر از سر نو زندہ ہوگئے یہ کیا بات ہے؟

کپتان ۔ خدا جانے یہ کیا ماجرا ہے اور سارا شہر کہتا ہے کہ وہی ہیں۔ ہم نے ان کو کبھی دیکھا نہیں۔

کلکٹر ۔ ہمیں سخت تعجب ہے کہ یہ لوگ یقین کیوں کر کر لیتے ہیں۔

کپتان ۔ حضور یقین تو ہم کو بھی ہے اور کیونکر نہ ہو۔

کلکٹر ۔ ایک اخبار نے رائے دی ہے کہ قبر کھودی جائے اور ایسا ضرور ہوگا ہم کل تک حکم دیں گے کہ قبر کھودی جائے۔

انسپکٹر ۔ ہاں کچھ تو حال ضرور ہی معلوم ہوجائے گا۔ اچھی بات ہے۔

کلکٹر ۔ دنیا بھر کہہ گئی ہم باور نہ کریں گے اور کیونکر باور کریں۔

انسپکٹر ۔ آپ خود شہزادی بیگم تک چلے چلیں۔

صاحب کلکٹر نے کہا ہم بلا اطلاع دیئے ہوئے چلتے ہیں تاکہ دفعتہً اُن کے مکان پر پہنچ جائیں اور فوراً شہزادے کو بلائیں الغرض حکام اور انسپکٹر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دَن سے شہزادی بیگم کے مکان پر موجود۔ یورپین حکام کی صورت دیکھ کر نوکر چاکر آدمی گھبرائے کہ خیر باشد اور سب سے بڑھ کر خیال یہ ہوا کہ کوتوال صاحب کیوں ساتھ ہیں۔

مرزا ہمایوں فر کے بھائی نے سب سے ہاتھ ملایا۔ عزت کے ساتھ بٹھایا اور باتیں کرنے لگے۔

صاحب ۔ شہزادہ صاحب زندہ ہوگیا۔ آپ کو مبارک ہے۔

بھائی ۔ تسلیم۔ میں آپ کی ہمدردی کا کمال شاکر ہوا۔

صاحب - کہاں ہے شہزادہ صاحب - آپ ہمارا اطلاع دیں۔
بھائی - وہ تو محلسرا میں ہیں مگر میں خود اطلاع کر دوں گا - آپ تشریف رکھیئے میں حاضر ہوتا ہوں۔

زنانے میں خبر ہوئی تو شہزادی بیگم نے کہا، ہم بلا حکم کے ان کو اب باہر نہیں بھیج سکتے - پہلے شاہ صاحب سے اجازت لاؤ پھر ان کو لے جاؤ - اس میں صاحب ہوں یا کوئی ہوں - سپہر آرا کو جو خبر ہوئی تو شہزادے کا دامن پکڑ کے بیٹھ گئی - کہا بھلا تم جاؤ تو - چاہے اِدھر کی دنیا ادھر ہو جائے ہم نہ اُٹھنے دیں گے - تم باہر جانے کا نام زبان پر لاتے ہو ہمیں وہم ہوتا ہے - ازبرائے خدا کچھ دن تو کہا مانو - شہزادہ بوسہ لے کر بولا بدل وجان اس وقت کیا معنی؟ جس وقت کہو جاؤں کہو نہ جاؤں - ایک ادنٰی سی بات کے لیے اس قدر اصرار کیوں کرتی ہو - دل وجان سے فرمانبردار ہوں - خدا کرے ہم دونوں عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

اب لیجیئے کہ شاہ صاحب رنگ لائے؟ ان سے جو دریافت کیا گیا کہ مرزا ہمایوں فر کی ملاقات کو صاحب کلکٹر آئے ہیں جائیں یا نہ جائیں - ملیں یا نہ ملیں؟ تو صاف انکار ہرگز نہ ملیں - محلسرائے سے باہر آئے اور میں چلدیا - بذریعہ تحریر ملاقات ہو - صاحب کلکٹر سے کہا گیا تو انھوں نے گردن ہلائی کہا اچھا ہم کچھ لکھ دیتے آپ شاہزادے کو دیں اور اس کا جواب لا دیں - شہزادی بیگم نے کہا اس میں عذر نہیں ہے - مرزا ہمایوں فر نے خط پڑھا اور اس کا جواب لکھا۔

My Dear Sir,

Yes I am Prince Hom-yun Far Bahadur. I dont know weher I was dead or alive, but I have come to know one thing that there are certain secret fares in nature bey and the good of the Europeans

Your Sincerely,

Mirza Homayun Far.

صاحب کلکٹر نے پڑھا تو مسکرائے اور کپتان صاحب بھی ہنسے کلکٹر صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور ہمایوں فر کی تحریر کا اس سے مقابلہ کیا تو یکساں جب صاحب ممدوح بنگلے سے آئے تھے تو مرزا ہمایوں فر کا خط ساتھ لائے تھے - دونوں کو ملایا تو بالکل ایک۔

صاحب کلکٹر ہمایوں فر کے بھائی کو علیحدہ لے گئے - پوچھا آپ کو خوب معلوم ہے کہ یہ ہمایوں فر ہی ہیں۔

کلکٹر صاحب نے مرزا ہمایوں فر کے بھائی سے ایک گھنٹے کامل تخلیئے میں باتیں کیں اور خوب سمجھایا کہ آپ پھر جا کر غور و تعمق سے دیکھیئے کہ وہی ہمایوں فر ہیں یا کوئی اور وہ لڑکا ہنسا اور ہنس کر بولا - آپ کو یقین ہی نہیں آتا - میں پردہ کرائے دیتا ہوں - آپ خود چل کر گفتگو کر لیجیے - دونوں حکام اس پر راضی ہوئے - لڑکے نے جا کر شہزادی بیگم سے کہا - اماں جان پردہ ہو جائے تو وہ آکے دیکھ لیں۔
شہزادی بیگم - نا پہلے شاہ صاحب سے دریافت کر لو بیٹا۔
لڑکا - اس میں کیا ہرج ہے اماں جان - یہ تو کوئی قباحت کی بات نہیں ہے ذرا ذرا سی بات میں گھڑی گھڑی شاہ صاحب کو کیوں دق کریں۔ آئندہ جو آپ کی رائے ہو۔

شہزادی بیگم ۔ مہری! جا کے دریافت کرلو۔ ہماری طرف سے آداب عرض کرو اور کہو پوچھتی ہیں کہ صاحب لوگ اوپر جا کے دیکھ لیں۔ صرف یہی عرض ہے۔

مہری (تھوڑی دیر کے بعد) حضور فرمایا ہے کہ شہزادے شہ نشین میں رہیں جو طرفہ سے بند ہو۔ باتیں کرنے میں ہرج نہیں مگر چار آنکھیں نہ ہونے پائیں۔

شہزادی بیگم ۔ جاؤ کہہ دو ۔ ہم بندوبست کیے دیتے ہیں۔

مرزا ہمایوں فر سے جب شہزادی بیگم نے یہ سب بیان کیا تو کھلکھلا کر ہنس پڑے ۔ یہ کہہ کر شہزادی بیگم چلی گئیں اور ادھر سپہر آرا نے ہزاروں قسمیں دیں کہ خدا کے واسطے تم تلے نہ جانا، تمہاری صورت ان کو نہ دیکھنے دونگی۔

اتنے میں دونوں حکام معہ انسپکٹر صاحب کے آئے ۔ دو نواب زادے ہمایوں فر کے اعزہ ہمراہ تھے۔

کلکٹر۔ وِل پرنس ہمایوں فر یہ سب کیا بات ہے ؟

شہزادہ۔ خدا کے کارخانے میں کسی کو دخل نہیں۔

کلکٹر۔ آپ وہی ہمایوں فر ہیں یا کوئی شخص؟

شہزادہ۔ (مسکرا کر) کیا خوب ۔ اب تک شک ہے ۔ وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہ تھی ۔ مجبوری ہے۔

کلکٹر۔ ہم نے آپ کو کچھ دیا تھا۔ آپ نے پایا یا نہیں؟

شاہزادے نے کہا ۔ مجھے یاد نہیں۔ کلکٹر صاحب نے کئی سوال کیے اور باہر آن کر کپتان صاحب سے کہا کہ یہ شخص ہرگز ہمایوں فر نہیں ہے ۔ ابھی حکم ہو کہ قبر کھودی جائے ۔ شہر بھر میں ہلڑ ہو گیا کہ شہزادے کی قبر کھودی جائے گی ۔ صاحب کلکٹر نے جو اُن سے باتیں کیں تو شک ہوا کہ ہمایوں فر نہیں ہیں۔ شہزادی بیگم اور بڑی بیگم اور حسن آرا نے یہ خبر سُنی تو دھک سے رہ گئیں ۔ استانی جی کو اس خبر کے سنتے ہی غش آ گیا۔

خواجہ بدیع مبرور

ساقی بیا کہ شد قدح لالہ پُر زمے
طامات تا بچند و خرافات تا بکے

کچھ دن تک تو آزاد پاشا مصر میں اس طرح رہے جس طرح اور مسافر رہتے ہیں۔ مگر جب کانسل کو اُن کے آنے کا حال معلوم ہوا۔ اپنے اٹاچی کو کہ ہندی تھے ہوٹل بھیجا اور کہا اُن سے کہو یہاں آئیں اور ہمارے مہمان رہیں۔ اٹاچی نے ہوٹل میں آن کر آزاد سے ملاقات کی اور بہت تپاک ظاہر کیا۔

اٹاچی۔ مجھے کانسل نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ ان کو سخت شکایت ہے کہ آپ آئیں اور ہم سے نہ ملیں۔ جس بسالت اور شجاعت سے آپ نے میدانِ جنگ میں کارنمایاں کیے اس کا شہرہ دُور دُور تک ہوا۔ ایسا شاذ ہی کوئی ہو گا جو آزاد پاشا کے نام نامی سے واقف نہ ہو۔ جو اخبار آتا ہے اس میں آپ کا ذکر خیر ضرور ہوتا ہے۔ وہ آپ کے ساتھ مسخرہ کون ہے۔ وہ بونا خوجی۔

آزاد۔ (مسکرا کر خواجہ صاحب کی طرف اشارہ کیا) یہ صاحب۔

خوجی۔ جی وہ مسخرے اور بونے کوئی اور ہونگے۔ اور خوجی خدا جانے کس بھکوے کا نام ہے۔ ہم جناب غفران مآب خواجہ بدیع الزماں بدیع خوش مذاق لطیفہ گو مسخرے کے پڑوس نہیں رہتے اور بونے کی ایک ہی کہی۔ ہائے میں کس سے کہوں کہ میرا بدن چور ہے۔ بونا لائے وہاں سے۔ ہونہہ!

آزاد۔ خواجہ صاحب کا ذکر مذکور بھی اخبار میں پڑھا ہو گا۔

کانسل۔ جی ہاں۔ ان کی بڑی دھوم ہے۔ مگر ایک مقام پر تو واقعی انھوں نے کار نمایاں کیا۔ خواجہ صاحب کا ذکر کانسل صاحب سے بھی رہا ہے۔

خوجی۔ خواجہ مذکور۔ خواجہ مذکور کوئی اور ہوں گے۔ ہم خواجہ موصوف ہیں اور خواجہ ممدوح کہو۔ خواجہ صاحب محتشم الیہ کہو خواجہ مذکور نعفروں کو کہتے ہیں۔

آزاد۔ گستاخی ہوئی۔ مذکور نہیں خواجہ مبرور سہی بس۔

خوجی۔ ہاں یہ مانا۔ خواجہ صاحب مبرور تک خیریت ہے۔

اٹاچی۔ آپ کا دولت خانہ کس شہر میں ہے؟

خوجی۔ جناب بندے کا دولت خانہ اودھ کے بیچ میں ہے

راوی۔ بہت ہی غلط ہے۔ کرسی[1] نہیں گو پامئو[2] سہی۔

کانسل۔ مجھے اس وقت سخت حیرت ہے کہ اتنے ننھے ننھے تو آپ کے ہاتھ پاؤں۔ یہ جنگ میں آپ کس بوتے پر شریک ہوئے تھے؟

---

[1] اودھ کا ایک قصبہ جہاں کے بیوقوف مشہور ہیں۔ [2] یہ بھی اودھ کا ایک قصبہ ہے یہاں کے بیوقوف بھی مشہور ہیں۔

خوجی (مسکراکر) یہی تو کہتا ہوں حضرت کہ بندۂ درگاہ کا بدن چور ہے۔ دیکھیئے ذرا ہاتھ ملائیے۔ یہ فولاد کی انگلیاں یا نہیں۔ ہر رگ پے میں فولاد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور اگر ابھی زور کروں تو آپ کی ایک آدھ انگلی توڑ کے رکھ دوں۔

اٹاچی کو غصہ آیا کہ مرا ہوا آدمی اور ہماری انگلیاں توڑنے کا زعم۔ جھلا کر انگلیاں ذرا کڑی کیں تو خواجہ بدیع مبرود کی جان پر بن آئی اور چیخ کر کہا۔ اوگیدی اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ یاد کرے گا۔ آزاد ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے۔ اٹاچی سے کچھ دیر تک گفتگو ہوئی۔ آزاد نے وعدہ کیا کہ شام کو ضرور حاضر ہونگا۔ اٹاچی سے رخصت ہوئے۔

خوجی۔ یہ آپ کی عجیب عادت ہے کہ اغیار نا ہنجار کے سامنے اتنے بڑے لائق اور سورما اور مبرور دوست کی ہجو کرتے ہو اور جو ہاتھ ٹوٹ جاتا تو کیسی ٹھہرتی۔ میں مارے مروّت کے بولا نہ چاہوں ورنہ میاں کی سٹی بٹی بھول جاتی۔

آزاد۔ یہ حضور ہر مقام پر مروّت کو کیوں دخل دیتے ہیں۔ ایسی مروت کیا جس سے خواہ مخواہ جوتیاں کھائے۔ کئی مقام پر آپ پٹے، کئی مقام پر آپ نے جوتیاں کھائیں کئی مقام پر ذلیل ہوئے مگر مروّت نہ چھوڑی نہ چھوڑی۔ ایک دن اس مروت کی بدولت کہیں کالی ہوس نہ بھیجے جائیے۔

خوجی۔ (مسکراکر) ارے میاں دل ہی تو ہے (چونک کر) کیا کہا کیا کہا جوتیاں کھائیں نکالے گئے۔ کس مردک نے جوتیاں کھائیں اور کس مردک نے لگائیں۔

آزاد۔ کیوں خواجہ صاحب۔ جب ان سب نے ہمارا حال سُنا تو کیا حسن آرا نے نہ سنا ہوگا۔

خوجی۔ ضرور بالضرور۔ اب آج کے آٹھویں دن شادی ہوگی۔ استاد ذرا دو ایک روز بمبئی میں ضرور رہنا۔ یہ مصرعہ اس وقت نظر کے سامنے ہے ؎

گر بہ سنبل کدہ روضۂ رضواں رفتم
ہوسِ زلف ترا سلسلہ جنباں رفتم

خواجہ صاحب نے بڑی خوشی ظاہر کی کہ کانسل اور اٹاچی صرف آزاد ہی سے نہیں واقف ہیں بلکہ ایں جانب کا نام بھی بخوبی جانتے ہیں۔ فرمایا کیوں بھائی آزاد تم نے جان جوکھم کی تو نتیجہ معقول نکلا حسن آرا سی حسین و مہ جبین بیوی پائی۔ ہم نے جو جان لڑادی تو کیا پایا؟

آزاد۔ یار تم بھی ایک پری کے ساتھ شادی کرلو۔ اب راستے میں تو ہم کہیں ٹھیریں گے نہیں۔ یہیں سے تجویز کرلو۔ ادھر ہندوستان پہنچے اُدھر کھٹ سے شادی ہوگئی۔ مگر کوئی اچھی سی تجویز ہو۔

خوجی۔ سوچو۔ پھر سن سال زیادہ نہ ہو۔ اور شکل صورت اچھی ہو۔ بس ہم تو صرف اس قدر چاہتے ہیں۔ دو باتیں ہوں۔

آزاد۔ حسن آرا کے مکان کے پاس ایک درزی رہتا ہے۔ اس کی بیوی بس کچھ نہ پوچھو۔ رنگت تو سانولی ہے مگر ایسی نمکین کہ میں کیا کہوں اور ابھی کمسن۔ بہت ہو بہت ہو کوئی چالیس بیالیس۔

خوجی۔ بھلا فیڈا ایں اور اس میں کیا فرق ہے؟

آزاد۔ یہ ان سے دو چار برس کم سن ہیں یہ سرخ و سفید ہیں وہ نمکین ہے۔ بس اتنا فرق ہے اور کچھ نہیں۔

خوجی۔ اسم شریف ان کا کیا ہے مسلمان ہے نا؟

آزاد۔ اور نہیں تو کیا ہندنی کے ساتھ شادی کروگے۔ عجیب بیوقوف آدمی ہو۔ نام شتاب جان ہے۔

خوجی - مگر پکی پوڑھی بات تو ہوئے پہلے۔
آزاد - آپ کو اس سے کیا واسطہ؟ کچھ تو سمجھ کے ہم نے کہا ہے۔ ہمارے پاس اس کا خط آیا تھا کہ خواجہ صاحب اگر منظور کریں تو میں حاضر ہوں۔
خوجی - ہاں - بس اب ہم قائل ہو گئے - بس انشاء اللہ آج کے آٹھویں روز شتاب جان ہماری بغل میں ہوں گی۔ نام کتنا پیارا ہے۔
آزاد - شام کو کانسل سے مل کے چلے چلو، آج ہی۔
خوجی - اجی کہاں کا کانسل ہم کو شتاب جان کی پڑی ہے۔

آزاد کی نواب صاحب سے ملاقات

آزاد کی حسن آرا سے محبت دیکھ کر مِیڈا اور کلیریسا نے طے کر لیا کہ اس سے شادی نہ کریں گی، زندگی بھر کنواری رہیں گی اور عیاسوئی مذہب اختیار کر کے خدمتِ خلق کریں گی۔ ان دونوں مہوشان بدیع الجمال مِیڈا اور کلیریسا کے ساتھ آزاد ہندوستان پہنچ کر حسن آرا کے ہاں جاتے ہوئے ایک مقام پر گذر ہوا تو وہاں کچھ پڑھ کر ایسے بے اختیار ہو گئے کہ ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ ذیل کی سطریں نظر سے گذریں ؎

شورے شد واز خواب عدم چشم کشودیم　　دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

مزار پُر انوار مقبول بارگاہ لم یزلی حق آگاہ عارف باللہ حضرت صف شکن علی شاہ برد اللہ مضجعہ و انار اللہ برہانہٗ ؎

پختہ مکان کی طرح ہے فکر گور بھی　　انسان جان دیتا ہے آرام کے لیے

رہتا ہے آدمی کا نشاں اس جہان میں　　بنتی ہے قبر بعد فنا نام کے لیے

اے خاک تیرہ خاطر مہماں نگاہ دار　　کیں نور چشم ماست کہ در بر گرفتۂ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضرات ناظرین میاں صف شکن علی شاہ سے خوب واقف ہیں۔ فسانۂ آزاد جلد اول میں اس انوکھے بٹیر کا ذکر ضرور درج ہے کہ مصاحبوں نے بھرے دے دے کر نواب صاحب کو خوب تیار کیا اور صف شکن علی شاہ کی اس درجہ تعریف کی کہ انسان تک سے بڑھا دیا۔

نواب کے دربار دُربار کی تصویر آزاد کی نظروں کے سامنے تھی۔ ان دونوں لعبتان سہی قد سے تذکرہ کیا تو اور بھی قہقہے پڑے۔ جب شہر میں پہنچے تو آزاد کو شوق چرّایا کہ جس طرح ممکن ہو نواب صاحب اور ان کے رفقا سے ضرور ملیں۔ مس مِیڈا اور مس کلیریسا کو ہوٹل میں چھوڑا اور گاڑی کر کے نواب صاحب کے دولت خانہ پر آئے۔ ادھر گاڑی سے اُترے ادھر خدمتگاروں اور دربانوں سپاہیوں، خواصوں نے غل مچایا کہ خداوند محمد آزاد پاشا تشریف لائے ہیں حضور آزاد آ گئے، پیر و مرشد آزاد آئے ہیں۔ میاں خوجی بھوت دتھارے آقا آ گئے۔ نواب صاحب، رفقا، مصاحبین، احباب سب کے سب گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ آزاد پاشا رپ رپ کرتے ہوئے ترکی فوجی وردی ڈانٹے چلے آتے ہیں۔ نواب صاحب نے جھپٹ کر معانقہ کیا اور گلے لپٹ گئے اور یوں ہمکلام ہوئے۔

نواب۔ بھائی جان آنکھیں تمہیں ڈھونڈھتی تھیں۔

آزاد۔ بحمد اللہ کہ یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی۔

نواب۔ اہا۔ اب یہ باتیں نہ کرنا۔ واللہ صاحب ضلع اور صاحب کمشنر تک تمہاری ملاقات کے شایق ہیں۔

مصاحب۔ بڑا نام کیا۔ واللہ کروڑوں آدمی ایک آزاد حضور ایک طرف سینہ سپر جاں بکف لڑے۔

نواب۔ ارے بھئی گنگا جمنی حقہ بھر لاؤ آپ کے واسطے۔ آزاد پاشا کو ایسا ویسا نہ سمجھنا۔ میاں میتا بیگ ان کی تعریف کمشنر

یک کی زبان سے سُنی اور سُنا آپ نے شہنشاہِ روس سے بھی ملاقات ہوئی ۔ مگر جب وہ ملنے آئے تو آپ اپنی کرسی ہی پر بیٹھے رہے ۔
بھائی جان اپنے تم نے وہ درجہ حاصل کیا ہے کہ ہم اگر حضور کہیں تو ہمارا فخر ہے کجا شہنشاہ کجا ہم ۔
خوجی ۔ خداوند موچے پر ان کو حضور دیکھتے تو غش غش کر جاتے جیسے شیر کچھار میں ڈکارتا ہے ۔
نواب (ہنس کر) مردود ہمیشہ گدھا ہی بنا رہے گا ۔
خوجی ۔ خداوند اب بندہ وہ خوجی نہیں ہے ۔

اتنے میں نواب صاحب کے ہاں ایک منشی صاحب تشریف لائے ۔

نواب ۔ منشی صاحب آپ کو پہچانا؟
منشی ۔ اخاہ ۔ حضور جنرل محمد آزاد پاشا صاحب ہیں ۔

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میری نطق نے بوسے میری زبان کے لیے

آزاد ۔ جناب میں کس لائق ہوں، من آنم کہ من دانم ۔
نواب ۔ ابھی کمشنر صاحب ان کے مداح ہیں بس اب اور اس سے زیادہ اعزاز کیا ہوگا ۔ بھئی میرے تو فخر ہیں ۔
منشی ۔ دریں چہ شک ۔ بیشک فخرِ قوم ہیں ۔
خوجی ۔ ابھی جناب میدانِ کارزار میں آپ دیکھتے تو غش غش کر جاتے ۔ گھوڑا دبایا اور لاکھ آدمیوں کے پرے میں کڑکڑاتے ہوئے ڈوں سے موجود ۔
منشی ۔ آپ نے بھی بڑا سانٹھ دیا خواجہ صاحب ۔ مگر آپ کی بہادری کا کہیں ذکر نہیں سننے میں آیا ہے ۔
خوجی ۔ آپ ایسے گیدیوں کو میں کیا سمجھتا ہوں ۔ میں نے وہ کارِ نمایاں کیے ہیں کہ باید و شاید ۔ قرولی ہاتھ میں لی اور صفوں کی صفیں صاف کر دیں ۔
منشی ۔ اب کہیے اب تو آپ نواب صاحب کے ہاں بنے ہیں نا؟
خوجی ۔ (آگ ہو کر) بنے ہوں گے آپ بنتے کوئی اور ہیں ۔ بنا کیا معنی؟ کوئی نفرہ مقرر کیا ہے ابے گیدی ۔
نواب ۔ بگڑ گئے حضور ۔ بگڑ گئے ۔ میاں گیدی خر ۔

پیرو مرشد یوں پوچھنا چاہیئے تھا کہ اب تو آپ نواب صاحب بہادر کے ہاں پھر اسی عہدے پر ممتاز ہوئے نا ۔ یہ سب بالائے طاق پوچھا تو کیا پوچھا کہ آپ یہیں بنے ہیں نا ۔
منشی ۔ اچھا جناب معاف فرمایئے ۔ اب یہ بتایئے کہ آپ کی تنخواہ کیا رہ گئی ۔
خوجی ۔ قسم ہے حضور کے قدموں کی ملکوں ملکوں گیا اور ہزار ہا قسم کے آدمی دیکھے مگر آج تک اس فش کا بدتمیز دیکھنے میں نہیں آیا ۔ محض بدسلیقہ مردک پوچھتا ہے کہ آپ کی تنخواہ کیا رہ گئی ہے ۔ صحبت یافتہ لوگ یوں پوچھتے ہیں کہ اب آپ کو کچھ ترقی ہوئی یا نہیں؟
میر صاحب ۔ کیوں خواجہ صاحب پہاڑ تو آپ نے کثرت سے دیکھے ہوں گے ؟
خوجی ۔ ایک دو؟ کروڑوں ۔ مگر جو لطف وہاں ہے اس سے زیادہ لطف اور کہیں نہیں ہو سکتا ۔ بلندی کی یہ کیفیت کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں ۔

نواب۔ بھلا آسمان وہاں سے کس قدر بلند رہ جاتا ہے؟
خوجی۔ حضور کوئی ایک دن کی راہ ہے گز نہ کہا۔
نواب۔ اور کیوں صاحب وہاں سے تو بخوبی معلوم ہوتا ہوگا کہ مینہ کس جگہ سے آتا ہے؟
خوجی۔ خداوند پہاڑ کی چوٹی پر ہیں تھا اور مینہ نیچے برس رہا تھا۔ یہ ایک ہی دفعہ نہیں دیکھا بلکہ صد ہا بار ہم اوپر سے دیکھ رہے ہیں کہ نیچے مینہ برستا ہے اور جہاں ہم ہیں وہاں کچھ بھی نہیں۔
نواب۔ کیوں صاحب یہ سچ ہے عجیب بات ہے بھئی۔
آزاد۔ جی ہاں پہاڑ کے نیچے بارش ہوئی اور ہم پہاڑ پر سے دیکھ رہے ہیں۔
مصیبتا۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ بادل تالابوں میں پانی پیتا ہے۔
خوجی۔ یہ تم ایسے گدھوں میں مشہور ہوگا،
نواب۔ (مسکرا کر) بدلا نکالنے کا اچھا موقع ملا ہے۔
مصیبتا۔ خداوند تمام زمانے میں مشہور ہے کہ پانی پی پی کے اڑتا ہے تو اس کے پیٹوں سے پانی گرتا ہے۔
نواب۔ بھئی یہ تجربہ کار لوگ ہیں جو بیان کریں وہ صحیح ہے۔
خوجی۔ اور خداوند دریا کے مخزن ہم نے دیکھے۔
نواب۔ (زبان دبا کر) مخزن؟ دریا کا مخزن؟
خوجی۔ ہاں خداوند جہاں سے دریا نکلتا ہے عجیب مقام ہوتا ہے۔ دریائے ڈینوب کا نام آپ نے سنا ہی ہوگا۔ اتنا بڑا دریا ہے کہ سمندر اس کے مقابلے میں شرما جائے اور مخزن جو جا کے دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ حضور اتنا بڑا زخار دریا اور ایک رئیس کے دیوان خانہ کے احاطے سے نکلا ہے۔
میر صاحب۔ ایں! ہمیں یقین نہیں آتا سب غلط ہے۔
خوجی۔ یہ لوگ واللہ کنویں کے مینڈک ہیں۔
نواب۔ مکان کے احاطے سے۔ جیسے یہ ہمارے مکان کا احاطہ۔
خوجی۔ بلکہ اس سے بھی چھوٹا۔ حضور خدا کی خدائی ہے اس میں بندے کو کیا دخل ہے بیچارے کو۔ اے توبہ ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم	وز ہر چہ گفتہ ایم شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر	ما ہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

اور خداوند ہم نے ایک مقام پر دیکھا کہ جس قدر شہر ہے سب لب دریا ہی بسا ہے اور صرف ایک قطار۔ ایک صف۔ اسی میں دکانیں اسی میں مکان اسی میں کوٹھیاں۔ اسی میں محل اور ایوان سب اس میں اور دریا کے اس پار باغ۔ امیر اور غریب سب دریا کی روانی کے مزے اٹھاتے ہیں اور سامنے باغ لہلہاتے ہیں اور دوسری سمت جنگل اور فضا اور خداوند استنبول میں ایک جانور خانہ ہے۔
میر صاحب۔ تم کو دھوکے سے کسی نے اس میں بند نہیں کر دیا۔
خوجی۔ بس ان جانگلوؤں کو اور کچھ نہیں آتا۔

نواب - اجی تم اپنا مطلب کہو۔ اس جانور خانے میں کوئی نئی بات تھی۔
خوجی۔ خداوند ایک تو ہم نے بھینسا دیکھا۔ بھینسا کیا تھا ہاتھی کا پاٹھا تھا اور ناک کے اوپر ایک سینگ۔ ہم ارنا بھینسے سے بڑا ہوتا ہے۔ نہایت قوی ہیکل جانور۔ بڑا گرانڈیل اور طاقتور۔ اتفاق سے جس مکان میں بند تھا۔ اس کی سلاخوں میں سے تین سلاخیں ٹوٹ گئیں اور وہ جناب سمٹ سمٹا کے نکلا تو معاذ اللہ کا مقام ہے بس کچھ نہ پوچھو ہوش اڑ گئے۔ دو ہزار آدمی گد بد ایک کے اوپر دوسرا اور دس پر سو اس طرح گرے کہ بیہوش۔ کوئی چار پانچ سو آدمی زخمی ہوئے۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا، کسی کا منہ ٹوٹا، کسی کا سر پھوٹا اور چوبیس آدمی جان سے گئے۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ اگر تم بھی بھاگتے ہو تو بڑی ہنسی ہوگی۔ لوگ کہیں گے کہ یہ کیدانی کیا کرتے تھے۔ ذرا سے ارنے بھینسے کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ گو ہزاروں آدمی بھاگے مگر ان میں اور ہم میں فرق تھا نہ خیر قبلہ بس ایک دفعہ جھپٹ کے جا تا ہوں تو گردن ہاتھ میں آئی بس بائیں ہاتھ سے گردن دبائی اور دبوچ کے بیٹھ گیا۔ پھر لاکھ لاکھ زور مارے اُس نے، بہت تڑپا۔ مگر کیا مجال ہمٹنے نہ دیا۔ میں نے جھنجھوڑ ڈالا۔ ذرا گردن ہلائی اور مَیں نے دبوچا۔ جتنے آدمی کھڑے دور سے تماشا دیکھ رہے تھے سب دنگ ہوگئے کہ واہ رے پہلوان اور چو طرفہ سے تعریفیں ہونے لگیں۔

آدمی کاہے کو ہے دیو کا بچہ ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ حریف کا دم ٹوٹ گیا تو بآواز بلند للکارا[1]

کب اپنے مُنہ سے عاشق شکوۂ بیداد کرتے ہیں — دہانِ غیر سے ہم مثلِ نَے فریاد کرتے ہیں
رقم کرتا ہوں جس دم کاٹ تیری تیغِ ابرو کا — گریباں چاک اپنا جامۂ فولاد کرتے ہیں
جو یہ سچ ہے نہیں بے حکم جنبش ایک غنچے کو — تو بس ہم وہ ہی کرتے ہیں جو آپ ارشاد کرتے ہیں
جسے یہ ذبح کرتے ہیں نہیں پھر دیکھتے اس کو — یہ بُت اللہ اکبر کس قدر بیداد کرتے ہیں

مسیتا۔ اس کے کیا معنی؟
خوجی - واہی ہو۔ بس حضور میں نے کان پکڑا تو اس طرح ساتھ ہوا جیسے بکری۔ اسی کٹہرے میں پھر بند کر دیا۔
نواب۔ کیوں صاحب، سچ ہے یہ روایت؟
آزاد۔ میں اس وقت موجود نہ تھا، شاید سچ ہی ہو۔
میر صاحب۔ بس بس قلعی کھل گئی۔ غضب خدا کا، جھوٹ بھی تو کتنا کہ گردن دبائی اور ہمٹنے نہ دیا۔ اس کفر پر تو جی چاہتا ہے کہ اٹھا کے گدّا دوں کہ دس گز زمین میں گڑ جائے نامعقول۔ گینڈے سے تو پیچھے لڑیئے گا پہلے ہم سے تو ہاتھ ملائیے۔ بڑے پہلوان بنے ہیں۔
خوجی۔ قسم ہے خدا کی جو ایک کوئی کلمہ زبان سے نکلا تو اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ عمر بھر یاد کرے گا۔ تو اپنے دل میں سمجھا کیا ہے؟ یہ سوکھی ہڈیاں لوہے کی سلاخیں ہیں۔

نواب صاحب نے آزاد سے دریافت کیا کہ گو آپ اس وقت وہاں نہ ہوں مگر یہ تو فرمائیے کہ اتنے بڑے جانور سے انسان ضعیف البنیان مقابلہ کر سکتا ہے بھلا۔

آزاد تو خوجی سے وعدہ کر چکے تھے ان کا رنگ پھیکا نہ ہونے دیں گے۔ انھوں نے کہا نواب صاحب بات یہ ہے کہ

---

[1] ہلنا۔

بعض آدمیوں کو ملکہ حاصل ہے کہ ادھر جانور کو دیکھا ادھر اس کی گردن پکڑی ہاتھ شہ رگ کو اس ترکیب سے دبایا کہ پھر جانور کسی مصرف کا نہ رہے۔ اگر خواجہ صاحب کو بھی یہ ترکیب معلوم ہے اور یہ بات ٹھیک ہے تو استعجاب کا مقام نہیں۔

نواب۔ بس اب ہم کو یقین آگیا۔

مسیتا۔ ہاں خداوند کیا عجب ہے۔ ایسا ہی ہو۔

رفیق۔ صاحب یوں ہی ہے کہیے جب حضور کے ذہن میں ایک بات آگئی تو آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔

مصاحب۔ حق ہے یہی بات ہے۔ بھائی جان یہی بات ہے۔

میر صاحب۔ اور جب ایک بات کی لم بھی دریافت ہوگئی تو پھر اس میں انکار کرنا کیا معنی؟

نواب۔ کیوں صاحب جنگ میں تو آپ نے خوب نام پیدا کیا ہے۔ یہ بتایئے کہ آپ کے ہاتھوں سے کس قدر آدمیوں کا خون ہوا ہوگا؟

خوجی۔ غلام سے پوچھیے انھوں نے کل ملا کر کم سے کم دو کروڑ آدمیوں کو تہ تیغ کیا ہوگا۔

نواب۔ دو کروڑ، شاباش شاباش!

خوجی۔ جب تو روم اور شام اور توران اور ملتان اور ابی سینا اور جرمنی اور آسٹریا اور انگلستان اور فرانس میں ان کا نام ہوا ہے۔

نواب صاحب نے کہا۔ اوہو۔ خوجی کو کتنے ملکوں کے نام یاد ہیں؟

آزاد۔ نواب صاحب ان کو وہ خوجی نہ سمجھیے۔

خوجی۔ خداوند میں نے ایک دریا پر خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں وہ کام کیا کہ ساری خدائی عش عش کر گئی صرف تن تنہا میں اور ہزاروں آدمیوں کا مقابلہ کیا۔

نواب۔ لاحول ولا قوۃ سب غلط محض غلط۔

مسیتا۔ حضور تین حصے جھوٹ اور ایک حصہ صحیح۔

میر صاحب۔ ہم تو کہتے ہیں سب ڈینگ ہے

رفیق۔ اور نہیں تو کیا یہ مضغۂ گوشت بلکہ مشت استخوان اور دعویٰ یہ کہ کروڑوں آدمیوں سے مقابلہ کریں۔

آزاد۔ نواب صاحب اس بات کی تو ہم بھی گواہی دیتے ہیں۔ اس جنگ میں میں شریک نہ تھا مگر میں نے اخباروں میں ان کی تعریف دیکھی تھی اور وہ اخبار میرے پاس موجود ہے۔

منشی۔ اخاہ۔ خواجہ بدیع الزماں آپ ہی ہیں [illegible] نے ایک اردو اخبار میں اس کا ترجمہ دیکھا تھا۔

نواب۔ تو اب ہم کو یقین آگیا جب جنرل آزاد صاحب نے کہا اور جب دوسرے صاحب نے گواہی دی تو صحیح ہے۔

آزاد۔ وہ موقع ہی ایسا تھا۔

خوجی۔ یہ موقع ہی ایسا تھا، بجا ارشاد ہوا۔

آزاد۔ نہیں نہیں بھئی تم نے تو واقعی کارنمایاں کیا مگر کیا موقع ایسا اچھا ملا کہ اگر دس کروڑ بھی ہوتے تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے یہ آپ کا کام تھا۔

خوجی۔ ان ہاتھ پاؤں پر سب کچھ کیا اور پھر زلوہ نکل آئے اور طرہ یہ کہ ہر مقام پر خوبان مہ جبین عاشق زار اور یہاں فراق یار اور ہجر کے

صدمے غضب ہیں ؎

ہجر میں اُس گل کے ہر گل کا گریباں چاک ہے   چشمِ نرگس میں ہے آنسو قطرۂ شبنم نہیں
یار کی صورت کو رضواں دیکھ کر کہنے لگا   سچ تو ہے یہ آدمی بھی حور سے کچھ کم نہیں

حضور ہم بھی دوسرے رستم ہندی ہیں۔ واللہ۔

آزاد - کچھ اور بھی تم نے بیان کیا یا نہیں خواجہ صاحب؟

خوجی - حضور نے قطعی ممانعت کر دی تھی۔

نواب - کیا کیا۔ کیا ہم سے کچھ چوری کی بات ہے؟

آزاد - پیر و مرشد صف شکن علی شاہ وہاں ملے تھے۔

نواب - (بآواز بلند) واہ رے صاحبو سنو۔ ارے میرا صف شکن علی شاہ۔

مصاحبین (بآواز بلند) جزاک اللہ جزاک اللہ۔ واہ رے صف شکن علی شاہ۔

خوجی - خداوند اس ڈانٹ ڈپٹ کا ٹَیر بھی کم دیکھا ہوگا۔

نواب - دیکھا ہی نہیں کم کیسا۔

مصاحبین - حق ہے حق ہے۔ واللہ بہت صحیح ہے۔

نواب - ارے میاں غفور ذرا گھر میں اطلاع دو کہ صف شکن علی شاہ بخیریت ہیں معرکۂ دار و گیر میں ان کو لوگ دیکھ آئے ہیں۔

غفور - سرکار یہ کس نے کہا۔ یہ خوش خبری کس نے سنائی!

مصنوعی مرزا ہمایوں فر

سپہر آرا بیگم نے اپنی بہن سے کمرے میں علیحدہ باتیں کیں اور کہا باجی جان میری سمجھ میں آج تک خود نہیں آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے
اور کیا ہوا، اور تین چار دن سے راتوں کو بُرے بُرے خواب دیکھتی ہوں۔ کبھی دیکھتی ہوں کہ خدانخواستہ کئی جنازے آتے ہیں،
کبھی دیکھتی ہوں کہ اماں جان کو نصیب اعدا لوگ زبردستی جلا رہے ہیں۔ بس یہ خواب پریشان دیکھ دیکھ کے چونک پڑتی ہوں۔ کئی
دن سے دو تین فرنگی روتے ہیں۔ کوئی تحریر دیکھتا ہے کوئی باتیں کرتا ہے کوئی پوچھتا ہے کہ فلاں سال ہم سے آپ سے ملاقات
ہوئی تھی۔

اب کل کا دن اس امر کے فیصلہ کا قرار پایا ہے کہ قبر کھودی جائے یا نہ کھودی جائے۔ حسن آرا کو یہ خبر سن کر بڑا رنج ہوا
کہ ابھی تک وہ جھگڑا باقی ہے۔ سپہر آرا سے پوچھا۔ سچ کہنا تم کو بھی شک ہوا یا نہیں، وہ مسکرا کے بولی۔ باجی جان مجھے بے اختیار ہنسی
آتی ہے شک کو ہے کا۔ اور میں نے تو خیر دور سے دیکھا۔ اُن کی اماں اُن کی بہنیں ان کی کھلائیاں دائیاں کسی کو تو دھوکا ہوتا۔
اب تو باہر آنے جانے کی اس قدر روک ٹوک نہیں ہے جیسی پہلے تھی۔ کہتے تھے کہ اگر آپ بلائیں تو کسی روز چلا جاؤں۔ اماں جان
سے کہہ کر بلوا لیجیے۔

حسن آرا اُسی وقت بڑی بیگم کے پاس گئیں اور کہا اماں جان اب تو شہزادے دولہا جان باہر نکلتے ہیں۔ کل بلوائیے نہ۔
اُس روز سے آج تک آتے ہی آتے رہ گئے۔ اسی دم بڑی بیگم نے مہری بھیجی۔

اب سنیے کہ حسن آرا اور سپہر آرا اور گیتی آرا اور جہاں آرا اور روح افزا اور بہار النسا اور شمس النسا اور دو تین ہمجولیاں مہتابی
پر ٹھنڈی ہوائیں کھا رہی تھیں کہ مہری بیتابی کے ساتھ دوڑتی ہوئی آئی اور ہانپتے ہوئے یوں کہنے لگی۔

مہری۔ اے حضور۔ اُف مارے۔

روح افزا۔ خیریت ہے؟ یہ اس قدر دوڑ کے کیوں آئی نصیبن؟

مہری۔ حضور مجھے بڑی بیگم صاحب نے وہاں اس وقت بھیجا تھا سمدھیانے سو میں نے وہاں دیکھا کہ بہت سے آدمی جمع تھے
سُنا کہ صاحب لوگوں نے سرکار سے لکھوایا کہ مجھ سے کہا نہیں جاتا حضور۔

روح افزا۔ کہو تو کیا لکھوا منگایا ہے۔ آئیں باب چپ ہے اور یہاں دل بے قرار ہو گیا۔

مہری۔ حضور میری زبان سے وہ لفظ نہیں نکلتا ہے۔

حسن آرا۔ سپہر آرا کے ہاں سے آئی ہو نہ پھر وہاں جماؤ کیسا۔

مہری۔ اس قدر کا جماؤ ہے کہ عرض نہیں کر سکتی۔

سپہر آرا۔ کلیجہ دہل گیا اور یہ کمبخت نہیں بتاتی، دور ہو میرے سامنے سے۔ اس کی صورت سے مجھے ہمیشہ سے نفرت ہے
کیا آگ لگ گئی۔ کوئی جل مرا۔ زمین پھٹ گئی۔ مکان ڈھے گیا۔ آخر ہوا کیا؟ بتانے میں کیا تامل ہے۔

مہری۔ حضور سُنا تحقیقات جو کی گئی تو شہزادے ہمایوں فرنہیں ٹھہرے سواب صاحب لوگ جمع ہوئے ہیں اور گھر بھر میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔

حسن آرا۔ (رنگ فق ہوگیا، اور مثل پیکر تصویر خاموش۔

روح افزا۔ (چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئیں) دم بخود۔

بہار النسا۔ سکتے کا عالم، سکوت، مُہر برلب۔

گیتی آرا۔ سب کے چہرے کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

جہان آرا۔ باجی جان یہ کیا غضب کی بات کہہ رہی ہے؟

بہار۔ میرے تو حواس ہی ٹھکانے نہیں رہے ہیں۔

سپہر آرا۔ اماں جان سے کہو آدمی بھیجیں دریافت کریں کیا بات ہوئی۔ مگر تم لوگ ذرا دل کو مضبوط رکھو از برائے خدا پریشان نہ ہو۔ نہیں تو میرا بہت بُرا حال ہو جائے گا۔

مغلانی (بیتابی پہ آن کر) حضور کچھ سُنا سا توہ ہے ہے۔

حسن آرا۔ اماں جان کو خبر ہوئی یا نہیں ان سے تو کوئی کہہ دو۔

مغلانی۔ وہ کب کی سن چکی ہیں۔ نواب عظمت علی خاں اور آغا صاحب اور چھوٹے مرزا صاحب کو بلوایا ہے اور عسکری میاں ان کی (سپہر آرا کی طرف اشارہ کر کے) سسرال دوڑے گئے ہیں۔

اتنے میں ایک ماما نے آن کر کل حال بیان کیا۔

ماما۔ حضور میں بھی وہیں سے آتی ہوں۔

روح۔ ہاں یہ کیا بات ہے کچھ ڈر تو نہیں ہے۔

ماما۔ حضور ہوا یہ کہ آج دس دن سے ہر روز صاحب لوگ اور مجسٹر کیا جانے کیا عہدہ ہے، وہ اور ان کے افسر جو ہیں وہ اور کئی ایک آیا کرتے تھے۔ سواب وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مرزا ہمایوں فر نہیں ہیں اور اب قبر کھودی جائے گی۔

روح۔ ہمیں اس کا کچھ حال معلوم ہی نہ تھا۔ سپہر آرا آخر اس معاملہ نے اتنا طول کھینچا اور تم کانوں میں تیل ڈالے ہی بیٹھی رہیں۔

سپہر۔ نہیں بعض بات تو زبان سے نکالی ہی نہیں جاتی۔ بس سارا پھیر یہ ہے کہ کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باپ کتّا کھائے۔ گومگو کا معاملہ ہے۔ مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

حسن آرا۔ مجھے بڑی تسلی ہوتی ہے کہ جب سپہر آرا خود ایسا کلمہ زبان سے نکالے اور ذرا بھی پریشان نہ ہو تو سمجھ لو کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔

روح۔ سپہر آرا ذرا ادھر آنا ہمیں تم سے کچھ کہنا ہے۔ روح افزا نے قسمیں دے دے کر پوچھا کہ صحیح صحیح حال بتاؤ۔ اب جب سارے زمانے میں ایک بات مشہور ہو گئی تو اس کا مخفی رکھنا کیا معنی؟

سپہر آرا بولیں۔ بہن کئی دن سے اس کا کھٹکا تھا کہ ہمایوں فر یہ نہیں ہیں۔ اور وہ ہر روز اسم پڑھواتے تھے اور بھوکوں کو کھانا کھلواتے تھے۔ دو دو سو بھوکے کھانا کھاتے تھے اور جس نے جو کہہ دیا وہ مان لیا۔ کسی نے کہا ایک ہندو فقیر بڑا باکمال ہے۔ اسی کو بلا بھیجا اور مجھ سے آن کر کہا اس فقیر کا ایک تو کمال یہ ہے کہ زمین سے چار چار انگل اونچا ہو جاتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے

چار اُنگل زمین سے اونچا ہوا اور کسی چیز کا سہارا نہیں۔ میں نے کہا اچھا پھر اس سے مطلب۔ تب مجھے قسمیں دے کر کہا لوگوں کو بھلا ہمایوں فر ہونے میں شک ہے اسی سبب سے ہندو مسلمان جو ملے اور جو کہ وے ہمیں انکار نہیں۔

روح۔ تم نے اتنا تو پوچھا ہوتا کہ تم کو تو اپنے ہمایوں فر ہونے میں شک نہیں ہے۔ یہ تو پوچھنا تھا کہ لوگ شک کیوں کرتے ہیں۔

سپہر آرا۔ شک کیوں کرتے ہیں۔ یہ تو اچھی بات آپ نے کہی۔ اے بہن تم ہو کہاں۔ ہمایوں فر گھوڑے سے گرے۔ زخم ایسا لگا کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اُسی دم روح پرواز کر گئی۔

روح۔ اچھا تو لوگوں کو اس کی تحقیقات کی فکر کیوں ہے۔ وہ تو جو ہوا سو ہوا یہ لوگ بیکار کیوں خواہی نخواہی کسی کے پھٹے میں پاؤں ڈالتے ہیں اور سرکار کو اس سے کیا واسطہ ہے۔

سپہر۔ جس شخص نے ہمایوں بیچارے بیگناہ کو قتل کیا تھا اُس کو پھانسی دی جائے تو کس بنیاد پہ پھر سرکار کو یہی خیال ہے نہ کہ ایسا نہ ہو کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا روپیہ کی طمع سے ہمایوں فر بن بیٹھے۔

روح۔ تمہاری باتوں سے پایا جاتا ہے کہ تم کو خود شک ہے۔

سپہر۔ اب تو جو ہے سو ہے مگر بہن تمہیں ایمان کی قسم کسی سے ذرا بھی ذکر نہ کرنا۔ میں سچ کہتی ہوں۔ میں نے ابھی تک باجی جان سے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ شہزادی بیگم اور خورشید النسا اور قمر النسا سب کو معلوم ہے اور بھی کئی آدمی جانتے ہیں۔

روح۔ یہ بھید ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ماجرا کیا ہے!

سپہر۔ بس اب جانے دو۔ یہ گفتگو ہی نہ کرو اور صبح شام تو سب کھل ہی جائے گا۔ جب سرکار دربار تک بات پہنچی پھر بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ باجی جان سے ابھی تذکرہ نہ کیجیے گا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک لونڈی نے آن کر کہا۔ عسکری میاں آئے ہیں۔ بڑی بیگم صاحب نے حکم دیا ہے کہ جا کے بہار النسا بیگم کو بلا لاؤ۔ بہار النسا اور گیتی آرا دونوں آگئیں۔

بہار۔ عسکری بتاؤ تو یہ کیا ماجرا ہے بھائی؟

عسکری۔ اصل میں حکام کو تو پہلے ہی سے شک تھا اور ایک ان پہ کیا فرض ہے زمانہ بھر کو شک تھا کہ بعد وفات از سر نو اُن کی پیدائش ہوا اس کے کیا معنی۔ آخرکار وہ حاکم جو ہمایوں فر کے بڑے دوست تھے باہر سے آئے ایک برہما بدل دیے گئے تھے وہ آئے اور ایک پہاڑ پہ تھے انھوں نے جو اُن سے باتیں کیں تو صاف کھل گیا کہ ہمایوں فر نہیں ہیں۔

بہار۔ ہاں! تم نے کسی کی زبانی سُنا ہے یا خود وہیں سے آتے ہو۔

عسکری۔ ابھی سیدھا وہیں سے تو چلا آتا ہوں۔

بڑی بیگم۔ اچھا پھر اب وہ تو بولتے ہیں کہ میں ہمایوں فر نہیں ہوں۔

عسکری۔ وہ تو ابھی تک خاموش ہیں مسکرا مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔

بڑی بیگم۔ آخر شہزادی بیگم کیا کہتی ہیں یہ حال کیا ہے اس سن میں آج تک ایسی بات سننے میں نہیں آئی تھی۔ سو اب آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ یا الٰہی ہمارے ہی لیے یہ سب باتیں تھیں۔

عسکری۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرنے کے بعد جی جانا کیسا اور اس کا یا پلٹ کے کیا معنی کچھ عجب گورکھ دھندا کا نقشہ ہے۔

بڑی بیگم۔ میں نے آغا صاحب اور چھوٹے مرزا اور عظمت علی خاں کو بلوایا ہے کہ جا کے دیکھو تو یہ کیا گورکھ دھندا

ہو رہا ہے۔
عسکری۔ نواب عظمت علی خاں تو ملے تھے وہ بھی حیرت میں تھے کہ یا خدا یہ کیا ہو رہا ہے کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور کیوں کر سمجھ میں آئے۔ کہتے تھے کہ مجھے بلایا تھا مگر میں جانتا ہوں کہ اسی لیے بلایا ہوگا۔
بڑی بیگم۔ اب کیا ان کے واسطے ہوگا جو یہ ہمایوں فر نہ ٹھہرے؟
عسکری۔ ہوگا کیا سزا ہوگی۔ بڑی مصیبت ہوگی۔
بڑی بیگم۔ سپہر آرا بیچاری کو زمانے کی گردش ایک دم چین نہیں دیتی ذرا مہلت نہیں ملتی۔
اب مرزا ہمایوں فر مصنوعی کا حال مفصل سنیے۔ وہ یوں ہیں جو اُن کے دلی دوست تھے جن کا حال پیشتر درج ہو چکا ہے وہ بلوائے گئے۔ ایک میجر ڈاڈ دوسرے مسٹر رائٹ۔ دونوں صاحب ضلع اور ان کے دو اسسٹنٹوں کو لے کر مرزا ہمایوں فر کے مکان پر آئے۔ شہزادے نے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ مگر بجز اپنے شہر کے حکام کے اور کسی کو نہیں پہچانا اور پہچانتے کیونکر کبھی دیکھا ہو تو پہچانیں۔
میجر ڈاڈ نے یوں گفتگو شروع کی:۔
میجر۔ اس مرتبہ پونے دو برس کے بعد ہم آپ سے ملے۔
شہزادہ۔ (گھبرا کر) جی ہاں عرصہ ہو گیا اب کی۔
میجر۔ آپ نے شاید ہم کو پہچانا نہیں، ہمارا نام یاد ہے؟
شہزادہ۔ اس قدر یاد آتا ہے کہ آپ کو کہیں دیکھا ہے۔
میجر۔ (حکام کی طرف اشارہ کر کے) شہزادہ صاحب ہمیں بھول گیا۔
صاحب ضلع۔ آپ سے تو بہت بڑی ملاقات تھی۔ مگر وہ بھی تو آپ نے شہزادے صاحب سے ہی سیکھی ہے۔ مگر تعجب ہے کہ آپ کو بھول گیا۔
شہزادہ۔ میری طبیعت آج کل نادرست ہے۔
رائٹ۔ (ڈل شہزادہ ہم کو پہچانا یا نہیں پہچانا۔
شہزادہ۔ (غور سے دیکھ کر) مجھے آج کل ذرا کم نظر آتا ہے۔
میجر۔ آپ کے سننے کی طاقت تو کم نہیں ہوا۔
صاحب ضلع۔ ہاں سن تو سکتا ہے آپ۔ تو جو دوست برسوں آپ کے پاس رہا اور جس سے اتنے برس یارانہ تھا اس کو آپ بھول گئے اور اس کی آواز تک نہیں سن سکتے۔ ہم آپ سے صاف صاف کہتے ہیں کہ آپ کی نسبت پوری پوری تحقیقات ہوگی ایک تو آپ نے سب کو یہ دھوکا دیا کہ مرزا ہمایوں فر زندہ ہوئے جس کے کچھ معنی نہیں اور پھر آپ لاکھوں روپیہ کی جائداد پر قابض ہو بیٹھے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ نے بے ایمانی کیا۔
شہزادہ۔ بے سمجھے بوجھے ایسے کلمے ہماری نسبت آپ کو زبان سے نہ نکالنے چاہئیں۔
صاحب۔ سچ ہے۔ اگر مرزا ہمایوں فر ہوتے تو ہم سے برابر کی ملاقات کرتے اور گو ہم سوچے کہ اس بات میں ہم دخل نہ دیں۔ مگر ہم کیونکر دخل نہ دیں۔ مرزا ہمایوں فر مار ڈالا گیا پھر زندہ کیونکر ہو سکتا ہے اس کا چھوٹا بھائی اس کا جانشین ہوگا۔ آپ کوئی چیز نہیں ہے

میجر۔ ہمیں بڑا تعجب ہوا اور دنیا میں کسی کو یقین نہیں آتا کہ انیسویں صدی میں کوئی مردہ بھی اُٹھے اور فقیر کی دعا سے زندہ ہو جائے۔
صاحب۔ (ہمایوں فر کے برادر خورد سے) شہزادی بیگم صاحب کو ہماری طرف سے جھک کر سلام کرے اور بولے کہ ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں پردہ ہو جائے۔

مرزا ہمایوں فر مبرور برد اللہ مضجعہ کے چھوٹے بھائی نے محل سرا میں جا کر اپنی والدہ سے کہا کہ صاحب ضلع آئے ہیں اور کُل قلعی کھل گئی وہ آپ سے گفتگو کرنے والے ہیں پردہ ہو جائے۔ مگر اماں کھو گئی کیا۔ وہ تو بھائی کے گرفتار کرنے کی نیت میں ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے بے ایمانی کی اور آپ سزا پائیں گے۔ اب تو صاف صاف کہے بغیر بات نہ بنے گی اور صاف کہنے میں کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔ مگر دو چار بزرگوں سے بھی صلاح لے لیجیے۔ شہزادی بیگم نے نواب عظمت علی خان بہادر، مرزا نادر حسین بیگ اور شہزادہ گرامی قدر کو بلوایا اور ان سے رائے لی کہ اب کیا کرنا چاہیئے معاملہ طول کھینچ گیا اور نازک ہو گیا۔ عظمت علی خاں نے کہا آپ خوب جانتی ہیں کہ میں آپ کا رشتہ دار ہوں اور آپ کے سمدھیانے سے بھی مجھے قرابت قریبہ ہے لیکن میں صلاح کیا دوں مجھے تو آج تک خود ہی نہیں معلوم کہ یہ اسرار کیا ہے، مرزا ہمایوں فر قتل ہو گئے۔ اس میں شک نہیں ہو سکتا ہم لوگوں نے اپنی آنکھوں دیکھا چونکہ ایک بار ان کے ڈوب جانے کی خبر مشہور ہوئی تھی اور پھر دوسرے تیسرے روز زندہ جیتے جاگتے آگئے تو اس مرتبہ بھی لوگوں نے یقین کر لیا کہ وہ ابھی تک زندہ ہی ہیں۔ لیکن دل سے کسی کو یقین نہ تھا۔ دس پانچ بوڑھی عورتوں یا ضعیف الاعتقاد مردوں کو شاید پورا پورا یقین آگیا ہوگا۔ مگر فی صدی دو چار کو اور جب ہم شہزادے کو دیکھتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں تو شک کی جگہ یقین ہوتا ہے کہ وہی ہیں عقل کام نہیں کرتی ہم صلاح کیا دیں اور صاحب ضلع سے کیا کہیں۔ آپ مفصل حال بتایئے تو کچھ رائے زنی کا موقع ہو۔ شہزادۂ گرامی قدر نے بھی ان کی تائید کی۔ کہا کہ جو بات اس وقت صاحب نے کہی ہے اس سے ہم کو خود اتفاق ہے ہم کہیں تو کیا کہیں۔ ہمایوں فر بیچارے کو خدا بخشے وہ جنت آشیاں فردوس مکان ہیں۔ اب زندہ ہونا کیا معنی؟

اتنے میں خبر ہوئی کہ بڑی بیگم صاحب کے داماد مرزا صاحب بمبئی سے آئے ہیں اور بڑی بیگم نے ان کو بھیجا ہے۔ شہزادی بیگم نے کہا پردہ تو ہئی ہے بلا لو۔ مرزا صاحب بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے بغلگیر ہوئے ہر کسی سے مصافحہ کیا بیٹھے۔
مرزا۔ حضرت انوکھی بات انسان کو حیرت میں ڈالتی ہے۔ شہزادہ ہمایوں فر کے زندہ ہونے کا دنیا میں کسی ذی عقل کو یقین نہ آئے گا ہاں اگر برات کے دن کسی اور کو گھوڑے پر بٹھا دیا تھا تو وہ اور بات ہے۔ مگر اس کا بھی خدائی بھر میں کسی کو یقین نہ آئے گا اس بھید کو خدا ہی جانتا ہے ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا کہ یہ کیا اسرار ہے معاذ اللہ۔
شہزادی۔ بیٹا مجھ سے کچھ کہا نہیں جاتا درد کی ہر طرح کی تباہی ہے۔
مرزا۔ آپ اس موقع پر ذرا استقلال رکھیں۔
شہزادی۔ سب ہے دیکھتے ہو کہ میں کس طرح ہمایوں فر کے مرنے کا حال سنتی ہوں اور ذرا اُف نہیں کرتی۔ میں نے تو کلیجہ پر پتھر رکھ لیا ہے۔
عظمت علیخاں۔ پھر اب کچھ مشورے کا نتیجہ بھی نکلنا چاہیئے۔
مرزا۔ اب کوئی بات تو مخفی رہ نہیں سکتی۔

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

نادر حسین۔ کیا خوب بات آپ نے فرمائی ہے اب پوشیدہ اور مخفی رکھنا فضول ہے اور اس سے مطلب کیا نکلے گا۔

شہزادی۔ پھر صاف ہی صاف کہہ دیا جائے نا اچھا یوں ہی سہی۔

اتنے میں صاحب ضلع نے پھر کہا بھیجا کہ اب ہم زیادہ وقت نہیں دے سکتے اور جس قدر زیادہ توقف ہوتا ہے اُسی قدر ہم کو زیادہ شک گذرتا ہے مجبور ہو کر شہزادی بیگم نے صاحب موصوف کو محلسرا میں بلایا۔

صاحب۔ ہم سلام عرض کرتا ہے شہزادی صاحبہ

شہزادی۔ زندہ رہو برخوردار (دبے دانتوں)

صاحب۔ آپ ان کو ہمایوں فر ہی سمجھتی ہیں اور آپ کو یقین ہے کہ یہ وہی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ برات کے دن جو لوگ خاص اس بات کے مہتم تھے کہ شاہزادے کو خلعت پہنائیں اور نوشہ کے گھوڑے کے ہمراہ رہیں اُن کو بلا دیجئے ان سے علیحدہ علیحدہ کل حال دریافت کیا جائے گا۔

شہزادی۔ ایک تو ان کا خدمتگار تھا رحیم بخش۔ دوسرے باپ کے وقت کا خواص۔ پیر خاں۔ یہ دونوں گھوڑے کے ساتھ ساتھ تھے اور ایک سپاہی تھا اس کا نام مجھے معلوم نہیں اور گھر میں خلعت پہنایا گیا جب باہر گئے تو مرزا سمو القدر اور مرزا دارا مرتبت اور منجھلے نواب ساتھ تھے۔ صاحب ضلع نے ان سب کے نام لکھ لیے اور پوچھا کہ ان میں سے کوئی یہاں حاضر ہے؟ کہا گیا کہ مرزا سمو القدر اور چھوٹے نواب موجود ہیں۔

عظمت علی خاں بہادر منجھلے نواب کہلاتے تھے۔ صاحب نے اور سب کے نام طلبی کے خطوط بھیجے اور مرزا سمو القدر کو علیحدہ کمرے میں لے گئے۔ ورمیجر ڈاڈ اسٹر رابٹ اور نواب احتشام الدولہ کے مواجہہ میں مرزا سمو القدر سے سوال کیے۔

صاحب۔ آپ نے دیکھا تھا کہ برات کے دن گھوڑے پر دولہا کون تھا؟

مرزا۔ بخوبی تمام و کمال۔ مرزا ہمایوں فر بہادر میرے سامنے سوار ہوئے تو میرے کان میں مذاق کی ایک بات کہی۔ میں نے کہا اب اس وقت نوشہ بنے ہو ایسی بات نہ کرو کہ خواہ مخواہ ہنسی آئے۔ بس خاموش ہو رہے۔

صاحب۔ آپ شہزادے سے وہ بات پوچھیے جو اُنھوں نے آپ کے کان میں کہی تھی اور خود ایک کاغذ پر لکھ دیجیے اور پھر ان سے کہیے کہ وہ بھی کاغذ پر علیحدہ لکھ دیں۔

مرزا سمو القدر بہادر نے ایک کاغذ پر پنسل سے لکھ دیا اور صاحب ضلع نے اس کاغذ کو اپنی پاکٹ میں رکھا اب شہزادے کو بلوا کر اُن سے جو کہتے ہیں تو وہ آئیں بائیں شائیں بتانے لگے۔

صاحب۔ آپ کو یاد ہونا چاہیے ابھی کل کی بات ہے۔

شہزادہ۔ صاحب میرے ہوش حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔

صاحب۔ اچھا تو آپ پھر تشریف لے جائیے ہم لوگ یہاں تحقیقات کرتا ہے۔ (مرزا صاحب سے) ول شہزادے صاحب آپ نے کسی کو چھری لگاتے یا تلوار مارتے دیکھا تھا کہ کسی شخص نے مرزا ہمایوں فر کو چھری بھونکی۔

مرزا۔ جی نہیں۔ مگر جیسے ہمایوں فر گھوڑے پر لڑکھڑائے اور میں دوڑ پڑا۔ میرے جانے تک وہ گر چکے تھے اور گرتے ہی سرد ہو گئے۔

صاحب۔ آپ کو یقین ہے کہ وہ ہمایوں فر ہی تھے؟ آپ نے زخم لگنے کے بعد بھی ان کو اچھی طرح پہچانا تھا کہ ہمایوں فر ہیں؟

مرزا۔ بیشک بہت اچھی طرح اس میں ذرا شک نہیں ہوسکتا۔

صاحب۔ تو آپ کو خوب یقین ہے کہ گھوڑے پر مرزا ہمایوں فر ہی سوار تھے اور زخم بھی انھوں ہی نے کھایا اور وہ مر بھی گئے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

مرزا۔ جو شک کرے وہ میرے نزدیک عقلمند نہیں۔ ہزاروں نے دیکھا یا ایک دو نے مرزا ہمایوں فر کا زخم کھانا اور لڑکھڑانا اور جان دینا ہزار ہا آدمیوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

صاحب۔ یہ جو مرزا ہمایوں فر بنے ہیں یہ کون ہیں آپ جانتے ہیں؟

مرزا۔ یہاں پر ہماری عقل چکر میں ہے۔ حیرت ہوتی ہے۔

صاحب۔ ہمایوں فر ہیں یا نہیں ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

مرزا۔ ہرگز نہیں، ہمایوں فر کیسے۔ وہ بیچارے قبر میں میٹھی نیند سو رہے ہیں یہ سب بناوٹ ہے، خدا جانے یہ کون شخص ہے اور اس میں کیا بھید ہے؟

صاحب ضلع نے اس کے بعد مرزا دارا مرتبت کو بلوایا اور مصافحہ کر کے کہا ہم نے آپ کو اس وقت بڑی تکلیف دی آپ معاف فرمائیے۔ مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ شہزادی بیگم صاحبہ نے کیا سمجھ کر سب میں مشہور کر دیا کہ یہ مرزا ہمایوں فر ہیں چونکہ آپ بھی برات کے مہتمم تھے اور شہزادی صاحبہ نے اور شہزادوں کے شمول میں آپ کا نام بھی لیا۔ اس سبب سے آپ کو تکلیف دی۔ آپ سے گواہی لی جائے گی۔ جو کچھ آپ کو معلوم ہو وہ بتائیں۔

دارا مرتبت۔ مجھے تو برات کا کل حال معلوم ہے۔ جو سوال کیجیے اس کا جواب دوں۔ جہاں تک میں واقف ہوں جواب شافی دینے میں دریغ نہیں کروں گا۔

صاحب۔ مرزا ہمایوں فر بہادر کہاں ہیں اس وقت؟

دارا مرتبت۔ اس وقت اسی کوٹھی میں ہیں مجھ سے ابھی ملاقات ہوئی تھی۔

صاحب۔ تو برات کے دن جان کس کی گئی اور کون زخمی ہوا؟

دارا مرتبت۔ آپ سمجھتے نہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ برات کی تیاری کے وقت ایک مخبر نے آن کر خبر دی کہ مرزا ہمایوں فر کا ایک جانی دشمن جو اُن کے خون کا پیاسا ہے اُن کے قتل کی فکر میں ہے اور چاہے کروڑ پردوں میں ہوں وہ بے قتل کیے نہ رہے گا۔ صلاح یہ ہوئی کہ گھوڑے پر سوار کر کے لے چلنا مصلحت کے خلاف ہے اور پھر خبر آئی کہ وہ خنجر کو تیز کر چکا ہے اور کئی آدمیوں نے بیان کیا تو یہ رائے قرار پائی کہ یہاں سے دولہن کے مکان تک ایک نالکی میں سوار ہو کر جائیں اور وہ بند رہے۔ پردہ پڑا رہے اور مسلح سپاہی ساتھ ہوں۔ کسی کو کیا معلوم ہوگا۔ چنانچہ گھوڑے پر ایک شخص کو خلعت پہنا کر بٹھایا اور سہرا اس کے چہرہ پر اس طرح لٹکایا کہ منہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ برات چلی تو کسی کو کیا معلوم کہ ہمایوں فر ہیں یا کوئی اور ہے اور گھوڑے کے ارد گرد ہم ہی سب لوگ تھے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔

صاحب۔ ول یہ نیا بات سُنایا۔ یہ تو دوسری بات ہے۔

میجر۔ مگر یہ کیا سبب ہے کہ شہزادہ اپنے دوست لوگ کو بھول گیا۔

دارا۔ صاحب ان کے حواس آج تک ٹھکانے نہیں ہیں۔

صاحب - اچھا جب گھوڑے پر ہمایوں فر کے عوض دوسرا آدمی سوار ہوا تو آپ وہاں تھا یا کہیں اور اس وقت چلا گیا تھا۔

دارا - میں ڈیوڑھی میں کھڑا تھا جس میں کوئی آنے نہ پائے۔

صاحب - اور جب گھوڑا برات میں چلا تب آپ ساتھ تھا۔

دارا - کچھ لوگوں کو جن سے پردہ تھا سوار کر دیا۔ کوئی گھوڑے پر کوئی ہاتھی پر۔ کوئی تامدان پہ کوئی کہیں کوئی کہیں اور ہم تین چار آدمی گھوڑے کے ساتھ تھے اور جس قفس میں ہمایوں فر تھے اس کی حفاظت اور نگرانی کا بڑا اہتمام کیا تھا۔

صاحب - اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ اس گھوڑے پر ہمایوں فر ہی تھے تو آپ کو یقین آئے گا یا نہیں۔ آپ کے سامنے تو کوئی اجنبی خلعت پہن کر سوار نہیں تھا۔ آپ صرف ڈیوڑھی میں کھڑے تھے۔

دارا - مجھے تو ہرگز یقین نہ آئے گا میں نے اس آدمی کو بیشک نہیں دیکھا مگر یہ سب باتیں میرے علم و یقین میں ہوئی تھیں اور میں خود شریک مشورہ تھا۔

میجر - شہزادہ صاحب ایک بات غور کے قابل ہے۔ شاید مرزا ہمایوں فر کے دوستوں نے صرف اس خبر کے مشتہر کرنے کی غرض سے ایسا کہہ دیا ہو کہ اب ہمایوں فر گھوڑے پر نہیں ہیں تاکہ جو سنے اس کو یقین آجائے کہ گھوڑے پر ایک شخص دولھا بنا ہوا سوار ہے اس کا قتل کرنا بیکار ہے۔ وہ تو ہمایوں فر ہی نہیں اس کے قتل کرنے سے کیا ملے گا۔ اس تدبیر سے ہمایوں فر بچ جائے۔ شاید وہ لوگ یہ امر سوچے ہوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

دارا - بیشک مقتول ہمایوں فر نہ تھا، ہرگز نہ تھا۔

صاحب - اچھا تو آپ کے ذریعہ سے بالکل نئی بات معلوم ہوئی۔ اب ہم نواب عظمت علی خاں کو بلاتا ہے۔

نواب عظمت علی خان بہادر عرف منجھلے نواب تشریف لائے۔ صاحب نے حسب معمول اُن سے کہا کہ آپ کی گواہی لی جائے گی۔ جو بات آپ نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہے اس کو بیان کر دیجیے اور جو بات بچشم نہ دیکھی ہو اس کی نسبت کہہ دیجیے کہ فلاں شخص کی زبانی سنی سنائی کہتے ہیں یا اگر کسی خاص آدمی کا نام نہ یاد ہو تو یوں کہہ دیجیے کہ لوگوں نے ایسا کہا تھا۔ ہم آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ مرزا ہمایوں فر جس وقت گھوڑے پر سوار ہوئے اس وقت آپ موجود تھے یا نہیں؟

نواب صاحب نے کہا سنیئے صاحب جو جو سوال کرنے ہوں لکھ دیجیے میں ان سب کے جواب لکھ دونگا۔

صاحب نے یہ بات بہت پسند کی اور یہ سوال لکھوائے:۔

۱۔ مرزا ہمایوں فر کو آپ پہچانتے ہیں یا نہیں؟

۲۔ برات کے دن آپ کے سامنے گھوڑے پر سوار ہوئے یا نہیں؟

۳۔ یہ صاحب جو اب ہمایوں فر بنے ہیں کون ہیں؟

۴۔ مرزا ہمایوں فر کے قتل کے وقت آپ کہاں تھے؟

۵۔ آپ نے لاش کو مُردہ پایا یا کچھ کچھ جان باقی تھی؟

۶۔ جس وقت ہمایوں فر گھوڑے پر سوار تھے آپ ان کی صورت اچھی طرح دیکھ سکتے تھے یا نہیں اور دیکھ سکتے تھے تو آپ کو شک تو نہ تھا؟

نواب صاحب نے ان چھ سوالوں کے جواب یوں لکھے:۔

۱۔ میں ہمایوں فر کو بخوبی تمام و کمال پہچانتا ہوں!
۲۔ برات کے روز میرے سامنے گھوڑے پر سوار ہوئے۔
۳۔ میری سمجھ سے خارج ہے کہ کون صاحب ہیں!
۴۔ میں گھوڑے کے قریب تھا مگر دیکھتا اور طرف تھا!
۵۔ بالکل سرد، ڈاکٹر نے میرے سامنے کہا کہ اب ذرا جان باقی نہیں ہے۔ گرتے ہی جان نکل گئی ادھر گرے ادھر ٹھنڈے ہو گئے۔
۶۔ میں نے ان کی صورت دیکھی اور بخوبی پہچانا کہ یہ وہی ہیں وجہ کیا کہ میں ہمایوں فر کو نہ پہچان سکتا۔ صورت صاف صاف نظر آتی تھی۔

صاحب۔ ول تو آپ نے ہمایوں فر کو دولھا بننے کی حالت میں قتل ہو کر گرتے دیکھا اور وہ گرے تو پھر بھی پہچانا کہ یہ مرزا ہمایوں فر ہیں؟

نواب۔ بے شک۔ اس میں تو کسی طرح کا شک ہو ہی نہیں سکتا۔

میجر۔ بھلا نواب آپ کا کیسے ہے سے بالکل صاف کیسے کہ یہ کون شخص ہے اور اس کو شہزادی بیگم نے کیوں کر ہمایوں فر سمجھ لیا۔ یہ کیا بات ہے؟

نواب۔ جناب میجر صاحب میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے خود حیرت ہے میں کیا جواب دوں مگر اس قدر البتہ خیال ہے کہ سپہ آرا کے ساتھ نکاح ہولے خدا اس بیچارے کی عزت رکھے اور یوں تو جو ہوا وہ ہوا۔

صاحب۔ اچھا تو آپ کے نزدیک ہمایوں فر زندہ نہیں ہیں۔

نواب۔ جناب اس میں تو کسی کو حجت اور انکار کا موقع ہی نہیں مل سکتا۔ ہزاروں آدمیوں نے ہمایوں فر کی لاش دیکھی اور شہر میں کہرام مچ گیا مگر خدا جانے کیا ترکیب کر کے ان سب نے مل مل کر ایک فرضی اور مصنوعی ہمایوں فر قائم کر دیئے اس کا کچھ سر پیر نہیں۔ لاحول ولا قوۃ بہت عجیب زمانہ ہے۔

الغرض سب کے اظہار لے کر صاحب ضلع اور میجر ڈاڈ اور مسٹر رایٹ اور نواب احتشام الدولہ بہادر نے باہم مشورہ کیا تو ان چاروں میں رایٹ صاحب اور نواب صاحب نے شہزادہ والا مرتبت کے بیان پر غور کرنے کی صلاح دی۔ مگر میجر ڈاڈ اور صاحب ضلع نے اس رائے کو پسند نہ کیا۔ کہا اس میں بناوٹ پائی جاتی ہے۔ یہ بالکل بے اصل بات ہے ایسا ہرگز نہیں ہوا ہے۔ بعد ازاں صاحب ضلع نے شہزادی بیگم کو کہلا بھیجا کہ اب آپ کو ذرا تکلیف ہو گی آپ دو دو باتیں سن لیں اور ان کا جواب دیں۔ پردہ کا ویسے تو کل باتیں چلمنوں میں دریافت کر لی جائیں۔ انھوں نے نواب عظمت الدولہ کو بلوایا۔ مگر صاحب موصوف نے کہا کہ نواب صاحب کو نہیں جانے دے سکتے۔ کیوں کہ یہ ایک گواہ ہیں۔ آپ بھی اظہار دے دیجیے تو پھر مضائقہ نہیں۔

شہزادی بیگم کو فرط الم سے اس روز غش آگیا اور طبیعت اس قدر بے چین اور بے لطف ہوئی کہ ڈاکٹروں کی صلاح سے اس دن اظہارات ملتوی رہے۔ جب حکام نواب احتشام الدولہ اور پرنس والا مرتبت اور شہزادے گرامی قدر کی ضمانت لے کر روانہ ہوئے کہ مرزا ہمایوں فر کہیں بھاگ نہ جائیں تو شہزادی بیگم نے ہمایوں فر کو گھر میں بلوایا اور تخلیے میں ان سے یوں ہم کلام ہوئیں:

شہزادی۔ بتاؤ بیٹا اب کیا کیا جائے۔ جو رائے ہو۔

ہمایوں - اماں جان صاف صاف کتنا اچھا ہوتا ہے۔

شہزادی - کسی وکیل سے پوچھ لو۔ اس میں کچھ ہرج تو نہیں۔

ہمایوں - مطلق ہرج نہیں ہرج کیا ہے آخر لڑکا تمہارا ہوں یا نہیں - بادشاہ کی اولاد ہوں - مال اسباب جائداد مکان زیور روپیہ سب میرا ہے یا نہیں پھر اس میں چوری کا ہے کی ہے آپ صاف صاف بیان کردیں۔

شہزادی - اچھا راست راست بے کم و کاست کہہ دوں۔

ہمایوں - ضرور ضرور آپ کے کہنے کی نوبت ہی کا ہے کو آئے گی - میں خود ہی بیان کردوں گا۔ سرکار کو فقط یہی خیال ہے کہ کوئی شخص آپ کو اور ہمایوں فر کے خاندان کو دھوکا دے کر مال اسباب پر قابض نہ ہوجائے اور اس کا یہاں ذکر ہی نہیں۔

شہزادی - چلو بس اب مجھے ڈھارس ہوئی ورنہ ہمایوں فر کا دشمن تھا - ہائے کہیں کا نہ رکھا - ادھر کی رہی نہ اُدھر کی۔

ہمایوں - اماں جان اب یہی بہتر ہے کہ صاف صاف بیان کردو۔

راستی موجب رضائے خداست

کس ندیدم کہ گمشدہ از راہ راست

شہزادی - تو اب تم خود صاحب سے کہہ دو جس میں ہم سے پوچھنے کی کسی کو ضرورت ہی نہ رہے - ہم اپنے منہ اور زبان سے کیونکر کہیں جہیں کہتے ہوئے اور بیان کرتے ہوئے بڑا رنج ہوگا - ہائے کلیجہ پر پتھر رکھ لیا سِل رکھ لی۔ مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

ہمایوں - (آبدیدہ ہوکر) ہائے جوان بھائی سامنے سے اُٹھ گیا - ہائے ہمایوں فر تونے یہ کیا دغا دی - دوست بن کے بھائی بن کے قتل کرگیا۔ اب رونا بھی اچھی طرح نہیں آتا - آنسو خشک ہوگئے۔

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال

صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

شہزادی - اور لوگوں نے کیا اظہار دیئے۔ سچ یا جھوٹ؟

ہمایوں - دو ایک نے صاف صاف بیان کردیا کہ ہمایوں فر مقتول ہوئے یہ ہمایوں فر نہیں کوئی اور میں مگر دارا۔ تربیت نے وہ قصہ بیان کیا کہ اللہ جس کا سر نہ پیر۔

شہزادی - کوئی ایسی بات تو نہیں کی جو ان کے خود خلاف ہو۔

ہمایوں - جی نہیں بہت بچاتے رہے - اماں جان ہم تو اس وقت سے حکم دیئے دیتے ہیں کہ ہم کو ہمایوں فر کوئی نہ کہا کرے - ہمارا نام صاحب عالم فریدوں سطوت مرزا نورالدین حیدر ہے۔

شہزادی - ابھی نہیں - جب حکام سے کہہ لو تب پھر سب میں آپ ہی شہرت ہوجائے گی - مگر خیر پھر ہرچہ باداباد سمجھا جائے گا۔

صاحب عالم فریدوں سطوت مرزا نورالدین حیدر شہزادی بیگم سے باتیں کرکے باہر آئے ان کی ماں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ آج کسی طرح سستی یا رنج نہ کرنا ورنہ پھر رعب جاتا رہے گا - جاکر عملاً اور قصداً احباب سے ہنس ہنس کے باتیں کریں۔

شہزادہ - اف - آج بہت تھک گئے اوہ (لیٹ کر)

احتشام الدولہ - اب کہیں بے نہ پوچھئے گا بندے کی ضمانت ہے۔

عظمت علی خاں - جی ہاں بندہ بھی پھنسا ہے اور آپ کا اعتبار کیا۔

احتشام۔ یار خدا کے لیے کہیں فرانس ڈانڈے نہ ہو رہنا۔ اس پر بڑا قہقہہ پڑا۔ یہاں تک کہ ایک بڑھے بزرگ نے آنکھیں نیلی پیلی کر کے کہا واہ وا واہ ہونہہ۔ یہاں تو خون خشک ہو گیا ہے اور ان کو دل لگیاں سوجھتی ہیں۔

احتشام۔ قبلہ و کعبہ بہت رو چکے اب کہاں تک روئیں۔

یاران رفتگان کو کیا روئیے سترت
کیا تم روانہ سوئے ملک عدم نہ ہوگے

عظمت۔ قبلہ و کعبہ واقعی ہے تو یہی وقت کہ دن بھر روئیے۔

احتشام۔ بھائی جان دیکھو خدا کے لیے ہماری عزت رکھنا۔

شہزادہ۔ جاؤں گا تو کہاں جاؤں گا ابھی کوئی ٹھکانا بھی ہے۔

بھاگے جہاں جہاں پہ بزن اور کٹ ملا   لٹ پٹ کے گھر کو آئے تو گھر کا ٹکٹ ملا۔

یہی مثل صادق ہو گی۔

عظمت بھئی تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو۔ واللہ یہاں اب تک یہی نہیں معلوم ہوا کہ اسم شریف کیا ہے اور حضور کون ذات شریف ہیں۔

شہزادہ۔ واللہ آپ بڑے زندہ دل آدمی ہیں۔

احتشام۔ اور میں تو اس کا قائل ہوں کہ جھیپ سے داخل دفتر۔ اب محلسرا سے نکلتے ہی نہیں اچھا رنگ جما یا واہ استاد واہ۔ اور مرزا وارا مرتبت نے تو وہ بے پر کی اڑائی کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ ایک بار صاحب خود چکرا گئے تھے۔

شہزادہ۔ حضرت کل تک آپ کو سب معلوم ہو جائے گا کہ بندہ کون ہے سارے یار بڑی حیرت کا مقام ہے مگر سمجھتے اس شدنی امر تھا اس کو کوئی کیا کرے۔

ہوا جو کچھ سو ہوا بس گذشتہ را صلواۃ
کہاں تلک کوئی رو دیا کرے گلہ دل کا

شہزادی بیگم نے دوسرے روز اپنے اظہار میں صاف صاف بیان کر دیا کہ جس وقت میرے لال بھبوکا ناندوں کے پالے نرگسی آنکھوں والے شہزادے کو اس موئے سوار نے اللہ کرے کٹے کی موت مرے۔ اللہ کرے مرتے دم پانی نہ نصیب ہو۔ ٹھنڈی سانس بھر کر جب اس نے بنجری میں ہمایوں فر پر تلوار چلائی اور اس ناندوں کے پالے زار اس قدر رقت سے کہ کر بہت بیٹھ اور تھوڑی دیر کے بعد آنسو پونچھ کر یوں بیان کیا) اور مجھے خبر ہوئی تو قلب پھالیا دھچکا لگا کہ میں کچھ رو نا شروع کیا)

صاحب۔ بیگم صاحب سب کو بڑا رنج ہوا۔ مگر خدا کی مرضی۔

شہزادی۔ صاحب مجھے تو اس پیرانہ سالی میں انگاروں پر لوٹنا پڑا ہے۔ وہ میں لوٹ رہی ہوں اور خدا جانے میری قسمت میں کیا کیا لکھا ہے۔

صاحب۔ صبر، صبر، حضور بیگم صاحب آپ صبر کریں بہت صبر کریں۔

عظمت۔ مختصر طور پر بیان کر دیجیے یہ حال سنا نہیں جاتا۔

شہزادی۔ بھائی خیروں خیروں کا ٹکے کلیجا کا نپتا ہے۔

انتظام الدولہ۔ سچ ہے ہم تو ہمایوں فر کے عزیز رشتہ دار دوست بھائی میں تمہیں دل کا حال بس ناگفتہ بہ ہے۔

شہزادی- میں بے اختیار تڑپ کے نعش سے کود پڑی اور دوڑ کے دیوانی کی طرح کبھی ادھر گئی کبھی ادھر گئی۔ اتنے میں لوگ ہٹ گئے اور مجھے جگہ دی۔ بس میں نے ہنوز اچھی طرح لاش کو دیکھا بھی نہ تھا کہ تیورا کھا کے گر پڑی اور غش آگیا ہائے اسی دم اگر مر جاتی تو کیا بات تھی۔ یہ دن کیوں دیکھتی۔ مگر میں مضبوط تھی۔ جان کیوں کر نکلتی۔

صاحب- کسی کا اختیار کا بات نہیں۔ کسی کے ہاتھ کا بات نہیں۔

شہزادی- ہاں اختیاری امر ہوتا تو یہ کیوں ہونے پاتا۔ بس اب آگئے اور کیا کہوں اتنی ہی دیر میں کانٹے پڑ گئے۔ تالو خشک ہو گیا۔

عظمت- ہاں بہتر ہے کہ اختصار کے ساتھ یہ حال مصیبت بیان ہو۔

شہزادی- بس اب اور کیا کہوں۔ ہمایوں نواب کہاں ہے۔ مقبرہ بھی بن گیا اور اتنے دن بھی ہو گئے۔ اب ہمایوں فر کی ہڈیاں بھی نہ باقی ہونگی۔ ہائے اُف ری میری بے حیائی۔ کس طرح استقلال کے ساتھ باتیں کرتی ہوں۔

صاحب۔ بیگم صاحبہ دل بہت مضبوط رکھنا۔

شہزادی۔ اب اور کیا مضبوط ہوگا دل تو فولاد ہو گیا۔

صاحب۔ اور کیا ہو سکتا ہے۔ خدا کا بات آدمی کیا ہے۔

شہزادی۔ تو اب تو مجھ سے کچھ اور نہیں پوچھنا ہے؟

صاحب۔ اب یہ پوچھنا ہے کہ کون ہمایوں فر بنا۔ کئی سوال ہے۔

۱۔ یہ کون ہے جو اپنے کو ہمایوں فر کہتا ہے؟

۲۔ آپ کو دھوکا دیا یا آپ نے اس کو اجازت دی؟

۳۔ آپ کا چھوٹا لڑکا کا حق محروم رہے گا اور آپ کے بعد آدھے کا وہ اور آدھے کا یہ مالک ہو جاتے گا اور یہ بڑی بات ہے۔

شہزادی۔ ان تینوں باتوں کا جواب باصواب سنیئے۔

۱۔ یہ ہمایوں فر نہیں ہے۔ مگر اس سے کم بھی نہیں ہے۔

۲۔ ہم نے اس کو آپ اجازت دی۔ اس نے کسی کو دھوکا نہیں دیا میں نے خود کہا کہ تم اپنے کو ہمایوں فر کہو مگر لوگوں سے ابھی میل جول کم رکھو جس میں دفعتہً سب پہچان نہ لیں کہ ہمایوں فر نہیں ہے۔

۳۔ چھوٹا لڑکا محروم نہیں ہو سکتا۔ اس کا اُس کا دونوں کا حق ہے۔ آپ لوگ اس بات سے اطمینان رکھیں۔

صاحب۔ دل بیگم صاحب ہم کو بڑا تسلی ہوا۔ مگر کامل طور پر ابھی نہیں سمجھا کہ یہ کون شخص ہیں۔

بیگم۔ اب صاف سنیے میرے تین لڑکے تھے اور دو لڑکیاں۔ پانچ اولادیں۔ ہمایوں فر کا بڑا بھائی سات برس کے سن میں گم ہو گیا زمانے بھر میں تلاش ہوئی کہیں پتہ نہ ملا۔ مجبور ہو کر رہ گئی کہ اب کیا ہوتا ہے۔ سمجھی کہ کوئی بہکا کے لے گیا۔ برسوں اسی کا غم رہا۔ وہ لڑکا ہمالیہ کے پہاڑ پر کسی فقیر کے ساتھ رہنے لگا۔

ایک روز جبکہ وہ فقیر کسی ضرورت سے نینی تال آیا تو اس کو بھی ساتھ لیتا آیا اور اسکول میں بھرتی کیا چند سال کے بعد اس نے ایک اخبار میں اپنے بھائی کے قتل کا حال پڑھا۔

بھائی تھا جوشش خون کہاں جائے

بس وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ یہاں آیا تو رات کے وقت ایک آدمی سے ملا جو اس کا کوکا تھا۔ کوکا نے اس کو نہیں پہچانا مگر وہ

پہچان گیا۔ باتوں باتوں میں اپنا نام لے کر پوچھا بھلا اس کو جانتے ہو مگر وہ تمہارے سامنے آئے تو پہچان سکو گے یا نہیں۔ کوکا نے غور کر کے دیکھا تو ؎

صورت وہی رنگ رو وہی ہے　　　لہجہ وہی گفتگو وہی ہے

کوئی فرق نہیں گلے لگایا اور مجھ سے آن کر پوشیدہ بیان کیا۔ اس کے بعد ہم سب کی یہ رائے ہوئی کہ اس کو ہمایوں فر مشہور کریں اور اس میں کئی راز کی باتیں تھیں جن سے سرکار کو کوئی سروکار نہیں۔ مگر سوچی کہ اس طرح دفعتہً مشہور کر دینا اچھا نہیں لہذا اس میں بڑا اہتمام کیا گیا اور اب شادی بھی ہو گئی۔ اور اتنے دن کے بعد آپ لوگوں کو معلوم ہوا۔

صاحب۔ ہم بہت خوش ہیں بیگم صاحب اب آپ ان کو ہمایوں فر سمجھیں اور اُس ہمایوں فر کو بھول جائیں۔

شہزادی۔ اب مجھے اجازت ہو تو جا کے میں سو جاؤں۔ اس وقت میرا دل بھر آیا اور میرے حواس بجا نہیں ہیں۔

صاحب۔ ہم بھی آداب سلام عرض کرتا ہے۔

باہر آکر صاحب ضلع نے میجر ڈاڈ اور مسٹر رایٹ سے کل حال بیان کیا ان دونوں کو یقین واثق ہو گیا کہ یہ بیان کذب سے مُبَرّا ہے مگر بنظر مصلحت خود اُن سے دریافت کرنا پڑا اور لازم آیا کہ اُس فقیر کو جہاں یہ برسوں رہے تھے بلوائیں اور جس اسکول میں شہزادہ پڑھتا تھا اس کے ماسٹروں اور پرنسپل سے دریافت کریں، اور شہزادی بیگم کے اعزہ کا اظہار لیں کہ آیا کوئی لڑکا کھو گیا تھا یا نہیں۔ شہزادے کو بلا کر صاحب ضلع علیحدہ لے گئے اور کہا اب ہم کو بخوبی معلوم ہوا کہ آپ مرزا ہمایوں فر ہی ہیں مگر حیرت ہے کہ آپ مر کر کس طرح زندہ ہو گئے۔ شہزادے نے کہا آپ میرا امتحان لیتے ہیں۔ اماں جان نے آپ سے کہہ دیا ہو گا کہ اصل حال کیا ہے۔ میں ہرگز ہمایوں فر نہیں ہوں۔ ہمایوں فر میرے چھوٹے بھائی کا نام ہے (اس بیچارے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے) زندگی نے (آنسو پونچھ کر) وفا بھی نہ کی۔ افسوس!

تحقیقات ضروری کے بعد صاحب ضلع مع اور حکام کے رخصت ہوئے۔

حسن آرا بیگم اور ان کی بہنیں اور نازک ادا بیگم یہ سب ایک مقام پر اس امر اہم کی نسبت گفتگو کرنے لگیں۔ سپہر آرا نے کہا ہمیں منع کر دیا تھا کہ خبردار کسی سے ذکر نہ کرنا اور ان کی بھی تاکید تھی اسی سبب سے ہم میں کہیں آتی جاتی نہ تھی اور نہ وہ گھر کے باہر نکلتے تھے مگر

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

ایسی باتیں کہیں پوشیدہ رہ سکتی ہیں۔ ہم نے کارسازی کہہ دی گئی مگر مجھے اب چنداں اس کا خیال نہیں۔ ان ہمایوں فر کا نام جس وقت یاد آتا ہے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں مگر اچھی طرح اُف نہیں کر سکتی ۔ نازک ادا بیگم نے کہا۔ سچ ہے اُف کیوں کر کرسکو صاحب عالم کی بغل میں بیٹھ کر ہمایوں فر کو یاد کرو یہ تمہیں کب زیبا ہے اب تو جو ہوا سو ہوا مگر پھر بھی ہم یہی کہیں گے کہ نتیجہ اچھا ہو۔ تمہارے حق میں انجام بخیر ہوا۔ ہاں ہمایوں فر بیچارے کی جان مفت میں گئی یہ بڑا سانحہ ہے مگر اس میں تمہارا کیا قصور یہ تو شدنی امر تھا تم شہزادے کے ساتھ ہی بیاہی گئیں۔ وہی حسب نسب۔ نجیب الطرفین شریف الجانبین اولاد شاہ حسن و جمال وجاہت قد و قامت شگفتہ روئی لیاقت تمیز سلیقے میں ہمایوں فر سے کم نہیں۔ یہ تو سوچو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا وہ حالت سوچو کہ گھر بھر کی زندگی تمہارے سبب سے تلخ ہو جاتی اور تم تو خدانخواستہ بن ناگفتہ بہ۔ سپہر آرا بولی تمام عمر گرداب میں رہتی اور موج غم کے تھپیڑے اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر تہ و بالا کر دیتے مگر خواستۂ خدا نہ تھا کہ کسی معصومہ کو بے وجہ مصیبت میں گرفتار کرے اب خدا نے وہ فکر کی کہ ہمایوں فر

کا نام اچھی طرح زبان پر نہیں لاسکتی خوف ہے کہ ما را جو سنے وہ بے حیا کہنے لگے ۔

خوف سے لیتے نہیں نام کوسن لے کوئی　　　دل ہی دل میں تمہیں ہم یاد کیا کرتے ہیں

جب کبھی یاد آجاتا ہے علٰحدہ جا کے رو آتی ہوں۔ اس کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ یہ تو آپس میں یہاں اس بے تکلفی سے کہہ رہی ہوں۔ نہیں کسی اور کے سامنے بھلا اس طرح کیوں کر صفائی کے ساتھ بیان کرسکتی اور ان کے روبرو تو کبھی آنکھ پرنمی یا ابرو پر میل ہی نہیں آنے دیتی۔ اِدھر جا کے اُدھر جا کے ٹھنڈی سانس کھینچی اور پھر دل کو تسکین دی گذشتہ را صلوٰۃ۔

نازک۔ اب ان باتوں سے بھلا فائدہ کیا ہوگا۔

حسن۔ بیوقوفی کیوں کر ثابت ہوگی۔ کہو جو تمہارے دل میں ہے وہ دل ہی میں رکھو اس کا اظہار عیب ہے۔ دس کے منہ بات پڑی چلو زمانے بھر میں مشہور ہوگئی۔

گیتی۔ جہان آدمی کے مرنے کا تو غیر غیر کو رنج ہوتا ہے نہ کہ اپنوں کو بھائیوں فرکی وفات کا سوگ سارے زمانے کو ہے کوئی ایسا نہیں جس کو ان کے مرنے سے تعلق نہ ہوا ہو مگر اس کا چارہ کیا اور جس شے میں مجبوری ہے جس میں بس نہیں چلتا اس میں بجز سکوت کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

سپہر۔ بہن کہتی ہوں کہ اب تک درد فراق نے مجھے مار ڈالا ہوتا۔ مگر اب تو اُف تک زبان پر نہیں لاسکتی۔ کس منہ سے کہوں اور کہوں تو کیا کہوں۔ کچھ کہوں بھی تو کہہ نہیں سکتی۔

حسن۔ یہ تو ہم سننا بھی نہیں چاہتے کہ تم کچھ کہو میں پوچھتی ہوں کہ تم کچھ کتنا ہی کیوں چاہو باقی رہا غم والم کس کا عزیز نہیں مرا ہے اور کون نہیں مرے گا۔ دنیا مرے گی۔ ہاں اگر یہ بات نہ ہوئی ہوتی تو البتہ تمہارا رنج کرنا بجا تھا۔ اب ظاہر کرنا اپنے کو مطعون کرنا ہے۔

سپہر۔ سچ کہتی ہوں باجی جان مگر قسم لو جو اس وقت کے سوا اور کبھی یہ باتیں زبان پر لائی ہوں۔ کیا مجھے آپ نادان سمجھی ہیں؟

نازک۔ ایسے مقام پر سب نادان ہو جاتے ہیں اب ان باتوں کو جانے دو۔ ہم کچھ پڑھیں۔ وہ سنو۔ مگر شرط یہ کہ دل کے کانوں سے سنو۔

سلامی دیکھ تو ہے رنگ آسماں کیسا　　　غم حسین میں رہتا ہے سب جہاں کیسا
اسیر فوج عدو سر کھلے پریشاں حال　　　چلا ہے شام کو زہراؑ کا کارواں کیسا
خدا سے شرم نہ کی ظالموں نے واویلا　　　نبیؐ کا کر دیا برباد دودماں کیسا

امام کہتے تھے اعدا سے دیکھو پانی
بلک رہا ہے مرا طفل نیم جاں کیسا

نازک ادا بیگم نے اس اس نازک ادائی سے ان اشعار کو ادا کیا کہ سب بے اختیار رونے لگیں اور کئی منٹ تک آنسو کے تار رونے کے نہ رک سکے۔

نازک۔ ہے ہے کسی روز بہت سناؤں گی کہ تم سب پھڑک پھڑک جاؤ۔ آج تو اس وقت خراش کے سبب سے ذرا گلا صاف نہیں ہے۔

بہار۔ تم جب پڑھوگی خوب پڑھوگی۔

حسن۔ اس وقت اس قدر دل بھر آیا کہ بیان سے باہر ہے۔

سپہر۔ ہاں باجی۔ اللہ جانتا ہے میرے قلب کا عجیب حال ہے۔
نازک۔ میں گھنٹوں رویا کرتی ہوں مگر یہ۔

گویا کو یہ کہیں کہ ہمارا ہے یہ محب ۔۔۔ ہو روزِ حشر اتنی عنایت حیلین کی

حسن۔ اتنا پوچھنا بھول گئی کہ اب تو کسی بات کا ڈر نہیں ہے۔
سپہر۔ کچھ نہیں باجی۔ اب ڈر اور خوف نہیں۔

شمس النسا بیگم اور روح افزا اور سپہر آرا اور حسن آرا سب سے علیحدہ ایک کمرے میں جا کر آزاد کی نسبت گفتگو کرنے لگیں۔ شمس النسا سے سپہر آرا نے کھود کھود کر کل باتیں پوچھیں تو انھوں نے یوں بیان کیا۔ بہن بات ساری یہ ہے کہ وہ دل وجان سے ان پر فدا ہیں اور یہ ان کی خوش قسمتی ہے۔ میں نے جو آزاد کو دیکھا تو خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں ایسا ہی خوش ہوا کہ بیان نہیں کر سکتی۔ نک سک سے درست، نوخیز جوان۔ رعنا شمائل زیبا خصایل۔ پسندیدہ کردار سعد جبیہ۔ شگفتہ رو۔ خوش تقریر اور شاعر ان کا حال تو حسن آرا سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ جتنے دن وہ بمبئی میں رہے میری روح کو فرحت حاصل ہوتی رہی اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں ان کو کسی طرح وہاں سے جانے نہ دوں مگر زیادہ اصرار کیوں کر کر سکتی تھی۔

حسن۔ سپہر آرا کا کبھی کبھی ذکر کرتے تھے ان کو بہت یاد کرتے ہوں گے جب ہم نے کہا تھا کہ تم جا کے روم میں نام پیدا کرو اور جنگ میں شریک ہو تو سپہر آرا نے ہم سے مخالفت ظاہر کی اور بڑی دیر تک رو رو کر اصرار کیا کہ باجی جان جس طرح ممکن ہو ہماری خاطر سے اس اصرار سے درگذر و اور بڑا رولا لائی تھیں مگر میں نے ایک نہ سنی۔ ایک بات نہ مانی۔

سپہر۔ واہ بڑا کام کیا تھا بڑی ہیں آپ کہنا تو نہ چاہیئے مگر برا نہ مانیے تو کہوں (دبے دانتوں) شرم تو نہیں آتی۔
روح۔ ہائیں کیا تو تم نے ظلم ہی تھا۔ بہن کہاں لڑائی کمبخت کہاں گولی بارود ۔۔۔۔۔۔۔ اور کہاں میاں آزاد یہ تم کو سوجھی کیا خوب!
حسن۔ اب انصاف کرو بہن اگر ہم اس قدر اصرار کر کے نہ بھیجتے تو آزاد کو کون جانتا دنیا میں کوئی اتنا بھی تو نہیں سمجھتا تھا کہ آزاد ہیں کون۔

سپہر۔ تو اتنے ہی کے لیے آپ کو یہ کرنا پڑا کہ ان کو میدان جنگ میں بھیجا اور مورچے پر جانے کا فتویٰ لگایا۔
حسن۔ اے ہے یہ اتنے ہی کے لیے ہوا۔
گیتی۔ اتنا تو ہم بھی کہیں گے کہ اگر آزاد روم نہ جاتے تو کبھی اتنا نام نہ ہوتا اور لوگ طعنے دیتے کہ غیر جگہ بھی شادی کی تو گمنام آدمی کے ساتھ۔
حسن۔ اور اب۔ اب بھی کوئی کہہ سکے گا۔
سپہر۔ اب کون کہہ سکتا ہے اب ان سے زیادہ نیک نام اور کون ہے۔ اب تو ہر طرف آزاد ہی آزاد کا نام ہے اور یہاں تک کہا کو ہم کو فخر کا مقام ہے کہ وہ ہمارے ۔۔۔ ہو ہوں۔ ایسے ہمزلف کا ہم کو بیشک فخر ہے۔
روح۔ بھلا اتنا بڑا شہزادہ کبھی اپنی زبان سے ایسا کہتا!
حسن۔ پھر آپ ہی سمجھیں۔ اب بتاؤ آزاد کو ہمارا شکر گذار ہونا چاہیئے یا ہم کو ان کا۔ یہ نام سب ہمارے سبب سے ہوا۔
روح۔ اس میں تو شک نہیں مگر جان جوکھم تو تھی وہ تو کہو خدا نے بچا لیا اور جو خدا ناکردہ کچھ اونچ نیچ ہو تی تو لوگ کیا کہتے۔

اب سنیئے کہ صاحب ضلع نے کامل تحقیقات کرکے شہزادی بیگم کو اطلاع دی کہ گورنمنٹ کو اب اس میں اصلاً شک نہیں کہ ہمایوں فر کے بڑے بھائی ہیں۔ اب سرکار کو ان سے یا آپ سے کسی قسم کا مواخذہ نہیں ہے۔

صاحب عالم نے اپنے طرز پر گھر کا انتظام کیا اور دوسرے روز حسب الطلب اپنی سسرال آئے۔ بڑی بیگم نے لڑکیوں کو بلا کر سمجھا اور سکھا دیا تھا۔ کہ خبردار کوئی کلمہ اس قسم کا زبان پر نہ لانا جس سے غم یا رنج ثابت ہو اور ہمایوں فر کا مطلق ذکر بھی نہ ہو ورنہ ان کے دل پر بڑا شاق گذرے گا اور بھائی کے غم کا زخم از سر نو تازہ ہو جائے گا۔

حسن آرا نے سپہر آرا کو علیحدہ لے جا کر سمجھا دیا تو وہ بولیں۔ باجی تمھارے نزدیک تو آج یہ نئی بات ہے اور یہاں اتنے دن رہتے سہتے گذرے کہ اب خیال ہی قریب نہیں آنے پاتا۔ تم مجھے سکھاتی کیا ہو۔ جب صاحب عالم کی سواری بڑی بیگم کے دولت پر پہنچی۔ اعزہ نے باہر کوٹھی میں بٹھایا۔ تواضع تکریم کی۔ محلسرا میں خبر آئی۔ بڑی بیگم نے اندر بلوایا۔ مگر جس خوشی اور تپاک سے داماد عروس کے گھر میں جاتا ہے اور جس شوخی اور پیار کے ساتھ سالیاں رل کی مذاق اور چہل کرتی ہیں اس کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ شاہزادے نے بڑی بیگم کو جھک کر سلام کیا اور قریب جا کر بیٹھے۔ ادھر ادھر سے سالیاں تاک جھانک کرنے لگیں۔ مگر کسی قدر افسردگی کے ساتھ ہمایوں فر کی تصویر سامنے کھنچ گئی۔ حسن آرا کا دل بھر آیا۔ ہر دو و دیوار سے مرزا ہمایوں فر ہی کی صورت نظر آتی تھی۔ روح افزا بار بار بہنوئی پر نظر ڈالتی اور دل ہی دل میں کہتی تھی کہ اللہ اللہ اس قدر مشابہت بالکل ہمایوں فر ہی ہیں ذرا فرق نہیں۔ گیتی آرا کی آنکھیں زجر الم سے پُرنم ہو گئیں مگر نیچی نظروں سے زمین کی طرف دیکھنے لگی تاکہ مبادا انہیں ان کو روتے ہوئے دیکھیں تو ان کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو جائیں۔ بہار النساء نے جو ہمایوں فر کے ساتھ بچپن میں کھیلی ہوئی تھیں ان کو غور سے دیکھا تو حسن آرا کے کان میں کہا۔ بہن ان کو تو میں جانتی ہوں اے یہ صاحب عالم ہیں جب میں اور ہمایوں فر بچپنے میں کھیلتے تھے تو یہ ہم دونوں سے الگ رہتے تھے ان کی ماں شاہزادی بیگم کہا کرتی تھیں کہ ہمایوں فر کی سب سے بنتی ہے مگر اس نے کیا جانے کیسی طبیعت پائی ہے کہ کسی برابر والے سے میل نہیں ہے۔

حسن۔ پھر تم پردہ کیوں کرتی ہو۔ سامنے کیوں نہیں ہوتی ہو۔

بہار۔ اے واہ۔ اس زمانہ میں تیرا بہانہ وہی مثل ہوئی۔

گیتی۔ (آنسو ضبط کرکے) اے بہن سپہر آرا کہاں ہیں؟

حسن۔ وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تصویریں دیکھ رہی ہیں۔

گیتی۔ چلو انھیں کے پاس چل کے بیٹھیں۔ ان کو اکیلا نہ چھوڑو۔

حسن۔ آپ کی بھی کیا باتیں ہیں وہ تو اُف نہیں کرتی اور وہ کیا آپ خواہی نخواہی چھیڑتی ہیں۔ جس میں ملول نہ ہوتی ہوں تو ہو جائیں۔

بہار۔ ہاں تم نے یہ میرے دل کی بات کہی۔ گھڑی گھڑی یہ کہنے سے کیا مطلب نکلتا ہے۔ اب تو پُرانی بات ہو گئی اس کو دل سے بھلانا چاہیئے بار بار اسی کا ذکر نہ کرنا چاہیئے۔

گیتی۔ میرا اس وقت بے اختیار دل بھر آیا۔ اوہ۔ توبہ۔

روح۔ ایسا نہ ہو وہ اپنے دل میں برا مانیں کہ یہاں کیا آیا کہ شہر خموشاں میں آیا کوئی بولتا ہے نہ چالتا ہے۔ امی جان بھی خاموش بیٹھی ہیں اور ہم سب الگ بیٹھے ہیں۔

حسن۔ بہارالنسا بہن کو ذرا دیر کے لیے جانا چاہیئے۔ بتلایئے آخر اس میں عیب کی کونسی بات ہے اور آج کوئی غیر تو یہاں ہے ہی نہیں کہ ہنسے گا۔ ایک نازک ادا تھیں سو وہ بھی اب نہیں ہیں۔ ملال جان بُرا ماننے سے رہیں۔

روح۔ ہاں ہاں۔ باجی جاؤ۔ سچ تو کہتی ہیں۔

گیتی۔ اے ہاں ہم ہی سب ہیں یہاں یا کوئی غیر ہے جو دس گھر میں جا کے بیٹھنے کا پھر جانے میں کیا چوری ہے تم کو تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ آج برات کا دن ہے اور دولہا گھر میں آیا ہے بیاہ کے دن دولہا سے پردہ کرنا کیا معنی۔ بہارالنسا نے کہا۔ اچھا اگر تم سب کی یہی رائے ہے تو کیا مضائقہ، پہلے تو آئینے کے پاس گئیں اور کئی منٹ تک اپنی صورت دیکھا کیں۔ حسن آرا اور روح افزا اور گیتی آرا سب ان سے واقف تھیں کہ دن رات نکھرنے کے سوا ان کو اور کوئی کام ہی نہیں۔ آئینہ میں صورت دیکھی تو پسند نہ آئی۔ پانی منگوا کے منہ دھویا پھر نیا دوپٹہ کیا۔ اب دوپٹے کے بدلنے کی فکر ہوئی۔ حسن آرا نے کہا یہ دوپٹہ نہ چنیں گے دوسرا لاؤ۔ اس پر روح افزا جھلا کر بولیں اے باجی از برائے خدا اس خبط سے درگذر رو۔ اے واہ اس دوپٹے میں کیا ہوا ہے۔ خاصہ اچھا دوپٹہ ہے مگر آپ سے کہے کون۔
حسن آرا اور گیتی آرا نے قہقہہ لگایا تو صاحب عالم نے ادھر نظر ڈالی اور خوش ہو گئے کہ گھر سونا نہیں ہے قہقہے کی آوازیں آتی ہیں گو طرح طرح کے خیالات نے ان کو از بس ملول کر دیا تھا اور ان کا دل بھی قابو میں نہ تھا۔ مگر گھر سے عہد کر کے آئے تھے کہ انتہا سے زیادہ ضبط کروں

اتنے میں دوپٹہ بدل کر اور دولہن بن کر بہارالنسا چھم چھم کرتی ہوئی کمرے سے نکلیں۔ صاحب عالم نے دیکھا تو ہے

پائجامہ گلابی اطلس کا   عطر جس میں لگا ہوا خس کا

نظر غلط انداز سے کئی بار دیکھا تو اس عروس نازنین کا جمال مبین بہت بھایا اور پسند آیا۔ بڑی بیگم کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کو بہارالنسا کا اس بے تکلفی سے باہر آنا بڑا معلوم ہوا۔ بہارالنسا نے صاحب عالم کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ پہچانا یہ ڈھنگ کہ یا الٰہی یہ پری پیکر مجھے کیوں کر جانتی ہے، غور کر کے دیکھا کہا جی نہیں میں نے نہیں پہچانا۔ لاکھ سوچتا اور غور کرتا ہوں کہ کہاں دیکھا تھا کب دیکھا تھا مگر دھیان نہیں لڑتا اور میں تو جانتا ہوں کہ دھوکا ہی دھوکا ہے۔ بہارالنسا نے مسکرا کر کہا دیکھا ہے، اتنے میں بڑی بیگم بولیں۔ سچ تو کہتے ہیں۔ بیٹا تم نے ان کو کہا دیکھا ہو گا۔ بھلا یہ پہچانیں تو کیوں کر پہچانیں۔ بہارالنسا بولیں اتی جان یہ چاہے بھول گئے ہوں ہم تو نہیں بھولے ہیں ابھی تک انگلی میں نشان باقی ہے یہ آپ ہی کی عنایت ہے اب بھی یاد نہیں صاحب عالم نے غور کر کے کہا۔ ہاں ہاں سچ کہا۔ اوہو برسوں کی بات ہے۔ میں نے اب بخوبی پہچان لیا بہارالنسا بیگم ہیں۔ دونوں بہنیں ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ کچھ ٹھکانا ہے کتنا عرصہ ہوا۔

بہارالنسا گو دل کی بے پاک اور نیت کی صاف تھیں مگر ان کے مزاج میں غرور حسن نے بہت دخل پایا تھا اور اس وقت اپنی پسند و مرضی کے موافق بناؤ چناؤ کرتی تھیں اس وقت حسن گلوسوز اور ادائے رنگین کے اظہار کا کمال شوق چرایا تھا اور یہی جی میں آتا تھا کہ کوئی دیکھے اور تعریف کرے۔ صاحب عالم شہزادہ قمر طلعت کے دکھانے کے لیے کوئی ادا باقی نہ رکھی۔ گویا مارے شرم کے ذرا چار آنکھیں کرتے ہوئے لجاتے تھے۔ مگر نظر غلط انداز ہی ستم ڈھاتی تھی۔

بہارالنسا۔ ہماری بہن جب سے ان کے یہاں گئی بالکل دُبلی ہو گئی۔

شہزادہ (مسکرا کر) جی درست ہے آپ تو ایسا ہی کہا چاہیں۔

بہار۔ کیا کچھ جھوٹ بھی ہے نہیں دُبلی ہوئی ہے؟

شہزادہ۔ خدا خدا کیجیے صاحب دُبلا ہونا کیا معنی ؟

بہار۔ اچھا سپہر آرا جو کہہ دیں وہ صحیح ہے بس۔

شہزادہ۔ وہ تو خواہ مخواہ اپنی بہنوں کی سی کہیں گی۔

بہار۔ یہ کیا ہے سے معلوم ہوا وہ تو سسرال کا دم بھرتی ہے۔

شہزادہ۔ واہ یہ باتیں ہیں۔ اچھا خدا نخواستہ آپ نے کیا دُبلا پن دیکھا اور یوں تو قاعدہ ہی ہوتا ہے کہ سسرال والے خواہ مخواہ مورد طعن ہوتے ہیں۔

بہار۔ تو ہم سسرال والوں میں نہیں ہیں جی۔

شہزادہ۔ کوئی اور بھی کہتا ہے یا آپ ہی کی رائے ہے ؟

بہار۔ تو تم رہتے کس برتے پر ہو۔ ہماری بہن کا جو حال ہم کو معلوم ہے تم کو معلوم ہو سکتا ہے۔ کبھی پہلے دیکھا تھا پھر بھلا ہم سے حجت کیا معنی۔

بڑی بیگم تو تھوڑی دور پر ایک اور اِدھر کی عورت سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں اور ادھر ان کو باتیں کرنے کا موقع ملا۔ جیسے بہار النسا نے یہ فقرہ کہا (پھر ہم سے حجت کیا معنی) ویسے ہی کمرے سے آواز آئی (گدھا پن کیوں کر ثابت ہو) یہ گرما گرم فقرہ سنتے ہی بہار النسا ہنس پڑی اور کمرے سے بھی کئی کم سنوں کے قہقہے کی آواز آئی اور صاحب عالم مُنہ پر رومال رکھ کر مسکرائے اور اس قدر جھینپے اور شرمائے کہ بیان سے باہر۔

شہزادہ۔ جس نے ہمیں گدھے کا خطاب دیا ہے اس کی صورت تک سے ناواقف ہیں۔ شوخی اور بے تکلفی تو اس کی مقتضی ہے کہ رُخِ انور کی جھلک دکھا دیں۔

آواز۔ پھر گدھے پن کی لینے لگے، ایک نشد دو شد۔

شہزادہ (بہار النسا سے) یہ کون ہیں بڑی گرما گرم، بڑی تیز، بڑی مقرر، بے تکلف معلوم ہوتی ہیں۔

آواز۔ سپہر آرا کہتی ہیں ہم کو ان کی باتوں پر ہنسی آتی ہے۔

شہزادہ۔ یہ گھونگھٹ کیا معنی اے صاحب خاموش۔

آواز۔ ماشاء اللہ ماشا واللہ بس خبردار۔ زبان سے بھی ان میاں کو کہنا نہیں ہے، لکھتے کچھ ہیں منہ سے نکلتا کچھ ہے۔

شہزادہ۔ آپ کا سا مقرر یا درلسّان تو کوئی شاذ ہی ہوگا۔ ناظرین شاید سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون شوخ بیباک اس بے حجابی اور لگاوٹ بازی اور زبان درازی سے گفتگو کرتی تھی۔ حسن آرا کی یہ تقریر نہیں، ان کی شوخی بھی نستعلیق ہے۔

سپہر آرا یہ کلمہ صاحب عالم کے حق میں بھلا کیوں کر زبان پر لاتی اور روح افزا گو مزاج کی تیز ہیں مگر اس قدر بے جھجک نہیں۔ گیتی آرا کے زبان آور ہونے میں شک نہیں لیکن اس درجہ ڈھیٹ نہیں ہے۔ یہ نازک ادا بیگم ہیں۔ جانے کو تو گھر گئیں مگر رہا نہ گیا۔ دوسرے روز واپس۔ آج آئیں تو سنا کہ صاحب عالم تشریف رکھتے ہیں۔ یہ بھلا بے آوازہ کسے پھبتی کہے کب رہنے والی تھیں حسن آرا نے لاکھ لاکھ کر سمجھایا مگر انہوں نے ایک کی نہ سنی اور موقع پا کر تڑ سے بول ہی اٹھیں۔

اب سنیے کہ جب نازک ادا اور صاحب عالم میں سوال و جواب ہونے لگے تو روح افزا نے کہا چاہے جو ہو میں تو تمہارا نام بتا دوں گی۔ خدا جانے وہ کیا سمجھیں۔

نازک۔ اخاہ۔ کیا چڑی پڑی ہے مجھے موئے!

روح۔ اللہ جانتا ہے ہم نام لے دیں گے جس میں تمھارے سبب سے کوئی اور تو مفت میں بدنام نہ ہو۔

نازک۔ اے روح افزا بہن کہتی تو تم ہو اور نام سب کا بدنام ہوگا۔ کہو تو اپنا نام لے کر کہو یہ تمھارے سبب سے کوئی اپنے کو کاہے کو بدنام کرے گا۔

روح۔ ہمارا نام تو نازک ادا بیگم ہے بہن۔

شہزادہ۔ اخاہ۔ یہ کہئے۔ نواب آسمان جاہ تشریف فرما ہیں۔

حسن۔ (ہنس کر آہستہ سے) ان کے نام سے کون نہیں واقف ہے۔

روح۔ اب بوبو۔ بہت بڑھ بڑھ کے باتیں بناتی تھیں۔

گیتی۔ اچھی دھری گئیں۔ اس وقت روح افزا نے بڑا کام کیا۔

شہزادہ۔ جب ہی میں سوچتا تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ کون شوخ و شنگ بیگم صاحب ہیں۔ چٹاخ پٹاخ زبان ہے کہ فراٹے بھرتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ نازک ادا بیگم صاحب تشریف رکھتی ہیں۔ مزاج شریف!

نازک۔ روح افزا دیکھو اللہ جانتا ہے تم کسی کا نام مفت میں لے کر لڑائی مول لیتی ہو اور پھر ہم اگر۔

روح۔ وہ تو گفتگو ہی سے پہچان گئے ہوں گے۔

شہزادہ۔ آپ کے کہنے کی ذرا ضرورت نہیں ہیں ان سے خوب واقف ہوں ماشاءاللہ بڑی گویا ہیں۔ اور مجھے تو اس وقت کمال مسرور کیا۔ اس قدر تعریف کی کہ میری زبان اس کے شکریہ سے قاصر ہے (مسکرا کر) تسلیم عرض ہے۔

نازک۔ اب کیا کچھ اور سننے کا قصد ہے۔

شہزادہ۔ اب اس سے بڑھ کر اور کیا کہیے گا۔

نازک۔ پھر اب سننے کو جی چاہتا ہو تو لیجیے کہہ دوں۔

شہزادہ۔ آپ سے جیتنا یا عہدہ برا ہونا یہ تو محال ہے۔

نازک۔ سسرال میں مان کے بسنے جاتا کیا معنی؟

شہزادہ۔ اس میں کیا شک ہے پھر سُنا تو چکیں آپ۔

بہار۔ میں تو دنگ ہوگئی کہ یا اللہ یہ کون ہے کیسا بیدھڑک کہہ اٹھیں۔ پھر جب آواز سُنی تو پہچان گئی کہ سوائے نازک ادا بیگم کے اور کون ہوگا۔

نازک۔ ہم نے سنا ہے آپ تو خوب نکھر سلور سے گئی ہیں۔

(بہار النسا۔ رجیب پڑ کر اب تم سے کون دفتر ہائیں)

نازک۔ ہاں ہاں۔ کہو کہو۔ کون۔ کہہ کے رہ گئیں۔ بس آخر جب دل میں چور نہیں ہے تو فرمائیں کیوں۔ یہاں سب کی سب ہنس رہی ہیں کہ بہار النسا بیگم نے تو بے نکھرے ہوئے قدم نہیں اٹھایا۔

بہار۔ اچھا پھر تم کو کاہے سے رشک ہوتا ہے؟

شہزادہ۔ چلو آپسے نا مضائقہ کیا ہے۔

نازک ۔ اللہ اللہ اب تو دیہاتن بھولی کہ بیٹو نہ دیتے ہی ہاتھ پکڑ لیا۔ انھیں سے باتیں کیجیے۔ بس اگر مجھ سے آپ الست ہیں تو بس الست

شہزادہ ۔ غیر تو خیر آپ کی کریم کو کیا ہوگا کہ ایک ذرا سی بات میں انکار کیا جیسے وہاں بیٹھی ہیں تو آپ ویسے یہاں بیٹھیے۔

نازک ۔ پھر وہی ۔ اب کو گے صلواتیں سناتی ہو۔

شہزادہ ۔ وہیں کے بعد کیسے تادیر گد ھا ہی چلانا۔

غیور بن گئے ہیں یا جو کچھ ہیں مروت کے یہی معنی ہیں کہ اتنے ستانے کے بعد یہاں تشریف لائے۔

زقدر و شوکت سلطان نگشت چیزے کم
زالتفات بہ مہمان سرائے دہقانی

روح افزا نے نازک ادا کو چھیڑنا شروع کیا اور چونکہ سب بیویاں روح افزا ہی کی طرف تھیں اس سبب سے نازک ادا کی دال نہ گلی۔

روح ۔ پھر ان کے دماغ کیوں کر ملیں جب شہر بھر کے شہزادوں اور نوابوں کی زبان پر ان کا نام رہتا ہے تو یہ جس قدر غرور کریں بجا ہے۔

نازک ۔ اے تم کاہے کو رشک کرتی ہو۔

روح ۔ ان کے کہنے کا اس وقت کوئی برا نہ مانا۔

گیتی ۔ ہاں اس وقت سب کو برطرف کرکے آئی ہیں۔

اس فقرہ پر بڑا قہقہہ پڑا اور سب کی سب بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑیں مگر ایک دیہاتن جو دو تین دن سے یہاں نکلی تھی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ قہقہہ کس بات پر پڑا۔ سادگی کے ساتھ گیتی آرا سے سبب دریافت کیا تو وہ ہنس کر بولیں اے تو ان کو ابھی یہی نہیں معلوم کہ یہ ہنسی کاہے کی ہے۔

نازک ۔ کون ۔ بی شکورن ۔ یہ بیچاری بھلا کیا سمجھیں۔

روح ۔ کشمیری بھانڈ نقل کیا کرتے ہیں کہ ایک رئیس کے دماغ پر گرمی جو چڑھ گئی تو سویرے اٹھتے ہی جو جاتا ہے اس کو پھاڑ کھاتے ہیں۔ خدمتگار نے جھک کے سلام کیا اور وہ چراغ پا ہوئے۔

شکورن ۔ کیا ہوئے ۔ کیا ہوئے ۔ چراغ کیا؟

نازک ۔ اب تم تو بہن ان سے وہ باتیں کہتی ہو جو اچھی اچھی شہر والیوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں ۔ کھڑی مردانی بولی۔

روح ۔ مطلب یہ کہ جس نے بات کی اس کو پھاڑ کھایا ۔ خواص آئی بندگی حضور تو فوراً بگڑ کر کہا تم برطرف ۔ مصاحبوں نے مزاج پرسی کی سلام کیا ۔ یہ بولے تم بھی برطرف ۔ اسی طرح سب کو برطرف کرتے کرتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ اپنی جورو تک کو برطرف کر دیا۔

شکورن ۔ یہ کس کو برطرف کرکے آئی ہیں ان کے جورو کہاں۔

روح ۔ واہ ۔ کیا یہ مرد ہی نہیں ہیں ۔ اے یہ تو سو امرد ہیں۔

نازک ۔ اے ہمارا انصاف بہن کچھ باتیں کرو ۔ خالی خولی بیچارے بیٹھے مکھیاں مار رہے ہیں ۔ نہ کچھ بولیں نہ چالیں اور کچھ نہیں تو پھر خاصہ کہیں سے منگوا دو ۔ کھانا ہی کریں۔

شہزادہ - اب آخر پردے سے گفتگو کب تک ہوا کرے گی، باہر آیئے روبرو دوبدو گفتگو ہو۔

اے بتو کس تو بہ اللہ کو منہ دکھلانا — آج منہ ہم کو دکھاؤ گے تو احسان ہوگا

نازک - یہ بے صبری! اب سوال کیا ہے تو مراد پا چکے۔

شہزادہ - واہ بتوں کی درگاہ سے سائل کہیں محروم جاتے ہیں!

جو چاہے سو مانگ آتش درگہ الٰہی سے — محروم کبھی پھرتے دیکھا نہیں سائل کو

اور بتوں پہ یہاں ایمان لائے ہوئے ہیں۔

نازک - مجھے تو کچھ بڑے لسّان بڑے زبان آور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اب تک یوں ہی بھیگی بلّی بنے ہوئے بیٹھے تھے، مگر اب معلوم ہوا پیٹ میں کس بھرے ہوئے ہیں مگر واہ ری ادا ؎

کھب گئی دل میں یہ کس خنجر مژگاں کی ادا — دل تڑپتا ہے جدا ٹکڑے جگر ہوتا ہے

روح - (دانتوں تلے انگلی دبا کر) ہائیں!

گیتی - (متحیر ہو کر) بس حد ہو گئی!!! ارے توبہ!

شہزادہ - صاحب ہم آپ سے ہارے۔ بیشک ہار گئے۔

روح - اوہ یہ ان سے اس قدر بے جھجک کیا کیونکر گیا۔

نازک - اس کی سند نہیں کہ ہاری ہاری پکارنے لگے۔ جب جانیں کہ اس کے جواب میں کوئی ایسا ہی پھڑکتا ہوا شعر کہو ؎

ہمہ تن کشتہ ہوں تیغ نرگس بیمار کا — ہر دہانِ زخم پہ یاں خندۂ مستانہ ہے

سیکڑوں شعر یاد ہیں ؎

پاسِ ادب رہا ہے جنوں میں بھی اس قدر — آتا ہوں سجدے کرتا ترے آستاں تلک

فصلِ خزاں میں گل کا تو آنا محال ہے — بجلی ہی کاش آئے مرے آشیاں تلک

اس مہ کے وصف میں یہ ہوا مرتبہ بلند — پہنچی مری غزل کی زمیں آسماں تلک

رکھیں ادب سے پاؤں نہ ہم تیری راہ میں — باہر جب آپ سے ہوں تو پہنچیں وہاں تلک

کب پہنچی آہ ضعف سے گوشِ جہاں تلک
سو جا ٹھہر کے سینے سے آئی دہاں تلک

روح - اس وقت گانے پہ کچھ مہربانی کی۔

بہار - اب تو تم نے صاحب عالم کو بند کر دیا۔

نازک - جبھی تو خاموش بیٹھے ہیں۔

اتنے میں صاحب عالم کو آزاد پاشا یاد آئے تو ان کی توصیف میں عرصۂ دراز تک رطب اللسان رہے۔

شہزادہ - حسن آرا بیگم تو بخیریت ہیں؟

بہار - ان خیر و عافیت سے ہیں۔ آپ کے استفسار اور پرسش کا شکریہ ادا کرتی ہیں کہ آپ کو اس قدر خیال رہا۔

شہزادہ - اب تو انشاء اللہ جشن مسرت ہوگا۔

بہار۔ انشاءاللہ۔ اب کچھ تھوڑی ہی کسر باقی ہے۔
شہزادہ۔ سنا ہے دور تک آ گئے ہیں مگر چشم بد دور خوب نام پیدا کیا۔ جہاں سنو انھیں کا چرچا اور جس کو دیکھو انھیں کی تعریف کرتا ہے۔ ایک جلیل القدر انگریزی زبان سے ہم نے بڑی توصیف سنی، وہ مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوستان کے اکثر مشہور انگریزی اخباروں میں ہم نے آزاد کی تعریف پڑھی اور ولایت کے کل پرچوں میں ان کی جرأت و بسالت کا حال درج پایا۔ ایسے نیک نام ہیں۔
بہار۔ ان کے سب دوست ہیں کوئی نام کو دشمن نہیں۔
شہزادہ۔ ایسے شخص کے سب دوست ہوتے ہیں اور اسی سبب سے وہ اور بھی زیادہ مشہور ہوتا ہے ؎

ہر کجا کردم وصف دوستاں گویم
برائے یار فروشی دکاں نمی باید

نازک۔ کسی اخبار میں آزاد کی تصویر بھی دیکھی ہے؟
شہزادہ۔ کسی اخبار میں کیا معنی، کیا کوئی ایسا اخبار بھی ہے جس میں ان کی تصویر نہ ہو ہمارے البم میں تو کئی تصویریں ہیں۔
نازک۔ بھلا حسن آرا بیگم کی تصویر بھی کہیں دیکھی؟
شہزادہ۔ (ہنس کر) اب اس کا جواب وہ خود دیں گی۔
بہار۔ تم اپنی تصویر کھنچواؤ تو کیا مضائقہ ہے بہن!
نازک۔ ہماری تصویر تو اس لائق نہ ہوگی کہ کوئی دیکھے۔ روح افزا کو اللہ نے وہ صورت دی ہے کہ.....
اس قدر کہا تھا کہ روح افزا نے جھلا کر ان کا منہ پکڑ لیا اور نازک ادا (کہہ) کہہ کر خاموش ہو گئیں اور ہنسنے لگیں۔
روح۔ اے تو تم کاہے کو بدنام کرتی ہو۔
نازک۔ تمھاری تو اور تعریف ہوتی ہے تم کیوں مانتی ہو۔
گیتی۔ اس قابل ہوں تو برا مانیں ہاں تم البتہ اس لائق ہو کہ سب کے پاس تمھاری تصویر رہے۔
روح۔ اور ہم کو جانتا ہی کون ہے، تم البتہ شیطان سے زیادہ مشہور ہو۔
بہار۔ نازک ادا کی زبان ولایتی منقراض سے کم نہیں۔
شہزادہ۔ ہاں کیا اچھی مثال دی ہے آپ نے۔
نازک۔ آپ کو بھی ہماری زبان پسند آئی۔ شان خدا۔

صاحب عالم کچھ دیر کے بعد دیوان خانے میں تشریف لائے یہاں بڑی بیگم کے اعزہ نے تعظیم و تکریم کے ساتھ بٹھایا اور ان کے سفر و سیر و سیاحت کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے کہا خدا جانے کیا بات ہوئی کہ ہم نے وطن کو ترک کر کے کوہستان پر رہنا اختیار کیا۔ عابد علی شاہ درویش نے وہاں ہم کو پڑھائی منطق اور ریاضی اور علم ادب اور فقہ اور طب اور صرف و نحو میں خدا کے فضل اور استاد شفیق کی توجہ سے برق ہو گیا تو اسکول میں جا کر انگریزی پڑھی۔ اگر خدا روپیہ دے اور عقل دے تو سال میں کم سے کم چار مہینے پہاڑ پر ضرور رہے، از سر نو جان آتی ہے، خدا داد لطف حاصل ہوتا ہے

ایں سبزہ و ایں چشمہ و ایں لالہ و ایں گل
آں شرح ندارد کہ بگفتار در آید

نواب۔ آپ کو......

شہزادہ۔ فرمائیے فرمائیے، آپ کو کہہ کے آپ رہ گئے۔ ہاں فرمائیے نا۔

نواب۔ کیا مطلب ہے اب ان باتوں کا ذکر ہی کیا ہوا جو کچھ ہونا تھا، خدا آپ کی زندگی میں برکت دے اور صد و سی سال عمر آپ کو عطا کرے۔ ہمارے سر تاج اور نور عین ہیں آپ۔

شہزادہ۔ میں نے اس سانحہ جگر دوز کا حال ایک اخبار میں پڑھا تھا تو گھر سے دل پھیکا پڑ گیا تھا مگر بھائی کی محبت جوش زن ہوئی اور بڑی دیر تک مثلِ ماہی بے آب تڑپتا رہا۔ کسی سے میں نے کچھ کہا نہ سُنا دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ یار دوست آشنا احباب سب متحیر کہ یا خدا آج ان کو بیٹھے بٹھائے کیا ہُوا۔ کسی نے کہا دماغ میں خلل ہو گیا ہے، کوئی سمجھا ایک ساعت کا جنون ہے کسی نے تشخیص کی کہ کوئی عارضہ ہے۔ الغرض سب نے عقل کے گھوڑے دوڑائے مگر کوئی یہ نہ سمجھا کہ دردِ دل کیا ہے۔ بس بآواز بلند بھائی کا نام لیکر اتنا البتہ کہا کہ اب مجھے کوئی تمنا نہیں ہے بجز اس کے کہ اپنی مادر ضعیفہ کو تسکین دوں اور مزار پر سر پھوڑ دوں ؎

سر مزار تو بنشینم و فقیر شوم   کنوں نماند تمنا وگر امیر شوم

نواب۔ ہائے افسوس اس کی جوانی مفت برباد گئی ہائے ہائے۔

رفیق۔ خداوند باغ میں تشریف لے چلیے، وہاں فرحت ہے۔

نواب۔ ہاں چلیے اب صاحب وہیں چل کر بیٹھیں اب دل کو بہلانا چاہیئے، خدا کی خدائی میں کسی کو دخل نہیں مشیت ایزدی کو وہی سمجھ سکتا ہے۔ بس۔

رفیق۔ حضور ایسے سانحے ہوتے ہیں کہ میں کیا عرض کروں۔

نواب۔ اسی کا نام دنیا ہے اور دُنیا کسے کہتے ہیں۔

تفریح طبع کے لیے باغ میں گئے اور بات ٹالنے کی غرض سے نواب صاحب نے شعر خوانی شروع کی ؎

ترا سمند کرے دوڑنے کا کیوں کر عزم   تمام عرصۂ دہر اس کو تنگ میداں ہے
قدم قدم جو چلے وہ تو سب لگے کہنے   کبھی نظر سے ہے پنہاں کبھی نمایاں ہے
شہا نہیں ہے یہ بے وجہ آسماں پہ ہلال   بتاؤں کیا کہ منجم کی عقل حیراں ہے
ترے سمند نے اُڑ کر وہاں جو ماری ٹاپ   نشان نعل کا یوں آج تک نمایاں ہے
ہر ایک اسپ سمجھتا ہے اپنی زیست اسے   ترا کمیت تو حیواں کو آبِ حیواں ہے
کہوں غزال ترے بادپا کو میں کیوں کر   کہ اس کے سامنے ہیچ رمِ غزالاں ہے
پھر آئے جلد وہ ایسا ہی ربع مسکوں ہیں   کہ اس کا عکس جہاں تھا وہیں نمایاں ہے
کہوں میں شبیہ ترے فیل سیہ کو پھر شبِ قدر   اور اُس پہ ہودج زریں مہ درخشاں ہے

یہ تیز رو ہے کہ پل میں نگہ سے غائب ہو
اگرچہ ڈیل میں وہ مثلِ چرخ گرداں ہے

شہزادہ۔ ع۔ اگرچہ ڈیل میں وہ مثلِ چرخ گرداں ہے۔ انگریز چرخ کے قائل نہیں۔ وہ اس کو حدِ نظر بتاتے ہیں اور ہم لوگ آسمان

کے قائل ہیں۔

رفیق۔ خداوندان لوگوں کی نہ کہیے، وہ تو سوائے عقل کے بس اور شے کے قائل ہی نہیں۔

نواب۔ اچھا اس میں تو عیب نہیں، عقل تو مقدم ہے مگر وہاں حکمِ خدا میں عقل دوڑانا اور جو شے انسان ضعیف البنیان کی فہم سے خارج ہو اس کو باور نہ کرنا یہ البتہ قبیح مستبعد ہے

معقول اس کا جو نہیں معقول خود نہیں
حکمِ خدا میں دخل نہیں ہے دلیل کا

رفیق۔ کیا خوب فرمایا ہے حضور نے اور سرکار سنتے ہیں کہ یہ جو سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے اس کے بھی لوگ قائل نہیں ہیں۔

شہزادہ۔ اس کے کیا معنی جوار بھاٹا آتا ہے اور اس کے قائل نہیں؟ یہ نئی بات ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ قمر اور شمس ان دو کروں کی کشش سے جوار بھاٹا آتا ہے۔ قمر چونکہ کرۂ شمس کی نسبت زمین سے قریب ہے اس سبب سے اس کی کشش کا زیادہ اثر پہنچتا ہے یہی اس کے اسباب خاص ہیں۔

نواب۔ ماشاء اللہ علوم انگریزی میں بھی دخل ہے۔

رفیق۔ خداوند شہزادگی چھوڑ کے علم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

نواب۔ اس میں کیا فرق ہے۔ اسی طرح علم حاصل ہوتا ہے۔

شہزادہ۔ جناب علم تو دریائے زخار بلکہ بحر ناپیدا کنار ہے۔

نواب۔ یہ سچ مگر کوئی زیادہ جانتا ہے کوئی کم کوئی بالکل ناواقف ہے اُس کو علم سے کوئی واسطہ ہی نہیں اس قدر فرق ہے۔

سامعین کے دلوں پر صاحب عالم کی علمیت اور قابلیت کا نقشہ منقوش ہو گیا۔ پہلے سب کو گمان تھا کہ ان میں اور مرزا ہمایوں فر بہادر میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔ مگر یہ خیال دور ہو گیا۔ مرزا صاحب اور شہزادے میں کبھی کی ملاقات اور جان پہچان نہ تھی۔ نواب حشمت علی خاں نے اُن دونوں میں ملاقات کرائی اور یوں تعریف کی

حشمت علی خاں۔ (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے) آپ سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کے ہم لف ہیں بغل گیر ہو جیے۔ آپ خورد ہیں ان کے۔

شہزادہ۔ (ایستادہ ہو کر) مجھے آپ کی خدمت میں نیاز نہیں حاصل ہے۔

مرزا۔ (بغل گیر ہو کر) مجھے بھی کبھی نیاز نہیں حاصل ہوا تھا۔ آپ کی تعریف بہت سنی ہے اور اس وقت آپ کی تقریر سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ واقعی عالم اور ذی لیاقت ہیں۔

شہزادہ۔ جناب یہ سب آپ ہی کی تعریف کرتے ہیں۔ کل انا رتیر شح بما فیہ، ورنہ من آنم کہ من دانم۔ آپ کا قیام تو بمبئی میں رہتا ہے۔

مرزا۔ جی ہاں کئی سال سے بمبئی ہی میں قیام ہے۔

شہزادہ۔ آپ سے تو حضرت آزاد پاشا سے ملاقات ہوئی ہو گی۔

مرزا۔ جی ہاں۔ جب روانہ ہوئے تھے تب بھی اسی جانب سے گئے تھے اور آتے ہوئے بھی۔ اور دوسرا تو کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

شہزادہ۔ ملاقات میں آپ نے ان کو کیسا پایا بے نظیر؟

مرزا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا کہنا ہے، جواب کا ہے کو رکھتے ہیں، فرد ہیں۔ کوئی علم، کوئی فن، کوئی امر ایسا نہیں جس میں طاق نہ ہوں اور بڑے مذاق کے آدمی ہیں۔ شکل و صورت سبحان اللہ سبحان اللہ، نہایت وجیہہ اور خوبرو جوان رعنا ہیں۔

شہزادہ۔ جنگ کے حالات ان کی زبان سے کمال دلچسپ معلوم ہوتے ہونگے۔

مرزا۔ کئی لیکچر دیے۔ بمبئی کے لوگوں نے اُن کی بڑی قدر کی اور اس کے تو وہ ہر آئینہ مستحق ہیں۔ ہنگام تقریر مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ بڑے گویا زبان آور آدمی ہیں۔

شہزادہ۔ سُنا ہے اُن کے ساتھ دو فرنگنیں آئی ہیں یہ صحیح ہے؟

مرزا۔ ایک روسی لیڈی ہے، دوسری کوہ قاف کی پری۔

شہزادہ۔ اس میں کچھ کلام تو نہیں ہے اور سنا ہے دونوں جوان ہیں۔

مرزا۔ نوخیز، دوشیزہ، حسین، نازنین، مہ جبین اور شوخ۔

شہزادہ۔ وہ بھی آپ ہی کے ہاں فروکش ہوئی تھیں یا کہیں اور؟

مرزا۔ وہ ہوٹل میں فروکش ہوئی تھیں مگر ہم نے ان کی دعوت کی تھی۔ اُردو بالکل نہیں سمجھتیں۔ ایک میم کو بلوایا تھا اس کے ذریعے سے کچھ کچھ مطلب سمجھ میں آتا تھا۔

شہزادہ۔ یہاں تو خبر گرم تھی کہ ایک کے ساتھ عقد ہوگیا ہے مگر کسی کو اس امر کا یقین نہیں آتا تھا۔ اب آپ کو مفصل حال معلوم ہوگا۔

مرزا۔ حضرت ان دونوں نے ان کی جان بچائی۔ اگر یہ دونوں نہ ہوتیں تو آزاد کا اس قدر نام بھی نہ ہوتا۔ اوّل تو یہ مفقود اور روپے کے بغیر کام چلنا معلوم۔ سب سے زر عشق میں ٹپر ٹپیں، دوسرے اکثر امور میں انھیں دونوں کی مدد کی خاص ضرورت تھی۔

اب محلسرا کا حال سنیئے کہ شمس النسا بیگم جو عرصے کے بعد خواب ناز سے بیدار ہوئیں اور سب ہمجولیوں میں آئیں اور معلوم ہوا کہ صاحب عالم عرصہ دراز تک بڑی بیگم کے پاس بیٹھ کر باہر گئے ہیں تو ان کو بڑا رنج ہوا کہ کسی نے بھی نہ جگایا۔ مغلانیوں پہ خفا ہوئیں، مہریوں پر جھلائیں، حسن آرا اور روح افزا سے بگڑ کر کہا، اے بہن واہ سبحان اللہ ذرا جگا یا تک نہ گیا۔

روح۔ تو سوکا ہے کو رہی تھیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ جگاتا پھرتا بمبئی سے یہاں تک تو اشتیاق سے آئیں اور یہاں جان کے سورہیں تو سانس ڈکار تک نہ لی۔

حسن۔ اور ہم کو کچھ خیال بھی نہ رہا کہ باجی یہیں ہیں ورنہ ضرور جگاتی۔

روح۔ کوئی دن کو سوے ہی کیوں۔ رات سونے کے لیے خدا نے بنائی ہے یا دن۔

شمس۔ یہ ایک تو شرماتی نہیں دوسرے اوپر سے ہم کو باتیں سناتی ہیں۔

روح۔ جا کے سورہیں مجھے یاد تھا۔ مگر میں نے کہا سونے دو۔ دن کا سونا بڑا منحوس ہوتا ہے سن!

بڑی۔ کیا ہے، کیا منحوس ہوتا ہے، نحوست کیسی؟

حسن۔ اب تباؤ کسی کی زبان سے نحوست کا نام نکلا اور ان کے کان کھڑے ہوئے یا الٰہی بڑا شک اماں جان کے مزاج میں ہے۔

روح۔ اماں جان دن کا سونا لوگ کہتے ہیں منحوس ہوتا ہے۔

بڑی۔ لوگ کہتے ہیں کیا معنی۔ کیا تم نہیں جانتی ہو۔

شمس۔ اماں جان میری طبیعت ذری یونہی سی بے لطف تھی تو دو گھڑی کے لیے سورہی۔

بڑی۔ بیٹا دو گھڑی کے سونے کی آج عادت ڈالی، کل دوپہر سوؤ گی، پرسوں دن بھر سوتی ہی رہو گی۔ سونا نہ ہوا بیماری ہو گئی خدانخواستہ۔
روح۔ جتنی دیر صاحب عالم بیٹھے رہے یہ سویا کیں ان کو ہوش بھی نہیں کہ وہ کب آئے کب گئے اور جو میں کہتی ہوں تو خفا ہوتی ہیں۔
بڑی۔ بڑی بات ہے، سونے کے لیے رات کیا کم ہے۔
شمس۔ (آہستہ سے روح افزا کی طرف) اچھا اس وقت تو ہم قائل ہو گئے اب کبھی اور موقع کیا نہ ملے گا۔ ایسی کہوں کہ یاد ہی کرو۔
بہار۔ تو یہ جھگڑا کیوں کرتی ہو ابھی تو باہر ہی بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آئیں گے۔ دیکھ لینا۔ اب تو تم یہاں رہنے کے لیے آئی ہی ہو، کیا آج ہی بھاگی جاتی ہو۔
نازک۔ تم تو کہا ہی چاہو۔ روبرو اور دو بدو باتیں کر چکی ہونا۔
شمس۔ کیا کیا۔ کیا بہار النساء بہن سامنے ہوئیں؟
روح۔ پھر کیا کچھ ہرج ہے آپ تو کہتی تھیں کہ بمبئی میں ہم ہوا کھایا کرتے ہیں۔ وہاں اس قدر پردہ نہیں ہے اور اب ایسی باتیں کرنے لگیں۔
حسن۔ ہاں اس میں ہرج ہی کیا ہے کیا کوئی غیر ہیں۔
شمس۔ اور آج ہی تو دولہا بن کر آئے ہیں۔ پھر دولہا کے سامنے ہونا تو شہر میں جائز ہے اور خصوصاً پہلے دن کچھ چھیڑ چھاڑ بھی ہوئی تھی یا نہیں۔
شمس النساء بیگم نے بڑی بیگم سے باصرار کہا کہ اماں جان ضرور بلوا لیجیے، اتفاق سے آنکھ لگ گئی اور ان سے شرارت کی ہم کو اطلاع نہ کی اور میری نیند ایسی ہلکی ہے کہ ذرا سی آہٹ ہوتی اور نیند اچاٹ۔ اگر ذرا قریب نام ہی لے دیتیں تو میں جاگ اٹھتی مگر سب نے ایکا کر لیا کہ اس کو نہ جگانا۔ بڑی بیگم نے مہری! ہر بھیجی کہ جا کر دریافت کراؤ کہ صاحب عالم کیا کرتے ہیں۔ مہری نے آکر عرض کیا حضور گنجیفہ کھیل رہے ہیں اور ورق ہوتا ہے وو دو پیسہ تیا بدا گیا ہے۔
شمس۔ تو بھلا گنجیفہ چھوڑ کر کیوں آنے لگے۔
روح۔ اب تو اس وقت نہیں جلدی کیا ہے اور تھوڑی دیر سہی۔
نازک۔ جب جانیں کہ اتنوں میں کوئی ان کے ساتھ گنجیفہ کھیلے۔
روح۔ سوائے تمہارے اور کون کھیل سکتا ہے بہن؟
نازک۔ مجھ سے گنجیفہ ہو تو دونوں ہاتھ سے لوٹ لوں۔
روح۔ وہ بھی کوئی کچے نہیں ہوں گے کہ کوئی ان سے لوٹ لے۔
نازک۔ اچھا پھر کوئی ان کو اس بات پر راضی کرے۔
گیتی۔ اس میں کسی کے کہنے سننے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم کو اس میں حجاب نہیں کہ نامحرم کے ساتھ گنجیفہ کھیلو تو ان کو کیا شرم ہے۔
حسن۔ اور ان سے کیا کچھ بعید بھی ہے ان سے کچھ بعید نہیں ہے۔
مہری۔ حضور باہر سب کہتے ہیں کہ جو باتیں شہزادوں میں ہونی چاہئیں وہ ان میں سب حاصل ہیں اور شکل و صورت تو شہزادوں کی سی ہے۔ بڑی بڑی دور کا سفر کر آئے ہیں۔
نازک۔ اے سپہر آرا تم اپنے میاں کا کچھ حال نہیں بتاتی ہو۔
سپہر۔ اے بہن پہلے تم بتاؤ تو پھر ہم بھی کچھ کہیں۔ تم بڑی ہو، بڑوں ہی کا تتبع چھوٹے بھی کرتے ہیں۔

روح ۔ تو کیا ان کو اس میں کچھ عذر بھی ہے؟
نازک ۔ جو پوچھو وہ بیان کریں ۔ اللہ جانتا ہے بہن اس وقت اتنا جی خوش ہوا ہے کہ بیان نہیں کر سکتی ہوں ۔ خدا جوڑی قائم رکھے ۔ اوہ سہرا آرا ہم کو تمہارا دل سے پیار ہے، گنجیفے میں بڑی دل لگی رہی ۔ نواب احتشام الدولہ اور نواب عظمت علیخاں ایک طرف صاحب عالم اور مرزا صاحب ایک طرف اور تیسرے میاں مذاق یہ صاحب بڑے باذاق آدمی تھے ۔ نقل محفل، ظریف طبع، بذلہ سنج، لطیفہ گو، جادو بیان، مرنجاں مرنج، پہلے دور میں سب نے پتے اٹھا لیے تو تقسیم کرنا میاں مذاق کے گلے پڑا اور اس سے ان کو نفرت کلی بہت ہی جھلائے ۔
مذاق ۔ (سر پیٹ کر) واللہ اوس پڑ گئی ۔ برا شگون ہے ۔ جو سب کے پہلے تقسیم کرتا ہے واللہ وہی ہارتا ہے یہ بندھی ٹکی چوٹیں ہیں ۔
مرزا ۔ یہ نئی بات سنی، مگر ہاں "القاسم محروم"۔
مذاق ۔ بندہ پرور ایک تصویر کی صورت دکھائی دے تو کچھ جرمانہ دوں ۔ میرے ہاتھ تو اس قابل ہیں کہ تراش ڈالے جائیں ۔
مرزا ۔ (احتشام الدولہ سے) تراشوں حضرت؟
احتشام الدولہ ۔ بسم اللہ ۔ سر عدد (لکیر کھینچ کر)
مرزا ۔ لیجیے چنگ کا دہلا تراشا ہے، نہ کہیے گا ۔
مذاق ۔ ارے! تو صاحب، چنگ ترشی اور خلال برسی ۔
احتشام ۔ ہمارے لیے تو اچھا شگون ہے (گنجیفے کا خالی خانہ میاں مذاق کی طرف کھسکا کر) حضرت کھلائیے ۔ میاں مذاق نے پہلے چار پتے دیئے تو شمشیر کا چوا، تاج کا دوا ۔ چنگ کا اٹھا اور برات کا دہلا ۔ بہت خوش ہوئے اور ان چاروں پہ پتے رکھ کر کہا، یہی ہوا ۔ ادھر بھی دوسرے پتے تقسیم کیے تو چنگ کا پنجا چھکا ۔ قماش کا چوا اور شمشیر کا اکا بہت ہی خوش ہوئے ۔
مذاق ۔ یہ ہاتھ چومنے کے قابل ہیں (ہاتھ چوم کر)
مرزا ۔ لاحول ولا قوۃ کیا رودے خدودے پتے دیئے ہیں ۔
مذاق ۔ قبلہ ۔ بندہ تو یوں ہی کھیلتا ہے چاروں میر چاروں وزیر ۔ اپنے پتے بیتے ہیں تو برات کا میر ۔
مرزا ۔ اُف پہلے ہی ہاتھ میر وزیر آ لیے گئے ۔ لاحول ولا ۔
احتشام ۔ بُری ہوئی ۔ اب کی صفایا ہوگا، انشاء اللہ ۔
مرزا ۔ انشاء اللہ ۔ آمین آمین ابکی تاج کی نادری مذاق نے ریتا کھول کر، شکر ہے خداوند شکر ہے تیرا ۔ برات کا میر اور چنگ کا میر ۔ ابکی بھر کچھ ہونا چاروں میر ریتا کھول کر برات کا اکا ۔ کچھ پرواہ نہیں ۔ ٹیپ اڑا دوں گا ۔ ادھر دونوں فریق کا رنگ فق اور میاں مذاق کی باچھیں کھلی ہوئیں ۔ چوتھا پتا لیا تو مرزا صاحب اور احتشام الدولہ بہادر اور عظمت علی خاں اور صاحب عالم اور کل حاضرین نے باواز بلند قہقہہ لگایا اور اچھل پڑے ۔ آفتاب، آفتاب بہتے ملائیے اور پھر سے بانٹیے ۔
مذاق ۔ واہ اس کی سند نہیں، پہلے سے شرط نہیں ہوئی تھی ۔
احتشام ۔ کیسی شرط، ہوش کی دوا کرو ۔ شرط لائے وہاں سے ۔
مذاق ۔ اجی حضرت اب ہم تو واللہ رو دیں گے اور پتے نہ دیں گے نہ دیں گے غضب خدا کا برات کا میر اور اتنا مع ٹیپ

زبردست کی اور چنگ کا میر۔ بھلا ہم کیوں کر پتے آپ کے حوالے کر دیں، کیا مجال۔

عظمت علی خاں ۔ اب پتے ملاتے ہو یا ردتے ہو رو ڈنہ۔

مذاق (سر پیٹ کر) دل رو رہا ہے چھ آفتاب اور چھ چنگ کے میر کے۔ اس میں ٹیپ اڑانا اور چھ برات کے میر اور اکتے کے سب ملا کے ہوئے چھ چھ بارہ اور چھ اٹھارہ تو نہیں ہو گئے جی اب فرمائیے ہیں کیونکر آپ کے حوالے کر دوں۔

الغرض بعد دقت گنجیفہ از سر نو تقسیم ہوا تو آفتاب پھر میاں مذاق ہی کے پاس آیا اور یہ اُچھل پڑے۔

مذاق ۔ وہ مارا۔ ع آفتاب آیا ہے سورج کنڈ ہیں۔

احتشام ۔ کیا چھچھڑے کھلا دیے ہیں۔ جب دیکھو تمھارے ہی پاس موجود رہتا ہے پالو کر لیا ہے آفتاب کو بھی ہے۔

مذاق ۔ حضرت آفتاب مذاق پسند ہے روشن دلوں کے پاس آفتاب جاتا ہے نہ کہ ایسے ویسوں کے پاس ؎

تیرہ دل کی بزم میں جام شراب آتا نہیں جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

مرزا ۔ تو سہی جو اسی کے سبب نحوست بازی بھر میں ہو۔

مذاق ۔ اب آپ پانی پی پی کے کوسیئے بندہ تو یوں ہی کھیلتا ہے۔

احتشام ۔ بھئی بازی ذرا نہیں آتی خم رکھو خم۔

مذاق ۔ تو سہی جو خم مڑ جائے ایک ورق عمدہ نہ نکلے۔

عظمت ۔ لائیے اب کی دست ہم لیں گے۔ چاروں میر، چاروں وزیر۔

مذاق ۔ دو لو پر کی بازی کے دوے اور دو دہلے نیچے کی بازی کے۔

عظمت ۔ ابھی پتے دکھاؤں تو دہل جائیں میاں مذاق۔

مذاق ۔ آپ بھی عجب تماش کے آدمی ہیں، مگر ہمارے سرتاج ہیں آپ۔

گنجیفہ تقسیم ہو چکا تو میاں مذاق نے کہا یارو تین خم رکھے ہیں اور دعوے کر کے کہتا ہوں کہ بارہ میر اور بارہ وزیر اس میں نکلیں گے ایک کم نہ ایک زیادہ۔ تینوں خم اعلیٰ سے اعلیٰ ہوں تو سہی۔

مرزا ۔ بارہ تو ورق اور چوبیس پتے۔ بہت ہی خاصے۔

احتشام ۔ جی ہاں بارہ میر اور بارہ وزیر، گھر کی ٹپکی باسی ساگ۔

مذاق ۔ میاں میرے ورق انڈے دیتے ہیں۔ اب بتائیے۔

عظمت ۔ بھلا ایک بات پوچھیں بتاؤ گے۔ یہ خم کس کے نام کے ہیں؟

مذاق ۔ حضرت یہ خم اس کے نام کا ہے جو (ایک ورق دیکھ کر) سبحان اللہ سبحان اللہ، تاج کا دولہا نکلا (دوسرا) پتا نہ بتاؤں گا (تیسرا ورق) سبحان اللہ ایک سے ایک بڑھ کر (چوتھا پتا) خیر نظر بد کے لیے۔ لو دیکھو تو شمشیر کا نہلا ہے۔

شہزادہ ۔ اللہ اللہ، شمشیر کا نہلا ایسا گیا گذرا کہ نظر بد کے واسطے ہے تو معلوم ہوتا ہے اور سب میر ہی میر ہیں۔

عظمت ۔ اجی گپ سنا کرو اور وہ میر ہوں چاہے وزیر ہوں سب سوخت ہوں گے۔ ٹیپ لیے بغیر نہ رہیں گے نہیں اور عقل سے کام لینا جانتے نہیں بس فراغت ہوئی ادھر ٹیپ کی اُدھر سوخت۔

مذاق ۔ چاہے جو کچھ ہو۔ ع ۔ بزن ٹیپے کہ کفرستان بلرزد۔

شہزادہ۔ زبردست زیردست سب کی ٹیپ بے سمجھے بوجھے جائز ہے۔
مذاق۔ جی خداوند، غلام کے ہاں سب جائز ہے۔

تاج ست زر سفید و شمشیر است و غلام
چنگ ست زرد سُرخ و برات ست قماش

مرزا۔ ابھی الف بے ہی پڑھتے ہیں آپ لا حول ولا قوۃ۔
عظمت۔ اور وہ خیر سے یاد نہیں۔ بار بار نوک زبان کرتے ہیں۔
مذاق۔ جی حضرت بسم اللہ آفتاب برآمد، ہمراہ غلام۔
عظمت۔ کیوں صاحب، ہم ایک پتا آفتاب سے اُٹھانا چاہتے ہیں۔
مذاق۔ بسم اللہ بسم اللہ، دو دو چہرہ شاہی حوالے کیجیے۔
عظمت۔ یہ السیٹھ ہے، یار ہم نہ مانیں گے۔
مذاق۔ وہ آپ نہ مانیں گے تو ہم سب مانیں گے۔ پتا نہیں اُٹھانے پائیے گا حضرت اور اگر اٹھائیے تو دو دو چہرۂ شاہی ادھر حوالہ کیجیے ورنہ اللہ اللہ خیر صلاح۔
عظمت۔ اجی دل لگی کرتا تھا کیسے پتے۔

کھیل شروع ہوا، پہلا دور۔ اب سُنیے کہ میاں مذاق خوش ہوئے کہ آفتاب کے پتے لے کر ترپ سے سر کر دیا۔

مذاق۔ قماش کا سر چوپے سے آیا ہوں ٹیپ نہ دوں گا۔
مرزا۔ (میرے ٹیپ کر) لیجیے خداوند لیجیے۔ بسم اللہ۔
مذاق۔ کھیل چکے بھئی کیا سوچ رہے ہو۔ اللہ ری سستی۔
مرزا۔ (تاج کا سر کر کے) حضرت آپ کے ٹکلو سب سوخت ہو گئے (قہقہہ لگا کر صاحب عالم کی طرف) ہاتھ لائیے گا۔ دو سو ٹکلو سوخت کر دیے۔ یوں گنجفہ کھیلتے ہیں۔
مذاق۔ (دانتوں تلے انگلی دبا کر) ارے!
عظمت۔ ہم نے تو کہا ہی تھا بھائی کہ وہ ان کے پاس اگر گنجیفہ بھر چلا جائے تو ان کے بنائے کیا بنایا جائے گا، خاک وہی ڈھاک کے تین پات۔
احتشام۔ بہت اُچھل کود مچائی تھی، اب بولو بات تیرے کی۔
مذاق۔ اُف، مار ڈالا ظالم، بالکل مر ہی مٹے واللہ۔
مرزا۔ دو سو ٹکلو سوخت ہوئے، لائیے خرچ میں۔
احتشام۔ کاہے کو ٹکلو تھے بھئی چنگ کے ہو گئے۔
مذاق۔ دیکھیے چنگ کا میر، گھوڑیا، اِکّا، دوا، تیا، چوا، پنجا۔ یہ تو ایک بازی کے ہیں اب اور لیجیے برات کا میر، گھوڑیا، اِکّا، دوا، گیارہ ٹکلو سوخت ہو گئے۔
مرزا۔ گیارہ کاہے کو نو سوخت۔

مذاق۔ خدا ان لوگوں کے گنجیفے سے سمجھے جنھوں نے کوس کوس کے یکلو سوختہ کیے۔ واللہ کمال رنج ہوا۔ مگر خیر دیکھو تو سہی۔
عظمت۔ اور ہم اشارے سے کہتے جاتے تھے کہ چنگ اُدھر ندارد ہے اِکّا، دوا کچھ دے دو، نہ مانا اب بھگتو ؎

آنچہ دانا کند کند ناداں　　لیک بعد از خرابیٔ بسیار

اتنا سا فرق ہے۔
احتشام۔ میں تو ایسا ہی گنجفہ کھیلتا ہوں۔ اس میں چاہے کوئی کھیلے چاہے نہ کھیلے۔
عظمت۔ جی ہاں بات بات پر یہی فقرہ تھا۔
مرزا۔ ایسی ترکیب کیجیے کہ ان کو تکو بھی نہ پہنچے۔

پہلی بانٹ میں میاں مذاق نے چھ پتے پائے مگر ایک نادری چڑھی اور ایک چور چل گیا، اس سبب سے پورے تینوں ورق ہاتھ سے گئے اور چونسٹھ روپے جیب سے نکالنے پڑے۔ اس وقت میاں مذاق نے بڑا مذاق کیا، آدمی بڑے متمول اور سیر چشم تھے مگر دل لگی باز اور ظراف چونسٹھ روپے جوگرہ سے گئے تو گنجیفے کو اُٹھا اُٹھا کر ٹپک ٹپک مارا۔
احتشام۔ حضرت ہم تو ایسا گنجیفہ کھیلتے ہیں چاہے کوئی کھیلے چاہے نہ کھیلے، ہم تو ایسا گنجیفہ کھیلتے ہیں، شرماؤ شرماؤ اب۔
مرزا۔ اور اتنا بھونڈا اچکا کھا گئے، سُرخ کا اِکّا نہ روکا گیا۔
عظمت۔ اجی یہ نہیں کہتے کہ بدے ہوئے گنجیفہ میں نادری کیسی۔
مذاق۔ ایں! اُف اُف، واللہ دونوں نے مل کر لُوٹ لیا مجھ سیدھے سادھے آدمی کو اوفوہ!
شہزادہ۔ یکلو کے یکلو سوختہ ہوئے اور نونو اور ورق میں نادری چڑھی اور سُرخ کا اِکّا نہ روکا گیا۔
عظمت۔ اور ابھی طرار بنے تھے کہ میں تو چھیانوے پتے پورے یاد رکھتا ہوں کیا مجال کہ ذرا بھول جاؤں۔
احتشام۔ کیا غل مچایا تھا ایک، دو تین بوجھ کو لاچیں۔
مذاق۔ حضرت اچھا ہوا بدا ہوا گنجیفہ نہ تھا۔
احتشام۔ ردو، ردو۔ بس اتنے ہی ہیں۔
رفیق۔ حضور میں اس وقت سے بیٹھا دیکھ رہا ہوں کہ دو چار سو بے ضابطگیاں اس گنجفے میں ہوئیں اور کوئی پوچھتا نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔
مذاق۔ مجھ سے کوئی لے گا کیا ہیں اور دوں۔

اتنے میں ایک بوڑھے رئیس جو بڑے شوقین اور گنجیفہ کے چوسر میں برق تھے آئے، عظمت علی خاں اور احتشام الدولہ اور صاحب عالم نے ان کو حکم بدا اور میاں مذاق اور مرزا صاحب نے بھی منظور کیا۔
احتشام۔ قبلہ و کعبہ بدا ہوا گنجیفہ ہے ورق ہو رہے تھے۔
عظمت۔ ان کے پاس چھ پتے آئے، سُرخ کا اِکّا اتنا بڑا نامی اور ہادی چھد ان سے نہ روکا گیا اور پتا چل گیا اور ایک نادری چڑھی تو چھ کے چھ رنو چکر ہو گئے۔
مذاق۔ اور میں نے اُسی وقت کہا کہ بدے ہوئے گنجفے میں نادری کیسی اگر سب کے سب مل گئے اور میرا گلا کاٹا اور مجھ سے پتے چھین لیے۔
رئیس۔ غلط کارروائی ہوئی۔ ورق میں نادری کیسی۔

مذاق۔ بندگی عرض ہے، آداب نواب صاحب، سُنیے۔
عظمت۔ تم نے اس وقت کیوں نہ منع کیا جی، مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خود باید زد، پہلے تو خاموش ہو رہے۔
احتشام۔ اور تو ٹکیو سوخت ہوئے، قماش کے چھ اور برات کے تین۔ یہ کھیلیں گے کیا!
رئیس۔ (مذاق سے) کیوں صاحب صحیح ہے یہ؟
مذاق۔ جی ہاں مگر بدا ہُوا تھوڑا ہی تھا، تینوں میں ایک سوا اور ٹکیو سوخت ہی نہیں ہو سکتے یہ لیے مرتے ہیں۔
رئیس۔ ہاں بدا ہُوا نہیں ہوگا، سچ کہا۔
عظمت۔ کیا! قبلہ واللہ بدا ہوا تھا، اس میں فرق نہیں۔
رئیس۔ ہم کو نہیں یقین آتا۔ اگر بدا ہوا ہوتا تو نادری سوار کیسی اور ٹکیو سب کے سب کیونکر سوخت ہو گئے۔
عظمت۔ یہ چکما کھا گئے تو ان سے ورق لیے جائیں یا نہیں۔
مذاق۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو، خدا کے غضب سے ڈرو۔
رئیس۔ ایسا چکما کوئی نہیں کھا سکتا، کوئی گنوار مقرر کیا ہے۔
شہزادہ۔ تو یہ ہونسٹھ روپے کی رقم گئی داخل سمجھیں۔
رئیس۔ کیا دو دو روپیہ بتا تھا اور اوّل تو ہماری سمجھ میں ایسا آتا ہے کہ آپ دونوں مل گئے تھے۔
مذاق۔ سبحان اللہ، حضور بس کیا بات کہی، میرے دل کی یا دونوں میں اشارہ ہونے جاتے تھے اور باتیں بھی ہوتی تھیں۔ ان کو یہ دریافت کرنا تھا کہ سُرخ کا ذریہ کدھر ہے تو پوچھتے ہیں کہو بھئی سُرخ رُو ہو، وہ بولے آج کل کے روسیاہ اپنا منہ رنگا کرتے ہیں۔
رئیس۔ اس کا نام گنجیفہ نہیں ہے ہم تو کھانا نہ دیں گے۔
مذاق۔ اور میں دوں گا، اس کا نام گنگفہ ہے۔
شہزادہ۔ لیجیے حضرت تڑکا ہو گیا۔ مفت میں ہاتھ تھکائے اور ہاتھ کچھ نہ آیا، اچھا صاحب نصفی پر معاملہ کیجیے، بلا سے۔
عظمت۔ منظور کچھ تو ہاتھ گرمائیں کیوں صاحب!
مرزا۔ اچھا جب آپ سب کو منظور ہے تو ہمیں کیا عذر ہے۔
احتشام۔ مگر نقداً حرمتاً۔ نقدی ملے نقدی۔
رئیس۔ بس اب تو ہمیں پورا یقین ہو گیا کہ لُش ہے۔
مذاق۔ قبلہ و کعبہ، یہ سب کے سب الیٹیے ہیں۔
رئیس۔ تمہارے نام ڈگری دے دی لو فتح ہے۔
عظمت۔ واہ ہم اپیل کریں گے۔ آپ ان دونوں سے رشوت کھا گئے۔
رئیس۔ (ہنس کر) معقول اب کہیں ہم جرمانہ نہ کر دیں۔
مذاق۔ اس طرح کے الیٹیے تو خداوند کہیں نہ ہوں گے۔
رئیس۔ کیا نصفی پر راضی ہو گئے تھے جلدی سے۔
مذاق۔ جی ہاں یہ تو چارم پر راضی ہو جاتے۔

عظمت۔ اچھی ڈگری دی۔ ڈگری کے بھروسے نہ بھولیے گا، چونسٹھ روپے گن دیجیے، ابھی ابھی۔
رئیس۔ ایں! ابھی ابھی تو نصفی پر راضی تھے۔
مذاق۔ جی ہاں اس قماش کے لوگ ہیں خدا کے واسطے ذرا تو شرماؤ۔ نام سُنیے نواب عظمت علی خاں بہادر، نواب احتشام الدولہ بہادر ماشاءاللہ اور فعل یہ کہ کملی ڈال کے لوٹ لیں۔
گنجفہ ختم ہونے کے بعد بڑی دیر تک دل لگی اور ٹھائیں ٹھائیں رہی۔ بعد ازاں صاحب عالم شہزادہ عالی مرتبت دارا اور بان فریدوں حشم زنانخانے میں تشریف لے گئے۔ شمس النسا بیگم نے چق سے بغور دیکھا۔ کہا بہن نہایت خوبصورت آدمی ہیں ماشاءاللہ چشم بد دور۔
نازک۔ بھلا کیوں شمس النسا بہن تم ان کے ساتھ شادی کر لو تو کیسا، بُرا نہ ماننا، کیا ہرج ہی کیا ہے۔
شمس۔ بڑی بے شرم اور بے حیا ہو، تم تو خدا جانے کس کی صحبت میں رہی ہو بھلا یہ کیا باتیں کرتی ہو؟
نازک۔ صورت شکل اچھی۔ ہاتھ پاؤں اچھے خوبصورت۔

الٰہی نار ہے گلزار خلد باغ جناں — چمن میں پھرتی رہے جب تلک نسیم بہار
بگوش دل سنیں جب تک سخن کو صاحب فہم — صدف میں قطرۂ نیساں ہوتا دُر شہوار!
رباب چنگ و دف و نے ہوں تا کہ بزم سخن — پیالہ اور صراحی ہوئے ہو اور مے خوار
نسیم عیش سے خنداں ہو دوست گل کی روش — چمن میں عمر کی ان کے رہے ہمیشہ بہار

یہ ہیں نے ان کو دعا دی ہے صاحب عالم

شہزادہ۔ جی حضور ارشاد، نازک ادا بیگم ہیں۔
روح۔ ان کا نام تو میں دیکھتی ہوں زبان زدِ خاص و عام ہو گیا ہے اور اس بے تکلفی سے پکارتے ہیں کہ گویا برسوں کی جان پہچان ہے۔
نازک۔ صاحب عالم اِس وقت کچھ گاؤ، ورنہ جانتے ہو سسرال میں بیٹھے ہو اور سالیاں سب شوخ اور بہت چھٹ ہیں۔
بہار۔ بہت چھٹ، کیا مار پیٹ کی نوبت آئے گی؟
شکورن (بہار النسا کے کان میں) یہ تو بہن بڑی ڈھیٹ ہے۔
بہار۔ اے ہے از برائے خدا چپ رہو بہن۔ ان کو نہ چھیڑنا بہن یہ پھر کسی کی ماں نہیں ہیں۔ اتنی میں ایک تو ان سے مقابلہ کر نہیں سکتی تم بے چاری کس میں ہو بھلا؟
شکورن۔ ہم تو بھی مارے بولان ہیں اے ہاں۔
نازک۔ بے زبانوں کو بھی ہمارے لیے زبان آنے گی۔

کاٹنے دوڑتی ہے ماہیٔ بے آب مجھے

صاحب عالم کو ان کی مذاق انگیز باتیں اور لب و لہجہ اس قدر پسند آیا کہ کمال محظوظ ہوئے۔
اتنے میں پیاری چھوکری خاصدان میں پان لے کر حاضر ہوئی اور ایک مہری حقہ بھر کر لائی۔ صاحب عالم پان کھاتے ہیں تو کتھا ہی کتھا اور ایک بنا ہُوا تمبا کو جس سے ان کو قطعی نفرت۔ فوراً پان پھینک دیے اور مُنہ دھو کر ٹھنڈا پانی پیا۔ حقہ پیا تو منہ میں ریت ہی ریت بھر گئی۔
شہزادہ۔ بہت خوب، پان میں چونے کے عوض کتھا اور الائچی اور مصالحہ کے عوض تمباکو ملا، حقہ میں ریت اس گھر کی یہی ریت ہو

کیا مضائقہ ۔ ہم بھی کسی کو ایسے ہی پان کھلوائیں گے، تو جس نے لڑکپن میں کھایا ہو اس کے استعمال میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

نازک ۔ اس بھروسے نہ بھولنا، ہماری بہن بڑی نازک مزاج اور دماغ دار ہیں، تم بیچارے کیا ہو؟

شہزادہ ۔ اس کا بدلہ تو ہم ضرور لیں گے ابھی سے کہہ دیا ہے۔

حسن (مسکرا کر) اسے تو کس سے بدلہ لو گے صاحب؟

شہزادہ ۔ جس پر بس چلے ۔ قسم خدا کی مارے ریت کے منہ کا عجب حال ہو گیا ہے لا حول ولا قوۃ۔

الغرض ایک شب و روز لطف اور ہنسی خوشی کے ساتھ بسر کر کے صاحب عالم مع سپہر آرا کے اپنے گھر گئے اور گھر جو ہمایوں فر کے قتل کے سبب سے ماتم کدہ بن گیا تھا پھر اپنی اصلی شادمانی و کامرانی پر آ گیا ۔ صاحب عالم سسرال والوں سے واقف ہوئے یہاں سب سے ملاقات ہو گئی۔ مرزا صاحب سے ملے ، بڑی بیگم کے اعزہ نے ان کو دیکھا اور دونوں جگہ بدستور چہل پہل اور خوشی ہونے لگی۔

میاں آزاد داخلِ شہرِ معشوقہ پریزاد ہوئے

آزاد فرخ نہاد مع ان دونوں مہوشان پریزاد کے اس شہر مینو سواد رشک بہشت شداد میں شام کے وقت داخل ہوئے، جہاں شاہد نازک بدن سیم تن گلگوں قبا حسن آرا بیگم کا پری خانہ عشرت کا شانہ تھا۔ معشوقہ شگفتہ رو کلیرسا اور نازنین ماہ طلعت مشکیں بوس میڈا کو لے کر ہوٹل میں فروکش ہوئے۔

بات بات پر آزاد کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ مسرت دل کی کیفیت کے اظہار میں زبان قلم لال ہے۔ نشاط و انبساط کی گرمی بازار کا بیان محال ہے۔ دماغ کنگرۂ عرش پر تھا۔ اللہ اللہ آج خدا نے وہ دن دکھلایا کہ بعد قطع منازل منزل مقصود پر پہنچے۔ ہند سے اقصائے روس اور مرزبوم روم سے مع الخیر ہندوستان واپس آئے۔ مدت کے بعد جناب باری نے شاہد آرزو کی صورت دکھائی اور منہ مانگی مراد پائی۔ کہاں روم کہاں ہندوستان، کہاں رن کی زمین اور جنگ کا میدان، کہاں حسن آرا کا صنم خانہ تازہ کن مشام جان، سر بکش روح رواں اور ان بتانِ سیمیں ساق یگانۂ آفاق کی میٹھی میٹھی باتیں اور دلربائی کی خداداد گھاتیں سمند طرب پر مہمیز کا کام کرتی تھیں دونوں سیماب طبع خاتونیں ان کی سچی محبت کا دم بھرتی تھیں۔

کلیرسا کے گیسوئے غالیہ بار سے نسرین و نسترن کی خوشبو آتی تھی تو میڈا کی زلف عنبر بیز سوری دشمن کو شرماتی تھی۔ یہ سرمست خوبی محو ناز، وہ نرگسی چشم سراپا انداز یہ گل رخ سیمبر وہ غنچہ دہن حور پیکر ؎

خونیں نگہاں کرشمہ کوشاں ہم خنجر و ہم نمک فروشاں
دل دوز پری وشاں سرمست در کاوش سینہ ہا سبک دست

ان دونوں نے وفور بہجت سے آزاد کو چھیڑنا شروع کیا۔

کلیرسا۔ آج بھلا آزاد پاشا کے دماغ کاہے کو ملیں گے۔ آج تو فلک افلاک پر دماغ ہوں گے اور کیوں نہ ہو ایک بت چینی ناآفرین بلائے جان عاشق حزین سے ہم آغوش ہونے کی امید ہے۔

میڈا۔ دیکھتی نہیں ہو بہن کیسی باچھیں کھلی جاتی ہیں بات کی نہیں اور باچھیں کھل گئیں۔ اور بات بھی ایسی ہی ہے۔ ایسا یوسف لقا گلگوں قبا جوان رعنا کبھی ایسی نیٹنی کو پیار نہ کرے گا۔ جو دوشیزہ عربدہ جو کروڑ در کروڑ میں انتخاب ہو اور جس کا حسن لاجواب ہو اس کا چاہنے والا بھی ایسا ہی شیر مرد جوان خوبرو ہونا چاہیئے۔ حسن آرا کے حسن گلوسوز و نور عالم افروز کی عمدہ تعریف یہ ہے کہ ان سے صنم فریب نوجوان ان پر اس قدر ریجھے کہ جان بکف معرکۂ دار و گیر میں گئے۔

کلیرسا۔ اس میں تو شک نہیں بہن کروروں میں فرد ہو گی ؎

از باغ رخش بہار خارے ہر برگ گلشن چمن نثارے
بتخانۂ ہند چشم مستش ہندی صنماں صنم پرستش!

میڈا۔ اس وقت مارے خوشی کے بات کرنا بھی ان کو دو بھر ہے۔ پس یہی جی چاہتا ہو گا کہ اسی دم اس پری چہرہ کو زیب آغوش

کریں اور یہ شوق و انتظار اور بھی ستم ڈھاتا ہے اور آتش عشق کو بھڑکاتا ہے ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک　　آتش شوق تیز تر گردد

آزاد۔ عجب مخمصے میں جان ہے۔ آخر یہ کیوں معلوم ہوا کہ اس وقت کمال مسرت ہے؟ بولوں تو ہنسا جاؤں نہ بولوں تو آوازے کسے جائیں۔

کلیرسا۔ آپ کہئیے گا کیا اس میں کچھ جھوٹ بھی ہے کہ آج جو خوشی تمھیں ہے دنیا میں کسی کو کم ہوگی، جس معشوق کی خاطر سے خدائی بھر کی خاک چھانی، اتنی سختیاں جھیلیں۔ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر ہنگامہ رستخیز میں گئے۔ آگ میں پھاند پڑے اب اس کے وصل کے مزے لوٹنے کا وقت آیا۔

میڈا۔ ہم تو ان کے حسن روز افزوں کے تب اور بھی قائل ہو گئے جب پولینڈ کی گلرخسار شہزادی نے ان سے بلجاجت و سماجت شادی کی درخواست کی اور طرہ یہ کہ اپنے زعم میں نکاح پڑھوا لیا۔ مگر انھوں نے وہاں عرصے تک قیام نہ کیا۔ ایفائے وعدہ کا خیال ہو تو اتنا ہو۔

آزاد۔ قول مرداں جان دارد، وہ انسان کیا جس کو اپنے قول کا خیال نہ ہو اور آزادوں کو سب سے زیادہ ایفائے وعدہ کا خیال رہتا ہے۔ دنیا میں ان کے نزدیک اس سے زیادہ پابندی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ کسی شاعر نے آزادوں کی تعریف میں کہا ہے ؎

ہم آزادوں کے دل کو شوق آسائش پسندی ہو
وہاں کچھ دیر تک ٹھہرے جہاں ٹھنڈی ہوا پائی

مگر ہماری آزادی اس کی مقتضی نہیں کہ آرام اور آسایش پسند ہوں، یوں تو ہر ایک شخص آزاد بن کر کاہلی کا پتلا ہو سکتا ہے، مل گیا تو کھا لیا نہ ملا تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں، مگر اس وقت مس میڈا کی باتوں نے ہمارا مزہ کرکرا کر دیا۔

میڈا۔ اے ہے وہ کون سی باتیں ہیں بہن جن سے ان کا مزہ کرکرا ہو گیا ہم تو سنیں، ابھی کیا ہے ابھی دیکھیے کیسے کیسے رنگ بدلتے ہیں۔

آزاد۔ آپ ہی ظلم کرو اور آپ ہی شکایت کرو، امید دے کے مایوس کرنا کیا معنی؟ یا تو امید ہی نہ دی ہوتی یا اب جو کہا ہے پورا کرو اور خدا گواہ ہے کہ تمھارا خیال محض غلط ہے اور بالکل خلافِ اصلیت، تم خود ہی انصاف کرو کہ جس شخص کو یہ امید ہو کہ تمھاری سی خاتون جاہ و جمال ہاتھ آئے گی اس سے بے اعتنائی کی باتیں کرو تو اس کے دل کا کیا حال ہوگا، اس نزاکت و طلعت اور اس قد و قامت نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے ؎

تیرے قدموں پہ کیوں نہ قیس گرے　　نقش پا رشک روئے لیلےٰ ہے
آنکھیں نرگس ہیں رخ ہے گل قد سرو　　تو تو اے گل چمن سرا پا ہے

میڈا۔ اب ان باتوں کو جانے دو اِن سے بجز رنج کے اور کیا فائدہ حاصل ہوگا، خاک! تم دل میں سوچو تو کہ ابھی کل کی بات ہے ہمارے منانے پہ تم روٹھے جاتے تھے، تبدبھگتی مگر شادی کا اقرار نہ کیا نہ کیا اور تمھاری رائے بہت صحیح تھی جب حسن آرا سے اقرار کر کے آئے تو مجھ پہ یا آشنائے راہ میں کسی اور محبوب سے دل لگانا ان کے دل کو دکھانا ہے اور ان کو دیدہ دانستہ رنج پہنچانا۔ آزاد مگر ہم تو بتان ہندی ہی کو ظالم اور جفا جو سمجھتے تھے تم ان سے بھی بڑھ گئیں۔

اتنی تو جفائیں کر نہ او بُت　　آخر میں بندۂ خدا ہوں

ہم تو سمجھے تھے کہ تم دلدار ہو، تمھارے سبب سے زندگی لطف کے ساتھ بسر ہو گی مگر تم تو ظالم اور سفاک نکلیں جس سے امید کرم ہو وہی برسر عتاب ہے ؎

ان ہونٹوں نے آہ ہم کو مارا
کہتا ہے مسیح جن کو جاں بخش

کلیرسا۔ کیوں آزاد پاشا اس ملک میں بھی عورتیں بمبئی کی طرح پردہ کرتی ہیں یا باہر نکل سکتی ہیں؟

آزاد۔ اے توبہ، یہاں بھی پردے کی رسم ہے، حسن آرا بیگم لڑکپن میں دکھن کی طرف رہی تھیں، ان کے ہاں پردے کا خیال کم تھا مگر اب وہاں بھی یہاں ہی کی سی کیفیت ہے، ہر ملکے و ہر رسمے۔

یہ باتیں ہوتی تھیں کہ ہوٹل کے ایک ملازم نے آزاد پاشا کو ایک کارڈ دیا، جس پر رابرٹ بلیٹس کا نام چھپا ہوا تھا۔ آزاد کمرے کے باہر آئے تو دیکھا ایک جوان لیڈی اور ایک نوعمر جنٹلمین ٹہل رہے ہیں۔ جنٹلمین نے فوراً مصافحہ کیا اور میم صاحب نے بھی بڑھ کر ہاتھ ملایا، اور آزاد ان دونوں کو لے کر کمرے میں آئے تو مس کلیرسا اور مس میڈا سے بھی مصافحہ کیا۔ جنٹلمین کرسی پر بیٹھتے ہی یوں ہمکلام ہوئے:۔

جنٹلمین۔ (آزاد کی طرف مخاطب ہو کر) آپ آزاد پاشا ہیں (اور کلیرسا کی طرف اشارہ کر کے) یہ لیڈی پولینڈ کی نہیں جو کہ مس کلیرسا ہیں اور (میڈا کی طرف خطاب کر کے) آپ مس میڈا ہیں، کوہ قاف کی رہنے والی۔

راوی۔ یہ سب دنگ کہ یا خدا اس اجنبی آدمی کو جس کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا یہ کیونکر معلوم ہو گیا اور اس نے ہم سب کا نام کس طرح بتا دیا؟

آزاد۔ بیشک آپ کی رائے صحیح ہے مگر میں متحیر ہوا کہ آپ کو اس کا علم کیونکر ہوا مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی پیشتر آپ سے ملاقات ہوئی ہو اور یہ دونوں لیڈیاں تو کبھی اس ملک میں آئی بھی نہیں، پھر آپ نے صحت کے ساتھ کیونکر نام بتا دیئے۔

جنٹلمین۔ مسٹر آزاد، تم وہ آدمی نہیں ہو کہ کوئی تربیت یافتہ تم کو دور سے دیکھے اور پہچان نہ لے کہ یہ وہی سپہ سالار ہے جس نے روم اور روس کی جنگ میں کارنمایاں کیے اور مورچے پر غنیم کے چھکے چھوڑا دیئے تھے۔ مس کلیرسا کے نام سے کون واقف نہیں ہے جنھوں نے تم سے خانہ جنگی کی تھی، گو میدان کارزار میں تمھارے ان کے تلوار چلی مگر وہ ایک قسم کی خانہ جنگی ہی تھی اور مس میڈا کو کون نہیں جانتا وہ کون پڑھا لکھا آدمی ہے جس نے آزاد کی تصویر مختلف اخباروں میں نہیں دیکھی ہو کوئی آدمی ایسا نہیں جو آزاد کو نہ جانتا ہو، جنگ کے دنوں میں دن رات آزاد ہی کا نام ورد زبان تھا۔ ہندو، مسلمان، یورپین سب دست بدعا تھے کہ آزاد پاشا کامیاب و سرخرو ہوں۔ مس کلیرسا اور میڈا کی نسبت خبر گرم تھی کہ آزاد پاشا کے ہمراہ آتی ہیں اور میں نے یہاں دو ہی لیڈیاں دیکھیں، مس کلیرسا کی صورت اور وضع اور قطع سے سمجھ گیا کہ روس کی لیڈی جنھوں نے اس جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا تھا یہی ہوں گی اور مس میڈا کے شمائل اور وضع سے بخوبی یقین ہو گیا کہ یہ کوہ قاف کی رہنے والی ہیں اور مس میڈا نہیں کا نام ہے (اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے) ان کو بھی کمال اشتیاق تھا کہ آزاد پاشا اور ان دونوں مسوں کو دیکھیں۔

میم۔ اور آپ اس امر کے سننے سے خوش ہوں گے کہ میں حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا بیگم سے خوب واقف ہوں اور ان کے ہاں میری آمد و رفت بھی ہے۔

آزاد۔ (نہایت خوش ہو کر) ہاں مجھے اس وقت بیشک کمال مسرت ہوئی آپ نے دیکھا ہو گا کہ حسن آرا کیسی تیز طبیعت اور شائستہ نواب زادی ہیں اس ملک میں شاید ہی کوئی ہو میں واقعی اس وقت بہت محظوظ ہوں کہ آپ سے ان سے جان پہچان اور ربط ضبط ہے۔

میم۔ مسٹر آزاد پاشا، ہم ٹھیک کہتے ہیں کہ ہم نے یہاں کی بیگموں میں ایسی پڑھی لکھی فہمیدہ اور سنجیدہ کوئی نہیں دیکھی اور اکثر امور میں ان کی باتیں اور بیگموں کی باتوں سے مختلف ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ بہن تم بڑی خوش نصیب ہو کہ آزاد سے تمہارا عقد ہونے والا ہے اور وہ خود اس رائے سے اتفاق کرتی اور اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتی ہیں۔

آزاد۔ آپ کی قدر دانی اور ان کی مہربانی ہے۔

میم۔ کل اخبار جو ہم کو مل سکے ہم نے ان کو سنائے اور روز آپ کا ذکر رہتا ہے اور اُن کا گھر بھر آپ سے خوش اور آپ کا منتظر ہے۔

میم صاحب نے تھوڑی دیر گفتگو کر کے میڈا سے کہا ہم نے سنا تھا کہ حسن آرا کے ساتھ نکاح ہو کر پھر آزاد پاشا کی اور آپ کی بھی شادی ہوگی۔

میڈا۔ (شرما کر) جی نہیں (گردن نیوہڑا کر) غلط ہے۔

میم۔ ہم نے کئی اخباروں میں پڑھا اور گرافک اخبار لندن میں آپ کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ ہم نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ مس میڈا ہیں۔

جنٹلمین۔ ان سب کی تصویریں نظروں کے روبرو تھیں۔

آزاد۔ جی ہاں، میں تو اس قابل نہیں ہوں مگر۔

میم۔ اور آپ بیشک اس قابل ہیں کہ شعرا آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہوں اور نثار آپ کی تعریف کے پل باندھ دیں۔

آزاد۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا اور جو شخص اپنا فرض ادا کرتا ہے وہ تعریف کا چنداں مستحق نہیں۔ کیونکہ یہ تو اس کا فرض ہی تھا اس نے کر دیا۔

جنٹلمین۔ بھائی صاحب فیصدی ایسے کتنے آدمی ہیں۔ جو فرض ادا کرنے کو سعادت سمجھتے اور فرض واجب ادا کرتے ہیں۔

میم۔ جو شخص اپنا فرض ادا کرے وہ بیشک بڑی تعریف کا مستحق ہے۔ آپ نے وہ کارنمایاں کیا کہ تاریخ میں عزت کے ساتھ یاد رہے گا اور مؤرخ مدت العمر آپ کا نام اعزاز کے ساتھ زبان پر لائیں گے۔

کلیرسا۔ آپ روم و روس کی جنگ کے وقت کہاں تھیں؟

میم۔ ہم دونوں اُسی ملک میں تھے اور آزاد پاشا کے حالات بہت غور سے پڑھا کرتے تھے۔

حسن آرا کے یہاں اکثر جاتی ہوں اور جب جاتی۔ تب آزاد کا ذکر خیر ضرور رہتا ہے۔ جس دن حسن آرا کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ آزاد پاشا ایک جزیرے میں گرفتار ہو گئے تھے اور بڑی جرأت اور دقت کا م کے بعد وہاں سے چلے تو دریا کی طغیانی اور برق و باراں وغیرہ آفات آسمانی نے ان کو سخت پریشان کر دیا تو رونے لگیں اور گو میں نے بہت سمجھایا مگر اُن کے دل کا عجب حال تھا۔

آزاد۔ خدا نے وہ سب مصیبتیں دور کر دیں

غم مخور حافظ بہ سختی روز و شب　　　عاقبت روزے بیابی کام را

اس شعر نے ہم کو ڈھارس دی اور آخر الامر خدا نے یہ دن دکھایا کہ یہاں تک عزت اور نام اور خیریت کے ساتھ پہنچ گئے آئندہ جو کچھ ہو۔

میم۔ ہیں کل صبح ضرور حسن آرا بیگم سے ملوں گی۔

آزاد۔ ضرور بالضرور ملیے اور کہیے کہ آپ کا جاں نثار اب شہر رشک فرخار میں مع الخیر داخل ہوا ہے، خوشی کے شادیانے بجائیے۔

میم - بیشک کہوں گی، سنتے ہی فرط طرب سے آنسو جاری ہو جائیں گے۔ اُن کو آپ سے عشق صادق ہے، دل و جان سے آپ پر نثار ہیں۔

آزاد - اس میں کیا شک بھی ہو سکتا ہے، اور یہ محبت طرفین سے ہے، جس قدر ہم کو ان سے عشق ہے اسی قدر ان کو ہم سے عشق ہے۔

جنٹلمین - ہم جانتے ہیں انھیں اسی وقت اطلاع دینی چاہیئے۔

آزاد پاشا نے اپنے دل میں خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اس میم سے ملاقات ہوئی اور چونکہ ان کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ حسن آرا سے اُن سے تپاک ہے لہذا اور بھی مسرور تھے، خصوصاً اس خیال نے ان کے دل کو کمال فرحت بخشی تھی کہ یہ میم صاحب آزاد کی کارروائیاں اور جرأت کے کارناموں سے بخوبی واقف تھیں اور آزاد کو اچھا سمجھتی تھیں۔

کلیرسا - آپ نے فرانسیسی زبان کیوں کر سیکھی؟

میم - میں فرانس ہی میں پیدا ہوئی اور وہاں ہی میں نے تعلیم پائی۔ چودہ سال کے سن تک میں فرانس ہی میں رہی۔ پھر دو برس اس ملک میں رہی، پھر ایک سال کے لیے انگلستان گئی مگر علالت کی وجہ سے چار سال تک قیام رہا، پھر ایک سال فرانس میں رہی۔

کلیرسا - جب ہی آپ اس قدر صاف فرانسیسی بول لیتی ہیں۔

میڈا - ہم لوگوں نے تعلیم پائی تھی، مگر خاص فرانس میں نہیں۔

کلیرسا - ہاں اور کیا صرف اسی لیے یہ زبان سیکھی کہ تعلیم خام نہ رہ جائے اور آپ تو خاص فرانس ہی میں رہی تھیں۔

آزاد - (جنٹلمین سے) آپ نے تو انگلستان میں یہ زبان حاصل کی ہو گی؟

جنٹلمین - جی ہاں۔ مگر میں بھی کئی سال تک فرانس میں رہا ہوں۔

میم - (کلیرسا) آپ روسی زبان میں کچھ گائیے تو ہم کو لطف حاصل ہو۔

جنٹلمین - بہت فرق نہیں ہے، کچھ یونہی سا فرق ہے۔

کلیرسا - ہم نے انگلستان کی کئی لیڈیوں اور جنٹلمینوں کی زبانی سنا ہے بیشک کم فرق ہے۔

اتنے میں میاں آزاد نے دونوں مہمانوں سے کہا کہ اگر مضائقہ نہ ہو تو اس وقت ہمارے ہی ساتھ ماحضر تناول فرمائیے۔

میم - خوشی سے ہم کو ذرا عذر نہیں ہے۔

صاحب - ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ اس وقت آزاد پاشا اور مس کلیرسا اور مس میڈا کے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔

آزاد - یہی ہم کو بھی کہنا چاہیے۔ مضمون واحد ہے۔

میم - ہم سچ کہتے ہیں آزاد پاشا واقعی ہم کو اس شرکت سے بڑی مسرت حاصل ہو گی کیونکہ برسوں سے آپ کا نام سنتے آئے ہیں۔

کلیرسا - ہم آپ کی تندرستی کا جام شامپین پئیں گے۔

میم - (بہت خوش ہو کر) حبذا ہذا التقیاس۔

اس کے بعد ہوٹل کے ملازمان سلیقہ شعار نے متصل کے کمرے میں میز پر نہایت قرینے اور خوشنمائی سے پلیٹیں، چمچیں، گلاس اور کشتی رنگتے۔ جا بجا چند بوتلیں رکھیں۔ گلدستوں سے میز آراستہ کیا۔ لمپ روشن کیے اور آزاد پاشا کو اطلاع دی کہ حضور سب سامان لیس ہے۔ آزاد اُن سب کو لے کر کھانے کے کمرے میں گئے اور فرط طرب سے اس قدر خوش ہوئے کہ صد ہا یاں

نہیں۔ اس وقت وہ سوچتے تھے کہ معشوق پری تمثال کے شہر میں بعد طے منازل و صعوبت سفر وارد ہوا اور خاتون صافی مذاق کے ساتھ کھانے میں شریک ہوں جو نا لطورۂ زہرہ جبین حسن آرا بیگم سے خوب واقف ہیں اور جو حسن آرا کو ہماری کارگزاری اور نبرد آزمائی کے مضامین بعد فرحت پڑھ کر سناتی تھیں تو جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے اور دل میں سوچتے تھے کہ آج منہ مانگی مراد پائی۔ اب ایّام فرقت دور اور روزِ وصل قریب ہے ؎

شد وعدۂ نوبہار نزدیک — شد نخل بہ برگ و بار نزدیک
دریافت کہ محنتش سر آمد — اقبال دگر ز در در آمد
شد عیش ابد بہ غم نوردان — شد قرعہ بکام عیش گرداں
گردوں امید گرم تر کرد
صد اختر مغوق در گذر کرد

کھانے کے وقت باہم لطف و طرب کی باتیں ہونے لگیں۔

میم۔ آزاد پاشا کے سبب سے حسن آرا بیگم کا نام بھی ہو گیا ؎

دیوانۂ حسن او بہر کوئے — افسانۂ عشق او بہر سوئے
در آرزو دیش نشستہ شاہاں
جان برکف دست دوصل خواہاں

آزاد۔ انھیں کے سبب ہم نے نام حاصل کیا۔

کلیرسا۔ اس میں تو شک نہیں، مگر تم نے تو اپنی جان کو بھی کچھ نہیں سمجھا جب جا کے اس قدر نام حاصل کیا۔

میڈا۔ انھوں نے وہ کام کیا جو کسی اور سے کم ہوگا۔

میم۔ پھر اس کا صلہ بھی تو پایا، جہاں جاتے ہیں قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں کون ہے جو ان کو نہیں جانتا۔

جنٹلمین۔ اور آج پر کیا فرض ہے برسوں تک ان کا نام نیکی کے ساتھ یادگار رہے گا، روم اور روس اور جرمن اور انگلستان اور ہندوستان اور امریکا ساری خدائی میں آزاد پاشا مشہور ہیں۔

آزاد۔ یہ خدا کی دین ہے، ورنہ میں ایک ذرۂ بے مقدار کیا کر سکتا تھا۔ لاحول ولا قوۃ، میرے امکان میں کیا تھا۔ عشق کا مزہ یہی ہے کہ پہلے مصیبت و پریشانی، پھر کامرانی و شادمانی ہو ؎

عشق برخوردار سے چاہوں کہ پھل ہووے نصیب
پہلے آہ و اشک سے نخل و ثمر پیدا کروں

اور یوں تو اس عشق کے جھگڑوں میں اینجانب مدت سے پڑے ہیں کچھ آج پہلا ہی دن یا روم کا جانا پہلی ہی منزل نہ تھی۔

آج کل سے ہے نہیں ملک جنوں زیر نگیں!
اس قلمرو میں ہے مدت سے اجارہ اپنا!

جنٹلمین۔ کل میم صاحب آپ کا ذکر خیر کریں گی اور ہم کھانا کھانے کے بعد اسی وقت لکھے بھیجتے ہیں کہ آزاد پاشا داخل ہو گئے۔

آزاد۔ آپ کی نوازش، آپ کی مہربانی۔ ابھی تک یقین نہیں آتا کہ کسی روز حسن آرا سے وصل بھی ہوگا۔ کبھی کبھی تو جی خوش ہوتا ہے۔

کہ خدا نے چاہا تو اب وصل کے دن قریب ہیں مگر چونکہ مدتوں سے ناکامی نصیب ہوتی ہے لہذا طبیعت گھڑی گھڑی پلٹا کھاتی ہے۔

گفتگو کرتے ہیں وصل یار کی
پھر یہ کہتے ہیں کہ کیا گاتے ہیں ہم

الغرض جب تک دیدار یار سے مسرور نہ ہوں تب تک بیقراری کی حد نہیں۔

میم۔ کیوں مسٹر آزاد! آپ حسن آرا بیگم کو کیسے جانتے ہیں؟

آزاد۔ بس ملاقات ہونے کے چند ہی روز بعد روم گیا۔

میم۔ ہاں حسن آرا ہم سے کہتی تھیں کہ نئے طرز کی شادی ہے۔

آزاد۔ بہت صحیح کہتی تھیں، کیا اس میں شک بھی ہے۔

میم۔ اس کے معنی، کیا عام قاعدہ کچھ اور ہے؟

آزاد۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ میاں بیوی کی صورت نہ دیکھے اور بیوی نے میاں کی شکل نہ دیکھی ہو۔

میم۔ اسّا یہ تو ہندوں کے ہاں قاعدہ ہے۔

آزاد۔ جی نہیں میم صاحب! ہندو مسلمان سب کا قاعدہ ہے۔

جنٹلمین۔ آپ لوگ کس طرح منظور کرلیتا ہے کہ میاں نے بیوی کو نہیں دیکھا، بیوی میاں سے نہیں واقف اور شادی ہو گئی۔

آزاد۔ یہ بڑے عیب کی بات ہے کہ کنواری لڑکی کو کوئی نامحرم دیکھ لے۔ خصوصاً شرفا میں جہاں پردہ ضروری ہے اور یہ آزادی کہاں کہ مرد اور عورت باہم بولتے چلتے باتیں کرتے ہیں، یہ ان کی خو بو سے واقف وہ ان کی چال ڈھال پر آگاہ ہو جائیں۔ یہ کہاں۔

جنٹلمین۔ اور جو لڑکی کو پسند ہو تو بھی شادی ہو جائے۔

آزاد۔ اہل اسلام میں ایجاب وقبول کی رسم جاری ہے۔ دُلہن سے دریافت کر لیتے ہیں مگر یہ دریافت کرنا صرف برائے نام ہے کوئی دُلہن ایسی بے شرم نہیں جو انکار کرے کیا مجال اور ہندو کے ہاں یہ قاعدہ ہے کہ سنسکرت میں دولہا دولہن دونوں کو کہنا پڑتا ہے کہ آج سے ہم میاں بیوی ہوئے اور ہمارے یہ یہ فرائض ہیں مگر چونکہ اس زبان سے دونوں واقف نہیں لہذا کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا بیان ہو رہا ہے۔

جنٹلمین۔ (ہنس کر) یہ تو ایک کھیل ہے صاحب۔

میم۔ آپ تربیت یافتہ لوگ ان باتوں کو کیوں روا رکھتے ہیں۔

کلیرسا۔ ہمیں بھی سخت حیرت ہے، مگر ہر ملکے وہر رسمے۔

میم۔ ایسی رسم بھی کیا۔ آپ لوگوں کو اس کی پابندی نہ کرنی چاہیئے۔ یہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو پُرانے فیشن کے ہیں۔

جنٹلمین۔ (میم سے) اسی وقت ایک خط لکھ کر بھیج دو۔

میم۔ ابھی کھانے سے فراغت ہوئی اور خط لکھا۔

آزاد۔ انگریزی میں لکھیے گا تو وہ پڑھ نہیں سکیں گی۔

میم۔ واہ واہ آپ دو برس کے بعد آئے اور ہم کو سکھانے لگے، انگریزی نہیں رومن سہی، انگریزی حروف ہوں گے اور اُردو عبارت۔

آزاد۔ (خوش ہوکر) ہاں تو اب ترقی کی ہے۔
میم۔ روز بروز ترقی کرتی جائیں گی اس میں مطلق شک نہیں۔
آزاد۔ خدا چنیں کند۔ ازیں چہ بہتر۔ اس سے کیا بہتر ہے۔
میم۔ اس وقت تمھیں ہر در و دیوار سے وہی نظر آتی ہونگی۔
آزاد۔ اس وقت، اس وقت کیا، ہر وقت۔

یہ اک تیرا جلوہ صنم چار سو ہے ۔۔۔ نظر جس طرف کیجیے تو ہی تو ہے
یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے ۔۔۔ کہ دستِ دعا آج دستِ سبو ہے
گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا ۔۔۔ نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بُو ہے
مری اس اسیری کے صدقے رہائی ۔۔۔ ترا حلقۂ زلف طوقِ گلو ہے
نہ ہوگا کوئی مجھ سا محوِ تصور ۔۔۔ جسے دیکھتا ہوں سمجھتا ہوں تُو ہے
کبھی رُخ کی باتیں کبھی گیسوؤں کی ۔۔۔ سحر سے یہی شام تک گفتگو ہے
ملا دے لبِ جام کو لب سے ساقی ۔۔۔ چمن ہے ہَوا سرد ہے آبِ جُو ہے

نہیں ہے سوا تیرے کچھ مطلبِ دل
تمنا تری ہے، تری آرزو ہے

میم۔ ہم کو معاف کیجیے گا مس میڈا ہم نے آپ سے واہیات سوال کیا تھا جس کا ہم کو افسوس ہے اب ہم ایسا بھونڈا سوال نہ کریں گے۔
جنٹلمین۔ ہاں صحیح ہے، مگر ہم نے کئی اخباروں میں پڑھا تھا۔
میڈا۔ بالکل غلط ہے، اس کی ذرا اصلیت نہیں۔
جنٹلمین۔ کیوں مسٹر آزاد آپ سچ سچ بتائیے!
آزاد۔ جناب یہ معاملہ ریانی پینے لگے)
میم۔ (بات ٹالنے کے لیے) پلونا میں بڑا کام کیا۔
آزاد۔ وہ سب حسن آرا کے حکم کی تعمیل تھی۔
میم۔ یہ بھی تو آسان بات نہیں ہے۔
جنٹلمین۔ بہت مشکل بات ہے اور حق یہ ہے کہ انھوں نے ساری خدائی میں نام کر دیا۔
میڈا۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔
کلیرسا۔ ہم کو دیکھیے کہاں تو ان کی جان کے دشمن تھے کہاں اب ان کے ساتھ یہاں تک چلے آئے، کجا روس، کجا ہندوستان مگر اتفاق۔
میم۔ ان کی جان کا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا۔
اتنے میں کمرے کے باہر سے آواز آئی (بھلا رے گید ی بھلا۔ خبردار ابھی اطلاع دے ورنہ اتنی قرولیاں بھونکوں گا کہ

یا وہی تو کرے گا، آزاد بے اختیار کھلکھلا کے ہنس پڑے، صاحب اور میم صاحب متحیر کہ یہ کس بات پر ہنسے۔ میڈا اور کلیرسا تاڑ گئیں کہ یہ وہی خوجی ہونگے۔

آزاد۔ (خانساماں سے) دیکھو یہ کس کی آواز تھی؟

خانساماں۔ (باہر جاکر) کون غل مچاتا تھا؟

خوجی۔ غل مچاتا تھا! گویا ہم نفرے ہیں۔ آزاد پاشا سے کہہ دو کہ خواجۂ خواجگان حضور خواجۂ بدیع الزمان صاحب بدیع تشریف لائے ہیں۔ ابھی اسی دم اطلاع دو۔

خانساماں۔ بہت اچھا تو آپ ذرا دم بھر ٹھہریں۔

خوجی۔ او گیدی ہم کوئی نفرا نہیں ہے، ہم روم شام کوہ قاف سب کہیں پھر آیا ہے۔

خانساماں۔ اے تو صاحب ابھی تو کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں۔

خوجی۔ (دل) تم اطلاع دو جاکے۔

خانساماں۔ اچھا مگر آپ تو عربی بولتے ہیں اور بندہ جاہل آدمی، گو صحبت میں بیٹھتا ہوں مگر عربی خوان تو نہیں ہوں۔

خوجی۔ جا کے کہہ دو خواجہ صاحب آئے ہیں۔

خانساماں۔ (کمرے میں جاکر) کوئی خواجہ صاحب آئے ہیں۔

آزاد۔ بلالو، بلالو (میم سے) یہ صاحب بھی میرے ہمراہ روم گئے تھے دیکھنے کے قابل آدمی ہیں۔

خوجی۔ (باہر ہی سے) من خواجۂ بدلیعا ہستم، یا بائے من۔

آزاد۔ (مسکرا کر) خاموش اے گیدی خر۔

خوجی۔ توصیف خویش نہ کہ من میکنی۔ من چہ قابل شما خود توصیف یعنے خود ستائی کردی۔

چوں باد دم از بہار میزد   گر برگ گل دگہ کہ بخار میزد

آزاد۔ این چہ بک بک میکنی، خر گیدی خاموش باش۔

خوجی۔ اندرون این عمارت سر خود پیدا کنم یا نہ۔

آزاد۔ ع۔ تو بردن درچہ کردی کہ درون خانہ آئی۔

خوجی۔ افوہ، واللہ! بہ دہان خود خوردم، اے ہے۔

راوی۔ یعنی منہ کی کھائی، اس فارسیت کے صدقے۔

آزاد۔ بیا بیا، مگر از حرکاتِ مجنونانہ احتراز کن۔

راوی۔ جب اس قدر یورپین کو دیکھا تو ذرا جھیپے اور مس کلیرسا اور میڈا سے ہاتھ ملایا۔

کلیرسا۔ آپ اتنے دن تک کہاں تھے خواجہ بدی؟

خوجی۔ اوّل تو بندہ خواجہ بدی نہیں بدیع کہیے۔

کلیرسا۔ ہم اس زبان سے واقف نہیں ہیں صاحب!

خوجی۔ یہ جو بڑے زباندان بنے ہیں میاں آزاد۔ ان کو ہم کیا سمجھتے ہیں بھلا یہ کیا ہیں مقابلہ تو کریں۔

آزاد۔ اے یار خدا کے لیے ہمارا رنگ پھیکا نہ کرو (اُردو میں)
خوجی۔ (اکڑ کر) ہاں اب البتہ خاموش رہیں گے۔
آزاد۔ حضور کی مہربانی کیوں سب کے سامنے فرماؤ گے؟
خوجی۔ کہیے اب کیا رنگ ڈھنگ ہے؟
آزاد۔ بدستور وہی حال وہی کیفیت ہے

از نالۂ عاشقانہ من — حسرت کدہ ایست خانہ من
گل کرد جنوں بہ روزگارم — آتش زدہ عشق در بہارم
افروخت بلا بکینۂ من — آتشکدہ کرد سینۂ من
زیں شعلۂ غم کہ سر بلند ست — چوں شعلہ فرارہ ام سپند ست
ہر شب زغمش بصد تب و تاب
تا روز بر آتشم ز مہتاب

خوجی۔ برادر ایں مس را چہ نام داری بابائے من۔
آزاد۔ اب آپ تو کل بھی محاورے یہیں ختم کر دیں گے۔
خوجی۔ نہ بابا من در شما گفتگوئے الفاظ سادہ وچنیں وچناں گفتگو کردی کہ فہمی نہ کہ نہ فہمی۔ این وبس۔

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید
ز جام دہر مے کُلُّ مَن عَلَیہا فان

آزاد۔ کیا برجستہ شعر پڑھا ہے عجب چونگا ہو۔

جھکے رہنے سے گردوں کے کجی گردوں کی ظاہر ہے
سمجھتا ہوں خم شمشیر ہیں تسلیم دشمن کو!

جیسا شعر آپ نے پڑھا ایسا ہی ہم نے پڑھا۔
خوجی۔ واہ ری قدر دانی، بڑے زبان داں بنے ہیں۔
آزاد۔ بنے ہیں۔ کیا اس میں شک بھی ہے۔
خوجی۔ اب اس باتوں سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔
آزاد۔ اس باتوں سے!! بہت خوب۔ آپ بھی علماؤں میں ہیں اور آپ کے بھائی بڑے شعراؤں میں تھے اور آپ کے والد پشتن خوارا ناموں میں تھے۔
خوجی۔ خیر صاحب آپ کی داڑھی بڑی سہی۔ بس اب یہ کہو کہ حسن آرا کو بھی خبر ہوئی یا نہیں۔ نہ ہوئی ہو تو بندہ پہنچے۔
آزاد۔ کھانے سے فراغت ہولے تو باہم مشورہ کریں۔
خوجی۔ واللہ مجھ پیر فرتوت سے زیادہ اس کام کے قابل اور کسی کو نہ پاؤ گے میں بڑے کام کا آدمی ہوں۔
آزاد۔ اس میں کیا شک ہے بھائی جان۔ بیشک ہوگی۔

اثنائے گفتگو میں میم صاحب نے کہا کہ حسن آرا بیگم نے کئی بار ایک بونے کا ذکر کیا تھا اور وہ کہتی تھیں کہ آزاد کے ہمراہ ایک مسخرہ بونا گیا ہے، شاید آپ نے کئی خطوں میں اس بونے کا ذکر کیا تھا۔ میں جانتی ہوں یہ وہی ہیں، وہی قد و قامت، وہی مسخرہ پن، وہی باتیں۔ آزاد بہت ہنسے اور خوجی کی طرف دیکھ کر کہا، جی ہاں یہ وہی مسخرے ہیں، اس شخص کے سبب سے راہ میں بڑی دل لگی رہی اور بعض مقاموں پر اس نے ہمیں مدد بھی بہت دی۔ نہایت معقول آدمی ہے مگر جھکّی، مغرور، یاوہ گو اور مجنون اور بات بات پر لڑ پڑتا ہے۔ ذرا کسی سے بات ہوئی اور یہ مشت مشت پر آمادہ ہو گئے۔ بدن میں طاقت برائے نام بھی نہیں، نتیجہ ظاہر ہے مگر بے لڑے نہ رہیں گے۔ یہ ان میں عجب عادت ہے اور جو کوئی سمجھائے تو اس سے اُلجھ پڑیں، اسی سبب سے کوئی ان سے بولتا نہیں مگر بڑے تماشے کے آدمی ہیں۔

خواجہ صاحب انگریزی خاک نہیں سمجھتے تھے مگر باتوں میں اس قدر تاڑ گئے کہ اپنی جانب ہی کا ذکر خیر ہے۔ خونخوار ہو کر آزاد سے یوں مخاطب ہوئے:

خوجی۔ سنو میاں، خواجہ بدیع ہفت زبان ہے، وہ کون سی زبان ہے جس سے یہ واقف نہیں۔ فرمائیے، عربی، فارسی، ترکی، اُردو، فرانسیسی، سب میں عبور، انگریزی زبان کا بادشاہ، میں سمجھ گیا کہ تم از بسکہ شریر ہو فلہٰذا میرے باجی اور بندہ کسے را بکدام وجوہ بدمردنہ گفتنہ و بس۔

آزاد۔ تم کو تو ہے جنون، تم سے واسطہ کیا، تمھارا ذکر کس نے کیا۔ آپ بھی سمجھتے ہیں کہ ہمارا ذکر کیا جاتا ہے۔ شانِ خدا، ہونھ!!

خوجی۔ ان بھڑوں میں لونڈے آتے ہوں گے جی۔

کلیرسا۔ کیا خواجہ کچھ خفا ہو کے گفتگو کرتے ہیں اس وقت؟

مئیڈا۔ ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیوں خواجہ بدیع تم اس وقت ناراض کیوں ہو اس قدر؟ آخر بے وجہ نہیں کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور ہے۔

خوجی۔ صاحب بات یہ ہے کہ ہمارا کہنا انھوں نے آج تک نہ مانا نہ مانا اور ہم ان کے دوست جان نثار ٹھہرے۔

میم۔ (مسکرا کر) بیشک یہ بڑا مسخرہ ہے، جیسا اخبار والے نے لکھا تھا ویسا ہی اس کی قطع وضع بات چیت سب سے مسخرہ پن برستا ہے اور قد تو ماشاء اللہ ان ہاتھ پاؤں پر یہ زعم!! شان خدا۔

خوجی۔ اب اُلجھن ہوتی ہے واللہ خفقان ہوتا ہے، آپ کھانے سے فراغت پائیں تو کیا مضائقہ، پھر ہم اور آپ باہم سرگوشی کر کے فیصلہ کریں گے، اس وقت جھگڑنا مناسب نہیں مگر جلد فراغت کیجیے ورنہ رات جاتی ہے۔

کھانے سے فراغت پا کر جنٹلمین اور میم صاحب ان سب سے رخصت ہوئے اور کہا کہ ہم اسی دم حسن آرا بیگم کو اس نوید مسرت خیز کی اطلاع دیتے ہیں آپ مطمئن رہیں۔ آزاد نے ان دونوں کی نوازش و عنایت کا شکریہ ادا کیا۔ اُن کے جانے کے بعد مئیڈا نے آزاد کو مبارک باد دی کہ جس شہر جس قصبے جس مقام پر جاتے ہو تم کو سب جانتے ہیں تم سے کوئی ناواقف نہیں، ایسا نام کسی نے کم پیدا کیا ہوگا۔ کلیرسا بھی ان کی ہمصفیر ہوئی اور کہا واقعی حسن آرا کے سبب سے یہ اور ان کے سبب سے حسن آرا اس قدر مشہور ہیں کہ دنیا کا ہر فرد و بشر جو ذرا بھی پڑھا لکھا ہے ان دونوں کو خوب جانتا ہے اور ہندوستان اور روم اور روس میں تو لکھے پڑھے اور اَن پڑھ کوئی ناواقف ان سے نہیں۔ یہ خدا کی دین ہے۔

ادھر تو یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ اب حسن آرا کے ہاں کا حال سنیے۔ وہ گل پیرہن غنچہ دہن گھڑی بھر دن رہے بناؤ چناؤ کر کے

ہمجولیوں اور بہنوں کے ساتھ چھت پر اٹھلا رہی تھی اور باہم ہنسی خوشی مذاق کی چھیڑ چھاڑ ہو رہی تھی۔
نظیر۔ کہیں کہیں اسی وقت دلہن کو دکھاتے ہیں، شفق پھولی ہے نہ اس وقت معشوقوں کا حسن دو بالا ہو جاتا ہے اگر اس وقت آزاد آجائیں تو کیا کہنا۔
حسن۔ تمہارے منہ میں گھی شکر۔
بہار۔ اے اب آئے ہی داخل ہیں۔ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں۔ اب دنوں کی بات ہے ہفتوں کی بات نہیں ہے۔
روح۔ جب برسوں چٹکیوں میں کٹ گئے تو دن تو بات کرتے معلوم نہ ہوں گے اور ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ آزاد صبح شام داخل ہوا چاہتے ہیں۔ اگر اس میں فرق ہو تو جب ہی کہنا۔
حسن۔ تعجب کیا ہے، آخر ہندوستان میں آگئے اور جائیں گے کہاں سوا اس شہر کے اور کہاں جائیں گے؟
جانی۔ ان کا تو یہی جی چاہتا ہوگا کہ دن رات آزاد ان کے پہلو سے جدا نہ ہوں، بس وہ ہوں اور یہ ہوں۔ دیکھیں تو آزاد کی شکل صورت کیسی ہے جو یہ اس قدر ریجھی ہیں۔ ان کے مذاق اور ان کی پسند تو دیکھیں۔ مگر دل یہی کہتا ہے کہ آزاد کروروں جوانوں میں فرد ہوں گے۔
نظیر۔ حسن آرا کی سی نزاکت اور ان کا سا حسن بھی کسی میں کم ہے، آدمی کیا پھول پان ہے۔ ناز کی خود ان کی نزاکت کی قسم کھاتی ہے۔
حسن۔ آپ اپنی تعریف رہنے دیں، ہم اچھے ہیں یا برے آپ نظر عنایت ہی رکھیں۔ جانی بیگم کی صحبت میں باتیں بہت سیکھ گئی ہو کیا!
جانی۔ (آگ بھبوکا ہو کر) دیکھو حسن آرا ہزار بار کہہ دیا ہمارے منہ نہ لگو، چہ خوش اب جانی بیگم ضرب المثل ہو گئی گویا۔
نظیر۔ سچ کہتی ہو حسن آرا، ان کی صحبت ایسی ہی ہے، جو کوئی ان کو سمجھائے تو الٹی آنتیں گلے پڑیں۔ ہم کو یہ نہ چھیڑا کریں تو گویا انھوں نے ہم کو داموں مول لے لیا۔ اب اس سے بڑھ کر اور بدنامی کیا ہوگی کہ آئے دن ہمجولیاں طعنے دیتی ہیں کہ جانی بیگم کی صحبت میں رہتی ہے نہ۔
جانی۔ (تنک کر) اب کچھ تو سنو گی۔ ہاں ہمجولیاں کیا طعنے دیتی ہیں، ذری ہم بھی تو سنیں یہ طعنے دیتی ہیں کہ جانی بیگم کی صحبت میں خراب ہو گئیں اے ہے کیا ننھی بیچاری ہیں، کہتے شرم نہیں آتی۔ خدا کی شان ہماری صحبت میں اور یہ خراب ہوں، تم روکھی پھیکی گنوار نیں ہماری قدر بھلا کیا جانو۔ دو دن پاس بیٹھو تو آدمیت سیکھ جاؤ بہن۔
بہار۔ اس وقت جانی بیگم نے بہت ضبط کیا نہیں تو خدا کی پناہ نظیر بیگم نے واقعی بہت بری بات کہی تھی مگر جانی بیگم ہمارا برا نہ مانو تو کہوں۔ تم اس وقت ذری دب بھی گئیں، کیا جانے اس کا کیا سبب ہے۔
جانی۔ میں او ان ایسوں سے دب کے چلوں، ضرور! یہ ہیں کیا بیچاری! پرائے گھر میں بیٹھی ہوں اس لیے خاموش ہو رہی، دم بخود۔ نہیں تو ان کو اس زبان درازی کا مزہ چکھا دیتی۔
روح۔ اے تو اس قدر تنکتی کیا ہو بہن۔ صحبت تو ان کو تمہاری رہی ہے اس میں کیا شک بھی ہے۔
جانی۔ (مسکرا کر) اور مجھے رونا کاہے کا ہے، یہی تو برا معلوم ہوتا ہے کہ میری صحبت کی بیٹھنے والی، آنکھوں کی دیکھنے والی بلی بنی رہے۔
حسن۔ اللہ۔ یہ جھگڑا سارا اس بات کا تھا۔
روح۔ اے لو۔ چہ خوش۔ یہ معلوم ہی نہ تھا۔
حسن۔ سچ تو کہتی ہیں ان کی صحبت اور سیدھی ایسی رہیں۔

نظیر۔ ان کی صحبت سے اللہ پناہ میں رکھے (کان پکڑ کے)

اتنے میں ایک مہری نے آن کر بہار النسا کے کان میں کچھ کہا اور دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بہار النسا بولیں (تو اس میں چوری کی کون بات ہے؟ اچھی طرح کیوں نہیں کہتی ہو) اب سب کو اشتیاق ہوا کہ کیا بات ہے اور نہایت اصرار کے ساتھ پوچھنے لگیں تو مہری نے یوں بیان کیا۔ اے حضور نیک قدم کے ابا ہوٹل میں نوکر ہیں۔ میں عسکری خانم کے ہاں سے آتی تھی تو میں نے کہا چلو اُن سے بھی ملتی آؤں۔ وہاں میں نے فرنگنیں دیکھیں، دونوں جوان اور اس قدر کی قبول صورت کہ میں کیا عرض کروں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ بس حضور میں نے نیک قدم کے ابا سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ کہا کیا معلوم کون ہیں مگر ان کے ساتھ ایک مسلمان بھی ہیں۔ سو مسلمان اس سے جان پڑے کہ بد مہری اور کالے پانی سے ان کو پرہیز ہے مگر وضع سے بالکل صاحب لوگ جان پڑتے ہیں۔ ویسے ہی گورے چٹے ویسی ہی وضع وہی کپڑے اور شاید وہ دونوں میمیں انگریزی بولنا نہیں جانتیں۔

روح۔ بہن مبارک! آزاد داخل ہو گئے۔

گیتی۔ ہو نہ ہو آزاد وہی ہوں تمہارا بھی دل گواہی دیتا ہے۔

بہار۔ ذری بڑے میاں کو بلانا، پیر مرد کو۔

مہری۔ اور حضور بڑے خوبصورت جوان ہیں۔ ہم لوگوں کی زبان اچھی طرح بولتے ہیں۔ جب میں نے نماز پڑھتے دیکھا تو بڑا تعجب ہوا مگر نیک قدم کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ مسلمان ہیں عیسائی نہیں ہیں۔

بہار۔ میں جا کے اماں جان سے کہتی ہوں کہ آزاد داخل ہو گئے۔ بہار النسا نے بڑی بیگم سے کہا، اماں جان مبارک ہو، بچھڑے ہوئے آ گئے اب جشن کیجیے۔ مہری کہتی ہے کہ ہوٹل میں ٹکے ہیں۔ بڑی بیگم بولیں، کہاں ٹکے ہیں؟ اوٹل کیا۔ اس پر بڑا قہقہہ پڑا اور بہار النسا نے کہا۔ اماں انگریزوں کی سرائے میں ٹکے ہیں جہاں صاحب لوگ اُترتے اور کھاتے پیتے ہیں۔

بڑی بیگم بہت خوش ہوتی۔ اُسی وقت محمد عسکری کو بلوایا اور حکم دیا کہ وہاں جا کے دیکھو آئے ہیں یا نہیں؟ محمد عسکری گاڑی پر سوار ہو کر ہوٹل گئے، ادھر مغلانی نے حسن آرا کو ایک خط دیا جس کا مضمون یہ تھا:

مائی ڈیر حسن آرا۔ تم کو اس وقت مژدہ سناتی ہوں کہ جس کی تم برسوں سے بکمال اشتیاق مشتاق ہو سمجھیں مگر اس نوید رسانی کے عوض میں تم سے ایک دعوت کل ہی لوں گی۔ آج ہم نے خبر پائی کہ پارسیوں کے ہوٹل میں دو لیڈیاں اور ایک جنٹلمین فروکش ہیں۔ شام کو ہم گئے تو دور ہی سے صورت پہچان گئے۔ بتاؤ کون تھے؟ وہ جنٹلمین آزاد پاشا ہیں اور وہ دونوں لیڈیاں وہ ہیں جن کو تم خوب جانتی ہو، ایک مس میڈا کوہ قاف کی پری، دوسری مس کلیریسا روس کی خاتون۔ مجھ سے اور آزاد سے خوب باتیں ہوئیں، خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں اور تم خوب جانتی ہو کہ میں قسم کھانے کی عادی نہیں ہوں کہ اس اتنے بڑے شہر میں کوئی جنٹلمین ایسا نہیں جو خوبصورتی اور رعنائی اور برنائی اور قوت میں اس کا مد مقابل ہو۔ باتیں کرتے ہوئے مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ بڑا عزیز آدمی ہے۔ الغرض آج میرا جی خوش ہو گیا کہ آزاد پاشا کی نسبت جو کچھ سنا اور پڑھا تھا، اُس سے بھی بڑھ چڑھ کر پایا۔ کل لوں گی اور کھانا تمہارے ہی ساتھ کھاؤں گی، جب میں نے آزاد کو اطلاع دی کہ حسن آرا سے میں واقف ہوں تو بہت خوش ہوئے۔

یہ خط پڑھ کر حسن آرا نے بہار النسا کو سنایا اور یہ اشعار زبان پر لائی ؎

گیا ہے کوچۂ کاکل میں اب دل مسلمان وارد ہندوستان ہے

سُنے جو پھر نہ جاگے تا قیامت — ہمارے عشق کی وہ داستاں ہے
تجھے کہتا ہوں سُن اے وحشتِ دل — وہاں لے چل جہاں وہ دلستاں ہے

ادا و ناز غمزہ سے ہے آتا
مرے یوسف کے ہمراہ کارواں ہے

جانی ۔ اس وقت تو باچھیں کھلی جاتی ہیں، کیوں نہ ہو۔
نظیر ۔ بات ہی ایسی ہے، برسوں کے بعد آنے کی خبر سُنی۔
روح ۔ اللہ نے منتوں سے یہ دن دکھایا، خدا جانے کس کس نے اس کے لیے دعا مانگی جب یہ دن نصیب ہوا کہ آج آزاد کے آنے کی خوش خبری سُنی، اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہو گی۔
بہار ۔ اس میں کیا شک ہے بہن، گو لاکھ خوش تھے کہ آزاد نے یہ کیا وہ کیا مگر پھر دل کہتا تھا کہ سائیں کے سو کھیل، بارے اللہ کو اچھا ہی کرنا منظور تھا۔
روح ۔ اے بہن، کون ٹھکانا تھا، دور از حال ذرا سی گولی چھنے کے برابر اچھے ڈھٹو کے ڈھٹو کو دم کے دم میں کہیں کا نہیں رکھتی مگر چلو جو ہُوا، اللہ نے ان دونوں کو سرخرو کیا۔ اب نکاح ہو اور دونوں کی جوڑی برقرار رہے۔

اتنے میں معلانی نے سپہر آرا کو جو خواب ناز میں تھیں جگایا۔ اُن کے آتے ہی مبارک سلامت کی آوازیں چو طرفہ سے آنے لگیں۔ فرط طرب سے سپہر آرا کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، حسن آرا سے کچھ کہنے کو تھیں مگر زبان نے مدد نہ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد مسکرا کر کہا باجی جان شکر ہے کہ آزاد پاشا کی خیر و عافیت سے آنے کی خبر سُنی۔ سپہر آرا بیگم نے کہا ذری کسی کو بھیج کر آسمان جاہ کو تو بلوا لو اور حُسن آرا نے مہری کو حکم دیا، فنس نکلواؤ اور تم اور نیک قدم کی ماں فنس کے ساتھ ہوں، دو سپاہی لے لو اور مشعلچی اور جاتے ہی نازک ادا بیگم سے کہو کہ آہستہ سے آزاد داخل ہوئے ہیں چلیئے بلایا ہے۔

روح ۔ اُن کی ساس کا مزاج جانتی ہو وہ نہ بھیجیں گی اس وقت، پھر بلانے سے کیا فائدہ اور بات گنوانا ہے۔
گیتی ۔ بہار النسا بہن کا نام لیں تو بھیج دیں۔
بہار ۔ ہاں نازک ادا بیگم کی ساس ہم پر ذری کسی قدر مہربان ہیں مگر یہ کچھ فرض تھوڑا ہی ہے کہ اس وقت بھیج ہی دیں۔
حسن ۔ ان کے بغیر یہاں سُونا ہے ایک ہی کونا آباد ہے۔
جانی ۔ کیا کہا۔ ذری پھر تو کہنا۔ پھر وہی چھیڑ خانی۔

الغرض مہری حکم بجا لائی، نازک ادا بیگم کی ساس نے پہلے ناک بھوں چڑھائی اور کہا بھلا اب یہ کون وقت ہے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ نازک ان کے کہے بغیر جانے کو تیار ہوئیں تو کہا اچھا چلی جاؤ مگر کل ضرور آ جانا۔ یہ فنس پر سوار ہو کر داخل محلسرائے حسن آرا ہوئیں اور اُترتے ہی مبارک مبارک کہتی ہوئی کوٹھے پر گئیں۔

نازک ۔ حسن آرا کہاں ہیں؟ آؤ بہن گلے ملیں۔
حسن ۔ یہ آج تو کچھ بہت ہی خوش خوش آتی ہیں۔
نازک ۔ چہ خوش، خوب، بہت ہی خوب۔ کہو بچھڑے ہوئے ملے اسی طرح اللہ کرے ہمارے میاں بھی شکار سے واپس آئیں۔
حسن ۔ کیا شکار کھیلنے گئے ہیں۔ یہ کب گئے ہیں۔

نازک - اسے کوئی اٹھوارہ ہوا ہوگا اور شکار ہے کاہے کا، شیروں کا شکار مگر وہ بڑے گل چلے ہیں۔
جانی - وہ ٹٹیوں کی آڑ میں شکار کھیلنے والے آسامی ہیں۔
نازک - اخاہ جانی بیگم بھی ہیں۔ اب تو حسن آرا کی بغل گرم ہوگی بہن، اب ان کے دماغ کاہے کو ملنے لگے۔
جانی - ان کے دماغ یوں نہیں ملتے تھے اب تو اور بھی نہ ملیں گے حسن آرا اللہ جانتا ہے اس وقت تمہارے بشرے سے خوشی برستی ہے کسی سے کچھ نہ کہو۔ مگر تمہارے چہرے سے خوشی کے آثار نمایاں ہیں۔
نازک - اس وقت آزاد پاشا نظروں کے سامنے پھر رہے ہیں ؎

دیکھ کر کون ترے چہرے کو حیراں نہ ہوا — کس نے دیکھیں تری زلفیں جو پریشاں نہ ہوا

بہار - میں اس کے گلے پر عاشق ہوں، ہاں ہاں بہن اور کوئی غزل شروع کرو۔ کوئی عمدہ سی غزل کہو۔
نازک - اچھا ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پلاؤ تو گاؤں۔
حسن - ایک نہیں دس، بلکہ کنواں کا کنواں پی جائیے۔
نازک - (پانی پی کر) آج جس قدر ہم خوش ہیں اُسی قدر حسن آرا بھی خوش ہوں گی، بڑی خوشی ہوئی بہار النسا بہن آزاد بیچارے آگئے، چلو بہت اچھا ہوا۔
نازک ادا بیگم نے آہستہ آہستہ یہ شعر بہ لحن داؤدی ادا کیے:؎

دلبستگی سی ہے کسی زلفِ دوتا کے ساتھ — پالا پڑا ہے ہم کو خدا کس بلا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
یارب وصال یار میں کیوں کر ہو زندگی — نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ
ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے — کس نے نگاہِ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ
دستِ جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا — اُلجھا ہے ان سے شوق سے بند قبا کے ساتھ

مومن وہی غزل پڑھو شب جس سے بزم میں
آتی تھی لب پہ جان زہ وحبذا کے ساتھ

جانی - تمہاری ساس تو نہیں کچھ رولا لائی تھیں؟
نازک - میں نے جیسے ہی یہ خبر سنی جھٹ پٹ کپڑے بدل مغلانی کو ساتھ لے فنس پر سوار ہوئی، جب دیکھا کہ جاتی ہی ہے تو کہا اچھا جاؤ، کل چلی آنا۔
گیتی - حسن آرا بیگم نے بڑی خوشی سے اس وقت بلوایا تھا۔
نازک - آزاد آن کر ٹکے کہاں ہیں، خبر کیوں کر ہوئی؟
بہار - جہری نے آن کر کہا اور پھر میم صاحب کی چٹھی آئی۔

اتنے میں محمد عسکری بڑی بیگم کے پاس آئے اور آزاد کی ملاقات کا حال یوں بیان کیا۔ میں ہوٹل گیا تھا، پہلے تو میں نے دو تدرو رفتار گل رخسار میمیں دیکھیں، دونوں ابھی نوعمر ہیں وہ ایک صاحب کے ساتھ ہوٹل کے ایک چمن میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ میں نے خانساماں سے پوچھا کہ محمد آزاد نامے کوئی یہاں فروکش ہیں۔ اس نے کہا جی ہاں، وہ کیا ٹہل رہے ہیں۔ مجھے سخت

تعجب ہوا کہ محمد آزاد نام اور یہ لباس۔ جرأت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر اُن سے ہمکلام ہوں۔ اتنے میں خانساماں نے ان سے کہا کہ حضور کی ملاقات کو ایک صاحب آئے ہیں۔ وہ فوراً میرے قریب آئے اور السلام علیکم کہہ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اب میں حیران کہ یا الہیٰ ان سے کہوں تو کیا کہوں اور وہ مجھ سے کئی سوال کر بیٹھے، آپ کا اسم مبارک، آپ کہاں سے تشریف لائے، خاکسار کو کس غرض سے ممتاز فرمایا؟ میں نے کہا جناب کا نام سُن کر صرف زیارت کے لیے آیا ہوں۔ کرسیاں منگوائیں خود بھی بیٹھے، مجھے بھی بٹھلایا اور یوں گفتگو ہوئی:

آزاد۔ دولتخانہ آپ کا اسی شہر میں ہے یا کہیں باہر؟

میں۔ جناب اب تو کئی دن سے یہیں قیام رہتا ہے!

آزاد۔ مجھے پیشتر بھی آپ کی خدمت میں نیاز حاصل ہُوا تھا؟

میں۔ پیشتر مجھے کبھی آپ کی زیارت نہیں نصیب ہوئی تھی، لیکن آپ شہرۂ آفاق ہیں یگانۂ دہر آپ کی زیارت ہماری سعادت ہے۔

آزاد۔ اپنے شہر کے متعلق آپ کوئی نئی بات نہیں جانتے؟

میں۔ یہاں ہر گلی کوچے میں حسن آرا بیگم کا فسانہ خاص و عام کے ورد زبان ہے غالباً آپ نے بھی ان بیگم صاحب کا نام سُنا ہوگا۔

آزاد۔ (مسکرا کر) دنیا میں ہزاروں خدا کے بندے پڑے ہیں۔

الٰہی ایک دل کس کس کو دوں میں ہزاروں بُت ہیں یاں ہندوستاں میں

میں۔ بہت اچھا، پھر یہی کہہ دوں گا۔

آزاد۔ (غور سے نظر کر کے) اب آپ پہیلیاں تو بجھوائیے نہیں صاف صاف بیان فرمائیے کہ آپ خود آئے ہیں یا آپ کو کسی نے بھیجا ہے؟

میں۔ حضرت صاف تو یہ ہے کہ بڑی بیگم صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ الحمدللہ کہ خدا نے یہ دن تو دکھایا، تمام ہندوستان کو اسی دن کی آرزو تھی، غالباً وہاں سب کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ آپ تشریف لائے ہیں۔

آزاد۔ حسن آرا بیگم — جن کا میں نے نام لیا اُن سے صرف آپ اتنا ہی کہہ دیجیے گا کہ تمہارا نام لے کر خاموش ہو رہے۔

میں۔ بہت خوب۔ مجھے تو بڑی بیگم صاحب نے بھیجا ہے۔

آزاد۔ آپ بڑی بیگم صاحب سے میری خیر و عافیت کہہ دیجیے گا اور یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ آپ بزرگوں کی دعائے خیر سے بندہ واپس آیا۔ صعوبت سفر اور زحمتِ جنگ کا حال ناگفتہ بہ ہے مگر اب وہ باتیں تقویم پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

میں۔ کمال اشتیاق حضور کی زیارت کا تھا۔

آزاد۔ آپ کی عنایت، مگر اسم شریف آپ نے نہ بتایا۔

میں۔ خاکسار کو محمد عسکری کہتے ہیں۔

آزاد۔ بڑی بیگم سے کچھ قرابت ہے؟

میں۔ (کسی قدر شرما کر) جی ہاں کچھ ہے!

آزاد۔ (ہنس کر) اس میں شرمانے کی کیا بات ہے حضرت!

میں۔ جی کچھ نہیں، یہ تو ہوا ہی کرتا ہے۔

آزاد۔ آپ اس قدر دانا بینا ہو کر شرماتے ہیں۔

حسن آرا بیگم کو نازک ادا بیگم نے بلطائف الحیل مہتابی پر بلایا اور کہا بہن ہم نے تم کو تخلیے میں اس لیے بلایا کہ اپنے طور پر کچھ پوشیدہ باتیں کریں اور تم کو سکھائیں کہ معشوق پن کسے کہتے ہیں۔ گویا اس میں تو شک ہی نہیں کہ تمھاری ایک ایک ادا سے معشوق پن برستا ہے۔ معشوق پن کوئی تم سے سیکھے مگر پھر بھی تجربہ اور شے ہے حسن آرا مسکرا کر بولی۔ بہن سچ کہتی ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کہتی کیا ہیں معشوق پن کیسا اور تجربہ کیسا۔ یہ چیزیں بھی سکھانے سے آتی ہیں بھلا!

نازک۔ کیا تجربہ کوئی چیز ہی نہیں ہے؟

حسن۔ خدا جانے کس بات کا تجربہ بہن!

نازک۔ میاں سے کیوں کر باتیں کرنی چاہئیں، اس بات کا تجربہ!

حسن۔ ہاں، پھر اس کا تجربہ ہمیں ابھی کیوں کر ہو، رفتہ رفتہ معلوم ہو جائے گا۔ مگر جبکہ ہم اور وہ دونوں دل سے ایک دوسرے کے شیدا ہیں تو پھر تجربہ ہو یا نہ ہو، ہمارا عشق رنگ جما ہی لے گا۔

نازک۔ بہن! اس کے بھید کو تم کیا سمجھو گی، یہ راز و نیاز کی باتیں ہیں، میاں سے اس طرح پیش آؤ اور ایسی معشوق پن کی گھاتوں کا برتاؤ کرو کہ وہ خود داد دیں اگر میاں اور بیوی کا دل مل جائے تو ممکن کیا کہ کوئی مرد ادھر ادھر اُدھر آشنائی کرتا پھرے۔

حسن۔ آپ کی باتیں ہی انوکھی ہیں، ہم دونوں تو لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد ہیں بہن۔ ہم میں آپس میں ان باتوں کا برتاؤ کیسا۔ ع۔

گر نغمہ کند ور نکند دل بفریبد، یہاں تو بات اور ہی ہے۔

نازک۔ اچھا اب دیکھیں جو بات اور دلولہ آج ہے وہ کب تک بدستور رہتا ہے اگر سچا عشق ہے تو تمام عمر رہیگا ورنہ سال دو سال۔

حسن۔ اب اس کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے مگر ہم اس وقت ایسی باتیں کرنا نہیں چاہتے کچھ اور ذکر چھیڑیئے۔

نازک۔ کوئی غزل گائیں ایسی کہ تم بھی پھڑک جاؤ؎

وعدے کی جو ساعت دم کشتن ہے ہمارا	جو دوست ہمارا ہے وہ دشمن ہے ہمارا
آغشتہ بخوں دست کو تو پونچھتے نہیں وہ	اُلٹے کف جلاد میں دامن ہے ہمارا

گو حسن آرا بیگم ضعیف الاعتقاد نہ تھیں مگر ان دونوں شعروں نے ان کو کسی قدر بیقرار کر دیا۔ کہا بہن گاؤ تو خوشی کی غزل گاؤ خوشی کے دن سب خوشی کی غزل گاؤ۔ خوشی کے دن سب خوشی ہی کی باتیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔

نازک۔ تاڑ گئی اور یہ شعر زبان پر لائی؎

چشم گلشن پر قدم رکھتا ہوا کون آئیگا	عطر فتنہ میں گل نرگس بسا تی ہے بہار
غنچہ ہائے آرزوئے مومن کہ اب کھلنے کو ہے	خیر مقدم گلشن ایمان میں آتی ہے بہار

وصل بتاں کی دعا کرتے ہو شکر خدا
حضرت مومن تمھیں دعویٰ دیں ہے ہنوز

حسن۔ آپ چل کر وہیں نہ بیٹھیں یہاں کیا ہے۔

نازک۔ ہاں اچھا دیکھو تو جانی بیگم کو اس وقت کیسا آڑے ہاتھوں لیتی ہوں کہ وہ بھی یاد کرے کسی سے پالا پڑا تھا۔

نازک ادا بیگم تو اس فکر میں تھیں ادر اُدھر جانی بیگم نے ان پر پہلے ہی آوازہ کسا رمیں کہتی ہوں یہ نازک ادا کہاں ٹھیلے پن

کے ساتھ حسن آرا کو لے کر چل دیں، بہن اس کے پھسلانے میں نہ جانا، یہ بڑی ایک ہیں، یہ لاکھ کہیں تم اپنی ہی کرنا۔ سن لیا کہ آزاد پاشا آئے ہیں اور یہ تو جانتی ہی ہیں کہ مرد خوشرو ہیں، اب حسن آرا سے محبت بڑھاتی ہیں دیکھو حسن آرا یہ اچھی بات نہیں ہے۔ پھر رفتہ رفتہ سودا نہ پیدا ہو جائے)

بہار۔ (ہنس کر) دونوں اچھی ملیں، کوئی کسی سے کم نہیں۔

گیتی۔ ابھی وہ ذری چپ ہیں، مگر کچھ کہا ہی چاہتی ہیں۔

روح۔ دونوں شمشیر برہنہ ہیں چپ وپ کوئی بھی نہیں ہے، مگر یہ مہتابی پر کیا کرنے گئی تھیں۔

اب سنیے بڑی بیگم صاحب جریب ٹیکتی ہوئی چھت پر تشریف لائیں۔ ضعیف الاعتقاد تو پرلے سرے کی تھیں۔ کبھی خواب اور کبھی منت ماننے اور آنکھ پھڑکنے کا ذکر چھیڑا۔

بڑی۔ میں نے تو کل ہی کہہ دیا تھا کہ کوئی خوش خبری سننے میں آئے گی، میری بائیں آنکھ پرسوں سے پھڑک رہی تھی۔

روح۔ اماں جان اب تو سب ہی کہیں گے اور آپ نے کل سے کہا تھا کہ خوشخبری سننے میں آئے گی ہم نے تو آج ہی سنا۔

مغلانی۔ (خوشامد سے) مجھ سے فرمایا تھا حضور نے

روح۔ یہ بڑی جھوٹوں کی سردار، تم سے اماں جان نے کہا تھا۔ اچھا ہم سے کیوں نہیں کہا۔

بہار۔ تم بڑی بے ادب ہو، جو منہ آیا بک اٹھیں۔

روح۔ اماں جان (ہاتھ جوڑ کر) ہماری آنکھ نہیں پھڑکتی کبھی، آخر آپ کو یہ بتایا کس نے ہے، اس سے ہوتا کیا ہے۔

بڑی۔ بابا ابھی ناتجربہ کار ہو تم کیا جانو۔

مغلانی۔ حضور نے آج صبح کو ایک کوے سے باتیں کی تھیں۔

بڑی۔ یہ ان باتوں کو کیا جانیں، ان کے سامنے کہنا ہی فضول ہے، میں تو سویرے جب اٹھتی ہوں ہوا کا رخ دیکھتی ہوں۔

حسن۔ (مذاق کی راہ سے) اماں جان ہمیں بھی بتا دیجیے۔

بہار۔ اخاہ ان کو بھی زبان آئی ہم کو تو ان باتوں کا عقیدہ ضرور ہے اور ہیں نہیں تو اتنے آدمی کیوں مانتے ہیں۔

حسن۔ یہ روح افزا بہن کو خدا جانے کس نے کہہ دیا کہ ذرا کوئی بات نہیں مانتی اور ہنستی ہیں۔

بڑی۔ (مسکرا کر) تم سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔

بہار۔ یہ میرے دل کی بات کہی اماں جان، کوئی پوچھے تم کون بہت مانتی ہو، جو روح افزا کو للکارتی ہو خواہی نخواہی۔

حسن۔ اماں جان یہ لڑاتی ہیں میں کیا نہیں مانتی۔

بڑی۔ میں نے کل خواب دیکھا تھا کہ ایک آدمی، مگر نہ کہوں گی، ان لڑکیوں کو یقین تو آوے ہی گا نہیں۔

بہار۔ کیسے کیسے اماں جان۔ ان لوگوں کو یقین نہ آوے جاہے۔ مجھے تو آپ خوب جانتی ہیں۔ جب خواب دیکھا کہ کوئی نہ کوئی بات ہوئی ضرور۔

بہار النسا نے کروروں قسمیں دیں تو مجبور ہو کر بڑی بیگم نے خواب کا حال یوں بیان کیا۔ کہا دو بجے کا وقت ہوگا جب میری آنکھ لگی تو میں کیا دیکھتی ہوں کہ ایک آدمی کوئی اٹھارہ میں برس کا سن ہوگا، نہایت قبول صورت خوبرو ہزار دو ہزار میں دیدار و جوان، سبزہ آغاز دروازے پر آن کے کھڑا ہوا۔ کہا حضور اب تو انعام دلوا دیجیے۔

بہار۔ ہاں اماں جان بیشک صحیح ہے، آپ کا خواب ہمیشہ سچا نکلتا ہے اب بھی یقین نہ آئے تو کوئی کیا کرے۔
بڑی۔ بس میں نے کہا صاحبزادے کس بات کا انعام مانگتے ہو، مسکرا کر کہا، واہ حضور ملکوں ملکوں کا سفر کیا جان ہتھیلی پر لے کر سارے زمانے کی خاک چھانی اور اب انعام کے وقت حضور فرماتی ہیں کہ کا ہے کا انعام، انصاف کیجیے اور میرا انعام مجھے دیجیے۔
روح۔ یہ تو صاف صاف خواب ہے، وہ جوان آزاد ہوں گے اور انعام میں حسن آرا کو مانگتے ہونگے۔ ہم اگر خود ایسا خواب دیکھیں اماں جان تو ہم کو ضرور یقین ہو جائے کہ خواب کا اثر ہوتا ہے۔
حسن۔ (آہستہ سے) ہم تو اگر خواب دیکھیں بھی اور وہ سچا بھی نکلے، تو ہمیں یقین نہ آئے کہ خواب کا اثر ہوتا ہے۔
روح۔ ہے تو ایسا ہی یہ سب خواب و خیال ہے۔
بہار۔ چلو چپ رہو، ہاں اماں جان پھر کیا باتیں ہوئیں؟
بڑی۔ بس میں نے اس کو چاندی اور سونا اور گلاب کا پھول، ایک ہرن دیا اور کہا اب یہ امانت تمھارے سپرد ہے۔
روح۔ یہ چاندی، سونا، گلاب اور ہرن کا کون محل ہے؟
بڑی۔ بیٹا ابھی تم کیا جانو۔ چاندی سے مطلب یہ ان کا بدن چاندی سا چمکتا اور سونا اس لیے کہ کندن سا دمکتا ہے اور گلاب کا پھول ظاہر ہے۔ اللہ نے ان کو مکھڑا بھی ایسا ہی دیا ہے اور ہرن آنکھوں سے مراد ہے۔

بڑی بیگم صاحب تو اپنے خواب کا ذکر کرتی ہی تھیں کہ اتنے میں فنس سے ایک اور ضعیفہ اتریں اور انھوں نے آتے ہی مبارکباد کہہ کر اپنی کہانی یوں شروع کی (بڑی بیگم کی طرف مخاطب ہو کر) بہن جس وقت تمھارے ہاں سے مہری گئی ہیں آرام میں تھی اس نے مجھے جگا دیا تو اس وقت میں اس پر بہت جھلائی مگر اس نے وہ خبر سنائی کہ غصہ فرو ہو گیا، میں اس وقت خواب دیکھ رہی تھی کہ جیسے بہت بڑا پہاڑ ہے اور اس کی چوٹی پر ایک آدمی کھڑا ہے اور اس کو کوئی ڈھکیل رہا ہے وہ زور کر کے رک جاتا ہے مگر ایک شخص کمر باندھے مستعد ہے کہ اس بیچارے کو زمین پر گرا دے اور پہاڑ کے دامن میں حسن آرا کھڑی ہے اور وہ آدمی حسن آرا کا نام لے کر کہہ رہا ہے کہ خبردار مجھ سے نہ بولنا میں نے حسن آرا کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ مگر دوسرا شخص ایک نہیں سنتا کہتا ہے یا تو پہاڑ سے اتر جاؤ یا ابھی ابھی اس زور سے اٹھا کے پھینکوں گا کہ دھڑ سے نیچے گر دگے اور وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ حسن آرا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تو جا کے آسمان کا تارا لا میں اب زینہ لگا کے تارا اتار لاؤں تو جہاں تھا چلا جاؤں۔
بڑی۔ دیکھو، سنو روح افزا کہاں ہیں، کچھ سنا بیٹیا۔
روح۔ ہاں اماں جان سن رہی ہوں۔ سب سنتی جاتی ہوں۔
بہار۔ کیا اب بھی تم کو خواب کا یقین نہ آئے گا۔
گیتی۔ سچ کہوں مجھے تو کچھ کچھ یقین آتا چلا ہے۔
حسن۔ (مسکرا کر) کہاں تک یقین آتا چلا ہے۔
بڑی۔ ہاں بہن پھر کیا دیکھا آنکھ تو نہیں کھل گئی۔
بیگما بیگم۔ (بڑھیا کا نام) ابھی نہیں بس پھر میں نے دیکھا کہ وہ آدمی زینہ لگانے لگا تو اس بیرحم دوسرے شخص نے زینہ کھینچ لیا اور وہ بیچارہ گر پڑا۔ مگر پھر سنبھلا اور ایسا مارا کہ اس شخص کا دم پھولنے لگا۔ حسن آرا نے قہقہہ لگایا اور وہ آدمی زینے پر چڑھ کر آسمان پر گیا۔ آسمان پر ٹکٹکی لگائی تو نظروں سے غائب ہو گیا اور حسن آرا نصیب مدعیاں رونے لگی۔ کچھ دیر کے بعد آسمان سے

وہ اُترا اور ایک بڑا سا تارا ہاتھ میں لایا، پہاڑ پر اُتر کر وہ اس فکر میں تھا کہ حسن آرا کے پاس جائے کہ بس اتنے میں مہری نے آواز دی اور آنکھ کھل گئی۔

جب بڑی بیگم اور بیگا بیگم دونوں ضعیفہ خاتونیں چلی گئیں تو حسن آرا اور روح افزا اور سپہر آرا بہت ہنسیں اور بہار النسا اور گیتی آرا سے مزے مزے کی نوک جھونک ہونے لگی۔

حسن - ان سے اوسا ماں جان سے خوب بنتی ہے۔

روح - بنا ہی چاہے، یہ ایک خواب کا حال بیان کریں تو وہ دس۔ اُفوہ کتنا جما ہوا عقیدہ ہے، کچھ ٹھکانا ہے!

بہار - تمہارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے، تم تو کسی کو مانتی ہی نہیں۔ تم دونوں کی ایک رائے ہے بھلا ان کو جھوٹ بولنے سے کیا ملتا ہے؟

گیتی - کیا تعجب کیا ہے، شاید دیکھا ہو خواب۔

بہار - آخر تم کبھی خواب دیکھتی ہو یا نہیں؟ پھر اگر انھوں نے ایسا خواب دیکھا تو کون تعجب کی بات ہے۔

حسن - اُفوہ، باجی اللہ جانتا ہے، بیگا بیگم نے اس وقت ایسی برجستہ کہی کہ میں دنگ ہو گئی، میں جانتی ہوں شاید گھر ہی سے سوچتی آئی ہوں گی اور بے سوچے کہہ گئیں تو اس فن میں ان کو کمال حاصل ہے۔

گیتی - اس بات میں ہم تم سے اتفاق نہ کریں گے حسن آرا۔

بہار - تم اتفاق کرو یا نہ کرو وہ کب مانتی ہیں۔ وہ تو جو سمائی سو سمائی، بس اب وہ بات دل سے نہ نکلے گی۔

اتنے میں ایک مغلانی نے آن کے سب کی طرف مخاطب ہو کر کہا، حضور بڑی بیگم دریافت کرتی ہیں کہ آپ کو کسی کو معلوم ہے ثریا بیگم کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں۔ نازک ادا اور جانی بیگم بولیں، ہاں ہاں ہمیں معلوم ہے نواب سنجر سطوت کے ساتھ ان کا نکاح ہوا ہے رہتی تو یہیں ہیں مگر کچھ دن سے اپنے میاں کے ساتھ باہر گئی ہیں مگر آنے والی ہیں، صبح شام داخل ہوا چاہتی ہیں۔ مغلانی جواب لے گئی۔ ادھر نازک ادا نے حسن آرا کے کان میں ثریا بیگم کا حال کہا اور کہا برات کے دن وہ یہاں آئیں گی۔ اس شب کو حسن آرا بیگم اس درجہ مسرور و محظوظ تھیں، جس کا حد و پایاں نہیں۔

حسن آرا بیگم سپہر آرا کے پلنگ کے قریب ایک مسہری پر لیٹیں مگر نیند اُڑنچھو، مارے خوشی کے پلک کا جھپکانا بھی محال تھا۔ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر کروٹیں بدلتی تھیں۔ میم صاحب کا خط کا ہے کو تھا بشارت رساں تھا۔ سوچتی تھیں کہ مجھے یہ حال پہلے سے معلوم ہوتا تو خدا جانے کیا کیا کہتی اور کیا کیا پیغام بھیجتی۔ اب تک جواب بھی آگیا ہوتا لیکن ہماری بیغامبرن کے جاتیں اور ان سے پیغام کب ادا ہوتا ہے

ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اس کی
کیوں کر لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا

اتفاق سے سپہر آرا کی آنکھ کھلی تو دیکھا حسن آرا بیگم مسہری پر بیٹھی ہیں، کہا باجی جان اتنی رات آئی آپ کو نیند نہیں آتی؟ مسکرا کر جواب دیا آج نیند ہی ہم نے بھلا دیا۔ اس وقت خدا جانے کس کی یاد ہے۔

سپہر - اے ماندی ہو جاؤ گی باجی کوئی دو بجے ہوں گے۔

حسن - نیند نہیں آتی، حضرت عشق بھی عجب چیز ہیں۔ جب فراق تھا درد ہجر کے سبب سونا نصیب نہ ہوا۔ اب امید وصل ہے تو خوشی کے مارے آنکھ نہیں جھپکتی۔

سپہر - یہ تو بھی جانی بات ہے اس وقت بھی ایک قسم کی بے قراری اور بے چینی ضرور ہوگی مگر یہ بے چینی ہزار ہزار آرام سے اچھی ہے۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک　　آتش شوق تیز تر گردد

حسن - کیوں بہن جس وقت مہری نے ان کے کہا تھا کہ آزاد تو چل دیئے اور یہ خط دے گئے ہیں، اس وقت کو یاد کرو دل کا کیا حال تھا، طبیعت دگرگوں ہوئی جاتی تھی - ایک وہ زمانہ تھا کہ دل آنا اور کسی پر مرنا جانتی بھی نہ تھی اور یکایک آزاد نے ایسا افسوں پڑھ کے پھونکا کہ دل اپنے ہاتھ سے جاتا رہا - جب تک دل نہیں آیا تھا تب تک الڑھ پنے کے دن تھے مگر جب عشق کی آگ سینے میں بھڑکی تب معلوم ہوا کہ عشق کسے کہتے ہیں۔

نہ تھے ہم پیش ازیں آگاہ حالِ عشق بازی سے
نہ تھا معلوم دل آتا ہے پہلے یا قضا پہلے

سپہر - کہو خدا کو اچھا ہی کرنا تھا، نہیں تو معاذ اللہ اگر خدا نا کردہ آزاد کے پاؤں میں ذرا بھی کانٹا چبھتا تو بڑی رسوائی ہوتی۔

حسن - اس میں کیا شک ہے مگر بہن گو اس وقت تو تم ہم سے بہت خفا تھیں لیکن سچ پوچھو تو آزاد کو ہم نے آزاد پاشا بنایا۔

سپہر - ہاں اس میں کون کلام ہے، مگر باجی جان ان کی دوسری معشوقہ مس میڈا نے بھی بڑا کام کیا - ان کا احسان آزاد کی گردن پر بھی ہے اور تمھاری گردن پر بھی اگر وہ اس وقت مدد نہ کرتیں تو آزاد فوج میں بھرتی ہونے کی حسرت ہی لے کے چلے آتے اور یا تو پھر صورت ہی نہ دکھاتے۔

حسن - نہیں معلوم میم صاحب کیونکر ہوٹل میں وقت پر پہنچ گئیں۔

سپہر - ان کو ڈوہ تھی نہ وہ بڑی ڈوہی ہیں۔

حسن - کیا جانے ہماری نسبت انھوں نے آزاد سے کیا کہا ہوگا۔

سپہر - اپنی تعریف کی ہوگی اور عشق و درد ہجر کا حال اس خوبصورتی سے بیان کیا ہوگا کہ جس کا حق ہے، ایک تو ان کی طبیعت خود رنگین ہے دوسرے ان کے ہاں بے دیکھے بھالے اور بلا عشق کامل کے شادی ہی نہیں ہوتی، تیسرے تم سے اس قدر محبت کرتی ہیں، چوتھے آزاد کی بہادری اور حسن کی ہمیشہ تعریف کیا کرتی ہیں - پھر انھوں نے آپ کی وکالت کیوں نہ کی ہوگی۔

بہر کجا کہ روم وصف دوستاں گویم　　برائے یار فروشے دوکاں نمی یابد

حسن - ہاں خوب یاد آیا، اماں جان نے ثریا بیگم کا حال کیوں دریافت کیا تھا - ایک مس میڈا ہو تو خیر، میں دیکھتی ہوں کہ ہر شہر میں کوئی نہ کوئی مہ پارہ پری چہرہ آزاد کی دلدادہ و شیفتہ ہے اور اگر ان سب پر وہ بھی ریجھے ہیں تو خدا ہی حافظ ہے پھر ہم سے نہ بنے گی۔

نہ شاید چو بس با ختن با گلے　　کہ ہر با مداوش بود بلبلے

سپہر - اب تو یہ بدگمانی ہے - وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہ تھی یہ کاہے سے معلوم ہوا کہ ثریا بیگم بھی ان پر ریجھی ہوتی ہیں۔

حسن - دریافت کاہے کو کیا تھا پھر آخر اور سنو تو وہ اللہ رکھی کہاں ہے اس کا پتہ نہ لگا کہ وہ کہاں چل دی۔

سپہر - باجی جان اگر برا نہ مانئے تو کہوں، اس سے تو ہم کو بھی ہمدردی تھی، اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ آزاد پر جان نثار کرنے کو مستعد ہے۔

حسن - تم کسی ترکیب سے کل سویرے اماں جان سے پوچھنا کہ اماں جان جس وقت بیگما بیگم آئی تھیں آپ نے ثریا بیگم کا حال کیوں

دریافت کیا تھا۔

سپہر۔ اے باجی دور کیوں جاؤ، نازک ادا بیگم سے پوچھ لو، ان کو سارا حال معلوم ہے، کہتی نہ تھیں کہ نواب سنجر سطوت سے ان کا نکاح ہوا ہے۔ سویرے ہم انہیں سے پوچھ لیں گے۔

حسن۔ بات یہ ہے کہ میڈ نے تو احسان کیا ہے اس کو تو آزاد جس قدر چاہیں اور پیار کریں بجا ہے مگر اور کا نام ہمارے سامنے نہ لیں۔

سپہر آرا کو اللہ رکھی کا حال خوب معلوم تھا کہ آزاد کی روانگی کے بعد وہ جوگن ہو گئی اور ٹھان لی ہے کہ جب تک آزاد واپس نہ آئیں گے اسی حالت میں رہے گی، سوچیں کہ حسن آرا کو اس حال سے اطلاع دیتی ہوں تو یہ اور کھٹکیں گی کہ مبادا اس نوجوان خوبرو کی وفاداری کی کیفیت اور اس درجہ محبت آزاد کے دل میں کوئی اور خیال پیدا کرے اور مس میڈا کے علاوہ اس کو بھی عقد نکاح میں لائیں۔ حسن آرا سے کہا سچ کہتی ہو۔

حسن۔ میڈا کے ساتھ شادی کا جو اقرار کیا اس میں تو مجبوری تھی اور اس میں ہمیں بھی شکوہ سنجی کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ میڈا کی عنایت اور حمایت کے بغیر کام نہ چلتا، مگر یہ ممکن نہیں کہ آزاد ہمارے عاشق زار وفادار ہو کر ایسی ویسی پر نظر ڈالیں یہ ہمارا خیال خام تھا، سچ ہے ع

عشق ست و ہزار بدگمانی

مگر ہم اپنی پسند اور اپنی شناخت پر جس قدر ناز کریں بجا ہے ع

معشوق کیسے تو پری زاد کیسے

آزاد وہ آئینہ طلعت جوان رعنا ہے جس پر ہندوستان سے اتصال روم و روس تک اچھی اچھی زاہد فریب عورتیں دیکھتے ہی ہزار جان سے شیدا ہو گئیں۔

زیر سفیش بہفت خرگاہ　　صد تیغ و ترنج بر کف ماہ

صد صبح بہار در جبینش

صد دستہ چمن در آستینش

سپہر۔ جو عورت دیکھتی ہو گی اللہ گواہ یہی کہتی ہوگی کہ یا خدا یہ جوان شیر اندام و گلفام کس خوش نصیب خاتون فرخ طالع کا زیب آغوش ہوگا۔

حسن۔ پولینڈ کی شہزادی صرف تصویر پر تنویر دیکھ کر اس قدر ریجھ گئی واقعی اپنے وقت کا یوسف ہے۔ اب اس میں ذرا شک نہیں رہا جو غمزہ خوش روح کے ساتھ کرتا ہے، وہ آزاد کا نظارہ جمال انسان کی آنکھوں کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ حسن بھی ہائے بیدل ہے۔

سپہر۔ اب آج رات کو آپ کو نیند نہ آئے گی۔

حسن۔ اب رات ہے کہاں، کوئی دم میں سپیدۂ صبح نمودار ہوا چاہتا ہے، ہم سنا کرتے تھے بہن! عاشقوں کی رات کاٹے نہیں کٹتی، مگر یہ معلوم ہی نہ تھا کہ خود وصل بھی شب ہجر سے کم نہیں۔ اکثر راتوں کو آزاد جب یاد آتے تھے اور میں بیقرار ہو جاتی تھی، سوچا کرتی تھی کہ یا خدا جس شب کو آزاد کے مع الخیر واپس آنے کا مژدہ بہجت خیز سنیں گے کس مزے کی نیند آئے گی، جیسے کوئی

گھوڑے بیچ کے سوتا ہے۔ آج خدا نے یہ خوش خبری سنائی ہے تو نیند نے ہوا بتائی ؎

آں شوخ چناں ربود از من گوئی کہ دلم نہ بود از من

ایک دفعہ مجھ سے کسی قدر روٹھ گئے تھے تو میں نے مسکرا کر کہا بندہ پرور یہ بے اعتنائی اور کج ادائی خدا کی شان۔ آپ بھی اتنے ہوئے کہ ہم مہرو الطاف سے پیش آئیں اور آپ روٹھیں۔ اس کے جواب میں کہا۔ شانِ خدا ہم ایسے گئے گذرے ہوئے۔

سپہر۔ نسان اور متفرق تو پرلے سرے کے ہیں۔

حسن۔ اس میں کیا فرق ہے باتیں بھی ویسی ہی اور لگاوٹ بازی بھی ویسی ہی اور دلربائی اور شان ادا آن بان سب دل چھین لینے میں طاق ہیں ایک سے ایک بڑھ کر اور میں بالکل ناآزمودہ کار ؎

اب تلک صدمۂ الفت سے نہیں ہوں آگاہ کچھ بھی دشوار نہیں میری گرفتاری آہ
کوئی دلدار بھر اور کوئی اداۓ دلخواہ بہ تکلم بہ خموشی بہ تبسم بہ نگاہ
میتوان برد بہر شیوہ دل آسان از من

سپہر۔ افوہ، واقعی جب مہری نے آن کے کہا تھا کہ چلے گئے تو مجھے اس قدر قلق ہوا تھا کہ دل ہی جانتا ہے۔

حسن۔ مگر میرے استقلال طبع کی تعریف نہ کرو گی، کیوں سچ کہنا بہن تم نے لاکھ سمجھایا اور ہزاروں دلیلوں سے، منت سے سماجت سے کہا مگر میں نے ایک نہ سنی۔

اتنے میں نازک ادا بیگم کی آنکھ کھل گئی۔ کہا بھئی اللہ یہ کیا بک بک لگائی ہے۔ پچھلے سے بکتے بکتے یہ وقت آیا۔ زبان کیا کترنی ہے۔ ولایت کی مقراض ہے کہ رکتی ہی نہیں۔

حسن۔ تم تو ایسا سوئیں کہ کل تک اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتیں۔ اب سویرے جو آنکھ کھلی تو یہ نخرے۔

نازک۔ تم کو آج بھلا کہاں نیند آتی۔

حسن۔ پھر یہ تو ہئی ہے۔ آج بھلا سونے کا کون موقع تھا۔

نازک۔ مجھے بڑی ہنسی آتی ہے جب میں سنتی ہوں کہ حسن آرا راتوں کو خدانخواستہ رویا کرتی ہیں۔

حسن۔ کسی پر دل آیا ہوتا تو قدر وعافیت معلوم ہو جاتی ؎

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

سپہر۔ ہے تو سچ بہن، دل آنا ستم ہے بخدا۔

حسن۔ پھر بھلا آپ کے ہنسنے کی کون بات ہے دل ہی تو ہے جب ہجر یار نے ستایا تو خواہی نخواہی آنسو آنکھوں سے جاری ہو جائینگے۔

نازک۔ چلو اب تو خداوند کریم نے تمھاری سُن لی۔

حسن۔ شکر ہے اُس کا مستجاب الدعوات نے ہماری دُعا قبول کر لی اور آزاد کو بھی سرخرو کیا۔ ورنہ کئی بار ہمیں یوں ہی سی امید رہی تھی۔ اس وقت ہمارا دل بے قابو ہو گیا۔

نازک۔ ہُوا ہی چاہے۔ یہ تو قاعدہ ہے بہن۔

سپہر۔ بارے بخیر گذشت خدا نے سُن تو لی۔

حسن۔ اس دن البتہ ہمارا دل بہت مغموم ہوا تھا جب ہم نے سنا تھا کہ ایک عورت کے ساتھ آزاد نے نکاح پڑھوا لیا۔

سپہر۔ مگر وہ تو طوفان اُٹھا یا اور مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ آزاد روم میں جا کر کسی ایسی ویسی کی طرف طبیعت مائل کرے۔
نازک۔ اے توبہ یہ اُن ہونی بات تھی منزلوں کیا معنی بلکہ برسوں کی راہ طے کرکے دور و دراز ملک میں جائے اس سے یہ امید کیونکر ہو سکتی ہے کہ وہاں جا کے کسی اور پر ریجھے، جو لوگ اس قطع کے ہوتے ہیں وہ اتنی دور نہیں جایا کرتے۔
حسن۔ مگر اس وقت خدا جانے ہمارے دل کو کیا ہوا کہ بے اختیار رونا آگیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ مُردنی چہرے پر چھا گئی۔
سپہر۔ اُس دن تو باجی جان خاتون جنت کی قسم بڑا غضب ہو گیا تھا، ڈاکٹروں اور حکیموں تک کی نبضیں ڈھیلی ہو گئیں۔ اچھے اچھوں کے رُخ چھوٹ گئے مگر خدا نے بڑی کرمی کی۔
نازک۔ تب تک ہم سے تم سے اس قدر ربط نہیں تھا، مگر ہم نے سنا تھا کہ حسن آرا بیگم کی طبیعت درجۂ اعتدال سے متجاوز ہے اور پھر سننے میں آیا کہ ڈاکٹروں نے خدانخواستہ جواب دے دیا۔
حسن۔ جواب تو دے ہی دیا تھا ان طبیب موذں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب نہ بچیں گی مگر ڈاکٹروں نے اُن کے مسیحائی کی اور ہمیں جلا لیا۔ خدا جانے کون عرق دیدیا، عرق کیا تھا آب حیات تھا، پہلے دس قطرے پانی کے ساتھ پیے پھر آدھ گھنٹے کے بعد دس قطرے اور استعمال کیے۔ خدا کی عنایت سے آنکھیں کھول دیں، سب کی جان میں جان آئی، رونا پیٹنا شروع ہو گیا تھا۔
نازک۔ دیکھیں آزاد پاشا سے کیسی باتیں ہوتی ہیں۔
حسن۔ اللہ جانتا ہے اگر اُن کی تقریر سُن لو تو برسوں نہ بھولو۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔
نازک۔ اللہ، اللہ، اور ہمارے میاں کی تقریر سُنو تو یہ معلوم ہو کہ باغ کے باغ منہ سے جھڑ رہے ہیں۔
حسن۔ واہ آزاد کا تکلم و تبسم اور کج ادائی و دلربائی، خدا جانتا ہے بہن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ہزاروں میں ایک بانکا نوجوان ہے۔ اچھا اپنے میاں کا اور ہمارے آزاد کا ایک دن مقابلہ کرو۔
نازک۔ اچھا جو خوبصورت ہو وہ دوسرے کی بیوی کو چھین لے۔
حسن۔ واہ بہن، مطلب یہ کہ ہم سے سوتیا ڈاہ پیدا کرو گی، پھر صاف صاف یہی کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ آزاد پر تمہارا بھی دل آیا ہے۔
نازک۔ اچھا خیر یوں ہی سہی کیا مضائقہ ہے۔
حسن۔ اب نیند آتی ہے ارادہ ہے کہ نماز پڑھ کے ذری سو رہوں ورنہ طبیعت بہت بے چین رہے گی۔
نازک۔ اچھا اب بہن نماز پڑھو اور سو رہو۔

دوسرے روز ساری خدائی میں مشہور ہو گیا کہ سپہر بسالت و ہمدردی کے تابندہ اختر مشرقستان جمعیت و حب الوطنی کے مہر منور آزاد فرخ نہاد مع الخیر والعافیت بعد حصول فتح و فیروزی نام کرکے روم سے واپس آئے صبح سے بارہ بجے تک ہوٹل میں وہ اژدحام عام تھا کہ تِل رکھنے کی جگہ نہ تھی، تھالی اچھالی جاتی تو سر ہی سر جاتی۔ شہر بھر کے لوگ جمع۔ تانتا لگا ہوا تھا جس نے سُنا فرط اشتیاق سے سر کے بل گیا۔ مس میڈا اور کلیر سا خوش و خرم کہ آزاد کے ہموطن اُن سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی دلی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ وفور جوش سے اکثر آدمیوں نے آزاد کے قدم لیے اور بڑھ بڑھ کے تعریفیں کرنے لگے کہ واہ رے سورما مردان مرد شیر دل کا کیا کہنا ہے۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

یہ تمہارا ہی کام تھا بھائی جان۔

حافظ۔ آج جدھر جاؤ آزاد ہی آزاد کا چرچا ہے۔
شیخ۔ ہُوا ہی چاہے، برسوں کے بعد خدا نے یہ دن دکھایا۔ بچھڑے ہوؤں کو ہم سے ملایا ہے۔ جس آزاد کی تصویریں دیکھ دیکھ کر دل کو ڈھارس دیتے تھے اس کو آج روبرو دیکھ رہے ہیں اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہوگی۔
سیّد۔ جی کیسی خوشی! شادی مرگ ہو جائے تو عجب نہیں، خوشی کیا شے ہے۔ یہ شخص اس قابل ہے کہ اس کے پاؤں دھو دھو کے پیجے۔
جماعت۔ (متفق اللفظ ہو کر) اس میں کچھ شک بھی ہے۔
آزاد۔ آپ سب صاحبوں کی ہمدردی کا شکریہ۔ مگر میں نے تو صرف اپنا فرض ادا کیا اور وہ بھی خالی از طمع نہیں۔ ایک تو یہ خیال تھا کہ حسن آرا بیگم محظوظ ہوں گی اور اس کارگزاری کے بدلے میں اُن سے ہم آغوشی نصیب ہوگی، دوسرا خیال یہ تھا کہ برادران دینی اور ملک کے کام آؤں گا جو عین ذریعہ مغفرت سمجھا گیا ہے۔ ان دونوں خیالوں نے مجھے اور بھی پر چک دی۔
حافظ۔ دو لاکھ خیال ہوں، جب دل مضبوط نہیں کچھ نہیں ہو سکتا، پہلے دل تو ایسا مضبوط کرے اور اللہ رے استقلال، کچھ ٹھکانا ہے، استقلال کی بھی کوئی حد ہے، یہ آزاد ہی کا کام تھا۔
سیّد۔ وہیں چوشک تب تو آج طوطی بولتا ہے۔
ایک۔ اس وقت کوئی حسن آرا بیگم کے دل سے پوچھے۔
دوسرا۔ میرے دل کی بات کہی، واللہ سچ ہے۔
تیسرا۔ حضرت ہم کو تو امید نہیں تھی کہ آزاد پاشا زندہ آئیں گے۔ ہم تو مایوس ہو گئے تھے مگر خدا کی کریمی کے صدقے کہ یہ روزِ سعید دیکھا۔
چوتھا۔ اس اقبال کو دیکھیے کہ جس جنگ میں شریک ہوئے فتح ہی پائی جس سے مقابلہ کیا اس کو نیچا ہی دکھایا۔ کبھی کسی سے دب کے نہ رہے آج تک۔
پانچواں۔ بھائی صاحب اس شکل و صورت کا آدمی ہر دلعزیز ہی ہوتا ہے آدمی کیا ہے پری ہے، حسن ہے اور صورت دیکھیے تو شریف جو انمرد اور خوبرو ہے

زلف کو دیکھ کے سنبل ہے پریشاں کیسا　　اس کا منہ دیکھ کے آئینہ ہے حیراں کیسا
تم کو اے قافلہ والو مہ کنعاں کی قسم　　میرے یوسف کا ہے یہ چاہِ زنخداں کیسا

قامتِ سرو پہ ہے ناز تجھے اے قمری
دیکھ تو ہے یہ مرا سروِ خراماں کیسا

مَیڈرا۔ (مسکرا کر) یہ بھی ہم کو خواجہ کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔
کلیرسا۔ (زیرِ لب مسکرا کر) بھائی، بڑا بھائی کہو۔
آزاد۔ کہاں تو باتیں کر رہے تھے کہاں ایسے مزے میں آئے کہ گانے لگے، بیشک خوجی کا بڑا بھائی ہے۔ خواجہ صاحب اس وقت آرام کر رہے ہیں (ہوٹل والے سے) ذرا ان کو جگا تو دو۔
اتنے میں خواجہ صاحب آنکھیں ملتے ہوئے برآمد ہوئے اور مجمع غفیر دیکھ کر آواز بلند للکارے۔ ایں! ایں جماعت بہ

چہ باایں موم سازش برائے ہر جگے نمودہ بودہ یا اندچہ۔
آزاد۔ اجی حضرت تسلیم، واسطے خدا کے ترکی نہ بولو۔
خوجی۔ (مسکرا کر) حضرت ہم تو فارسی الاصل ہیں۔
میڈا۔ خواجہ صاحب آپ کی جوڑ کے ایک اور بزرگوار بھی یہاں موجود ہیں۔ اب تک آپ بے نظیر تھے۔ اب آپ کا جواب بھی مل گیا۔

اتنے میں وہ مسخرالدولہ خواجہ بدیع کا بھائی پھر ہانک لگانے لگا اور خواجہ صاحب بھی چکرائے کہ من چہ فش ام برادر کلاں من بسیار فش است۔

مسخرہ۔ ایک پیسے بلکہ ایک جھنجھی کوڑی سے لے کر کرور روپیہ تک کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ آزاد کا سا جوان نہ ہوا اور نہ ہوگا اور نہ ہے ؎

راست قامت ہے کج ادا ہے وہ ٹیڑھی سیدھی نہ کیوں سنے اس کی

آزاد۔ افوہ۔ واللہ بالکل خوجی ہی ہیں۔ قد و قامت بھی ویسا ہی، بات چیت بھی ویسی ہی ہے، شکل و صورت بھی مشابہ اور برجستہ شعر تو ایسا پڑھا کہ خود خوجی جھینپ گئے ہوں گے۔
میڈا۔ (رومال لب پر رکھ کر مسکراتی ہوئی) بس ان کو چھپاؤ ان کو دکھاؤ، ان کو چھپاؤ ان کو دکھاؤ، ذرہ برابر فرق نہیں۔
مسخرہ۔ حضور مس صاحب بہادر سنیئے گا ؎

دوپٹا منہ سے سرکا یا نہ ہوتا چراغ زیر دامن کیوں بنی ہو

خوجی۔ یہ مسخرہ ہے کون۔ اور تو اور یہ عورتوں پر آوازہ کستا کیا معنی کچھ بدھا تو نہیں ہوا ہے۔
مسخرہ۔ کوئی ہم سے بڑھ کے دیکھ لے بڑا مرد ا ہوا آجائے۔
خوجی (تکرار اتول کر کیا کیا۔ برس پڑوں۔
مسخرہ۔ جا جا اپنا کام کر، جو گرجتا ہے وہ برستا نہیں۔
خوجی۔ بچہ تمہاری قضا میرے ہی ہاتھ ہے۔
مسخرہ۔ ماشہ بھر کا آدمی۔ بونے کے برابر قد اور چلا ہے ہم سے بڑانے خدا کی شان۔ اس وقت فقط محمد آزاد کا لحاظ ہے ورنہ جہان کے نقشے وہیں پہنچا دیتا۔ اکڑنا وکڑنا سب بھول جائے۔
خوجی۔ کوئی ہے لانا تو چنڈو کی نگالی لے آئیے۔
مسخرہ۔ گئے کہاں ہو جو بلاتے ہو۔ ہم تو جہاں کھڑے تھے وہیں ہیں شیر کہیں ہٹا کرتے ہیں۔ جے سوجے۔ ڈٹے سو ڈٹے۔ اب تو ہاتھی اور کتنا مست ہاتھی بھی آئے تو ہٹنا معلوم۔
خوجی۔ (کمر کس کے) قضا کھیل رہی تیری میں اس کو کیا کروں۔ اب جو کچھ کہنا سننا ہو کہہ سن لو۔ تھوڑی دیر میں لاش پھڑکتی ہوگی۔ اتنا یاد رکھنا میں ایک نہ مانوں گا۔

کیا گرم ہے خون میرا پڑے سیکڑوں چھالے پیدا ہوئی ظالم تیری تلوار میں گرمی!

مسخرہ۔ میں بھی ایک نہ مانوں گا ڈٹا سو ڈٹا بس۔

گر نہ ہو بیم خزاں دل میں نہ امید بہار پھر تو نخل نا امیدی میں ثمر پیدا کروں

راوی - بہت ہی خاصے اچھے ملے، دونوں بے ٹنکے۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو   خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

دونوں اچھے ملے، جواب ترکی بہ ترکی کوئی کم نہیں۔

خوجی - تیرے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں پر رحم آتا ہے۔

یاد آیا مرا تن پُر داغ   اس نے جب لالہ زار کو دیکھا

مسخرہ - ننھے ننھے ہاتھ پاؤں کے بھروسے نہ بھولنا نہیں تو۔

بیخودی میں گل و سنبل کو جو دیکھو تو کہو،   رُخ گلرنگ یہ ہے زلف گرہ گیر یہ ہے

راوی - اچھی جوڑ پھڑ کی، ہمرنگ کی دو دن ہے۔

آزاد - آپ دونوں صاحب کیوں لڑے مرتے ہیں، خواہی نخواہی دونوں کے چہرے سے شرافت برستی ہے مگر خدا جانے اس جنگ زرگری اور پاجی پن کی باتوں سے کیا ملتا ہے۔

مسخرہ - ذری زبان سنبھالے ہوئے حضرت اس کو پاجی بنایئے مگر بندے کی طرف خطاب نہ فرمایئے گا، سمجھے!

خوجی - اس پاجی کو ہزار بار پاجی کہیے گر بھلے مانسوں کو اس میں شامل نہ کیجیے گا، پاجی کوئی اور ہوتے ہونگے۔

ہوٹل میں جتنے کھڑے تھے سب کو شگوفہ ہاتھ آیا اور بڑے شوق سے ان دونوں بونے کو تہ باچہ پہلوانوں کی کشتی دیکھنے کے منتظر تھے کہ اب چلی اور اب چلی، یار لوگ آپ جانیئے ایک ہی نقرہ باز، آوازہ کسنے لگے تاکہ دونوں جھلائیں اور آپس میں خوب دھول دھپا ہو۔

ایک - بھئی ہم تو ان کی طرف ہیں - (خوجی کی جانب)

دوسرا - ہم بھی، یہ ان سے کہیں سکت دار ہیں۔

تیسرا - کون واہ، کہیں ہوں نہ ان میں ان میں بیس اور سولہ کا فرق ہے چاہے بدلو، بولو کیا بدتے ہو!

چوتھا - اجی ان سے کیا کہتے ہو ہم سے بدو ہم ان کے ہاتھ پر بدتے ہیں (مسخرے کیطرف) ایک روپیہ سے تا بہ سو تک مار دہا تھ۔

خوجی - جس کا روپیہ فالتو ہو وہ ان کے ہاتھ پر بدلے اور جو کچھ گھر بنا لے جانا چاہے وہ ہمارے ہاتھ پر بدلے بس یہ اشارہ کردیا ہے۔

مسخرہ - ایک پوٹے میں بول جائے تو سہی - بات کرتے کرتے پکڑ لاؤں اور چٹکی بجاتے چت کروں یوں یوں (چٹکی بجا کر)

خوجی - تا - اتنی دیر خواجہ بدیعا نہ لگائیں گے۔

مسخرہ - تم تو پڑے ہو گے گھوڑے پر اتنی دیر میں - تم اور مقابلہ مردان جنگی کرو، یہ منہ کھائے چولائی ایک انگلی سے وہ پیچ باندھوں کہ تڑپنے لگو۔

لیا جس نے ہمارا نام مارا بیگنہ اس کو   نشاں جس نے بتایا بس وہ تیروں کا نشانہ تھا

آزاد - بڑھ گئے خواجہ صاحب - یہ آپ سے بڑھ گئے، اب کوئی برجستہ شعر فرمایئے تو عزت رہے ورنہ اسی دم ڈوب گئی - جی حضرت دل لگی نہیں ہے۔

خوجی - اجی اس سے اچھا شعر اور حسب حال۔

تڑپا نہ تہ خنجر میں ذرا سر اپنا دیا شکوہ نہ کیا   تھا پاس ادب جو قاتل کا یہ بھی نہ ہوا وہ بھی نہ ہوا

مسخرہ۔ (لنگ کس کر جنگ کے لیے آمادہ ہو گیا) او بے ادب۔
خوجی۔ (کتارہ رکھ کر) دیکھو تیری قضا آگئی ہے۔
مسخرہ۔ معلوم ہو جائے گا کس کی قضا آئی ہے۔ ذرا سامنے آؤ تو ایک جھپٹ میں زمین میں سرکھونس دوں، بس ایک ہی جھپٹ میں جی۔
خوجی اور مسخرالدولہ دونوں کے سر پر جنون سوار ہوا اور دونوں نے ٹھان لی کہ ضرور کشتی کریں گے۔ یہ سمجھے تھے کہ مسخرہ کیا مال ہے، چھٹتے اٹھا کے دے ماروں گا۔ وہ کہتے تھے ایسے ایسے بونوں کو نیچا دکھانا کون بات ہے، اشارے میں لڑا دوں اور جھٹ مرکر ڈالوں، اس کی اصل وحقیقت کیا ہے۔
اتنے میں خواجہ بدیع الزماں پہلوان خم ٹھونک کے آگے بڑھے۔
خوجی۔ (خم ٹھونک کر) اب بھی کہا مان، نہ لڑ۔
مسخرہ۔ (ڈنڈ پیل کر) یا علی مدد، مدد کن خدایا۔
خوجی۔ آؤ خواجہ بدیع تم بھی دس ڈنڈ کرلو۔
مسخرہ۔ بس اب ڈنڈ مگدر رہنے دو اور آن کر جھپٹ جاؤ، ہمت مرداں مدد خدا، قدم درویشاں رد بلا۔

بال سا آنکھوں میں کھٹکا کیا میری شب بھر یاد موئے کمر یار نے سونے نہ دیا
جلد تلوار اٹھائی مرے سر پر رکھ کر سایۂ تیغ میں بھی یار نے سونے نہ دیا
ہجر میں سوتے تو کیا وصل میں منہ دکھلاتے خیر گذری جو غم یار نے سونے نہ دیا
قبر میں جن کو نہ سونا تھا سلایا ان کو
پر مجھے چرخ ستمگار نے سونے نہ دیا

خوجی۔ اب اس وقت شعر و شاعری سے کیا واسطہ!
آزاد۔ جاؤ بھی شاعری میں تو تم بالکل دب گئے۔
خوجی۔ کون؟ واہ خوب سمجھے حضور۔ اے حضرت!

خلاقی مضمون کا ہے سب کو دعویٰ کھل جائے جو چندے میں زباں بند کروں

خواجہ صاحب شعر پڑھنے میں مصروف تھے کہ اتنے میں مسخرے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً لٹ پٹا اور گردن میں ہاتھ دے کر قریب تھا کہ زمین پر دے پٹکے مگر خواجہ صاحب سنبھلے اور جھپٹ کے مسخرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کے کہا، یہ پنجہ قضا دست اجل ہے۔ اب یہیں ڈھیر ہو گئے بس یہیں کی مٹی بدی تھی تجھے) ان کی گردن زور سے ہلا کر کہا کہ میاں بس اب تم کو ہم مرحوم کہیں گے۔ تم مرے میں داخل ہوئے۔
خوجی۔ (دانت پیس کے جھٹکا دیکر) او لے گا۔
مسخرہ۔ (گدا جا کر) لے اور لے گا اور لے۔
خوجی۔ (گھونسا دے کر) اور ایک لیتا جا اور ایک اور۔
مسخرہ۔ (دانت کٹکٹا کر) آج تجھے جیتا نہ چھوڑنے کا۔
خوجی۔ ہوش کی دوا کر۔ دیکھ ہاتھ لوٹا تو نالش کروں گا۔ کشتی میں ہاتھا پائی کیسی، بدتمیز بے شعور۔

راوی۔ سچ تو ہے کشتی میں ہاتھا پائی سے کیا واسطہ!

مسخرہ۔ ہاں، ہاتھ ٹوٹتا تو نالش کردو گے۔ اپنی بڑھیا کو بلاؤ کوئی لاش پر رونے والا تو ہو تمھاری۔

خوجی (جھلا کر) یا تو قتل ہی کریں گے یا قتل ہوں گے۔

مسخرہ۔ اور ہم قتل ہی کر کے چھوڑیں گے۔

اتنے میں خواجہ صاحب نے ایک آنٹی بتائی تو مسخرہ گرا مگر پٹ اور خواجہ صاحب بھی اس سے الگ منہ کے بل زمین پر آرہے۔ اب نہ یہ اُٹھتے ہیں نہ وہ، دوسری بار خواجہ صاحب نے مسخرے کو چنگنی تبائی اور نیچے پکڑ لائے تو مسخرے نے فوراً ان کی گردن دبالی۔ اب ادھر خوجی تڑپ رہے اُدھر مسخرہ نیچے دبا ہوا ہے نہ وہ ان کی گردن چھوڑتا ہے نہ یہ اس کو چھوڑتے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے داؤں کی گھات کر رہے ہیں۔

مسخرہ۔ مار ڈال مگر میں گردن نہ چھوڑوں گا۔

خوجی۔ تو گردن مروڑ ڈال مگر میں ادھ مرا کر کے چھوڑوں گا، گردن چاہے مُرنڈا ہو جائے مگر ہیں ڈالوں گا۔

مسخرہ۔ (گردن زور سے دبا کر) اب بتاؤ بچہ جی!

خوجی۔ (خوب دبا کر) اس کا جواب یہ ہے سمجھا اُس کا جواب یہ تھا۔ ہائے گردن گئی گئی گردن، موت کا سامنا ہے۔

مسخرہ۔ ارے مرا، جان گئی، پسلیاں چرچر بول رہی ہیں۔

خوجی۔ ہرچہ بادا باد جو کچھ ہو سو ہو کچھ پروا نہیں ہے۔

مسخرہ۔ یہاں کس کو پروا ہے، کوئی رونے والا بھی نہیں ہے۔

اتنے میں خوجی نے گردن چھڑائی اُدھر مسخرہ مٹا نکل بھاگا اور خوب تالیاں بجیں، دونوں سمجھتے تھے کہ ہم شیر ہیں۔

خوجی۔ (اپنی گردن دبا کر) اُوہ واللہ میں ہی ایسا بے حیا تھا کہ گردن بچ گئی ورنہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی، واہ رے ہم۔

مسخرہ۔ اور ہم کس سے کہیں میرا ہی سا پاجی تھا کہ اتنی دیر تک برداشت کی ورنہ دوسرا اب تک کب کا بول چکا ہوتا۔ اب یار لوگوں نے پھر فقرے چست کیے اور دونوں کو تیار کرنا شروع کیا۔ ایک صاحب بولے بھئی ہم تو ان کے دم کے قائل ہیں، دوسرے نے کہا واہ اگر کچی آدھ گھڑی اور کشتی رہتی تو وہ مار لیتا۔ تیسرے نے کہا، اچھا اب کی سہی، کیا کسی کا دم تھوڑا ہی ٹوٹا ہے۔

یار لوگ تو ان کو تیار کراتے مگر ان میں دم نہ تھا، آدھ گھنٹے تک دونوں ہانپا کیے مگر زبان چلی جاتی تھی اور اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے دونوں نہیں چوکتے تھے۔

خوجی۔ اک ذرا اور دیر ہوتی تو پھر دل لگی دیکھتے۔

مسخرہ۔ ہاں بیشک دل لگی دیکھنے کا جب ہی موقع تھا۔

خوجی۔ خدا کا شکر کرو بچ گئے ورنہ منہ بگاڑ دیتا۔

مسخرہ۔ اب تم اس فکر میں ہو کہ میں پھر اُٹھوں۔

خوجی۔ کیوں ہڈیاں چلچلاتی ہیں، آٹھوں پہر

مسخرہ۔ میرے دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں پر نہ جاؤ

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست   شاید کہ پلنگ خفتہ باشد!

نقرہ بازوں نے دیکھا کہ پھر لڑائی کے قابل ہوئے تو فقرے چُست کرنا شروع کیے۔

ایک - خواجہ صاحب میں تو دم ہی نہیں باقی ہے۔

دوسرا - واہ! ان کا بدن چُور ہے۔

تیسرا - اچھا پھر تم ان کے ہاتھ پر بدو ہم ان کے ہاتھ پر بدتے ہیں، دیکھا نہیں تھا کس ترکیب سے پکڑ لائے تھے؟ ہاتھ ملتے ہی پکڑ لائے تھے - اک ذرا دیر اور ٹھہر تے نا تو دم ہی نکل جاتا۔

چوتھا - ہم تو ان کے قائل ہیں اتنی دیر تک گردن دبی رہی مگر ذرا چوں تک نہ کی، اف تک نہیں، وہی تیور وہی خم دم۔

پانچواں - واہ تعریف ان کی کرو، چٹکی بجاتے پکڑ لوئے۔

خوجی - یہ بات، اجی ہم نے مصر تک کے پہلوانوں کو تو نیچا ہی دکھایا یہ بیچارے کس کھیت کی مولی ہیں، جو دیکھتا ہے عاشق ہو جاتا ہے۔

دم پھڑک جائے جسے سنتے ہی تقریر یہ ہے دیکھے تو جی ہی نکل جائے نگہ تیر یہ ہے
قتل ہونگا میں ترے ہاتھوں سے یہ لکھا ہے جوہر تیغ نہیں ہے خطِ تقدیر یہ ہے
دیکھتے رہتے ہیں ہم خواب پریشاں اکثر پیچ میں آئیں گے اس زلف کے تعبیر یہ ہے

خط ہُوا اشک رواں پنجۂ مژگاں قاصد
چشم گریاں ترے مضمون کی تاثیر یہ ہے

آزاد - اب زیادہ بکھیڑا نہ بڑھاؤ، قصہ مختصر کرو۔

مسخرہ - حضور میں بے نیچا دکھائے نہ رہوں گا۔

خوجی - (بڑھ کر) آؤ دکھاؤ نیچا رہا تھا پائی ہونے لگی۔

مسخرہ - ابے تو گردن تو چھوڑ گردن چھوڑ دے ہماری۔

خوجی - اس دفعہ تم نے گردن پکڑی تھی، اب کی ہمارا داؤں ہے۔

مسخرہ - (تھپڑ لگا کر) ایک (دُوسرا گن کر) دو۔

خوجی - (چپت دے کے) تین تین۔

مسخرہ - (گدے پر گدا جما کر) چار پانچ۔

نقرہ باز - سو تک گن جاؤ یوں ہی - ہاں پانچ ہوئیں۔

دوسرا - ارے یار بڑا غضب ہے، ایسے ایسے جوان اور پانچ ہی تک گن کے رہ گئے، ہاں چھ کی آواز آئے چھ کی۔

خوجی - (جھلا کر چپت دی) چھ - چھ اور نہیں تو بڑی دیر سے لوگ مشتاق تھے کہ چھ کی آواز نہیں آتی اور میرے دل میں بھی خلش تھی آخر خدا خدا کر کے

یاد مژگاں سے نہ آنکھوں میں مرے نیند آئی آہوؤں کو خلش خار نے سونے نہ دیا

اس مرتبہ وہ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور اس قدر گدا چلا کہ دونوں بیدم ہو کے گر پڑے اور رونے لگے۔

خوجی - با بائے من بدیع آزاد، بندہ مردنی ترب۔

مسخرہ۔ اف بے موت مرے، آئے تھے تو آزاد پاشا کو دیکھنے یہاں اس مسخرے سے چمٹ پڑے، لاحول ولا قوۃ۔

خوجی۔ آزاد بھائی ہمارا مزار کسی پوست کے کھیت کے قریب بنوانا۔

مسخرہ۔ آزاد پاشا سلامت۔ ذرا ہماری بھی سنیئے ہماری قبر شاہ فصیح کے تکیے میں بنوائی جائے جہاں ہمارے والد ماجد خواجہ بلیغ الزمان دفن ہیں۔

خوجی۔ (چونک کر) کون، کون؟ ان کے والد کا کیا نام تھا؟

آزاد۔ خواجہ بلیغ الزمان کہتے ہیں، آپ کے نام سے ملتا ہے۔

خوجی۔ (گریہ وزاری کرکے) بھائی ہمیں پہچانا، میں خواجہ بدیع الزمان ہوں۔ مگر ہماری تمھاری یوں ہی بدی ہوئی تھی۔

مسخرالدولہ نے جوان کا نام سُنا سر پیٹ لیا، کہ بھائی یہ کیا غضب ہوا ارے کیا ستم کیا قیامت کا سامنا ہے۔ ہائے افسوس وائے افسوس حقیقی بھائی حقیقی بھائی کو مارے اور قتل کر ڈالے، اُف غضب کا سامنا ہے۔

آزاد پاشا نے کہا ہم تو تعجب میں تھے کہ خوجی کی اُن کی صورت اس قدر کیونکر ملتی ہے، وہی ہاتھ پاؤں وہی قد و قامت بالکل ایک اور باتیں بھی ویسی ہی، کسی امر میں ذرا فرق نہیں۔ بعینہٖ ایک سے۔ آپ کا کیا اسم مبارک ہے؟ اس نے کہا۔ بندے کو خواجہ رئیس الزمان کہتے تھے۔

آزاد۔ یہ کہتے تھے کیا معنی۔ کہتے ہیں یا کہتے تھے؟

مسخرہ۔ کہتے تھے، اب تو ہم مردوں میں شامل ہیں نہ۔

آزاد۔ تو حضرت آپ مردوں میں شامل۔ ہم تو مردوں میں شامل نہیں ہیں، جو لوگ آپ کو خواجہ رئیس الزمان کہتے ہیں وہ تو مُردے نہیں ہیں۔

مسخرہ۔ جناب اس وقت ہوش بر جا نہیں ہیں واللہ۔

خوجی۔ ارے بھائی ہوش کہاں حواس کہاں۔ دو دو رنج۔ ایک تو یہ کہ اپنی جان گئی، دوسرے یہ کہ بڑا بھائی ہمارے ہاتھ سے قتل کیا جاتا ہے اور کیا جاتا ہے کیا معنی قتل کر ہی ڈالا۔ بھائی صاحب آپ بزرگ ہیں، خطا معاف، قصور معاف کیجیے۔

مسخرہ۔ بھائی ہمارے ہاں تو ہوتی ہی آئی ہے۔

خوجی۔ ہائے کیا بات ہے، یہ پرانے زخم ہیں۔

مسخرہ۔ اپنے بڑے بھائی خواجہ لطیف الزمان کو ہم نے قتل کیا اور والد مرحوم کو انھوں نے مار ڈالا تھا، یہ کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔

آزاد۔ کیا آپ کے بڑے بھائی آپ ہی کے ہاتھ سے مقتول ہوئے تھے؟

مسخرہ۔ جی ہاں حضرت۔ میں ایسا ہی بدبخت ہوں، بڑے بھائی کو قتل کیا، چھوٹے بھائی کے ہاتھ سے مقتول ہوا، اب تجہیز و تکفین کی فکر کیجیے۔

اتنے میں خواجہ بدیع الزمان صاحب اُٹھ کر خواجہ بلیغ الزمان صاحب سے ملے، اور کہا بھائی اب ہم تم دونوں بڑے خواجہ صاحب کے پاس جاتے ہیں اور جناب مرحوم سے ملیں گے اور اب کیا کہوں، مگر ہم نے سنا ہے کہ مرتے وقت ذرا انسان کو ہنس دینا چاہیے تاکہ لوگ کہیں ہنستے ہنستے مرا۔

منگر کہ دلِ خواجہ بدیع پُرخوں شد منگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد

تسبیح بدست بود و افیون بدہن!
با پیک اجل خندہ زناں بیروں شد

آزاد - حضرت پہلا مصرع کس قدر موزوں کر کے آپ نے پڑھا ہے۔ ع مُنگر کہ دل خواجہ بدیع پرخوں شد، سبحان اللہ سبحان اللہ!
خواجہ بدیع اس مصرع میں عین لطف کی بات ہے۔

خوجی - بڑے بھائی، ہائے تم سے تو کچھ کہنے نہ پائے بھائی جان - ہمارا کلام تو تم نے سنا ہی نہیں، میرا ہی کلام ہے، دیکھیے فخر خاندان ہوا یا نہیں - ابا جان پڑھے لکھے تھے ہی نہیں، بھائیوں میں سب جاہل، آپ نے ذری صحبت پائی ہے، بس، شاہ کوئی نہیں بندے نے یہ کمال بھی حاصل کیا، کشتی میں برتن ہوا - روم تک ہو آیا، روس تک دیکھا - میں تو اس قابل ہوں کہ مجھے ڈبیا میں بند کر رکھے - واللہ۔

اتنے میں خواجہ رئیس الزماں بھی کلبلا کے اُٹھے اور دونوں بھائی گلے مل کے رو دئے - رئیس الزماں نے کہا بیٹا تم مجھ سے کوئی بیس برس چھوٹے ہو، تم نے اپنے باپ کو اچھی طرح نہیں دیکھا تھا - بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، ہم کو روز دکان پر لے جایا کرتے تھے۔

آزاد - کاہے کی دکان تھی حضرت پرچون کی؟

رئیس الزمان - جی ٹال تھی، لکڑیاں بیچتے تھے۔

خوجی - خ ام وش - بس ک وت لازم شد۔

رئیس - کچھ دن کیمپ میں صاحب لوگوں کے ہاں خانساماں رہے۔

آزاد - بلا در خر تو آپ ہی پر پھبتی ہوئی - آپ خر آپ کے برادر بجان برابر۔

خوجی - ار برادر خر خ ام وش باش مردک۔

رئیس - تلعی خاندان بدیعے کشاید، پدر مرحوم مردہ اندروں ز بیزدگرتشاں نمودہ۔

آزاد - پس حضرت تلعی کھل گئی قابلیت عالم بالا معلوم شد - ابا جان خانساماں اور حضور بدیع الزماں!!

خوجی - (سر پیٹ کر) ہا افسوس، یارو کیا غضب کی بات ہے، یہ اتنا بڑا تجربہ کار اور صاف صاف بک اُٹھا، افسوس۔

اتنے میں خواجہ بدیع الزماں اور خواجہ رئیس الزماں میں پیچ چلنے لگی - بڑے اور چھوٹے بھائی کی گفتگو سننے کے قابل ہے۔

خوجی - آپ نے اس وقت وہ بات کی کہ اگر جناب والد زندہ ہوتے تو اسی دم آپ کو طلاق دے دیتے، وہ حرکت ناشائستہ آپ سے سرزد ہوئی۔

مسخرہ - اور تم اتنے بڑے ناخلف ہو کہ جیتے باپ کو تم نے عاق کر دیا تھا، وہ شریر اور چھٹے ہوئے آدمی ہو۔

خوجی - آپ تو گدھے ہیں منہ پر کہنا تو خوشامد کرنا ہے۔

مسخرہ - ہم گدھے ہیں یا وہ گدھے تھے جنھوں نے تم ایسے گدھوں کو پیدا کیا ان کو گدھا کہو تو مے زیبد۔

خوجی - اچھا پنچایت سے پوچھو کون گدھا ہے۔

آزاد - حضرت آپ دونوں کے دونوں گدھے ہیں۔

خوجی - چلو بس فیصلہ ہو گیا اور ہم دونوں پہ کیا فرض ہے - ہمارا خاندان کا خاندان گدھوں سے بھرا ہے، کچھ ایک ہی گدھا تھوڑا ہی ہے۔

آزاد - خیر - ع - ایں خانہ تمام آفتاب ست۔

اس تو تو میں میں کے بعد خواجہ صاحب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ شہر کی سیر کو گئے اور آزاد سے وعدہ کر گئے کہ حسن آرا بیگم

کے گھر ضرور جائیں گے۔ اِدھر اُدھر گشت کر کے حسن آرا بیگم کے محل سپہر تو ام ان میں داخل ہوئے پیر مرد بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔

خوجی۔ سلام علیکم، پہچانا؟ ایسے جلد بھول گئے۔

پیر مرد۔ وعلیکم السلام، میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔

خوجی۔ تم کیا پہچانو گے، تمھاری آنکھوں میں تو چربی چھائی ہوئی ہے، تم بھلا ہمیں کیا پہچانو گے!

پیر مرد۔ کیا آپ تو کچھ عجیب مخبوط الحواس معلوم ہوتے ہیں۔ یہ وجہ کیا کہ جان نہ پہچان خواہ مخواہ کے لیے دس باتیں سنا دیں۔

خوجی۔ ابھی ہم تو سنائیں بادشاہ کو، تو کیا مال ہے گیدی پیر مرد، ایں! ہوش میں اپنے ہے یا نہیں یہ بکتا کیا ہے تو۔

خوجی۔ کوئی ہے محلسرا میں حسن آرا بیگم کو اطلاع دو کہ مسافر آئے ہیں، مہمانی کرو ہماری۔

پیر مرد۔ اخاہ (استادہ ہو کر) اخاہ خواجہ صاحب تو نہیں ہیں آپ، معاف فرمائیے گا حضرت آئیے بغل گیر ہوں۔

خوجی۔ بھلا بے جانے بوجھے کوئی بھی کسی کو کچھ کہتا ہے؟

پیر مرد۔ آپ تشریف رکھیں میں خود جا کے اطلاع کر دوں، خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ اور ہمارے آقائے نامدار اور عزیز میاں آزاد صاحب خیر و عافیت سے واپس آئے۔ آدمی کو حکم دیا کہ حقہ بھر وا دو اور آپ کے سامنے لگا دو بندہ ابھی حاضر ہوا، یہ کہہ کر پیر مرد خوش خوش اندر گئے اور بآوازِ بلند کہا لو صاحب ع

پس ماندے کا پیش خیمہ آیا!

خوجی داخل ہو گئے جس نے سنا انتہا سے زیادہ خوشی حاصل ہوئی کہ خوجی آئے ہیں۔ حسن آرا بیگم اور سپہر آرا اور روح افزا اور نازک ادا باغ کی طرف کے کمرے میں گئیں اور چلمنوں سے خوجی کو دیکھنے لگیں، جانی بیگم اور گیتی آرا اور روح افزا بھی آئیں۔

خواجہ صاحب فضل خدا سے خوش قطع تو تھے ہی ان کو دیکھ کر سب کی سب ہنس دیں۔

نازک۔ اوہو ہو کیا گرانڈیل سڈول جوان ہے۔

جانی۔ شانے کیسے بھرے ہیں اور ہاتھ پاؤں کتنے خوبصورت ہیں اور قد خیر سے کتنا موزوں پایا ہے۔

نازک۔ اے ادھر موئے خوجی، ادھر رے خوجی۔

خوجی۔ (حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ کر) کون ہے بھئی؟

نازک۔ (ہنس کر) اِدھر دیکھ موئے تجھ پر خدا کا قہر نازل ہو، ادھر دیکھ آنکھیں ہی پھوٹیں جو ادھر دیکھے۔

جانی۔ اللہ جانتا ہے ایسا عجیب و غریب آدمی نہیں دیکھنے میں آیا، اونٹ کی تو کوئی کل شاید درست بھی ہو، اس کی کوئی کل درست نہیں۔ ہنسی آتی ہے۔

خوجی اِدھر ادھر دیکھتے کہ یا خدا یہ آواز کہاں سے آتی ہے؟ اتنے میں پیر مرد آ گئے۔

خوجی۔ حضرت اس مکان کی عجیب خاصیت ہے کچھ!

پیر مرد۔ کیا کیا اس مکان میں کوئی نئی بات آپ نے دیکھی؟

خوجی۔ آوازیں آتی ہیں۔ میں بیٹھا ہوا تھا ایک آواز آئی پھر دوسری آواز آئی، قہقہے کی آواز آئی۔ کسی نے میرا نام لے کر پکارا، مجھ کو بُرا بھلا کہا۔

پیر مرد۔ آپ کیا فرماتے ہیں، ہم نے تو آج تک کوئی بات اس قسم کی دیکھی نہیں۔ پیدا یہیں ہوئے، بڑھے یہیں، رہے سہے یہیں۔

خوجی - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں غلط کہتا ہوں؟

پیر مرد - جی نہیں میں استعجاب ظاہر کرتا ہوں کہ یہ آواز کدھر سے آئی - شاید کوئی بھوت پریت ہو کیا عجب ہے -

خوجی - (کھڑے ہو کر) ہا ہا ہا - واللہ خوب یاد آیا، خوب ہی یاد آیا، بھتنی ہو نہ ہو وہی مردک ہو، یہاں بھی پیچھا کیا -

پیر مرد - کون! کیا کوئی جن یا آسیب آپ کو ستاتا ہے -

خوجی - واہ کیا سمجھا ہوں، بھلا گیدی بھلا -

راوی - حضرات ناظرین غالباً سمجھ ہی گئے ہونگے -

خوجی - اچھا گیدی آج اتنی قرولیاں بھونکی ہوں کہ تو بھی یاد کرے، ہم سے بھڑنے کا مزا آج چکھ لے -

پیر مرد - حضرت کچھ بتائیے تو کون ہے، مجھے کچھ اور شک ہوتا ہے -

خوجی - واہ شک کے کیا معنی اور آپ ہیں کون شک کرنے والے - صریح وہ ہم کو ہزار بار چکمے دے چکا اور آپ اُلٹا ہمیں کو اُلّو بناتے ہیں سارے صاحب یہ ایک بہروپیا ہے - ناک میں مردود نے دم کر دیا - واللہ ناک میں دم کر دیا اب تک ہم اکیلے تھے اب دو ہوئے ہم اور بھائی جان وہ خواجہ رئیس الزمان ہم خواجہ بدیع الزمان اور دونوں کے کینڈے سے پہلوانی برستی ہے -

پیر مرد - جیسے ہم آن کے بیٹھے ہیں ہم نے کوئی آواز نہیں سنی -

خوجی - آپ تو مجھے کچھ سودائی سے معلوم ہوتے ہیں -

پیر مرد - اچھا صاحب! اپنے بھائی سے پوچھیے، دیکھیے یہ کیا کہتے ہیں -

خوجی - ہائے افسوس! ارے صاحب وہ تو افیم کی پینک میں غین ہیں اور یہاں مارے خوشی کے نیند حرام ہے -

پیر مرد - خیر اب ان باتوں کو جانے دیجیے - اب کچھ روم کا ذکر چھیڑیئے، بڑا غضب ہوا مگر خدا کا ہر حال میں شاکر و صابر رہنا چاہیئے - آنچہ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ -

خوجی - آپ کو روم روس کی پڑی ہے اور یہاں کچھ اور ہی خیال ہے - حسن آرا بیگم سے اطلاع کر دی آپ نے، لے اب رخصت (اٹھ کر چلے، رخصت پھر واپس ہوئے) اوہو خوب یاد آیا ہماری جانب سے آداب عرض کر دیجیے اور کہیے کہ بندہ حاضر ہوا اور خیریت سے سب کے سب آگئے -

جب پہلوانوں کے استاد رفیق بالتحقیق آزاد حضرت خواجہ بدلیا صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ آوازے کوٹھے پہ کسے جاتے ہیں تو دل میں بہت ہی خوش ہوئے اور فرط طرب سے فرمایا کہ اگر اجازت ہو تو دو دو باتیں عرض کروں - حسن آرا نے کمرے پہ سے کہا، کیا مضائقہ ہے، فرمائیے -

خوجی - یا خدا شکر ہے، ہزار شکر خدا کہ حضور خاتون بلقیس مرتبت حسن آرا بیگم کی آواز کان میں آئی ؎

بدیں مژدہ گر جاں فشانم رواست
کہ ایں مژدہ آسایش جان است

پیر مرد - آپ کو کوئی امر اگر تخلیے میں کہنا ہے تو فکر کی جائے؟

خوجی - خوشی گلوگیر ہے صاحب - اللہ رے مبارک دن -

حسن - اب یہ بتائیے کہ خیر و عافیت سے تو آنا ہوا؟

خوجی۔ ہاں آئے تو خیر و عافیت ہی سے مگر ؎

معشوق اور بھی ہیں بتا دے جہان میں
کرتا ہے کون ظلم کسی پر تری طرح

بارے خیر گذشت، آنچہ گذشت۔

ایک تو آزاد پر لے سرے کے آزاد، دوسرے اُن کے معشوق پریزاد نے یہ پٹی پڑھائی کہ جنگ میں جا کر نام کرو تو بات ہے چلیے سونے میں سُہاگا۔ اس وقت حسن آرا بیگم کے دل سے کوئی پوچھے کہ کیا حالت ہے ؎

ہو نہ بیتاب ادا تمھاری آج   ناز کرتی ہے بے قراری آج

حسن۔ آزاد پاشا کا راستہ تمھارے سبب سے اچھی طرح کٹ گیا ہوگا۔

خوجی۔ حضور، آزاد کے حسن نے ان کے ساتھ ہمیشہ بدی کی یعنی ملک ——— جس شہر میں گئے اچھی اچھی شہزادیاں ہزار جان سے عاشق ہو گئیں اور پولینڈ کی شہزادی کا حال تو بس ناگفتہ بہ، اس قدر روتی تھیں اس قدر گریہ و زاری کرتی تھیں کہ الامان الامان

عدو نے دیکھے کہاں اشک چشم گریاں سرخ
نہ آستیں ہے نہ رومال ہے نہ داماں سُرخ

حضور ایک روز آزاد کو قید کر دیا اور قید بھی ایسے مقام پر جہاں آدمی کیا پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ پندرہ دن اسی غار کے میں بیچارے کو رہنا پڑا، ہائے افسوس!

حسن۔ مآ جیدہ ہو کر، ہم کو اس وقت دعائیں دیتے ہونگے؟

خوجی۔ قسم خدا کی ان کو یہی خیال تھا کہ یا خدا حسن آرا اپنے دل میں یہ نہ سمجھیں کہ آزاد دغا دے گیا۔

حسن۔ ہائے افسوس، اللہ ری محبت

نازک۔ خاتون جنت کی قسم دل بھر آیا۔

سپہر۔ پندرہ دن تک پہاڑ کی غار میں قید رہے!

خوجی۔ اس پر بھی چین نہ آیا، ایک اندھارے میں قید کیا اور اندھا اندھا جنگل کے اندر۔

حسن۔ رو کر، جی چاہتا ہے، کسی ترکیب سے اسی وقت آزاد سے ملوں۔

خوجی۔ ایک مرتبہ اندھارے سے آزاد نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا
مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

جب میں نے کہا بھائی اب بھی اس کافر سے صلح کر لو ورنہ مفر محال ہے تو فوراً یہ شعر پڑھا۔

ہے صلح عدو بے خلاقی جنگ غلط فہمی   جینا ہی تو آفت ہے مرتا تو بھلا ہوتا

اور حضور اس طرح کی حسین شہزادی کہ خدا گواہ ہے، میں نے آج تک ایسا حُسن گلو سوز دیکھا ہی نہیں، جوانی بعد حُسن پھٹا پڑتا تھا۔ خدا کی قسم مگر حسن آرا بیگم کے خیال سے ذرا توجہ بھی نہ کی۔

خواجہ بدیع الزمان نے اس حسرت کے ساتھ آزاد کے مصائب کا حال بیان کیا کہ جس نے سُنا رو دیا اور حسن آرا بیگم کے

دل کی تو عجیب ہی کیفیت تھی۔

نازک۔ ہم تو سمجھے تھے کہ یہ موا مسخرہ نرا پاگل ہے۔

جانی۔ اس طرح پر حال بیان کیا اور حسرت کی باتیں کہیں اور اس قدر کا رنج دیا ہے کہ تو بہ بھلی حسن آرا آزاد کی لونڈی بن کے رہنا بھی تمھارے لیے فخر کا مقام ہے۔

حسن۔ میں خود جانتی ہوں بہن تم کیا کہتی ہو۔

سپہر۔ اللہ اللہ میں جس وقت سوچتی ہوں کہ اندار وں اور باولیوں اور کنوؤں اور غاروں اور پہاڑوں میں پندرہ پندرہ دن اکیلے رہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

خوجی۔ حضور اس شہزادی کو کسی طرح چین نہ تھا، ہجر کے دنوں میں تڑپنا اور وصل میں آیندہ مفارقت کا رونا ہائے ستم! ؎

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں

کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

نازک۔ بھلا کوئی دن ایسا بھی تھا کہ اس سفاک ظالم کو ترس آیا ہو اُس نے رحم کیا ہو؟ ہائے افسوس!

خوجی۔ جس روز اُس بتِ خونخوار نے آزاد کی نسبت حکم دیا تھا کہ یہ اندارے میں جا کر قید رہیں اور وہاں قیدی کی طرح زندگی بسر کریں اُس دن سر سے پا تک سُرخ پوشاک پہن کر آئی تھی ؎

مُوا ہوں عشق میں گل پیرہن کے لازم ہے

مرا کفن بھی ہو چون جامۂ شہیداں سُرخ

نازک۔ اے ہے یہ تو سب سُنا مگر کسی دن رحم بھی آیا تھا۔

خوجی۔ میں نے جا کے آزاد کو خوب سمجھایا کہ واسطے خدا کے عقل سے کام لو، دشمنِ عقل نہ بنو۔ یہ دشت پُر خار ہے، یہاں قدم قدم پر خوف ہے۔

سپہر۔ ان کو لازم تھا کہ شہزادی کا کہنا مان لیتے۔

نازک۔ خدا جانے اس میں کیا بجوگ پڑ گیا ہوگا۔

خوجی۔ بجوگ کیا معنی! آزاد یہی کہتے تھے کہ میں تو اُس دم شادی کر لوں مگر خرابی یہ ہے کہ میں وعدہ خلاف کے پاس نہیں کھڑا ہوتا، مجھ کو ایسے آدمی سے کلی نفرت ہے، وعدے کے خلاف عمل میں لائے۔

حسن۔ اللہ رے خیال ایفائے وعدہ بھی تو مشکل بات ہے۔

خوجی۔ جس وقت آزاد کا سامنا ہوتا تھا وہ خونخوار مردم آزار عجب نگاہ قہر سے دیکھتی تھی۔ آنکھوں سے خون ٹپکتا تھا ؎

چین جبیں بلا دنگاہ غضب ستم

کرتی ہے قتل اُس بتِ خونخوار کی طرح

سپہر۔ یہ تو پولینڈ کی شہزادی کا ذکر ہے۔

خوجی۔ جی ہاں۔ یہ انھیں کی عنایت کا ذکر ہے۔

نازک۔ وہاں تو خواجہ صاحب ہی بچارے کام آئے تھے۔

خوجی۔ حضور بعضی بات کی نہیں جاتی بس گو مگو کا نقشہ ہے، کہے تو کوئی باور نہ کرے اور نہ کہے تو مصیبت کا سامنا ہے۔
پیر مرد۔ نہ کہنا کیا معنی ضرور کہیے سب مشتاق ہیں۔
خوجی۔ اصل حال یہ ہے کہ وہ شہزادی مجھ پر عاشق تھی۔
حسن۔ گھر کی پھٹکی اور باسی ساگ، مُوا اُلّو کہیں کا۔
نازک۔ عاشق ہو یا نہ ہو، ان کی بیٹی کے برابر تو ضرور ہو گی۔
خوجی۔ کیا! اب یہ تو گالیاں بکتا ہے اور حضور کو اختیار ہے، مگر خدا ہی خوب جانتا ہے کہ مجھ پر کون کون پری وش تدرو رفتار عاشق ہو گئی تھی، نیک و بد کی گنتی نہیں۔ سارے ملک کی خاتونیں ایک دم سے عاشق ہو گئیں، مگر شہزادی سے تو میں نے لگاوٹ بازی خود ہی نہ کی۔ ہاں ایک خادمہ سے جو شہزادی کی بڑی منہ چڑھی اور انتہا کی حسینہ تھی اس سے عشق کا اظہار کیا۔ گو مارے غم کے دل اس لائق نہ تھا مگر ؎

دل قابل محبت جاناں نہیں رہا — وہ ولولہ وہ جوش وہ طغیاں نہیں رہا
ٹھنڈا ہے گرمجوشی افسردگی سے جی — کیا اثر کہ نالہ و افغاں نہیں رہا
کرتے ہیں اپنے زخم جگر کو رفو ہم اب — کچھ بھی خیال جنبش مژگاں نہیں رہا
کیا اچھے ہو گئے کہ بھلوں سے برے ہوئے — یاروں کو فکر چارۂ درماں نہیں رہا
ہر لحظہ مہر جلوؤں سے ہیں چشم پوشیاں — آئینہ زار دیدۂ حیراں نہیں رہا
دل قابل محبت جاناں نہیں رہا

سپہر۔ یہ تو شعر خوانی کا موقع نہیں ہے۔ یہاں تو مطلب سے مطلب رکھیے۔ آزاد پاشا نے جو لکھا تھا سچ لکھا تھا۔
خوجی نے حُقّہ پی کر اپنی توصیف میں اپنی بسالت اور جواں مردی کا حال اس طرح بیان کیا اور حالات تو اس نے سُنے ہی ہوں گے۔ مگر ایک امر خاص کی نسبت مجھے کچھ کہنے دیجیے، ایسا حال بیان کروں گا کہ پھڑک پھڑک جائیے گا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ سامنے دریا اور دریائے زخار جس کا اور نہ چھور پاٹ کا پتہ ہی نہیں، سامنے دریا موجزن اور اِدھر اُدھر جنگل، منزلوں کی راہ پر جنگل ہی نظر آتا تھا اور دونوں لشکر آمنے سامنے پرے جمائے ہوئے کھڑے ہیں۔ اِدھر سے بھی جنگی باجا بجا اُدھر سے آوازِ دہل آئی۔
حسن۔ اور آزاد کہاں تھے اور تم کہاں تھے؟
خوجی۔ میں تو خاص قلعے میں تھا، قلعہ معلّٰے اور آزاد سمند دغا پسند پر سوار میدان کارزار میں جواں مردی کے ساتھ کار نمایاں کر رہے تھے۔ اِدھر گھوڑا کڑکڑایا اُدھر پورے۔ کل سپہ سالاروں میں بس وہی نظر آتے تھے۔ گو اور بھی جنرل تھے مگر آزاد کے حسن و جمال اور فن جنگ کے کمال کو کوئی نہیں پہنچتا تھا۔ اچھے اچھے خوش رُو سپاہی ان کی طرف دیکھ دیکھ کر تعریفیں اور رشک کرتے تھے اور اس وقت کی یہ تصویر ہے۔
راوی۔ یہ تصویر مہری اندر لے گئی اور وہاں کمال شوق سے سب کی سب تصویر پر گر پڑیں اور مہری کے ہاتھ سے چھین لینے کی کوشش کی۔
پیر مرد۔ دیکھو دیکھو یہ کیا چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔

خوجی۔ یہ آپ کو کیوں کر معلوم ہوا؟
پیر مرد۔ خدا کو دیکھا نہیں مگر عقل سے پہچانا۔
خوجی۔ اے تو صاحب آخر یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ وہ سب کی سب تصویر کی چھینا جھپٹی کر رہی ہیں، حضور نے اس خوبی سے کل امور بیان کیے کہ تصویر دیکھنے کا سب کو تہ دل سے شوق ہوا۔
پیر مرد۔ اپنے تئیں آپ حضور کہتے ہیں، بہت ہی خوب۔
خوجی۔ یہ تصویر ملاحظہ فرما لیجیے تو پھر ہم کچھ اور بیان کریں۔
اب سنیے کہ تصویر حسن آرا بیگم نے چھین لی اور کہا اگر دیکھنا ہے تو آدمیت سے دیکھو ورنہ تصویر پھٹ جائے گی اور کسی کے دیکھنے میں نہ آئے گی۔ اس سے مطلب کیا نکلے گا؟
نازک۔ جو تصویر ہے ایک نئے طرز کی اور ہر تصویر سے بانکپن برستا ہے، یہ بات خدا نے آزاد ہی کے لیے پیدا کی ہے۔
سپہر۔ دیکھو باجی جان اور بھی کئی ہیں مگر جو رعب ان کے چہرے پر ہے وہ کسی اور کے چہرے پر نہیں۔
نازک۔ اس میں کیا فرق بھی ہے ع

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

وہ تو ہم جب ہی سمجھے تھے، جب ہم نے سنا تھا کہ آزاد نامے ایک باحمیت مسلمان روانہ روم ہوئے ہیں۔
خوجی۔ حضور ان کی تعریف انسان کی زبان سے محال ہے۔
نازک۔ بھلا لڑائی کے دن بھی سپاہی اور افسر نماز پڑھتے تھے یا نہیں؟ اس وقت کوئی کم پڑھتا ہوگا۔
خوجی۔ سچ کہوں بعض بعض پاشا اس قدر پابند نماز ہیں چاہے کوئی توپ کے مہرے پر اڑا دے وہ بے نماز پڑھے ایک قدم آگے نہ بڑھتے اور یہاں تو رند مشرب آدمی ہے

ما ہمانیم و سیہ مستی ہر روزہ ہماں	نہ شب جمعہ شناسیم نہ ماہِ رمضان
مستیم را نبود مطرب و ساقی درکار	مستیم را نبود نغمہ و صہبا ساماں
مستیم را نہ بود نامہ سیاہی فرجام	مستیم را نبود بادہ پرستی عنوان
مستم اما نہ ازاں بادہ کہ آید ز فرنگ	مستم اما نہ ازاں بادہ کہ سازند مغان

اللہ الشکر کہ در ساغر من ریختہ اند
مے بے رنگ زمیخانۂ بے نام و نشاں

نازک۔ کسی لڑائی میں آزاد کی فوج دب بھی رہی تھی؟
خوجی۔ کیا مجال۔ اے توبہ کبھی ایسا کہنا بھی نہیں۔
سپہر۔ تو کیا ہر لڑائی میں روسیوں کو زک دی۔
خوجی۔ حضور ہر لڑائی میں زک دی اور زک کیسی کہ معاذ اللہ توبہ ہی بھلی۔ جو تنے چھوڑ چھوڑ کے بھاگے، بڑے مرد میدان ہیں۔ جن کا نام آزاد ہے۔
خواجہ بدیع الزماں صاحب نے کئی بار اس حسرت سے آزاد کے مصائب شدیدہ کا حال بیان کیا کہ جس نے سنا،

بے اختیار رو دیا۔ کبھی کبھی ان کی جوانمردی اور بہادری کا ذکر بھی کرتے تھے، اتنے میں میم صاحب بھی آگئیں۔ انھوں نے حسن آرا سے مصافحہ کر کے روح افزا کی طرف مخاطب ہو کر کہا، مبارک ہو سچ کہنا سب سے پہلے ہمیں نے اطلاع دی تھی نہ؟

روح۔ واہ یہاں وہ وہ شہر خبرے جمع رہتے ہیں کہ شہر بھر میں کسی کے فرشتے خاں کو کانوں کان تک معلوم بھی نہ ہو اور یہاں خبر ہو جائے۔

میم۔ کیا سچ مچ، ہماری اطلاع کے پہلے ہی خبر ہو گئی تھی۔

روح۔ ہاں ہاں، ایک آدمی نے آن کے کہا کہ آج ہوٹل میں دو میمیں اور ایک صاحب آن کے ٹکے ہیں، اگر صاحب بہت اچھی اُردو بولتے ہیں۔ ہم نے عقل سے پہچان لیا کہ آزاد ہی ہوں گے۔

میم۔ اور آنے کی خبر تو تھی ہی پہلے سے۔

روح۔ اب یہ بتائیے کہ آپ سے کیا کیا باتیں ہوئیں؟

میم۔ ہمیں ایک نئی بات معلوم ہوئی، وہ یہ کہ مس میڈا آزاد کے ساتھ شادی نہ کریں گی اور یہ پکی خبر ہے آج۔

حسن۔ واہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔

بہار۔ آپ کو کیوں کر معلوم ہوا، میم صاحب؟

میم۔ میں نے ان دونوں سے خود پوچھا تھا کہ اب تو حسن آرا کے بعد مس میڈا کے ساتھ آزاد کی شادی ہو گی۔ اس نے معاً جواب دیا کہ (نہ) میں نے اپنے دل سے یہ خیال دُور کر دیا ہے۔

حسن۔ اس میں کچھ (فی) ضرور ہے۔ اس قدر عشق تھا کہ بیان سے باہر اور اب یہ کیفیت، دفعتہً رائے بدلنا کیا معنی، کوئی سبب خاص ضرور ہے۔

میم۔ طبیعت ہی تو ہے مگر اس میں ذرا شک نہ سمجھنا۔ واقعی وہ اب ہرگز شادی نہ کریں گی، تم کو خوش ہونا چاہیئے کہ آزاد کی تم ہی اکیلی بیوی ہو گی، سَوت کسی کو بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو اس کا رواج ہی نہیں، اگر ہم نے کئی سوتیں دیکھی ہیں۔ ایک شخص کی تین بیبیاں اور ایک ہی مکان میں تینوں تھیں روز جوتا چلتا تھا۔ جب دیکھو جوتی پیزار، گالی گلوچ پھکڑ ہو رہا ہے اور تینوں میں جس وقت لڑائی ہوتی تھی اُس وقت تگڈم دیکھنے کی بہار تھی۔

روح۔ یہ پاجیوں کا ذکر ہے، شریفوں میں کہیں جُوتا چلا کرتا ہے؟ بھلا کیا مجال، شریف زادیاں برداشت کرتی ہیں۔

نازک۔ اب اس گفتگو سے کیا مطلب آزاد کا حال سُنو۔

میم۔ ہم نے تو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ آزاد پاشا ہیں۔

روح۔ تو دو خوش خبریاں آپ نے آج آن کے سنائیں۔ ایک یہ کہ آزاد آئے اور دوسری میڈا سے شادی نہ ہو گی۔

حسن۔ ہم کو اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی، کیونکہ میڈا اور ہم بہنوں کی طرح زندگی بسر کرتے، یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آزاد نے کسی ایسی ویسی سے اتنا بڑا اقرار کر لیا ہو۔

میڈا کی قابلیت میں کون شک کر سکتا ہے، اس کے علاوہ آزاد نے اس قدر نام اسی کے سبب سے پیدا کیا۔ اسی نے ان کو آزاد پاشا بنایا۔

مغلانی۔ حضور اس دن بھی یہی کہہ رہی تھیں اور آج بھی حضور نے یہی فرمایا، میں اس کا مطلب نہ سمجھی، اس چھوکری نے کیا مدد دی؟ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

حسن۔ جب یہ وہاں داخل ہوئے تو ان کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا، مس میڈ ان پر عاشق ہوئی، شادی کا پیغام کیا، مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا، اور کہا کہ ہم ہندوستان میں وعدہ کر آئے ہیں۔ ایفائے وعدہ ضرور ہے اور مقدم ہے۔ اس پر میڈ نے کہہ سُن کے وزیروں کو ایسی پٹی پڑھائی کہ آزاد کو قید کر لیا۔

مغلانی۔ اُوئی! ایسے عشق کو آگ لگے جس کو چاہے اُس کو قید کرائے یہ اُلٹی بات سننے میں آئی، عجب موئی بے تکی عورت ہے۔

جانی۔ اور ابھی تک تو اس کے احسان کا کوئی بھی ذکر نہیں، آزاد پر آخر اس کا کیا احسان ہے یہی کہ جیل خانے بھیج دیا۔

حسن۔ سُن لو، جب جیل خانے میں کئی دن تک رہے تو رحم آیا، جا کے میں، آزاد سے قول و قرار لیا، سفارش کی چھوڑا دیا۔

سپہر آرا نے کہا، باجی جان آزاد لکھا کرتے تھے کہ خوجی کے سبب دل بہلتا رہتا ہے، اس کو اس وقت بنانا چاہیئے۔

جانی بیگم کی رگ رگ میں شوخی بھری ہوئی تھی، ان کو سب سے بہتر ترکیب سوجھی، کہا ایک بات ہمیں سوجھی ہے۔ ابھی ہم سب ظاہر نہیں کریں گے۔ مگر بہن بہار النسا اگر اجازت دیں تو اسی دم خوجی اُلّو بن جائے۔

بہار۔ اچھا ابھی ان سے کسی سے نہ کہو ہم سے کہہ دو۔

جانی۔ کان میں آہستہ سے کچھ دیر تک گفتگو کی۔

بہار۔ کیا ہرج کیا ہے، بوڑھا ہی تو ہے، اسّی برس کا۔

جانی۔ بس جب آپ نے حکم دے دیا ہے تو ہمیں کیا چوری ہے۔

حسن۔ آخر کچھ کہو تو باجی جان، ہم سے کہنے میں کچھ چوری ہے!

بہار۔ جانی بیگم اجازت دیں تو کہہ دوں۔

جانی۔ جی نہیں کسی سے نہ کہو، اب میں تو جاتی ہوں اور آپ مجھے سب سامان لیس کر دیجیئے۔

یہ کہہ کر جانی بیگم اُٹھ کے دوسرے کمرے میں گئیں اور بہار النسا بھی وہاں سے چلی گئیں۔ یہاں ان سب کو حیرت کہ یا خدا کون ترکیب سوجھی ہے کہ کفر کے کلمے کی طرح کسی سے بیان کرتے ہوئے ڈرتی ہیں۔ اپنی اپنی عقل کے موافق سب نے فکر کی۔

نازک۔ ہم سمجھ گئے افیمی آدمی ہے، اس کی ڈبیا چورانے کی فکر کی ہو گی۔

روح۔ یہ بات نہیں اس میں چوری کیا تھی۔

مغلانی۔ نہیں حضور اتنی شے کے لیے اُٹھ کے اس قدر دور نہ جاتیں۔

حسن۔ یہ بہار النسا بہن نے کیا کہا کہ بوڑھا آدمی تو ہے ہی۔

گیتی۔ اس میں کچھ نئی ضرور ہے، کھُل جائے گا۔

مغلانی۔ میں جا کے خبر تو لاؤں کہ کیا ہو رہا ہے۔

اتنے میں بہار النسا بیگم نے آن کے کہا چلو باغ میں چل کر بیٹھیں اس بنگلے میں ہم سب بیٹھیں گے اور اس کے نیچے خوجی۔ اس تجویز کے مطابق باغ کے دلکش بنگلے میں جا کے سب بیٹھیں خواجہ صاحب اور ان کے بھائی خواجہ رئیس الزمان صاحب اور بیر مرد بنگلے کے سامنے ایک روش میں مونڈھوں پر بیٹھے اور دونوں بھائیوں میں گفتگو ہونے لگی۔

خوجی۔ کیوں برادر باباے من بدلیا، سچ کہنا۔ اپنے خاندان میں ہم نے بھی کیسا نام روشن کیا۔ کیوں۔

رئیس۔ سنا ہے میں نام روشن کیا معلوم تو ہو؟

خوجی - ہاں! یہ فرمائیے، روم گئے، روس گئے، اور
رئیس - پھر اس سے کیا ہوتا ہے۔ سنا نہیں ؎

خر عیسٰی اگر بہ مکہ رود　　چوں بیاید ہنوز خر باشد

ایک شخص دتی میں بارہ برس رہے مگر بھاڑ ہی جھونکا کیے۔
خوجی - ارے ہم فخر و افتخارِ قوم ہیں ؎

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ　　یاد رکھو فسانہ ہیں ہم لوگ

تم بڑے بھائی ہو۔ مگر بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال، تونگری بہ دل است نہ بہ مال، یہ نہیں سنا!
نازک - یہ دونوں بھائی ہیں یا دشمن دشمن!
حسن - دونوں یکساں، قد و قامت شکل دیوانہ پن سب میں ایک ہی سے ہیں، یہ دونوں جہاں ہوں وہاں جی نہ گھبرائے۔
مہری - (خوجی سے) کیوں میاں تم باپ بیٹے ہو؟
خوجی - نہیں، باپ بیٹے نہیں سالے بہنوئی ہیں۔
اس فقرے پر خواجہ رئیس الزماں صاحب نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا بس بس، روم، روس ہو آئے مگر لیاقت نہ آئی، بھلا یہ کون مذاق ہے، افسوس!
اتنے میں ایک مہری نے پیر مرد کو اشارے سے بلایا اور کہا، آپ اور خوجی کے بھائی ذری دیر کے لیے یہاں سے چلے جائیے، یہاں پردہ ہوگا، خوجی کو بیٹھے رہنے دیجیے۔ خواجہ رئیس الزماں اور پیر مرد باغ کے باہر کوٹھی میں آکر بیٹھے۔ حسن آرا اور ان کی سہیلیوں نے کہا، یہ دونوں ہٹا دیے گئے، اب کوئی گل ضرور کھلے گا۔
اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جوان گبھرو اونچی بنا ہوا سامنے سے اینڈتا اکڑتا چلا آتا ہے، بالکل نوعمر، سبزے کا نام نہیں، گورے گورے گال اور مستانہ چال، گھٹنا چست فالسائی گرنٹ کا چوڑی دار جالی نوٹ کا کرتا، اس پر شربتی کا انگرکھا کٹاؤ کا، سر پر بانکی پگیا۔ گلابی رنگی ہوئی ہاتھ میں کٹار۔
حسن - یہ کون ہے؟ اللہ، اے بی مغلانی ذری دریافت تو کرنا۔
روح - ایں! یہ کس کا لونڈا ہے برس پندرہ سولہ ایک کا۔
سپہر - (قہقہہ لگا کر) اوہ، باجی جان پہچانو تو بھلا۔
حسن - (ہنس کر) ارے! اوہ بڑا دھوکا دیا۔
روح - اوہ میں اب پہچانی۔
نازک - یہ کون ہے کون۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ پیار کرنے اور منہ چومنے کے قابل ہے، بوٹا سا قد اور ایسا خوبصورت گبھرو تو دیکھا نہ سنا، ابھی بالکل کمسن ہے۔
حسن - بھلا اگر ملے تو چوم لو یا نہیں (شرما کر)
نازک - اخاہ، ہمارے لیے آپ کو بھی زبان آئی۔
روح - اے بہن یہ جانی بیگم ہیں۔

نازک۔ (زور سے قہقہہ لگا کر) سچ سچ، اخاہ، اُف بیشک بڑا دھوکا دیا!!!
سپہر۔ میں تو پہلے سمجھی ہی نہ تھی کچھ۔

اتنے میں وہ نوعمر گبھرو خوجی کے قریب آیا تو یہ چکرائے کہ اس باغ میں اس کا گذر کیوں کر ہوا اور طرہ یہ کہ ان کے پیچھے پیچھے بہار النسا بیگم۔ جیسے ہی خوجی نے بہار النسا پر نظر ڈالی، اُنھوں نے غل مچا کر کہا، اوئی، اے کون مردوا نامحرم باغ میں آگیا؟ خواجہ صاحب مرد ہو یا عورت۔ اسے اس کو کسی طرح یہاں سے نکالو۔ ایک مہری جوان کے ساتھ تھی اس نے بھی یہی کہا اور خواجہ صاحب اس جوان رعنا سے یوں ہمکلام ہوئے:

خوجی۔ سنو بھئی جوان! ہم تم دونوں سپاہی پیشہ ہیں۔
جوان۔ دھشت سے (اکڑتے ہوئے آگے بڑھا)
خوجی۔ (آگے بڑھ کر) ابی حضرت آخر آپ کون صاحب ہیں؟ پرائے زنانے میں گھسے جاتے ہو یہ ماجرا کیا ہے؟
جوان۔ قضا کا نوحہ خوان ہے کیا شامت آئی ہے،
خوجی۔ سنیئے بندہ پرور ہم اور آپ ایک ہی پیشے کے آدمی ہیں اور دونوں ہمسن اور کمسن۔
جوان۔ اگر ابکی بولو گے تو ہم بیشک کٹار ماریں گے، ہم حسن آرا بیگم کے عاشق زار ہیں اور ان کے دام محبت میں گرفتار سُنا ہے کہ آزاد نامے ایک عیار مکار یہاں آن کر حسن آرا بیگم کے پاس پیغام نکاح بھیجنے والا ہے اسی کے انسداد کے لیے آئے ہیں۔
خوجی۔ آزاد کے مقابلے میں آپ ایک ادنٰے لونڈے ہیں اور اس خیال خام سے درگذر یئے، وہ بڑا صاحب سیف سورما تلوار یا ہے اور آپ ابھی بچے اور صاحبزادے ہیں۔

خواجہ صاحب بہت چکرائے، سوچے کہ اگر اس سے جھگڑا پڑتا ہوں تو جان جائے گی، اس کے پاس کٹار ہے اور یہاں قرولی منزلوں دُور اور اگر خاموش رہتا ہوں تو یہ سب خاتونیں مجھے عورت سے بدتر سمجھیں گی۔ تو متعجب ہو کر کے سمجھایا کہ بھئی گبھرو دو باتیں سُن لو تو آگے بڑھو۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ اس نے بہار النسا کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ابھی اسی دم حسن آرا کو بلاؤ ورنہ کٹار مار دوں گا۔

خوجی۔ ہائیں ہائیں!! ایں عورت و شما مرد بابائے من۔
جوان۔ کیوں تیری ہڈیاں ملبلاتی ہیں ابے بوڑھے!
خوجی۔ کیا آپ کچھ مجھ سے زیادہ جوان ہیں، آپ ہیں کیا۔
جوان۔ اچھا پھر پہلے تمھارا ہی کام تمام کروں، ایک پہرے والے کو تو شہید کر آیا ہوں۔ اب تمھاری باری ہے۔
خوجی۔ (پینترے بدل کر) ہم کسی سے دبنے والے نہیں ہیں۔
راوی۔ خواجہ صاحب پینترے بدلتے اور بڑبڑاتے تو جاتے تھے مگر دو باتوں سے غافل نہ تھے۔ ایک تو پیچھے ہٹتے جاتے تھے، دوسرے بھاگنے کا راستہ تجویز رہے تھے۔
جوان۔ آج ہی کا دن تیری قضا کا تھا۔
خوجی (پیچھے ہٹ کر) دیکھا نہیں ہے کسی کو۔ کیا مجال۔
جوان۔ کوئی سپاہی ہو تو اس سے مقابلہ کیا جائے۔ تم ایسوں سے کیا مقابلہ کروں مگر جھلایا ہوا ہوں اچھا لے ایک جھکا۔ (ہاتھ بڑھا کر)

ے بچ سنبھل۔

خوجی۔ چونک کر پیچھے ہٹے تو گھبرا کے گرے اور گرتے ہی آواز دی۔ اور برادر بابائے من بدلیا اندر خواب کٹار قرولی بیار، ایں گبی

ہر سر پیکار و من بدلیا زار زار۔

اب تو سب کو معلوم ہی ہو گیا تھا کہ جانی بیگم مرد کے بھیس میں آئی ہیں، یوں ہی سب کی سب بے اختیار ہو ہو ہنس رہی تھیں، مگر ان

کے گرنے سے وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ الامان الامان!

اب خواجہ صاحب کی سنیئے گرے تو اُٹھے نہیں

جوان۔ بس اسی برتے پر پھولا تھا، اے پھٹکار۔

خوجی۔ من بدیع وگلے والی پلٹن کا رسالدار۔ مگر ؎

مردی نہ بود فتادہ را پائے زدن   گر دست فتادۂ بگیرے مردے

اتنے میں کئی مہریاں اور مغلانیاں اور محلدار اور آتون اور ددا اور یہ اور وہ اِدھر اُدھر سے جمع ہو گئیں اور ددا ایک نے

لاعلمی میں بڑی بیگم کو بھی اطلاع دی اور پہرے پر یہ مشہور ہو گیا کہ ایک سپاہی مسلح ہو کر خدا جانے کس ترکیب سے باغ میں گھس گیا

وہاں خوجی کو تو زخمی کیا، اب اور بیگمات میں گیا ہے پہرے کے جوان اور کئی آدمی ان کے ساتھ بے تحاشا دوڑ پڑے تو خواصوں نے

روکا کہ تم اپنا کام کرو یہ آپس کی چہل ہو رہی ہے۔ اس کا خیال نہ کرنا چاہیئے، بڑی بیگم کو بھی تسکین دی گئی کہ لڑکیاں آپس میں ہنس بول رہی

ہیں آپ گھبرائیں نہیں۔

اب سنیئے کہ خواجہ صاحب تو چاروں شانے چت پڑے ہوئے آنکھیں کھول کھول کر اُس جوان رعنا کو دیکھتے تھے کہ خدا نے

اسی کو ملک الموت کی صورت میں بھیجا ہے، مگر ٹک ٹک دیدم دم نکشیدم اور وہ جوان زیبا شمائل رعنا خصائل برابر یہی کہہ رہا تھا کہ

یہ ان کے ذریات سے ہیں جب سند ہے کہ آزاد کو ڈپٹ لوں ممکن کیا کہ ہماری بغل میں حسن آرا نہ ہوں۔

خوجی۔ واللہ میں اس وقت اپنے زعم میں اپنے آپ آ رہا۔

مہری۔ اس میں کون کلام ہے میاں، ایسا ہی ہوا۔

خوجی۔ اور اب بھی اگر اُٹھوں تو قیامت برپا کر دوں۔

مہری۔ اے نہیں آپ کے دشمن اُٹھیں۔

مغلانی۔ ایسی آرام کی جگہ پا کر کوئی چھوڑتا ہے؟

خواص۔ مگر گرے بھی اس زور سے کہ زمین ہل گئی۔

ددا۔ اے میں سمجھی کہ بھونچال آگیا۔ ماشاء اللہ جوان بھی تو گراں ڈیل ہیں، زمین کا کلیجہ تک دہل گیا۔ اب جس وقت اُٹھیں گے زمین

اور بھی دب جائے گی۔

خوجی۔ اس وقت گانے کو جی چاہتا ہے ؎

بیا اے جوہری حُسن مرصع را تماشا کن   عرق را دانۂ یاقوت احمر ساخت رخسارش

مغلانی۔ اب ایسے آرام ہی کے وقت نہ گاؤ گے تو پھر کب گاؤ گے۔

جوان۔ کل ہم دریافت کر لیں کہ آزاد شکے کہاں ہیں تو وہیں پہنچیں، اسی دم جاؤں اور للکار دں اور ڈانٹ بتاؤں۔

خوجی - واہ گھر کی ٹیکی اور باسی ساگ۔
جوان - کیا! کیا آزاد ہم سے بڑھ کے تلوار یئے ہیں؟
خوجی - بہتوں کا ارمان نکل گیا، صورت دیکھنا تو رستم بھاگ جاتا۔
جوان - اچھا پھر کل سہی، دیکھو تو ہوتا کیا ہے۔
خوجی - ذکروٹ بدل کر) کل بھی کچھ دور نہیں ہے۔
جوان - دکنا ر دکھا کر) یہ کروٹ بدلنا کیا معنی؟ چت سوا ور سینے ایسے مزے میں آئے، اوجھی کلے پر کھڑا ہے اور ان کو آرام و آسایش کی سوجھتی ہے، کیا بے تکلف آدمی ہیں۔
خوجی - دیکھو بی مغلانی اس وقت ناحق کا خون ہماری گردن پر ہوگا۔ سچ کہتا ہوں، اس وقت ایک آدھ کا خون ہوا ہی چاہتا ہے۔
مغلانی - اے چھنے دُور مُوئے بڑبڑا کے گر پڑا۔ مردوئے کی صورت دیکھتے ہی اور چلا ہے باتیں بنانے۔
مہری - نوج کوئی ایسا مردوا ہو، صورت مردوں کی سیرت عورتوں کی۔
جوان - اس پر کیا فرض ہے جس کو ہم ڈانٹ دیں گے رعب میں آجائے گا۔
خوجی - اب کل معلوم ہو جائے گا، ساری قلعی کھُل جائے گی میاں صاحب، میں تو خیر اس وقت اپنے زعم میں اپنے آپ منہ کے بل گر پڑا۔
راوی - ہم بھی گواہ ہیں، وجہ یہ کہ حضور ہر بار اپنے زعم میں گر پڑا کرتے ہیں۔ یہ کمال طاقت ہے، غنیم کو دیکھنا اور چاروں شانے چت۔
مغلانی - اے تو اب اُٹھو گے بھی یا یہیں دفنائے جاؤ گے؟
خوجی - ع - ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را۔
راوی - پس یہ عمدہ اصول ہے، انھیں کے مطابق کاربند ہو جیے۔

جب سب نے زور زور سے قہقہہ لگانے شروع کیے اور بہار النسا اُس جوان رعنا کا ہاتھ پکڑ کر اوپر لے گئیں تو خوجی مارے غصے کے اُٹھے اور خدا حافظ کہہ کر چلے، دل میں سوچتے جاتے تھے کہ آزاد سے جا کے کہوں گا کہ حسن آرا کے ایک اور چاہنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ جیسے ہی چشمے کی طرف سے ہوٹل کی راہ لی، ایک کاغذ نظر سے گذرا اور اس کو پڑھنے لگے۔

" اس بہکانے اور پھسلانے کی تجارت سے ملک کی معصوم دختروں کو جو اپنے ماں باپ کو بخوبی پہچاننے کی قابلیت سے معذور تھیں، ایسا فروغ ہوا کہ بی کندن کھُلے بندوں اپنے افسون و افسانہ کے رواج میں کامیاب ہوئیں اور اشاں ہوس کار کی آمد و رفت روز مرہ اور داد دہش اور دوسری طرف پولیس کی سازش میل جول رفاقت، یکجہتی، یکتا دلی اور اطمینان نے اس کو ایسا اندھا بنایا کہ وہ اصلاً و مطلقاً اپنے افعال قبیحہ اور کردار ذمیمہ کی تمیز پر قادر نہ ہو سکی اور سمجھتی تھی کہ یہ گرم بازاری اس کے پیشہ کے روبرو ترقی پذیر ہو گی اور اس کے دام تزویر میں ایک نہ ایک اُلّو پھنستا ہی رہے گا ع

گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی "

گیدیوں کے قبلہ گاہ، پدیوں کے پشت پناہ، گاودیوں کی جان بلکہ روح رواں، دیوارِ حماقت کے پُشتیبان پچھے پہلوان میاں خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع الآ بھانی، غرلتی لبۂ نادانی نہایت حیرانی و غایت پریشانی سے دل ہی دل میں اس جوان عنشتاتی

زیبا خصائل کو برا بھلا کہتے پھرتے اور تیزی کے ساتھ قدم دھرتے، ٹھنڈی سانسیں بھرتے شہ گام جانے لگے اور چونکہ ماشاءاللہ ڈنٹر پیل جوان اور کامل فن پہلوان تھے یہ کیفیت ہوئی کہ دس قدم چلے اور تیورانے لگے، اللہ ری طاقت، اوّل تو پستہ قامت، ماشہ بھر کا قد، دوسرے قطع شریف از بس موزوں، اونٹ کی طرح کوئی کل درست نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ مدت کے بعد ایک چوبی قرولی جو کسی اُستاد نجار نے پیر مرد کو بطریق نذر دی تھی۔ زیب دست تھی۔ مثل مشہور ہے۔ اوچھے کے گھر تیتر باہر رہے کہ بھیتر۔ کبھی داہنے ہاتھ میں لی بازار والوں کی طرف دیکھ کر چمکائی اور کبھی بائیں ہاتھ میں لی اور اکڑ کے چلنے لگے اب زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے، دماغ فلک الافلاک پر ہے، اللہ ری نخوت! اور کیوں نہ ہو، خدا نے حسن دیا تو گلوسوز، نور عطا کیا تو عالم افروز۔ ایک تو گراں ڈیل جوان دوسرے فن سپہ گری میں طاق کشتی کے پہلوان بانک پٹے، بانے بنوٹ میں مشاق، خانہ جنگی میں شہرہ آفاق اور سب صفتوں سے بڑھ کر یہ صفت جناب باری نے عطا کی تھی کہ میدان جنگ میں بھاگتوں کے مقدمۃ الجیش سپہ سالار نامدار بنتے تھے۔ کوئی در بھاگے یا نہ بھاگے یہ سب کے پہلے میدان چھوڑنے کی فکر کرتے تھے، اللہ ری بہادری، بازار میں اس عجیب الخلقت پر جس کی نظر پڑتی بے اختیار ہنس دیتا تھا کہ واہ! ماشاءاللہ کیا قطع ہے اور اس بونے پن پر اکڑنا اور اینڈنا اور تن تن کر چلنا اور شہ گام جانا اور مصنوعی قرولی سے بھیڑ کو ہٹانا اور بھی لطف دیتا تھا۔ فقرہ باز آپ جانیے زمانے بھر کے بے فکرے ان کو شگوفہ ہاتھ آیا جس گلی کوچے کی طرف خوجی نکل جاتے تھے لوگ انگلیاں اُٹھاتے تھے اور پھبتیوں کے چھرے چلے جاتے تھے۔

خواجہ صاحب قرولی ہاتھ میں لیے اکڑتے جانے لگے، اتنے میں ان کے ایک پرانے شفیق ملے۔

شفیق۔ اخاہ! کہو بھئی خوجی، اچھے تو رہے صاحب!

خوجی۔ مرکھپ گئے، ہم تو جناب خواجہ بدلیا صاحب ہیں۔

شفیق۔ اللہ ری وحشت، روم و روس ہو آئے مگر اس کرنگی کے صدقے کہ کینڈا وہی ہے ہم سمجھے تھے کہ آدمی بن کر آئے ہوں گے مگر وضعدار لوگ کہیں وضع کے خلاف کام کرتے ہیں۔ کیا مجال، پابندی وضع مقدم ہے۔

خوجی۔ ہر کس و ناکس سے باتیں کرنا ہماری شان سے بعید ہے۔

شفیق۔ بجا ارشاد ہوا، حضور کی شان کا کیا کہنا، ہم دیکھتے ہیں، وہاں جانے سے اور بھی گاؤدی ہو کے آئے۔

خوجی۔ ہونھ، گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

شفیق۔ بہت ہی خاصے، اس کھرکنے کے صدقے، ولایت جا کے یہ شوق بھی پیدا ہوا، اب اندر سبھا میں نام لکھوائیے۔ پیرانہ سالی کے لیے اچھا شغل تجویز کر کے آئے ہو، از برائے خدا آدمی بنو یہ کیا حماقت ہے، بات کا جواب دو، ولایت کا کچھ حال بیان کرو، سوال از ریسماں جواب از آسماں۔ ہم کہتے ہیں آم، آپ کہتے ہیں املی۔ سوال دیگر جواب دیگر۔ چہ خوش چرا نباشد۔ واہ اُستاد۔

خوجی۔ بس دو گھڑی میں مرلیا باجے گی!!!

شفیق۔ دماغ میں خلل ہو گیا اور انسان میں حواس ہی حواس تو ہے اور ہے کیا، جہاں اس میں فتور آیا پس غنائم و بہائم سے بدتر ہو گیا۔ گو آپ کے مزاج میں جنون کی قابلیت پہلے ہی سے تھی مگر وہاں جا کے حضور خراد پر چڑھ گئے۔

خواجہ بدیع الزماں صاحب کو اپنی قرولی پر ناز تھا، ہر کس و ناکس کے منہ لگنا خلافِ وضع اور کسر شان سمجھے کرتے پڑتے بھول میں داخل ہوئے اور آزاد کو دیکھتے ہی منہ بنا کے سامنے کھڑے ہوئے۔

آزاد۔ ع۔ غیر مقدم چہ خبر یار کجا راہ کدام۔

خوجی - زفرولی کو داہنی ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں لے کر ہونھ!
آزاد- کیا! خدا خیر کرے، ارے میاں گئے تھے وہاں؟
خوجی- زفرولی کو بائیں ہاتھ سے داہنے میں لے کر ہونھ!
آزاد- یا الٰہی! کچھ منہ سے بھی تو بولو میاں!
خوجی - گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی!!!
آزاد- کیا! اس کے معنی کیا! جنون ہوگیا ہے کیا؟
خوجی- بس، گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی!!!
آزاد- حُسن آرا بیگم کے ہاں گئے تھے، کسی سے ملاقات ہوئی، کیا رنگ ڈھنگ ہے؟ تم تو مخبوط الحواس معلوم ہوتے ہو۔
خوجی- وہاں گئے نہیں تھے تو کیا جہنم میں گئے تھے، نہ جانا کیا معنی؟ جائیں اور بیچ کھیت جائیں مگر ——
آزاد- اگر مگر کو تو رہنے دو، صاف صاف بتاؤ۔
خوجی- اس سے زیادہ صاف اور کیا ہوگا؟
آزاد- بھائی صاحب ہم نہیں سمجھے اور ہمیں اُلجھن ہوتی ہے خواہ مخواہ کے لیے طبیعت پریشان کرنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔
خوجی- از رقیباں حذر کن با بائے من بدیع۔
آزاد- رقیباں کیا؟ (سُرخ ہوکر)، یہ بکتا کیا ہے؟
خوجی- بکتا نہیں ہوں سچ کہتا ہوں، گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی، گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔
آزاد- (جھلا کر) خوجی اگر صاف صاف نہ بیان کروگے تو اس وقت بہت بُری ٹھہرے گی، بس اب تم کو اختیار ہے۔
خوجی- اور اُلٹے مجھی کو ڈپٹتے ہو، میں نے کیا بگاڑا ہے۔
آزاد- وہاں کا مفصل حال کیوں نہیں بیان کرتے؟
خوجی- کیا بیان کروں، حُسن آرا بیگم سے باتیں ہوئیں، گھنٹوں آپ کا ذکر خیر رہا، ایں جانب آپ جانتے ہیں ایک لسان آدمی ہیں، میں نے جو شاعرانہ تقریر کی تو وہ سماں باندھا کہ حسن آرا بیگم اور ان کی ہمجولیاں آٹھ آٹھ آنسو روئیں اور پھر ایک لطیفہ ایسا کہہ دیا کہ قہقہے پڑنے لگے۔

مس میڈا، مس کلیرسا اور پولینڈ کی شہزادی اور کُردی اور گیلی اور سبز پوش سب کے عشق کا حال بیان کیا اور آپ کی پاکدامنی کا ثبوت دیا پورا پورا۔ پھر تو یہ کیفیت تھی کہ جتنی بیٹھی تھیں دل میں سب کی یہی خواہش تھی کہ آزاد ہمارے میاں ہوں تو بڑا لطف ہے۔
آزاد- یہ کیا واہیات گفتگو ہے، پرائی بہو بیٹی کی نسبت ایسی بات زبان سے نکالنا پاجی پن ہے۔
خوجی- اجی ہم تو باتوں سے، اشاروں سے تاڑتے ہیں!
آزاد- اس وحشت کے صدقے، یہ گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔ اس کی خبر نہ ملی، عجب بے تکے ہو واللہ۔
خوجی سُنتے جائیے! میں نے آپ کا مفصل حال بیان کیا تو سب کی سب بڑی خوش ہوئیں اور کہنے لگیں کہ رجب علی بیگ سرور اور

خواجہ اماں سے بھی خواجہ بدیع بڑھ گئے، ان کی تقریر سے پھول جھڑتے ہیں۔ صورت تو کسی نے دیکھی نہیں مگر آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ انتہا کی حسینہ و جمیلہ ہیں اور سب شوخ و شنگ و چلبلی۔

اس کے بعد خواجہ صاحب نے پھر منہ بنایا اور بکمال فصاحت اور بلاغت اُس واقعہ کا حال یوں کہہ سنایا:

• ناقلانِ نقل الم و حاکیانِ حکایت غم تابوتِ قرطاس میں بعض مضمون کو یوں رکھتے ہیں کہ اندرینِ زمانہ یگانہ ربع کاشانہ میں ایک مرد خدا عارف باللہ، شرافت و نجابت دستگاہ، معروف و مشہور جہان، سحبان گیہان نامی خواجہ بدیع الزماں کہ شاعر اچھا اور منشی بہت اچھا تھا، ایک پری کے باغ میں داخل شد۔

آزاد نے جو یہ بے تکی ہانک سُنی تو ان کو اور بھی اُلجھن ہوئی، کہا از برائے خدا مختصر طور پر کہو، معلوم ہے کہ آپ سرور مغفور سے بھی اس فن میں بڑھ گئے، مگر نثاری کی لیاقت کے اظہار کا یہ کون موقع ہے؟

خواجہ صاحب نے بگڑ کے کہا یاروں کی تو یہی تقریر مسلسل ہے، جس کا جی چاہے سُنے خواہ نہ سُنے۔ یہ کہہ کر اپنی کہانی کا سلسلہ یوں شروع کیا:

• اس باغ رشکِ راغ پُر از بلبل و زاغ ——

آزاد۔ خدا کی مار اس بھونڈی تک بندی پر۔

خوجی۔ بس قبلہ بس اگر کل قصہ سننا ہے تو ٹوکیے نہیں اگر اب کی ٹوکا تو واللہ نہ کہوں گا۔ ذرا دل لگا کر سُنیئے (اس باغ رشک نباغ پُر از مینا و زاغ میں ایک چمپئی رنگ نرگسی آنکھوں والی متوالی کہ حسن میں یوسف مصری سے خراج لینے والی تھی۔ جہاں جہان خرامان خرامان نظر آئی - دیکھتے ہی میں نے کہا دُہائی فریاد رس الٰہی۔ حسن اتفاق سے لونڈوں نے جو مجھے اس گلبدن پاکدامن پر لٹو دیکھا تو تک بندی کے ساتھ آوازے کسنے اور پھبتیاں کہنے لگے۔

میں۔ اُس حسن کے ظلم سے خداوند کریم کی دہائی۔

لونڈے۔ ڈبیا دیا سلائی، ڈبیا دیا سلائی۔

میں۔ فریاد رس الٰہی، یا خدا تیری دُہائی۔

لونڈے۔ بس بونے پہلوان کی سچ مچ شامت آئی۔

میں۔ جور حسن اور تعدیٔ جمال اور جفائے ادا کی دہائی۔

لونڈے۔ بیٹھے بٹھائے بونے کی شامت آئی، قضا نے صورت دکھائی ڈبیا دیا سلائی۔

اس تکرار اور طبیعت داری اور غل کی آواز سے وہ خفتۂ چار بالشِ ناز سراپا انداز بیدار ہو گئی۔

آزاد۔ اس بے تکے پن کے قربان کہاں تو جہان جان خرامان خرامان کہا تھا، کہاں خواب ناز کا ذکر ہے، واہ!

خوجی۔ کیا عجب آدمی ہیں آپ بھی، چمن میں خرام کر رہی تھی مگر نرگس مست نے بدلیا دیکھتے ہی آنکھ لگ گئی۔ خیر اب سُنیئے کہ اس نسرین بدن کے جلو میں ہزارہا پریاں کوہ قاف کی تھیں۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ایک جوان کٹارکف سامنے آیا اور مجھے للکارا تو اپنے زعم میں ایناخب اپنے آپ ہی گر پڑے۔

آزاد۔ بہت خفا ہو کر تمھاری انھیں پاجی پن کی باتوں پر ہمیں غصہ آتا ہے بس، بھلا دل لگی اور فقرہ بازی اور تک بندی کا یہ موقع کون ہے، مگر کسے اس سے جو جھے۔

خوجی - اجی جناب صاف صاف یہ ہے کہ حسن آرا بیگم کے ایک اور چاہنے والے پیدا ہوئے ہیں اور اُن کی زنان خانے تک رسائی ہے۔ باغ میں بندہ بیٹھا تھا اور باغ کے بنگلے میں حسن آرا بیگم اور ان کی بہنیں اور بیگمات اور خواصیں بس، ایک جوان سامنے سے نمودار ہُوا اور مجھے دیکھتے ہی آگ ہو گیا۔

آزاد - کوئی خوبصورت آدمی ہے، کمسن ہے؟

خوجی - نہایت حسین اور ابھی بالکل کم سن ہے، بس بہت ہو تو پندرہ سولہ برس کا سن ہو بس اس سے زیادہ نہیں ہے۔

آزاد - اور ہاتھ پاؤں کیسے ہیں۔ ڈنٹر پیل جوان ہے یا دُبلا پتلا، وہاں کیا کرنے آیا؟

خوجی - بہت ہی نازک اندام، پتلی کمر، اے بالکل ہی بچہ ہے، اکا ہی بھی نہیں، ملوان سمجھیے اس نے کہا بھلا آزاد بیچارے کیا ہیں اور کل ہی نوابؤں سے ٹکڑے ٹکڑے سمجھ لوں گا، میری موجودگی میں حسن آرا بیگم پر کوئی نظر ڈالے کیا طاقت۔ یہ کہہ کر درّاتا بنگلے میں چلا گیا جہاں وہ سب بیٹھی ہوئی تھیں۔

آزاد - اس میں کچھ بھید ہے ضرور، تمھارے اُلّو بنانے کے لیے شاید دل لگی کی ہو، مگر ہمیں اس کا یقین نہیں آتا۔

خوجی - یقین تو ہمیں مرتے دم تک نہ آتا۔ مگر وہاں تو قہقہے پڑ رہے تھے اُس جوان خوبرو کے دیکھتے ہی بنگلے سے قہقہے کی آوازیں آنے لگیں اور جب میں اپنے زعم میں آرہا تو اور بھی قہقہہ پڑا، اس سے تو بھائی جان میں بہت کھٹکا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے، ورنہ نامحرم کو دیکھ کر قہقہہ کیسا؟

خواجہ صاحب نے قسم کھا کر اور آزاد کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا، آزاد! اس سر کی قسم کھا کے کہتا ہوں اور خدا اور خدا کا رسول گواہ ہے کہ بنگلے سے بیگمات نے قہقہہ لگایا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا اور مجھے یقین واثق ہو گیا کہ اس حسین جوان کی یہاں بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے، ورنہ غور تو کیجیے بھلا نامحرم کسی شریف زادی کے زنانے میں بے دھڑک جا سکتا ہے؟ اور ہاں خوب یاد آیا یہ تو کہنا بھول ہی گیا تھا کہ اُن کے پیچھے پیچھے ایک نہایت کمسن اور طرحدار نواب زادی تھیں خوب بنی ٹھنی۔ بڑے ٹھسے، پہلے تو اس جوان کو دیکھ کر بہت ہی اُچھلی کودیں اور غل مچایا اور مجھے للکارا کہ تم کیسے مردوے ہو کہ ان کو منع نہیں کرتے۔ یہ پرائے زنانے میں کہاں گھس آئے ہیں اور پھر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر زینے پر لے گئیں، وہ بھی بنگلے کی چھت پر داخل ہو گئیں اور اُس جوان کو بھی لیتی گئیں۔

آزاد - ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بے سر و پا کہانی کے کیا معنی ہیں اگر ایسا ہوتا تو اب تک تمام ہندوستان میں خبر مشہور ہو جاتی ہے، مگر خیر ؏

سمجھیں گے دل اشتاب کیا ہے

انشاءاللہ فہمیدہ خواہد شد، دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔

خوجی - اور اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ آج ضرور آؤں گا اور آزاد کو للکاروں گا کہ اس خیال خام سے درگذر، ورنہ تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

آزاد - خیر آنے دیجیے، بہت ہی خوش ہو کے جائیں گے۔

خوجی - ہوں! گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

آزاد - اخاہ! یہ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی کا یہ مطلب تھا؟ یہ کیسے مگر اب تک ہم کو یہ سب خواب خیال ہی معلوم ہوتا ہے،

واللہ اعلم۔

خوجی۔ بھائی سنو، وہ جوان اور جوان کاہے کو حلوان تو واقعی الیاسمین ہے کہ مردوں کا خود جی چاہتا ہے کہ اس کے لب شکر خا کا بوسہ لیں نہ کہ عورتیں، ہونٹھ واللہ یاقوت رنگ، رخسار تاباں بوسہ فریب آدمی کیا پری ہے واللہ ؎

میخانۂ او بہر قرابہ   دیوانۂ او بہر خرابہ

اور چال ورفتار کا عالم کچھ نہ پوچھیے، سبحان اللہ سبحان اللہ ؎

زاں غمزہ کہ درخرام کردہ   صد زلزلہ فتنہ دام کردہ

اور زلف مسلسل تو خدا کی قسم بس مرغ دل کی گرفتاری کے لیے زنجیر اور دام سے بھی زیادہ تھی، سچ کہتا ہوں اس زلف پرشکن و عنبر بار کا بھی کشتہ ہوں ؎

شب بھر تمھاری زلف مسلسل کی یاد میں   دو سانپ ہیں کہ سینے پہ لہرائے جاتے ہیں

اب ہم سوچے کہ اگر اس کے عشق کا اظہار کرتے ہیں تو آزاد بگڑ جائیں گے کہ واہ اچھے رہے، گئے ہماری معشوقہ پری زاد کا حال دریافت کرنے اور وہاں سے خود چرکہ کھا کے آئے، بیٹھے بٹھائے فضول عشق کے پھندے میں مرغ دل خوجی پھنسا آئے۔

آزاد۔ خیر سمجھا جائے گا، اب تو ہم کھانا کھانے جاتے ہیں۔

یہ کہہ کر آزاد اور وہ دونوں گلرخان پریزاد طعام لذیذ نفیس نوش جان کرنے گئے مگر خواجہ صاحب ہوٹل میں کھانا کھانے کے خلاف تھے ان کا قول تھا کہ جب قسطنطنیہ تک میں میں نے حتی الوسع ان امور کا پرہیز کیا اور عین جنگ کی حالت میں کسی ایسے مقام کا پکا ہوا کھانا نہ کھایا تو اپنے شہر اور اپنے ملک میں آن کے دس آدمیوں میں مطعون کیوں ہوں۔ اُنھوں نے ایک سرا میں جا کر جو ہوٹل کے ملحق تھی بھٹیاری سے کھانا پکوایا، ماش کی دال روٹی اور سالن مگر اس وحشت کو ملاحظہ فرمائیے کہ بھٹیاری سے بھی بات بات پر یہی کہتے جاتے تھے کہ گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔

اب حسن آرا بیگم کے ہاں کا حال سنیے کہ ادھر خواجہ صاحب گرتے پڑتے وہاں سے نفر و ہوئے اور ادھر گھر بھر میں قہقہے کی آواز گونجنے لگی۔ جانی بیگم کی کارستانی نے سب کو اس قدر ہنسوایا کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے، جس نے سُنا لوٹنے لگا اور خصوصاً جب خوجی کا مارے ڈر کے گرنا یاد آیا تو اور بھی ہنسی ہوئی۔

حسن۔ اوہ، جانی بیگم بہن نے اس وقت لٹا دیا۔

بہار۔ مجھے تو اس موٹے بونے کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آتی ہے کیا دھم سے گرا ہے کہ توبہ ہے۔

جانی۔ اوہ، اس قدر گھبرایا کہ توبہ ہی بھلی۔

خواص۔ اے حضور حواس نفر و ہو گئے، ہوش غائب۔

مہری۔ اور دل لگی تو جب معلوم ہوئی جب گرے، پھر اُٹھنے کا نام تک زبان پر نہ آیا، کس مزے سے لیٹے ہوئے تھے۔

نازک۔ اس وقت تو جی چاہتا تھا کہ جانی بیگم کو چوم لیں۔

جانی۔ کیا مضائقہ ہے، بسم اللہ پھر دیر نہ کرو بہن۔

سپہر۔ اب دل لگی ہو کہ وہ جا کے آزاد سے کچا چٹھا کہہ دے۔

حسن۔ ہاں یہ ہمیں خیال ہی نہ تھا، مگر آزاد ایسے کچے نہیں ہیں، کوئی لاکھ کہے وہ کب ماننے والے ہیں، ہاں تشویش تھوڑی

دیر ضرور رہے گی۔
حسن۔ پھر اس کا دفع دخل، خدا جانے وہ مُوا سڑی سودائی کیا بکے اور اُن کے دل میں کیا خیال آئے؟ بُری ہوئی بہن، اب ہمیں خود ایک طرح کی تشویش ہو گئی ہے۔
سپہر۔ نہیں باجی جان! تشویش کا کوئی مقام نہیں۔
بہار۔ نہیں سچ کہتی ہیں، وہ نگوڑا دوانہ ضرور جا کے کہے گا اور اس کو تو پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہ مرد ہے اور گھڑی گھڑی کنارے کی طرف دیکھے اور پیچھے ہٹتا جائے، اس کے کہنے سے آزاد کو چاہے پہلے یقین نہ آئے مگر یہ ممکن نہیں کہ جب وہ قسمیں کھائے اور یقین دلائے تب بھی ان کو شک ہی رہے۔
حسن۔ پھر باجی جان! آپ ہی سمجھیے، آپ نے اُن کو کیوں اجازت دی اور جو اُن کے دل میں شک پیدا ہوا تو پھر کیسی ٹھہرے گی!
سپہر۔ اب اس وہم کا تو کوئی علاج ہی نہیں ہے۔
نازک۔ ہاں اگر شک کسی قدر ہوا بھی تو رفع ہو جائے گا۔
سپہر۔ آخر یہ ہو سکتا ہے کہ خوجی کو آدمی بھیج کے ہوٹل سے بلواؤ، جو آدمی بُلانے جائے وہ ہنسی ہنسی میں آزاد سے یہ بات کہہ دے۔

حسن آرا بیگم کی صلاح سے پیر مرد کو آزاد کے پاس روانہ کیا تاکہ کل امور مفصل بیان کر کے ان کی تشفی کریں۔
پیر مرد آصف الدولہ کے وقت کا درباری لباس زیب بدن کر کے ایک پُرانے دقیانوسی میانے پر سوار ہوئے اور ہوٹل میں پہنچ کر اطلاع کرائی۔ آزاد نے جو اس رفیق قدیم کو جو خاص باعث ملاقات اور ذریعہ رسائی تھا دیکھا تو بڑے تپاک سے استقبال کیا اور مصافحہ کر کے برآمدے میں کرسی پر بٹھایا اور قریب کی کرسی پر خود متمکن ہو کر یوں مکالمہ کرنے لگے۔
آزاد۔ گو دل تو گواہی دیتا تھا کہ خدا ہماری محنت ٹھکانے لگائے گا مگر کبھی کبھی ابر مایوسی بھی گلشن دل پر چھا جاتا ہے۔
پیر مرد۔ بھائی آزاد! وہ کام تم نے کیا ہے کہ دوسرے سے نہ ہو سکتا۔ میں نے اس وقت تمہیں کیا دیکھا کہ آنکھوں کو نور سے معمور کر دیا۔
آزاد۔ اخبار تو آپ کے پڑھنے میں آتے ہوں گے۔
پیر مرد۔ برابر تار بندھا ہوا تھا اور مجھ کو سب سے زیادہ فکر تھی، کیونکہ میں ہی ان امور کا باعث ہوا تھا۔ جب میں نے تم کو دیکھا تھا معاً دل میں کھپ گئی کہ یہ رعنا شمائل زیبا خصائل جوان حسن آرا کے قابل ہے۔ حضور چاہے آپ انکار کریں مگر یہ سب ہماری ذات سے ہوا ہے، اگر ہم اس وقت ڈھیل دیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ پرندے کے تو پَر جلتے تھے انسان کی کون کہے۔ لوگوں نے کیسے کیسے اڑنگے لگائے۔ دراندازوں نے کیسی کیسی درانداز یاں کیں مگر میرے سبب سے ایک کی بھی دال نہ گلنے پائی۔ آخر کار حسن آرا بیگم تک رسائی ہوئی۔ بجرے پر سوار ہو کر ہوا کھائی سیر دریا بھائی۔ دونوں کی بن آئی، ایک وہ وقت تھا اور ایک یہ وقت ہے۔ ایک مرتبہ یہاں خبر مشہور ہو گئی تھی کہ آزاد نے نصیب اعدا کسی نیچ قوم کی عورت کے ساتھ جو کسی ادنیٰ سے آدمی کی جورو تھی شادی کر لی اور یہاں تک گپ اوڑی کہ پہلے آزاد نے اس کے میاں کو سنکھیا دے کر مار ڈالا پھر شادی ہوئی اور خرابی یہ کہ خبر ایک اخبار میں درج ہوئی اور وہ اخبار مفسدہ پردازوں اور رخنہ اندازوں نے جو انتہا کے شقی القلب اور ناخدا ترس ہوتے ہیں، کسی ترکیب سے حسن آرا بیگم کے نام بھیجا۔ بس اس مضمون کا پڑھنا تھا کہ آگ ہو گئیں اور زار زار رونا شروع کیا۔ دن کو چین نہ

راتوں کو قرار الب پر فغاں و نالہ، آنکھیں اشکبار دیوانہ وار کبھی گھر گلزار میں باد ل زار پھرتی تھی مگر گھر ویرانہ اور باغ خارستان سے بدتر نظر آتا تھا۔ پس اُسی روز دو توریہ رنج و قلق سے نوبت باینجا رسید کہ از بس ضعیف ہو گئیں۔ نشست و برخاست کی طاقت نہیں رہی اور آخر کار بات کرنا بھی دو بھر ہو گیا۔ کیفیت رفتہ رفتہ ردّی ہوتی گئی۔ حتّٰی کہ ڈاکٹروں اور حکیموں تک کو صحت میں شک ہو گیا اور ایک روز آنکھیں پھیر دیں اور نصیب اعدا دو پہر کے دم بھرنے لگیں۔ سرِ بالیں کہرام مچا ہوا تھا۔ میں باہر اپنے کمرے میں دم بخود پڑا سسکیاں بھر رہا تھا کہ یا خدائے کیا ہوا، ابھی گل خنداں پر اتنی جلدی اوس پڑ گئی، کھلتے ہی مرجھا گیا، باد سموم نے غنچۂ دل کو پژمردہ اور چراغِ طمانیت کو افسردہ کر دیا۔

آزاد۔ ارے غضب، یہ نوبتیں پہنچیں، الٰہی توبہ!

پیر مرد۔ اُس دن کا حال کچھ نہ پوچھیے، بس ناگفتہ بہ ہے۔

آزاد۔ یہ کس ذات شریف کے کانٹے بوئے تھے؟

پیر مرد۔ یہ نہ پوچھئے، گذشتہ را صلوٰۃ، مضی ما مضیٰ۔

آزاد۔ اگر ملیں تو بایاں قدم لوں کہ واہ حضرت واہ!

پیر مرد۔ خدا خدا کر کے ڈاکٹروں کی سریع التاثیر ادویہ سے اس قدر افاقہ ہوا کہ معاً آنکھ کھول دی اور پانی مانگا تو لوگوں کے دلوں میں ڈھارس ہوئی جان میں جان آئی۔

آزاد۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہماری ہی داستان مصائب بے پایاں سے کوٹ کوٹ کے بھری ہے مگر یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ادھر بھی رقیبوں اور حاسدوں نے اپنے نزدیک کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا۔

پیر مرد۔ آخر کار دو ہی چار روز گذرے ہوں گے کہ اس مضمون دروغ بے فروغ کی قلعی کھل گئی اور حسن آرا کو کامل یقین ہو گیا کہ واقعی بے سر و پا بات تھی۔

آزاد۔ شکر خدا، ہمیں حیرت ہے کہ حسن آرا کو اس بات کا کیونکر یقین ہو گیا کہ آزاد سے ایسا فعل ناشائستہ سرزد ہوتا؟

پیر۔ طبیعت ہی تو ہے، دل میں یہی سمائی۔

آزاد۔ خیر اس کی شکایت ملاقات کے وقت کی جائے گی۔

پیر۔ وہ آپ کے میاں خوجی کہاں ہیں؟ ان کو بلوائیے، وہ تو نقل محفل ہیں؛ واللہ!

آزاد۔ آپ کے یہاں سے جو آئے تو نہایت ہی برہم، اب مجھ سے گفتگو نہیں کرتے، نہ کسی بات کا جواب دیتے ہیں۔ ہر سوال کے جواب میں یہی کہتے ہیں کہ دگھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔

پیر مرد۔ حضرت وہ تو ایسے بنائے گئے کہ تو بہ ہی بھلی۔ کم سنی آپ جانیے ہزار شوخیوں کی ایک شوخی اور پھر آپ ہر خط میں میاں خوجی کی تعریف لکھتے ہی تھے۔ حسن آرا بیگم اور سپہر آرا اور روح افزا اور ان کی سب بہنوں اور ہجولیوں کو دل لگی ہاتھ آئی۔ اول تو ماشاءاللہ ان بزرگوار کی قطع ہی ایسی ہے کہ صورت دیکھتے ہی انسان کو بے اختیار ہنسی آتی ہے، آدمی کیا زعفران زار ہے۔

آزاد۔ حضرت اس نے تو وہ کہانی سنائی کہ میرے ہوش اُڑ گئے۔ اگر سچ ہے خدا ہی حافظ ہے مگر خوجی کی بات کا جو یقین کرے اس سے بڑھ کر بے وقوف کوئی نہیں۔

پیر۔ آپ تو خود دانا بینا آدمی ہیں، آپ کو سکھانا حکمت بہ لقمان آموختن سے کم نہیں۔ ہوا یہ کہ انھوں نے جو بے تکی افیونیوں کی

باتیں شروع کردیں تو وہ سب سمجھ لیں کہ پورے سرے کا احمق چرچرا اور گاودی اور مسخرا ہے، پھر کیا شگوفہ ہاتھ آیا اور حسن آرا کی دو بجولیاں بھی اس وقت وہاں موجود تھیں، جانی بیگم اور نازک ادا بیگم، یہ دونوں کمال شوخ اور چلبلی ہیں، ان میں جانی بیگم نے وہ مذاق کیا کہ خوجی کے آئے حواس غائب ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نوجوان کٹار ہاتھ میں لیے اکڑتا ہوا چلا آتا ہے۔ اگر خواجہ صاحب کو ذرا بھی عقل ہوتی تو صورت ہی سے بھانپ لیتے کہ عورت ہے۔ مرد اور عورت کا قد و قامت، چال ڈھال وضع قطع بھلا کہیں چھپی رہتی ہے، مگر ان کو عقل سے تو کوئی بحث ہی نہیں۔ دل پر نقش ہو گیا کہ یہ کوئی جوان نازک اندام ہم سے لڑنے کے لیے آتا ہے۔ ان کے پیچھے حسن آرا کی بڑی بہن بہار النسا تھیں۔ اب اگر ذرا بھی عقل سے کام لیتے تو سمجھ جاتے کہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے مگر یہ سمجھے کہ بہار النسا کی عدم واقفیت میں وہ مرد خوبرو باغ میں گھس آیا ہے، لگے غل مچانے۔

آزاد۔ لاحول ولا قوۃ، تو کیا جانی بیگم مرد کا لباس پہن کر آتی تھیں؟

پیر۔ جی ہاں! لیکن صورت سے صاف معلوم ہوتا تھا۔

آزاد۔ بس اب میرا شک رفع ہو گیا۔ خوجی بھی عجب کمبخت آدمی ہے، مجھ سے آن کے بات ہی نہیں کی، جو کچھ ہم پوچھتے ہیں اس کے جواب میں یہی کہتا ہے کہ دو گھڑی دم میں مر لیا باجے گی۔ آخر کار جب میں نے للکارا تو یہ کہانی کہی کہ حسن آرا بیگم کے ایک اور چاہنے والے پیدا ہوئے ہیں۔

پیر مرد۔ لاحول ولا قوۃ۔ عجب خبط الحواس آدمی ہیں!

رفتن مہندی از خانہ عروس

بیا ساقی اے درخت صد بہار ۔۔۔ مے سُرخ در ساغر زرنگار
بمن دہ کہ از رنج یابم فراغ ۔۔۔ بیک جرعۂ می شوم تر دماغ

آج عروس دہر پراس غضب کا جوبن اور ستم کا نکھار ہے کہ قاضی دعابد، شیخ وزاہد تک کو نشۂ مے کا خمار ہے۔ کہیں عرائس مست وطناز کہیں مطربانِ خوش، ادا نازنینان سرو قد اور پری رویان گلعذار غد برنگ شمشاد دست نگارین میں گلدستہ ہائے رنگین لیے ہوئے بہ ہزاراں ناز خراماں و بہ نہایت انداز چہاں چہاں صحن خانہ میں مستی کے ساتھ جلوہ افگن تھیں۔

دلہن کے ہاں بزم طرب بھی دُلہن بنی ہوئی تھی اور محفل رشک ارم میں اشیائے سُرخ کی کثرت سے گل لالہ کھلا ہوا تھا کمرے آراستہ، سامان دل خواستہ۔ بانو یان پریزاد و دوکش خوبان فرخار اور سامان شادی پر جشن جمشید ی و بزم فریدونی نثار۔

معشوقہ پریزاد نازک ادا بیگم بادلِ شاد بار بار نزاد ڈومنیوں سے فرمایش کرتی جاتیں اور سامعین کو بار بار وجد میں لاتی تھیں۔

دُلہن کا حسن عالم آشوب اور خدا داد تھا، رشک جمال خوباں نوشاد تھا۔ نازک ادانے بکمالِ ناز یہ شعر گایا:۔

امشب ایں مجلس رنگین زعنا بنداں ست ۔۔۔ بہ خوشی دلولۂ شوق چہ دو چنداں ست
دیدہ چوں روشنی دست نگاریں آں ماہ ۔۔۔ پنجۂ مہر بصد رشک بخود لرزاں ست

کمرے کی دیواریں شنجرف اور گوند سے اس طرح رنگی ہوئی تھیں کہ دیکھنے والوں کی نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ یہ خود بڑی بیگم کی فرمائش سے منوں شنجرف اور صرف کثیر سرمایہ خطیر سے رنگی گئی تھیں اور چھت گیری کے عوض گراں بہا سُرخ زرلفت لگا یا تھا اور سنہری کلابتوں کی جھالر جھمکتی تھی۔ سُرخ کاشانی مخمل کی کارچوبی مسند اس میں سنہری مقیشی جھالر لگی تھی اور تکیے سُرخ مخمل کے اور ان پر کارچوبی کام بنا ہوا۔

اس پر بڑی بیگم نے یہ بات ایجاد کی کہ سُرخ کریب کا ہلکا پھلکا شامیانہ نصب کیا تھا، اس کی جھالر بھی سنہرے بادلے کی تھی سنہرا لچکا اور سنہری کرن ٹکی ہوئی۔ چکنی کا جال کیا ہوا شامیانہ بڑے اہتمام بلیغ سے بنوا یا گیا تھا اور سونے کی چوبیں اس لگی ہوئی تھیں۔ اس ایجاد کا یہ اثر ہُوا کہ اور شہزادوں نے بھی اس کا تتبع کیا اور مسند کے لیے شامیانہ ہر مقام پر جاری ہو گیا۔ فرش بھی سُرخ مخمل کا تھا اور کہیں پشمینے کے سُرخ غالیچے بچھے ہوئے تھے اور کہیں ریشمی بیش قیمت سرخ دریاں زینت بزم تھیں۔ پشمینے کے غالیچوں پر عجب جوبن تھا۔ جھاڑ اور کنول اور مردنگ ہانڈیاں سب سرخا سُرخ اور سُرخ ریشمی ڈوریوں اور طلائی زنجیروں سے لٹکائی گئی تھیں۔ دیوار گیریاں سُرخ شیشے کی۔ کمرے کو شیش محل کر دیا تھا۔ خواصوں، مغلانیوں، پیش خدمتوں، حبشنوں، محلداروں کو گرنٹ اور گلبدن اور کمخواب تک کے جوڑے ملے تھے۔ الغرض جہاں تک نظر جاتی تھی ہر شے سُرخ ہی سُرخ نظر آتی تھی اور خواتین سیم غبغب شکر لب کے رخسار تاباں سے بزم نشاط اِندر کے اکھاڑے اور پرستان پر رشک زن تھی۔

جو بانوی بلقیس مرتبت اس محفل مینو آئین اور بزم رنگین میں آئی تھی، اس کر و فر کو دیکھ کر یہ شعر زبان پہ لاتی تھی:۔

نگاہم از تماشا گشت گلگوں   بہار این چنیں خوں میکند خوں

اتنے میں ایک سکھپال لے کر مہریاں صحن محل سرا میں آئیں اور سب کی نظر اسی رُخ تھی کہ ایک شہزادی قمر طلعت زیبا اندام نازک خرام ادائے رنگین سے اُتری اور کبک دری کو پامال خرام نازکرتی ہوئی چلی۔ ان بیگم صاحب کو ہمجولیاں پری بانو کہتی تھیں۔ پہلے بڑی بیگم۔ سے ملیں، بعد ازاں دلہن کے پاس آئیں دُلہن کو دیکھ کر مسکرا کے کہا:

سپہر آرا۔ ہاں اب نازک ادا بہن کی جواب دینے والی آگئیں، برابر کی جوڑ ہے یہ کم نہ وہ کم۔

روح افزا۔ ہاں اور صورت بھی دونوں کی ملتی ہے۔

نازک ادا۔ کیا اچھے شعر پڑھے ہیں پری بانو نے،

روح افزا۔ ارے ان کا کیا نام ہے؟ پری بالو پری بانو سب کہتے ہیں مگر نام تو پیارا ہے۔

نازک۔ پیارا کیوں نہ ہو ان کے میاں نے یہ نام رکھا ہے۔ پھر پیارے کا نام رکھا ہوا کیوں نہ پیارا ہو۔

پری بانو۔ اور تمھارے میاں نے تمھارا نام کیا رکھا ہے۔ ہم تو جانتے ہیں چربانک محل نام رکھا ہوگا۔

جانی بیگم۔ کیوں پری بانو سچ کہنا کیسا کمرہ سجایا ہے

پری۔ بڑی بیگم بڑی ذی حوصلہ ہیں۔

جانی۔ اس وقت یہاں دو دُلہنیں ہیں بتاؤ کون کون؟

پری۔ ایک تم دوسری حسن آرا بیگم یہی دو نا۔

جانی۔ واہ آپ کیا پوچھو گی بیچاری عقل بڑی کہ بھینس۔

پری۔ نہیں آپ بھی اپنے کو کوئی چیز سمجھتی ہیں۔

جانی۔ ایک دُلہن حسن آرا، دوسری دُلہن محفل۔

نازک۔ اس وقت جو خوشی ہمیں ہے وہ بیان نہیں ہو سکتی۔

پری۔ ہمارے ہاں ایک قلماقنی کہتی تھی کہ آزاد نے جوڑا پہننے سے انکار کیا تھا۔ سُنا پہلے بہت رنگ لائے تھے ساچق کے روز مگر جب بہنوں نے قسمیں دیں تو مجبور ہو کر پہننا ہی پڑا اور مانجھے کا جوڑا پہن کے جلدی سے اُتار ڈالا۔ انگریزیت مزاج میں بہت ہے۔

نازک۔ بھلا اُن کے حسن کی نسبت قلماقنی کیا کہتی تھی۔

پری۔ کچھ نہ پوچھو اتنی تعریف کی کہ مجھے ان کی دید کا اشتیاق ہو گیا اور نکاح کے دن ضرور دیکھوں گی اگر نہ آسکی تو برات تو دیکھوں ہی گی۔

نازک۔ جو جاتا ہے اور دیکھتا ہے وہ حسن کا مداح آتا ہے۔

پری۔ خوشبو جان نے ان کی تصویر کہیں دیکھی تھی۔ وہ تصویر دیکھ کر عاشق ہو گئیں کہتی تھیں ہم نے ایسا حسین جوان آج تک دیکھا ہی نہ تھا۔ نظر نہیں ٹھہرتی ہے رُخِ انور پر۔ یہ نور ہے۔

جانی۔ حسن آرا اس وقت اپنے دل میں خوش ہوتی ہوں گی کہ جو آتا ہے آزاد کے حسن کی تعریف کرتا ہے۔

جانی بیگم کی مہری عیدو اُن کی گنگا جمنی گڑگڑی لے کر آئی تو تمام بارہ دری مہک اُٹھی۔ تین سو کا حُقہ سچے سلمے کا نیچہ؛

یاقوت کی نئی گڑھت کی حقال عدیم المثال۔ کل بیگمات کی اس گڑگڑی پر نظر پڑی اور تمباکو کی خوشبو نے دماغ کو طبلۂ عطار بنا دیا۔ نازک ادا نے گڑگڑی لے کر ایک کش لیا تو وجد کرنے لگیں۔ کہا بہن! یہ کس دکان کا تمباکو ہے؟ واہ کیا بو باس ہے دھوئیں کی سیاہی رشک زلف خوباں علغ و نوشاد ہے، اگر گڑگڑی پریزاد ہے۔ جانی بیگم بولیں تمباکو تو اچھا ہے ہی مگر دام بھی اچھے ہیں، دو روپیہ سیر کا تمباکو ہے۔ اس شہر کے بڑے بڑے شہزادے دو سیر سے زیادہ نہیں پیتے۔ جو دو ایک بڑے شوقین مشہور ہیں وہ، د پیہ سیر والا پیتے ہیں۔ پوچھا یہ کس دکان سے منگواتی ہو؟ کہا دکانیں تو یوں شہر میں بہت ہیں مگر سچ پوچھو تو محمد علی اور اعظم علی لکھنوی کی دکان کو ان سب سے وہی نسبت ہے جو ستاروں کو چاند سے، وہ ستارے ہیں تو یہ چاند۔ اس دکان کا تمباکو مہینوں کی راہ پر جاتا ہے، اس ملک کے جتنے نواب اور رئیس شوقین ہیں منوں تمباکو یہاں سے منگواتے ہیں اور اس کی بو باس پر عاشق ہیں، لطف اس میں یہ ہے کہ اول سے آخر تک ایک ہی طرح کا دھواں آتا ہے۔ چاہے جل جائے سوخت ہو جائے مگر رنگ نہیں بدلتا۔ پارسال ایک آدمی دلی سے تمباکو لایا تھا اور اسی روپیہ تولہ بیچتا تھا۔ چھوٹی شہزادی کے مکان کے پاس دکان ہے۔

نازک۔ اسی روپیہ تولہ؟ (سخت متحیر ہو کر)

جانی بیگم۔ ہاں ہاں اسی روپیہ تولہ، سیر نہیں۔

نازک۔ اس میں کیا بات تھی، جواہرات کوٹ کے ملا دیے تھے یا کوئی نسخہ ملایا تھا، جالینوس سے کسی ترکیب سے بنوایا تھا، آخر بات کیا تھی، اسی روپیہ تولہ؟

جانی بیگم۔ بات یہ تھی کہ توے پر ایک لکیر کھینچ دی اور آگ رکھ دی اور پینا شروع کیا، خوش مزہ تو ضرور تھا مگر امیروں کا چونچلا۔ جو بات اس میں ہے وہ اس میں کہاں، زمین و آسمان کا فرق، کجا یہ کجا وہ۔

نازک ادا بیگم نے تمباکو کی بڑی تعریف کی اور ہمجولیوں کو جو حقہ پیتی تھیں گڑگڑی دی اور سب عش عش کرنے لگیں تو نازک ادا نے کہا بہن ہم کو بھی منگوا دیا کرو۔

جانی بیگم بولیں ہمارے ہاں کا سودا جا کے آٹھویں روز لاتا ہے۔

۱۲ بجے شب کو مہندی روانہ ہوئی۔ محل سرا سے سوا سو کشتیاں باہر نکالی گئیں اور ان میں دولہا کا جوڑا لگایا گیا۔ تاج مرصع مع جیغہ و سرپیچ و کلغی و پر ہما جامدانی کا انگرکھا گلنار رنگا ہوا، بنت اور لچکا ٹکا ہوا کریب کا جامہ کارچوبی پٹکا اور پائجامہ آرام پائی زردوزی اور پھندنا اور شمسہ، دوشالہ خاص کشمیر کے پرفن اور مسلم الثبوت کاریگروں کا بنایا ہوا۔ دہن دار رومال سرخ گرنٹ کا حنا بند رنگ اور شوخی میں یاقوت سے دوچند۔ ایک طرف ناڑا رکھا گیا، پھول اور مقیش کی چھڑیاں۔ چنگیروں میں بدھی اور طرہ چاندی کا پان دان۔ زیوروں میں نورتن رشک دُرِ عدن، بجو بند بیش بہا، دست بند اور ڈُلڑا لپا گلوبند وغیرہ وغیرہ۔

جب جلوس سجایا گیا تو خواجہ صاحب آن موجود ہوئے اور آتے ہی غل مچانا شروع کیا۔ سب قرینے کے ساتھ لگاؤ اور اہتمام اور دھوم دھام سے جلوس بڑھاؤ اور خبردار زنہار بالحکم خواجہ صاحب شاعر باوقار شاہی کے رسالدار اور کمیدان جرار یعنی بندۂ بدیع سلیقہ شعار کے کوئی فرد بشر از قسم اناث و مرد و مذکر و مؤنث و نر و مادہ بہ ہمراہی بغیر اجازت خواجہ مبرور کوئی کام از قسم انتظام و اہتمام و انصرام نہ کرے ورنہ مستوجب سزائے اخراج فہمیدہ شدہ خواہد بود۔ اے سبحان اللہ!!!

آرایش کے تخت بڑے بڑے کاریگروں سے بنوائے گئے تھے، جس نے دیکھا دنگ ہوگیا اور تعریف کے پُل باندھ دیئے۔

۱۔ یوں تو ہر شے بے نظیر ہے مگر تخت سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں، واہ واہ بڑی کاریگری کی ہے۔

۲۔ کمال صناعی ظاہر کی ہے، ہر تخت بے بدل ہے۔

۳۔ بڑا روپیہ انھوں نے بھی صرف کیا ہے صاحب!

۴۔ بیر دل کی سوگی کا لطف آتا ہے۔

۵۔ دریں چہ شک، پھول کیسے شاداب بنے ہیں!

۶۔ بس انتہا یہ ہے کہ سچ مچ کے پھول معلوم ہوتے ہیں۔

۷۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کلیاں چٹکی ہیں، اے سبحان اللہ اور اس سرو کو دیکھیے گا، سرد کیا بہار کا چوبدار ہے!

۸ چاندی کے تخت بڑے لطف کے بنے ہوئے ہیں۔

۹۔ ارے یار چانڈو بازوں کے تخت کہاں ہیں؟

۱۰۔ چانڈو بازوں کا تخت کجا یہاں، یہاں پھول باغ سرو بہار آبشار ہاتھی گھوڑے اب کل کو آپ کہیں گے کہ شراب خوروں دھوبی کہاروں اور مدکیوں اور چرسیوں اور گنجیڑیوں اور بھنگڑیوں کے تخت ہوں آپ کی بھی کیا عقل ہے ماشاءاللہ۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چانڈو بازوں کا تخت بھی نظر سے گذرا اور قہقہہ پڑا۔ لوگوں نے کہا، دیکھیے چانڈو بازوں کا تخت بھی آگیا۔ اہو ہو سب کے سب اوندھے پڑے ہیں۔ بخت نگوں کی طرح خود بھی واژگوں ہیں اور ان نیک بخت کو تو دیکھیے کس لطف سے مردے کا سر زانو پر رکھے ہیں۔ دوسرا بولا، اجی یہ بھی تین چار چھینٹے اُڑا چکے ہوں گے۔ آنکھوں سے چانڈو بازی کا حال نظر آتا ہے مگر خدا کی قسم تصویر کھینچ دی ہے۔ کمال کے معنی یہ ہیں، یہی معلوم ہوتا ہے کہ سچ مچ چانڈو خانہ ہی ہے اور وہ دیکھیے کہ پونڈا کس مزے سے چھیل رہے ہیں۔

ایک شخص نے پوچھا، بتایئے یہ سامنے کیا بنا ہے؟ کئی آدمیوں نے تشخیص کی مگر ایک دبلے پتلے آدمی نے کہا۔ یار دیہ ہم بتا سکتے ہیں اور کوئی نہیں بتا سکتا، ہم تو چانڈو باز ہیں، یہ پونڈے کے چھلکے ہیں۔ حضرت ان کی پیٹھ ٹھونکی گئی اور بڑی تعریف ہوئی اور چانڈو باز صاحب اکڑنے لگے۔ فرمایا دیکھیے اس شہر میں وکیل بھی ہیں اور عدالتیں بھی ہیں اور تاجر بھی ہیں اور دکانیں بھی ہیں اور سب کچھ ہے، مگر تخت ہمارا ہی بنایا گیا اور کوئی کسی کو نہیں پوچھتا تو سبب کیا، چنڈو باز تو مقبول بندگانِ خدا ہیں۔

اتنے میں ایک تخت پر بہت بڑا ہاتھی بنا ہوا سامنے آیا، اس ہاتھی میں بڑی صناعی کی گئی تھی۔ اس کے بعد ترک سواروں کا تخت آیا۔ گھوڑے طاؤس دم زریں لگام تندخو، آہو خرام، ترک سوار گردان گردن کش، جوانان رعنا کرتیاں سرخ بانات کی لالہ زار کھلا ہوا سر پر بانکے ترچھے خود اور ان کے اوپر کلغی لگی ہوئی، بوٹ چڑھائے ہوئے ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے ہوئے، یہی معلوم ہوتا تھا کہ رسالہ نے اب دھاوا کیا اور اب دھاوا کیا، باگیں اُٹھائے بگٹٹ دوڑایا ہی چاہتے ہیں۔ بعد ازاں ایک تخت پر ہوادار نظر آیا آٹھ کہار ساتھ، تین تین اِدھر اُدھر ہوادار اُٹھائے ہیں اور ایک ایک کاندھا بدلنے کے لیے ہمراہ ہوادار بالکل چاندی کا بنا ہوا نظر آتا تھا اور اس میں پرانے فیشن کے ایک نواب صاحب متمکن تھے۔ خدمتگار کے ہاتھ میں حقہ پیچوان پیتے جاتے ہیں۔ کہاروں کی ہری وردی اور لال لال پگڑیاں اور مچھلیاں دور سے بعینہٖ اصلی ہوادار ہی کا دھوکا ہوتا تھا۔

بعد ازاں ایک فنس آئی، مہریاں اِدھر اُدھر ہمراہ اور سواری کے ساتھ چار سپاہی بانکی ترچھی بتیاں دیے اور ایک نقیر گویا

دوڑتا ہُوا ساتھ جاتا تھا۔ ایک مہری کے چیتون اس درجہ تیکھی تھی کہ نقل کو اصل کر دکھایا، یہ گویا فقیر کو ڈپٹ رہی تھی کہ دُور موئے کان نہ کھا الگ الگ آ سواری پر کیوں بلا پڑتا ہے۔

خواجہ بدیع الزمان صاحب بدیع نے للکارنا شروع کیا کہ لال مہتابیں برابر روشن رکھو تاکہ چوک میں ادھر اُدھر کروں پر جھمکڑا نظر آئے۔ ہم چوک کے کمرہ ہی کو تکتے ہوئے نکلے۔ اُس جلوس میمنت مانوس کے ساتھ رنگین طبع جوان رنگیلے آدمی بہت ہیں۔ روشنی ایسی ہو کہ دن کو مات کردے۔ روزِ روشن گرد بد ہو جائے۔ پنجشاخے چڑھاؤ، پنجشاخے والے بڑھاؤ باجے بجاؤ، گھوڑوں کو چمکاؤ، ہاتھی ڈٹاؤ۔ مگر اس پنجشاخے والی کو نہ آنے دینا خبردار، خبردار کہہ دیا ہے۔ مگر آج آئی تو کوچے ہی کاٹ ڈالوں گا۔ اُس روز اُس کی موت نہ تھی، ورنہ دم کے دم میں کرڈالتا۔ ادمشعلچی ادھر مشعل لا، ادھر دکھا۔ دیکھو ہر سواری کے ساتھ دو دو، ایک ایک پنجشاخے والی رہیں۔ ہوا دار کے ساتھ ایک ادھر ایک اُدھر چار چار مشعلچی آگ لگا دو بازار میں سب پھُکا ہوا نظر آئے۔ لالہ زار چراغوں کی چکا چوند ہوا اور جس قدر سائیس ہیں سب کو تاکید کی جاتی ہے، کہ فوراً اور معاً گھوڑوں کو چمکائیں اور ہر مقام پر گھوڑے چالاکیاں دکھائیں اور فیلبانوں کو حکم دو کہ وہ ہاتھیوں کو ذرا آتشبازی کے پاس لے جائیں، جس میں خوب بھڑکیں، لوگوں نے ہنسنا شروع کیا۔

لوگ ۔ ہاتھی بھڑکیں تو خوب ہی لطف ہو خواجہ صاحب،

خوجی ۔ اس سے زیادہ لطف خدا کا نام ہے جناب!

لوگ ۔ بجا ارشاد، مگر دھرے بھی جایئے گا۔

خوجی ۔ کیا مجال دھرے جانے کی ایک ہی کہی آپ نے۔

لوگ ۔ ہاتھی بھڑکیں اور دو چار سو آدمیوں کا خون کریں اور سو دو سو بلکہ ہزار دو ہزار مجروح ہوں تو دل لگی دیکھیئے۔

خوجی ۔ سب ہاتھی تو بگڑنے سے رہے، اگر دو تین بھی بگڑے تو کچھ پروا نہیں دُم پکڑ لوں تو ہمس نہ سکے۔

لوگ ۔ تو دُم ایک ہی کی پکڑ بیٹھے گا اور باقیماندہ کو کیا کیجیے گا حضرت؟

خوجی ۔ ایک کی دم، ایک کی سونڈ اور ایک کو ڈانٹ بتائی، بھلا بے بھلا خبردار جو آگے بڑھا، خبردار، بس مجال کیا کہ بڑھ سکے اور کیا چنگھاڑ کے منزلوں بھاگے۔

لوگ ۔ تو پھر ایک آدھ ہاتھی کو ریل دیجیئے نا۔

خوجی ۔ نہیں صاحب آج نہیں، اب اپنی شادی کے دن ؎

گرچہ کس بے اجل نخواہد مُرد   تو مَرو در دہانِ اژدرہا

جلوس کے ساتھ بادبہاری نے عجب لطف دکھایا، بینڈ نوازوں کا اعجاز، بگل والوں کی خوش آئند آواز، سامنے ماہی مراتب عالی شان، ادھر اُدھر ذوالفقار بحرابے لنگردار، کلہ شیر دلبر مچھلی لٹو، ایک تلنگا کوس بھیا دھکیلتے جاتا تھا اور نقیب کی آواز دُور باش وادب سے شان اور بھی دوبالا تھی، سواریوں کے آگے ڈنکا بیگمات عصمت سمات اور خواتین عفت مآب سکھپال پینچ کلسے بوچے پالکیوں میں سوار، ادھر اُدھر خواص خاص بردار، مہریاں طرحدار، طرار پیچھے رتھوں پر خواصیں، مغلانیاں پیش خدمتیں، اس طرح پر دولھا کے ہاں پہنچیں، دولھا کی بہنیں اور بھاوجیں اور چند اور رشتہ دار بیگمات نے کی نادر خانہ پیشوائی۔ اور حسب رواج صندل کی گھلی ٹکیوں سے مانگ بھری، پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے جب سمدھنیں اُتریں تو سہرا آرائیگم

اور مبارک محل کے بوچے ڈیوڑھی تک آئے اور مہریوں نے بوچے اُٹھائے اور محلسرا کے اندر لائیں، جب سمدھنیں مٹھیں تو ڈومنیوں نے مبارک بادگائی اور پھر گالیوں کی بوچھار ہونے لگی، آزاد پاشا کو جو خبر ہوئی، تو بہت ہی بگڑے، بھاوج سے کہا، از برائے خدا ان کو منع کرو، ہمارے گھر میں اور گالیاں، گو بہت ہی خفا ہوئے مگر کسی نے ایک نہ سُنی اور جب ڈومنیاں گالیاں دے چکیں، تو اُن کے پھسلانے کے لیے کہا، اب اگر گالیوں کی آواز تمھارے کان میں آئے تو جب ہی کہنا، آزاد اس رسم فضول کے خلاف تھے، ان کو سخت افسوس ہوا مگر مجبوری تھی، اُس روز انھوں نے مارے رنج کے مہندی کا جوڑا نہ پہنا، فقط تاج سر پر رکھ لیا اور فوراً اُتار ڈالا، بہ اصرار تمام بہنوں اور بھاوجوں نے مجبور کیا کہ مہندی نہ لگائیں اور عروس شیریں ادا دلبر رنگیں قبا سپہر آرا بیگم نے اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے دائیں ہاتھ میں مہندی لگائی اور ان کے بعد روح افزا بیگم نے دوسرے ہاتھ میں، سپہر آرا بیگم کو تمام عمر میں اس قدر خوشی نہیں ہوئی تھی جس قدر خوشی اس وقت ہوئی، جب آزاد پاشا کے ہاتھوں میں مہندی لگائی گو آزاد پاشا کا ارادہ تھا کہ صرف ایک ہی انگلی میں مہندی لگائیں مگر سپہر آرا کے ہاتھ سے مہندی لگانا ایسا نہ تھا کہ ان کو وہ خیال آئے یا اس قدر جرأت ہو کہ ہاتھ کھینچ لیں، ہنسی ہنسی میں انھوں نے کہا، ہندوؤں کی دیکھا دیکھی ہم لوگوں نے بھی یہ رسم سیکھی ہے، ورنہ عجم اور عرب اور روم اور شام اور کابل اور ماوراء النہر میں مہندی لگانا کیا معنی؟ مرد کو حنا سے کیا کام؟

سپہر آرا۔ تم کو اس طرح پر دیکھ کر کوئی ہنس نہیں سکتا،

آزاد۔ جب ہم اوروں کو ہنسیں گے تو وہ ہمیں کیوں نہ ہنسیں گے؟ مرد کے ہاتھوں میں مہندی سخت معیوب ہے۔

سپہر۔ جن ہاتھوں سے تم نے شمشیر چلائی اور جن ہاتھوں سے بندوق سر کی اور جن ہاتھوں سے دشمنوں کے سر قلم کیے اور جن ہاتھوں سے خنجر چلائے اُن ہاتھوں کو کوئی ہنس نہیں سکتا، سپاہی کو کوئی نہیں ہنس سکتا، سپاہی کو کون ہنسے گا بھلا؟

روح۔ کیا بات کہی ہے جواب دو تو جانیں،

آزاد۔ اب مقام غور ہے کہ جس شخص نے تلوار اور ——————

سپہر۔ قطع کلام ہوتا ہے، آج کے دن تو ہم تمھاری ایک نہ سنیں گے اگر تم ذرا انکار کرتے تو مجھے بڑا رنج ہوتا، برسوں کی سختیوں اور پریشانیوں اور مصیبتوں کے بعد آج خدا نے یہ دن دکھایا ہے آج جھگڑے کو تہ کر رکھو،

روح۔ مہندی لگانا مرد معیوب کیوں سمجھتے ہیں؟

سپہر۔ معیوب ہے مگر کن مردوں کے لیے؟

آزاد۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ اچھا اچھا ہپ ہپ بُرا بُرا تھُو تھُو۔ مرد مرد سب ایک، جو بات ایک مرد کے لیے معیوب ہے دوسرے کے لیے کیوں نہ معیوب ہو؟

سپہر۔ سکھ اور پنجابی جری ہوتے ہیں یا نہیں، پھر وہ زیور کیوں پہنتے ہیں، سونے کے کڑے وہ پہنیں، بالے وہ پہنیں، ان کو کون ہنس سکتا ہے، سب جانتے ہیں کہ یہ زنانہ پن کے سبب سے زیور استعمال نہیں کرتے ان کی جو وضع ہے، وہ بانکپن اور سپہ گری کی ہے۔

آزاد۔ ان کے ہاں تو یہ رسم ہے کہ زیور پہنیں۔

سپہر۔ (ہنس کر) اے تو یہ تمھارے ہاں کی رسم نہیں ہے، وہ ان کے ہاں کی رسم یہ تمھارے ہاں کی رسم ہے۔

---

[1] پنجابی پٹھتیاں۔

آزاد۔ خیر صاحب ہم ہارے تم سب جیت گئیں۔
سپہر۔ ہم اپنے ہاتھ سے مہندی لگائیں اور تم اس پر اعتراض کرو تو بھلا رنج ہو یا نہ ہو؟
آزاد۔ آزاد پاشا کی بہنوں اور بھاوجوں نے طعنے دینے شروع کیے کہ ہمارے کہنے سے نہ مانا، سالی کے کہنے سے فوراً مان لیا۔
سپہر۔ تو یہ وجہ ہے کہ ہم سے تو پہلا ہی سابقہ ہے نا۔
بہن۔ نہیں یہ سبب نہیں ہے کہ پہلا ہی سابقہ ہے۔
سپہر۔ ہم تو غیروں میں ہیں تم بہن ہو۔
بہن۔ سالی کی محبت بہنوں سے زیادہ ہوتی ہے۔
سپہر۔ اس کی شکایت ہے تو یہ شکایت ہے۔
بہن۔ کل سے گھر بھر ایک طرف تھا اور یہ ایک طرف، کہتے تھے کہ نہ مہندی لگاؤں گا، نہ جوڑا پہنوں گا مگر اس وقت چپ چاپ ہاتھ بڑھایا سالی کی یہ محبت ہوتی ہے۔
آزاد۔ تم سے تو یہ خوف نہ تھا کہ تم برا مانو گی اور یہ تو برا مان جاتیں، بس یہی فرق ہے۔
سپہر۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم کو غیر سمجھے۔
آزاد۔ یہ خوش، تم بھی ناخوش وہ بھی ناخوش۔
سپہر۔ ہماری خوشی تو ہو گئی۔
اس کے بعد سپہر آرا اور روح افزا کو نیگ کی دو دو اشرفیاں دیں، سمدھنوں کو شربت پلایا اور وہ رخصت ہوئیں۔

جب عروس شوخ و طناز سرمست خوبی محو ناز لیلیٰ لقا حسن آرا بیگم کے پیارے پیارے گورے گورے ہاتھوں میں مہندی لگائی تو جوبن اور بھی دوچند ہو گیا۔
اس شب کو آزاد نے احباب اور رؤسائے اولوالالباب کی دعوت بھی کی تھی اور انواع اقسام کی اغذیہ لطیف پکوائی تھیں۔
مہندی کے دوسرے دن شب کو دو بجے کے وقت کچھ کھٹکا سا ہوا قلماقنی جو پہرے پر تھی اس نے غل مچا کر کہا، کون ہے بارے کون ہے، اتنا کہنا تھا کہ اندر باہر جاگ ہو گئی اور سب کے سب بیدار ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے، قلماقنی سے پوچھا کہ کس قسم کا کھٹکا ہوا تھا۔ بیان کیا کہ پورب کی شہ نشین میں ایک آدمی نظر آیا، چپ چاپ اس آدمی کے چلنے کی آہٹ معلوم ہوئی، تو میں اس طرف گئی وہاں کی جشن پہرے پر اونگھ رہی تھی، جیسے ہی میں وہاں پہنچی یہ معلوم ہوا کہ کسی نے قہقہہ لگایا، میرا پاؤں آگے نہ بڑھا مگر میں وہاں سے ہٹی نہیں اتنے میں جاگ ہو گئی، جب یہ حال معلوم ہوا تو اب شہ نشین کی طرف کوئی رخ نہیں کرتا، خوف معلوم ہوتا ہے کہ مبادا چور ہو اور ہاتھ چلا بیٹھے، لہٰذا باہر سے خورشید دولہا اور بیٹی کے مرزا صاحب اور

چار پانچ سپاہی مسلح ہو کر آئے اور شہ نشین کی سمت جانے لگے، شہ نشین کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ایک گوشے سے پھر قہقہے کی آواز آئی اور یہ ذرا ٹھہر گئے کہ اتنے میں کسی نے ناک سے کسی نے غنغنا کر کہا، خبردار اندھر کمین طرف نہ آناں، یعنی خبردار ادھر کی طرف نہ آنا۔ بہار النسا بیگم نے کوٹھے پر سے کہا یہ تو روح افزا کی سی آواز ہے اس پر ایک قہقہہ پڑا آخر کار قلماقنی آگے بڑھی اور ہنس کر بولی، واہ حضور گھر بھر میں خدانخواستہ تہلکہ ڈال دیا، نواب صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا، حضور آرام فرمائیں صرف مذاق ہی مذاق تھا۔

نواب صاحب اور مرزا صاحب اور سپاہی باہر گئے اور ادھر روح افزا اور نازک ادا اور گیتی آرا کھلکھلاتی ہوئی گوشہ نشین سے باہر آئیں، معلوم ہوا کہ گیر و گھول کے کئی مہریوں اور حبشنوں کے منہ بجھری میں رنگے تھے اور اب پہرے والی کی فکر میں تھیں کہ اتفاق سے اس میں رہ گئیں، بڑی بیگم واہ وا۔ کوئی بچہ ہو تو خیر کہیں، اس نے ہنسی کی ماشاءاللہ سن تمیز کو پہنچی ہو، مگر لڑکپن نہیں جاتا۔

روح افزا۔ امی جان یہ پہرے والیاں سب اونگھا کرتی ہیں، ان میں کسی پر بھروسا نہ کرنا، یہ سب خراٹے لے رہی تھیں، ایک نہیں جاگتی تھی۔

قلماقنی۔ حضور اگر میں سو گئی ہوتی، تو جاگ کیوں کر ہوتی ہے جیسے ہی آہٹ پائی غل مچا دیا کہ چور ہے چور ہے۔

روح۔ ہم ایک گھنٹہ بھر سے یہاں ہیں اور چو طرفہ بارہ دری میں ہو آئے کوئی منکا تک نہیں۔

گیتی آرا۔ میں نے ان کو منع کیا تھا، مگر یہ سنتی کب ہیں۔

روح۔ بس بہن یہ جھوٹ ہی تو برا معلوم ہوتا ہے۔

گیتی۔ اچھا گیرو کس نے پیسا اور کس نے گھولا تھا؟

روح۔ تمھاری مہری نے پیسا اور اسی نے گھولا۔

اب سنیے کہ جن جن کے منہ رنگے گئے تھے، جب ان کو یہ حال معلوم ہوا تو بہت ہی جھینپیں اور دو ایک بڑی بیگم صاحب کے پاس گئیں اور کہا حضور سرخرو ہوئے۔ مہندی کے دوسرے دن روح افزا بیگم صاحب نے منہ پہ گیرو ملا، انھوں نے آہستہ سے کہا روح افزا کو تو ان باتوں کا خیال بھی نہیں ہے، یہ سب نازک ادا کے ہتھکنڈے ہیں، چلو خیر ان کی خوشی، جب ہمارا ان کا سا سن تھا تب ہم بھی چہلیں کرتے تھے، یہاں تک تو خیریت تھی کہ مہریوں اور حبشنوں کے منہ پر گیرو پھیرا گیا۔

اب سنیے کہ جانی بیگم جو یہ آواز شور و غل سن کر اٹھیں اور ہمجولیوں کی ان پر نظر پڑی تو اور بھی قہقہے پڑے۔

جانی۔ یہ آج ماجرا کیا ہے محل زعفران کا کھیت بنا ہوا ہے ہر کوئی دیوار قہقہہ ہے۔

روح۔ گھبراؤ نہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

نازک۔ جس سے ڈری وہی منہ آیا۔

گیتی۔ جانی بیگم کو منہ دیکھنے کی بس محبت ہے،

سپہر آرا۔ اچھا گل کھلا کچھ بسنت کی بھی خبر ہے!

جانی۔ کیا یاقوتی کسی نے کھلا دی یہ ہے کیا؟

سپہر۔ ہم نے یاقوتی اور تم نے منہ کی کھائی۔

گیتی۔ یہ منہ (اشارہ کر کے) یہ منہ کھائے چولائی۔

نازک - کوئی تباؤ نہیں خبردار جو کوئی بتائے۔
مبارک محل - کچھ اپنے چہرے کی بھی خبر ہے بہن؛
نازک - (قہقہہ لگا کر) تم اپنے چہرے کی بھی تو خبر لو۔

اتنے میں جانی بیگم کی نظر مبارک محل پر پڑی تو انھوں نے فرمائشی قہقہہ لگایا اور ادھر مبارک محل نے ان کو ہنسنا شروع کیا اور یہ نہیں معلوم کہ دونوں ایک ہی رنگ میں تھیں، جب ہی نازک ادا بیگم نے قہقہہ لگا کر کہا تھا کہ تم اپنے منہ کی خبر لو جب جانی بیگم نے مبارک محل کے ایک رخسارے کو رنگا ہوا دیکھا تو کہا بہن ہمبارک ہو، اس پر مبارک محل سر ہوئیں اور بولیں یہ کیا؟ گال پر ہاتھ پھیرا تو سرخ ہو گیا آئینے کے پاس جا کر دیکھتی ہیں تو رخسار چپ رنگا ہوا، آئینہ اُٹھا کر جانی بیگم کو دکھایا اور اس قدر قہقہے پر قہقہہ پڑا کہ بارہ دری گونجنے لگی، آخر کار بڑی بیگم صاحب کے خوف سے قہقہہ بازی موقوف ہوئی اور جس جس کے چہرے رنگے گئے تھے انھوں نے منہ دھو ڈالا، جانی بیگم کی تو رگ رگ میں شوخی اور چلبلاہٹ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس وقت تو سو رہیں، مگر تڑکا ہوتے ہی تیکھی ہو ہو کر باتیں کرنے لگیں، اچھا کیا مضائقہ ہے، خیر مگر اچھے گھر بیانہ دیا، آج رات تو ہونے دو، انشاءاللہ ایسا بدلہ لوں کہ یاد ہی کریں، جانی کہاں ہیں، مجھ کو بھی کوئی وہ سمجھتی ہیں، نازک ادا نے کہا (ہنس کر) ہم دروازے بند کر کے سو رہیں گے پھر کوئی کیا کرے گا؟ جانی بیگم بولیں ع جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے، ہم سوچتے تھے کہ یا اللہ یہ کس کی عنایت ہے، بارے اتنا تو معلوم ہو گیا دروازہ بند کر کے سوئے کوئی یا دس من کا قفل ہو، ہم اس سیاہی سے منہ رنگیں گے، جس سے جوتے صاف کیے جاتے ہیں، بڑھئی کو بلایا ہو تو سہی، دروازہ چیر ڈالے قفل توڑ ڈالے چھت کاٹے، دیکھو تو کیا کیا ہو گا، نازک ادا نے کہا بہن! از برائے خدا معاف کرو، دو گھڑی دل لگی تھی، اگر تم بڑھیں تو بڑی بیگم کے خلاف ہو گا اور یوں ہم حاضر ہیں، جوتوں کا ہار گلے میں ڈال دو، بڑی دیر کے بعد جانی بیگم نے کہا اچھا ہم نے معاف کیا، اگر اتنی لجاجت اور منت دساجت نہ کرتیں تو ہم ہرگز نہ مانتے۔

الغرض مہندی کی رسم بڑی بیگم کی خاطر خواہ بڑی دھوم سے انجام کو پہنچی اور اب برات کے دن کی تیاریاں ہونے لگیں ایک عورت نے بیان کیا کہ کل دولہا کے ہاں شہر کے سب مولوی جمع ہوں گے اور ان کی بڑی تعریف کریں گے: بڑی بیگم نے ہنس کر جواب دیا، دولہا کا باوا آدم ہی نرالا ہے جو بات سنتی ہوں دنیا سے نرالی اور ساری خدائی سے انوکھی، کہو ابھی مولویوں کے جمع ہونے کی کونسی ضرورت ہے، نکاح تو ہو لینے دیجیے، مگر کون کہے، جس بات کو ان کے بزرگ ان کی ماں بہنوں نے جائز رکھا اس میں ہم کون دخل دینے والے بھلا، یہ بھی کہیں سنا ہے کہ دولھا مانجھے کے کپڑے نہ پہنے، مہندی کے دن جوڑے کے عوض ٹوپی دے لے واہ اور سنا وہ اس کو سوانگ بتاتا ہے، کہا ہم سوانگ نہیں بننا چاہتے، روح افزا بولی، امی جان سچ تو یہ ہے کہ دولھا مانجھے کے کپڑے پہن کر سچ مچ سوانگ ہی بن جاتا ہے۔

نازک - ساری دنیا کے دولھا مانجھے کے کپڑے پہنتے ہیں،

روح - ساری دنیا کے آدمی نہ کہو، اس شہر کے امیروں کا چوچلا ہے اور تو کوئی قوم ایسی نہیں ہے۔

نازک - سب میں دولہا کو خلعت پہنایا جاتا ہے، ہندو مسلمان سب کے ہاں کا قاعدہ ہے وہ دولھا کیا جس سے اور لوگوں سے فرق نہ معلوم ہو؟

روح - انگریزوں میں یہ کہاں رسم ہے بھلا؟

بڑی بیگم - اسے ہے الو وہ اور ملک کے ہم اور ملک کے۔

روح - تو مسلمانوں کے کس ملک کی رسم ہے؟
بڑی - اب تو جہاں ہو وہاں کی رسم کی پابندی کرو،
نازک - اور وہ کون ملک ہے جہاں دولہا ننگا رہتا ہے؟ یا برات کے دن اس کو قیمتی خلعت یا لباس نہیں پہنایا جاتا - ہر ملکے و ہر رسمے۔

با ہمیں مردماں بباید ساخت   چہ تواں کرد مردماں آنند

اب تو ہندو مسلمان کا چولی دامن کا ساتھ ہے - اس جھگڑے کا تصفیہ استانی جی کی رائے پر چھوڑا گیا، انھوں نے بہ سہولت تمام جواب دیا کہ ہم کو تو خود یہ رسم اچھی نہیں معلوم ہوتی، مگر یہاں کے امیرزادوں میں کیسا ہی شرعی آدمی کیوں نہ ہو، عورتیں ایک نہ مانیں گی، ہزاروں لاکھوں قسمیں دیں اخفا ہوں، بگڑ جائیں، دولہا کو پہننا ہی پڑے گا اور شرع کی پابندی تو بہت مشکل ہے، رسم ریت کی پابندی البتہ مقدم ہے۔ میں نہیں جانتی کہ یہ اس مانجھے کے جوڑے پر لوگ اس قدر کیوں تلو ہیں ہا خاصی اچھی بھلی چنگی صورت کو قسملے سے بگاڑ دینا کون عقل کی بات ہے؟ گڈ ا بنانا اس سے فائدہ کیا؟ آزاد تو بڑے فہیدہ ہیں، مگر ان پر کوئی ایسا ہی زور ڈالا گیا ہوگا، جب انھوں نے مجبور ہو کر مانجھے کا جوڑا پہنا ورنہ وہ ایک ماننے والے نہ تھے۔
نازک - ایلو یہ بھی روح افزا کی طرف ہو گئیں۔
روح - نہیں تمھاری کہیں جس کا سر نہ پیر۔
سپہر - مہندی لگانے پر بھی وہاں بڑے بڑے جھگڑے ہوئے تھے، مگر پھر بھی کچھ پورے نہیں، ان کی بہنوں اور بھاوجوں نے بڑے طعنے دیئے کہ سالیوں کے ہاتھ سے مہندی لگوائی اور ہم سے کہتے تھے کہ کیا مجال جو سوائے چھنگلیا کے کسی اور انگلی میں مہندی چھو بھی جائے۔
استانی جی - ہمیں بڑی حیرت ہے کہ کیونکر مان گئے؟
روح - آپ کو، اے سب کو تعجب ہے، اس بات کا۔
سپہر - اس کے کئی سبب ہیں، استانی جی! بے وجہ نہیں ہے۔
نازک - اب دیکھیں برات کے دن کچھ سوانگ لاتے ہیں یا نہیں، اب کیا کہیں گے بے خلعت پہنے ہوئے آنے نہ پائیں گے اور کہیں بھی ایسا ہوا ہے؟

اب ایک نیا حال سنیئے کہ آزاد پاشا مہندی کے دوسرے روز بارہ دری میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے آ کے سلام کیا اور خواجہ صاحب سے کہا کہ اگر مضائقہ نہ ہو تو ہم آزاد پاشا صاحب سے کچھ عرض کریں، پوچھا آپ کون صاحب ہیں؟

کہا مجھے خواجہ محمد اسمٰعیل کہتے ہیں - آزاد نے ان کو اجازت دی، آپ کو جو کچھ فرمانا ہو بسم اللہ، ارشاد کیجیے، انھوں نے مسکرا کر کہا خادم کو آپ نے کہیں دیکھا ہوگا، آپ کو شاید یاد نہ ہوگا، مگر مجھے بخوبی خیال ہے، کہ ایکبار آپ ہم پر ہنستے تھے، مگر شکر ہے کہ اب ہم کو بھی ہنسنے کا موقعہ ملا - آپ کو یاد ہوگا کہ ایک روز میں مانجھے کے کپڑے پہنے جاتا تھا اور آپ نے قہقہہ لگایا تھا کہ ڈاڑھی مونچھ پر مانجھے کے کپڑے پہنے ہو، اب یہ فرمائیے کہ حضور نے یہ بدپرہیزی

کیوں کی؛

آزاد بہت ہنسے کہا میں گھر میں پہنتا ہوں اور گھر ہی میں اتار ڈالتا ہوں، ممکن نہیں کہ باہر پہن کر نکلوں اور میں واقعی اب بھی اس رسم کے خلاف ہوں اور یہ رسم بھی پوچ ہے۔

القصّہ بڑی بیگم اور آزاد پاشا دونوں کے ہاں لطف طرب اور دھوم دھام ہوئی۔

حُسن آرا کی شادی اور آزاد کی خانہ آبادی

دمِ صبح ہے ساقیِ خوش جمال　　عنایت ہو جامِ مئے پرتگال

وہ خوشبو کا دے جام جس سے مدام　　معطر ہو رندوں کا سلفی مشام

ذرا شیشہ و جام دھو دھا کے لا　　شرابِ مصفا اچھوتی پلا!

میں قربان ساقی ذرا اُٹھ شتاب　　تو دے جام مہتاب میں آفتاب

بچھاؤں میں ہر سمت عشرت کا فرش　　زمیں آسماں فرش ہو تا بعرش

وہ روشن پلا مے کہ پُر نور ہو　　ہر اک قطرہ جوں شعلۂ طور ہو

اٹھا ساقیا ساغرِ مشک بو　　کہ مستی میں بر آئے سب آرزو

مرا خضرِ رہ ہو وہ آبِ حیات　　خوشی میں لکھوں عیش و عشرت کی بات

پلا ساقیا بادۂ پرتگال　　کہ گُل اور بلبل میں ہوگا وصال

خوشی میں ہیں مصروف سب خاص و عام　　مبارک سلامت کی ہے دھوم دھام

پلا ساقیا مجھ کو جامِ شراب
کہ ملتے ہیں باہم مہ و آفتاب

اللہ اللہ آج کس ٹھسّے سے گلزارِ دہر میں عروسِ بہار کی سواری رشکِ بادِ بہاری آئی ہے کہ رضوان تک بعد شوق دیدۂ دل سے تماشائی ہے۔ سبحان اللہ کیا فیضِ بہار ہے کہ خوبرویانِ چمن پر قیامت کا نکھار ہے۔ زلیخائے گُل یوسفِ بلبل سے ہم آغوش ہے۔ بحرِ مستی و عشرت پرستی کا جوش ہے۔ ادھر گلوں پر نکھار ادھر عنادل کی چہکار بوستانِ جہاں پر نشاط و طرب کی گھنگھور گھٹا چھائی، رندوں نے دھوم مچائی۔

زہادِ صد سالہ پیاپے جام لنڈھا کر قیدِ مذہب سے آزاد ہوئے، شوالے اور مسجدوں کے عوض میکدے آباد ہوئے، ہر شیخ و شاب مریدِ پیرِ مغاں ہے۔ حافظ جی کا خدا حافظ و نگہبان ہے۔ شیخ جی، باایں ہمہ شیخوخیت بطیوں پر بولیاں گاتے، برہمن چھپ چھپ کے مندروں میں بادۂ گلگوں کے جام لنڈھاتے ہیں۔ بانگِ تکبیر اور آوازِ ناقوس کے عوض ہو حق کی صدا بلند ہے، اور لطفِ طرب دہ چند ہے۔

دُلھن کا خانہ طرب آستانہ رشکِ باغِ ارم تھا، ہر در و دیوار پر نور کا عالم تھا، سراپا طلسمات تھا، غیرتِ دہ گلزارِ جنات تھا۔ تمامی سے منڈھے ہوئے دیوار و در، سونے کا گھر، آئینہ بندی کی، یہ شوکت و شان تھی کہ سکندر کی روح دیکھ کر حیران تھی، موقع موقع پر جا بجا جڑاؤ پلنگ، کہیں مسہریاں خوش رنگ، اس پر اوتچے کسے ہوئے زری باف کے رشک دینے والے آئینہ صاف کے پایوں کی چاروں طرف منقش کی ڈوریاں اس لطافت سے کشیدہ کہ گوشِ چرخ شنیدہ نہ چشمِ عروس دیدہ۔ حُسن آرا کا اُبھرا ہوا جوبن اور ستم کا نکھار، اگر حورانِ بہشتی دیکھ پاتیں تو ہزار جان سے عاشق ہو جاتیں، اور پھر روضۂ جناں

کا نام زبان پر نہ لاتیں۔

نازک ادا۔ بھئی آج تو وہاں دھوم دھام سے ناچ ہونا چاہیئے۔

جانی بیگم۔ دولھا کے ہاں میراثنیں دھما چوکڑی مچا رہی ہیں۔

نازک۔ رسم تو رسم کے طور پر ہونا ہی چاہیے بہن

جانی پہلے تو ہم سنتے تھے کہ دولھا کے چہرے سے وہ جلال برستا ہے کہ ایکا ایکی کوئی چار آنکھیں نہیں کرسکتا، اور زنانے میں ناچ گانے سے انھیں اس قدر نفرت ہے کہ مجال کیا کوئی ڈومنی دہلیز کے اس پار قدم دھرنے پائے، نہ کہ اب سنتی ہوں، طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہے، غزلیں ٹھمریاں پٹے گائے جاتے ہیں، یہ آتا تھا یہی کہتا تھا کہ ان کے رباب کے آگے کوئی چوں نہیں کرسکتا تھا۔

مغلانی۔ کیا شک ہے، اگا بھن گا جر ڈالتی ہے۔

نازک ادا۔ پھر یہ کایا پلٹ اتنی جلدی کیوں کر ہوگئی؟

مغلانی۔ دل ہی تو ہے حضور، اور پھر دلہن پانے کا شوق۔

سپہر آرا۔ ہم نے مہندی لگائی تو ذرا بھی اِدھر سے انکار یا تکرار کی بات نہ ہوئی۔ مسکرا کر ہاتھ دے دیا۔

نازک۔ اے تو سالیوں سے بھی کوئی اتنی بے رخی کرتا ہے۔

مغلانی۔ یہ نہ کہیے، حضور جو کہتے ہیں وہ ایک نہیں مانتے، ساچق مانجھا وہاں اس کا ذکر نہیں مرزا تفتہ نے کیا کیا۔ خاص شرع کے مطابق شرعی نکاح پڑھوا لیا۔

بہار النساء۔ ہماری رائے ہے کہ جس میں ان کا جی راضی ہو وہ کریں۔

سپہر۔ مگر واہ رے آزاد کتنا قول پورا پورا نبایا ہے۔

مغلانی۔ حضور سپہ گری کو ان کے نام سے عزت ہے۔

نازک۔ تلوار کے منہ لڑنا انھیں سورماؤں کا کام ہے۔

مغلانی۔ ہم سے دو ایک عورتیں کہتی تھیں کہ حسن آرا کو جل دے کے خدا نخواستہ چلے گئے مگر ہم نے کہہ دیا تھا کہ آئیں اور بیچ کھیت آئیں، ہزاروں لاکھوں میں آئیں، ایسے مرد لوگ وعدہ خلاف ہوا کرتے ہیں؟ قولِ مرداں جان دارد!

سپہر۔ اتنے دنوں میں دو مرتبہ باجی جان کا نصیب اعدا دور از حال بڑا بُرا حال ہوا۔ ایک مرتبہ تو آزاد کو خواب میں دیکھا۔ جب اماں جان کو ان کی بے کلی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے ان کو سمجھانا شروع کیا ؎

کون کہتا ہے تم نہ پیار کرو　　　شوق سے جان تک نثار کرو

باغ کی سیر کو ذرا جاؤ　　　گل و بلبل سے دل کو بہلاؤ

نازک۔ ہم کو اس حال کی پہلے خبر نہ تھی بہن۔

بہار النساء۔ اور ہم سمجھ گئے تھے کہ اس میں کچھ جوگ پڑا ہے۔

سپہر۔ بس باجی بس زیادہ نہ کچھ کہیے گا۔ ہونھ۔

بہار النساء۔ اے اس بار کا ذکر نہیں کرتی، دوسری دفعہ کا تذکرہ ہے بہن۔

اب خیر نوشہ کے ہاں کا حال سنیے کہ برات کے روز وقت فرح بخش میں دولھا کو بیگم صاحب نے محل سرا میں بلوایا۔

بہنوں نے خوش خوش نہلایا، ہری ہری دوب شاداب و خوب منگوائی، ایک بہن چانول اور دودھ لائی۔ حسب رواج رونے دھون کی رسم ادا ہوئی، عیش و مسرت دوبالا ہوئی۔ کلس کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ڈالا گیا، اور ماں نے کہا بیٹا سسکی نہ لینا۔ کپڑے سے بدن پونچھا، زنانے میں پردہ ہوا۔ اعزا و اقربا شاداں و فرحاں آئے، خلعت بیش بہا لائے، بہنوئی نے سہرا باندھا، عزیزوں نے خلعت پہنایا، بڑی بوڑھیوں نے بلائیں لیں، اور تہ دل سے دعائیں دیں۔ دولہا باہر مردانے میں آیا، محفل رقص و سرود نے خوب رنگ جمایا ؎

زہرہ در رقص بصد ناز و طرب زیں شادی
چرخ خم گشتہ بہ تسلیم مبارک بادی

محلسرا میں تمام شب ناچ ہوا کیا، خواتین عالی مرتبت نے میراثنوں کو بھرپور انعام دیا، سمدھنوں کی چوٹیاں گندھیں، ہر صفت آرائش سے مزین ہوئیں، بیش بہا زرق برق بھڑک جوڑے زیب بدن کئے، زیور پہنا، مشاطگان کامل فن نے جوبن کو دوبالا کیا، اور نکھر نکھر کر کے آراستہ ہوئیں۔

اب برات کے جلوس میمنت مانوس کا حال سنیے کہ آدھی رات سے شہزادگان گردوں مدار اور نوابان جم اقتدار اور امرا دار اور بان اور مہاجنان والا شان کے ہاں سے جلوس آنے لگا، اور ۸ بجے تک اس قدر کثرت ہوئی کہ دو رویہ بازار میں دور تک تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، شانے سے شانہ چھلتا تھا ہوا تک کو راستہ بہ دقت سے ملتا تھا۔ کہیں فیلان فلک شکوہ رشک کوہ کنا اور ایک دنیا کنجل دل ادس گنگا جمنی اور روپہلے اور سنہرے ہودج زرنگار، فیلبانان تجربہ کار سلیقہ شعار کہیں، مہاجنوں کے پری چہم گھوڑے افراس ہنر پر تسکار ادھر نامداران اور ہوا دار ادھر باجوں والوں کے غول اور خاص بردار۔

تاروں کی چھاؤں میں آزاد کی برات بڑے کروفر کے ساتھ روانہ اور عازم محل عشرت منزل جانانہ ہوئی۔ جب چوک میں اس عظمت شاہانہ اور سطوت خسروانہ سے برات آئی، تو تماشائیوں نے جو بصد شوق منتظر کھڑے تھے، گویا منہ مانگی مراد پائی ؎

یوں سواری جو چوک میں آئی محو حیرت ہوئے تماشائی

سب کے آگے نشان کا عرش شکوہ ہاتھی جھومتا ہوا جاتا تھا، اور نشان عظمت نوابان عجب شان دکھاتا تھا، ہاتھی کے سدے قدم قدم پر آتشبازی کے انار چھوٹتے جاتے تھے جو ضیا میں مہر عالم افروز کو شرماتے تھے۔ بومزوں دور تھی، گندھک مثل کبریت احمر کافور تھی، بو ہر اُدھر کمروں پر بارہ بارہ چودہ چودہ برس کے رنگت نکھر نکھر کے محو دید حیرت تھی، کہ الٰہی یہ رات ہے یا روز عید! ایک ایک سے ہمکلام ہو کر کہتی تھی، باجی! اٹھو، نشان کا ہاتھی آتا ہے، اُسے لو دیکھو، ہزارہ چھوٹتا جاتا ہے، مہتاب کی روشنی سے ماہ تاباں کا رنگ فق تھا، چرخی کی آن بان سے چرخ زنگاری کا کلیجہ شق تھا۔ تماشہ بین اور جوانان رنگین چوک کے کمروں کو تکتے تھے، ادہر عباسی عباسی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے انداز دلبرانہ سے کھڑی برات کا جلوس دیکھتی تھیں ادہر ہزاروں عاشقان زار دکانوں سے ان کے جوبن کے مزے لوٹتے تھے، کوئی کمرہ ایسا نہ تھا جس پر دو چار حوران طرح دار سولہ سنگار کر کے برات دیکھنے نہ آئی ہوں ؎

رنڈیاں جابجا جو تھیں استاد مل کے گانے لگیں مبارکباد

کمرے بیٹھے پٹنے تھے، تماشائی جگہ کے لئے باہم لڑتے تھے، شوقین آدمیوں نے آدھا چوک کرائے پر لیا تھا اور صرف ایک

مجے کے لیے زرکثیر دیا تھا۔ مہاجنوں کے طاؤس دُم اور آہو شم گھوڑے زیور سے لدے ہوئے چھم چھم کرتے جھوم جھوم کے شوخی کے ساتھ قدم دھرتے جاتے تھے، اِدھر اُدھر سپاہی حفاظت کرتے آتے تھے، جس وقت گوروں کا باجا چوک میں پہنچا، اور اُنھوں نے بینڈ بجائی، لوگ سمجھے کہ آسمان سے فرشتے باجا بجاتے اتر آئے۔ وہ مست کرنے والی آواز وہ مصلحہ دلکش خوش آیند و دلنواز، کبھی تلنگوں کی کمپنیاں رپ رپ کرتی آئیں، کبھی جھنڈی برداروں نے طرح طرح کی رنگ برنگ جھنڈیاں دکھائیں، شہنائی نواز نے اس خوبی، خوش اسلوبی سے شہنائی بجائی کہ میاں غوثی تک کی روح وجد میں آئی۔

اتنے میں دگلے والی پلٹن کے کمیدان میاں خواجہ بدیع الزمان صاحب من بدیعا بدیع بالقابہ نے انتظام شروع کیا۔

خوجی۔ او شہنائی والو! منہ نہ پھیلاؤ بہت،

لوگ۔ آئیے آئیے، بس آپ ہی کی سرتھی،

خوجی۔ اُو دائیں طرف کا شہنائی والا باز دیا وحشت،

لوگ۔ کوئی آپ کی سنتا ہی نہیں، خواجہ صاحب بہادر اغوثی کو بھی اس کے کان نے بتا دے، گرد نسیجیے

خوجی۔ ہم ان کا بازو توڑے گا، میاں بہت منہ نہ پھیلاؤ، یہ عیب ہے،

لوگ ان نکات کو کیا جانیں؟

لوگ۔ خواجہ صاحب! کچھ فرمائش تو کیجئے ان سے۔

خوجی۔ اچھا واللہ وہ سماں باندھوں کہ باید و شاید، گرجا میں درد اُٹھی کاسے کہوں نندی مورے رام، گرجا میں درد اٹھی، سوتی تھی میں اپنے منڈل میں رے، اچانک چونک پڑی، مورے رام گرجا میں درد اٹھی، کیوں کیا چیز ہے، خاص بھیرویں اور سنیے،

جو بنا ہو چار روز، جو بنا ہو چار روناچار دنا دیتو ساتھ۔ جوبن رُت جات سبھیں مکھ مورت رہے، کدر کو ونہ پوچھے بات، جو بنا ہو چار روز

دیتو ساتھ ؎

خدا بخشے صنم یہ کہہ کے ان کو یاد کرتے ہیں
یہ مشتِ خاک تیری راہ میں برباد کرتے ہیں

لوگ۔ سبحان اللہ۔ شعر کو اچھی اصلاح دی! واللہ۔

خوجی۔ من بدیعا بدیع۔ خالی خولی شاعر نے، نثر ہم مے گوید۔ در قوالی گوئے سبقت از بار بدو باربد برده شده ام که گفته اند علم در سینہ کر در سفینہ۔

لوگ۔ مگر شہنائی والے اب تک آپ کا حکم نہیں مانتے۔

خوجی۔ نابابا۔ حکم تو مانیں اور نہ مانیں تو میں نکال دوں، مگر بات اس میں یہ ہے کہ مجبور ہیں۔ ایک شے ہے آگاہ ہی نہیں، اور واللہ نوشاہ، اور ہم آج بدرجہ اتم خوش اور خرم اور مسرور و اکرم ہیں۔

راوی۔ اے سبحان اللہ! قافیہ پیمائی آپ پر ختم ہے۔

خوجی۔ ذرا مجھے آنے میں دیر ہوئی، اور سب ابتر۔

لوگ۔ اور خواجہ صاحب آپ گدھے پر سوار نہ ہوئے۔

خوجی - من بدیع بدلیعا، اس قابل بھی نہیں ہے -
افیمی - واہ رے انکسار! حضور کیا عاجزی ہے ؟
خوجی - میں بدیع بدلیعا، اپنے کو قابلِ تعریف بھی نہیں سمجھتا۔ کیونکہ ذرّہ بے مقدار ہوں،

اتنے میں ایک شخص نے از راہِ مذاق خواجہ صاحب کے قریب جاکر ذرا شانے کا اشارہ کیا، تو خوجی کسی قدر لڑکھڑائے اور ان کے چیلے افیمی بھائیوں نے اس پر قہر کی نظر ڈالی۔

ایک - (اینڈکر) اے میاں، کیا آنکھوں کے اندھے ہو؟
دوسرا - (بربر کر) اینٹ کی عینک لگاؤ میاں -
تیسرا - اور جو وہ بھی دھکا دیتے تو کیسی ہوتی!
چوتھا - ہوتی کیسی، منہ کے بل میاں گرے ہوتے -
پانچواں (بگڑ کر) گرے ہوتے، ہونہہ! یہ نہیں کہتے کہ انجر پنجر سب الگ ہوجاتے۔ ہونھ!۔
خوجی - ارے بھئی، اب اس سے کیا واسطہ ہے۔ ہم کسی سے لڑتے جھگڑتے تھوڑا ہی ہیں، مگر ہاں (طیش میں آکر) اگر کوئی گیدی ہم سے بولے تو جہاں کا ہے وہیں پہنچا دیں۔ آنتی قرولیاں بھونکی ہوں کہ یاد کرے، اور بدن سے خون کے شراٹے بہیں، با اگر نشتر پاس ہو تو اسے اور خون نہ دے، جی غرور کے ساتھ ؎

منم رستم داستاں بیگماں منم خواجۂ خواجگانِ جہاں

اور جو لوگ منکسر المزاج ہیں، ان کے ساتھ ؎

منم بندۂ خواجہ بدیع الزماں حقیر زماں احقر احقراں

لوگ - ایک ذرا سے اشارے میں تو آپ نے ڈھکنی کھائی، اور زعم یہ کہ رستم داستاں ہیں اور خون نہ نکلے، اور چنیں اور چناں، سب زبانی داخلہ!

ایک طرحدار عورت نے چوک کے ایک کمرے سے آوازہ کسا، میاں خوجی کہاں ہیں؟ اے یہ موا بوزناں ان ننھے ننھے ہاتھ پاؤں پہ اس قدر اتراتا ہے، خدا کی شان مرد تو مرد میں عورت ہوں، مگر یہ دعویٰ ہے کہ اگر ذرا پھونک ماروں تو ستر لڑھکنیاں کھائے۔ خواجہ صاحب نے کمرے پر نظر کر کے کہا میں تم کو بچہ سمجھتا ہوں واللہ۔ اس پر سامعین نے قہقہہ لگایا اور اس شوخ طرار نے ان کو انگلیوں پر نچایا۔

اخاہ! میرے اباجان قبر سے اٹھ آئے، برسوں کے بعد آج صورت دکھائی ہے، میں تمھاری لڑکی روز ترستی تھی، کہ یا خدا مجھے ابا کی صورت دکھا۔ بارے شکر ہے کہ برسوں کے بعد آج اباجان کو آنکھوں سے دیکھا، اماں کہا کرتی تھیں کہ تمھارے ابا کے ذرا ذرا سے ہاتھ پاؤں تھے، مگر خدا کی شان ہے۔ کسی کی طرف نگاہ قہر آلود ڈالی تھرا اٹھا، جس کو تان کے تھپڑ لگایا بھنا گیا، اور اسی طرح کی تیکھی چیتون ان کی بھی تھی، خواجہ صاحب نے یہ تقریر سنی تو معاً کمرے پر چڑھ گئے، اور اس سے کہا بیٹیا، تمھاری اماں کی روح کی قسم مجھے خیال بھی نہ تھا، اب آج سے تم ہماری بیٹی اور ہم تمھارے باپ، یہ کہہ کر خواجہ بدیع الزماں حماقت نشان کمرے سے اترے اور آپ جانیے عقل مجسم تو تھے ہی، سوچے کہ اب اگر آزاد کبھی ترائیں گے تو ہم بھی اکڑ کر کہیں گے کہ اس قدر عورتیں اور حسین حسین بانوئیں ہم پر عاشق تھیں، کہ ہر گلی کوچے میں ایک نہ ایک اس شخص کی لڑکی موجود ہے، اور اس خوبرو نوعمر

کو دکھا کر کہوں گا، سچ کہیے گا میں کی لڑکی اس درجہ خوبصورت ہو۔ وہ خود کہیں گھبدن نہ ہو گی، راہ میں حضرت دو ایک مقام پر
روئے بھی، کہ ان کی بیوی یعنی اس بسیا کی ماں نے انتقال کیا اور خوجی کو رنج مفارقت دے گئیں۔ جس جس نے یہ حال سنا
مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گیا کہ عقلمند ہو تو ایسا، اور نہ ہو تو اتنا کہ ایک مال زادی کے آبا جان بن بیٹھے، بھیا کے تاؤ
ایسے ہی لوگ کہلاتے ہیں۔

نوشا فریدوں، کمر خاقان، کلاہ ذی مرتبت و ثریا جاہ حسن میں غیرتِ مہرو ماہ گلگوں قبا بار فتار ضرغام شکار پر بصد طنطنۂ
خسروی و دبدبۂ شاہی سواراں پٹری جمائے کمال شہسواری دکھاتا جاتا تھا، اور شبدیز سبک خیز ایک ایک گام پر نوجوان کے
مزاج کی طرح بل کھاتا تھا، اور آگے آگے نقیب با ادب پکارتا آتا تھا، با ملاحظہ با ادب دُور باش، سامعین خوش، حاضرین
بشاش کہ آزاد پاشا کی برات ہے یا جادو کا کارخانہ سراسر طلسمات ہے۔ اللہ رے لطافت اُف رے جوبن، برات ہے یا دلہن،
پیچھے پیچھے پانچ چھ سو پیر بخارا کا درباری شہدا۔ جھولیاں لیے ہوئے ساتھ نچھاور کرنے والوں کی طرف جھولیوں پہ ہاتھ پیچھے پر
سے کمہار نے کھلونوں کی ڈالی دکھائی اور معاً زرِ سرخ و سفید سے چھت بھر پور پائی، بانکی ترچھی سبز رنگ کبڑنوں نے
سقفِ مکان پر دکانیں لگائیں، اور اشرفیوں کی اس قدر لوجھاڑ ہوئی، کہ ایک ایک نے دس دس اشرفیاں پائیں، بیوہ
ضعیفہ عورتوں نے دعائیں دیں، دلہن کا سہاگ برقرار، دولہا سلامت حق تعالیٰ کرے جیبیں جاگیں، بیٹا ہو۔ انھوں نے
بھی جیب و دامن بھرے، طوائفوں نے پیشوازیں پہن کر کمروں ہی پر سے مبارک باد گائی، اور بھیرویں کی دُھن میں ع

ہمیشہ دلبر سبحان مبارک باد شد

کی ہر کمرے سے آواز آئی، طوائفوں کے کمروں پر زرِ سرخ و سفید کی اس درجہ لوچھاڑ ہوئی کہ بجز دکان زر ایک ایک کمرے
پر نثار ہوئی،

خوجی، اس کمرے پر بھی ایک ہاتھ اِدھر اُدھر،

لوگ۔ کیا کوئی اور آپ کی پیدا ہوئیں،

خوجی۔ اجی خدا جانے کس کس کو فیض بخشا ہے!

لوگ۔ خواجہ صاحب تم تو اشرفیاں لوٹو،

خوجی۔ ہماری ہی دولت، ہم ہی لٹائیں، اور ہم لوٹیں، واہ کیا انصاف ہے۔ ارے یہ سب ہمارا ہی تو ساختہ و پرداختہ
ہے، آزاد ہمارے، برات ہماری، دولت ہماری، ثروت ہماری اور ہم ہی لوٹیں۔

الغرض تاروں کی چھاؤں میں برات اس دھوم سے دلہن کے خانۂ سعادت کاشانہ کے قریب پہنچی، عجب سہانا
سماں تھا، ہر در و دیوار نور افشاں تھا۔

ادھر دلہن کے ہاں اطلاع آئی کہ برات قریب آگئی۔

مغلانی۔ حضور دیکھیے گا کہ کس ٹھسّے کی برات ہے!

مہری۔ بس یا ولی عہد کی برات تھی یا یہ دیکھنے میں آئی،

مغلانی۔ وہ برات تو ہمیں اچھی طرح یاد نہیں ہے۔

مہری۔ اے ہے کیا ننھی بنی جاتی ہیں۔ اے ہے۔

دَدَا ۔ اے ہاں ابھی تو کوئی بارہ ہی برس کی ہیں،
مُغلانی ۔ بلکہ اس سے بھی کم، ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، اللہ جھوٹ نہ بلائے ملکہ کو گودیوں میں کھلایا ہو مگر دلی عہد کی بات نہیں یاد ہے۔
مغلانی ۔ اب زبردستی سے تبولوایا چاہتی ہو، اللہ جانتا ہے ہم کو یاد نہیں ہے، اس میں جھوٹ بولنے سے ہم کو کیا مل جاتا!

جب آزاد فرخ نہاد کی برات عروس پریزاد غیرت خوبان نوشاد کے ایوان عرش نشان عظمت تو امان کے عالیشان پھاٹک پر پہنچی اس زور سے بلبے بجے کہ گرش فلک بہرے ہو گئے اور انگریزی باجے نے وہ سماں باندھا کہ بناؤ پر سب وجد کرتے تھے۔ گوروں نے اپنا کمال دکھایا اور بھرپور انعام پایا۔ دولہا کو دروازے کے قریب لائے، اور دلہن کا حمام کیا ہوا پانی فرس طوطی پر کے سموں تلے ڈالا، بعد ازاں روغن زرد اور شکر ملا کر گھوڑے کے پاؤں میں لگایا اور نوشاہ ثریا جاہ خاقان کلاہ بصد آن بان محلسرا میں آیا، دولہا کی دو بہنیں حور وش برق کردار رشک پری رخاں فرخار بصد انداز معشوقانہ دولہا پر دوپٹے کے آنچل کو ڈالے ہوئے دولہا کو اندر لائیں۔

دُلہن کی طرف سے عورتیں ایک بیڑا ہر قدم پر ڈالتی جاتی تھیں، اور یہ کلام زبان پر لاتی تھیں، (گلاب پانی، گلاب پانی، اس وقت بیگمات عصمت مآب اور مخدرات کا ہجوم اور محل کی چہلیں اور دھوم خوشی کے شادیانے طرب و انبساط ہر سمت انشراح و نشاط ہی کی گرم بازاری تھی، کوئی باہم چہل اور دل لگی کرتی تھی، کوئی محو دیدار تھی، گو کل شاہزادیاں والا دودمان اور خاتونان عالی خاندان اور مخدرات عصمت سمات خصوصاً نوجوان اور شوخ مزاج بانویان قمر طلعت مہر لقا و کم عمر بہار طبع خواتین جادو جمال مہر سیما اس تیر سپہر سروری اور مہر شبستان برتری مہ دواج رعنائی طوطئی نو بہار برنائی یعنی نوشاہ ذی جاہ فلک بارگاہ کو بصد شوق چھپ چھپ پردے سے دیکھتی ہیں مگر ایک کو سب سے زیادہ اشتیاق دید تھا اور اس کے لیے یہ دن بہتر از روز عید تھا۔ یہ پری بصد شان دلبری بڑے شوق اور غایت ذوق سے اُن جوان رعنا کے حسن افروز پر نظر ڈالتی تھی۔ یہ بلبل شاخسار جمال زہرہ تمثال ہمجولی سے یوں زمزمہ سنج بیان ہوئی:

بیگم ۔ بہن اس وقت خوشی اور رنج توام ہیں۔
ہمجولی ۔ اے اوئی۔ رنج کا نام نہ لو بہن۔ واہ!
بیگم ۔ سچ کہتے ہیں بہن اس وقت غم و شادی توام ہیں۔
ہمجولی ۔ اب وہی باتیں کرو گی بہن کہ بڑی بیگم نکلوا دیں۔
بیگم ۔ وہ کیا نکلوا دیں میں خود چلی جاتی ہوں۔
ہمجولی ۔ اے آخر ش کچھ کہو تو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی۔
بیگم ۔ بہن تم ہمارے درد دل کا حال کیا جانو۔
ہمجولی ۔ اوئی آخر درد دل کا سبب کیا ہے؟
بیگم ۔ (آبدیدہ ہو کر) ہمارا قلب اس وقت الٹا جاتا ہے۔
ہمجولی ۔ (علیحدہ لے جا کر) بہن ہم جانتے ہیں۔ تم سے اور آزاد سے ملاقات تھی۔ تھا کبھی رسم ضرور۔ ہم ایک نہ مانیں گے۔
بیگم ۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میرے دل کا کیا حال ہے۔ بس ناگفتہ بہ۔ اب یہاں سے کیا بہانہ کر کے جاؤں۔

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر نیا گل کھلا یعنی دو چار کمسن جو از بس چمن سبع رنگین مزاج بلکہ کھلاڑ عورتیں تھیں۔ دولھا کو جو دیکھا تو دیکھتے ہی ہزار جان سے بلبلِ شیدا کی طرح اس گل رخسار حسن پر عاشق و فریفتہ ہو گئیں اور یہ خیال کر کے کہ اب آزاد کا نکاح حسن آرا کے ساتھ ہو گیا اور موقع نہ رہا از بس بیقرار ہوئیں ؎

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی　　کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلائی سی پھرنے لگی　　کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو　　گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کسی نے دیے کھول سنبل سے بال　　طمانچوں سے جوں گل کیے سرخ گال
کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی
رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

مگر یہ محلسرائے فراخ کے گوشوں میں جا جا کے خفیہ چھپ کر روتی تھیں تاکہ بڑی بیگم بُرا نہ مانیں کہ آج عین خوشی کے دن انھوں نے گریہ وزاری شروع کی، اور پھر رسوائی اور جگت ہنسائی کا بھی خیال تھا کہ کوئی سن پائے گا تو بنائے گا کہ واہ بیوی واہ کیا جلدی سے پرائے مردوے پر پھسل پڑیں، بہو بیٹیوں کا یہی شعار ہے۔ پاس پڑوس کی عورتیں طعنہ دیں گی کہ اوئی! اس بیوی پر شیطان کی پھٹکار، ذرا پاس ناموس نہیں۔ سچ ہے اگر عورت کے منہ پر ناک نہ ہو تو خدا جانے وہ کیا کر گزرے، نوج کوئی بہو بیٹی ایسی ہو۔

الغرض جب آزاد اندر آئے تو منڈھے کے تلے اس چوکی پر کھڑے کیے گئے جس پر دلہن نہائی تھی۔ دلہن کے پائجامے کا ناڑہ ڈومنیاں لے کر دوڑیں اور دولھا کے گلے میں کلاوہ ڈال کر دونوں سرے لیے اور یہ گانا شروع کیا:

ہریالا ڈورے ڈامیاں چھوڑائے کوئی آئے
ہزار ڈورے ڈامیا چھوڑائے کوئی آئے۔ چھوڑائے تیری میا، چھوڑائے تیری بہینا جسے چاہ گھنیری رہے۔
او ڈورے ڈامیاں چھوڑائے کوئی آئے

میراثنیں جب ڈام چکیں تو ان کو زرِ کثیر انعام دیا۔ ایک ڈومنی نے گوہرِ مقصود سے جیب و دامن بھر لیا۔ گو انعام پر انعام اور اشرفیاں پر اشرفیاں دی جاتی تھیں مگر میراثنیں کب مانتی تھیں۔ ایک بولی اے حضور آج ہی کا دن تو جھگڑنے کا ہے۔ دوسری نے کہا۔ جب بے لڑے جھگڑے نہ ملے نہ۔ تیسری نے جواب دیا اس سے کہیں ہم لوگوں کا پیٹ بھرتا ہے۔ اے آج تو ہم اس قدر زرِ سرخ لیں گے کہ سات نہیں بلکہ ساٹھ پیڑھی تک لکھ پتی بنے رہیں گے۔

اس کے بعد میراثنوں نے دُولہا کے اُبٹن کا جو مانجھے کے دن سے رکھا ہوا تھا ایک بھیڑ اور ایک شیر بنایا اور چاندی کے چراغ روشن کر کے ڈومنی دولھا کے پاس لے گئی اور کہا کہیے یہ شیر میں بھیڑ۔ دولھا بھیڑ۔ دلھن شیر۔ پہلے تو میاں آزاد خوب ہنسے اور کہا واہ ہم تو نہ کہنے کے۔ مگر وہ کب مانتی تھیں۔ اس رسم کی جہل قابل دید تھی۔

آزاد۔ اچھا صاحب ہم شیر وہ بھیڑ بس!
ڈومنی۔ اے واہ یہ تو اچھے دولہا آئے ہیں۔ آپ بھیڑ وہ شیر۔
آزاد۔ اچھا صاحب لیں سہی آپ بھیڑ وہ شیر۔

ڈومنی۔ اے حضور کہیے یہ شیر۔ میں بھیڑ۔ یوں کہیے!

اس پر بڑا فرمائشی قہقہہ پڑا، اور عرصے تک سب ہنسا کیں۔

دوسری۔ (آہستہ سے) یہ تو اچھے دولہا ہیں کیا مزے مزے باتیں کر رہے ہیں اے واہ!

نازک ادا۔ دولہا بڑے فقرے باز معلوم ہوتے ہیں۔

جانی بیگم۔ اور جب جوتی چرائی جائے گی تب کیا کریں گے؟

نازک ادا۔ جب بھی یہی نخرے بازیاں کریں گے۔

جانی بیگم۔ چل چکیں نخرے بازیاں کریں گے۔

نازک۔ اور جب غلام بنائے جائیں گے تب کیا کریں گے؟

جانی۔ لے یہ کہیں، اور ان کے پیر کہیں۔ کسی کی صاحبزادی بیاہ کے لے جانا کیا دل لگی ہے۔

مبارک۔ معلوم ہو گیا۔ یہ یہاں سے راضی ہو کے جائیں گے۔

نازک۔ ہاں میرے دل کی بات کہی۔ بھیڑ بننے میں یہ نخرے۔

الغرض بہزار دقت آزاد نے کہا۔ میں بھیڑ۔ یہ شیر۔

جانی۔ (دولہا کی طرف والیوں سے) دلہن کے ابا جان ہیں۔

دوسری۔ یہ تمہاری طرف والیوں کے میاں ہیں۔ پہچان لو۔

سجولیاں باہم چہلیں کرتی تھیں۔ خوشی اور شادمانی کا دم بھرتی تھیں۔ قہقہے پر قہقہے پڑتے تھے۔ کھلی جاتی تھیں ؎

وہ آپس کی خوش دل لگی اور ٹھٹھول رسیلے سلونے وہ میٹھے سے بول
بجانا عجب ناز سے تالیاں سہانی وہ دینا عجب گالیاں
وہ آپس میں کہنا کہ یاں پر تو آؤ
خوشی کی مری جان رسمیں مناؤ

اس کے بعد نوشاہ فلک بارگاہ اس مقام عشرت انجام میں گئے جہاں عروس پری رُخ نسترن بدن بڑے ٹھٹے اور جوبن سے سولہ سنگار کر کے متمکن تھی۔ آزاد والا نژاد نے انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا تو نور کا عالم نظر آیا ؎

لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر

الغرض جب بیچ کے در سے دولہا دلہن کے کمرے میں جو خود دلہن کی طرح سجا سجایا تھا، بلائے گئے اور پردے کے پاس وہاں بٹھائے گئے تو دلہن کے داہنے ہاتھ میں تل شکری رکھی گئی اور دولہا کو چٹائی۔ اس دست بوسہ فریب سے جو دولہا نے شکر اور تل کھایا تو آب حیات کا مزہ پایا۔ شکر چاشنی بخش کام جان رشک آب حیوان۔ تل خال رخسار خوباں پسند دہان اس تل شکری کی آرزو میں آزاد کی روح برسوں سے ترس رہی تھی اور اسی کے ذائقہ جان بخش کی تمنا میں جنگ کی تلخ کامی سہی تھی۔ دولہا جامے میں پھولے نہیں سماتا تھا اور پردۂ حائل کو دیکھ کر زیر لب ڈرتے ڈرتے مسکراتا۔

آزاد کا دل اس وقت اس قدر بیقرار تھا کہ جی چاہتا تھا کہ پردے ہٹا کے معشوق گلبدن کا جمال مشاہدہ کریں اور اس حور فریب کے نظارۂ حسن سے آنکھوں کو نور بخشیں۔ عشق کو دعائیں دیتے تھے جس کی بدولت یہ روز سعید نصیب

ہوا کہ وصل ناظورۂ طاؤس زیب ہوا۔

جب سب رسوم فرحت لزوم ادا ہوچکیں تو دولھا کی بھنیں اسی طرح پہ آنچل ڈال کر اس خورشید مشرقستان جلال اور مشرقستانی خورشید جمال کو دروازے تک لائیں۔ ادھر نوشہ محفل عشرت منزل میں گیا، ادھر ڈومنیوں نے بآواز بلند گالیاں سنائیں۔

دکھا پھر جام کا منہ ہم کو ساقی کہ راحت سے کٹے یہ عمر باقی

جب خورشید ہمایوں جادید صبح محفل سپہر پہ مسند آرائے روزگار ہوا اور سورۂ نور چہرۂ پر نور روز سپیدہ دم کرنا آشکار بیاض سحر کا شیرازہ رشتۂ تار شعاعی سے بندھا اور پیشانی عروس کو نور تجلیٰ نشاں سے منور کیا حروف سطور بیاض خطوط مہر سے روشن رخسار گلزار نثار شگفتگی آثار عروس نور علیٰ نور ثبت مبرہن۔

آئینہ گرمیٔ طبیعت سے آئینہ سخن کو روشن کرتا تھا اور صیقل و جلا سے بھرتا تھا۔ نفس طبع کو خیال سر سخندانی سلک گوہر سلک کو تصور انجم افشانی۔ جب دولھا محفل مینو مشاکل میں آیا تو سب نے سرو قد تعظیم کی۔ دولھا مسند پر متمکن ہوا اور ادھر گانا ناچ شروع ہوا۔ ایک طرف زہرہ طبعان ماہ جبین رامشگری میں مصروف ایک سمت لولیان نرگس چشم عشوہ بازی میں مصروف۔

پہلے لولیان شہر آشوب بلائے دل و جان سیم و ساق غنچہ دہان نے بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی اور چھیڑ چھاڑ سے اہل محفل کو مسرور کیا۔ بعد ازاں ایک زن نوجوان بلائے بے درمان دلربائی اور کج ادائی میں مشہور انام عباسی نام بصد ناز و انداز گراں بہا پشواز پہن کر بن ٹھن کر آئی۔ اس زاہد فریب کے آتے ہی محفل ارم تزئین غنچۂ گل کی طرح کھلکھلائی، لطف صحبت دو چند ہوا۔ ہر گوشۂ انجمن سے آوازۂ تحسین بلند ہوا، نازک آوازی پہ صورت بار بدی نثار گلے بازی سے لحن داؤدی آشکار۔ تان سین شاگردی کا دم بھرتا۔ بیجو نایک سنتا تو وجد کرتا۔ وہ صورت دلکش و روح افزا، اور نغمات دل کشا کہ تمام حاضرین کی زبان پر آوازہ آفریں تھا۔ اور ہر سمت شور تحسین ایک نواب صاحب نے جو بی عباسی پہ ریجھے ہوئے تھے یوں مذاق شروع کیا۔

نواب۔ بی عباسی صاحب آپ تو ایسی خوش گلو ہیں واللہ کہ آپ کی تعریف ہی کرنا فضول۔ بالکل فضول ہے۔

عباسی۔ کوئی کسی تعریف کرے تو خیر عطائی اناڑی نے تعریف کی تو کیا۔

نواب۔ اللہ رے غرور۔ اے صاحب ہم تو خود تعریف کرتے ہیں۔

عباسی۔ شان خدا۔ آپ بھی اتنے ہوئے۔ اے تیری قدرت۔ بھلا یہ بہاگ کا وقت ہے یا دھناسری کا۔

نواب۔ یہ کسی ڈھاڑی بچے سے پوچھو جاکے۔

عباسی۔ (ہنس کر) اے لو اور سنو جو علم موسیقی کے نکات سمجھے وہ ڈھاڑی بچہ کہلائے۔ اس عقل کے صدقے اے واہ امیر نہیں جھلا ہے جو دو باتیں نہ جانتا ہو۔ گانا اور پکانا چاہے خود گلے سے نہ کرے مگر سمجھے تو وہ رئیس نہیں جو یہ نہ سمجھے۔ پھر گنوار اور شہر والوں میں فرق کیا رہا۔ اور جو کھائے گا اچھا وہ پکائے گا بھی اچھا۔ آپ کے سے دو ایک گھامڑ رئیس شہر میں اور ہوں تو تمام شہر بس جائے۔

نواب۔ لگا نہ رہنے دے جھگڑے کو یار تو باقی۔ ہماری تو یہ فرمائش ہے۔ اگر مزاج میں آئے تو بسم اللہ ورنہ اختیار ہے۔

عباسی۔ سنیے بسر و چشم یہ کیا بات ہے۔

لگا نہ رہنے دے جھگڑے کو یار تو باقی! رُکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگِ گلو باقی

جو ایک رات بھی سویا وہ گل گلے مل کر تو بھینی بھینی مہینوں رہی ہے بُو باقی

ہمارے پھول اٹھا کے وہ بولا غنچہ دہن — ابھی تلک ہے محبت کی اس میں بو باقی
فنا ہے سب کیلئے مجھ پہ کچھ نہیں موقوف — یہ رشک ہے کہ اکیلا رہے گا تو باقی
کنوئیں میں جبکہ گرے آہ حضرت یوسف — رہی نہ عشق مجازی کی آبرو باقی

جو اس زمانے میں رہ جائے آبرو باقی

نواب - یہاں یہ سب سے زیادہ مقدم شے ہے۔

عباسی - مگر حیاداروں کے لیے۔ بگڑے بانوں کو کیا!

حاضرین - اس زور سے تہقہہ پڑا کہ نواب صاحب جھینپ گئے۔

عباسی - اب اور کچھ ارشاد فرمائیے حضور۔ ہنسکر یہ چہرے کا رنگ فق ہو گیا کیوں!

حاضرین - آپ سے نواب صاحب بہادر بہت ڈرتے ہیں۔

نواب - جی ہاں حرامزادے سے سبھی ڈرا کرتے ہیں۔

عباسی - اے ہے یہ جبھی آپ اپنے ابا جان سے اس قدر ڈرتے ہیں۔

حاضرین - اور زور سے تہقہہ لگا کر کیا کہی ہے۔ واللہ کیا کہی ہے۔ بی عباسی کے سامنے آپ کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ ساری شیخی رکھی رہتی ہے۔

عباسی - اب زیادہ نہ چھیڑیئے۔ کیوں نواب آجکل کوئی مقدمہ عدالت میں دائر ہے یا نہیں؟

الغرض دیر تک محفل رقص آراستہ رہی۔

دلہن کو سات سہاگنوں نے مل کر اس طرح سنوارا تھا کہ آتش حسن دوچند بھڑک اٹھی۔ جب کنگھی چوٹی سنواری، مانگ نکالی یہ معلوم ہوا کہ قلب شب سے صبح صادق نکل آئی۔ مشاطۂ چابکدست یہ شعر زبان پر لائی ؎

ہو دسترس ہمارا جو مکھڑے یہ یار کے — صدقے کروں میں چاند فلک سے اتار کے

بوا فرحت افزا بوا جان بخش سے مخاطب ہو کر یوں ہمکلام ہوئیں۔

فرحت افزا - تم کو خدا کی قسم ہے میں اپنی ابٹری چوٹی دیکھوں ایسی سہانی موہنی صورت اور ایسی بھاؤنی دلپسند مورت کبھی دیکھی نہ سنی۔

جان بخش - اللہ رکھے کیا بھاؤنی مورت ہے ؎

وسواس ہے کچھ دل میں ہمارے کئی دن سے — صدقے نہیں تم پر سے اتارے کئی دن سے

محلدار - تیسوں کلام کی قسم بندی اندھی ہو جائے روزی نصیب نہ ہو جو جھوٹ کہتی ہوں۔ یہ صورتیں خواب میں بھی نہیں دیکھنے میں آتیں۔

فرحت افزا - اے اس میں کیا فرق ہے۔ در در ماری پھروں جو ذری بھی اس میں جھوٹ ہو کہ پرسوں سکینہ بیگم اپنے منہ سے کہتی تھی کہ اگر ہم سے بڑھ کے حسن ہے تو حسن آرا بیگم کا۔

جان بخش - یہ حسن خداداد ہے۔ اللہ کی دین میں کس کا اجارہ ہے۔

محلدار - بارے اللہ نے اتنی جھنجھٹ کے بعد یہ دن دکھایا۔ یہ عالم عیش تقدیر سے نظر آتا ہے اور یہ دور احسن تدبیر سے ظہور پاتا ہے۔

جاں بخش - اللہ مبارک کرے دن دن شادی بڑھے۔
فرحت افزا - دوست شاد، دشمن نامراد۔
جاں بخش - زیور کو ان کے جسم کے سبب سے رونق ہوتی ہے۔
فرحت افزا - اور کیا یہ زیور کی محتاج ہیں بھلا ؎

کب خوبرو کو ہوتی ہے زیور کی احتیاج　　　ہر عضو عضو اس کا ہے ہر حسن نو کا تاج

چاندنی کی اس چمک دمک سے زیب دیتی تھی جیسے چاند کے پاس سہیل نمایاں یا بدر کے مقابل مشتری جلوہ کناں پیچ و تاب زلف پر تاب رسن گردن آفتاب ؎

روے بنا تا دگر زاہد نخواند الصلٰوۃ　　　زلف بنا تا دگر راہب نگوید الصلیب

نرخ سادہ غبغب آویختہ گر لاغر سینہ آمیختہ۔ الٰہی یہ سینہ ہے یا چشمۂ زرینہ یا سیم گنجینہ لب رنگین سے شورش اٹھائی تھی۔ دل خستگان زار کے زخم جگر پر نمک چھڑکاتی تھی۔ تبسم و خندہ کہ لب شکر ریز سے نمودار ہوا اس کے مقابل میں قند فرسود تھا۔ قد و قامت خرامندہ سرو و شمشاد قیامت و محشر کی بنیاد زیور نے اور بھی آفت ڈھائی چھبن کی آگ دہ چند بھڑکائی۔ بجلیاں بجلی گراتی ستم ڈھاتی تھیں۔ جگنی اور دھد کی اور ڈھولنا اور ملکڑی زیب گردن و گلو۔ جوشن اور نورتن آرائش میں ہم پہلو۔

اب نکاح کی رسم شروع ہوئی۔ قاضی صاحب اندر آئے اور دو گواہوں کو ساتھ لائے۔ اس کے بعد دریافت کیا گیا کہ آزاد پاشا کے ساتھ نکاح منظور ہے الخ۔ دلہن نے فرطِ حیا سے جواب نہ دیا اور گردن نیوڑا کر سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھی رہی۔

بڑی بیگم۔ اے بیٹی کہو خدا کا واسطہ۔
روح افزا - حسن آرا بولو بہن، دیر کیوں کرتی ہو۔
نازک ادا - بولو حسن آرا۔ بس تم ہاں کہہ دو۔
جانی بیگم - (آہستہ سے) ایسی ہی تو بڑی شرمیلی ہیں۔
نازک - اے بیٹی اب کاہے کو دیر لگاتی ہو۔ خواہی نخواہی۔
قاضی - آپ سمجھائیے ان کی بہنیں سمجھائیں۔
جانی - (آہستہ سے)۔ بجروں پر سیر کر چکیں۔ ہوا کھا چکیں اور اب اس وقت یہ نخرے بگھارتی ہیں۔
نازک - ازبرائے خدا بہن اس وقت نہ شرماؤ انہیں۔
جانی - نہیں اللہ جانتا ہے ہمیں یہ نخرے بازی نہیں بھاتی، ایک آنکھ خواہی نخواہی اپنے تئیں بنانا۔
بڑی - بیٹی ازبرائے خدا کہہ دو سمجھاتے ہیں۔

العرض بڑی کوشش اور اصرار اور فہمائش کے بعد حسن آرا نے نہایت نازک آواز سے "ہوں" کہا۔

بڑی - لیجئے دلہن نے ہنکاری بھری۔
قاضی - ہم نے آواز نہیں سنی تم نے سن لیا۔
بڑی - ہاں ہم نے سن لیا بہت سے گواہ ہیں۔

قاضی نوراللہ صاحب معہ گواہوں کے باہر آئے۔ ناچ رنگ موقوف ہوا۔ دولہا کے شملے پر سہرا باندھا، خطبہ پڑھا

دولہا سے ایجاب و قبول کرایا۔

آزاد۔ جی ہاں قبول کیا۔

قاضی۔ یوں کہیئے قبول کیا ہم نے۔

آزاد۔ (مسکرا کر) قبول کیا ہم نے۔

قاضی صاحب تشریف لے گئے اور محفل میں طائفوں نے مل کر مبارکباد گائی ع

ہمیشہ دلبرِ سبحان مبارک باشد

شربت پلائی کے بعد دولہا کو رسم کرنے کے لیے اندر بلایا، سر پر آنچل ڈالے ہوئے بہنیں لائیں۔ مسند بیش بہا پر بٹھائے گئے، ابعد ازاں عروس رشک ماہ غیرتِ مہر یوسف لقا پری چہرہ کو بہنوں نے لاکر اسی مسند پر بٹھایا۔ اس وقت کے جوبن کا حال حیطۂ تحریر سے خارج ہے اور حیز تقریر سے باہر وہ چشم جادو اور اس پر سرمے کی تحریر کافر مست کے ہاتھ میں برہنہ شمشیر رخسار گل نثار۔ زلف چلیپا سیہ مار کفچہ دار۔

گیسوئے دوتا سا کمند انداز رسن باز۔ در پردہ جنگ ساز، غالیہ رنگ عمر دراز، مانگ کے دونوں جانب بال بال موتی پروئے ہوئے معلوم ہوتا تھا فلک پر ستارے درخشاں ہیں مثلِ کہکشاں یا ابرِ سیاہ میں برق جہندہ شرر فشاں مسی دھڑی کے ساتھ پان کے لکھوٹے نے وہ رنگ جمایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ دامن شب آج شفق کا ہاتھ آیا ؎

وہ جب کرچکی اپنا سارا سنگار	ہوئے مہر و مہ جان و دل سے نثار
ہوئی حسن کی سارے عالم میں دھوم	فلک نے لیے دستِ مشاطہ چوم

دلہن بیٹھنے ہی کو تھی کہ روح افزا اور گیتی آرا نے کہا بہن جوتی تو چھواؤ۔ دلہن سمٹی سمٹائی سر جھکائے ہوئے خاموش کھڑی رہی۔

جانی۔ واہ یہ تو خود چھوئی موئی بن گئیں اس وقت۔

سپہر آرا۔ حیا مانع ہے۔ آخر حیا بھی تو کوئی شے ہے!

نازک۔ اے جوتی شانے پر چھوا دو بہن۔ واہ۔

استانی۔ اگلے وقتوں میں تو سر پر پڑتی تھی۔

نازک۔ اس جوتی کا مزہ کوئی مردوں کے دل سے پوچھے۔

جانی۔ اے جوتی خورے کے جوتی لگا دو بہن۔

جب دلہن نے ذرا جنبش نہ کی تو بہار النساء نے ہاتھ بڑھا کر دلہن کے داہنے پاؤں کی جوتی دولہا کے شانے پر چھوا دی۔ میراثنوں نے کہا اب دولہا کا ہاتھ دلہن کی پیٹھ پر رکھوائیے آزاد نے ؛ دلِ شاد معشوقۂ پریزاد کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ ساچق کے دن کا سہاگ پڑا آیا۔ سات سہاگنوں نے چاندی کی کھرل میں سرمہ سا کر کے ایک چھوٹی زنگار۔ پیالی میں رکھا اور چھیل چھبیلا ناگرمو تھا کیوڑا گلاب عطر سہاگ اور اشرفیاں رکھ کر دولہا کو دیا۔ دولہا نے صندل کی ٹکیا سے مانگ بھری۔ اس وقت حسن آرا کا رخسار نورانی شعلۂ طور تھا اور ہر خط پیشانی مشعل نور سامنے جماعتِ مطربان خوش گلو شہر کی ڈومنیاں۔ خوبرو عنبر مو گانے میں طاق حسن میں پریزاد بادبدو نگیسا کی استاد۔ کوئی گاتی تھی کوئی ناچنے کے لیے کھڑی تھی گنگری گویا مسلسل موتیوں کی لڑی تھی۔ ڈومنیوں نے گانا شروع کیا ٹکے پیسوں جوتری پیسوں بھرا کٹورا تجا۔ ہریالے بنے بھرا کٹورا تجا۔ تیرا لاڈلا۔ اے

نادان سب کچھ جانے لاڈلا لاڈ حضرت بی بی کی بتیاں جو شو آوے تجا۔

حیدری ڈومنی جو سب سے زیادہ خوبرو تھی اس نے اصرار کیا کہ دولھا دلھن کی طرف مخاطب ہو کر کہیں کہ تیرا مونگاری۔ میری نادان بنو۔ ڈولی کے ساتھ چلوں گا۔

نازک۔ اور پاپوشیں جھاڑ جھاڑ کے دھروں گا۔

جانی۔ اور صراحی ہاتھ لے چلوں گا۔ اور چاندنی چوک ڈولی کے ساتھ جاؤں گا۔

ڈومنی۔ تیرے بابا کا لیا۔ گھوڑے نخاس میں لیا۔ کھوٹے داموں سے لیا۔ میری نادان بنو کیسے یہ دونوں ٹونے میری آنکھوں سے لگیں۔

آزاد۔ اے کیوں نہیں ضرور کہوں گا۔

نازک۔ اے واہ اچھا رنگ لائے۔

جانی۔ رنڈیوں کے نخرے بہت سیکھے ہیں۔

راوی۔ اس فقرے پر اس قدر قہقہہ پڑا کہ میاں آزاد گو ازبس طرار و حاضر جواب تھے مگر بہت ہی شرمائے۔

ڈومنی۔ اے حضور فرمائیے۔ یہ دونوں ٹونے میری آنکھوں سے لگیں، کہنا تو پڑے گا۔

ٹونا میرا سلونا آلو آلو ری مان ٹونا۔ الزار منگل کا ٹونا۔ بہ مجبوری تمام دولھا نے کہا، یہ ٹونے میری آنکھوں سے لگیں۔

لاڈلی بیگم بصد انداز دامتیاز آ کیں پان کا بیڑا لائی اور نوشاہ کو گلوری کھلائی۔ پہلے منہ تک بیڑا لا کر ہٹایا اور ڈہکایا۔ آزاد تو آزاد تھے ہی مسکرا کر بولے۔ ہم کو ڈہکانا کیا سر نور رنگ جمانا کیا چکنی چکنی باتوں سے لبھاتی ہو رنگ جماتی ہو۔ ہم نے جان سپاری میں خیر خواہانہ بیڑا اٹھایا تھا۔

نوباتی بیگم اور مصری خانم نے روئیں روئیں سے نوبات چنوائی اور دولھا کی روح وجد میں آئی۔ دُلہن نے منہ مانگی مراد پائی۔ اس کے بعد سپہر آرا سہاگ لائی اور دولھا کے کان کی لو پکڑ کر جھک کر کہا۔ کہو سونے میں سہاگا موتیوں میں دھاگا اور بنے کا جی بنی سے لاگا۔

میراثنیں گاتی تھیں، سننے والوں کو وجد میں لاتی تھیں۔ نوباتیں چننے کا ہر پلہ ہزار الیا ٹونا کر دے رہی رہے بن رام کا غلام ڈیوڑھی بٹھا کر سلام۔

اس کے بعد رسم آرسی و مصحف عز و شرف ادا ہوئی۔

حیدری۔ دلہن کی آرسی میں دولھا منہ دیکھے۔

نازک۔ اس میں حسن آرا کو آرسی آئے گی۔

دولھا اور دُلہن کو سُرخ دوشالہ اڑھایا ادھر حیا اُدھر شوق وصل نے رنگ جمایا۔ عروس نازنین کا سہرا ہٹایا، منہ پر سے ہاتھ اٹھائے، ٹھوڑی پکڑ کر مُنہ سے منہ ملایا۔ بیچ میں دُلہن کے زانو تلے آئینہ تمثال پر تکیہ رکھا۔

سکندر بیگم دوڑ کے آئینہ لائی۔ ان دونوں مہر و ماہ سپہر راحت اور نونہالان گلزار فرحت کے درمیان میں آئینہ رکھا عکس جبین نور آگین عروس ناز آفرین جس پر افشاں چنی ہوئی تھی اور حیا سے قطرات عرق لرح پیشانی پر نمودار تھے گو ستارے اوج فلک حسن پر نمودار تھے صاف ظاہر کہکشاں کے آثار تھے۔ اس گھڑی کا سہانا پن بھینی بھینی خوشبو۔ اُبھرا ہوا جوبن مہر و ماہ ایک برج میں جلوہ گر قران زہرہ و مشتری پیش نظر حیدری نے بصد شان دلبری کہا مبارک باشد آج چاند اور سورج آسمان سے زمین پر اتر آئے۔ دلہن لنگ

سواری بیاہن کی آج تیاری دلہن مانگ سواری قرآن شریف لایا گیا۔

نوباتی بیگم - بی بی بنو جلدی آنکھ نہ کھولنا۔

نازک - جب تک اپنے منہ سے غلام نہ بنیں۔

حیدری - کہیے بیوی میں غلام ہوں۔

آزاد - (مسکرا کر) بیوی میں غلام بلکہ درم ناخریدہ غلام ہوں اور غلام کیا معنی غلام کا چولام ہوں۔ از برائے خدا منہ کھولو۔

بڑی بیگم - بٹیا اب تو کہلوا لیا - اب آنکھیں کھول دو۔

حیدری - ایک ہی بار کے کہنے کی سند کیا ہے

آزاد - بیوی تم پر نثار تمہارا غلام واسطے خدا کے منہ تو کھولو۔

نازک - ہمارے میاں اس قدر اصرار کرتے تو ہم۔

جانی - (ہنس کر) ہاں - ہاں کہو - کیا کرتیں۔

حیدری - اے حضور خوشامد کیجئے دلہن کی۔

آزاد - اب خوشامد سے نہ مانیں گی زبردستی کے بغیر

نازک - اللہ جانتا ہے یہ تو سچ مچ آزاد ہی ہیں۔

حیدری - آپ جو کہتے ہیں اس کا خیال رہے۔ دلہن کے غلام بنے رہیئے گا۔

جان بخش کہتے تو ہیں مگر ان مردوں کی بات میں بھید رک نہیں ہے - اسی سے دلہن منہ نہیں کھولتیں۔

حیدری - یہ تو کہتے تھے کہ ہم مانجھے کے کپڑے نہ پہنیں گے۔

جان - بڑے بول کا سر نیچا غلام تک تو بنے۔

دولھا - مجھے مول لو۔ بیوی آنکھیں کھولو۔

بڑی بیگم - بٹیا مسّی دیکھو بناؤ دیکھو - اب کہا مانو۔

دلہن نے آنکھیں کھولیں تو دولھا کی بہنیں بولیں۔ ہمارے بھائی سے اس قدر خوشامد کروائی تب جا کے صورت دکھائی۔ حسینی بیگم نے حرز یمانی دم کی اور مصحف ناطق بہ نیت داتی لا کے دولھا کے ہاتھ میں دیا اور کہا میاں چوم کے سورۂ اخلاص نکالو کہ اللہ تعالےٰ دونوں میں اخلاص بڑھائے۔

حسن آرا اس وقت غیرتِ ماہ رشک مہر خورشید پری چہرہ لباس فاخرہ سے مخلع تھی - اس درجہ معطر معنبر کہ مشام روح طبلۂ عطار تھا - عنبر سارا خوشبو پر نثار تھا - آزاد اس وقت فرط مسرت اور وفور طرب سے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے - بیقرار ہوئے جاتے تھے - حسن آرا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو جاری ہوئے لوگ سمجھاتے سمجھاتے عاری ہوئے مگر آنسو نہ تھمے - آزاد نے بدرجہ سر جھکا کر کان میں کہا - ایں خیر تو ہے۔ دل کو مضبوط رکھو - ہم تم تمام عمر مزے سے زندگی بسر کریں گے - جو لوگ خوشی اور انتہا کی خوشی کے وقت اعتدال سے نہیں گذرتے وہ ضابط کہلاتے ہیں - از برائے خدا اس وقت ذرا دل کو قابو میں رکھو ورنہ میں شادی مرگ ہو جاؤں گا - مجھے دیکھو دل پر کس قدر میں نے جبر کیا ورنہ واقعی فرط طرب سے میں مر ہی جاتا۔

بڑی - نصیب دشمناں دور پار - گنگا گومتی پار

بہار النسا - شادی کے وقت کوئی منہ سے وہ کلمہ نکالتا ہے جس کو شادی کے ساتھ مرکب کرتے ہیں؛

روح افزا۔ حسن آرا از برائے خدا بہن منہ دھو ڈالو۔
عباسی بیگم۔ حضور کہا مانیے دیکھیے بڑی بیگم صاحب اور روح افزا بیگم کھڑی گھگھیا رہی ہیں۔
بہار النسا۔ اے بی جان بوا ذری تم آن کے سمجھاؤ۔
سپہر آرا۔ باجی اچھا ایک بات تو سن لو۔
بڑی بیگم۔ ہمیں ہول ہوتا ہے ایسا نہ ہو کہ رونے رونے۔
بہار۔ ناحق اپنے آپ کو ہلکان کرتی ہو حسن آرا۔
استانی۔ بیٹا یہ نہیں کرتے دل قابو میں رکھو۔
حیدری۔ پانی سے تر کرکے کپڑا منہ پر پھیر لو۔
استانی۔ تر کپڑے سے منہ پونچھ کر حسن آرا۔
بہار۔ بہن کہنا مانو ایسا بھی دل کے ہاتھ بک جانا کیا۔

اتنے میں حسن آرا کو غش آیا۔ کوئی لخلخہ لائی کسی نے عرق بہار سنگھایا۔ آزاد نے جھک جھک کے کان میں کہا خدا کے لیے سنبھلو لوگ نام دھریں گے۔ زود فہمی اور زود لاغری کا دھبہ لگائیں گے۔ حسن آرا کو ہوش آیا۔ ادھر اُدھر دیکھ کر کہا اماں جان کوئی نہ کوئی اطلاع دینا۔ اس پر قہقہہ پڑا اور بڑی بیگم بولیں بٹیا کتنی سادی ہو، تمھیں نصیب دشمناں غش آئے اور یہ بات ایسی چپ چپاتی ہو جائے کہ سنو بھی نہیں۔ عباسی اچھی طرح منہ دھونا۔

جب دلہن کا رخ انور دھلا چکے اور دیکھا کہ اب عنایتِ ایزدی سے چاق ہے تو دولہا نے اس عروس پری چہر غیرتِ بدر دہر کو گود اٹھایا، شوق نے گدگدایا، مسند سے پلنگ پر بٹھایا۔ ڈومنیوں کی فرمائش اور فہمائش سے حسب رواج عروس پری تمثال جادو جمال کی مانگ کھولی تو جانی بیگم پردے سے بولی ۔

دل و جاں زلف دوتا مانگے ہے ۔۔۔ مانگ اب دیکھیے کیا مانگے ہے

بہار النسا۔ اے بہن جان وان کا ذکر نہ کرو اس وقت
جانی بیگم۔ یہ تو پرانا شعر ہے۔ دل و جان زلف۔
نازک ادا۔ (جانی بیگم کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) پھر وہی اکٹتی ہو۔
جانی۔ اس وقت جی چاہتا ہے کہ گلے لگا لوں۔
نازک۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ حسن آرا کو پیار کروں۔
جانی۔ اور ثریا بیگم پر بھی نکھار ہے۔
نازک۔ واہ ایڑی چوٹی پر واروں۔
جانی۔ کیوں کیا جوبن نہیں ہے تم سے اچھی ہے۔
نازک۔ کہیں ہو نہ ہم سے اچھی، جیسی سب ہیں ویسی وہ بھی ہے۔
جانی۔ دیکھو کیسی اپلی گملی پھر رہی ہے۔ لونا سا قد، پتلا سا منہ، ملنسار، اپنے دل سے صاف۔
نازک۔ اے ہے ملنسار! ملنسار نہ سمجھنا۔ ایک ہی اکل کھری ہے۔ بس کی گانٹھ پیٹ کی ہلکی۔ ان سے کوئی بات کہو تو چاہے کہیں

ہی رانڈ کی کیوں نہ ہو مجال کیا کہ گھر میں ایک ایک سے نہ کہیں اور جو کہیں یہ کہہ دو کہ بہن کسی سے کہنا نہیں تو پھر تمام محلے میں ڈھنڈورا پٹوائیں۔

جانی۔ کیا مبارک محل کا پاؤں بھاری ہے؟

نازک۔ نری اندھی ہو گیا اتنا بھی نہیں سوجھتا ان گنا مہینا ہے؟ دیکھ لینا لڑکا ہوگا۔

جانی۔ ایک لڑکا تو ان کے پہلے ہوا تھا،

نازک۔ ہاں سات مہینے کا ہو کر بیچارا چل بسا۔

جانی۔ اے ہے سوکھے کا عارضہ ہوا ہوگا۔

نازک۔ نہیں سردیوں میں ٹھنڈی نکل گئی۔

جانی۔ دولھا باہر گیا یا ابھی رسم ہو رہی ہے۔

نازک ادا اور جانی بیگم دونوں نے پردے کے پاس سے جھانک کے دیکھا نازک ادا نے کہا بہن بڑی بیگم نے اس شادی میں بھی وہ دھوم کی ہے کہ سارا شہر تعریف کرتا ہے۔ یہ تقریب اور دوسری تقریب نواب امیر محل کے ہاں کی جب نواب امیر محل کی صاحبزادی کی شادی ہوئی تھی تو انھوں نے بھی وہ دھوم کی تھی کہ آج تک نام ہو گیا۔ گیارہ ذی الحجہ کو دُلھن کے ہاں سے مانجھا جلوس کے ساتھ گیا۔ باجا اور جلوس اور علم اور برچھی خوانوں میں پینڈیاں کوئی تین من اور تین ہزار روپیہ نقد اور کشتی میں منڈیل شاہی مع کلغی جڑاؤ سرپیچ ایک میں کارچوبی جوڑا پر چاندی کی چوکی اور لوٹا ایک کشتی میں کنگنا۔

مغلانی۔ حضور مجھ سے پوچھئے نہ۔ میں عرض کروں میرے تو ہاتھوں کا بندوبست کیا ہوا ہے۔

نازک۔ سنا کنگنے میں حضور نے ایجاد کیا تھا۔

مغلانی۔ اے حضور کنگنا خواہ بادشاہ کے یہاں کا ہوگا خواہ غریبوں کے ہاں کا، کارچوبی ہی ہوتا ہے۔ حضور نے کل کنگنا طلائی بنوایا تھا۔

نازک۔ یہ تو شاید یہاں بھی بندوبست ہوا تھا۔

مغلانی یہاں تو تقلید ہوئی تھی نہ۔ موجد تو ہماری حضور ہی ٹھہری ہیں نہ نواب امیر محل ہی کے ہاں ایجاد ہوا۔

نازک۔ یہاں سے جو کنگنا گیا اس پر ہیرے اور زمرد کی لڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

مغلانی۔ کشتیوں میں چاندی کے برتن تھے۔

مہندی بھی نواب امیر محل نے بڑی دھوم سے بھیجی تھی۔ آرائش کے تخت اور روغنی کشتیوں میں جوڑے پُر زر، دولھا کے لیے اور کارچوبی منڈیل اور جڑاؤ سرپیچ کلغی کے اور کارچوبی باریک بڑا قیمتی دوشالہ۔

نازک۔ ان کے ہاں بھی سب شہزادے آئے تھے۔

مغلانی۔ اے لو، نہ آنا کیا معنی سب آئے تھے۔ ایک ایک شہزادہ تھا جہیز میں چاندی کا پنج کلسہ اس پر طلائی ملمع۔ ہاتھی کسی راجہ سے بارہ ہزار کو لیا تھا۔ گنگا جمنی ہودا تھا۔ ایک عربی گھوڑا معہ نقرئی ساز کے۔ لوٹا اور صندوقچہ اور خاصدان اور اور اگالدان سبوچہ سلفدان۔ آئینہ پلنگ طلائی قلمدان کوئی اسباب باقی نہ رہا۔

نازک۔ انھوں نے بھی جہیز کی تیاری دھوم سے کی ہے۔

مغلانی۔ ان کے ہاں ایک ایک چیز دو دو تین تین عدد تھے۔ مستی کے اسباب میں کوئی شے باقی نہیں تھی، پٹارا، ڈول، چولھا،
توا، گھڑونچی، اوٹنوں پر دیگیں بار تھیں۔

نازک۔ بڑی بیگم نے شیشے اور چینی کے متعدد اور بیشمار برتن منگوائے ہیں اور جوڑے بھی بھاری ہیں۔

مغلانی۔ نواب امیر محل کے ہاں سوا سے جوڑے تیار ہوئے تھے۔ چار سو سے تین ہزار تک کا۔ کوئی جوڑا چار سو سے کم نہ تھا۔
زیور تین قسم کا تھا۔ جڑاؤ الماس کا، جڑاؤ فیروزے کا اور سونے کا۔ اس زمانے میں ایسی دھوم کی شادی کم ہوگی۔ اچھے اچھے
شہزادے تعریف کرتے تھے۔ برات کے ساتھ کھانے کی تین سو دیگیں تھیں۔ چوتھی کے دن دولھا کے ہاں سے بڑی دھوم دھام
سے چوتھی آئی۔ دس اشرفی نواب امیر محل کو بطریق نذر دیں اور حضور نے بہت بھاری خلعت عطا کیا۔ اس میں ایک بڑا بیش بہا کارچوبی
دوشالہ تھا۔ بعد ازاں دولھا نے قاضی محمد اصغر علیخان بہادر یعنی دُلھن کے پدر بزرگوار کو دس اشرفیاں دکھائیں اور قاضی صاحب نے
ایک ہار جڑاؤ طلائی الماس کا عطا کیا۔ دولھا شہزادے ہیں۔ محمد علی شاہ کے پوتے ہیں۔ اب تو رئیسوں نے زمانے کے موافق شادی
بیاہ میں روک لیا ہے نہیں تو آگے جب زمانہ بکام ہوتا تھا ایک ایک فراش سیکڑوں کی چاندی لوٹ لیتا تھا۔ الغرض دولھا نے سہاگ بٹے سے
مصالحہ نکال کر اپنے انگوٹھے سے دُلھن کی مانگ بھری اور اس رسم کے بعد مردانے میں آیا۔ رخصت کے وقت دولہا کی ماں نے
ان کو اندر بلایا عروس پری چہرہ کو گود میں اٹھایا اور سکھپال پر بٹھایا۔

رخصت کے وقت سپہر آرا اور بڑی بیگم اور روح افزا اور بہار النسا اور اکثر مہمانوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور حسن آرا کی
آنکھیں بھی پُرنم ہوگئی تھیں۔ جب برات رخصت ہوگئی تو ہمجولیاں باہم یوں گفتگو کرنے لگیں۔

روح افزا۔ اللہ کرے جیسی سختیاں آزاد نے اٹھائی تھیں ویسا ہی آرام پائیں۔

عباسی۔ آمین آمین اور اللہ ایسا ہی کرے گا۔

جانی بیگم۔ مگر آزاد کا سا دولھا بھی کسی نے کم دیکھا ہوگا۔

مبارک محل۔ لاکھوں کنوؤں کا پانی پی چکے ہیں۔

جانی۔ اس میں کیا فرق ہے۔ کس مزے سے کہتے تھے، بیوی میں تمھارے غلام کے غلام کا چلام ہوں، از برائے خدا ذری منہ کھولو۔
کسی بات میں ذرا جھجک نہیں۔

نازک ادا۔ بڑے خوش مذاق آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

سپہر آرا۔ کیسے کچھ ڈہکانے کے وقت بڑی دل لگی ہوئی۔

نازک۔ ان سے کوئی جیت نہ پاوے گا۔

جانی۔ ہماری بھی یہی رائے ہے بہن۔

سپہر۔ ثریا بیگم کے آنے سے باجی جان خوش نہیں ہوئی۔

جانی۔ بالکل نہیں مگر کیا معلوم دولھا کو ان کا آنا معلوم ہوا یا نہیں۔

سپہر۔ تم نے نہیں سنا ان کی مہری نے جاکے دولہا کی طرف کی ایک ڈومنی سے کہا کہ اگر ہمارا پیغام کہہ دو تو ہم ایک اشرفی
دیں۔ وہ بولی اب اس وقت بھلا دولھا سے کوئی بات پوشیدہ طور پر کیوں کر کرسکتی ہوں سب سن لیں گے۔ باجی نے
کانوں سنا۔

جانی۔ بہن، تم کو ابھی تک اچھی طرح سے معلوم نہیں ہے کہ ثریا بیگم کس مرتبے کی عورت ہیں، مگر دلی محبت کو کوئی کیا کرے۔
سپہر۔ امید تو نہیں ہے کہ پاکدامن ہوں یا شاید۔
جانی۔ ان سے زیادہ پاکدامن بس پھر اللہ کا نام ہے۔
سپہر۔ باجی کو تو اس کے نام سے نفرت ہو گئی ہے۔
جانی۔ یہ ان کی بدگمانی ہے اور جہاں میاں بیوی عاشق معشوق ہوتے ہیں وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔
سپہر۔ نازک ادا بیگم نے کہا تھا کہ یہ کرستان بھی ہو چکی ہیں۔ پھر ایسی آوارہ ہرزہ گرد کا کونسا اعتبار؟
جانی۔ اللہ نہ کرے کسی پر مصیبت پڑے مگر گو برسوں اکیلی اور مطلق العنان رہیں اور چاہتیں سو کر گذرتیں لیکن ہر قدم پر آبرو کا خیال تھا اور یہ اسی سے ظاہر ہے کہ آخر میں شادی کی۔
سپہر۔ (مسکرا کر) یہ کیا اچھا ثبوت دیا ہے۔
نازک۔ اس وقت ہمیں یہ ذکر ذرا نہیں بھاتا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اس وقت حسن آرا کے دل کا کیا حال ہوگا اور دولہا کیسے خوش ہوں گے مگر آنکھوں سے پایا جاتا تھا کہ پیے ہوئے ہیں۔
جانی۔ اور انھیں یہ کیونکر معلوم ہو گیا کہ پیے ہوئے آدمی کی آنکھیں فلاں رنگ کی ہوتی ہیں؟
نازک ادا۔ وہ مثل نہیں سنی کہ دولھا نہیں بنے مگر براتیں تو دیکھی ہیں، کتابوں میں تو پڑھا ہے کہ پی کر آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں لال لال ڈورے آنکھوں میں پڑ جاتے ہیں۔
جانی۔ تمھیں دولھا کی شکل و صورت پسند ہے بہن؟
مبارک محل۔ اور سنو، پسند کی ایک ہی کہی۔ اس صورت کا دوسرا بھی پیدا ہوا ہے کوئی؟
نازک ادا۔ ماشاء اللہ کروڑ دو کروڑ میں ایک ہیں، نام خدا آغاز شباب ہے چہرے پر ریاست برستی ہے۔ بس کہہ دیا کہ حسن آرا کے لیے ایسا ہی شوہر موزوں ہے اور آزاد ایسی ہی بیوی پانے کے مستحق تھے، اس میں جو شک کرے وہ کافر۔
جانی۔ ان میں سب صفتیں موجود ہیں۔ اول تو منشی بے بدل دوسرے سپاہی بے مثل تیسرے خوبصورتی میں کسی سے کم نہیں چوتھے ہر علم سے واقف ہر علم کے استاد ہر دلعزیز۔
نازک۔ چوتھی کے دن دیکھنا ناک ناک کے نشانے لگائیں گے۔
سپہر آرا۔ اس میں تو شبہ نہیں ہے اس میں بھی تیز ہیں۔
جانی۔ کون دیکھ لینا بہن اگر باری نہ بولیں تو جب ہی کہنا۔ وہ اگر تیز ہیں تو ہم بھی کم نہیں۔
نازک۔ بس دو ہی تو ہیں ہم اور تم۔
سپہر۔ اماں جان کو یہ رنگ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔
نازک۔ اے بہن اس وقت کوئی رد کرے چاہے کوئی غل مچائے ہم کسی کی نہ سنیں گے۔
روح افزا۔ (دروازہ کھول کر) امی جان آج بڑی خوش ہیں۔ کہتی تھیں کہ بس اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے اب بالکل سبکدوش ہو گئی ہوں۔ استانی جی سے باتیں ہو رہی ہیں۔ دولھا کا جوڑا دیکھا آنکھ نہیں ٹھہرتی ہے، بڑی لاگت آئی ہے اور ابھی امی جان کے دل کے موافق نہیں ہے۔ کسی نہ کسی تدبیر سے اور روپیہ ضرور خرچ کریں گی اور اب ان کے بقول ان کو طمع کس کی ہے۔

جب برات دولھا کے گھر واپس گئی آزاد فرس پریزاد سے اترے سکھپال مہریاں ڈیوڑھی میں لائیں ، دولھا کی بہنیں آئیں۔ دروازہ بند کر دیا۔ آزاد نے عروس نسرین بدن غنچہ دہن کو سکھپال سے اتارا۔ گود میں اٹھایا۔ پہلے بہنوں نے کئی منٹ تک دروازہ بند رکھا جب خاطر خواہ نیگ پا چکیں دروازہ کھول دیا۔ عروس مہ وش بارہ دری میں آئی اس کے ڈوپٹے پر دولھا سے نماز پڑھوائی کھیر آئی۔ دولھا نے سات بار اپنے ہاتھ سے چٹائی۔ بوڑھیوں نے رونمائی دی۔

آزاد فرخ نہاد نے قطع منازل و طے مراحل صد ہا سختیوں و انواع و اقسام کے مصائب کے بعد خدا خدا کر کے یہ روزِ سعید دیکھا کہ حسن آرا سی حور وش کو بیاہ لائے۔ دولھا دلھن دونوں کا بحر جوش طغیانی پر تھا۔ دونوں فرطِ طرب سے جامے میں نہیں سماتے۔ باغ باغ ہوئے جاتے تھے۔ وفور نشاط و غایتِ انبساط سے دونوں کی آنکھیں اشکبار دونوں چشم و راہ انتظار یا خدا کہیں لیلی مشکیں پر ندشب جلوہ گر ہو۔ سریر عرش پر اجلاس بانوے قمر ہو۔ آغوش لبریز گل ہائے مراد ہو۔ ادھر دولھا اُدھر عروس پریزاد ہو۔ آزاد پاشا نے حمام کیا اور لباس فاخرہ زیب بدن کر کے دیوانخانے میں آئے۔ احباب بذلہ سنج مرنجاں مرنج نے مذاق کرنا شروع کیا۔ عرصہ دراز تک چہل پہل رہی اور ادھر بارہ دری میں بیگمات شوخ طبع کچھ اور ہی فکر میں تھیں۔

مہ لقا۔ اتنا دق کرنا کہ پاؤں پڑنے کی نوبت آئے۔

گلشن آرا۔ وہ تو خدا ہی نے کیا رات تو ہونے دو۔

مغلانی۔ اے نہیں کا ہے کے واسطے عیش میں خلل ڈالے کوئی۔ برسوں پاپڑ بیلے ہیں دولھا نے۔

گلشن۔ تم میں تو بی مغلانی اب گرمی نہیں رہی ہے۔ تم تو سو برس سے کچھ اوپر ہی اوپر ہوگی۔ تم کو ہماری باتوں میں کیا دخل ہے؟

مغلانی۔ دیکھئے گا جو چھیڑیں گی وہی پچھتائیں گی۔

مہ لقا۔ خیر آپ کی بلا سے بھگت لیں گے۔

بی جان۔ آج کا دن تو دق کرنے کا ہے ہی۔

مہ لقا۔ کسی دروازے کی چول بودی ہو تو دل لگی ہے۔

گلشن۔ کمرے کے دروازے کی کنڈی ڈھیلی ہے مگر یہ اس طرح کارروائی ہو کہ دولھا کانوں کان سننے نہ پائیں۔ ایسا نہ ہو پہلے سے کچھ بندوبست کریں۔

مہ لقا۔ بی مغلانی سے قسم لو کہ کسی سے ذکر نہ کریں۔

اب سنیے کہ محبوبن اور لطیفن شہر کی دو مشاطگانِ پُرفن نے جو اس پیشے میں کمال رکھتی تھیں دولھن کو اس لطافت سے سنوارا کہ کل حاضرین و ناظرین اور کل بیگمات و مخدرات عش عش کرتی تھیں اور اب سب متفق الرائے تھیں کہ جب سے اس جہان آفرین نے لفظ کن سے دنیا کو نمودار کیا اور مافیہا کو آشکار کیا۔ حسن آرا کی سی حسینہ و جمیلہ برق کردار حور نژاد، رشک خوبان نوشاد، خلق میں خلق نہیں ہوئی۔

ایک۔ خدا نظر بد سے بچائے، کیا شکل و صورت ہے!

دوسری۔ اللہ رکھے اس حسن کی کوئی دوسری دکھا تو دے۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔

تیسری۔ اسی صورت نے تو دولھا کو روم بھیجا تھا۔

چوتھی۔ اس ملک میں تو ان کا جواب نہیں ہے بہن۔

پانچویں۔ مگر اللہ جانتا ہے اگر کوئی جواب دینے والا ہے تو دولھا ہے، مردوں میں وہ عورتوں میں یہ۔

الغرض دولھا دلھن دونوں کی مراد دلی بر آئی یعنی عامل روز نے کوچ کی ٹھہرائی۔ جب عروس جہان افروز مہر خلوت کدۂ مغرب اور حجلۂ آرام میں متمکن ہوئی خاتون صدر آرائے انجمن انجم۔ یعنی ماہ سراپا رفاہ نے سریر مینا کار سپہر پہ جلوس فرما کر مسند نور تمامی آفاق پر بچھائی اور پھیلائے پیل تنے بہ خوب ترین وجہ جلوہ گری فرمائی آزاد فرخ نہاد خلعت فوکانہ خوش قماش سے مخلع اور انواع و اقسام کے عطر خوشبو سے معنبر ہوئے اور ادھر وہ جادو جمال پری تمثال سحر شمال یعنی عروس زلیخا لقا حسن آرا بیگم ہفت آرائش سے مزین اور حلی پرالیش سے شیشن ہوئیں۔ کوئی لولی عورت کیا مجسم نور ہے کسی نے کہا بہن یہ تو جنت کی حور ہے۔ الٰہی یہ رخسار تاباں ہے یا قمر ہے، عارض جاناں ہے یا نگار خانۂ سحر ہے

نگار خانۂ صبح ست ایں نہ رخسار است　　　نگاہ کن ورق سادہ چہ پر کار است

گو دلہن سر جھکائے گردن نیوڑھائے بیٹھی تھی مگر اس سکوت میں بھی عجب ادا تھی ؎

نگاہ مست تو آں را کہ مستفید کند　　　ہزار پیر خرابات را مرید کند

جانی بیگم نے نازک ادا سے کہا بہن جی چاہتا ہے گلے لپٹ کر سیکڑوں مچھیاں لوں، پھر جب ہم عورتوں کا یہ حال ہے تو مردوں کا حال ظاہر ہے۔

آزاد دست بدعا تھے کہ یا خدا کہیں جلد آفتاب پردۂ خفا میں منہ چھپائے عروس ماہ سریر سپہر پہ جلوہ فرمائے بحر طرب و انبساط کا جوش ہو۔ آزاد پاشا شاد محبوب مطلوب سے ہم آغوش ہو۔ شب عروسی کا حال لکھتے ہوئے قلم کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ ہر در و دیوار سے مبارکباد کی صدائیں آتی ہیں۔ اللہ اللہ آج کیا سماں ہے عرصۂ گیتی رودکش باغ جناں ہے۔ جوش پر حسن بہار صحن گلشن پروردگار، گلوں کا جوش بلبلوں کا خروش، ہوا میں لطافت پھولوں میں طراوت، نہریں جاری بید دل پر لطف باری، سبزہ گل کا دفور فیض نامیہ سے عالم معمور بلبلوں کی صدا معجزۂ عیسوی سے زیادہ، پھولوں کی خوشبو جان بخشنے کو آمادہ۔ طاؤس نگاریں صحن گلشن میں خوش خرام سبزۂ زمردیں طائر روح کے لیے دام، دست چنار طلب ساغر میں دراز شقائق میں ساقی کا انداز شبنم کے موتیوں سے گوش گل کو آرائش باران رحمت سے نباتات کی افزائش۔ سرو دوں کی بہجت انگیز صدا شاہدان چمن کی رنگین ادا نرگس کی آنکھ چشم بد دور گلاب پر شبنم نور علیٰ نور، گل کے نازک کرشمے آب صاف کے لبریز چشمے۔ غنچوں کا چٹکنا پھولوں کا مہکنا۔ آتش گل کی گرمی باد شمال کی نرمی۔ چار طرف عالم آب روش فلک پہ بارانی سحاب گل کو وہ ابتہاج کہ جامے میں نہ سمایا لالہ ایسا مست کہ دستار کا ہوش نہ آیا۔ سوسن کی سیہ مستی کس زبان سے بیان کروں۔ نرگس کا خمار آنکھ سے دیکھتے ہیں کیا عیاں کروں، شاہدان چمن کا نور ماشاء اللہ چشم بد دور خاک میں خاصیت اکسیر پانی میں آبحیات کی تاثیر۔ اب شبنم کا طغیان آتش گل کا طوفان۔ بلبلوں کی صفیر اہتزاز بخش پر تاثیر، حوض مصفا، آئینۂ قدرت پروردگار دامن صبا۔ عکس ریاحین سے گلزار صورت دیوار تیور سنبھالے۔ طائر تصویر نے بال و پر نکالے۔ موتیا کی خوشبو سے مردوں میں جان آئی، شاخ کہن پھل پھول لائی۔ لطف ہوا نے اعجاز عیسوی دکھایا۔ آہن دلوں کو موم بنایا۔ نرگس کو خدا چشم بد سے بچائے سوسن کو زبان پر نہ چڑھائے۔ سورج مکھی آفتاب پر چشمک زن، صحن چمن اس کے پرتو سے روشن۔ سبزے کے عکس سے کون و مکان ہرا بھرا۔ مردوں کو دریائے اخضر کیسے تو بجا۔ دیدہ دام صیاد لطافت ہوا سے نرگس پر چشمک زن چوب قفس نزاکت و نرمی سے رشک افزائے شاخ یاسمن کاتب قدرت نے نرگس قلم سے خط گلزار لکھا باغبان بہار نے نافرمان کو مہر داغ لالہ سے مزین کیا۔

عالم میں ایسی شگفتگی آئی کہ دشمنوں کے دل میں گرہ نہ پائی۔ ہر شجر بر گمان تحمل طور صحن گلشن عالم نور۔ مشتاقوں کی زبان پہ ارنی کا

برگ گل کے لبوں پر لن ترانی کا ترانہ - جام لالہ بادۂ شبنم سے لبریز - آتش گل آتش موسئے سے تیز - کمال پر عروج بہار خزاں دل میں حسرت کا خار - گنہگاروں کے نامے دھو گئے سیہ کار سفید رو ہو گئے - زلف سنبل کا شہرہ ختن میں گوہر شبنم کا چرچا ہے میں - زاغ سیاہ کا طاؤس گوں، بوم شوم ہمارے ہمایوں فتور عالم کمن گیا خارستان نسرین زار بن گیا -

ریلائے مشکیں پر ندشب بزم فلک میں جلوہ گستر ہوئی - ادھر چیکارانِ قانون دان اور خواصان باادب نے دولھا دلھن کی یکجائی کا اہتمام عروس گل رخسار تدرو رفتار کو کہ ہر ہفت آرائش سے مزین تھی چاندی کی پلنگڑی پر سلایا اور آزاد شیر دل شیر مرد کو بلوایا - گل ناز کو عندلیب شیدا کے سپرد کیا اور اپنا اپنا راستہ لیا - جب دولھا کو تنہائی میں چھوڑا تو حیا اور شرم نے منہ موڑا - ادھر زیبانِ نوخیز و گلبدن تاک جھانک کرتی تھیں عیش و نشاط کا دم بھرتی تھیں - آزاد کو اس وقت نشۂ بادۂ جوش نے ایسا مست دیا کہ تاک جھانک کی پروا نہ کی مگر دلھن نے کئی بار آہستہ سے ہاتھ جھٹک کر آنکھوں کے اشارے سے منع کیا کہ عجلت کا بہ پشیمانی ہے، تعجیل کار شیطانی ہے، ان کا اصرار ان کا انکار ادھر شوق کی افزائش ادھر حیا کی نمائش - دولھا کا بیتابانہ ہاتھ بڑھانا دلھن ہاتھ اور منہ کے اشارے سے سمجھانا -

الغرض عجیب مزے کی بات تھی - زیادہ کیا لکھیں پردے کی بات تھی - چوتھی کے دن عروس رنگین ادا حسن آرا بیگم کا چھوٹا پازاد بھائی دلھن کو لینے آیا - چوتھی بھی بڑی دھوم دھام اور کروفر سے آئی تھی - بیں بیس فیل کوہ رفعت اسپ تیز گام عقاب ہیئت جلوس افزاج مانوس - جب چوتھی آئی تو دولھا والوں کی طرف سے میراثنوں نے گالیاں دیں - دلھن کے بھائی کے آگے چوبھا لگا گیا - اس نے ڈومنیوں کو نیگ بخشا بھرپور انعام دیا - تھوڑی دیر کے بعد حسن آرا بیگم میکے تشریف لے گئیں -

جانی بیگم اور نازک ادا بیگم اور اُن کی بہنوں روح افزا اور سپہر آرا اور بہار النسا اور جہاں آرا اور گیتی آرا ور مہمانوں اور بیگمات نے ان کے آنے سے دلی خوشی ظاہر کی - دیر تک چہل پہل رہی - بعد ازاں دلھن نے حمام کیا اور مشاطگانِ ذی ہنر نے سنوارا - دس بجے آزاد فرخ نہاد سسرال آئے - بہنیں ممانیاں وغیرہ اعزہ ہمراہ تھیں - خوانوں میں متیش کے گیند اور پھولوں کے گیند آئے - حسن آرا کے دستِ نازک پر کھیر رکھی اور دولھا سے کہا چاٹ لو جیسے ہی آزاد نے منہ بڑھایا نازک ادا نے کہ پردے کے پاس ڈہکانے کے لیے منتظر کھڑی تھیں فوراً دلھن کا ہاتھ ہٹایا - جب کئی بار اسی طرح ڈہکایا تو بڑی دل لگی ہوئی اور سمدھنیں یوں کہنے لگیں:

مبارک محل - لے ہے کیسا ندیدہ دولھا ہے لوگو!

نازک ادا - اس کو کھیر کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی ہے -

جانی بیگم - کس لالچ سے بچارا منہ بکاتا ہے -

نازک - آج تک کبھی کھیر کھانے کی نوبت ہی نہیں آئی -

جانی - حلوا خوردن را روئے باید -

نازک - یہ منہ کھائے پھلائی واہ رے ندیدے -

بہن - (دولھا کی) ندیدے بنتے ہو شرم نہیں آتی؟

دوسری - اے ہاں پکڑ لو ہاتھ - ڈرتے کیا ہو -

نازک - کیا ہنسی ٹھٹھا ہے - بھیڑ بن چکے ہیں -

جانی - بھلا کہیں شیروں کے مقابل میں چل سکتی ہے -

بہن ۔ (دولھا کی) اللہ جانتا ہے ہمیں شرم آتی ہے۔
دوسری ۔ اے ان کو پکڑ نہیں لیتے ہاتھ۔
دولھا نے مُنہ لپکا کر ہاتھ بڑھایا مگر بے سُود۔
نازک ۔ (قہقہہ لگا کر) شرمائے تو نہ ہو گئے۔
حیائی (کھلکھلا کر) بے حیائی بلا دُور۔
مبارک ۔ ایکی تو مارے شرم کے عرق عرق ہو گئے ۔ دولھا نے حبالہ کے ہاتھ پکڑنا چاہا مگر نازک ادا نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا۔
حیائی لینا بالکل ہی ندیدہ ہے اے ہے۔
بہن (دولھا کی) اے واہ تمھیں شرم بھی نہیں آتی ۔
حیائی ۔ حیادار ہوں تو شرم آئے ۔ ندیدے کی طرح کھیر پر گرے پڑتے ہیں۔
بڑی بیگم ۔ بس اب ڈھکا چھپی زیادہ دق نہ کرو ۔ اس رسم کے بعد دولھا نے سات بار پھولوں کی چھڑیاں دلہن کے کاندھوں پر چھوائیں ، مگر بہت ہی آہستہ آہستہ کہ جسم نازک کو گراں نہ گزرے ۔ عروس گلبدن کی نزاکت اس درجہ بڑھی تھی کہ پھولوں کی چھڑیاں بھی ناگوار تھیں ۔ اس کے بعد دلہن کے ہاتھ میں چھڑیاں دیں اور نازک ادا نے خوب زور سے میاں آزاد پر ہاتھ صاف کیا اور ہنس ہنس کے دلہن کے ہاتھ سے لگائیں ۔
بہن (دولھا کی) کیا مفت کا بدن پایا ہے۔
دوسری ۔ اس بے رحمی کے قربان واہ صاحب واہ۔
نازک ۔ کسی کی چاند سی بیٹی بیاہنا دل لگی نہیں۔
حیائی ۔ اور ایسے ہی تو دولھا نازک بدن ہیں نہ۔
نازک ۔ اے ہے بڑے بچارے دبلے پتلے ان کے دشمن گھل گھل کر ہاتھی ہو گئے ہیں۔
اس فقرہ پر بڑا قہقہہ پڑا ، اور دولھا کی بہن نے کہا جی ہاں سچ ہے ۔ پرائے بدن پر ایسی ہی سوجھتی ہے کسی پر ایک آدھ پڑے تو قدر عافیت معلوم ہو ۔ خیر اب پھولوں کے گیند آئے بعد ازاں مقیش کے گیند سے کھیلا اور جب ترکاری اچھل پڑی تو بڑی دھینگا مشتی ہوئی ۔ نازک ادا اور حیائی بیگم نے تان تان کے ترکاریاں لگائیں ۔ جب آزاد نے دیکھا کہ یہ دونوں بتانِ شوخ اس زور سے ترکاری تاک تاک کے لگاتی ہیں کہ چوٹ آتی ہے تو ان سے بھی نہ رہا گیا ۔ انھوں نے بھی پردے میں بینگن پھینکنے شروع کیے ۔ کسی کی آنکھ پر پڑا کوئی کھڑی ہو گئی کوئی بھاگی کوئی مارے گھبراہٹ کے گر پڑی۔
بڑی بیگم ۔ بس بس ترکاریاں ہٹا دو عباسی سنتی نہیں۔
استانی ۔ اے ہے کیا بڑ دنگا کھیل ہے اوئی !
عباسی ۔ حضور لونڈی کی تو کوئی سنتا ہی نہیں ۔
بڑی ۔ اے از برائے خدا نازک ادا ہائیں ہائیں ۔
حیائی ۔ دولھا کو تو ڈانٹے کوئی ہم کیا کریں ؟
بہن ۔ (دولھا کی) پہل کس طرف سے ہوئی ؟

بڑی۔ اب کسی نہ کسی کے چوٹ ضرور آئے گی۔

ڈومنی۔ حضور اس چوٹ میں ذرا بھی درد نہیں ہوتا۔

استانی۔ ہٹا دو ہٹا دو۔ بس اب تک اچھل گئی۔

جانی۔ جو بات ہم چاہتے تھے وہ تو ہونے ہی نہیں پائی۔

آزاد۔ (جھلا کر) پردے کے باہر آئیے تو معلوم ہو۔

جانی۔ اخاہ گھول کر پی جائیں گے جیسے زور سے ترکاری ناک کے لگائی تو رخسار چپ پر پڑی۔

آزاد۔ (جھلا کر) جواب دینے ہی کو تھے کہ یہ آواز آئی واہ رے واہ مردوے عورتوں اور کمسنوں پر کوئی جھلاتا ہے!

آزاد مسکرا کر بیٹھ گئے اور ترکاریاں ہٹا دی گئیں۔ اس رسم اور چہل اور ہڑ بونگے پن کے بعد دولھا نے دلھن کا کنگنا کھولا اور دلھن نے دولھا کا۔ دلھن کا کنگنا سات گرہ کا تھا اور دولھا کا صرف ڈھائی گرہ کا۔ حسن آرا نے صرف برائے نام ہاتھ لگایا۔ ڈومنی نے دولھا کا کنگنا کھول دیا مگر آزاد کو کسی نے مدد نہ دی۔ بڑی دقت سے دیر کے بعد کھلا۔ اس قدر سخت گرہیں پڑی ہوئی تھیں کہ کئی منٹ کا عرصہ ہوا۔ بعد ازاں سہاگ پڑے میں دو ڈلیاں رکھیں۔ لگن میں دو پان کا بیڑا جا دل ڈومنی نے پھینکا اور دولھا دلھن سے کہا روکو۔ دلھن کی طرف سے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر روک لیتی تھیں اور دولھا کی جانب سے خود میاں آزاد آہستہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔

ڈومنی۔ ہماری دلھن عمر بھر غالب رہیں گی۔

مبارک محل۔ اس میں کیا فرق ہے وہ تو ظاہر ہے۔

نازک ادا۔ میاں سے تو ایک مرتبہ بھی روکا نہ گیا۔

جانی۔ تمام عمر دلھن کی جوتیاں سیدھی کریں گے۔

آزاد۔ خیر سمجھا جائے گا۔ مطلب سے مطلب ہے۔

جانی۔ کیا مجبوری ہے (مسکرا کر) کیا ناچاری ہے۔

دولھا۔ ہم تو وہ بات کرتے ہیں جس میں سب خوش ہوں۔

جانی۔ غلامی کی سند لکھ دو وہ مطلب یہ کہ اتنا لکھ دو کہ ہم آج سے دلھن کے غلام ہوئے ؎

حکم جو دویم بر از حکم خدا ست   ہر چہ جو دویم بفرما بد رواست

یہ شعر اپنے ہاتھ سے لکھ دو۔

اس چہل پہل کے بعد دولھا باہر جانے لگے مگر جوتا ندارد۔

آزاد۔ (ادھر ادھر دیکھ کر) اچھی دل لگی ہے۔

روح افزا۔ (مسکرا کر) کیا ہے کیا۔ کچھ گھبرائے سے معلوم ہوتے ہو۔

آزاد۔ خیر نیت تو معلوم ہو گئی۔ (مسکراتے ہوئے)۔

نازک۔ میاں پہن کر آئے تھے یا لیے مرتے ہوئے۔

بہن۔ وہ پہن کر آئے تھے یا نہیں اس سے کیا غرض ہے، مگر خیر دمڑی کی ہانڈی گئی —— !

——✲——